Registered No. A-1104.

(فہرست مضامین آخری صفحہ پر درج ہے)

برہان

قیمت فی کاپی [illegible] روپیہ

15942

نرخنامۂ اجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۵ "
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۶ "	۳ "

(۱) اجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصول منظور نہیں۔

(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانا طے پایا ہو اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی ہندوستان کے اندر تین روپیہ

" بیرون ہند آٹھ روپیہ " بیرون ہند پانچ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کو ۸ ہر فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی

منیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے





اُردو شاعری

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	جنوری سنہ ۱۹۳۵ء	شمارہ ۱

اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ

اس مقالہ کا موضوع صرف تاریخی تبصرہ ہے یعنی صرف یہ بتانا کہ کس عہد میں کون کون سے شاعر پیدا ہوئے۔ ہرچند تنقید اس موضوع سے بالکل علٰحدہ ہے اور اصولاً اس مضمون میں اس کی جستجو نہ کرنا چاہیے تاہم سلسلۂ کلام میں اپنی رائے بھی ظاہر کرتا گیا ہوں۔

میاں نظام شاہ رام پوری، افسوس، ہوس اور سوز پر چونکہ اس سے قبل نگار میں تفصیلی مضامین تنقید و انتخاب سے متعلق شائع ہو چکے ہیں اور مومن، غالب، ظفر پر مستقل نمبر نکل چکے ہیں اس لئے انکا کلام صرف تبرکاً اس مضمون میں درج کر دیا گیا ہے

اسی طرح متاخرین میں بعض نہایت مشہور شعراء کے صرف چند شعر بغیر کسی خاص خیال کو سامنے رکھے ہوئے جو یاد آگئے درج کر دیے گئے ہیں اور شعرائے حال کا کلام بالکل پیش نہیں کیا گیا، اس مضمون کی تیاری میں علاوہ تاریخ ہند تاریخ دکن اور تمام مشہور و متداول تذکروں کی خصوصیت کے ساتھ میں نے جلوۂ خضر، نکات الشعراء، تذکرہ میر حسن، گل رعنا شعر الہند، آب حیات، اور تاریخ ادب اردو سے زیادہ مدد لی ہے۔

اس مقالہ سے مدعا اُردو شاعری کی تاریخ کو مختصر سے مختصر الفاظ میں موردِ حوالہ کے طور پر اس طرح پیش کرنا ہے کہ لوگوں کو تذکرے نہ دیکھنا پڑیں اور طلبہ کو استفادہ میں آسانیاں پیدا ہو جائیں، عام طور پر تذکروں میں شعراء کے سنین پیدائش و وفات کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ متقدمین اس کا ذکر ضروری نہ سمجھتے تھے تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا ہے پوری جستجو کر کے ان کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (نیاز)

فرض کیجیے آپ کے باغ میں ایک تناور درخت کھڑا ہے اور کوئی شخص سوال کرے کہ اس درخت کی تاریخ پر روشنی ڈالیے تو آپ کو یقیناً اس کے تین حصے کرنے پڑیں گے، ایک وہ زمانہ جب اس کا تخم ڈالا گیا تھا دوسرا وہ جب زمین سے اس تخم نے سر نکالا اور کونپلیں پھوٹیں، تیسرا وہ جب اس میں پھول پھل آئے،

اسی طرح اگر کوئی شخص زبان اُردو کی تاریخ سے بحث کرے گا تو اس کو بتانا پڑے گا کہ اس کی بنیاد اول اول کب پڑی اس کے بعد اس کی جداگانہ ہیئت کس وقت نمایاں ہوئی اور پھر یہ کہ اس کا مستقل وجود کب قائم ہوا، بالکل یہی صورت اردو شاعری پر بحث کرنے کی ہو گی، لیکن چونکہ کسی زبان کی شاعری حقیقتاً ارتقائی منزل کی چیز ہے اس لیے لامحالہ اس کو تاریخ زبان کے دوسرے دور سے متعلق کرنا پڑے گا اور اس طرح گویا زبان اور شاعری میں پورے ایک دور کا فرق پڑ جائے گا،

اس جگہ یہ بحث ہمارے موضوع سے علیحدہ ہے کہ اُردو زبان کی بنیاد کس زمانے میں پڑی، لیکن اگر اصولاً یہ صحیح ہے کہ دو مختلف قوموں کا باہمی اختلاط ایک ملک کی زبان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تو اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ زبانِ اُردو کی بنیاد سب سے پہلے وہ حملہ تھا جو شاہانِ اسلام نے ہندوستان پر کیا، ہر چند ان حملوں کی صورت ایک زمانے تک صرف قزاقانہ رہی اور لوٹ مار کر کے چلے جانے کی حد سے گزر کر حملہ آوروں نے کسی سلطنت کی بنیاد یہاں قائم نہیں کی، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ان حملوں کے دوران میں وہ اپنی ترکی و تازی کے کچھ الفاظ یہاں چھوڑ نہ گئے ہوں اور میرے نزدیک یہی وہ اولین تخم ریزی تھی جو عرصہ تک عدم آبیاری کی وجہ سے کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکی، لیکن بعد کو جب رفتہ رفتہ شاہانِ اسلام نے یہاں قیام کر کے مستقل سلطنتیں بنائیں اور باہمی میل جول بڑھنے لگا تو اس تخم کی نشو و نما کے آثار شروع ہوئے اور برج بھاشا میں (جو خود آرین اقوام کی اصل زبان سنسکرت اور ہندوستان کے

اصلی باشندوں کی زبان سے مل کر تیار ہوئی تھی) فارسی و ترکی الفاظ کی آمیزش اس حد تک ہو گئی کہ آخر کار خلجیوں کے عہد میں اس درخت کی سب سے پہلی کلی امیر خسرو[۱] کی صورت میں نمودار ہوئی، ہم نے امیر خسرو کا نام خصوصیت کے ساتھ اس لیے لیا کہ انھوں ہی نے سب سے پہلے فارسی آمیز برج بھاشا میں انشاء و شاعری کی ابتدا کی ورنہ یوں تو جہاں تک صرف فارسی و عربی الفاظ کا تعلق ہے غوریوں ہی کے عہد میں وہ برج بھاشا میں دخیل ہو گئے تھے اور اس کا ثبوت چند گوئی ہندی شاعر کی اس تصنیف سے ملتا ہے جو شہاب الدین غوری کے حملہ کے بعد پرتھی راج رائے کے نام سے اس نے لکھی تھی آزاد نے آب حیات میں اس کا ایک کبت لکھ کر بتایا ہے کہ الفاظ محل، پروردگار، کریم، سلطان، پیغام، بادشاہ، زبان، سلام، حضرت وغیرہ کس آزادی سے استعمال کیے ہیں اس کے بعد لودیوں کے زمانے تک کوئی خاص پتہ اس امر کا نہیں چلتا کہ فارسی کا رواج کس حد تک وسیع ہوا البتہ سکندر لودی کے زمانے (۱۴۸۹ء۔ ۱۵۱۷ء) میں ہندوؤں اور خاص کر کائستھوں نے فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور دفاتر وغیرہ میں ملازمتیں اختیار کیں، ظاہر ہے کہ اس کے بعد فارسی الفاظ اور زیادہ بھاشا میں ملے ہوں گے، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کو کبیر کے دوہوں، گرونانک کی تصانیف، تلسی داس کی رامائن، سورداس کے کلام اور ملک محمد جائسی کی پدماوت میں بکثرت الفاظ فارسی و عربی کے نظر آتے ہیں،

لودیوں کے بعد دور مغلیہ شروع ہوا تو یقیناً ہندوستان کی عام زبان برج بھاشا سے بدل کر بہت کچھ نئی چیز ہو گئی اور جس طرح ہندو عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے تھے مسلمانوں نے بھی ہندی الفاظ کو اختیار کر لیا تھا، چنانچہ حد یہ ہے کہ بابر جو تازہ تازہ ہندوستان آتا ہے وہ بھی اس سے نہیں بچ سکتا اور اپنے ایک شعر میں پانی، روتی، (روٹی) موتی، کچ (کچھ) اور مجکا (مجھکو) کے الفاظ استعمال کرتا ہے

---

[۱] امیر خسرو کے فارسی ہندی آمیز کلام میں علاوہ عاشقانہ اشعار کے پہیلیاں، کہ مکرنیاں، دوسخنیاں وغیرہ بہت سی چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں اور بعض بعض تو اتنی صاف اردو میں ہیں کہ تعجب آتا ہے مثلاً ان کی دوسخنی ہے

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا؟ … — گلا نہ تھا

مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ یہ امیر خسرو کے زمانہ کی اردو ہو سکتی ہے، البتہ اُن کی بتیاں، چھتیاں والی مشہور غزل بیشک اس وقت کی زبان ہو سکتی ہے، یا پھر پہیلیاں کہ اُن کی زبان بھی تقریباً ہندی بھاشا ہے، اُن کی غزل کے بعض اشعار یہ ہیں، ؎

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں　　کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر　　نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آئے نہ بھیجے بتیاں

ہمایوں کے عہد میں ملک محمد جائسی کی پدماوت کافی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں میں برج بھاشا کا رواج کس حد تک ہو گیا تھا اور اس میں فارسی کے کتنے الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب اکبر[1] کا عہد آیا تو یہ اختلاط بڑھنا ہی تھا کیونکہ وہ تو ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر خود بھی آدھا ہندو ہو گیا تھا اور سیکڑوں الفاظ برج بھاشا کے، فارسی رقعات و فارسی فرامین اور روز کی گفتگو میں استعمال ہونے لگے تھے۔

اس کے بعد عہدِ جہانگیر[2] شاہجہان، اورنگ زیب[3] میں اور زیادہ ترقی ہوئی، چنانچہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں دو شاعروں نوری اور غواصی کا ذکر کیا ہے جو جہانگیر کے عہد میں پائے جاتے تھے، شاہجہاں کے زمانے میں لشکری زبان کا نام ہی اردو ہو گیا، اور اورنگ زیب کے رقعات دیکھو تو تم کو سیکڑوں الفاظ برج بھاشا کے ملیں گے (تذکرہ آبِ حیات و گلِ رعنا میں اس عہد کے بہت سے ہندی الفاظ اقتباس کر کے لکھ دیے ہیں اور ہر شخص ان کو دیکھ سکتا ہے)

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر میں اکبر کی ایک رُباعی بھی نقل کی ہے، جہانگیر نے جب ابو الفضل کو قتل کرا دیا تو اکبر کو بہت رنج ہوا اور جہانگیر سے خفا ہو گیا اس کے بعد آخر کار باپ بیٹے میں جب صلح ہوئی اور اکبر نے جہانگیر کو بلایا تو اس نے لکھا کہ کوئی اچھی ساعت دکھلا کے اطلاع دیں تاکہ میں اس دن حاضر ہوں اس پر اکبر نے یہ رباعی لکھ بھیجی، ؎

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت　　تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت　　ساعت کا بہانا نہیں، خوش ہر ساعت

لیکن میرے نزدیک اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور ممکن نہیں کہ اکبر اتنی صاف اردو لکھ سکتا ہو اور وہ بھی شعر کی صورت میں!

[2] صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر کو جہانگیر کی مشہور بیوی نور جہاں بیگم کے دو شعر کسی بیاض میں ملے ہیں چنانچہ ایک شعر یہ ہے ؎

دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم　　دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بُتِ بیباک میں ہم

اس کے معنی یہ ہیں کہ نور جہاں داغ کی شاگرد تھی!

[3] تذکرۂ جلوۂ خضر میں کسی پُرانی بیاض کے حوالے سے زیب النسا بیگم دختر عالمگیر کے بھی چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، دو شعر یہ ہیں ؎

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی　　اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی
ہر ایک پہ تم جور جو کرتے ہو پیارے　　دھڑکے ہے مرا دل، نہ لگے آہ کسو کی

مجھے اس کی صحت میں بھی تامل ہے

عہد مغلیہ کے فارسی شعراء بھی اپنے کلام میں اکثر الفاظ ہندی کے مثلاً ہار، چنبیلی، راگ، دھوبی، تنبولی، گڑہل، مولسری، پٹھان وغیرہ استعمال کرنے لگے تھے، الغرض ۱۰۰۱ء سے لے کر (جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا) عہد اکبری (۱۵۵۶ء) تک آہستہ آہستہ فارسی اور برج بھاشا ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتی گئیں، یہاں تک کہ دور مغلیہ میں یہ اُنس تقریباً معانقہ کی حد تک پہنچ گیا اور محمد شاہ کے زمانہ (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء) تک تو ایک نومولود (ریختہ) بھی اس مواصلت سے ظہور میں آگیا جس نے شاہ عالم کے عہد میں نشو و نما پایا، بہادر شاہ ظفر کے عہد (۱۸۰۵ء سے ۱۸۳۷ء) تک جوان ہوا اور پھر لکھنؤ پہنچ کر پورے نکھار پر آیا،

اس میں شک نہیں کہ ترقی کی یہ رفتار کوئی قابل فخر بات نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کے اولین حملہ کے بعد پانچ چھ سو سال کا طویل زمانہ اسی حالت میں گزر جانا کہ سوائے چند الفاظ کے اختلاط کے کوئی اور نمایاں فرق تشکیل زبان کے باب میں نظر نہ آئے حیرتناک امر ہے، لیکن اس کا سبب وہی تھا جو ہمیں آج بھی عہد برطانیہ میں نظر آتا ہے اور غالباً ہر جگہ جہاں غیر ملکی حکومتیں قائم ہوئیں یہی صورت پیدا ہوئی ہوگی،

اول تو ابتدا میں مسلمانوں نے یہاں کوئی مستقل حکومت قائم نہیں کی، حملہ کیا اور لوٹ مار کر چلے گئے، لیکن جب بعد کو سلطنت قائم ہوئی بھی تو حالت یہ تھی کہ پے در پے حکمراں خاندان بدلتے گئے اور کسی نئی قائم ہونے والی حکومت کو اپنی پیشرو حکومت سے کوئی ہمدردی نہ پیدا ہو سکی، چنانچہ ۱۰۰۱ء (حملۂ محمود غزنوی) کے بعد ۱۵۲۶ء تک جب بابر نے لودیوں کو شکست دے کر سلطنت مغلیہ کی بنیاد قائم کی، پورے سات خاندان (غزنوی، غوری، غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی) علحدہ علحدہ یہاں حکمرانی کر چکے تھے اور سب کے سب غیر ملکی تھے، پھر ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت جبکہ جم کر کسی ایک خاندان کو حکومت قائم کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور ہر خاندان نے اپنے آپ کو فاتح و برتر سمجھ کر ملک کے لوگوں اور ان کے اوضاع و اطوار معیشت و معاشرت سے علحدہ رہنا ہی مناسب سمجھا ہو، زبان میں کیا تغیر پیدا ہو سکتا تھا، البتہ جب عہد مغلیہ شروع ہوا تو سب سے پہلے اکبر نے اس الگ تھلگ رہنے کی بدعت کو توڑا لیکن حکومت کی زبان بدستور فارسی ہی رہی اور ایسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس وقت تک اُردو نے اپنی کوئی جداگانہ حیثیت قائم ہی نہ کی تھی کہ وہ اس کی جگہ لے لیتی، انگریزی حکومت پر نگاہ ڈالیے تو وہاں بھی آپ کو یہی بات نظر آئے گی، وہی اہل ملک سے بیگانہ وار زندگی بسر کرنا، اپنے آپ کو بلند و برتر جان کر ہندوستانیوں سے اختلاط پیدا کرنے کو معیوب سمجھنا اپنی وضع و قطع کو بالکل علحدہ رکھنا اور ہمیشہ اپنی ہی زبان میں لکھنا پڑھنا آج بھی ہمیں نظر آتا ہے، الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت (دہلی) تو اس عصبیت یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے کوئی خدمت زبان کی نہ کر سکی، لیکن اطراف میں چونکہ حالات مختلف تھے اس لیے وہاں ہم کو یہ بات نظر نہیں آتی،

تاریخ ہندوستان کے مطالعہ سے واضح ہے کہ نقل و حرکت کے ذرائع وسیع و عام نہ ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت دور دراز

صوبوں کو بھی اپنے اقتدار میں نہ رکھ سکی اور رفتہ رفتہ وہاں مستقل حکومتیں بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات میں قائم ہو گئیں لیکن زبان کا جہاں تک تعلق ہے دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۱)

---

۱ (بنگال) یہ صوبہ محمد غوری کے زمانہ (۱۱۹۶ء) میں فتح ہو گیا تھا لیکن چونکہ مرکزی حکومت سے بہت دور واقع تھا اسلئے غلاموں کے زمانہ میں عہد بلبن یہاں کے حاکم طغرل بیگ نے بغاوت کی اور خود مختار ہو گیا، بلبن نے اسکو شکست دیکر اپنے لڑکے بغرا خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور اسکی اولاد نے عرصہ تک یہاں حکومت کی، عہد محمد شاہ تغلق میں بنگال بالکل خود مختار ہو گیا (۱۳۳۸ء) ہر چند بعد کو فیروز تغلق نے پھر اسکے فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا اسکے بعد سیدوں اور لودیوں کے زمانے میں کسی نے بنگال کی طرف توجہ نہ کی، بعد کو بابر نے بھی حملہ کیا لیکن مصالحت ہو گئی، اسکے بعد شیر شاہ نے یہاں کی حکومت کو اپنے اختیار میں لے لیا اور اکبر نے ۱۵۷۶ء میں پھر اس کو مسخر کر لیا، اس کے بعد سے یہ صوبہ برابر مغلیہ سلطنت کا ایک جزو رہا لیکن جب ۱۶۹۶ء میں ہندو زمینداروں نے بلوہ کیا تو مغلی صوبیدار نے انگریز، فرانسیسی اور ڈچ تاجروں کو اجازت دیدی کہ اپنی نوآبادیاں محفوظ رکھنے کے لیے انکے گرد فصیلیں اور مورچے بنالیں، چنانچہ انگریزوں نے قلعہ فورٹ ولیم تیار کر لیا ۱۷۴۲ء میں جب مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کیا تو انگریزوں نے نواب علی وردی خاں کی اجازت سے اپنی حفاظت کیلیے قلعہ کے گرد خندق کھود ڈالی اسکے بعد جنگ پلاسی میں بالکل انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔

(جونپور) اس شہر کی بنیاد فیروز تغلق نے ۱۳۶۰ء میں قائم کی ۱۳۹۴ء میں محمود تغلق نے ایک خواجہ سرا کو مشرقی حصہ کا انتظام کرنے کیلیے یہاں روانہ کیا بعد اسکو خواجہ جہاں کا خطاب ملا، اس نے رفتہ رفتہ قنوج، کڑا، بہار وغیرہ اور ترہٹ وغیرہ فتح کر کے اڑیسہ اور لکھنوتی کے راجاؤں سے خراج وصول کیا اور تیمور کے حملے کے بعد خود مختار ہو گیا، اسکے بعد اسکا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا (۱۴۰۱ء تا ۱۴۴۰ء) اور اسکے عہد میں سلطنت جونپور کو بڑی ترقی حاصل ہوئی، یہاں کا آخری خود مختار بادشاہ حسین شرقی تھا ۱۴۷۶ء میں بہلول لودی نے اسکو شکست دیکر اپنے بیٹے باربک شاہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا لیکن بعد کو سکندر لودی نے باربک شاہ کو نکال کر پھر سلطنت دہلی کی سرحد میں شامل کر لیا۔ پندرھویں صدی میں جونپور علوم و فنون کا مرکز تھا، شاہ حسین شرقی خود بھی بڑا فاضل شخص تھا اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا، وہ شعر بھی کہتا تھا اور موسیقی کا ازحد دلدادہ تھا

(مالوہ) سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے ۱۳۱۰ء میں اس کو فتح کیا اور دہلی کا ماتحت صوبہ بنایا، تیمور کے حملے کے بعد دھار کا جاگیردار دلاور خاں خود مختار بن گیا اور اُس نے مالوہ کو بھی اپنے قلمرو میں شامل کر لیا، اسکے بیٹے ہوشنگ نے دار الخلافت اجین سے مانڈو کر دیا ۱۴۳۵ء میں محمود خلجی نے اس خاندان کا استیصال کر کے قبضہ کر لیا ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے مالوہ فتح کر کے گجرات میں شامل کر لیا، جب اکبر نے دکن پر فوج کشی کی تو اسی سلسلہ میں مالوہ اور خاندیس کو بھی مسخر کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا (۱۶۰۱ء)

(گجرات) سب سے پہلے ۱۱۹۶ء میں قطب الدین ایبک نے گجرات پر فوج کشی کی اور اس وقت سے یہ صوبہ برابر دہلی کا ماتحت رہا لیکن تیموری حملہ کے وقت یہاں کا حاکم ظفر خاں خود مختار ہو گیا اور مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا، اسکا پوتا احمد شاہ (۱۴۱۱ء-۱۴۴۱ء) بڑا زبردست شخص تھا اسلیے مالوہ اور اسیر گڑھ وغیرہ قرب و جوار کے ممالک کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو بہت وسیع کر لیا اور شہر احمد آباد بسایا، اس خاندان میں سلطان محمود خاص شہرت کا مالک ہوا (۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء) گجرات کا آخری حکمراں بہادر شاہ (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۷ء) تھا جس نے چتوڑ کا قلعہ سر کیا، آخر اکبر نے ۱۵۷۳ء میں گجرات فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

مسلمانوں کے حملہ سے قبل دکن میں کئی ہندو ریاستیں پائی جاتی تھیں، مشرق میں جسے تلنگانہ کہتے تھے اندھرا خاندان حکمراں تھا اور ورنگل اس کا پایۂ تخت تھا، مہاراشٹر میں یادو راجپوت حکمراں تھے اور کرناٹک میں بلال راجپوت کی حکومت تھی، دوار سمدر ان کا صدر مقام تھا، ان کے علاوہ اور بھی کئی ریاستیں تھیں،

سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور دیوگیر کے راجہ رام دیو کو مغلوب کر کے بڑی کثیر دولت اپنے ساتھ لے گیا، اس کے بعد اس کے سپہ سالار کافور نے دکن پر فوج کشی کی اور ورنگل، دوار سمدر اور مدورا وغیرہ فتح کر کے ان سب سے خراج وصول کیا، ۱۳۱۸ء میں دیوگیر کا راجہ باغی ہو گیا تو قطب الدین مبارک شاہ نے پھر اس کو مغلوب کر کے سخت سزا دی،

جب سلطنت دہلی کمزور ہوئی تو یہاں سے خراج جانا بند ہو گیا، لیکن محمد تغلق نے جو ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا تھا دو سال کے اندر پھر سارے دکن کو مطیع کر لیا، ۱۳۴۴ء کے بعد مرکزی حکومت میں بدنظمی شروع ہوئی تو ایک طرف ۱۳۳۶ء میں ریاست وجیانگر قائم ہوئی اور دوسری طرف حسن کانگو افغان سردار خود مختار بادشاہ بن بیٹھا، اور گلبرگہ کو اپنا صدر مقام بنایا، اس نے اپنا لقب بہمنی اسلیے اختیار کیا کہ وہ اپنا سلسلۂ نسب فارس کے بادشاہ بہمن سے ملاتا تھا، فرشتہ نے یہ بالکل غلط لکھا ہے کہ وہ کانگو نامی برہمن کے یہاں نوکر تھا اور پھر اس نے بادشاہ ہو کر کانگو کے احسانات کے اعتراف میں بہمنی لقب اختیار کیا، قلعۂ گلبرگہ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں اس کا نام "حسن کانگو بہمن شاہ" درج ہے

اس وقت دکن میں وجیانگر اور بہمنی دو حکومتیں برابر کی تھیں ایک ہندوؤں کی دوسری مسلمانوں کی، لیکن وجیانگر نے آہستہ آہستہ بڑی ترقی کر لی اور دونوں ریاستوں میں عرصہ تک جنگ جاری رہی، محمد شاہ سوم (۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۲ء) کے زمانے میں بہمنی خاندان کا زوال شروع ہو گیا لیکن اس کے وزیر محمود گاواں نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے سنبھالے رکھا جب سازش کر کے اس کو قتل کرا دیا گیا تو سلطنت بھی ختم ہو گئی اور بہمنی سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہو گئی،

(۱) بیدر میں بریدشاہی ریاست (۲) بیجاپور میں عادل شاہی

(۳) احمد نگر میں نظام شاہی (۴) گولکنڈہ میں قطب شاہی

(۵) برار میں عماد شاہی

ان میں سے عماد شاہی حکومت (برار) کی ۱۵۷۴ء میں احمد نگر میں شامل ہو گئی اور احمد نگر کی حکومت پر چاند سلطانہ کی انتہائی کوشش کے باوجود اکبر نے قبضہ کر لیا، اسی طرح بیدر کی ریاست کو بیجاپور کے فرمانرواؤں نے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تھا، اور اب گویا صرف دو قابل ذکر حکومتیں دکن میں رہ گئی تھیں ایک بیجاپور کی عادل شاہی اور دوسری گولکنڈہ کی قطب شاہی جن کو اورنگزیب نے آکر درہم برہم کیا قطب شاہی حکومت ۱۵۱۲ء سے ۱۶۸۷ء تک قائم رہی اور عادل شاہی حکومت ۱۴۸۹ء سے ۱۶۸۶ء تک گویا ایک سال

ہنسے دیکھے دونوں کو اورنگ زیب نے ختم کر دیا۔ دونوں حکومتیں علم و فضل کی بہت قدر داں تھیں اور فنون کی ترقی میں کافی حصہ لیتی تھیں عادل شاہی حکومت کا پانچواں فرمانروا (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) ابراہیم عادل شاہ ثانی چونکہ نو سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور تمام انتظام دکنی امرا کے ہاتھ میں تھا اس لیے اس کی فطرت بہت کچھ ہندوستانی رہی اور موسیقی کا اتنا شوق اس کو ہوا کہ تمام اکناف ہند سے ہزاروں کی تعداد میں گویے بیجاپور میں جمع کر لیے اس نے بیجاپور کے قریب نو رسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا اور نورس نامہ ایک کتاب موسیقی میں تصنیف کی جس کا مقدمہ سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے، یہ خود گیت بھی تصنیف کرتا تھا اور گاتا بھی تھا، چونکہ اس کو ہندی موسیقی سے عشق تھا اس لیے لامحالہ اس کے گیت میں فارسی الفاظ کے ساتھ بہت کچھ آمیزش ہندوستانی دکنی الفاظ کی ہوتی ہوگی اور رفتہ رفتہ یہی گیت فارسی بحروں میں آ کر اردو کی اولین شاعری قرار پائے ہوں گے،

بالکل اسی کا ہمعصر سلطان محمد قلی (قطب شاہی حکومت کا پانچواں فرمانروا) گولکنڈہ میں حکمران تھا (۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۲ء) یہ بھی بڑا رنگین مزاج اور علم و فضل کا قدرداں تھا، اس نے ایک عورت بھاگ متی کے عشق میں گولکنڈہ سے قریب ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا لیکن جب بھاگ متی مر گئی تو اس کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا جو دولت آصفیہ کا پایۂ تخت ہے، یہ خود بھی اچھا شاعر تھا اور فارسی کے علاوہ ملکی زبان میں بھی شعر کہتا تھا افسوس ہے کہ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کے گیت یا اشعار کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے اور اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زبان کس قسم کی تھی، لیکن محمد قلی کا ضخیم کلیات جو تمام اصناف سخن پر حاوی ہے موجود ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت عہد اکبری میں صرف فارسی و بھاشا کی آمیزش سے زیادہ زبان نے کوئی شکل اختیار نہ کی تھی ٹھیک اسی وقت یعنی اب سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل دکن میں سلطان محمد قلی اس نوزائیدہ زبان میں شاعری بھی کرتا تھا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا　　　کہ اس بن نہیں ہمیں یک دل قرارا

پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر　　　تو بشا ہاں اپر مجھ کلس کر بنایا

خورشید کہ اُپر سے ابرو ہلال عید　　　اس ابرواں کو سجدہ کیا ہے وصال عید

موناں خوشیاں کرو ہے آج دن مولود کا　　　مرتضےٰ بارہ اماماں عید ہے معبود کا

اس کے بعد تین فرمانروا اور ہوئے، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، اور ابوالحسن تانا شاہ اور یہ تینوں شاعر تھے چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

پیا سانولا من ہمارا بھلایا نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

ساقیا آ شراب ناب کہاں چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کا نمونہ یہ ہے:۔

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب دیکھتا ہوں نور ہے نا مجھ میں تاب

اور تانا شاہ کا یہ شعر تو میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے

کس در کہوں کاں جاؤں مجھ دل پہ بھل بکھراٹے اک بات کئے ہونگے سجن یاں جی ہی بارہ باٹے

چونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں جگہ کے فرمانرواؤں کو شاعری کا ذوق تھا اس لئے یہاں اور شاعر بھی پیدا ہوئے، بیجاپور کے بعض شعراء کا ذکر بحوالہ بساطین السلاطین، تذکرۂ گل رعنا میں کیا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں مولانا نصرتی، ملا ہاشمی اور میرزان مرثیہ گو کا نام لیا جاتا ہے، نصرتی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں

نصرتی محمد عادل شاہ کے اخیر زمانہ یعنی سنہ ۱۰۶۶ء تک زندہ رہا، اس کی تصانیف میں ایک مثنوی گلشن عشق ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کے واقعۂ محبت کو اردو میں نظم کیا ہے، دوسری علی نامہ ہے، اس میں علی عادل شاہ کے فتوحات بیان کیے ہیں ایک مجموعۂ قصائد اور ایک دیوان غزلوں کا ہے،

مصنف نے تذکرۂ گل رعنا نے لکھا ہے کہ:۔

"ایک پرانی بیاض میری نظر سے گزری ہے جس میں نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل کیا ہے تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ ۱۰۸۳ ہجری اس میں درج ہے اور اکبرآباد میں لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتی کا کلام انھیں کی زندگی میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلیں بیجاپور سے اکبرآباد پہونچ گئیں"

ہاشمی اندھے پیدا ہوئے تھے مگر بلا کے ذہین تھے، انھوں نے یوسف زلیخا کے نام سے ایک مثنوی دکنی زبان میں لکھی ہے شمس اللہ صاحب قادری کا بیان ہے کہ ان کا ایک دیوان بھی تھا لیکن زیادہ تر ریختی میں، ہاشمی نے سنہ ۱۱۰۹ ہجری میں انتقال کیا،

ان کے علاوہ بیجاپور کے اور شاعروں کا بھی نام لیا جاتا ہے جن میں ایک شاہ ملک ہیں جنھوں نے بعض مسائل مذہبی

دکنی زبان میں نظم کیے اور دوسرے شاہ امین جو ایک صوفی شخص تھے اور تصوف ہی کے متعلق اشعار کہتے تھے،

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت میں علاوہ اُن فرمانرواؤں کے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے ایک شاعر ابن نشاطی تھے، یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھے، انھوں نے ایک مثنوی پھول بن ۱۰۶۶ھ لکھی، اس دربار کا دوسرا شاعر غواصی تھا، اس نے ایک مثنوی سیف الملوک کے نام سے رکھی تانا شاہ کے زمانے میں ایک شاعر طبعی تخلص کرتے تھے اور فائز و شاہی بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں لیکن ان سب نے مثنوی کی طرف زیادہ توجہ کی اور غزل کی طرف صحیح معنی میں توجہ اس وقت ہوئی جب اورنگ زیب نے عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں حکومتوں کا خاتمہ کرکے اورنگ آباد کو اپنا مرکز قرار دیا،

چونکہ مغلیہ سلطنت کی قدر دانیاں تمام اکناف ہند میں مشہور تھیں اس لیے دکن کے وہ تمام شاعر جو یہاں کی حکومتوں سے وابستہ تھے مغلیہ تسلط کے بعد اورنگ آباد پہونچے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی قدر دانی کی گئی، اس دور کے شعرا میں میر عبدالولی عزلت، مرزا داؤد، میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحی خاں صارم، عارف الدین خاں عاجز، میر اولاد محمد ذکا، قاضی محمود بحری، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، محمد امین امین وجدی اور شمس الدین ولی ہیں جن کو آزاد نے آب حیات میں غزل کا ابوالآباء ظاہر کیا ہے

اس دور کے تمام شاعروں میں جسے شعرائے متقدمین کا دور ثانی کہنا چاہیے ولی سے زیادہ شہرت کسی نے حاصل نہیں کی، اور اس کے بعد سراج، داؤد، عزلت اور عاجز کا نام لیا جاتا ہے، فقیر اللہ آزاد کو بھی میر نے اپنے تذکرہ میں اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا،

ان شعراء میں سب سے پہلے ولی کا انتقال ہوا (۱۱۵۵ھ)، اس کے بعد داؤد کا (۱۱۶۸ھ) پھر سراج کا (۱۱۷۷ھ) اور پھر عاجز کا (۱۱۷۰ھ) عزلت نے سب کے بعد ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی، ولی کا سنہ پیدائش ۱۰۷۹ھ بتایا جاتا ہے اور ۷۶ سال کی عمر پاکر ۱۱۵۵ھ میں انتقال کیا، اس لیے سلطان عبداللہ قلی (قطب شاہیوں کے آٹھویں فرمانروا) کے زمانہ میں پیدا ہوے ہوں گے اور اورنگ زیب سے لے کر محمد شاہ تک کا زمانہ دیکھا ہوگا، ان کا نام ولی اللہ، لقب شمس الدین اور تخلص ولی تھا، اورنگ آباد کے رہنے والے تھے لیکن چونکہ ان کی تعلیم و تربیت گجرات میں ہوئی اور وہیں بیعت بھی کی اس لیے بعض نے ان کو گجرات کا باشندہ سمجھ لیا، ولی دو مرتبہ دہلی گئے پہلی بار اورنگ زیب کے عہد یعنی (۱۷۰۰ء) میں اور اسی وقت شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جو نقشبندیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے اور شاعر بھی تھے، تذکروں میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ان کے شعر سُن کر کہا کہ "مضامین فارسی کیوں نہیں ریختہ میں استعمال کرتے" دوسرا سفر دہلی کا انھوں نے ۱۷۲۲ء میں بعہد محمد شاہ کیا اور اپنا کلام ریختہ بھی ساتھ لیگئے جسکی وہاں بہت شہرت ہوئی اس کے دلی سے پھر اورنگ آباد میں آئے اور یہیں انتقال کیا،

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائی اور آخری رنگ میں بہت فرق پایا جاتا ہے اول اول ان کی غزل کی زبان یہ تھی

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کرنا کیا — اگر تو نا اچھے مجھ کن تو پرسنسار کیا کرنا

دکنّی زبان اور محاورہ غالب ہے

اس کے بعد غالباً شاہ سعداللہ سے ملنے کے بعد انھوں نے فارسی ترکیبوں کا بھی استعمال شروع کیا مثلاً

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

خوبیٔ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں — بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں

لیکن دوبارہ دلی سے واپس جانے کے بعد ان کے کلام میں بہت زیادہ سلاست پیدا ہوگئی اور زبان اتنی بدل گئی کہ اسوقت بھی اس میں کسی حذف و اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی مثلاً:-

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی — کہ دل سوتاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے

ذیل کے اشعار سے ان کی شاعری کے مختلف ادوار کا حال واضح ہوسکتا ہے:-

(۱) جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خوبی — تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

---

(۲) مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے — چمنِ حسنِ پری رو کا تماشائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

---

(۳) زندگی جامِ عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں

یوں تو سراج اور داؤد وغیرہ سب ہمعصر ولی ہی کے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ولی کا تتبع کیا اور زبان و خیال کے لحاظ سے ولی کے نقش قدم پر چلے، ذیل کے اشعار سراج کے ملاحظہ ہوں

شکر خدا ان دنوں تیر اکرم ہونے لگا　　شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

مدت سے گم ہوا دل بیگانہ اے سراج　　شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جاناں　　کہاں سراج کہاں آفتاب عالمتاب

سراج[1] اورنگ آبادی کی مشہور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں　　کہ شراب حسرت و آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

مرزا داؤد[2] کا رنگ سخن یہ تھا۔

مرا احوال چشم یار سے پوچھ　　حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

اے زاہداں اٹھاؤ جبیں کو زمین سے　　جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے (کہاں)

---

[1] سراج الدین سراج اورنگ آباد کے سیدوں میں تھے وہیں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما ہوا بعض اہل تذکرہ نے انھیں سید حمزہ دکنی کا شاگرد بتایا ہے عنفوان شباب میں صوفیانہ مستی و خود رفتگی میں بسر ہوا، اس کے بعد سید عبد الرحمن چشتی سے بیعت کی، ان کے پیر بھائی عبد الرسول خاں نے انکا دیوان ... ہ شعروں کا مرتب کیا تھا شعرائے اورنگ آباد میں ان کا خاص مرتبہ تھا اور فارسی کے اشعار بھی اچھے کہتے تھے، ۱۱۷۷ھ ہجری میں انتقال کیا

[2] مرزا داؤد، داؤد بھی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ آباد علم و فضل کا مرکز تھا، اور شعراء کی مجلسیں ہر ہفتہ گرم رہا کرتی تھیں، اسی صحبت نے انھیں بھی شعر کی طرف متوجہ کیا، اور ولی کا تتبع انھوں نے بھی اختیار کیا ۱۱۶۶ھ میں انتقال ہوا،

عزلت[۱] ۱۱۶۴ھ میں دلی آئے تھے اور میر تقی میر سے بھی ملے تھے یہ بھی ولی کے متبع تھے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا ——— سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

سدائے گل کہاں، سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے ——— گئی ہیں بلبلیں کیدھر، جلا کر آشیاں اپنا

عارف الدین عاجز کے والد عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے، عاجز کمسنی میں یتیم ہوگئے تھے لیکن نواب لشکر خاں (رکن الدولہ نصیر جنگ) نے ان کی پرورش کی اور بعد کو رسالہ کی بخشی گری کا منصب ان کو عطا کیا، اورنگ آباد پہنچکر شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا، فارسی، اُردو دُونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے ۱۱۶۸ھ میں انتقال ہوا، کلام کا رنگ یہی ہے جیسے ولی اور سراج دونوں کے کلام سے کوئی نسبت نہیں

دیکھ دامنگیر محشر میں ترے ہوئیں گے ہم ——— خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ لے قاتل چھڑا

ہمارے اشک خونیں یاد ہیں گر تجکے بہ بکر ——— نگہ کو رشتۂ تسبیح یا قوتی بناتا ہے

ولی کے دہلی پہونچنے کے بعد وہاں کے لوگوں میں خاص تحریک غزل گوئی کی پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے شاہ مبارک آبرو کا نام سامنے آتا ہے، شاہ مبارک لقب تھا اور نجم الدین نام، محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے اور عنفوان شباب میں دہلی آگئے تھے اور آخر عمر تک یہیں رہے، اس زمانے میں سراج الدین علی خاں آرزو دہلی کے مشہور فارسی گو شاعر تھے اور شاید دو چار شعر اردو کے بھی کہے تھے یہ خان آرزو کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور میرزا مظہر سے اکثر ان کی چوٹیں چلتی رہتی تھیں جنکا ذکر آب حیات میں کیا گیا ہے، شاہ مبارک کے کلام اور ولی دکنی کے کلام میں زیادہ فرق نہیں ہے البتہ ایہام و تشبیہ ان کے یہاں زیادہ ہے لیکن کیفیت و جذبہ بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے

---

[۱] نام میر عبدالولی تھا اور رشید سعد اللہ ان کے باپ کا نام تھا جو سلون ضلع رائے بریلی (اودھ) کے رہنے والے تھے، سید سعد اللہ ایک فاضل شخص تھے سفر حج سے واپس ہوتے ہوئے سورت میں رہ پڑے تھے، یہیں ان کے بیٹے کا نشو و نما ہوا اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی، فارسی، بھاشا اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور موسیقی و نقاشی کا بھی بہت شوق تھا، جس وقت ۱۱۶۴ھ میں دہلی پہنچے تو خان آرزو اور میر دونوں سے ملے، یہاں سے مرشد آباد گئے اور نواب علی وردی خان نے ان کی بہت عزت کی اس کے بعد اورنگ آباد چلے گئے اور وہیں ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

نکلے تم آ، صبا کی طرح جب چمن میں بھول — گلشن کے دیکھ تجھ کو گئے ہاتھ پاؤں پھول

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد — روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

قول آرزو کا تھا کہ نجاؤں گا اس گلی — ہو کر کے بیقرار دیکھو آج پھر گیا

پھرتے تھے دشت دشت دوانہ کدھر گئے — وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

انھیں کے ہمعصر شیخ شرف الدین مضمون تھے، صوفی آدمی تھے اور زینت المساجد میں رہا کرتے، یہ بھی خان آرزو کے شاگرد تھے، ان کے بعض بعض اشعار میں تغزل کی وہ کیفیت پیدا ہو چلی تھی جس کی تکمیل بعد کو میر اور درد نے کی مثلاً

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا — صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

مرا پیغام وصل اے قاصدا — کہیو سب سے اُسے جُدا کرکے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے — کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

سودا نے ان کا زمانہ دیکھا تھا، چنانچہ مضمون کے انتقال کے بعد سودا نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے

بنا ئیں اُٹھ گئیں یار و غزل کے خوب کہنے کی — گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

ایک اور شاعر شاکر ناجی[1] تھے جنھوں نے نادر شاہی لوٹ کا تماشہ دہلی میں دیکھا تھا، ان کے اشعار میں کوئی خاص کیفیت تغزل کی نہیں پائی جاتی، طبیعت ہزل کی طرف زیادہ مائل تھی، زبان بھی چنداں صاف نہیں ہے اور دلی کے وقت کے الفاظ بھی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] ان کا نام میر محمد تھا اور تخلص ناجی، شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے اور عمدۃ الملک امیر خاں محمد شاہی کے یہاں باورچی خانہ کے داروغہ تھے بہت شوخ مزاج اور تیز طبع آدمی تھے، بات بات میں ہر شخص سے اُلجھ پڑنا معمولی بات تھی، عنفوان شباب میں ان کا انتقال ہوا، رنگ سخن یہ تھا

نہ سیر باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں — یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

آج تو ناجی سجن سے کرلے اپنا عرض حال — مرنے جینے کا نہ کر دسواس ہونا ہو سو ہو

مصطفیٰ خاں یکرنگ بھی اسی عہد کے کہنہ مشق شاعر تھے اور میرزا مظہر سے مشورہ لیتے تھے چنانچہ ایک شعر میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

بجائے (سے) کے (سیتی) اور سجن وغیرہ کے الفاظ دکنی شعرا کی طرح انھوں نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن بعض بعض اشعار بے انتہا صاف ہیں مثلاً ؎

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے،
میرا صبر و قرار جاتا ہے،

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

سنتا ہی نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجھ کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن
جب سے وہ تیرا دوستدار ہوا

میر محمد حسین کلیم بھی اسی عہد کے مشہور شاعر تھے جو بقول میر بیدل کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور اسی لئے زیادہ قبولیت حاصل نہ کر سکے اس عہد کے نہایت مشہور شاعر شاہ ظہور الدین حاتم تھے، پہلے رمز تخلص کرتے تھے بعد کو حاتم ہو گئے ان کا دیوان قدیم نادر شاہی حملہ کے وقت ضایع ہو گیا اس لیے بعد کو ایک اور مجموعہ دیوان زادہ کے نام سے مرتب کیا، اس کے دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور بہت سے قدیم الفاظ اور محاورہ جو دکنی شعرا اور ان کے تبعین کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے ترک تو خیر کیا کیے البتہ ان کے ترک کی طرف لوگوں کو متوجہ ضرور کیا

---

[1] یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے اور میر تقی میر کے عزیزوں میں تھے شاید بہنوئی تھے، نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی، نمونۂ کلام اردو یہ ہے ؎

لگتی ہے اب تو قلقل و مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز اے کلیم
آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

غرور حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

آزاد نے ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۱ھ لکھا ہے۔ وفات ۱۲۰۷ھ یا بقول مصحفی ۱۱۹۶ھ میں ہوئی ۸۶ سال کی طویل عمر پائی زبان کی صفائی ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک　　　تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

اول اول ان کے کلام میں ایہام زیادہ پایا جاتا تھا لیکن بعد کو ترک کر دیا۔

لیکن میرے نزدیک اس دور میں بہ لحاظ تغزل جو مرتبہ اشرف علی خاں فغاں کا تھا وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا، یہ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے اور علی قلی ندیم کے شاگرد تھے، شعر و سخن کے علاوہ بذلہ سنجی میں بھی ماہر تھے اور اسی لیے بادشاہ نے انھیں ظریف الملک کا خطاب دیا تھا، یہ دہلی کی شورش انگیز حالت سے گھبرا کر پہلے اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد گئے اور پھر نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد آئے، نواب نے ان کی بڑی قدر کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر یہاں سے عظیم آباد چلے گئے جہاں راجہ شتاب رائے شاعروں کا بڑا مشہور قدرشناس تھا اور ۱۱۸۶ھ میں یہیں انتقال کیا۔

ان کے کلام میں سوز و گداز کی خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو ان کے دوسرے ہمعصر شعراء کے یہاں بہت کم ہے، مثلاً چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں　　　لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
باور تجھے اگر نہیں آتا تو دیکھ لے　　　آنسو ڈھلک گئے کہیں، لخت جگر کہیں
ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں　　　ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

کیا حال پوچھتے ہو فغاں کا سنا نہیں　　　خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

مجھ سے جو پوچھیے تو ہجراں تمکر ہے　　　یوں بھی گزر گئی مری دوں بھی گزر گئی

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو اں فغاں　　　الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اس دور میں خان آرزو اور میرزا مظہر دو شاعر فارسی کے ایسے ہوئے ہیں جن کا ذکر اردو شاعروں کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے خیر خان آرزو کو

تو اس زمرہ میں شامل کرنا درست نہیں کیونکہ انھوں نے صرف چند اشعار اُردو کے کہے ہیں لیکن میرزا مظہر کو یقیناً اس دور کے نہ صرف بہترین بلکہ مصلح شعرائے اُردو کی صف میں جگہ دینی چاہیے۔ یہ اورنگ زیبؔ کے بالکل آخری زمانے میں پیدا ہوئے اور پچھ فرمانروا عہد مغلیہ کے دیکھ کر عالمگیر ثانی کے زمانے میں انتقال کر گئے

نام شمس الدین تھا اور تخلص مظہر سنہ ولادت ۱۱۱۱ھ ہے ان کے والد کا نام مرزا جان تھا، اسی لیے جب عالمگیر کو ان کی ولادت کی خبر ہوئی تو اس نے "جانِ جاں" نام رکھا۔

میرزا مظہر فاضل شخص تھے اور نقشبندی خاندان سے تعلق درویشی رکھتے تھے محمد شاہ اور نواب آصف جاہ نے بہت کچھ ان کی مالی مدد کرنا چاہی لیکن کبھی قبول نہ کی، فارسی کلام ان کا جس پایہ کا ہے وہ بقول میر سلیم وکلیم سے ٹکر کھاتا ہے لیکن چونکہ ان کا اُردو کلام نایاب ہے اس لیے تذکرہ نویسوں نے اردو شعراء کے سلسلہ میں بہت کم ان کا ذکر کیا ہے دراں حالیکہ حسب بیان مولوی قدرت اللہ صدیقی سب سے پہلے یہی شاعر ہیں جنھوں نے ایہام گوئی کو ترک کرکے شاہجہاں آباد کی اُردوئے معلیٰ میں ریختہ کو رواج دیا، ساتویں محرم ۱۱۹۵ھ کی رات میں ایک شخص نے قرابین سے حملہ کیا اور ۱۰ محرم کو انتقال کیا، صاحب تذکرۂ گلِ رعنا نے ان کا اردو کلام بہت کوشش سے فراہم کرکے ۳۰ صفحات میں درج کیا ہے، ہم منتخب اشعار پیش کرتے ہیں جن سے اُن کے رنگ تغزل کی پاکیزگی واضح ہوسکتی ہے۔

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا ۔۔۔ نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزہ سے زندگی کرتے ۔۔۔ اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا ۔۔۔ لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس ۔۔۔ کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم ۔۔۔ مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے ۔۔۔ ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جبتک بہار آوے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو ۔۔۔ یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

تذکرہ گلِ رعنا نے میرزا مظہر کا شمار طبقۂ متوسطین کے دورِ اول میں کیا ہے، دراں حالیکہ وہ شاعر جو عہدِ اورنگ زیب میں پیدا ہوا ہو اور ولی دکنی و حاتم کا ہمعصر رہا ہو اس کا شعرائے متقدمین میں شمار ہونا چاہیے۔

میرے نزدیک اردو شاعری تاریخی حیثیت سے تین طبقوں میں منقسم ہے اور ہر طبقہ کے دو دو دور ہوئے ہیں طبقۂ متقدمین طبقۂ متوسطین، طبقۂ آخرین، اس وقت تک ہم نے طبقۂ متقدمین کا ذکر کیا ہے اور دو دور حسبِ تفصیل ذیل ہونے چاہییے۔

دورِ اول:۔ شاہانِ قطبیہ و شاہانِ عادل شاہی اور اس زمانہ کے دوسرے شعرا جو صرف گولکنڈہ تک پائے جاتے تھے جن کو دہلی جانا نصیب نہیں ہوا

دورِ دوم:۔ وہ شعرا جو اورنگ آباد میں بزمانۂ اورنگ زیب پائے جاتے تھے ---- خواہ وہ دہلی گئے ہوں یا نہ گئے ہوں اس لحاظ سے دورِ اول کے خاص خاص شعرا محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، نصرتی، ہاشمی، شاطی غواصی، طبعی، نوری، فائز وشاہی تھے اور دورِ ثانی میں ولی دکنی، سراج، داؤد، عزلت، عاجز، فقیر اللہ آزاد، آبرو، مضمون یکرنگ، کلیم، حاتم، فغاں اور مرزا مظہر تھے

دہلی آنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے شعرا میں بہ لحاظ پیدائش سب سے پہلے ولی دکنی کا نمبر ہے، کیونکہ یہ اورنگ زیب کے ابتدائی عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے اور محمد شاہی حکومت کے زمانۂ شباب میں انتقال کیا، گویا انھوں نے سلطنتِ مغلیہ کی ۵ حکومتوں کو دیکھا

ان کے بعد شاہ حاتم کا نمبر ہے جو اورنگ زیب کے بالکل آخر زمانے میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ تک زندہ رہے گویا انھوں نے آٹھ فرمانرواؤں کا زمانہ دیکھا، پھر مرزا مظہر ہیں جو اورنگ زیب کے انتقال کے آٹھ سال قبل پیدا ہوئے اور عالمگیر ثانی کے زمانے تک زندہ رہے یعنی انھوں نے بھی سات بادشاہ عہدِ مغلیہ کے دیکھے، سراج، داؤد، اور عاجز وغیرہ کا دہلی جانا پایا نہیں جاتا، عزلت البتہ احمد شاہ کے زمانہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں انھوں نے وفات پائی۔

اس لحاظ سے عہدِ مغلیہ میں محمد شاہ کا زمانہ خاص مرکزی دور ہے کیونکہ اس نے ۳۰ سال تک حکومت کی اور متقدمین شعرا میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس بادشاہ کا زمانہ نہ دیکھا ہو بلکہ عہدِ وسطیٰ کے مشہور شعرا سودا، میر، درد اور سوز بھی اسی کے عہد میں پیدا ہوئے اس لیے یوں بھی اصولاً محمد شاہ کے عہد تک کے شعرا کو علیحدہ کر دینا چاہیے، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کی حکومتیں صرف بارہ سال تک رہیں اور پھر شاہ عالم کا عہد آیا جو ہر چند نہایت ہی اضطراب کا وقت تھا لیکن اس نے بھی تقریباً ۵۰ سال تک حکومت کی اور یہ وہ زمانہ تھا جب میر و سودا، درد و سوز کی شاعری کا زور تھا اسی لیے ہم طبقۂ متقدمین کے دوسرے دور کو محمد شاہ کے عہد کے شعرا تک ختم سمجھتے ہیں۔

طبقۂ متوسطین کے دونوں دور اردو شاعری کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور اگر انھیں انتہائی عروج کا زمانہ قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

پہلے دور یعنی شاہ عالم کے زمانے میں سودا، میر، درد، سوز ایسے زبردست شاعر ہوئے کہ زمانہ پھر ان کا مثل پیدا کر سکا اور دوسرے دور یعنی بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مومن، غالب، ذوق اور مصحفی نے جو مرتبہ حاصل کیا وہ انھیں کا حصہ ہو کر رہ گیا۔

میرزا سودا کے والد مرزا محمد شفیع کابل سے ہندوستان آئے تھے لیکن میرزا سودا دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے اول اول سلیمان قلی خاں داؤد کے شاگرد ہوئے اور پھر شاہ حاتم کے۔ شاہ عالم بادشاہ بالکل ان کے ہمعصر تھے اور انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے بعد کو کسی بات پر خفا ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی اجڑ رہا تھا اور اودھ کی سلطنت عروج پر آ رہی تھی۔ آخر کار یہ بھی وطن سے گھبرا کر پہلے فرخ آباد پہنچے جہاں نواب احمد خاں غالب جنگ برسرِ حکومت تھے اور مہربان خاں رند ان کے دیوان شعرا کے بڑے قدردان تھے جب ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا تو فیض آباد آئے، یہ زمانہ نواب شجاع الدولہ کی حکومت کا تھا ان کی بڑی قدر ہوئی جب شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ حکمراں ہوئے تو پایۂ تخت لکھنؤ ہو گیا اور سودا بھی یہیں چلے آئے، ستر سال کی عمر تک پہونچ کر ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔

سلہ سودا اپنے قصائد و ہجویات کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اپنی ذہانت و ہمہ گیری کے لحاظ سے جواب نہ رکھتے تھے تغزل میں ان کے یہاں وہ سوز و گداز نہیں ہے جو میر، درد یا سوز کے یہاں پایا جاتا ہے، انھوں نے واردات عالم اور اعتبارات سے زیادہ کام لیا ہے ان کا کلیات تمام اصناف سخن سے بھرا ہوا ہے اور بہت عام چیز ہے۔ بعض مشہور اشعار ان کے یہ ہیں ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجیو کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ
تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

فکر معاش و عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

میر تقی میر کا اصلی وطن اکبرآباد ہے، لیکن اپنے والد میر عبداللہ کی وفات کے بعد عنفوان شباب میں دہلی چلے آئے اور خان آرزو کے مشورہ لینے لگے جو شاید ان کے عزیز بھی تھے، رفتہ رفتہ ان کی شاعری نے بہت شہرت حاصل کی لیکن جب شاہ عالم کے زمانے میں دلی اجڑی تو یہ بھی بقول آزاد ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ کی طرف چل دیے میرزا لطف نے ۱۱۹۶ھ تحریر کیا ہے اور عمر ۶۰ سال

اگر تاریخ اول صحیح مانی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ لکھنؤ میں ایک سال تک سودا اور میر کا اجتماع رہا لیکن تذکروں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، میرزا لطف میر صاحب کے ہمعصر ہیں اس لیے ان کا بیان صحیح ہونا چاہیے اور میر کا سودا کے انتقال کے دو سال بعد لکھنؤ پہنچنا درست معلوم ہوتا ہے ہر چند آب حیات کے ایک لطیفے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا اور میر دونوں کا اجتماع لکھنؤ میں پایا جاتا ہے لیکن آزاد لطائف و ظرائف کے بیان کرنے میں ہمیشہ تحقیق تاریخی سے ہٹ جاتے ہیں۔

جس وقت میر لکھنؤ پہنچے ہیں نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا، انھوں نے میر کی تنخواہ ۳۰۰ روپیہ ماہوار جاری کر دی جو آخیر عمر تک انھیں ملتی رہی ۱۲۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا[5]۔

سلہ ۵ میر صاحب کی غزل گوئی کے متعلق اظہار خیال بیکار ہے کیونکہ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ میر کا سا غزل گو نہ اس وقت تک پیدا ہوا اور نہ آگے اس کی توقع کی جاتی ہے میر صاحب کے کلام کا انتخاب متعدد لوگوں نے کیا ہے اور مضامین کی صورت میں تو خدا جانے کتنی باران کے رنگ تغزل پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود میر نے جو انتخاب اپنے کلام کا پیش کیا ہے وہ نہایت معمولی بلکہ بعض جگہ بہت پست ہے
ان کے چند مشہور شعر یہ ہیں

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر　　مذہب عشق اختیار کیا

اب تو جاتے ہیں بتکدہ سے میر　　پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

جائے ہے جی نجات کے غم میں　　ایسی جنت گئی، جہنم میں

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس صف کے تیسرے شاعر سوز تھے جن کا نام سید محمد میر تھا، پہلے یہ میر تخلص کرتے تھے لیکن بعد کو سوز اختیار کیا، آب حیات میں لکھا ہے کہ میر انھیں پا شاعر مانتے تھے لیکن میر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے، یہ میر ضیاء الدین کے بیٹے اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما ہوا، تقریباً ۱۱۷۰ھ میں جب عمر ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی یہ بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور سب سے پہلے فرخ آباد جا کر نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں زندگی بسر کی وہاں سے ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد چلے گئے وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں پھر لکھنؤ آئے اور آصف الدولہ کے استاد ہوئے انھوں نے ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا [1]

خواجہ میر درد، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور ۲۲ سال کے سن میں علائق دنیا کم کر کے اپنے والد کی خانقاہ میں سجادہ نشین ہو گئے اور آخر عمر تک یہیں رہے، صاحب! طرز شخص تھے اور فن موسیقی میں اچھی مہارت رکھتے تھے، ان کے یہاں مہینے میں دو بار محفل سماع منعقد ہوتی تھی اور کبھی کبھی شاہ عالم بادشاہ بھی اس میں شریک ہوتے تھے ۱۱۹۹ھ میں ۶۰ سال کی عمر پا کر وفات [2] پائی

---

[1] نومبر ۱۹۳۴ء کے نگار میں ایک مستقل مضمون ان کے حالات و کلام کے متعلق شایع ہو چکا ہے ان کے چند شعر بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص ہے عاشق کہیں ۔۔۔ عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب ۔۔۔ اے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے ۔۔۔ دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے ۔۔۔ مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

[2] درد کے بعض مشہور اشعار یہ ہیں:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا ۔۔۔ بس ہجوم یاس بھی گھبرا گیا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا ۔۔۔ پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک ۔۔۔ اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کیے ۔۔۔ جی میں ہے خوب رو لیے اب بیٹھ کر کہیں

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ۔۔۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا! اب لگ رہا ہے چل چلاؤ ۔۔۔ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

یہ تھا مختصر سا حال اُن چار شاعروں کا جن پر سرزمین دہلی ہمیشہ فخر کرے گی اور جن میں سے تین حضرات کی تشریف آوری کی عزت لکھنؤ نے بھی حاصل کی ۔ شعرائے دہلی میں سب سے پہلے اشرف علی فغاں بعہد نواب شجاع الدولہ فیض آباد گئے اس کے بعد سودا لکھنؤ آئے پھر سوز اور سب سے آخر میں میر تقی میر،

میر، سودا اور درد، دُنیائے شاعری میں اتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور ان کے کلام کے مطالعہ کا موقع ہر شخص کو اتنی بار مل چکا کہ اس کا انتخاب یا اقتباس کوئی معنی نہیں رکھتا تاہم فٹ نوٹ میں کہیں کہیں اس کمی کو بھی پورا کر دیا گیا ہے۔ سوز کو نسبتاً لوگوں نے کم یاد رکھا لیکن ان کے متعلق ہمارا ایک مفصل مضمون حال ہی میں مع اقتباس کلام کے نومبر ۱۹۳۴ء کے رسالہ نگار میں شایع ہو چکا ہے علاوہ اس کے چونکہ مضمون زیر بحث میں صرف تاریخی تبصرہ مقصود ہے اس لیے یوں بھی کسی تفصیلی تنقید کا موقع نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سودا کا مرتبہ شاعری ان کی ہمہ گیری کے لحاظ سے بہت بلند نظر آتا ہے: مثنوی، قصیدہ، غزل، ہجو، مرثیہ ترجیع بند، مخمس، رباعی، قطعہ وغیرہ سبھی کچھ انھوں نے لکھا ہے اور ہر صنف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر صحرا ہے جو نیستان کو چیرتا پھاڑتا چلا آ رہا ہے لیکن چونکہ ان کی یہی تنہا صفت غزل گوئی کے منافی تھی اس لیے وہ اس صنف میں تو زیادہ کامیاب ہوئے نہیں البتہ قصیدہ اور ہجو میں وہ اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ مثنویوں میں بھی چونکہ سادگی جذبات وحلاوت زبان کی ضرورت ہے اس لیے میر کے مقابلہ میں یہاں بھی ان کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

غزلوں میں بعض بعض جگہ سودا نے بھی جذبات عاشقانہ سے کام لیا ہے اور سوز وگداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ان کی فطرت اس کیفیت کے مناسب نہ تھی اس لیے وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے

میر کی غزل گوئی کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، دوست دشمن سب نے ان کو اس صنف کا خدا تسلیم کر لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کتنی ہی جدید فتوحات حاصل کر لے لیکن وہ اس مملکت میں کوئی فاتحانہ قدم نہیں رکھ سکتی جو میر کے قبضہ میں آ چکی ہے، زبان کی حلاوت، عاشقانہ فتادگی، والہانہ ربودگی، خستگی و برشتگی کون سی ایسی چیز ہے جو ان کی غزلوں میں نہیں پائی جاتی اور اب کس میں ہمت ہے کہ ان میں کوئی اضافہ کر سکے، کہا جاتا ہے کہ اُردو میں واسوخت کے بھی موجد یہی تھے، قصیدہ بھی لکھا ہے لیکن سودا کو نہیں پہونچے

خواجہ میر درد کا اُردو دیوان بہت مختصر ہے لیکن جتنا بھی ہے "جانِ محبت" ہے، یہ ایک صاحبدل درویش تھے اور اسی لیے انکی غزلوں میں ایک کیفیت میر سے کچھ علحدہ پائی جاتی ہے، ان کے یہاں بھی وہی جذبات وکیفیات ہیں لیکن ایک خاص تکلف لیے ہوئے ہیں جن کا پتہ الفاظ سے تو نہیں چلتا لیکن دماغ ضرور محسوس کرتا ہے۔

میر سوز کی غزل گوئی کی خصوصیت صرف باتیں کرنا ہے، ان کا کلام پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص نہایت بے تکلفی سے محبت کی گفتگو کر رہا ہے اور سہل سے سہل الفاظ میں بغیر کسی تصنع وآورد، بلا کسی تشبیہ واستعارہ کے دلی حال دُہرا رہا ہے، افسوس ہے

کہ ان کا کلام ضائع ہوگیا، گزشتہ نومبر کے نگار میں ایک قلمی نسخہ سے انتخاب کرکے میں نے ان کا کلام پیش کیا ہے ناظرین نگار کے مطالعہ میں آیا ہوگا۔

خدمتِ زبان کے لحاظ سے بھی یہ دور قابلِ ذکر ہے کیونکہ بہت سے وہ نامانوس الفاظ ہندی کے جو محمد شاہی عہد میں رائج تھے اس زمانے میں ترک کر دیے گئے اور زبان بہت صاف ہوگئی۔

اس عہد میں علاوہ ان چار مشاہیر کے بعض اور شعراء بھی استادانہ حیثیت کے گزرے ہیں، ان میں سے ایک شیخ قیام الدین قائم تھے جو چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت دلی میں رہ پڑے تھے، اول اول خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کی اور پھر سودا کی دلی کی تباہی کے بعد وطن واپس آکر نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ (آنولہ کے قریب) چلے گئے، پھر رام پور گئے اور ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا ان کے کلام میں سودا کا رنگ غالب ہے لیکن نہ اتنا کہ حدِ تغزل سے گزر جائیں معاملاتِ محبت کے شعر انھوں نے نہایت پاکیزہ کہے ہیں۔ مثلاً

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے ۔۔۔ پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر ۔۔۔ رُوٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا ۔۔۔ آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم ۔۔۔ مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ضیا، الدین ضیا بھی مرزا سودا کے ہمعصر تھے، دلی کے رہنے والے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس کے شاگرد تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ہی یہ فیض آباد چلے آئے، اور پھر لکھنؤ آگئے، چند دن بعد عظیم آباد چلے گئے، یہاں راجہ شتاب رائے کے بیٹے نے ان کی قدر کی اور یہیں ان کا انتقال ہوا مگر کب؟ یہ معلوم نہیں، یہ زیادہ تر غزل گوئی کی طرف مائل تھے اور خوب کہتے تھے، اشعار ملاحظہ ہوں

کل کی رُسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگِ خلق ۔۔۔ اس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر کھو دیا ۔۔۔ اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رُو دیا

برس اے ابر جتنا چاہے تو اب تیری باری ہے ۔۔۔ کبھی دل تھا تو میں رو رو کے اک دریا بہاتا تھا

کہاں سے ہو تجسس کا گمان تا کا آہ کیا دل میں درد اٹھتا ہے

انعام اللہ خاں یقین میرزا مظہر کے شاگرد تھے اور ۲۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ مصحفی کی یہ پیش گوئی کہ شاید میر و میرزا کا دعویٰ یکتائی باقی نہ رہتا۔ یہ نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے اور شیخ عبد الاحد سرہندی کے پرپوتے تھے۔ ان کا رنگ تغزل یہ تھا۔

قسمت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے جی ہی جائے گر چھوٹے گی آخر یہ بیماری مجھے

یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا یہ دیوانہ تو ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہیے

میرزا مظہر کے ایک شاگرد خواجہ احسن اللہ بیان تھے جو آخر عمر میں دہلی سے حیدرآباد چلے گئے تھے اصل وطن اکبرآباد تھا حیدرآباد میں ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا، ان کا کلام کمیاب ہے لیکن تذکروں میں جس قدر درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام ان کا رنگین تھا اور جو سلاست و سادگی غزل کے لیے ضروری ہے اس کی ان کی غزلوں میں کمی نہ تھی، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مصلحت ترک عشق ہے ناصح لیک وہ ہم سے ہو نہیں سکتا

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے آنا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے

میر محمد باقر حزیں بھی میرزا مظہر کے شاگردوں میں تھے اور خوب کہتے تھے، یہ بھی دہلی چھوڑ کر عظیم آباد نواب صولت جنگ کے پاس چلے گئے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

حال اے قاصد مرا جو کہہ کہ تڑپتا ہو دیکھ اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

میر کے شاگردوں میں میاں عبد الرسول نثار، میاں گلبن، محمد محسن، مجنوں، مشتاق، نزار، ہلاہن، آتم، شکیبا وغیرہ کا نام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے لیکن ان میں کوئی اس قابل نہ ہوا کہ میر کی شاگردی اس کو زیب دیتی۔

سودا کے شاگردوں میں میاں یقین، ہاشم، ماہر، میر امانی اسد وغیرہ بہت سے شاعروں کا نام لیا جاتا ہے لیکن جلد ہی تاباں نے واقعی سودا کا نام روشن کیا اگر وہ واقعی سودا کے شاگرد تھے، تاباں نہایت خوبصورت شخص تھے میرزا مظہر کے بہت محبوب عقیدت مند تھے نمونۂ کلام یہ ہے

عجب احوال ہے تاباں کا تیرے کہ رو رو رات دن اور کچھ نہ کہنا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو ہوا سو ہوا — تری بلا سے گزر جی پہ جو ہوا سو ہوا

میرے ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہے آج — نہ ہوں اور ہاتھ سے اور یہ اک گریباں ہے آج

خواجہ میر درد کے شاگردوں میں اچھے اچھے کہنے والے ہوئے ہیں ان میں اثر ان کے چھوٹے بھائی میر محمد اثر ہی تھے ان کی کمال میں شک نہیں کہ خوب کہتے تھے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اثر مجھے کیسا کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے

وہ ہی میں ہوں اثر وہی دل ہے — اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

بے وفائی پہ تیری جی ہے فدا — قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

ہدایت اللہ خاں ہدایت بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، بعض بعض شعر ان کے نہایت پاکیزہ ہیں مثلاً

جی تو کرتا نہیں کہ پیچھے سے ترے جانے کو — مگر تری اس میں خوشی ہے تو بھلا جاتا ہوں

بھلا بتا تو مری جان کچھ ہدایت نے — تمہارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا
مگر یہی تا کہ بے اختیار ہو کے کبھی — کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا

حکیم ثناء اللہ فراق بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے اور بقول مولوی محمد حسین آزاد نہایت مشہور شاعر گزرے ہیں ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا ہے

ہوں تماشا کہ چشم پُر کرتا تیری نگاہ — ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

خواجہ صاحب کے ایک صاحب دیوان شاگرد میر محمدی بیدار بھی تھے لیکن کوئی خاص بات ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے تھے صاحب دل درویش تھے ۱۲۰۹ھ میں انتقال ہوا

اس دور کا ذکر ناقص ہے اگر حسن کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ وہی میر حسن ہیں جن کی مثنوی سحر البیان اردو زبان کی بہترین مثنوی [illegible] ہے۔ یہ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ پہلے دلی میں رہتے تھے لیکن صغر سنی میں فیض آباد چلے گئے اور پھر لکھنؤ میں آکر [illegible] کرتے تھے لیکن ابتداً [illegible] تھا اور [illegible] ۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی [illegible] کا ایک [illegible] غزل میں ان کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

[illegible] کہاں سے [illegible] حالت [illegible] — [illegible] کوئی بھولا ہوا [illegible]

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

دل کو تم [illegible] ہے کل جہاں جاکر — جی میں ہے آج جی بھی تم کو آؤں

اُس محبت کی زندگی سے تنگ آ ہو حسن — یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا — کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

اظہارِ خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نہ رہتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو — حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں — جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

جان و دل ہیں اُداس سے میرے — اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا — کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو بے کر گیا میرے آہ! — وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمارِ محبت میں بازی سدا — وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جاں بخشی بھی کی — حسن اُس نے احساں دوبارا کیا

اس دور میں افسوس اور میرزا علی لطف کو بھی شامل کرنا چاہیے

افسوس کا نام میر شیر علی تھا، ان کے والد سید علی مظفر خاں اپنی آخری عمر میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل ہوگئے اور افسوس کا نشو و نما بھی اودھ میں ہوا، شاعری میں میر حیدر علی حیرانؔ اور سوزؔ سے مشورہ کیا، بعد کو کلکتہ چلے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں اردو تراجم کا کام کرنے لگے، میرزا علی لطف بھی اس وقت وہیں تھے اور ان دونوں کی ملاقات [illegible] لطف نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور ۱۲۱۵ھ تک دونوں وہیں موجود تھے، افسوس اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے بڑے پایہ کے شخص لیکن افسوس ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی ان کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا، آخر عمر میں یہ حیدرآباد چلے گئے تھے۔

لطف کے والد کاظم بیگ خاں ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے ساتھ استرآباد سے دہلی آئے تھے اور چند روز دربار شاہی سے وابستہ ہوگئے
بلحاظ شاعری افسوس کا مرتبہ لطف سے زیادہ بلند ہے کیونکہ ان کے یہاں وہی میرؔ و دردؔ کا سوز و گداز پایا جاتا ہے، لطف کے کلام میں یہ رنگ کم ہے اور آورد زیادہ ہے مثلاً ؎

پاس ناموس محبت فرض ہے پروانہ وار — شمع ساں سوزِ شب ہجراں زباں پر لائیں کیا

غبار بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو — کہ بخشے ہے جلا گرد یتیمی آب گوہر کو

لطف نے ریختہ میں کسی سے مشورہ نہیں لیا لیکن کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوداؔ کا تتبع کرنا زیادہ پسند کرتے تھے کہیں کہیں جذبات کی بھی شاعری کی ہے لیکن کم

اسی دور کے ایک اور شاعر لکھنؤ میں میرزا جعفر علی حسرتؔ بھی تھے، انھوں نے رائے سرب سنگھ دیوانہ سے مشورۂ سخن کیا تھا اور امراء کی صحبت میں خوش باشانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے والد کا نام ابوالخیر تھا اور اکبری دروازہ میں عطاری کی دکان کرتے تھے جب ان کا انتقال ہوگیا تو حسرتؔ دکان پر بیٹھنے لگے اور پھر ترک دنیا کرکے لباس فقر اختیار کرلیا، ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا۔

۱؎ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے نگار میں ان کے حالات اور انتخاب کلام ایک قلمی نسخہ سے شائع ہوا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا فائدہ جو پوچھیے احوال دل افسوس سے — منہ دیکھ رو دیتا ہے وہ پر بات کچھ کہتا نہیں

بیتاب بہت ہوں آج یارو! — ٹک لے چلو اس کے پاس مجھ کو

کیا جانے یہ آہ ہے کہ کیا ہے، — کچھ آگ سی آئی ہے زباں پر!

منزل عشق تک نہ پہونچا آہ! — میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا

پاس سے اس کے سب گئے خورسند — ایک افسوس سوگوار گیا

انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور غزلوں کے دو دیوان اپنے بعد چھوڑے۔ جرأت اور خواجہ حسن کے [illegible] کلام میں بھی ہوتا تھا اور زبان کی صفائی و موزونی ترکیب کے لحاظ سے خاص پایہ کا تھا۔ غزل گوئی ان کے یہاں [illegible] تک ہوتا ہے کہ [illegible] سوز و گداز پیدا کر دیا تھا، ایک رنگ [illegible] تک بھی قائم رہا۔ ذیل کے اشعار سے [illegible] ظاہر ہوگا۔ ؎

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا — تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا
بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

روتے ہی اس کو گذرے ہے ہجر میں تیرے رات دن — حال میں کیا بیاں کروں حسرت بے قرار کا

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے شکل اپنی دکھا گئے — کبھی نیند برسوں میں آ گئی تھی سو وہ اس طرح سے اچٹ گئی

ذیل کا شعر ان کا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی — چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

طبقۂ متوسطین کے دوسرے دور میں جرأت، مصحفی و انشا نے جتنی شہرت پائی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

انشا: انشاء اللہ خاں انشا، اس میں کلام نہیں کہ بلا کے ذہین شخص تھے اور دنیا کی کوئی حرکت ایسی نہیں جسے وہ شعر میں نہ کہہ سکتے ہوں لیکن جس چیز کا نام تغزل ہے وہ ان کے حصہ میں نہ آسکی، قسمت بے شک بہت اچھی تھی کہ نواب سعادت علی خاں کے مزاج میں درخور حاصل ہو گیا اور مصحفی ایسے باکمال شخص کی کچھ نہ چل سکی۔

مصحفی کا نام غلام ہمدانی تھا اور شیخ ولی محمد ان کے باپ کا نام تھا، اصل وطن امروہہ تھا لیکن اوائل عمر میں دہلی آگئے تھے اور یہیں درسیات کی کتابیں ختم کیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے تھے اور چونکہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی موزونیت اس فن کی رکھتے تھے اس لیے اسی صحبت میں رہنے لگے ان کا سنہ ولادت غالباً ۱۱۶۴ھ ہے۔ جب احمد شاہ بادشاہ دہلی میں حکمراں تھے لیکن دہلی پہونچے یہ شاہ عالم کے زمانے میں، جب دہلی اجڑنے لگا تو یہ بھی وہاں سے نکلے اور سیدھے ٹانڈہ پہونچے، یہاں قائم نواب محمد یار خاں کی سرکار سے متوسل تھے ان کی وساطت

ریاستی [illegible] اور مرزا سلیمان شکوہ کی زندگی بسر کرتے تھے جب نواب [illegible] فیض آباد سے [illegible] آصف الدولہ [illegible] لیکن چونکہ [illegible] کے خلاف جنگ کرنی تھی اس لیے [illegible] دہلی [illegible] اور چند دن [illegible] اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے لیکن افسوس ہے کہ ان کی خاطر خواہ قدر نہ ہوئی [illegible] ان کو ترک دی اور چونکہ سخن میں یہ اس کے تو مقابل نہ تھے اس لیے جیت اس کی رہتی تھی، آب حیات میں ان دونوں کی نوک جھونک کے بہت سے واقعات درج ہیں۔

مصحفی اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے کامل استاد تھے اور کہنہ مشق [illegible] میں [illegible] تھے لیکن اگر صرف غزل کو سامنے رکھا جائے تو وہ یقیناً سودا سے بلند تر مرتبہ رکھتے تھے مشکل زمینوں میں بغیر کسی تکلف کے بہترین اشعار نکالنا ان کی خصوصیت تھی اور پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ باوجود ہزاروں غزلیں فروخت کر دینے کے آٹھ دیوان اپنے بعد چھوڑ گئے جو اب کمیاب ہیں

اس میں شک نہیں کہ حکومت وقت نے ان کی قدر نہ کی لیکن لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ ان کی زیر بار احسان رہے گی کیونکہ بعد کو جتنے نامور شاعر لکھنؤ میں پیدا ہوئے سب مصحفی کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ناسخ انھیں سے مستفید ہوئے آتش نے ان سے فائدہ اُٹھایا، متاخرین میں امیر انھیں کے شاگرد تھے اور انیس و دبیر جن کی زباں دانی کو دنیا نے تسلیم کیا انھیں کے اِرادتمند تھے۔

آزاد آب حیات میں انشا کا ذکر مصحفی کے مقابلے میں بہت بڑھا چڑھا کے کرتے ہیں حالانکہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے انشا کو مصحفی سے کوئی نسبت نہ تھی، یہ اور بات ہے کہ قسمت نے یاوری نہ کی اور انشا کی طرح امیرانہ زندگی نہ بسر کرسکے انھوں نے ۹۰ سال کی عمر میں [illegible] میں انتقال کیا [illegible] میں مدفون ہوئے

[illegible] مصحفی [illegible] ہیں۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

[illegible] رات [illegible]

[illegible]

جب [illegible]

[illegible]

[illegible]

سید انشاء اللہ خاں انشاؔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں دہلی پہونچے۔ غلام قادر روہیلہ کے ظلم سے یہاں سے بھاگ کر [illegible] لکھنؤ میں [illegible] جب دیکھا کہ شاہ عالم کے پاس کچھ نہیں رہا تو آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس وقت سخن [illegible] [illegible] لیکن انشاؔ اپنی ذہانت [illegible] کے خود ان کی جگہ حاصل کر لی اور رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہونچ گئے اور بڑا مرتبہ حاصل کیا، لیکن ۱۲۲۵ھ میں زیر عتاب آ گئے کیونکہ نواب سعادت علی خاں بہت سنجیدہ شخص تھا اور وہ ان کے مسخرے پن کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ سعادت علی خاں کے بعد نواب وزیر نے اپنی چند ماہ کی حکومت میں ان کو [illegible] لیکن چند دن بعد پھر ہٹا لیے گئے اور ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ انشاؔ بڑا فاضل شخص تھا اور ذہانت تو اس کا حصہ تھا لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس فطری دولت سے صحیح کام نہیں لیا اور ساری عمر مسخرے پن میں بسر ہو گئی۔[1]

شیخ قلندر بخش جراتؔ دہلی کے باشندے تھے لیکن ان کا نشو و نما فیض آباد میں ہوا۔ عنفوان شباب میں بینائی جاتی رہی اور موسیقی کا شوق پیدا ہوا، ستار اچھا بجاتے تھے۔ مشق سخن جعفر علی حسرتؔ سے کی۔ اول اول محبت خاں کے سرکار میں ملازم ہوئے اور بعد کو مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انشاؔ سے ان کی بھی خوب چوٹیں چلیں اور ۱۲۲۵ھ میں بعہد نواب سعادت علی خاں انتقال کیا۔ آبِ حیات میں ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے لطائف تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

---

[1] انشاؔ کے بعض مشہور شعر یہ ہیں :—

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

غصہ میں تیرے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

جرأت غزل گو شاعر تھے اور سادگی کے لحاظ سے میر کے متبع کہلائے جاتے ہیں لیکن انھوں نے معاملات عشق و عاشقی کو نہایت ادنیٰ سطح پر آکر بیان کیا اور اسی لیے وہ ایک خاص طرز کے موجد سمجھے جاتے ہیں جس میں لطف و عیاشی کی بڑی فراوانی کا احساس ملتا ہے۔[1]

انھیں کے ہم عصر شیخ غلام علی راسخ بھی تھے ان کا وطن عظیم آباد تھا لیکن عمر کا زیادہ حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا میر کے شاگرد تھے اور ایسے شاگرد تھے کہ کبھی اپنے استاد کے رنگ سے تجاوز نہ کیا۔ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۵ سال کی عمر پاکر ۱۲۳۸ھ میں بعہد غازی الدین حیدر انتقال ہوا، کلام کا رنگ یہ تھا ؎

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے — قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

تھا جی میں کہ دشوار ہی ہجر میں ہے کیونکے — پر جب سے تجھے رنج و محن یاد نہ آیا

مرزا سعادت یار خاں رنگین بھی اسی دور کے شاعر تھے اور ریختی کے ایجاد کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے رنگین سرہند میں پیدا ہوئے لیکن نشو و نما دہلی میں ہوا، سپاہی زادہ تھے اور یہی ان کی زندگی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کا بھی شوق تھا، شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، آدمی بہت ذہین، بذلہ سنج اور بیباک تھے، انھوں نے اردو کے چار دیوان اپنے بعد چھوڑے جن کے نام ریختہ، بیختہ، آمیختہ، اور انگیختہ ہیں، تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے۔ انشا کے بڑے دوست تھے اور دونوں میں بہت چھنتی تھی، ان کی ایک مثنوی دلپذیر بہت مشہور ہے اور چند کتابیں اور بھی لکھی ہیں، ۱۱۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ میں اسی سال کی عمر پاکر انتقال کیا

---

[1] جرأت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے — یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو — ادا سے ان کا چلنے میں اٹھا لینا وہ داماں کا

ناصح میں اور ہم ہیں یہ طرز صحبت میں — ہم کچھ نہیں کہتے وہ کہے جاتے ہیں

باوجود فحاشی و ہزل گوئی کے ریختہ میں اسی جذباتی رنگ کی جھلک نمایاں ہے جو اس عہد کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

جو نامہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا　　تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے　　مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

جو کوئی تیرے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی　　کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

اس دور کا ذکر نا تمام رہے گا اگر مصحفی کے شاگرد نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کا ذکر نہ کیا جائے، یہ اصل میں فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ان کے کلام میں بالکل میر کا لطف آتا ہے اور ان کے کلام کا اقتباس ایک قلمی نسخہ سے نگار اپریل ۱۹۲۳ء میں شایع ہو چکا ہے [1]۔ مصحفی کے شاگردوں میں شہید بھی خاص چیز تھے، لیکن افسوس ہے کہ دنیا نے ان کی طرف توجہ نہ کی ان کا نام کرامت علی تھا عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے، وطن بانس بریلی تھا لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، پہلے مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور ان کے انتقال پر شاہ نصیر کی، چھاؤنی نیمچ میں ملازم ہو گئے تھے، لیکن حساب میں خورد برد ہونے کی وجہ سے علیحدہ کر دیے گئے ۱۲۵۵ھ میں حج کی غرض سے روانہ ہوئے لیکن مدینہ منورہ کے قریب پہونچ کر انتقال ہو گیا، سوز و گداز ان کے کلام میں بہت پایا جاتا ہے، خصوصیت میں ان کی غزلیں بہت مقبول ہوئیں لیکن عاشقانہ رنگ کا کلام بھی خوب ہوتا تھا، چند اشعار ذیل میں ملاحظہ ہوں،

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پے　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اندوہ دائمی میں کئے کس خوشی سے غم　　گر مجھ کو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

---

[1] چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

شغل شب تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا　　دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا

عاشق تو تھا ہوس کبھو رسوا نہ کب ہوا　　لو اٹھ گیا حجاب بڑا ہی غضب ہوا

آ چکا تھا صاف میرے سامنے وہ بے حجاب　　کچھ یونہی اک شرم کا پردہ سا حائل ہو گیا

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کس کا ذکر　　ہر دم زبان یار پہ یا دشش بخیر تھا

گزشتگان زمانہ کا تم نہ وصف کرو　　یہی غم و الم اُس روزگار میں بھی تھا

جس سے کل خون میں ڈوبا قفس مرغ اسیر　　تو نے پھر آج وہی زمزمہ بنیاد کیا

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا ۔۔۔ نہ خرید یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری ۔۔۔ اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

وہ وقت تو آنے دے بتا دینگے شہیدی ۔۔۔ بن آئے کسی شخص پہ مرجاتے ہیں کیسے؟

دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں ۔۔۔ کچھ نہ رُو دے آہ گر ہم عمر بھر رویا کیے

متاخرین کے اول دور میں شاہ نصیر، ناسخ، آتش، ذوق، مومن و غالب بڑے مشہور شاعر ہوئے ہیں، سنہ وفات کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہوتی ہے۔۔ ناسخ، شاہ نصیر، آتش، مومن، ذوق و غالب لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کا زمانہ دیکھا تھا اس لیے ان سب کا ذکر دور متاخرین میں ہونا چاہیے۔

شاہ نصیر الدین دہلی کے رہنے والے تھے اور شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے، شاہ عالم کے دربار میں انکی بھی رسائی ہوگئی لیکن انھوں نے بھی دوسرے شعرا کی طرح ہجرت کی اور لکھنؤ آئے، یہ زمانہ مصحفی و انشاء کا تھا اس لیے یہ سمجھ کر کہ ان کے آگے انھیں کون پوچھے گا واپس آئے، دوبارہ جب گئے تو ناسخ و آتش کی دھوم تھی، مجبوراً حیدرآباد کا رُخ کیا، یہاں مہاراجہ چندو لال وزیر تھے بڑی قدر ہوئی، اس کے بعد یہ تین بار دہلی واپس آئے اور پھر حیدرآباد پہونچے آخری مرتبہ مہاراجہ چندو لال نے سات ہزار روپیہ بھیج کر ان کو دعوت دی اور پچیس روپیہ روزانہ مقرر کر دیا، چنانچہ یہیں رہ گئے اور ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا، ان کے کلام میں سوائے شوکت الفاظ کے اور کچھ نہیں ہے، نئی نئی تشبیہیں نئے نئے استعارے ڈھونڈھنا ان کا خاص ذوق تھا زمینیں بھی انھوں نے نئی نئی اور مشکل پیدا کیں، کچھ پرانے الفاظ بھی انھوں نے متروک کیے اور زبان کی صفائی کا بھی کافی لحاظ رکھا[1]،

---

[1] ان کے کلام کا بہتر نمونہ ملاحظہ ہو۔

خلاف زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر ۔۔۔ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

دیکھ لیتی جو اُٹھا کر تو ترے ٹوٹتے ہاتھ ۔۔۔ لیلی اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

آج کچھ ہم کو نہ تھی فرصت بیدم کی خبر ۔۔۔ اے حباب لب جو تونے یہ عقدہ کھولا

بسر قع کو الٹ منھ سے جو کرتا ہے تو باتیں ۔۔۔ اب میں ہمہ تن گوش ہوں یا ہمہ تن چشم

وجہ معلوم تو ہو جیں بجبیں ہونے کی ۔۔۔ سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

شیخ امام بخش ناسخ لکھنؤ کے بہت مشہور شاعر ہوئے ہیں، اور اس لحاظ سے کہ لکھنؤ کی شاعری میں آورد و تصنع سب سے پہلے انھوں نے پیدا کیا تاریخ میں ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ یاد رکھے جائیں گے

فیض آباد میں پنجاب کا کوئی خیمہ دوز خدا بخش نامی تھا اسی کے بیٹے تھے یا یہ کہ اس نے متبنیٰ کر لیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر ہوا اور شروع سے پہلوانی و ورزش میں لگ گئے، نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر کے ساتھ لکھنؤ آئے، یہ زمانہ مصحفی و انشار کے ہنگاموں کا تھا، ان کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا، ابتدا میں مصحفی سے اصلاح لیتے رہے اور شاید مصحفی کے شاگرد محمد عیسیٰ تنہا سے بھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ کے ایک رئیس میر کاظم علی تھے انھوں نے ناسخ کو متبنیٰ کر لیا تھا جب وہ مرے تو اچھی خاصی دولت ان کے ہاتھ آئی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے، رفتہ رفتہ ان کی رسائی ایک امیر زادے مرزا حاجی کے دربار تک ہوگئی جو خود بھی ذی علم تھے اور اہل علم کا مجمع بھی ان کے یہاں رہتا تھا اس صحبت نے ناسخ کے دل میں نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور ان کی شاعری چمک گئی،

یہ زمانہ غازی الدین حیدر کا تھا اور وزرار کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا، ناسخ بھی چونکہ امرا و وزرار کے آدمیوں میں سے تھے اسلیے ان پر بھی عروج و زوال کی بہت سی ساعتیں آئیں اور بار بار بھاگ کر الہ آباد گئے جہاں دائرہ شاہ اجمل میں قیام ہوتا تھا، آخر کار محمد علی شاہ کے زمانے میں ان کو چین نصیب ہوا اور سو روپیہ ماہوار گھر بیٹھے ان کا مقرر ہوگیا[1]۔ سنہ [illegible]ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۵۴ھ میں وفات

انھوں نے اپنے بعد دو دیوان چھوڑے جن میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں، قطعات اور تاریخیں بھی ہیں، قصائد کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اس صنف میں وہ بہت زیادہ کامیاب ہوتے، غزل میں ان کا انداز یکسر تصنع تھا اور سوائے رعایت لفظی، شوکت الفاظ، مبالغہ اور بیجا بلند پروازی کے جذبات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے مگر زبان کی صفائی و صحت کی طرف بیشک توجہ کی اور بہت سے نامانوس الفاظ انھوں نے ترک کر دیے[2]۔

---

[1] تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانے میں ان کی تنخواہ بند ہوگئی تھی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ناسخ کی وفات سنہ ۱۲۵۴ھ ہے اور امجد علی شاہ سنہ ۱۲۵۸ھ میں تخت نشین ہوئے تھے

[2] ناسخ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

سیکڑوں اہل کر اُن پہ دخل کیا آواز کا
تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

کہیں کہیں اس رنگ کے بھی اشعار ہیں:-

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار
اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھکو

خواجہ حیدر علی آتش کا اصلی وطن دہلی تھا، نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں ان کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آئے اور آتش یہیں پیدا ہوئے اوائل عمر میں یتیم ہو گئے اور بُری صحبت میں بانکے بن بیٹھے نواب محمد تقی کے ساتھ لکھنؤ آئے تو جرات، انشا، مصحفی کی دھوم مچی ہوئی تھی ان کو بھی شوق پیدا ہوا اور مصحفی کے شاگرد ہو گئے استعداد علمی کم تھی لیکن آدمی ذہین تھے اس لیے مصحفی کی صحبت نے ان کو چمکا دیا اور غزل گوئی میں بڑی شہرت حاصل کی بادشاہ نے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن آدمی رند مشرب اور دوست پرست تھے اس لیے ہمیشہ عسرت میں بسر ہوئی، آخر عمر میں معالی خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے اور یہیں ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا، جو وضع شروع میں اختیار کر لی تھی اسے اخیر دم تک نباہا، اپنے بعد ایک دیوان چھوڑ گئے جس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں زبان کی صحت وصفائی میں ناسخ سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور سوز وگداز کے لحاظ سے ان سے کہیں برتر و فائق ہیں[1] ان کے شاگردوں میں میر دوست علی خلیل، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رند، آغا حجو شرف، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنؤ اسکول کے مشہور شعراء میں تھے، شوق اور نسیم نے اپنی مثنویوں کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کی اور خلیل، صبا اور رند نے اپنی غزلوں کی وجہ سے جن میں گل و بلبل، رعایت لفظی اور ناموزوں بلند پردازی کے سوا اصل تغزل بہت کم ہے۔

ناسخ کے شاگردوں میں خواجہ محمد وزیر وزیر نے خاص شہرت حاصل کی، یہ خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے اور وطن کے اعتبار سے لکھنوی تھے، استعداد علمی اچھی تھی اور ہمیشہ گوشہ نشین رہے، واجد علی شاہ نے طلب کیا بھی تو نہیں گئے سنہ ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا رنگ شاعری بالکل وہی تھا جس کی بنیاد ناسخ نے ڈالی تھی اس لیے غزلوں میں ان کی کیفیت نہیں پائی جاتی اور رعایت لفظی پر عبارت کی عمارت کھڑی کر دینا ان کا خاص ذوق تھا[2]

---

[1] آتش کے بعض مشہور شعر یہ ہیں:-

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر — دل سے دشمن کی شکایت کا گلہ جاتا رہا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

[2] وزیر کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

جلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
کیا قتل اُس نے غیروں کو مرے ہم رشک کے مارے — اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
سبزۂ چشم یار زخمۂ خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

ناسخ کے دو شاگرد اور بھی مشہور ہوئے، مرزا محمد رضا برق اور میر علی اوسط رشک

برق، واجد علی شاہ کے مصاحب مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ناسخ کے شاگرد ہو کر مشق سخن کی، فنون سپہ گری سے بھی واقف تھے، واجد علی شاہ کے زمانے میں بہت ترقی کی اور ان کے کلام میں اصلاح بھی دی، بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج بھی گئے تھے، اور وہیں ۱۲۷۳ھ میں انتقال کیا، آدمی بہت پُر گو تھے لیکن رنگ وہی تھا جو اس زمانے میں ناسخ کی وجہ سے مقبول عام ہو چکا تھا، اپنے بعد ایک دیوان چھوڑ گئے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں، قطعات، اور مسدس وغیرہ بھی نظر آتے ہیں[1]

میر اوسط علی رشک فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن ان کا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، صاحب استعداد آدمی تھے، شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے اور تصحیح زبان و تحقیق لغات میں خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا، انھوں نے ناسخ و آتش سے بھی زیادہ زبان کی طرف توجہ کی اور بہت سے ایسے الفاظ جو بول چال میں استعمال ہوتے تھے انھیں بھی شعر میں داخل کیا، ان کی شاعری کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ الفاظ کے استعمال کی راہیں بتائیں، انھوں نے ۱۲۵۶ھ میں ایک لغت بھی (نفس اللغت) کے نام سے مرتب کیا تھا، آخر عمر میں کربلائے معلی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی، انھوں نے اپنے بعد تین دیوان چھوڑے، دو خود انھوں نے چھپوائے ایک ضایع ہو گیا[2]

ناسخ کے ایک اور شاگرد شیخ امداد علی بحر بھی کافی مشہور ہوئے ہیں، الفاظ کی تحقیق و صحت اور فن عروض کے لحاظ سے رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں انھیں کا مرتبہ ہے۔

تقریباً ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے لکھنؤ وطن تھا اور یہیں نشو و نما ہوا، تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ چھوٹی شہزادی کی سرکار سے کچھ وظیفہ مقرر تھا، انھیں کی ڈیوڑھی پر پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ تھا وہیں ایک دن کھلا کرتی تھی ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے رہتے

---

[1] برق کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

قیس کا نام نہ لو، ذکر جنوں جانے دو — دیکھ بنا مجھے تم موسم گل آنے دو

اٹھا کے آئنہ دکھلا دیا اسے میں نے — نہ ہو جو بھی عارض گلگوں کی جب مثال مجھے

اذاں دی کعبے میں ناقوس دیر میں پھونکا — کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

[2] رشک کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

محفل میں شمع، چاند فلک پر، چمن میں پھول — تصویر روئے یار جاناں کہاں نہیں

کہاں یہ لطف چھتے نے اگر پائی کمر پتلی — تمہارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے — بدن شفاف، شانے گول، قد موزوں، کمر پتلی

اسی جگہ لوگ دور دور سے تحقیقِ الفاظ کے لیے آتے، توپ دروازے میں کچا سا مکان تھا، شام کو وہاں آبیٹھتے، بیوی تھیں اور آپ، بعض کا بیان ہے کہ ایک لڑکا بھی تھا اور ایک لڑکی بھی، اخیر عمر میں نواب کلب علی خاں نے طلب کیا اور تنخواہ مقرر کر دی لیکن وہاں جی نہ لگا اور پھر لکھنؤ واپس آئے، نہایت وارفتہ مزاج آدمی تھے اس لیے دیوان مرتب نہیں کیا، ان کے دوستوں نے کچھ غزلیں جمع کر کے چھپوا دیں، سنہ ۱۳۰۳ھ میں انتقال ہوا، کلام بہت صاف ہوتا تھا اور فی الجملہ دلکشی بھی اس میں پائی جاتی تھی، چند اشعار درج ذیل ہیں،

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

گئی برسات گزرا سال یہ بھی آہ شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آیا کدھر برسا

آتش کے شاگردوں میں بلحاظ اصلاح زبان آغا حجو شرف کا مرتبہ بہت بلند ہے، انھوں نے فارسی کے بہت سے الفاظ جو رندی و ہوسناکی کا اظہار کرنے والے تھے ترک کر دیے اور اس لیے ان کے کلام میں ایک حد تک تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے، یہ واجد علیشاہ کے مصاحب تھے اور انھیں کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے[۵۱]

میر دوست علی خلیل بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں تھے، باپ کا نام سید جمال علی تھا اور بڑولی کے رہنے والے تھے نواب ناور مرزا کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے تھے، ان کے کلام میں سوائے رعایت لفظی کے اور کچھ نہیں ہے[۵۲]

---

[۵۱] آغا حجو شرف کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں

ٹھیرا گیا ہے لاکے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا، کہ رہزن تھا، کون تھا!

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا
چمن کی بلبلوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

دربدر بھی انھیں صبا نے کہنے نہ دیا
رہ گئے مرغ قفس کھول کے منقاروں کو

[۵۲] خلیل کا نمونہ کلام یہ ہے

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو
اٹھیے گھر جائیے، دم لے چکے ستائیے بہت

مسافر رہ ناآشنائے منزل ہیں
مثال ریگ رواں جائیں گے کہاں دیکھیں

جنوں میں بھی یہی دھن ہے کوئی ادھر نہ جائے
جدھر وہ دشمن ہوش و حواس رہتا ہے

میر وزیر علی صبا بھی آتش کے مشہور شاگرد تھے، آپ کا نام میر بندہ علی تھا اور وطن لکھنؤ، ادبیات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی شوق تھا ۱۲۷۱ھ میں رحلت کی، ان کا دیوان غنچۂ آرزو کے نام سے شایع ہو چکا ہے، ان کو بھی صحت و صفائی کا بہت لحاظ تھا[1]

آتش کے شاگردوں میں رند کو خاص شہرت حاصل ہوئی، ان کا نام سید محمد خاں تھا اور نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے محمد تقی الملک کے بھانجے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور نواب بہو بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے (در ۱۲۳۴ھ) فیض آباد میں میر مستحسن خلیق سے مشق سخن کی اور لکھنؤ میں آتش سے، پہلے وفا تخلص اختیار کیا بعد کو رند، ان کے کلام میں نہ خیال کی نزاکت ہے نہ مضمون آفرینی لیکن بے ساختہ سادگی نے ہلکی سی تاثیر ضرور پیدا کر دی ہے، اخیر عمر میں دربار اودھ کی سازشوں سے گھبرا کر عتبات عالیات کی طرف ہجرت کے خیال سے لکھنؤ چھوڑا لیکن بمبئی پہونچ کر انتقال کر گئے[2]

اس زمانہ میں ہرچند دہلی بالکل تباہ ہو چکی تھی اور بہادر شاہ ظفر صرف قلم کے بادشاہ رہ گئے تھے لیکن پھر بھی وہاں کی خاک سے جو شاعر اٹھا، مہر دوام ثبت کر کے گیا، کون ہے جو ذوق، غالب و مومن کو نہیں جانتا اور ان کے کمال کا قائل نہیں، ذوق ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا، ان کی پیدائش سے ۸ سال بعد غالب عالم وجود میں آئے (۱۲۱۲ھ) اور ۱۲۸۵ھ تک زندہ رہے مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ تک زندہ رہے، مومن و غالب کے متعلق نگار میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں، ذوق کے حالات سے بھی دنیا ناواقف نہیں، ذوق و غالب کی چھیڑ چھاڑ کا حال تذکروں میں موجود ہے اور مومن کے استغنا سے بھی ہر شخص واقف ہے، ذوق فن شعر کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بڑے پرگو، نہایت مشاق اور فن عروض کے بڑے ماہر تھے، ان کا کلام اغلاط سے پاک نظر آتا ہے، سودا کے بعد قصائد میں ذوق ہی کا نام سامنے آتا ہے لیکن تغزل میں غالب و مومن کو

---

[1] صبا کے بعض مشہور اشعار یہ ہیں

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

[2] رند کا رنگ سخن ملاحظہ ہو

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا — تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا
کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد — میں ماجرائے چمن کیا بیاں کروں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے — وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

یہ نہیں پہونچتے، غالب کا اُردو کلام ہر چند بہت مختصر ہے لیکن ہر رنگ کے پھولوں کا نہایت دلکش گلدستہ ہے، مومن کا رنگ تغزل بھی لطیفہ اتنا دلکش اس درجہ موثر ہے کہ ان کا مثل پھر پیدا نہ ہو سکا، اندازِ بیان کا تنوع ان کا حصہ تھا اور باتوں میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیت، مگر چونکہ ان کی شاعری درد و میر کی طرح اُن جذبات عالیہ کا نتیجہ نہیں جنھیں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ صرف جنسی محبت سے بحث کرتی۔ لیکن کمال یہی ہے کہ مومن نے ابتذالی جذبات کو بیان بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور جو کچھ کہہ گئے اس میں اضافہ کی کوئی گنجائش چھوڑی

ذوق کا تغزل اشعار ذیل سے واضح ہوگا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو بہے لہو میرا

خط بڑھے کا اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو
عید ہوئی ذوق تو ہے شام کو

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مومن کا مخصوص رنگ ملاحظہ ہو۔

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں، مرضی خدا کی

غالب کے چند مشہور اشعار یہ ہیں:۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مومن، غالب و ذوق کے علاوہ میر نظام الدین ممنون بھی اس زمانے کے اچھے شاعر تھے، یہ میر قمرالدین منت کے بیٹے تھے جن کا وطن سونی پت تھا، لیکن مولانا شاہ عبدالعزیز سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے دہلی آگئے تھے، ممنون یہیں پیدا ہوئے اور اسی جگہ اپنے والد سے مشق سخن کی، اکبر شاہ کا زمانہ تھا، بہت سے لوگ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ مفتی صدرالدین آزردہ بھی انھیں سے مشورہ لیتے تھے، یہ لکھنؤ بھی آئے تھے اور سرکار اودھ نے ان کی بڑی قدر کی، بعد کو انگریزی حکومت نے ان کو اجمیر کا صدرالصدور بنادیا، ضعیفی میں دلی چلے آئے اور سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا، انکا ایک ضخیم دیوان تھا جس میں زبان کی شیرینی و صفائی اور چستی بندش کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثالاً چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہو دیں گے ۔۔۔ نہ دل عہد آشنا کی نہ یاں شیوہ تقاضے کا

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا ۔۔۔ ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

کون آیا ہے کہ سینے میں بیدار ہو گئیں ۔۔۔ صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

تفاوت قامت یار و قیامت میں ہے کیا ممنوں ۔۔۔ وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ممنوں مہاد آئے کوئی ہجر ناگہاں ۔۔۔ نالہ ہوں سے وصل ہی میں آؤ خو کریں

غالب کے شاگردوں میں ذکریا خان ذکی، میر مہدی حسن مجروح، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، خواجہ الطاف حسین حالی اور انور بلند پایہ کے شاعر گزرے ہیں لیکن ان کا شمار متاخرین کے دوسرے دور میں ہے۔

مومن کے شاگردوں میں سالک اور نسیم استادانہ رنگ رکھتے تھے لیکن نسیم نے بہت شہرت حاصل کی، نسیم کے شاگرد تسلیم تھے اور تسلیم کے حسرت موہانی جن کو اس دور کا امام المتغزلین کہنا چاہیے۔

ذوق کے شاگردوں میں سید ظہیرالدین ظہیر نہایت اچھا کہنے والے تھے۔

متاخرین کے دوسرے دور میں نسیم، تسلیم، اسیر، منیر، امیر، داغ، جلال، میاں نظام شاہ رامپوری، امانت، قلق، بحر، سحر

اور غالب کے بعض شاگرد جن کا ذکر اوپر آچکا ہے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اصغر علی خاں نسیم، نواب آقا علی خاں قاچار کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے یہیں نشو و نما پایا اور مومن کی شاگردی اختیار کی، غدر سے کچھ دن پہلے لکھنؤ آئے، واجد علی شاہ کا زمانہ تھا بعض امرا نے ان کی شاگردی اختیار کی اور ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا، بڑے وارستہ مزاج شخص تھے اور مثنوی خوب لکھتے تھے، غزلوں میں بھی انھوں نے دہلوی رنگ نہیں چھوڑا اور روانی، سلاست اور الفاظ کی صحت کا التزام رکھا، اور ساقی نامے تو قیامت کے لکھے ہیں،

رنگ سخن یہ تھا:-

سکھے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں | کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے | تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

ہاتھ میں خنجر، کمر میں تیغ تیز | یہ ارادے ایک مشت خاک پر

آنکھوں میں ہے لحاظ، تبسم فزا ہیں لب | شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

گلہ میں بخت کے اُن کا بھی کچھ قصہ نکل آیا | ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

میر مظفر علی خاں اسیر، میر مدد علی کے بیٹے تھے اور امیٹھی میں پیدا ہوئے جو لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے ادبیات کے فاضل تھے اور شاعری میں مصحفی کے شاگرد، نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملازم ہوئے امجد علی شاہ کے عہد میں میر منشی ہو گئے لیکن نواب امین الدولہ پر زوال آیا تو یہ بھی قید میں ڈال دیے گئے بعد کو واجد علی شاہ نے انھیں رہا کر کے تنخواہ مقرر کر دی اور تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب مرحمت کیا، انتزاع سلطنت کے بعد رام پور پہنچے نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد ہوئے اور نواب کلب علی خاں نے بھی ان کی قدر کی ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا، بڑے پرگو شاعر تھے اور فن شعر کے اچھے جاننے والے تھے ان کا رنگ تغزل اپنے استاد مصحفی سے بالکل علیحدہ ہے اور ناسخ کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے ان کے شاگردوں میں

امیر مینائی، احمد علی شوق اور ریاض خیرآبادی نے اچھی شہرت حاصل کی، ان کے بیٹے حکیم وافضل بھی شاعر تھے اور اپنے باپ کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سید ظہیر الدین ظہیر، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے، درسی کتابیں ختم کرنے کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں ذوق کے شاگرد ہوگئے، غدر کے وقت لکھنؤ کے ارادہ سے نکلے لیکن یہ معلوم کرکے کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ہے رام پور چلے گئے یہاں چار برس رہ کر پھر دہلی واپس گئے، اس کے بعد اخبار جلوۂ طور کی اڈیٹری کی جو بلند شہر سے نکلتا تھا، اس کے بعد مہاراج شیو دان سنگھ والیٔ الور نے انھیں بلا لیا اور کافی قدر کی، مہاراجہ کے اختیارات سلب ہونے کے بعد پھر دہلی واپس آگئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور میں ملازم ہوگئے اور ۱۹ سال تک یہیں رہے، مہاراجہ رام سنگھ کے مرنے پر نواب احمد علی خاں نے ٹونک بلا بھیجا اور ۱۵، ۱۶ سال تک ٹونک میں رہے، اسی زمانے میں حیدرآباد گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد نے چالیس روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، ان کے تین دیوان چھپ گئے ہیں لیکن چوتھا دیوان طبع نہیں ہو سکا۔ ظہیر ہر چند شاگرد ذوق کے تھے لیکن مومن کا رنگ ان پر غالب تھا، وہی لطیف ترکیبیں، وہی دل نشین الفاظ اور وہی رنگین کنائے جو مومن کی خصوصیات تھیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، دہلوی اسکول کی یہ آخری یادگار تھے اور ان کے ساتھ ہی یہ رنگ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ذیل کے چند اشعار سے ان کا رنگ سخن واضح ہو سکے گا۔

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا — نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
تصور میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں — ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے — بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

اعجازِ دلفریبیٔ انداز دیکھنا — ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا
پرہیز عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی — میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

کیا بری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ — جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے — کہیں جو ذکر حریفانِ بادہ خوار آیا

سالک کا نام قربان علی تھا اور نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، پیدا ہوئے حیدر آباد میں، نشو و نما ہوا دہلی میں، پہلے مومن کے شاگرد ہوئے پھر غالب کے، غدر کے زمانے میں الور بھاگ کر گئے لیکن وہاں سے حیدر آباد چلے گئے ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا ان کے دیوان کا نام ہنجار سالک ہے: ان کا کلام بھی بہت پاکیزہ ہے اور مومن کی جھلک زیادہ پائی جاتی ہے۔
چند شعر ملاحظہ ہوں :-

اعتبارِ نگہِ ناز ہے کیسا کیسا ان کو
قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

نہیں اب نام بھی سننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

میر مہدی مجروح، میر حسین تسکین کے بیٹے تھے، وطن دہلی تھا اور غالب کے نہایت محبوب شاگرد تھے، غدر کے وقت پانی پت چلے گئے اور پھر الور، لیکن ہمیشہ پریشانی میں زندگی بسر کی، آخر عمر میں نواب حامد علی خاں رئیس رام پور نے وظیفہ مقرر کر دیا تھا، مجروح کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے اور اسی لیے چھوٹی بحروں میں ان کا کلام زیادہ ملتا ہے، کوئی خاص جدت نہیں ہے۔

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، فارسی اردو، دونوں کے نہایت اچھے شاعر تھے اور غالب کے شاگردوں میں اس مرتبہ کا کوئی دوسرا نہیں ہوا، یہ نواب سرفراز الملک مرتضٰی خاں کے بیٹے تھے اور ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت نہایت پاکیزہ ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں امام بخش صہبائی، غالب، ذوق اور آزردہ وغیرہ کا جمگھٹا تھا اسی لیے شیفتہ کو بھی شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور مومن سے مشق سخن کی، ان کا ذوق سخن معیاری چیز سمجھا جاتا تھا غالب کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا کتنا احترام کرتے تھے

تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۸۶ھ ہجری میں انتقال کیا، ان کا کلیات فارسی و اردو ان کے بیٹے نواب محمد اسحاق خاں نے شائع کیا تھا، ذیل کے اشعار سے ان کے کلام کی پاکیزگی واضح ہو گی :-

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی ‫ ‫ صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں ‫ ‫ آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آگیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر ‫ ‫ کیا کوئی اور ستم یاد آیا

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں ناز دلفریب ‫ ‫ شکر بجا نہ گلۂ بے سبب تلک

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ ‫ ‫ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ ‫ ‫ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی ‫ ‫ میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ‫ ‫ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

مفتی صدرالدین آزردہ، غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے اور فہم و تدبّر بلا کا پایا تھا ۱۲۰۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا، اپنے وقت کے بڑے جیّد عالم تھے اور ان کے شاگردوں میں بہت سے مشہور علماء گزرے ہیں عربی، فارسی، اُردو پر یکساں قدرت حاصل تھی، صدرالصدوری کے عہدے پر ممتاز تھے اور شعراء کے بڑے قدردان تھے کہا جاتا ہے کہ شاعری میں انھوں نے میر ممنون کی شاگردی اختیار کی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا استاد خود ان کا ذوقِ سلیم تھا اُردو کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

---

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے ‫ ‫ یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

کاش اس فرقۂ زُہّاد سے اُٹھتا نہ کوئی　　　کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

مومن کے شاگردوں میں میر حسین تسکین بھی بڑے پایہ کے شاعر تھے، ان کے والد کا نام میر حسن تھا جو میرن صاحب کے لقب سے مشہور تھے، دہلی میں پیدا ہوئے، فارسی صہبائی سے پڑھی اور مشقِ سخن پہلے شاہ نصیر اور پھر مومن سے کی، دہلی سے رامپور چلے آئے جہ نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا، یہیں ۵۰ سال کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا، انکا کلام مومن سے بہت کچھ ملتا جلتا ہو نمونہ کلام یہ ہے

جس وقت نظر پڑتی ہے اُس شوخ پہ تسکیں　　　کیا کہیے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

کوچۂ یار میں تسکیں میں نے　　　پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

یہ تو سچ ہے کہ جو تم جا ہوگے کر گزروگے　　　پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اس دور کے ایک نہایت خوشگو شاعر انور بھی تھے، ان کا نام سید شجاع الدین عُرف امراؤ مرزا تھا، ظہیر کے چھوٹے بھائی تھے اور ذوق و غالب دونوں سے اصلاح لی تھی، ۴۰ سال کی عمر میں بمقام جے پور انتقال کیا، افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی، ورنہ معلوم نہیں اُن کی شاعری کا عروج کس حد تک پہونچتا، شوخی و محاکات میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے　　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

میں نے کہا کہ غیر سے پردہ نہیں ہوا　　　کہنے لگے کہ آپ کو پھر کیا ؟ نہیں ہوا

تزئیں کچھ اور کرتی ہے دیکھو تو آئینہ
میں کیا کہ آپ اپنے سے تم بدگماں ہو آج

بدمستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے

پھینکیے کیوں مئے ناقص ساقی
شیخ صاحب کی ضیافت ہی سہی

غالب کے شاگردوں میں نواب سید محمد ذکریا خاں ذکی بھی قابلِ ذکر ہیں، دلی میں پیدا ہوئے تھے (سنہ ۱۸۳۹ء) اور ان کے والد نواب سید محمود خاں بھی شاعر تھے، ذکی کی تعلیم دہلی میں ہوئی اور درسیات ختم کرنے کے بعد فنِ شعر میں غالب کی شاگردی اختیار کی، غالب کا رنگ ان کے کلام میں بہت رچا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے دشوار دیکھنا

بڑھا ذوقِ اسیری جب انھوں نے
کہا کہہ دو کہ "اب سے رہا ہیں"

سو حسرتوں سے پوچھنا "پھر آ کے جاؤ گے"
اُن کا وہ ایک ناز سے کہنا "کہاں چلے"

اسی سلسلے میں حالی کا ذکر بھی ضروری ہے، عام طور پر ان کی جدید شاعری کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رنگِ تغزل میں بھی ان کا جواب نہ تھا، سوز و گداز، شیرینی و سلاست، سادگی و تاثیر جو غزل کی جان ہے بدرجۂ اتم ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور حق یہ ہے کہ غالب حالی کی شاگردی پر جتنا فخر بھی کرتے کم تھا، ۱۲۵۳ھ میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں انتقال کیا، ان کے حالات بہت مشہور ہیں زیادہ اظہار کی ضرورت نہیں، دیوان بھی ان کا شائع ہو چکا ہے لیکن چند شعر ان کی غزلوں کے پیش کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

ترکِ دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر نہ اب ہو تو اک ترکِ ریا اور سہی

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

میاں نظام شاہ رامپوری، اس دور کے بہترین شعرا میں سے تھے اور محاکات کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ نگار ماہ اگست ۱۹۲۲ء میں ایک مستقل تنقیدی مضمون انکی شاعری پر میں نے لکھا تھا۔ ۱۲۳۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ یہ شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد اور نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور کے زمانے میں دربار کے شاعر تھے، رامپور ہی میں انکا نشو و نما ہوا اور یہیں مدفون ہیں چند اشعار مثالاً یہاں درج کیے جاتے ہیں:

یوں دیکھ کے مجھ کو مسکرانا
پھر تم کو میں بے خبر کہوں گا

منھ پھیر کے نہس نہس کے وہ اقرار کی باتیں
اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں آتا

میں حالِ دل اُن سے کہہ رہا ہوں — وہ کہتے ہیں "تجھ سے میں خفا ہوں"

وہ ہائے بگڑ کے اُس کا جانا — رونا وہیں زار زار میرا

آج کل آپ سے باہر ہے نظام — کہیں محفل میں نہ بلوائیے گا

عہد کیا تھا ابھی کیسا نظام — پھر وہیں جانیکا ارادہ کیا

اب حالِ نظام کچھ نہ پوچھو — عنسم ہوگا تمہیں بھی گر کہوں گا

متاخرین کے دوسرے دور میں امیر و داغ کو جتنی شہرت حاصل ہوئی کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی، اور اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ایک کو نواب رام پور کی قدر افزائی نے اُچھالا اور دوسرے کو شاہ دکن کی سخن فہمی نے، امیر مینائی اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کے شخص تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شاعر پیدا نہ ہوے تھے، برخلاف اس کے داغ شاعر محض تھے اور کچھ نہیں، امیر کی شاعری اکتسابی تھی اور داغ کی فطری، لیکن ان کے اکتساب کا بھی یہ عالم تھا کہ غزل، قصید، مثنوی سب ہی کچھ لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ زبان کی صحت، لغت کی تحقیق، محاورہ کے استعمال الفاظ کی بندش، و مضمون آفرینی کے لحاظ سے بڑے زبردست اُستاد تھے، لیکن جذبات کے لحاظ سے ان کے کلام میں کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی، ان کے دو دیوان ہیں ایک مرآۃ الغیب جو بالکل ان کے اُستاد اسیر کے رنگ میں ہے اور دوسرا صنم خانہ عشق جس میں داغ کا تتبع کیا ہے، اسی کے ساتھ جوہر انتخاب و گوہر انتخاب میں درد و میر کے رنگ کے اشعار پیش کیے ہیں اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے کام لے کر ہر رنگ میں لکھ سکتے تھے اور فطرتاً وہ خود کسی مخصوص ذوق شعری کے مالک نہ تھے

داغ دہلی اسکول کے شاعر تھے اور لال قلعہ کے اندر ان کی تربیت ہوئی تھی، مرزا فخرو کے ساتھ ساتھ ذوق کے سامنے زانوئے ادب انھوں نے بھی تہ کیا تھا، وہ قلعۂ معلّٰی کی زبان، وہ شعر و سخن کا چرچا، وہ رنگین صحبتیں، فطری ذوق چمک اٹھا اور آخر کار دُنیائے شاعری میں وہ شہرت حاصل کی کہ اس دور میں کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوسکی، ان کے کلام کی خوبی بیانِ حسن و عشق کے بیان کرنے پر منحصر ہے، اور اس کوچے کی خاک انھوں نے ایسی چھانی کہ کیا کوئی چھانے گا۔

امیر ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا
داغ ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۲ھ میں رحلت کی

چونکہ ان دونوں کے تفصیلی حالات مع تنقید کلام کے بارہا دنیا کے سامنے آچکے ہیں اس لیے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اسی زمانے میں لکھنؤ کے ایک اور شاعر ضامن علی جلال بھی تھے، یہ حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے اور ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے نصیر علی شاہ کا زمانہ تھا، انھوں نے امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ دونوں کا زمانہ دیکھا اور اسی عہدِ رنگیں میں ان کا نشو و نما ہوا، درسیات پڑھنے کے بعد شاعری میں امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے اور پھر علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے، جب رشک کربلائے معلی چلے گئے تو برق سے مشورہ حاصل کرتے رہے، طبیعت چونکہ موزوں تھی اس لیے مشق سے ان کے کلام میں ایک کیفیت پیدا ہو گئی، غدر کے بعد رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں جہاں ان کے باپ داستان گوئی کی خدمت پر مامور تھے یہ بھی ملازم ہو گئے بعد کو نواب کلب علی خاں نے بھی ان کی قدر کی، نواب کے انتقال کے بعد پھر لکھنؤ آگئے

امیر مینائی کے بعض اشعار ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر   جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا
کلیم شکر کر و حشر تک نہ ہوش آتا   ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا
اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی   یاں عمر کٹ گئی ہو اسی اضطراب میں
شبِ وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں   اب ہم سے جدا ٹھیرے، حیا تم سے جدا ٹھیرے،
مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے،   آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

داغ کے بعض اشعار ؎

وصل میں ہائے وہ اترا کے مرا بول اُٹھنا   اے فلک دیکھ تو یہ کون مرے گھر آیا
عرض وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب   دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا
وعدے پہ مری اُن کی قیامت کی ہے تکرار   اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں   دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
وقتِ خرام ناز دکھا دو جدا جدا   یہ چال حشر کی یہ روش آسمان کی ہے
تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر   دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

اور منصور نگر میں رہنے لگے، ان کو اپنی محاورہ دانی و زباں دانی پر بڑا ناز تھا، اپنے بعد چار دیوان چھوڑے، ایک کتاب محاورات و اصطلاحات پر "سرمایۂ زبان اردو" کے نام سے تصنیف کی اور ایک رسالہ تذکیر و تانیث، ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود لکھنؤ میں نشو و نما پانے کے انھوں نے دہلوی رنگ تغزل کو پسند کیا، چنانچہ ان کے کلیات میں بہت سے شعر اس رنگ کے ملتے ہیں، نہایت صاف و شستہ کہنے والے تھے، رام پور کی صحبتوں میں جہاں امیر، داغ، اسیر، منیر، سحر، قلق اور تسلیم کا اجتماع ہوا کرتا تھا یہ بھی شریک ہوتے تھے اور داد سخن پاتے تھے ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا، ان کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

خوبرویوں کے بگڑنے میں بھی ہیں لاکھ بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق میں
فرق بس اتنا ہے وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ادا و ناز پر سو جان دیتے ہیں بتا دے گا
ذرا جینے تو دو چندے کسی مرجانے والے کو

شیخ امیر اللہ تسلیم بھی اسی جتھے اور دور کے آدمی تھے، فیض آباد کے ایک گاؤں منگلیسی میں پیدا ہوئے (۱۲۳۵ھ) ان کے والد مولوی عبد الصمد انصاری پلٹن میں ملازم تھے اس لیے ان کا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، درسیات ختم کرنے کے بعد تو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اصغر علی خاں نسیم کے شاگرد ہوئے جو اس وقت لکھنؤ میں تھے، جب ان کے والد ضعیف ہوئے تو بیٹے کو اپنی جگہ پلٹن میں رکھا دیا، محمد علی شاہ کا زمانہ تھا، واجد علی شاہ کے زمانے میں جب یہ پلٹن ٹوٹ گئی تو تسلیم بیکار ہو گئے، آخر کار غدر کے بعد یہ رام پور چلے گئے اور عرصہ تک وہاں رہے، جب لکھنؤ میں انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ پھر لکھنؤ آ گئے، اور منشی نول کشور نے اپنے مطبع میں تصحیح کتب کے لیے بیس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا، دس روپیہ نواب محمد تقی خاں بھی دیتے تھے، جب نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو پھر ان کو رام پور طلب کیا اور تیس روپیہ تنخواہ کر دی لیکن انعام و اکرام ملتا رہتا تھا اس لیے فارغ البالی سے بسر ہوتی رہی، نواب کے مرنے پر پندرہ روپیہ پنشن ہو گئی، یہ پریشان ہو کر ٹونک اور مانگرول گئے، مانگرول کے رئیس نے ان کو روکنا چاہا لیکن آب و ہوا ناموافق تھی اس لیے لکھنؤ آ گئے، جب نواب حامد علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کو طلب کیا

اور اصل تنخواہ پر دس کا اضافہ کرکے بحال کر دیا، اخیر وقت میں بینائی بھی جاتی رہی تھی اور ثقلِ سماعت بھی بہت ہو گیا تھا ۹۶ برس کی عمر میں ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

انھوں نے پانچ دیوان لکھے: پہلا دیوان غدر سے قبل کا ضایع ہو گیا، دوسرا بعد غدر نظمِ ارجمند کے نام سے شایع ہوا جس میں چند قصائد بھی ہیں اور دو مثنویاں بھی، تیسرا دیوان نظمِ دل افروز کے نام سے اور چوتھا دفترِ خیال کے نام سے رامپور میں طبع ہوا، اور پانچویں کے متفرق اجزا ان کے شاگردوں کے پاس ہیں شایع نہیں ہوئے، تسلیم کو مثنوی لکھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے تمام ہم عصر شعرا سے بڑھے ہوئے تھے، قصائد بھی انھوں نے خوب لکھے ہیں اور تغزل میں تو خیر وہ دہلوی رنگ کے متبع تھے ہی،

غزل کا رنگ ملاحظہ ہو

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دستِ جنوں		اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل		خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافرِ عدو ہوتا

اللہ رے اضطراب تمنائے دید یار		اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے		اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

مانا کہ حسنِ یار سے لبریز ہے جہاں		لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں

گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو		دور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں		ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں

امیر مینائی کے شاگردوں میں جلیل مانک پوری، حفیظ جون پوری اور ریاض خیرآبادی نے خاص شہرت حاصل کی لیکن فرق یہ ہے کہ جلیل نے امیر و داغ و جلال وغیرہ سب کا رنگ اختیار کرلیا، اور حفیظ جون پوری نے داغ کا، ریاض خیرآبادی نے خود اپنا ایک رنگ علیحدہ قائم کیا۔

جلال کے شاگردوں میں انور حسین آرزو بہترین کہنے والے ہیں اور تسلیم کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ حسرت موہانی ایسا شاگرد انھیں نصیب ہوا۔

داغ کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے لیکن خاص خاص یہ ہیں: بیخود دہلوی، سائل دہلوی، نسیم بھرت پوری، بیخود بدایونی، نوح ناروی، آغا شاعر دہلوی، بیباک و رسا۔

اسی دور میں دو شاعر ایسے گزرے ہیں جو ایک حیثیت سے متاخرین کے دور اول میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں شاد[1] عظیم آبادی اور نظم[1] طباطبائی، کئی سال ہوئے شاد کا انتقال ہو چکا ہے اور نظم طباطبائی نے حال ہی میں رحلت کی ہے۔ نظم، داغ کے رنگ کے بہترین کہنے والے تھے اور واقفیت فن کے لحاظ سے اس دور میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ شاد، بلحاظ تغزل بلند مرتبے کے شاعر تھے، ان کے یہاں میر و درد کا گداز، مومن کی نکتہ سنجی، غالب کی بلند پروازی اور امیر و داغ کی سلاست سب وقت واحد میں ایسی ملی جلی نظر آتی ہیں کہ اب زمانہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر پیش کر سکے گا۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا ہے لیکن باقی غیر مطبوعہ کلام جو کئی صندوقوں میں بند ہے انھیں کے ورثا کے قبضے میں ہے، معلوم نہیں اس زلزلہ میں وہ باقی بھی رہا یا نہیں۔

---

[1] دہلی کی ویرانی کے بعد جب شعرا منتشر ہوئے تو ان میں سے اکثر تو سلطنت اودھ کی طرف آئے جس کا پایہ تخت لکھنؤ تھا، کچھ عظیم آباد کی طرف گئے اور کچھ مرشدآباد کی طرف، کیونکہ جس طرح صوبۂ اودھ دہلی سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہو گیا تھا اسی طرح راجہ شتاب رائے نے نظامت بنگال سے علیحدہ ہو کر صوبۂ بہار میں اپنی حکومت جداگانہ قائم کرلی تھی، چونکہ یہ خود بھی شاعر تھا اس لیے خصوصیت کے ساتھ شعرا کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا، چنانچہ اس وقت سے عظیم آباد کو ایک مرکزی حیثیت شاعری کے لحاظ سے حاصل ہو گئی اور مختلف زمانوں میں نہ صرف یہ کہ باہر کے شعرا وہاں پہونچے بلکہ خود وہاں کی سرزمین سے بھی اچھے اچھے کہنے والے پیدا ہوئے۔

عہد متقدمین و متوسطین میں بیدل، ناجی، فغاں، حسرت اور راسخ ایسی ہستیاں وہاں پائی جاتی تھیں اور اب دور آخر میں امداد امام اثر اور شاد پیدا ہوئے، اثر کا حال میں انتقال ہوا اور شاد کے انتقال کو تین سال ہو گئے۔

شاد عظیم آباد ہی کے رہنے والے تھے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، شاد ۱۸۵۷ء کے غدر سے ۱۱ سال قبل پیدا ہوئے اور ۸۰ سے متجاوز ہو کر انتقال کیا

اس میں شک نہیں کہ ناسخ نے لکھنؤ کو بہت بدنام کیا اور جس لغو شاعری کی طرح انھوں نے ڈالی تھی وہ عرصہ تک قائم رہی لیکن اب تقریباً دس پندرہ سال سے لکھنوی شعراء کا ذوق بالکل بدلتا جارہا ہے اور ان کا رنگ تغزل دہلوی رنگ کا ہوتا جاتا ہے چنانچہ عہد حاضر کے کہنہ مشق شعراء میں آرزو، صفی، ثاقب، عزیز، آثر، اور نو مشق شعراء میں آشفتہ، سراج وغیرہ کا کلام اکثر جذبات سے لبریز نظر آتا ہے، دہلی میں اب بالکل سناٹا ہے۔ کیونکہ سائل و بیخود باوجود دہلوی ہونے کے شاعری کے لحاظ سے دہلی کے لیے ننگ و عار ہیں، دہلی و لکھنؤ سے غیر متعلق لوگ بھی اس وقت بہت بلند پایہ غزلیں کہنے لگے ہیں۔

حسرت موہانی کا ذکر تفصیل کے ساتھ میں نے قصداً نہیں کیا کہ اُن کا مرتبہ غزل گوئی میں اس وقت میر و درد کی طرح مسلم ہے

(بسلسلۂ سابق) ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا اور استادان عصر میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی شاعری کی عمر ۵۰ سال سے کم نہ تھی اور ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت میں انھوں نے کیا کچھ اور کتنا نہ کہا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اب سوائے غزلیات کے ایک مختصر مجموعہ کے اور کچھ ہمارے سامنے موجود نہیں،

شاد اپنے رنگ تغزل کے لحاظ سے بالکل میر و سوز کے متبع تھے، وہی بیان کی سادگی، وہی عجز و فتادگی، وہی سوز و گداز اور وہی محبت خاص جذبات جو غزل کی جان ہیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، سوقیانہ محاورات اور فحش و ابتذال ان کے یہاں بالکل مفقود ہے۔

ذیل کے اشعار سے ان کا رنگ تغزل واضح ہوگا۔

جب اہل شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

جفائے یار کا دل کو ملال آ ہی گیا ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

شب ہجر اس کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

کچھ کہے جاتا تھا، غرق اپنے ہی افسانے میں تھا مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا
ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا
نہ جانبازوں کا مجمع تھا، نہ مشتاقوں کا میلا تھا خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب تو اکیلا تھا
جب کسی نے حال پوچھا رو دیا چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا
دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

گزشتہ رُبع صدی کے اندر غزلوں سے زیادہ نظموں کی طرف ملک کے شعرا نے توجہ کی ہے لیکن میری رائے میں اس کی ابتدا سب سے پہلے نظیر اکبرآبادی نے کی، اس کے بعد اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا حالی نے اس کو ترقی دی یہاں تک کہ اس وقت ملک میں ہزاروں قومی، سیاسی، اور محاکاتی نظمیں کہنے والے پیدا ہوگئے ہیں مگر اس باب میں جو عزت اقبال کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب ہوئی، اکبرالہ آبادی ہرچند اپنے قدیم رنگ تغزل کے لحاظ سے خود بھی کے دور اول میں شمار ہونے کے قابل ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو جس رنگ میں پیش کیا وہ سب سے علٰحدہ ہے اور انھیں کے ساتھ ختم ہوگیا، مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں، اور اگر لکھنوی دور شاعری سوائے انیس و دبیر کے کسی اور شاعر کو نہ پیدا کرتا تو بھی اس کے لیے یہ فخر کم نہ تھا کہ اس نے ایسی دو ہستیاں پیش کیں، گو اُن کا تعلق بھی حقیقتاً دہلی ہی سے تھا۔

(سلسلۂ سابق) میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

رعنائی نفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

ہنا چلا ذہیر اکہ کا تو، سمجھا چلا اپنے دل کی لیکن
بہت دنوں تک دہی دہائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے، ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار لے آشیاں رہے گی

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابر بہاراں، دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اُس کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

مرے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غمخوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

ہم اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں
کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

فنا کے بعد لحد پر وہ آکے روتے ہیں
کہاں کی چھیڑ نکالی ہے کہ دو سوتے ہیں

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو
مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو

شاہان دہلی میں بہادر شاہ ظفر سے بہتر کوئی شاعر نہیں ہوا

اور نوابان اودھ میں آصف الدولہ سے زیادہ صحیح رنگ تغزل کسی نے پیش نہیں کیا، اس رسالہ میں میرا ایک مضمون آصف الدولہ کی شاعری کے متعلق علیحدہ نظر آئے گا،

نوابان رام پور میں سے اکثر نے شاعری کی، لیکن وہ شاعری ایسی ہی تھی جیسی بادشاہوں اور رئیسوں کی ہوا کرتی ہے اسی مضمون کے ساتھ میں چند ضمیمے بھی پیش کرتا ہوں جن سے میرے اس تاریخی تبصرہ کے سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی۔

(سلسلۂ سابق) سنہ ۵ تک نظم کا رنگ تغزل یہ تھا:۔

نہ شوخی، اے حیا کی وضع میں اب فرق آتا ہے   غبار اُڑ نجانہ ہو جانے کہیں ہم خاکساروں کا

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا   لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

ادائیں سادگی دیں، کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا   شکن ماتھے پہ، ابرو میں گرہ، گیسو میں بل ڈالا

گہر ہے کہ صبح بناگوش میں   ستارہ سا ہے جھلملاتا ہوا

آگیا پھر رمضان کیا ہوگا   ہائے اے پیر مغاں کیا ہوگا

پرسان حال وہ ہوا اور سامنے بلاکر   کیا جانیے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں

کہے سنے سے ذرا پاس آکے بیٹھ گئے   نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے
نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا   رُلا کے اُٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے



مولوی امیر احمد علوی- بی اے



مولوی نورالحسن نیر- بی- اے



مسٹر مشیر احمد علوی- بی- اے

اُردو کی مشہور مثنویاں

اصطلاحِ شعراء میں "مثنوی" اُس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کی ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ نہ قصیدے کی طرح ابیات کی تعداد محدود ہے۔ نہ غزل کی طرح ردیف و قافیہ کی قید ہے۔ مناظرِ قدرت۔ فلسفہ و تصوف کے طویل مباحث۔ حسن و عشق رزم و بزم کی داستانیں اس صنفِ سخن میں بخوبی نظم ہوسکتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لئے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں ہے۔

اس ہمہ گیر طرز کی ایجاد کا فخر غالباً ایران کو حاصل ہے اور فارسی شاعری کا گراں ترین گنجینہ اسی صنفِ کلام میں محفوظ ہے۔ شاہ نامہ سکندر نامہ۔ حملۂ حیدری بیانِ رزم میں۔ یوسف زلیخا اور شیریں خسرو، داستانِ محبت میں۔ ہفت پیکر و دشت بہشت قصص و حکایات میں۔ بوستاں تعلیمِ اخلاق میں اور مثنوی معنوی تصوف میں وہ بے نظیر نظمیں ہیں جو فارسی شاعری کی حیاتِ جاوید کا باعث ہوئیں اور جن کو ادبِ ایران سے خارج کردیا جائے تو ہیملٹ کا تماشہ بغیر شہزادۂ مظلوم کے یا اندر سبھا کا کھیل بغیر گلفام کے رہجائے گا۔

اُردو شاعری فارسی کے سانچے پر ڈھالی گئی۔ علم عروض ایران کی معرفت آیا۔ اصنافِ کلام ایران سے آئے۔ تشبیہات و استعارات بلکہ شاعرانہ خیالات بھی اُسی ملک سے لئے گئے۔ بحریں ایران کی تھیں اور اُن کے ابتدائی شناور بھی فارسی نژاد و نکے وارث یا شاگرد تھے عرفی و نظیری۔ صائب و کلیم نے ہندوستان کے سخن فہموں کو غزل کا دیوانہ بنا رکھا تھا اس لئے دکن میں نظمِ اُردو کی داغ بیل ڈالی گئی تو پہلے غزل ہی تختۂ مشق بنی۔ مگر مثنوی کی لذت سے آشنائی تھی اور اسکی منفعت و عظمت سے شناسائی لہذا باوجود دیکہ زبان میں ادائے مضامین کی قدرت نہ تھی مگر پہلے ہی دور سے مثنوی لکھنے کی کوشش کی گئی۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مری زباں کے لئے

کہا جاتا ہے کہ ۱۰۰۱ھ میں قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ نے ایک مثنوی لغت میں لکھی اور یہی پہلی مثنوی تھی جو دکنی بھاشا میں کہی گئی اُس کے بعد متعدد مثنویاں اُسی سرزمین پر تصنیف ہوئیں جنمیں سے غواصی کی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" ہنوز مشہور ہے اور

اس کا سال تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔

برس ایک ہزار ہور پنج تیس میں   کیا ختم یو نظم دن تیس میں

علی عادل شاہ ثانی کے ۱۰۶۳ھ کے عہد سلطنت میں نصرتی نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں سے ایک "علی نامہ" عادل شاہ کے فتوحات کی داستان شاہنامہ کے جواب میں تھی۔ جو نسبت غریب عادل کو کیخسرو اور افراسیاب سے اور اُس کے سپہ سالاروں کو رستم و سہراب سے تھی شاید وہ نسبت بھی اس مثنوی کو شاہنامہ سے نہو گی۔ اسی دوران میں ملا ہاشمی نے یوسف زلیخا کا مشہور قصہ نظم کیا اور اس کے بعد خواجہ بحری نے ۱۱۱۲ھ میں ایک مثنوی "من لگن" نام تصوف میں لکھی مگر ان سب تصنیفات کو اُردو سے معلّیٰ سے وہی دور کا رشتہ ہے جو ڈارون کی تحقیق کے مطابق بندر کو بایرن اور میکالے سے تھا۔

نظم اُردو کے مجدد میر شمس الدین ولی نے ۱۱۴۱ھ میں ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حال میں لکھی۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال   تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال

شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد نے مثنویاں لکھیں جنھوں نے چند روزہ شہرت پائی مگر سید سراج الدین اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان خیال آج دو سو برس کے بعد بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

یہ نظم ۱۱۶۰ھ میں کہی گئی اور اسی رعایت سے اس میں ۱۱۶۰ اشعار ہیں۔

زبس اس میں ہے سیرِ گلشن تمام   رکھا بوستانِ خیال اس کا نام
عدد جبکہ اس نام کے آئے ہاتھ   مطابق ہوئے سال و ابیات ساتھ
یہ دو دن کی تصنیف ہے حسب حال   زباں پر نکل آیا دل کا اُبال

باغ کی سیر کیجیے:۔

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سیر   وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار   جدہر دیکھیے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا   سماں باندھا تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل   خوشی کی گلے میں تھی گویا حمیل
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں   خم زلف لیلیٰ کے افسوں کی تھیں
ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا   ہر اک قطعۂ باغ گل خیز تھا
سمن۔ ارغواں۔ نرگس عبہری   گل لالہ و سیوتی جعفری

درخت آم کے سبز اور سایہ دار — نہالان نوخیز رنگیں بہار
اِدھر بلبلوں کی غزل خوانیاں — اُدھر پھول کی شبنم افشانیاں
پہاڑوں کے تختوں کی سیر — نئی کونپلوں کے درختوں کی سیر
نپٹ جھوم آیا تھا ابرِ بہار — برستی تھی باریک جھم جھم بہار

جنگل کی وحشت اور تاریکی کا سماں۔

وہ صحرائے وحشت فزا لق و دق — کہ اُڑتے تھے شیروں کے دل کے ورق
کہوں کیا میں اُس مینھ کے شدت کی بات — کٹاری تھی بوندی کی ہر بوند سات
پھر اُس پر سنو تم اندھیرے کا حال — نہ تھی شمع داں غیر چشم غزال
وہ تنہائی و وحشت و بیکسی — مجھے اپنے احوال پر تھی ہنسی
صدا رعد کی شدت گرد و باد — قیامت کے دن کی دلاتی تھی یاد
گزرتا تھا ہر آن دل پر یقیں — مگر صدر کا حکم ہے آج ہیں
نہ اُس شب میں تھا روشنی کا نشاں — نہ کچھ (ہی) تھا ستاروں کا وہم و گماں
ہوا جمع یکجا خدا کا غضب — کہ صورت پکڑ نام پایا تھا شب
چراغ اُس اندھیرے میں پاوے کہاں — چمکنا ہی برق کا تھا دہاں
سیہ شب میں بجلی چمکتی تھی یوں — نظر چشم دلبر میں چمکے ہے جیوں
شب مرگ یا جان کی کال تھی — درازی میں ہر ہر گھڑی سال تھی

بے تکلف دوست کا کردار ملاحظہ کیجئے:-

نپٹ بے حجابی ستے ملنے لگے — ہنسی ساتھ جوں پھول کھلنے لگے
کبھی سر کو لاویں مرے منھ کے پاس — کہ پہونچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں — کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
دوپٹا مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں — کبھی شال اپنی مرے تئیں اُڑھائیں
کہوں کیا کہ کیا کیا کئے مجھ سے چھند — کہ دل اسکا ہووے ہر اک طرح بند

عارف الدین عاجز المتوفی [illegible]ھ کا قصہ "لال و گوہر" اُس عہد کی صاف شدہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے۔

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی،
عطا کر مجھ کو یاقوت معانی

سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر
سخن سنجوں کو میرا مشتری کر

سخن کا لال دے میری زباں کو
دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

(جنگل کا سین)

وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار
اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار

وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی
وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی

جب زبان اس منزل سے آگے بڑھی اور مرزا و میر نے غزل کا خیمہ فلک الاطلس تک پہونچایا۔ مثنوی نے بھی ترقی پائی۔ مرزا رفیع سودا نے جو بیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور ظرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری۔ جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کر سکے۔ البتہ میر تقی نے متعدد مثنویاں درد و تاثیر سے لبریز لکھ کر شعر و سخن کے اس تختہ پر آب حیات کا چھینٹا دیا۔ خصوصاً شعلۂ شوق اور دریائے عشق میں فصاحت و بلاغت کے وہ آبدار موتی پروئے کہ یہ نظمیں عروس سخن کا زیور رنگیں اور آج تک مثنویوں کی صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

افسانے دلچسپ نہ سہی دردناک ہیں۔ حکایتیں طویل نہیں نتیجہ خیز ہیں۔ جذبات کی مصوری اور مناظر کی نقاشی ہے۔ بیان کی سادگی، گفتگو کی شیرینی میر صاحب کا حصہ ہے۔

(از مثنوی شعلۂ شوق)

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا
لہو اُسکی آنکھوں سے جاری ہوا

جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا
رُکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا

گئے ہوش و صبر اُس کے یکبارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

کبھو یاں کبھو واں بحال خراب
وہی بے قراری وہی اضطراب

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سُدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے
کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے

کبھو خاک ملتا ہے منہ پر کھڑا
کہیں ہے خرابے میں بے سُدھ پڑا

(از مثنوی دریائے عشق) - اینجاست کہ آفتاب تیز است

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اُس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
خار خار دل غریباں ہے انتظار بلانصیباں ہے

(آغاز محبت)

ایک دن بیکلی سے گھبرایا سیر کرنے کو باغ میں آیا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ تھی طرف اُس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی، وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بیوفائی کی
بستر خاک پر گرا وہ زار درد کا گھر ہوا دل بیمار

(دایہ کے فریب میں پھنسکر دریا میں کودتا ہے)

بے خبر کار عشق کی تہ سے جست کی اُس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں موج زنجیر ہو گئی پا میں
کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب تھی کشش عشق کی گرۂ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اُس کو آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

(عاشق و معشوق کی لاش دریا سے نکلتی ہے)

نکلے باہر وے مُوئے نکلے دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا مر گئے پھر بھی شوق پیدا تھا

ایک کے ہاتھ ایک کے بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے

"مثنوی در بیان دنیا" میں ضعف پیری کی لاجواب تصویر ملاحظہ ہو:-

جوانی گئی موسم شیب ہے — شہود ایک دو روز کو غیب ہے
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام — مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام
بلا ارتعاش تن زار ہے — ہر ایک عضو چلنے کو طیار ہے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
صد افسوس لطف سماعت نہیں — صدا دور سے جیسے آوے کہیں
شباب آہ داغ جگر دے گیا — قد خم زمیں کی طرف لے گیا
جوانی کی شب کیا بسر ہوگئی — سفیدی مُو سے سحر ہوگئی
کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق — جییں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے — تو دیکھو گے ہم پانسے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم — یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
بدن کی ہوی میرے صورت ہی اور — دیے آنکھیں نہیں دے نہ جیون کے طور
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کر پژمردگی — عزیزی کی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھرا گئی
سیہ روے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کریں جیتے ہی مر گیا

اسی زمانہ کے قریب خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر نے ایک نظم "خواب و خیال" تصنیف کی جس کو بعض تبصرہ نگار اعلیٰ درجہ کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ نہ کوئی مسلسل قصہ ہے نہ داستان۔ نہ مصوری ہے نہ سیرت نگاری صرف زبان کی صفائی ہے اور مواصلت میں عریاں نگاری کی ایجاد کا شرف۔ شاعر کو خود اعتراف ہے کہ

وضع اس کی ہوئی خلاف طبع — ہے مجھے اس سے انحراف طبع

یہ تو قابل نہیں سُنانے کے — نہیں لائق کہیں دکھانے کے
ایک دو دن میں کھلکے پھینک دیا — نہیں معلوم کن نے اس کو لیا
اب جو دیکھو کسو کے پاس کہیں — ہیں یہ اشعار اُسی کے میرے نہیں

مثنوی کا بیشتر حصہ فارسی اشعار اور میر درد کی غزلوں سے بھرا ہوا ہے۔ سیکڑوں اشعار معشوق کے سراپا کی توصیف میں ہیں جن میں سے چند مرزا علی لطف نے تذکرۂ گلشنِ ہند میں نقل کر کے اس نظم کی تضحیک کی ہے۔ مثلاً:۔

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں — شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے — رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

میر تقی علیہ الرحمۃ نے بھی ایک مثنوی "خواب و خیال" نام لکھی تھی اور اُس میں بھی معشوق کا سراپا تھا۔ صرف ایک شعر پر میر اثر کا کل سراپا قربان ہے۔

"سراپا میں جس جا نظر کیجئے — وہیں عمر اپنی بسر کیجئے"

اثر کی اس نظم کے بعض اشعار خوب ہیں۔

ہجر میں جی ہے میرے پاس کہاں — وصل میں گر جیا حواس کہاں
درد کوئی کسی کا کیا جانے — اُس کا دل جانے یا خدا جانے
رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے — بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے

لیکن یہ غزل کے مضامین ہیں۔ مثنوی چیزے دیگر است۔

شیخ قلندر بخش جرات نے دو مثنویاں لکھیں۔ وہ مشہور نہ ہوئیں۔ البتہ ان کے آقائے نامدار۔ نواب محبت خاں فرزند کشتۂ جفائے شجاع الدولہ حافظ رحمت خاں روہیلہ کی مثنوی اسرارِ محبت عام و خاص میں مقبول ہوئی یہ ۱۱۹۶ھ کی تالیف ہے۔

کہی تاریخ اُس کی یہ بصنعت — عجب قصہ ہے اسرارِ محبت

مصحفی کی زبان ہے اور جرأت کا انداز بیان "بدمستی" اور "جنوں" کے عشق محبت کا افسانہ ہے یا سوز و گداز کا تصویر خانہ!

پہلے متفرق اشعار سنئے:۔

محبت نام ہے اور ہر دل نگیں ہے — محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
کرے بے خود سو وہ مے ہے محبت — خدا جانے کہ کیا شے ہے محبت

یہ گرمی حُسن کی اُس نازنیں پر | کہ گویا مہر اُتر آیا زمیں پر
ہر ایک تھا غنچۂ گل جیوں گلابی | شجر جھومیں تھے سب مثل شرابی
وہ سرگرم رہِ دشتِ فنا تھی | اجل تھی وا اپنے بائیں قضا تھی

(ہجر کی مصیبت)

جنونِ عشق جب ہوتا زیادہ | نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی مکھڑے پہ کر زلفیں پریشاں | گریباں چاک کرتی تا بہ داماں
کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں اکبار | زمیں پر بیٹھ جاتی ہو کے ناچار
کبھی گھبرا کے اُٹھ کر واں سے چلتی | اُٹھا کر خاک اپنے منھ سے ملتی
غرض دشوار تھا آرام پانا | کبھی اُٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی وہ دوپہر آوارہ پھرنا | کبھی اُٹھنا کبھی غش کھا کے گرنا
کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا | کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا | کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
اُسے جب کوئی سمجھانے کو آتا | تو یہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا
کبھی چُپ اور کبھی رو رو بلکتی | بسانِ موج سر دے دے پٹکتی

کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں فضایل علی خاں بے قید نے ایک مثنوی اپنے حالات میں لکھی تھی اور میر و مرزا کے عہد تک اُس نظم کی اتنی شہرت تھی کہ ایوان فصاحت کے بالانشین میر حسن نے "حسب حال خود مثنوی گفتہ و بسے دُرہائے معانی سفتہ" کا سرٹیفکٹ دیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اُسی نظم کے نمونہ پر میر حسن نے اپنی مشہور و معروف مثنوی سحرالبیان، تصنیف کی وہ خود فرماتے ہیں :-

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان | نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیان
جو منصف سُنیں گے کہیں گے یہی | نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

شیخ مصحفی نے " یہ بت خانۂ چین سے بے بدل " اور فخرالدین ماہر نے " ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح " مصرعہائے تاریخ کہے جن سے مصنف کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اس طرز کی کوئی دوسری مثنوی اُسوقت اُردو زبان میں موجود نہ تھی۔

بہرحال یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ بہادر تمام ہوئی اور اس میں جذبات قلبی۔ واردات عشق۔ ہجر و وصل۔ مناظر قدرت۔ سراپا۔ زیورات۔ رئیسوں کی معاشرت۔ بیاہ شادی کے رسوم۔ اہل حرفہ کی اصطلاحیں۔ آزادوں کی بولی ٹھولی کے ساتھ ساتھ قصہ دلچسپ۔ داستان پرلطف۔ قافیے چست۔ زبان صاف و شستہ۔ تمام اوصاف و محاسن جمع تھے۔ اول سے آخر تک کوئی شعر بیکار نہیں اور کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں۔

ہجر کی رو داد ایسے موثر الفاظ میں بیان کی کہ اُردو شاعری کے سارے خزانے میں اس سے زیادہ باثر اور سچی تصویر غم جدائی کی موجود نہیں ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جاکے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" تو اُٹھنا اُسے کہکے "ہاں جی چلو"
جو پوچھا کسی نے کہ "کیا حال ہے" تو کہنا "یہی ہے جو احوال ہے"
کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے" کہا "خیر بہتر ہے منگوائیے"
جو پانی پلانا تو پینا اُسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

(بے قراری بڑھتی ہے)

زباں پر تو باتیں و لے دل اُداس پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منھ کی خبر اور نہ تن کی خبر نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی جو کنگھی نہیں ہے تو یونہیں سہی
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سُبھاؤ کہ بگڑے سے دونا ہو اُن کا بناؤ

تصویر کشی کے کمالات:۔

(عیش بائی مجرے کے لئے حاضر ہوتی ہے)

وہ خلقت کی گرمی وہ ڈومن پُنا نشے میں بھبھوکا سا چہرہ بنا
وہ بن پونچھے ہونٹوں کی مستی غضب کہ منھ پر تھی گویا قیامت کی شب

بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال　　کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ اُٹھی ہوئی چین پشواز کی　　وہ مَسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے　　وہ پاؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی وانسے دامن اُٹھاتی ہوئی　　کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافر اس آن سے　　کہ جانے لگا جی مسلمان سے

(ناچ گانا ہوتا ہے)

وہ رقص بتاں اور ستھری الاپ　　وہ "گوری" کی تانیں وہ طبلہ کی تھاپ
وہ دل چھینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ　　اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

(شہزادہ لب بام سے غائب ہوگیا۔ خواصوں کی پریشانی)

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی　　کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو　　گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی　　رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں سے داب　　کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
لب بام کثرت جو یکسر ہوئی　　تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

(وزیر زادی جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلتی ہے۔ جوگن کی تصویر)

کئی سیر موتی جلا راکھ کر　　بھبھوت اپنی تن پر ملی سر بسر
پہن ایک لہنگا زری بافت کا　　وہ پردہ سا کر اُس تن صاف کا
زمرد کے مُندرے لگا کان میں　　کہ جوں سبزہ گل ہو گلستان میں
زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال　　اور اک بین کاندھے پر اپنے سنبھال
وہ موتی کی مالا وہ مونگے کا ہار　　گل نسترن کی چمن میں بہار
وہ قشقہ کھنچا سرخ ماتھے پہ یوں　　پڑے نور پر لعل کا عکس جوں
پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کیس　　چلی بن کے صحرا کو جوگن کا بھیس
وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی　　تو وہ صاحب خانہ رونے لگی

وہ رو رو کے دو ابر غم یوں ملے　　کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے
نہ شُدہ بدہ کی لی اور نہ منگل کی لی　　نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

آصف الدولہ کے عہد میں نوجوان رئیس زادوں کا فیشن۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن　　جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک　　بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں　　کہ جوں عکس مہ زیب آب رواں
طرحدار اک سر پہ پھینٹا سجا　　تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا تکہ گلے میں بندھا　　ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کا لٹکن زمرد کی ہڑ　　لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ انگشتری　　سراسر حنا دست و پا میں لگی
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل　　جوانی کی شب اور سماں برمحل

کلام کا زور اور قافیوں کی چُستی۔

دوپٹے کو کرنا کبھی مُنھ کے اوٹ　　کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹ پوٹ
فقیری جو کیجئے تو دُنیا کے ساتھ　　نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
غلاف اُنپہ باناتِ پر زر کے ٹانک　　شتابی سے نقاروں کو سینک سانک
گئی بائیں کی آسماں تک گمک　　اُٹھا گنبد چرخ سارا دھمک
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے　　وہ پاؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوئے
یہ کہہ نیچے اُترا دبے پاؤں وہ　　نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
صباحت صفا اُس میں جھلکی ہوئی　　پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل　　کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت　　مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ　　ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ ساری کتاب حفظ کرنے کے قابل ہے:۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا ایں جاست

میر حسن نے دو مثنویاں اور لکھیں۔ رموز العارفین تصوف میں اور گلِ ارم فیض آباد کی تعریف میں۔ ایک سحر البیان سے پہلے اور دوسری اُس کے بعد مگر اِس شاہکار کی چھاؤں تک بھی نہ پہونچ سکے۔

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہو سب کا سر   مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

سید انشا نے دریائے لطافت میں اس مثنوی کے انداز بیان پر تعریفیں " بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی۔ گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں" لیکن خود اس میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ متعدد مثنویاں "زنبور" و "پشہ"۔ "فیل" "مرغ" کی داستانوں میں اور ایک اپنے عاشقی کے احوال میں لکھی مگر میر حسن کی گرد کو بھی نہ پہونچے۔ چند اشعار یہ ہیں :۔

گردوں کیا جور گر دوں کی شکایت   جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت
ستائے بن نہیں ہے کام اُس کو   کہاں بن دُکھ دئے آرام اُس کو
نہیں معلوم منظور اُس کو کیا ہے   بُری چتون سے کافر دیکھتا ہے

(پہلی ملاقات)

گئی آنکھوں تلے بجلی سے اِک کوند   سمندِ ناز نے ڈالا اُسے روند
کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ   کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ
سُہانا تھا کچھ ایسا روپ اُس کا   کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اُس کا
وہ ظالم کے مسی آلودہ دنداں   جھلک میں موتیوں سے بھی دو چنداں
پڑے ہونٹوں میں تھے ایسے دمکتے   کہ ہوں جوں رات کو جگنو سے چمکتے

(فراق کی بیتابی)

ہوں پڑا ہے اور جی میں ہے درد   بھرا کرتا ہوں جب تب میں دم سرد
مجھے کچھ کھانے پینے کا نہیں ہوش   تصور سے اُنھوں کے ہوں ہم آغوش
لگی ہے آگ سی اک دل میں میرے   سمائی وحشت آب و گل میں میرے
یہ گھر سُنسان اُن بن لگے ہے   کسی کو جس طرح سے جن لگے ہے

ان کے دوست یکرنگ سعادت یار خاں رنگین نے ایک مثنوی ریختی میں لکھی اور عورتوں کی زبان میں میر حسن کے انداز بیان کی نقالی کی :۔

یہ جو ملنے میں اُس سے شرماتی — وہ اُسے چھیڑ چھیڑ گرماتی
آگئیں خوب اُس کے جب بس میں — پھر تو دینے لگیں اُسے قسمیں
اب تجھ سے ہے یہ سوال میرا — کیوں تجھ کو نہیں خیال میرا
ہستی تری ہے اگر نمودار — تو میری دھڑی بھی ہے دھواں دار
گر نکلے ہے تجھ پہ خلق کا دم — تو مجھ کو بھی چاہتا ہے عالم

افسوس ہے کہ فحش کی آمیزش نے مثنوی کو اس قابل نہ رکھا کہ اُس کے طویل اقتباسات پیش کئے جاسکیں اور کوئی مسلسل بیان نقل کیا جاسکے۔

اُستاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ایک مثنوی بحر المحبت نام میر تقی کی دریائے عشق کے جواب میں لکھی۔

گرچہ ہے کلک میر نادرہ کار — تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا — دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

وہی قصہ ہے وہی بحر لیکن وہ درد نہیں۔ میر صاحب کے ہر شعر کا جواب لکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔

میر:۔ ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
مصحفی:۔ جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ — لہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ
میر:۔ نکلے باہر وے مُوئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
مصحفی:۔ دو بہم آغوش دام میں نکلے — پکّے اپنے وہ کام میں نکلے
میر:۔ کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب — تھی کشش عشق کی مگر تہ آب
مصحفی:۔ کشش کے ساتھ ہی گیا تہ آب — ہوا غواص گوہر نایاب

شیخ صاحب مثنوی کے خاتمہ پر عرض پرداز ہیں:۔

ہے توقع کہ صاحب انصاف — مجھکو اس گفتگو میں رکھیں معاف
کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں — نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

لہذا موازنہ مناسب نہیں اور اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ ہنسوڑ کہتے ہیں:۔

"کہاں چاندنی چوک کی سلونی زبان اور کہاں یہ امروہہ کا پھیکا پکوان !!"

اس بحر کے آبدار موتیوں کا نمونہ یہ ہے:۔

ہجر میں وصل جاودانی ہے　　ہجر عاشق کی زندگانی ہے
نہ کوئی آشنا نہ ہمدم ہے　　ہے جو مونس تو بس ترا غم ہے
جان مضطر ہو تن سے جانے لگی　　بیخودی میں غشی سی آنے لگی

مصحفی کے شاگرد رشید طالب علی خاں عیشؔ نے ایک مختصر مثنوی "سوز و ساز" لکھی۔ قصہ دلچسپ نہیں لیکن بندش کی صفائی اور تاثیر کلام میں اُستاد سے گوئے سبقت لے گئے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:-

سرمایۂ سوز و ساز ہے عشق　　نیرنگ نیاز و ناز ہے عشق
دل بسکہ ضعیف و ناتواں ہے　　تن پر مرے جان بھی گراں ہے
طاقت نہیں جان مضمحل میں　　اک آگ سی لگ رہی ہے دل میں
ناساز ہوئی جو زندگانی　　بیمار نے اپنی موت ٹھانی
گر عشق دکھائے اپنی بازی　　محمود کیا کرے ایازی

مصحفی کے دوسرے نامور شاگرد میر تقی ہوسؔ نے نظامیؔ کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کیا اور ایسی دردناک مثنوی لکھی کہ دریائے عشق اس کے آگے پانی پانی ہے۔ قصہ دلچسپ۔ انداز بیان درد خیز۔ بحر عاشقانہ۔ مثنوی کو قبولیت نصیب ہوئی۔ زبان اب بہت ترقی کر چکی ہے۔ "نپٹ"۔ "نت"۔ "روندھنا" وغیرہ الفاظ غیر مانوس ہو گئے ہیں لیکن کلام کی تاثیر آج بھی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے اور آنسوؤں کے دو چار موتی شاگرد مصحفی کی اس یادگار پر چڑھانا ہی پڑتے ہیں۔

ابتدائے عشق:-

از بہر تجسّس دل آرام　　جھک جھک کبھی دیکھتا در و بام
کرتا کبھی دیکھنے کی گھاتیں　　کرتا کبھی آپ ہی آپ باتیں
رک رک کے گہے زار زار روتا　　اُٹھ بیٹھتا گاہ سوتا ہوتا
کرتا کبھی چاک پیرہن کو　　ملتا گہے خاک سے بدن کو
ہر کوچے میں بے قرار پھرتا　　غش کھا کے ہر ایک در پہ گرتا

لیلیٰ غرفہ سے مجنوں کو دیکھتی ہے:-

آلودہ بگرد و سر تا پا　　ڈوبی بہ عرق میں سر سے تا پا
تہہ گرد کی اُس کے تھی بدن پر　　تھا بار لباس اس کے تن پر

عریاں تھا جو بے کلاہ واں سر ‏ افسوس سے ہاتھ یاں جبیں پر
واں درد سے تھا وہ دست بر دل ‏ یاں عشق سے تھی شکست بر دل
وہ فرش زمیں پہ پا بزنجیر ‏ مسند پہ یہاں یہ غم کی تصویر
وہ صورت موج بے قراری ‏ یہ غرق بہ بحر شرمساری
بسمل کی طرح سے وہ پھڑکتا ‏ دل سینے میں اس کا تھا دھڑکتا
وہ آتش عشق سے پھنکے تھا ‏ یاں ضبط سے اس کا دم رکے تھا
ملتی تھی اُدھر وہ دست افسوس ‏ کرتا تھا یہ دور سے قدمبوس

مجنوں کی ماں کا حال زار۔

ماں کا ترے حال ہے دگرگوں ‏ ہے یاد تری ہی اُس کو مجنوں
روتی شب و روز رہتی ہے وہ ‏ بےچین ہو کر یہ کہتی ہے وہ
مجنوں کی مجھے خبر نہ آئی ‏ صورت وہ کہیں نظر نہ آئی
جس روز سے تو جدا ہوا ہے ‏ میں کیا کہوں اُس کو کیا ہوا ہے
مطلق نہیں اپنا ہوش اُس کو ‏ غم رکھے ہے نت خموش اُسکو
ہے شدت غم مدام اُس کو ‏ ہے خواب و خورش حرام اُس کو
کھینچے ہے جگر سے آہ پر آہ ‏ خوں روتی ہے شام اور سحرگاہ
نے گھر کا اُسے خیال تجھ بن ‏ نے غم سے ہے اُس میں حال تجھ بن
بے فرش پڑے ہیں سارے دالان ‏ سب گھر ہے بغیر تیرے ویران
ہے نام ترا ہی لیتی پھرتی ‏ بالوں سے ہے جھاڑو دیتی پھرتی

نواب اعظم الدولہ سرور دہلوی نے سات مثنویاں یوسف زلیخا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں وغیرہ تصنیف کیں اور "ہفت سیارہ" کے نام سے سپہر سخن پر درخشاں ہوئیں مگر اب اُن کا نشان نہیں ملتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

اگر حاصل ہو عمر جاودانی ‏ نہیں بن عشق لطف زندگانی
.... ‏ ....
اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر ‏ نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

اندوہ میں اُسکے راحتیں ہیں		مرغوب اُس کی اذیتیں ہیں
مجھ کو رہے عشق سے سروکار		اس نشہ کا دل سے ہوں طلبگار

۱۲۲۵ھ میں دہلی کے ایک شاعر منشی مولچند نے تقریباً ۹۰۰۰ بیت کی ایک طویل مثنوی لکھکر ادب اُردو کا دامن جمشید و کیخسرو۔ رستم و افراسیاب کی کہانیوں سے بھر دیا۔ سبب تالیف مولف کی زبان سے سنئے :۔

عزیزان معنی شناس ایک روز		کہ تھا مثل نوروز بہجت فروز
بہم محفل آرا تھے ہنگام شب		مہیا تھے سامان عیش و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار چمن		ہر اک لحظہ تھا ذکر شعر و سخن
تو تاریخ کا بھی جو مذکور تھا		تو واں پر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشہ کتاب		عجب نظم دلکش ہی با آب و تاب
توکل کہ مرد سخن سنج تھا		کیا ترجمہ اُس نے شہنامے کا
لکھا نثر میں قصۂ مختصر		کہ احوال معلوم ہو سر بسر
یہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے		تمام اُس میں احوال مرقوم ہے
یہ سُنکر برادر مرے مہرباں		سخن فہم دانشور و نکتہ داں
یہ بولے کہ منشی جی اس نامے کو		تم اب ریختے کی زباں میں لکھو
ہوا میں دل وجاں سے مصروف کار		لکھی نظم یہ دلکش و آبدار
مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا		کیا فکر تب سال تاریخ کا
تو پھر ہاتف غیب نے صبحدم		کہا۔۔ قصۂ خسروان عجم

شعرا کے نقطۂ نگاہ سے اس مثنوی میں بے شمار نقائص تھے۔ بندشیں کمزور۔ قافیے سُست۔ محاورے بے محل الفاظ غلط۔ اُن کی بزم میں یہ نظم مقبول نہوئی مگر داستانیں دلچسپ تھیں۔ بیان صاف وسادہ تھا۔ ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مُنیزہ کی کہانی گلی گلی بیان ہونے لگی۔

مُنیزہ ہوں میں دُختِ افراسیاب		کیا گردشِ آسماں نے خراب

ناگ پنچمی اور سلونو کے میلوں میں یہ شعر اب بھی سُننے میں آجاتا ہے۔

پکڑ کر کمر بند سُہراب کا		زمیں سے لیا پیلتن نے اُٹھا

اسی عہد کے قریب حکیم مومن خاں دہلوی نے متعدد مثنویاں لکھیں جن میں سے شکایت ستم (۱۲۳۱ھ) قصۂ غم (۱۲۳۵ھ) اور قول غمین (۱۲۳۶ھ) نہایت درد انگیز ہیں مگر ادب اُردو کی بدنصیبی سے ان کی واقعہ نگاری اور سخن طرازی کی کچھ قدر نہ ہوئی، غزلیں غالب کی "واہ واہ" سے اور مثنویاں میر کی "آہ" سے کم رتبہ سمجھی گئیں۔ اسباب و علل پر مباحثہ فقیر کا شعار نہیں لیکن یہ واقعہ کا اظہار ہے کہ آج سخن سنجوں کی بزم میں چند ہی نفوس اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ مومن کی مثنویاں درد و تاثیر میں میر مصحفی کی مسلسل نظموں سے فائق ہیں۔ اور غالب تو اس میدان کے مرد ہی نہ تھے وہ صرف غزلوں کی "شاخ"[۱] سے "چوگان" کھیلتے تھے اور اس بازی میں بھی مومن سے اکثر ہارتے تھے !!

مومن اُسی نے تجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم تیرے اشعار تک نہ پہونچا

جدائی

(از قول غمین)

اس کے کوچے سے نہ اُٹھتا تھا قدم — بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
دل میں جب ہوک اُٹھی بیٹھ گیا — پاؤں اُٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا

آخری ملاقات

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی — کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگان بیکس — دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم — حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام — پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو — مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اور وں سے لگا بیٹھو جی — نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو — رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے — ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

---

[۱] - ایک مختصر مثنوی انبہ کی تعریف میں غالب نے کہی تھی-

آم کا کون مرد میداں ہے — ثمر و شاخ گوی و چوگاں ہے

تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ ہم چلے حسرت و حرماں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا تم کو تو ہم نے خدا کو سونپا

چھیڑ چھاڑ

(از قصۂ غم)

وہ ہاتھ کو دمبدم جھٹکنا وہ تکیے پہ سر کو دے پٹکنا
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ جی سے تنگ ہونے لگتا کچھ بس نہ چلا تو رونے لگتا

اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک ہندو شاعر راحت (یا تاج ؟) تخلص نے نلدمن فیضی کا خلاصہ اُردو نظم میں کیا۔ قصہ کی نُدرت سے مثنوی مشہور ہوئی اور آج تک نوجوانوں کی صحبت میں اُس کی قدر باقی ہے۔ زبان صاف اور شاہنامہ منشی سے بہتر ہے۔

سببِ تالیفِ کتاب :-

قلم سے کر کے اول دُر فشانی لکھوں میں دل کے اسرار نہانی
کہ تھا از بس سخن سے ذوق مجھ کو سدا تھا مثنوی سے شوق مجھ کو
جو دیکھا آج کل ہندی کا چرچا ہوا دل ایک دن مشتاق اُس کا
کہ عشقِ نل جو ہے عالم میں مشہور کرے ہندی زباں میں اسکو مذکور
اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے مگر طول سخن ہر اک داستاں ہے
کرے تو مختصر ایسا بیاں سب کھُلے ہر اک پہ جو راز نہاں سب

ہندوستان کی تعریف :-

زبس ہے حُسن میں وہ مُلک نامی بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی
وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک پھنسے جس میں دل اسلام بیشک
جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی کریں کیونکر نہ واں سب جبہ سائی

یہ مثنوی ۱۲۲۴ھ میں تمام ہوئی۔ " یہ داستان ہے راحت افزا " تاریخ اختتام ہے۔ مصنف کا صحیح نام معلوم نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا ہے کہ تاج بہادر تاج کی تصنیف ہے جو محلہ نوبستہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کوئی راحت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ داستان مشہور ہے

مگر داستان گو گمنام ہوگیا۔

میر تقی۔ میر حسن۔ انشا و مصحفی نے لکھنؤ کی مبارک سرزمین پر اپنی مشہور مثنویاں تمام کیں لیکن اُن کے سینوں میں دلّی کے "اُجڑے ہوئے دیار" کی یاد تھی۔ وہ اپنی زبان و محاورات کی سند کے لئے "خانم کی بازار" اور "جامع مسجد کی سیڑھیوں کی" طرف اشارہ کرتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور بیان کا اسوقت تک کوئی جداگانہ انداز نہ تھا اس لئے زبان کے اعتبار سے ان بزرگوں کی مثنویاں خواہ لکھنؤ کی خیال کی جائیں یا دلّی کی مگر ان سب میں عموماً اور سحر البیان میں خصوصاً لکھنؤ کی معاشرت کا اس قدر گہرا نقش ہے کہ میر حسن کی مثنوی کو تو خاص لکھنؤ کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔

ناسخ و آتش کے دور میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا۔ نواب وزیر شہر نجف کے بادشاہ بنے۔ متروکات سخن کے نئے دفتر اور معائب کلام کے جدید قوانین مرتب ہوئے۔ تازہ محاورات خانہ ساز ٹکسال میں ڈھلنے لگے۔ شعرا نے دلّی کی مرکزی حکومت کا جُوا گردنوں سے اُتار پھینکا۔ صحت زبان صفائی بیان پر مرجح قرار پائی۔ صنعت طرازی اظہار جذبات سے اعلیٰ متصور ہوئی اور زباندانی و خوش بیانی کا ایک جدید اسکول یہاں قایم ہوگیا۔ اس دور انقلاب کی پہلی مشہور مثنوی شیخ ناسخ کی نظم سراج ہے جو ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی چھ سات سو بیتوں میں بعض احادیث کا ترجمہ ہے صحت الفاظ میں شک کی گنجایش نہیں لیکن قافیے بے حد سست ہیں۔ "نیک نام" "نیک خو" "خوش بیان" "خوش کلام" وغیرہ وقت عام صفتیں مصرعوں کا وزن پورا کرنے کو بے ضرورت استعمال کی گئی ہیں اور ایک شعر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس مضمون میں نقل کیا جائے۔ "معجزۂ آل نبی" اور "قصۂ شاہ روم" جو اسی زمانہ کی بعض غیر مشہور شاعروں کی تصنیفات ہیں وہ مجود زبان کی اس مثنوی سے افضل ہیں۔ اُن میں روانی اور تاثیر ہے جس کا نظم سراج میں نشان نہیں۔ ناسخ کی مثنوی کلیات میں بحفاظت مقفل ہے لیکن "قصۂ شاہ روم" اب بھی بچوں کی زبان پر ہے۔

عجب تھا سہگیں میداں وہاں کا — شجر ہی واں نہ تھا سایہ کہاں کا
ہوئی مرضی جو رب العالمیں کی — طنابیں کھنچ گئیں اُس سرزمیں کی
وہ شہ اور فوج و لشکر اُس کے ہمراہ — ستاروں کے ہو جیسے بیچ میں ماہ

شیخ ناسخ کے انتساب سے نظم سراج لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی تصور کی گئی ورنہ شاعرانہ حیثیت سے اُس کا کوئی درجہ نہیں۔ علاوہ اس کے وہ اس جہت سے بھی اول کہلانے کی مستحق نہیں کہ جو اس نظم کا سنہ تالیف ہے وہی سال اُس بے مثال مثنوی کے اختتام کا ہے جس کا ادب اُردو میں کوئی ثانی نہ ہو سکا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل بکاؤلی کا دلچسپ قصہ جو پہلے سے اُردو نثر میں موجود تھا نظم کیا

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں

اور ۱۲۵۴ھ میں یہ بیش بہا مثنوی تمام ہوئی۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنہاد — گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد — توقیع قبول روزیش باد
۱۲۵۴ھ

میر حسن نے مناظر کی مصوری اور جذبات کی نقاشی میں کمال دکھایا تھا لیکن داستان اُن کی طبعزاد تھی جس جگہ جیسی ضرورت ہوئی قصہ کو توڑ مروڑ لیا۔

نسیم دوسرے کی لکھی ہوئی ... وہ ادب زبان باستانی" کے پابند تھے اور اس میں ترمیم و تحریف کی گنجائش نہ تھی۔

میر حسن نے زبان صاف۔ سادہ اور بے تکلف اختیار کی جو واقعہ نگاری کے لئے مناسب و موزوں تھی۔ نسیم نازک خیالی۔ نقش طرازی۔ اور معنی آفرینی کے بغیر شعر کہنا وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی جگہ اسلوب بیان سحرالبیان سے ٹکر نہ کھائے۔ ان سخت قیود کے ساتھ داستان نگاری میں کامیابی نسیم کا سحر و نیرنگ ہے۔

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر — نیرنگ نسیم باغ کشمیر
نقطے ہوں پسند خوش بیانی — جدول ہو حصار سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے — مرکز کشش مری پہونچ جائے

مصوری کے کمالات دیکھئے :-

(۱)

اک شب راجہ تھا محفل آرا — یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے — شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
منھ پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چیتون کو ملا کے رہ گئی ایک — ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

راقم الحروف کئی دن غور کرتا رہا کہ مندرجۂ بالا دو شعروں کا جواب اُردو شاعری کے تمام سرمایہ میں کہیں موجود ہے یا نہیں بلکہ فارسی کی گرانقدر مثنویوں میں بھی یہ سینما کی سی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں یا نہیں مگر کوئی نظیر یاد نہ آئی۔ ممکن ہے کہ اُسکی کوتاہ نظری کا قصور ہو یا فہم کا فتور۔

(۲)

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں — باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی — جانا کہ حریف نے اُڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں
رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو
ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو

واقعہ نگاری کی شان دیکھئے :-

روح افزا نے کہا بہن سے
بہتر کوئی جا نہیں چمن سے

گلگشت کریں چلو --- کہا خیر
کیا جانئے کہ ہوگی سیر میں سیر

چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا
کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا

روح افزا نے کہا کہ ہمشیر
میں نے یہ سُنا کہ تو ہے دلگیر

واللہ کہ چھپا نہ کر خدائی
تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی

سمجھی وہ ہنسی کہا سخن ہو
نادان ہو کیا کہوں بہن ہو

ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا
پیارا ہوئیگا وہ تمھارا

پیارا ہو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں
ہر رہی آپ ہو گئیں کیوں

بولی وہ آشنا تمھارا
پیارا نہیں پیاری کا ہے پیارا

گر اُس کی تلاش میں میں کھوئی
ہر راہ نہ کہہ سکیگا کوئی

جو چاہو کہو جواب کیا دوں
قایل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں

وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن
دکھلا یا تو تھی اُسیکی جوگن

جذبات کی نغمہ سرائی :-

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی ،
پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں ! ادھر گیا گل ؟
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

تھرائیں خواصیں صورت بید
اک ایک سے پوچھنے لگی بھید

اپنوں میں سے پھول لیگیا کون
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

اشارات وکنایات کا طلسم:۔

جب پردۂ صبح ہو گیا فاش
خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش

اُس غنچہ دہن کا مسکرانا
بے رنگ بکاؤلی نے جانا

ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں
ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں

بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا
آتش پہ کباب دیکھتا تھا

بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر
دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر

بولا وہ کہ رات کو اُفق میں
خورشید تھا آتش شفق میں

بولی وہ کہ مہر سے شب و روز
عالم میں رہوگے رونق افروز

بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا
گلزار خلیل روبرو تھا

بولی وہ بشر ہو تم دلاور
سر سبز ہو قوم آتشی پر

بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں
شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں

بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں
جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں

بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا
بخشا مہ انجمن نے بالا

بالا مہ انجمن کا کیا تھا ؟
وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا!!

گھبرائی پری کہ ہیں! یہ کیا ہے؟
بولی وہ کہ ہار نوکھا ہے!!

کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا
پہچانتی ہو وہ سطبلے والا

صنعت طرازی کے ساتھ الفاظ کی سادگی اور قافیوں کی چستی ۔

تو باغ ارم سے لے گیا گل
تو مجھ سی پری کو دے گیا جل

تجھ کو ترے باپ سے ملایا
مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی | سب تجھ سے سُنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
اب تک ہیں وہ خار جی کے جی میں | جلد آکہ ہے مصلحت اسی میں
آئے گا تو درگزر کروں گی | ورنہ میں بہت سا شر کروں گی
کانٹوں میں اگر نہوا اُلجھنا | تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

اختصار اس مثنوی کا بے مثال ہے۔ ایک شعر درمیان سے حذف کیجئے تو ساری داستان برہم ہو جائے۔

طوطا مُنکر شجر پہ آکر | پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گوند چھال لکڑی | اُس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی
گھر بار سے کیا فقیر کو کام | کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب ؟ کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب ؟ کہا۔ قناعت
تنہا اُسے دیکھ کر کہا - ہیں ! | محوِ د اکیا ہوئیں ؟ کہا " ہیں "
یہ کہکے اُٹھا کہا کہ " لو جان | جاتے ہیں کہا - " خدا نگہبان "
پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام | بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام
تیورا کے وہیں وہ بار بردوش | بیٹھا تو گرا ۔ گرا تو بیہوش
جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے | سمجھا کے ۔ دبا کے ۔ دست پا کے
مَن چھین کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانے

نازک خیالی کا کمال

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں | کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں
سیاح کو کیا قیام سے کار | شبنم نہیں جاگزین گلزار
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

اشعار کہاں تک نقل کئے جائیں۔ اول سے آخر تک صنایع و بدایع کا دریا موجزن ہے۔ جب تک اُردو زبان ہندوستان میں زندہ ہے یہ نظم سخن فہموں کے گلے کا ہار رہیگی اور سحرالبیان کے برابر اس کی عزت و توقیر ہوگی۔

گلزار نسیم کی مہک نے سخنوروں کی محفل کو طبلۂ عطار بنا دیا۔ لکھنؤ کے گلی کوچے اس خوشبو سے مست ہوئے اور مثنوی کہنے کا

عام شوق پیدا ہوگیا۔

نازک خیالی اور سخن آفرینی کے ساتھ واقعہ نگاری نسیم کا حصہ تھا۔ تقلید کی بیشتر کوششیں ناکام رہیں۔ ملک الشعرا قاضی صادق علی خاں اختر نے ایک مثنوی "سراپا سوز" لکھی۔ نہ بیان میں روانی تھی نہ زبان میں شعلہ فشانی۔ افسانہ بھی دلچسپ نہ تھا۔ دُختِ زرگر کی کہانی بُھکر رہ گئی۔ (رئیس زادہ جوگی بنکر آتا ہے)

گرد و پیش اُس کے ایک جمِ غفیر		ہمدم گریہ سب صغیر و کبیر
خاک اڑاتا تھا اپنے سر پہ کوئی		ہاتھ رکھے ہوئے جگر پہ کوئی
کوئی کرتا تھا اس طرح نالے		جس سے جینے کے پڑ گئے لالے
لوگ تھے گرد ماتمی سج سے		بیچ میں وہ جوان تھا اس دھج سے
تن کی اُس کے بھبھوت سے یہ نمود		جیسے دُرِّ یتیم گرد آلود
سر پہ یوں زر کے اژدرے کی پھبن		ہووے سورج کے گرد جیسے کرن
کنڈل اُن کانوں میں یہ آفت ہوش		مہر دمہ جیسکی جیب کے حلقہ بگوش
زیبِ بخشِ گلو تھا یوں زنّار		ہو بندھا جیسے آنسوؤں کا تار
غرض اس شکل سے جو آتا تھا		خلق کا جی ہی نکلا جاتا تھا

آتش کے نامور شاگرد میر وزیر صبا نے ۱۲۶۲ھ میں ایک مثنوی "صیدیہ" لکھی۔ اپنے مُربّی نواب محسن الدولہ کے سیر و شکار کی حکایت نظم کی۔ صنایع و بدایع کے طلسم بنائے۔ محاورات کے دریا بہائے لیکن قبولیت عام کا شکار نہ کر سکے۔ بہرحال اُستاد کا کلام ہے اور موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ چند اشعار سنئے :۔

عجب ایک بستی لب آب تھی		کہ جو بات تھی اُس کی نایاب تھی
جسے دیکھئے حسن میں وہ پری		وہ صورت کہ دیکھا کرے آدمی
لٹک۔ اچپلاہٹ۔ شرارت۔ اُمنگ		دمکتا وہ کندن سا چہروں کا رنگ
وہ چھوٹے ہوئے گیسوئے عنبریں		کمندیں سئے غارت نقد دیں
وہ ہنگے نمونے تھے گلزار کے		اور اُن پر دوپٹے وہ زرتار کے
وہ باتیں جو سنئے تو کیا بات ہے		وہ چالیں کہ کبک دری مات ہے
وہ دریا کا عالم وہ جنگل کا روپ		وہ دھانوں کے کھیتوں پہ بدلی کی دھوپ

میر حسن کا شعر یاد آگیا:۔

درختوں کی چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ — یہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

سنہ ۱۲۶۰ھ میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی نے رامائن کا ترجمہ کیا:۔

سروشِ غیب نے فرمایا سُنکر — ریاضِ نور ہے تاریخ خوشتر

حکایتیں دلچسپ اور نتیجہ خیز تھیں۔ قافیے بھی چست تھے۔ مگر تشبیہات و استعارات کے ساتھ داستاں نگاری میں کامیابی نہ ہوئی اور سخنوروں نے اس نظم کی کچھ قدر نہ کی۔

خاتم السلاطین واجد علی شاہ اختر نے متعدد مثنویاں کہیں۔ شاہ ذیجاہ نے محاورات کے دریا بہائے۔ خدام بارگاہ نے ہر قطرہ سے تحسین و آفریں کے باغ لگائے لیکن سخن سنجوں کی بزم میں اس شعبدہ پردازی کی کچھ قیمت نہ ہوئی۔ دریائے تعشق کا قصہ دلچسپ تھا الف خاں حباب نے ڈرامہ بناکر شوقین نوجوانوں کو مدتوں "عزالہ ماہرو" کا شکار رکھا مگر مثنوی کے اُچھالنے کا حباب میں دم نہ تھا وہ بدستور ڈوبی رہی۔ تاہم زبان صاف وسلیس ہے۔ بیان میں درد ہے۔ "ملک الکلام" نہ سہی "کلام الملوک" ضرور ہے۔

لال پری خودکشی کے لئے طیار ہوتی ہے:۔

وہ رشکِ قمر نہا چکی جب — پہنا کفن اُس نے گیروا سب
تسبیح گلے میں ایک ڈالی — اور مانگ بھی بالوں میں نکالی
بالوں کو بھی کردیا پریشاں — حُسن اُس سے ہوا مگر دوچنداں
کافور لگایا سب بدن میں — کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں
عمامہ بھی باندھا اُس نے سر پر — اور گیروکی اوڑھی ایک چادر
جسم اپنا چھپا کے سب کفن میں — وہ شمع رُخ آئی انجمن میں
اک ہاتھ میں اُس کے خنجر تیز — اور ایک میں جام سم سے لبریز
اک لونڈی کے ہاتھ میں اگر سوز — رومال لئے کوئی جگر سوز
واں ناچ کا شغل ہورہا تھا — غُل سازِ طرب کا جابجا تھا
مطرب سب کو رجھا رہے تھے — اختر کی غزل یہ گا رہے تھے
عاشق کو نہ اس قدر ستاؤ — پچھتاؤ گے اب بھی باز آؤ
ہم تو اُٹھتے ہیں اب جہاں سے — جاہو جسے پاس تم بٹھاؤ

عاشق نہ ملے گا ہم سا کوئی　　　جو کہتے ہیں اب بھی مان جاؤ

آغا حسن نظم لکھنوی نے ایک مثنوی لذت عشق نام سحر البیان کے جواب میں لکھی۔ وہی بحر ہے مگر روانی زیادہ ہے۔ اُسی طرز کا قصہ ہے لیکن بے حیائی میں دس بیس قدم آگے ہے۔ مصحفی کی بحر المحبت کو جو نسبت دریائے عشق سے تھی وہ بھی اس مثنوی کو سحر البیان سے نصیب نہ ہوئی۔ میر حسن کی جوگن بصیرت افروز ہو چکی ہے۔ نظم کا "فقیر" دیکھیے:۔

رنگا گیروا اپنا سارا لباس　　　مہیا کیا فقر کا سب اساس

وہ بیراگی اک بانس کی بیچدار　　　کہیں شکل آہو کہیں شکل مار

وہ تسمہ وہ کفنی وہ ہمت لنگوٹ　　　تکلف کی جس میں لگی سبز گوٹ

سمندر کا بسرا اک منگا نارجیل　　　بنائی وہ کشکول اک بے عدیل

"بدر منیر" کی بیتابیٔ فراق ملاحظہ ہو چکی ہے۔ نظم کی ہیروئن کا سوگ دیکھیے:۔

ناظم میں شب بھر طبیعت رہی　　　نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی

بہت آگیا فرق اوقات میں　　　وہ کھسیانا ہو جانا ہر بات میں

وہ گرمی سے رخ تمتایا ہوا　　　وہ رونے سے مُنہ بھر بھرایا ہوا

خوشی ہے نہ راحت نہ عیش و طرب　　　خواصیں بھی میلی کچیلی ہیں سب

کہیں ہے جو مسند تو تکیہ نہیں　　　کہیں فرش تک بھی بچھایا نہیں

دَر و در میں ہر اِک جا پہ جالے لگے　　　چھتوں میں ابابیل کے گھونسلے

کہاں صحر البیان کی مرصع کاری اور کہاں یہ نظم بازاری !! ــــ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک !!

نظم کے وقت تک زبان بہت ترقی کر چکی تھی لیکن "ہینگے" بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور تعقید کو بھی عیب نہیں سمجھتے۔

یہ دونوں جو ہینگے مرے میہماں　　　بٹھا تخت پران کو تم ہو رواں

صرف چند شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں:۔

نیا پھول گلشن میں پھولا ہے آج　　　مسافر کوئی راہ بھولا ہے آج

بیاں کیا کروں اُنپہ کیا روپ ہے　　　کہ سائے میں چھٹکی ہوئی دھوپ ہے

سحر تک نہ سوئی نہ سونے دیا　　　نہ موتی میں دھاگا پرونے دیا

لنگوٹے کو آگے بڑھا لیجئے   کرامات داتا چھپا لیجئے

آخری دو شعر اخلاقی معیار سے پست ہیں لیکن غضب کی شوخی ہے اور اُردو زبان ان کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔ نواب بادشاہ محل عالم نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ بیگماتی زبان میں منجموں اور جوگیوں کی اصلاحیں اور شادی بیاہ کی رسمیں نظم کیں۔ علم نجوم و موسیقی سے واقفیت کا ثبوت پیش کیا۔ قصہ سحر البیان کے طرز کا تھا مگر دلچسپی میں اُس سے کم۔ شائستگی و متانت جنس لطیف کی تصنیف میں ہونا ہی چاہئے وہ موجود تھی مگر درد و تاثیر کا نشان نہ تھا۔ مثنوی کی کچھ قدر نہوئی۔ بیگم صاحبہ نے خاتمۂ کتاب پر دعا مانگی تھی وہ بھی قبول نہوئی روشنائی بھی خشک نہوئی تھی کہ سلطنت چھین گئی اور راج لُٹ گیا۔

رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور   مہدیٔ دین کا جب تلک ہو ظہور

نوجواں بادشاہ خوش اقبال   والیٔ لکھنؤ خجستہ خصال

جو کہ مشہور جانعالم ہے   رونق بوستان عالم ہے

رہے رونق فزائے خطۂ ہند   فخر ایراں بنائے خطۂ ہند

البتہ آفتاب الدولہ قلق نے ایک طویل مثنوی طلسم اُلفت نام لکھکر لکھنؤ کے انداز واقعہ نگاری کی آبرو رکھی۔ جس طرح شاعروں کی زبان میں زلف یار کی درازی پائے معشوق کے لئے گاہ گاہ کمند ہو جاتی ہے ایسے ہی اس نظم کی برجستگی کو اُس کی فضول طوالت سے نقصان پہونچا۔ اگر نسیم کی طرح وہ بھی ذرہ یک کا قانون جاری کرتے یا غالب کی طرح کلیات کا عطر نکالتے تو شاید گلزار نسیم پر خزاں آ جاتی مگر خیالات کی بے انداز وسعت۔ مضامین کے بے ضرورت پھیلاؤ نے قافیے سست کر دئے "اے جور" "اے آہ" "خوش خو" "نیک ذات" "بے پیر" وغیرہ بھرتی کے الفاظ نے آورد و تصنع کی حد کر دی اور بعض جگہ گفتگو مقتضائے حال کے خلاف ہو گئی۔

مواصلت میں عُریاں نگاری کی رسم قبیح میر اثر۔ میر حسن۔ مومن اور نسیم نے رائج کی تھی لیکن انھوں نے سارا کوک شاستر نظم کر دیا۔ اور سنجیدہ صحبتوں میں اس مثنوی کے نام پر ثقات کی نگاہیں نیچی ہونے لگیں۔

بایں ہمہ پر لطف بیان۔ بیگمات کی شستہ زبان۔ محلات شاہی کے نادر نمونے۔ رنگیلے جانعالم کے عہد کی معاشرت۔ عشق آباد لکھنؤ کے رسم و رواج۔ قصہ دلچسپ۔ اشعار نور آگیں۔ آبدار مضامین۔ مثنوی کو قبولیت عام کا خلعت ملا اور شاعر کی آرزو پوری ہوئی کہ بزم خوباں میں جب پڑھی جائے۔ ایک اک سُن کے وجد میں آئے۔

پہلے سر زمین عشق کی تعریف سنئے:۔

شہر مانند لکھنؤ آباد   ہر گلی رشک گلشن شداد

مثل بازار مصر ہر بازار   یوسف وقت ساکنان دیار

تھی وہ کچھ سرزمیں بھی اُلفت خیز   کوچہ کوچہ تھا اُس کا عشق انگیز
کھیل لڑکوں کا عشق بازی تھا   شمع ساں شغل جانگدازی تھا
سب جو عاشق مزاج رہتے تھے   عشق آباد اُس کو کہتے تھے

حُسن آباد کی توصیف :-

شہر دیکھا کہ آدمی تو کیا   گر پری دیکھ لے تو ہو سکتا
ہے ہر اک گلشن و چمن البیلا   پھول والوں کا روز ہے میلا
دلکش اک اک مقام ہے اُس کا   حُسن آباد نام ہے اُس کا

فرزند عزیز کے وداع کے وقت باپ کی حالت :-

سر کو رکھے ہوئے ہیں تکیے پر   تر ہے اشکوں سے مسند پُر زر
جب اُٹھاتے ہیں سر تو آہ کے ساتھ   وزرا دوڑتے ہیں شاہ کے ساتھ
خود تو اپنے جگر کو تھامے ہیں   لوگ ان کی کمر کو تھامے ہیں

ماں کی حالت زار :-

ضعف سے دمبدم غش آتے تھے   لوگ سب لخلخے سنگھاتے تھے
گاہ صحن محل میں آ آ کر   کھول کر سر کے بال گھبرا کر
گود پھیلا کے مانگتی تھی دعا   یا رب اس داغ سے کلیجہ بچا
کبھی در سے وہ سر ٹپکتی تھی   کبھی دیوانہ وار بکتی تھی
اب کوئی دم میں گھر اُجڑتا ہے   مجھ سے بچہ مرا بچھڑتا ہے

ماں بیٹے کو رخصت کرتی ہے :-

واری اب کیا یہی ارادہ ہے   رات ابھی تو بہت زیادہ ہے
اتنی کیوں جلدی کرتے ہو جانا   اب نہ روکیں گے ہمنے لو مانا
ہمکو تنہا ہی آپ چھوڑ چلے   ماں سے بے جُرم مُنہ کو موڑ چلے
یہ تو کہہ دو کہ جلد آؤ گے   ہم کو تم بھول تو نہ جاؤ گے
وعدہ کر لو تو کچھ تسلی ہو   دل کو ڈھارس بندھے تشفی ہو

میرا پیشِ نگاہ حال رہے وارِی آنا زرا خیال رہے
کہ یہ ماں گور کے کنارے ہے بے سہارے ہے بے سہارے ہے
تم کو تو لائے گا خدا پھر یاں میں کہاں؟ چند دن کی ہوں مہماں

معشوق کی فراق یار میں بیتابی :-

جس قدر عرصہ ہوتا جاتا تھا شوقِ دیدار اُسے ستاتا تھا
چوٹ پہلے پہل جو کھائی تھی نئے غم سے جو آشنائی تھی
وہ گلِ تر ہزار نالتی تھی لاکھ صورت سے دل سنبھالتی تھی
پھر نہ دل کو قرار آتا تھا غم کلیجے کو کھائے جاتا تھا
حسرتِ دید بڑھتی جاتی تھی وحشتِ عشق سر اُٹھاتی تھی
لیکن اک ایک سے چھپاتی تھی دل ہی دل میں وہ کوفت کھاتی تھی
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی آپ ہی آپ پھر وہ بکتی تھی

باغ معشوق کی مالنوں کی شان دیکھئے :-

مالنیں چار پانچ سو کمسن پیاری پیاری ادا غضب کے دن
چوٹیاں نور کی گندھی ہوئیں صاف جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف
غارت ہوش پاؤں میں چھاگل کتنی کو بے پہ خوشنما ہیکل
لہنگے اطلس کے پاؤں میں پُرزر سر سے پا تک جڑاؤ سب زیور
بیلچے کھُرپیاں مرصع کار شغلِ آرائشِ چمن ہر بار

مالنیں شہزادہ سے پوچھتی ہیں کہ :-

ایسی وہ کون سی ہے مہ پارہ جس کی اُلفت میں تم ہو آوارہ

شہزادہ جواب دیتا ہے :-

اے جوانانِ گلشن شاداب خار دیتی ہیں یہ تمھیں دو جواب
کہ وہ نوبادۂ ریاضِ جمال وہ ثریائے آسمانِ کمال
حُسن میں بے مثال ہے کہ نہیں گلِ باغِ جمال ہے کہ نہیں

تمھیں غنچو چٹک کے کچھ دو جواب　　　دہن اُس گل کا کیا نہیں نایاب
تو ہی ان سے اُلجھ پڑا اے سنبل　　　بوئی عارض سنگھا دے نگہتِ گل

شہزادہ کو اُس باغ میں یار کی خوشبو ملتی ہے۔ وہ متحیر ہوتا ہے۔ انہیں نام و نسب دریافت کر رہی تھیں اسی عالم حیرت میں اُنکو جواب دیتا ہے۔ پورا سین ملاحظہ کے قابل ہے:۔

بیٹھنے کو وہ آکے بیٹھا تھا　　　پر دھواں سوزِ دل سے اُٹھتا تھا
چین لیتا نہ تھا دلِ مضطر　　　چار سو دیکھتا تھا اُٹھ اُٹھ کر
دل سے کہتا تھا وہ اسیرِ ستم　　　یاں کہیں آج اے دلِ پُرغم
نگہتِ زلفِ یار آتی ہے　　　بوئے شوخ نگار آتی ہے
آتشِ شوق نے جو گرمایا　　　کھینچ کر آہ سرد فرمایا
کیا کہیں تم سے کون ہیں کیا ہیں　　　بلبلِ گلشنِ تمنا ہیں!
وطن آوارہ خانماں برباد　　　نامراد و ستم کش و ناشاد
آہ فرہاد کوہِ غربت ہوں　　　قیسِ صحرائے درد و محنت ہوں
جھوٹ کہتا نہیں میں سچ جانو　　　کافرِ عشق ہوں مسلمانو
یہ جو صورت ہے یہ جو وحشت ہے　　　حضرتِ عشق کی بدولت ہے
کیا بتائیں تمھیں نسب اپنا　　　اب تو ناشاد ہے لقب اپنا
کبھی انسان تھے پری زادو　　　دلِ ناداں کے بس میں آئے تو
نام ہے اب تو عاشقِ بدنام　　　اب تو مہر و وفا سے رکھتے ہیں کام
محور وسے حبیب کہتے ہیں　　　عاشقِ بدنصیب کہتے ہیں
سرگزشتِ بلاکشاں نہ سنو　　　نہ سنو میری داستاں نہ سنو
فقرہ فقرہ ہے اس کا پُرتاثیر　　　ہو نہ جاؤ کہیں بلا میں اسیر

طلسمِ اُلفت ابھی تمام نہ ہوئی تھی کہ لکھنؤ نواب مرزا شوق کے زمزموں سے گونجنے لگا اور حسن و عشق، عیش و عشرت کے متوالے نغمہائے شوق سے پرجوش ہو گئے۔ فریبِ عشق نے رنگین مزاج نوجوانوں کی آتشِ شوق پر تیل چھڑکا۔ بہارِ عشق نے دردمندانِ محبت کے دل چھینے اور زہرِ عشق کی حسرت ناک موسیقی نے سارے شہر کو دیوانہ بنا دیا۔ بندش کی صفائی۔ زبان کی سادگی۔ بول چال کی بے ساختگی۔

محاورات کی برجستگی نے عوام کے قلوب کو مسخر کیا۔ واقعہ نگاری اور نقش طرازی کے کمال نے خواص کی گردنیں خم کیں اور ان مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی سحرالبیانی فراموش ہوگئی حاسدوں نے ان نظموں کی "لغزش مستانہ" کو پستی اخلاق سے تعبیر کیا۔ سفارشیں اُٹھا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی سنجیدہ مجلسوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار دیا لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے چھپ نہیں سکتا۔ بہار عشق اور زہر عشق کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی اور نکتہ چیں منہ دیکھتے رہگئے۔

واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ کی خانگیوں کی زبان سنئے:۔

(فریب عشق)

اے لونی کہوں سبب کیا ہے　　ارے تو ہی خواب مرزا ہے
ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف　　سُن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف
بیوفائی میں دل جلانے میں　　تو تو مشہور ہے زمانے میں
جعلسازی یہ تجھکو کیونکر آئی　　ایک کو سائی دوسرے کو بدھائی
دور بھی ہو نگوڑے سودائی　　موا ہر دیگی چمچا ہرجائی
کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ　　میں کہاں تم کہاں معاذ اللہ
اک ذرا ہٹ کے مٹھیو منہ بنوا ؤ　　یہ چونی بھی مجھ کو گھی سے کھاؤ
ساتھ سے دیکھے اپنے یاروں کو　　مینڈکی بھی چلی مداروں کو
مردوا ہو نہ ہے نوج اس گت کا　　جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا
سُن کے یہ پھبتی میں نے اس سے کہا　　اب یہ نوبت ہوئی ہماری بجا
بولی چپ رہئے منہ کی کھائیے گا　　اک ذرا سینک کر بجائیے گا
ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجئے　　مجھسے ناحق نہ چوچلا کیجئے

معشوق کا سراپا میر تقی، میر حسن اور دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی بیان کیا تھا لیکن بہار عشق کی حسینہ کی شان ہی نرالی ہے اور یہ خشک مضمون دلچسپ ہوگیا ہے:۔

حُسن یوسف بھی اُسکے آگے ماند　　چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
جلوۂ حسن رشک شعلۂ طور　　چشم بد دور آنکھیں موتی چور

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال
رنگ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال

بے مسی کے وہ دانت رشک گہر
جان عاشق نثار ہو جس پر

قد میں آثار سب قیامت کے
گر رہی گردن میں طوق منت کے

رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم
جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم

عکس رخ موتیوں کے دانوں میں
بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں

آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے
پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے

رنگ گل ی کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

پائنچے ناز سے جو اُس نے اُٹھائے
میں پکارا خدا کمر کو بچائے

جس طرح سحر البیان کی "عیش بائی" نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ویسے ہی بہار عشق کی "خادمہ" مصوری کا کمال ہے:۔

اتنے میں نکلی گھر سے ایک عورت
سانولا رنگ چلبلی صورت

لال نیفہ ازار بند بڑا
گچھا ایک کنجیوں کا اُس میں پڑا

کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی
آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی

چاق چوبند سینہ زوری میں
پھول رکھے ہوئے کٹوری میں

حسن کے دن جوانی زوروں پر
رات کی باسی مہندی پوروں پر

دھیان اک اک سے بدگمانی کا
ستیاناس ہو جوانی کا

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر
ہاتھ رکھے کھڑی ہے کوسلے پر

اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے
بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے

شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر
پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر

کھڑی اک اک کا منھ چڑھاتی ہے
ہنستے ہنستے لوٹی جاتی ہے

چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سے
لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

تصویر کشی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

منھ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری
خوف کے مارے کانپتی اُتری

نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا
سر پہ آنچل الٹ کے ڈال لیا

لب حیا سے بدن چرائے ہوئے / پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے
چال اٹکھیلیوں سے چلتی آئی / دل کو پاؤں کے نیچے ملتی آئی
گھنگرو جوتی کے چھچھاتے تھے / ہاں میں ہاں اور یہ ملاتے تھے
پانی پانی جو دل تھا سینے میں / جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
کچھ دکھائی تھی کچھ لگاوٹ تھی / کچھ حقیقت تھی کچھ بناوٹ تھی

زہر عشق کا درس عبرت نظم اردو کا گوہر شب چراغ ہے:—

اقربا میرے ہو گئے آگاہ / تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں / بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں / جبر کیونکر یہ اغنیا نہ کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس / یہ ہی کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے / مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے / آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے / آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم / آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو / صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی / نام کو بھی نہیں نشاں باقی
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم / ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے / اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج / آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے / نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے / استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر / ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے / یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں "کل من علیہا فان"

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہچکیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی — ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی
میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہوویں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہوگئے تم اگرچہ سودائی — دور پہونچے گی میری رسوائی
طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری میت پہ دھیان رکھیے گا — بند اپنی زبان رکھیے گا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا — ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
آکے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال — خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے — کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ — ہے کسی جا صدائے نالۂ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو — آؤ دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہو گی بات کہاں — ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل — اب تو جاتے ہیں اس مکان سے کل
یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں — اِن کل کے لیے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا — کل بسائیں گے قبر کا کونا
چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن — اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

نواب مرزا شوق کے دادا حکیم آغا حسن آزل نے ایک مثنوی بحرِ عشق نام زہرِ عشق کے طرز پر لکھی مگر سورج کو چراغ دکھانا بیکار تھا ایک شعر بھی زبان زدِ خلائق نہ ہوا اور مثنوی نایاب ہو گئی ۔

غدر کے بعد مسلسل نظموں کی طرف ملک کی توجہ بہت زیادہ ہو گئی اور بے شمار مثنویاں تصنیف کی گئیں ۔ معزول شاہ اودھ نے ٹیا برج کے مطبع سلطانی سے کئی مثنویاں شائع کیں مگر اُن میں شعریت بہت کم تھی،

مجھ سا ہر کو دو دل سے کیجیے بہم — تو ہو نام اس خوش لقب کا رقم
کرو دل گر مؤخر محمد سے شیر — تو ہو نام لینے میں ہر گز نہ دیر
الٰہی جو آباد ہے ایک نام — رہے آٹھ دن اس میں اے خوش خرام

سید عبد الرزاق کلامی ساکن رائے بریلی نے فتوح الشام واقدی کا اور منشی طوطا رام شایاں نے مہابھارت کا ترجمہ شائع کیا مگر شاعری مثنویوں سے عنقا تھی، اس عہد کے اساتذہ میں سے امیر و داغ، محسن و منیر، تسلیم و شوق نے اس صنف کلام پر طبع آزمائی کی، امیر کی مثنویاں نورِ تجلی اور ابرِ کرم وغیرہ اخلاق و موعظت میں تھیں، ضمناً عشق اور مرآۃ الغیب سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھیں چند روز میں فراموش ہو گئیں ع یاد رہنے کے نہ قابل ہو تو کیا یاد رہے ۔

داغ اور آفتاب داغ سے وہی نسبت تھی جو کربیا کو بوستاں سے ہے ، نہ قصہ میں دلچسپی تھی نہ بیاں میں اثر تاہم امیر کی

مثنویوں سے بہت زیادہ عمر پائی

ساقیا میں اگر دعا مانگوں — تجھ سے کے اور کیا مانگوں
ساتھ اس کے مری نگاہ گئی — جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی
کل جو امید تھی وہ آج نہیں — مرض موت کا علاج نہیں
جاں، جاتی ہے دل کے آنے سے — موت آتی ہے اس بہانے سے
پھول بھی ناگوار تھے اس کو — بار پھولوں کے بار تھے اس کو

(مسیہ فام عاشق کی تصویر سے مخاطب ہو کر)

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لئے — رکھ لیا ہے نظر گزر کے لئے

مداح رسول عربی حضرت محسن کاکوروی نے تین مثنویاں صبح تجلی، چراغ کعبہ۔ اور شفاعت و نجات نعت میں لکھیں اور اس خشک مضمون کو ابر گہربار بنا دیا۔ مرزا بیدل سے بہتر معنی آفرینی ہے اور غنیمت سے برتر نقش طرازی۔ لیکن ان مثنویوں کی بلاغت پر تنقید اس مختصر تبصرہ میں ویسی ہی بے محل ہے جیسے امانت و سحر کے واسوختوں سے مرزا دبیر کے مرثیوں کا موازنہ ایک ناتمام ساقی نامہ کلیات محسن میں ہے جس کا رنگ اُن کے سب کلام سے جدا ہے۔ چند اشعار سنئے۔

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر — سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
یہ نگہ تھے ترے گلکاری کے — جنکی کلیوں میں چھپے ہیں کانٹے
کامدانی کا پہننا چھوڑا — لُٹ گیا تیرا سنہرا ناجوڑا
باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو — آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
شہر کا سیر و تماشا چھوڑا — چاندنی چوک کا رستہ چھوڑا
ہوش میں آؤ بجھو والے ہو — تم تو پینے سے پیے متوالے ہو
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک — روشنی شمع سحر کی کب تک
جھوٹی کھاؤ نہ ہزاروں قسمیں — پھینکدو دل جو نہیں ہے بس میں

شیخ ناسخ کے شاگرد رشید سید اسمٰعیل حسین منیر نے ”مثنوی حجاب زناں“ لکھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد کا ایک اخلاقی قصہ لڑکیوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لیے نظم کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے اس کا درجہ خود شاعر کی زبان سے سنئے۔

حال جو کچھ سُنا کیا موزوں — نہیں اس میں لطافت مضموں
اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں — جو ہیں میرے قصیدے غزلیں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں — سادہ سادہ بیان ہے اس میں

لکھنؤ مرحوم کی تصویر:—

لکھنؤ کا جو شہر ہے مشہور — اب ہے ویران پہلے تھا معمور
کبھی اُس شہر کا یہ تھا عالم — ڈھونڈھے ملتا نہ تھا کسی کو غم
سب وہاں تھے خوشی کے عالم میں — غم جو تھا بھی تو تھا محرم میں
شادی اور اس تھی عیش بستا تھا — رات دن مُہن وہاں برستا تھا
ہاتھ خالی بھی جو وہاں آتے — لکھنؤ سے بھرے پُرے جاتے
مٹ گئی سلطنت وہاں کی جب — اُڑ گیا چین عیش سب کا سب
کھلاتے تھے جو ہزاروں کو دیکر — پھرتے ہیں ٹکڑے مانگتے گھر گھر

گرمی کی تکلیف اور جنگل کی وحشت:—

فصل گرمی کی اور وہ جنگل — دھوپ کے مارے ہو گیا بیکل
ہر طرف تھا غضب کا سناٹا — بن پڑا سائیں سائیں کرتا تھا
چلتی تھی لو زمین تپتی تھی — روح گھبراتی تھی تڑپتی تھی
دونوں تلووں میں پڑ گئے چھالے — کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے
گرم رتن کو بھونے دیتی تھی — بھاڑ کی طرح گرم رہتی تھی
کہیں اُڑتا ہوا بگولہ تھا — کسی جانب مدار پھولا تھا
راہ کانٹوں نے ہر طرف گھیری — سوکھی سوکھی لگی تھی جھربیری
جھاڑ کانٹوں کے تھے ببول کہیں — کوئی پتا نہ جن میں پھول کہیں

ہجر کی مصیبت:—

جب سے دولہا جدا ہوا اس کا — جینے سے دل خفا ہوا اُس کا
کوئی کھانا اُسے نہ بھاتا تھا — بات کرنا بھی خوش نہ آتا تھا

مِسّی مہندی بھی ترک کی اس نے — کنگھی چوٹی بھی چھوڑ دی اس نے
ہنس کے بولے کسی سے کیا ممکن — نہ بدلتی تھی کپڑے دس دس دن
رنگ چہرے کا زرد آنکھیں لال — میلے کپڑے بکھرے سر کے بال

مثنوی میں زبان کی سادگی اور متانت بیان کے ساتھ درد و تاثیر بھی ہے، آخر کے دو چار شعر جو میلے ٹھیلوں میں جانے والی عورتوں کی خدمت میں لکھے ہیں حذف کر دیے جائیں تو یہ نظم اس قابل ہے کہ لڑکیوں کے درس میں مقرر کی جائے اور زمانۂ حال کی روشن خیال خواتین اس نصیحت نامہ سے فائدہ اٹھائیں۔

منشی امیر اللہ تسلیم نے پہلی مثنوی واجد علی شاہی دور میں لکھی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد جہانداری کا ایک فرسودہ قصہ نظم کیا تھا اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا تھا۔ افسانہ پہلے سے مشہور تھا، انداز بیان میں ندرت نہ تھی، عیش و عشرت کے بندوں نے نالۂ تسلیم کی کچھ قدر نہ کی

عاشق کے بوڑھے باپ کی تعریف کرتے ہیں

ادب سے اس کو وقت خط کتابت — خضر لکھتے سدا "حضرت سلامت"

معشوق کے سراپا میں فرماتے ہیں:-

حنا کچھ پاؤں پر ایسی بسی ہے — اسے جب دیکھو قدموں سے لگی ہے

مومن دہلوی سے بالواسطہ تعلق کا فیض ہے:-

پریشانی اثر ہے شانہ زانی — اجل تعبیر ہے خواب جوانی
کیا واماندگی نے دل کو بیتاب — ہوا وقت سحر شرمندۂ خواب

دوسری مثنوی شام غریباں نام ۱۲۹۰ھ میں تصنیف کی اور ادب اردو کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے، قصہ دلچسپ تھا بیان میں شوخی نہ تھی۔ کلام کی پختگی کی کافی داد نہ ملی، عاشق عالم وحشت میں ایک درویش حق آگاہ سے ملاقی ہوا،

کہا اس نے کہ تو آیا کہاں سے؟ — کہا "آبادیٔ ہندوستاں سے"
کہا "مقصود اس غربت سے کیا ہے"؟ — کہا "ترک تمنا مدعا ہے"
کہا "کافر ہے یا پابند اسلام"؟ — کہا "بے قید کو مذہب سے کیا کام"
کہا "کس شغل میں رہتا ہے سرشار"؟ — کہا "نفیِ عدو، اثبات دلدار"
کہا "کچھ تو مصیبت آشنا ہے"؟ — کہا "دل میں غم الفت بھرا ہے"

کہا "پھر کس لیے محنت سفر کی؟" | کہا "ہوں ڈھونڈتے گل، عادت سفر کی"
کہا "جائے گا آخر اب کہاں کو؟" | کہا "تقدیر لے جائے جہاں کو"

ناچ گانا ہوتا ہے:-

موافق سازسے آواز ہو کر | ہوئی پردے سے باہر راز ہو کر
وہ انگیز بدن انداز کے ساتھ | وہ لینا منہ پہ آنچل ناز کے ساتھ

جنگل کا سماں:-

نہ سایہ تھا نہ برگ خشک و تر تھا | ہرنگ شوخ آہو ہر شجر تھا
کف سائل کی صورت چشمۂ آب | ہوائے گرم سے ہر مرغ بیتاب
حرارت سے دھواں اٹھتا جگر میں | تپش سے آبلہ پڑتا نظر میں
یہ عالم دیکھ کر دشت بلا کا | نظر میں پڑ گیا ساماں قضا کا

تیسری مثنوی صبح خنداں نو عمری میں دیکھی تھی۔ اب تلاش سے نہیں ملتی اور اس کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا، شام غریباں سے بہتر نہ تھی۔

سید مظفر علی خاں اسیر کے نامور شاگرد منشی احمد علی شوق نے ۱۳۰۵ھ میں اس دور کی بہترین عاشقانہ مثنوی لکھی، میر حسن کی مصوری نسیم کی نازک خیالی، نواب مرزا شوق کی خوش بیانی کو دلیل راہ بنا کر خیالات و محاورات کا طلسم بنایا، قصۂ طلسم الفت سحر البیان اور دریائے تعشق کا عطر مجموعہ تھا۔ دلچسپی میں ان سے کم مگر تہذیب و سنجیدگی میں زیادہ نئی نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ محاورے خوش آیند اسلوب سے باندھے، بول چال کی صفائی اور بندش کی خوبی نے نظم میں چار چاند لگا دیے، گلزار نسیم کی بحر تھی اور اسی کی سخن طرازی کی تقلید، اختصار کی کوشش کی مگر یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی، آورد و تصنع کا پردہ بری طرح فاش ہوا اور بعض جگہ بے ضرورت طول ہو گیا، بے جان اشیاء میں جان ڈالنا اور ان سے ہمکلام ہونا نسیم کا نیرنگ تھا۔ لیکن جو خیال حد سے بڑھا وہ مسا ہوا یہاں طوالت نے اس شعبدہ پردازی کی قلعی کھول دی، مثنوی درد سے خالی تھی۔ لبوں پر "واہ واہ" آئی مگر دل سے "آہ" نکلی پہلے تشبیہات کی بہار دیکھیے جو تمام دنیا میں شعر کی روح رواں سمجھی جاتی ہے:-

(منقبت اہلبیت) گر ذات محمد مصطفٰے شجر تھا | اس میں کوئی گل کوئی ثمر تھا
(مناجات) ہر صفحہ کتاب کا فلک ہو | نقطوں میں ستاروں کی چمک ہو
صفحے پہ ہو اُن کی ضوفشانی | خردی بوٹی کی مدانی

(سراپا)۔ پیشانی کی تعریف

کیا رنگ کہوں شگفتگی کا ۔۔۔ اک پھول کھلا تھا چاندنی کا
گیسو تھے کہ دام تھے بلا کے ۔۔۔ ابرو تھے کہ تیغے قضا کے
بے خود تھے شراب پینے والے ۔۔۔ مستی میں الٹ دیے پیالے

گالوں پہ جو چھائی ہے اُداسی ۔۔۔ دو پھول تو ہیں مگر ہیں باسی
چشمہ پر تو کسی جبیں کا ۔۔۔ بنگلہ گھونگھٹ کسی حسیں کا
تھی بیل زمیں پہ جال کھولے ۔۔۔ کالی دبی تھی بال کھولے
ہلکی پتلی سی ایک تھی ناؤ ۔۔۔ جھولا جھولو جو اس پہ چڑھ جاؤ
حیرت تھی کہ اوج کس قدر ہے ۔۔۔ یہ بال کمانی یا کمر ہے
قدمیں زیور کچھ اس قدر تھا ۔۔۔ گھنگھی کا پھیلا ہوا شجر تھا
دھانی کپڑوں میں تن کا یہ حال ۔۔۔ مینا تو زمردیں تھا اور مے لال
تھے راہ میں جمع شہر والے ۔۔۔ یا مانگ بھری تھی موتیوں سے
چوٹی پہ شجر کے دام رکھا ۔۔۔ چھپکا کہنے کو نام رکھا
گلشن سے نکل سکا نہ اسطرح ۔۔۔ گر نگے کے دہن سے بات جسطرح

اب نازک خیالی دیکھیے جو ایشائی شاعری کی جان ہے :۔

حیرت سے تھے اہل ہوش ششدر ۔۔۔ بت خانہ تھا بادشاہ کا گھر
لائی قسمت فسوں کے بس میں ۔۔۔ فیروزہ تھا خاتم قفس میں
سائے سے بدن کے دھوپ پھیلی ۔۔۔ رخ صاف تھا آرسی تھی میلی
جو نخل تھا چپ کھڑا تھا ڈر سے ۔۔۔ سایہ غش میں پڑا تھا ڈر سے
اختر نے حجاب کی نظر سے ۔۔۔ در بند کیے ہوا کے ڈر سے
منظور اسے خود تھی پردہ داری ۔۔۔ منھ پھیر کے آرسی اتاری
کتنی تھی حیا یہ ظلم ہے سخت ۔۔۔ آتی جاتی ہے سانس کمبخت

یہ تیلی اور یہ بجلی کی تار دہی   مینا سو سنے پہ لاجوردی

محاورات اور بول چال:-

تصویر کو دیکھ کے زر خریدا   سودا لیا در دسر خریدا
کیا بخت ہے اور کیا مقدر   بجلی تو کہیں ۔ جلے کہیں گھر
تصویر کی کون ایسی ہستی   اللہ تم اور بت پرستی
مٹی نہ کر آبرو کو جانی   اندھا ہے کنواں جو ہو نہ پانی
چلتی آندھی کا رُکنا کیسا   بہتے پانی کا روکنا کیسا
بیمار کو جان کھوتے کیا دیر   نیند آ ہی گئی تو سوتے کیا دیر
وہ جل گئی ۔ وہ ڈیہی تاؤ کھا کر   وہ ہنس پڑی بھاگی مُنھ چڑھا کر
بگڑی تو بنایا دل لگی سے   روٹھی تو منا لیا ہنسی سے
کچھ کھیل نہیں ہے عشق کی لاگ   پانی نہ سمجھ یہ آگ ہے آگ
چار اپنے پرائے کیا کہیں گے   تھوکیں گے بُرا بھلا کہیں گے
چپ مرغ تھے خوف سے غضب کے   طوطے سے اُڑے ہوئے تھے سب کے
کیسی ہے خطا معاف صورت   دھویا کپڑا کہ صاف رنگت
چھائی تھی اُداسی سی صحن پر   جھاڑو سی پھری تمام گھر پر
"تم" لکھتی ہوں میں بگڑ نہ جانا   منظور ہے لطف کا جتانا
بولی کہ نہ دوں گی یوں زباں میں   کھیلی نہیں کچی گولیاں میں

سوال جواب:—

پوچھا کہ "یہاں میں آیا کس طرح؟"   بولی کہ "قرار دل میں جس طرح"
پوچھا "یہ ستم کیا ہے کس نے؟"   بولی "تمھیں دل دیا ہے جس نے"
پوچھا "لشکر؟" کہا کہ "ہاں تھا"   پوچھا کہ "ملیگا؟" کہا "نا"
بولا "یہ غضب!" تو بولی "خاموش"   بولا کہ "پھر اب؟" تو کھولی آغوش
بولا کہ "نہیں" تو بولی "بیکار"   بولا کہ "رہائی؟" بولی "دشوار"

بولا "کوئی پُرغرور کیوں ہو؟" بولی "کوئی ناصبور کیوں ہو؟"
بولا وہ "کسی کا دل ہو بے چین" بولی "تو وہ ضبط کرکے لے چین"
بولا "جو ضبط نہ کر سکے وہ" بولی "تو مرے جو مر سکے وہ"
بولا "تو ہو خون یوں کسی کا" بولی "تو ہوا کرے مجھے کیا؟"
بولا "یہ ستم ترس کے بدلے!" بولی "یہ کہو۔ ہوس کے بدلے"
بولا کہ "ہوس ہے اور ہی چیز یہ عشق ہے عشق۔ قدر کی چیز
اتنا کوئی شکل پر نہ اترائے کس کی رہی اور کس کی رہ جائے
بولی کہ "چلو چلو ہوا ہو میں نے تو نہیں کہا کہ چاہو
تم لاکھ چھپاؤ کھا کے قسمیں پوشیدہ غرض تھی اس ترس میں
کیا تم مرتے ہو سچ بتاؤ کیونکر مرتے ہو مر تو جاؤ"

مصوری:- ہونٹوں پہ تھی اُف۔ جگر پہ تھا ہاتھ تصویر پہ دل نگاہ کے ساتھ
صدمہ تھا - ملال تھا - قلق تھا آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا
ہونٹوں پہ تھے دانت سر پہ تھے ہاتھ سر سے جو ہٹے جگر پہ تھے ہاتھ
کانپا - سہما - ہٹا - ڈرا وہ پھرنے کے لئے مڑا ذرا وہ
بولا یہ جھجک کے ایں! یہ کیا ہے؟ بولی وہ تنک کے دل مرا ہے
سسکی لب پر شکن جبیں پر آنچل منہ پر نظر زمیں پر
گردن نہ اٹھا سکی وہ گلفام احسان کا بوجھ شرم کا نام

(ہجر) رنگت کہیں نام کو نہیں ہے سادہ کاغذ ہے یا جبیں ہے
کوٹھے پہ کھڑی ہے تو کھڑی ہے کونے میں پڑی ہے تو پڑی ہے
چوٹی جو کھلی کھلے بلا سے بال اُڑتے ہیں تو اُڑیں ہوا سے
تارے گن گن کے رات کاٹی کوئی بولا تو بات کاٹی

اختصار کی کوشش:۔

لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لٹایا
خسروِ شب بہ نامہ دینا — کہنا — سننا — جواب لینا
آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا — سہما — غریب رویا
پوچھا جو مزاج کو کہا "خیر" — پوچھا سبب آنے کا کہا "سیر"
کھٹکی — جھجکی — زبان کھولی — بل ڈال کے تیوریوں پہ بولی
تسلیم جو کی — جواب پایا — غمدیدہ اٹھی — ملی — بٹھایا
پوچھا کہ لقب؟ — کہا "پریشان" — پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ "طوفان"
پوچھا مقصد؟ کہا کہ "پانا" — پوچھا مطلب؟ کہا "ملانا"
اسپنے کے عوض کہی پرائی — الٹی گنگا غرض بہائی

واقعہ نگاری:۔

گردوں نے بلائے شب جو ٹالی — چونکی طوطا پڑھانے والی
طوطا نہ ملا تو ہوگئی بھور — سمجھی وہ کہ لے اڑا کوئی چور
طوطا بھی گیا قفس بھی ٹوٹا — دل بھی دستِ ہوس بھی ٹوٹا
کالی آنکھیں ہونے لگیں لال — انگارے ہوئے وہ پھول سے گال
چہرہ کندن سا تمتمایا — الماس سے لعل کو دبایا
طائر کے مثال اڑ گیا رنگ — جھنجھلائی کہ ہیں یہ کیا رنگ؟
او سروِ چمن ادھر تو آ تو — طوطا مرا کیا ہوا بتا تو
او سوسنِ باغ تو بیاں کر — او چاندنی راز تو عیاں کر
بتلا تو شمیم تو کہاں تھی — سچ کہہ دے نسیم تو کہاں تھی
برگِ گلِ لالہ تو ہی لب کھول — کیا تو گونگی ہے او کلی بول
طوطا صیاد نے اڑایا — چڑیاں رہیں چپ اڑیں خدایا
کیا باغ میں بھونرا تھا سویا — کلیاں نادان ہی تھیں گویا

انگور تو ہے پرست شیر سے ۔۔۔ کیا ان سے کہوں یہ مست تیرے
آنے والی نسیم ہے بس ۔۔۔ جانے والی شمیم ہے بس
ہے لوث سے پاک انکا دامن ۔۔۔ پکڑے کوئی خاک انکا دامن

اقتباسات طویل ہو گئے اور مثنوی کے کل محاسن بیان نہ ہو سکے ۔ آورد و تصنع کی مثالیں بکثرت ہیں ۔ مثلاً کہتا ہے

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم ۔۔۔ سب ہے فیض استاد مرحوم

اور رعایت لفظی کا گورکھ دھندا اس کثرت سخن کی خاص پیداوار ہے ۔ اس مثنوی سے بے لطف اشعار حذف کر کے مسلسل داستان بنائی جائے تو بٹیک ۔

نکلے یہ زبان اہل فن سے ۔۔۔ لعل اُگلے ہیں شوق نے دہن سے

ترانہ شوق کے بعد لکھنؤ اسکول کے طرز میں صرف ایک مثنوی اور لکھی گئی مگر افسوس کہ وہ نا تمام رہی ۔ سید ولایت علی فردوسی نے فسانۂ عجائب کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا ۔ اگر وہ اتمام کو پہونچتا اور شاعر کو نظر ثانی کا وقت ملتا تو ادب اردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہوتا ۔ انداز بیان دکھانے کو چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

(۱) ماہ طلعت نے طوطے سے پوچھا کہ اُس کی سی خوبصورت شکل " گزری ہے کہیں تری نظر سے "

طوطے کی ذات بے مروت ۔۔۔ بولا بگڑی بنا کے صورت
خوبی کیا اپنی پوچھتی ہو ۔۔۔ جیسا کہتی ہو ایسی ہی ہو

یہ جواب صاف سُنکر ماہ طلعت بہت چیخی ۔ طوطے کو گالیاں دے رہی تھی کہ شہزادہ محل میں آگیا ۔ دیکھا کہ بیگم طوطے سے لڑ رہی ہیں اُسوقت کی تصویر یہ ہے :۔

سر گرم جلال ہو رہی تھی ۔۔۔ فیروزے سے یہ لال ہو رہی تھی

(۲) ملکہ مہر نگار شہزادۂ جہان کو اپنے پاس روکنا چاہتی ہے اور بہت گفتگو کے بعد اپنا حال زار بیان کرتی ہے ۔

ہنسنا تو گیا خوشی کے ہمراہ ۔۔۔ رونا ہے بس اب یہی کہ ہر گاہ
پونچھیں اگر اشک غم بہیں گے ۔۔۔ دیکھیں گے جو لوگ کیا کہیں گے
ہنس ہنس کے مجھے رُلائینگے اور ۔۔۔ بگڑوں گی جو میں ہنائیں گے اور
کب تک نہ یہ حال ہاں سنیں گے ۔۔۔ پائیں گی خبر تو سر دُھنیں گے

....

جب ہوگی اُنھیں حضورِ دل شاہ — مانند قرآن زہرہ و ماہ
خلوت میں کہیں گے راز میرا — پردے میں کھُلیگا ساز میرا
جب سامنے اُن کے جاؤنگی میں — آئے گی حیا لجاؤں گی میں
لیکن تجھے کیا مری حیا سے — رُسوا ہو کوئی تری بلا سے
قربانِ وفائے قیس مفتوں — اپنی لیلیٰ کا تھا جو مجنوں
گو اُس کی دُلھن بنی خدیجہ — پر وصل کا ہجر تھا نتیجہ
اک چاہ ہوئے عروس و داماد — شادی نے کیا نہ غم سے آزاد

شہزادہ کہتا ہے کہ قیس کا جس رات کو عقد ہوا تھا ستاروں کی نظر بد تھی۔ "عقرب میں قمر تھا قوس میں تیر"۔ اس وجہ سے زوجین میں موافقت نہیں ہوئی۔ ملکہ بگڑ کر بولتی ہے :-

سعدین کا عقد جب ہوا تھا — اور زائچہ داں طلب ہوا تھا
گو نُدرۂ فرخی و شومی — سمجھی میں تمھیں تھے وہ نجومی!!

شاعر کی لااُبالی طبیعت یا زمانہ کی ناقدری سے مثنوی ناتمام رہی مگر اسی عہد میں مغربی تعلیم اور فرنگی تہذیب کے اثر سے چمنستان ادب کا رنگ بھی یکایک بدل گیا۔

اسلوب بیان کے "داخلی" اور "خارجی" پہلو دیکھے جانے لگے "نفسیات" و "جمالیات" کی دھوم مچی۔ شعر کا موضوع بجائے تفریحِ طبع و تحریکِ جذبات کے فلسفہ و اخلاق کی تعلیم سمجھا گیا۔ نازک خیالی معنی آفرینی۔ سخن طرازی۔ بلند پروازی کا لغویات و ہزلیات میں شمار ہوا۔ پہلے خیال آفرین اور خلاق معانی ہونا شاعر کا کمال تھا۔ کیفیات و تاثرات اشارات وکنایات میں ادا کرنا شعر کا حسن تھا تسلسل بیان، مصوری۔ اور کردار نگاری مثنوی کی خصوصیت تھی۔ اب اداشناسانِ فرنگ نے فتویٰ دیا کہ "مثنوی کے لئے سادگی لازمی ہے اور وہ تشبیہات۔ تمثیلات اور استعارات کا بار نہیں سنبھال سکتی" یہ بالکل بجا اور درست ہے! - اسی بوجہ سے یوسف زلیخا جامی دب گئی۔ سکندرنامہ نظامی کی صناعی مٹی میں ملی۔ نل دمن فیضی اور سب سے بڑھکر مثنوی غنیمت بے نشان ہوگئی۔ گلزار نسیم اور طلسم الفت خس و خاشاک کے انبار میں ہیں صرف میر اثر کی خواب وخیال تاریخ تصنیف سے اس وقت تک ہر لحظہ اور ہر ساعت عاشق مزاجوں کی گردن میں حمایل رہی اور یہ خوبصورت شعر زباں زد خلایق ہے :-

دانت جب مجھ کو یاد آتے ہیں — دل کلیجا بھی چباتے ہیں!!!

اس طرز جدید میں خواجہ الطاف حسین حالی۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ سرور جہان آبادی وغیرہ نے

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ پنجاب کے ایک شاعر نے کلام مجید کا ترجمہ نظم کیا۔ دوسرے بزرگ نے شاہنامۂ اسلام کی ترتیب شروع کی گران نیچرل نظموں پر رائے زنی کا ابھی وقت نہیں ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال کے بعد جو سخن کا کھرا کھوٹا پرکھنے والے ہوں گے وہ ان پر صحیح اور بے لوث تنقید کریں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اُردو کی قدیم مثنویوں میں حیات جاوید صرف سحرالبیان گلزارِ نسیم اور زہر عشق کو نصیب ہوئی، وہ بتائیں گے کہ ان طرز جدید کے "خو بند و خوشند و بوند ارند" ولایتی پودھوں میں کوئی قطرۂ آبِ حیات کا تھا یا نہیں۔

کیا کہوں تجھسے میں اختر کو اُسے
کس طرح دیکھتا ہوں خواب کے بیچ

امیر احمد علوی بی ۔ اے کاکوروی)

لکھنؤ کا مشہور ترین شاعر (ناسخ)

(جسنے عمر بھر میں صرف گیارہ شعر کہے)

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت　　آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا

سمجھے تھے بعد قضا پائینگے راحت ناسخ　　حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھکو　　اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج　　ہم تو کہتے ہیں دُعا کرتے ہیں

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو　　اسکی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

روزِ مرگ آرزو ہے تابکے غم کیجئے　　تا کجا دست دعا کو وقف ماتم کیجئے

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو　　ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تری فریاد سے

خانۂ ویراں مجھے کہتا تھا ہر اک لے ناسخ　　اب تو آباد ہوا خانۂ زنداں مجھ سے

اُڑا کے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا　　مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں ۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی　　عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

رنگ ناسخ کا منسوخ کرنے والا پہلا شاعر

(ضامن علی جلال لکھنوی سنہ ۱۲۵ھ - سنہ ۱۳۲۵ھ)

حشر میں کہتے پھرے ہم جلوہ اسکا دیکھ کر
حوصلہ یاں بھی نہ نکلا شوق خاطر خواہ کا

یاد رہ جائے گی فرقت کی یہ مجبوری بھی
دم نہ ہم توڑ سکے موت پہ قابو نہ ہوا

تغافل کرکے گلے شکر جھکالیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

آپ کو بھول گئے دیکھ کے اُس بُت کو جلال
حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی شناسائی کا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا
مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں
یہاں خطاب تھا کچھ وہاں جواب نہ تھا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا
تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شب وصل طرفہ مزا دیا
کہیں میں نے رو کے ہنسا دیا کہیں اُس نے ہنس کے رُلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

پہونچے نہ وہاں تک یہ دُعا مانگ رہا ہوں
قاصد کو اُدھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا

انھیں سے پوچھیے دیکھا ہو جو کچھ آنکھوں نے
ہمیں خبر نہیں کیا روزِ انتظار ہوا

ایذا وہ کوچۂ یار میں رہکر اُٹھائی ہے
اب ذکر سن کے کانپتے ہیں ہم بہشت کا

عاشق کو جلال آپ وہ فرما گئے ناشاد
اس پر بھی تو کمبخت کو شاداں نہیں دیکھا

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوش جنوں کا کیسا
یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

اپنا ہاتھ اپنی چھری اپنا گلا ہے اک دن
خنجر و بازو قاتل کا بھروسا کیسا

میں شوق دید میں کیا جانے کتنی دور آیا
کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا

تسلیاں جو وہ یونہیں دیا کریں گے جلالؔ
تو صبر پھر دلِ بیتاب کو ضرور آیا

یاد آگئیں کچھ اور جلالؔ اس کو جفائیں
بھولے سے بھی اظہار نہ کرنا تھا وفا کا

جستجو تیری بدِ عالم سے مجھے کھو دیگی
میں بھی تجھکو نہیں ملنے کا اگر تو نہ ملا

جہاں سُنا کوئی مجمع ہے اس کو ڈھونڈھ آئے
ذرا خیالِ پریشانیِ نظر نہ کیا

جلالؔ وصل سے ہم ہو چکے تھے نا اُمید
ستم کیا کہ پھر اُس نے امیدوار کیا

کیوں کسی کی جستجو کو دل گیا
کھوئے جانے کے سوا کیا مل گیا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلالؔ
مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

دم بھر کو ترسے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ
برسوں نہ رہے بزمِ خرابات کے قابل

جلالؔ دل کی تڑپ یوں ہی دور ہو شاید
اُٹھائے دیتے ہیں لو اُن کو اپنے پاس سے ہم

جو دل نہ ہوگا نہ ہوا اسکا مجھ کو غم بھی نہیں
سنا یہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

سیکڑوں بار اُنھیں پہنا دئے ہونگے ہم نے
کیا اگر قبر پہ دو پھول چڑھا جاتے ہیں

ہوش میں آؤ ذرا تم تو بھلا کیا ہو جلالؔ
اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا جاتے ہیں

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد
داورِ حشر ہو تمھیں نہ کہیں

خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں
پیار سے جس کو وہ کمبخت کہا کرتے ہیں

باز تم ائے کہ نہ آسے وہ جفاؤں سے جلالؔ
تم تو کر گزرو جو کچھ اہلِ وفا کرتے ہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے، تم مجھ کو

کہدیں تم سے کون ہیں کیا ہیں کہاں رہتے ہیں ہم
بیخودوں کو اپنے جب تم ہوش میں آنے بھی دو

کردے خبر اُس خانہ برانداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

چونکا رہا ہوں وصل کی شب چونکتے نہیں
کچھ نیند ہے شباب کی کچھ خواب ناز ہے

رگِ گلو ہے جگہ یار جاودانی کی
صدا قریب سے آتی ہے لن ترانی کی

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلالؔ
دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سُنے

تمھاری بزم میں ہم خود سنبھل جاتے یہ مشکل تھا
تمھیں بیتاب کرتے تھے تمھیں پھر تھام لیتے تھے

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے
پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

شعراء دہلی پر لکھنؤ کا اثر

اور

ناسخ سے پہلے لکھنوی شاعری کا تصنع و ایہام

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ناسخ و آتش کے زمانہ میں لکھنؤ زبان کے "اعتبار سے دہلی کی تقلید سے آزاد ہوا۔ لیکن اس قول کی صحت میں تامل ہے۔ دہلی کے زوال پر لکھنؤ کا عروج ہوا۔ افلاس و پریشان حالی سے گھبرا کر دہلی کے شرفاء و اہل کمال پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں اٹھ آئے جہاں ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ حکومت کے بانی اور اس کے متوسلین سب دہلوی تھے اور اسی کے ساتھ عالی ہمت و بلند حوصلہ اور علم و ہنر کے قدر دان و سرپرست۔ انشا نے بالکل سچ لکھا ہے کہ لکھنؤ میں رہ کر بھی وہ دہلی کا خواب دیکھا کرتے تھے اور دہلی ہی کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ یہ حالت صرف ان لوگوں کی نہ تھی جو دہلی سے آئے تھے بلکہ ان کے بال بچے جن کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی وہ بھی اپنے تئیں دہلی سے منسوب کرتے تھے۔ انشا کی عبارت یہ ہے۔

"انجام دریافت توان کرد کہ با وصف تولد در لکھنؤ خود را دہلوی پندارند و سکنۂ قدیم را پوربی۔ دیگر اینکہ اگر کسے بپرسد کہ شما بذات خود در لکھنؤ بوجود آمدہ اید یا وطن شما ہمین است بخشم آلودہ در نگاہ کنند و گویند کہ خدا نکند کہ ما متوطن اینجا باشیم"

(دریائے لطافت صفحہ ...)

ایک تو دہلی کی محبت دوسرے فراغت اور اطمینان جو وطن آوارہ "اجڑے گھر" سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ فکر معاش سے آزاد ہوا اور راحت سے بسر کرنے لگا۔ اہل کمال کو آنکھوں پر جگہ دی جاتی تھی جو آپ سے نہ آئے بلائے گئے اور پھر جوش و خلوص کے ساتھ کہ سودا کو شجاع الدولہ "برادر من مشفق من" کا القاب لکھتے ہیں۔ اسی طرح آصف الدولہ کو میر کا اشتیاق تھا اور سالار جنگ کی معرفت پیام و زاد راہ بھجوایا۔

دہلی ویران تھی اور لکھنؤ آباد۔ اردو کا مرکز ثقل بھی دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ادبی مجالس قائم ہوئیں۔ علوم و فنون کا بازار

گرم ہوا۔ خریداروں کو جوہر قابل کی تلاش رہتی تھی اور سرپرستی و فراخدلی سے خیر مقدم کیا جاتا تھا جو لیقوں میں تنگین ہونے لگیں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ علمی بحثیں چھڑیں۔ ہر شخص کو یہی دھن تھی کہ دوسروں کو نیچا دکھا کر اپنا سکہ جمائے اور نام پیدا کرے۔ اس رد و جہد و رد و کد میں زبان منجھتی گئی مگر شاعری جس کا تعلق دل سے ہے اور ایسے ہنگاموں سے گھبراتی ہے کھلونا بن کے رہ گئی۔ ان دلچسپ مشاغل میں دہلی کی یاد بتدریج کم ہوتی گئی۔ لکھنؤ کی خاک نے اپنا اثر دکھلایا اور دامن دل کھینچا۔ اب لکھنؤ کو صرف دلی ہی نہیں سمجھا بلکہ دہلی سے بڑھ کر [illegible] مستقل ہوا۔ ابداع و اختراع کا عمل جاری تھا۔ زبان میں تراش خراش ہوتی رہی، منگ کے ساتھ اجتہاد کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ پیش روؤں کی فصاحت و صحت گفتار پر ایراد ہونے لگے۔ اگر ایک طرف یہ اعتراف تھا کہ میر و سودا و میر درد نے چمنستان ریختہ کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور سخن پی [illegible] قدیم سے عامیانہ و ناقابل پیوند الفاظ کو ترک کیا تو ڈنکہ مار کر یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ یہ اور بات ہے جو ان حضرات نے (سے، کے بجائے (ستی) یا (سیتی) اور (مجھ دل) بجائے میرے دل، کے جائز رکھا۔

انقلاب کی تحریک پوری قوت سے کارفرما تھی اور علوم و فنون و تمدن و معاشرت سبھی کا جائزہ لے رہی تھی دہلی مٹ چکی تھی مگر اس کے شکستہ در و دیوار اب تک اپنی گزشتہ عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ گلی کوچوں میں خاک اڑتی تھی مگر پھر بھی لکھنؤ کی نئی تہذیب کو اگر کوئی مدمقابل نظر آتا تھا تو جہان آباد کے کھنڈروں میں۔ لہذا اسی پر تفوق حاصل کرنے کا شوق غالب ہوا اور ہر بات میں اسی کے علی الرغم ایک نئی صورت اختیار کی۔

دہلی میں نیچی چولی کا انگرکھا پہنا جاتا تھا۔ یہاں چولی اونچی ہو گئی اور ایک نہیں تین تین کر تریاں اضافہ کی گئیں۔ کمانیوں کا ذکر نہیں۔ وہاں صرف مغزی ہوتی تھی۔ یہاں سنجاف نے حسن دوبالا کیا۔ "کرچیں" ایجاد ہوئی۔ مندیل کی جگہ نکے دار ٹوپی نے لی اور چست مہری کا پاجامہ غرارے دار ہو گیا۔ سلیم شاہی جوتا گھتیلا بن گیا۔ ملائی بالائی، اندھیری اندھیاری ہو گئی اور نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا۔

انتہا یہ ہے کہ دلی کے شیدائی میر تقی میر علیہ الرحمہ جن کا کلام درد و خستگی و سوز و گداز کی جان ہے لکھنؤ میں ایک عرصے قیام کے بعد ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایسے شعر بھی اُن کے قلم سے نکلنے لگے ؎

ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی　　کہاں ہم، کہاں تم، کہاں پھر جوانی
بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے　　کفن میر کو دیجو زعفرانی

(از دیوان پنجم)

جرأت دہلوی تھے مگر لکھنؤ کی رنگ رلیوں اور گلچھروں نے کلام کو سوقیت کا عبرت ناک نمونہ بنا دیا۔ انشا پھسکڑ

لڑنے لگے مصحفی سے تعلق ہی ختم ہوکر کر اکھاڑے میں اتر آئے۔ جتنے تھے وہ ایک دوسرے کو ہجو نگاری اور فحاشی سے پچھاڑنا چاہتے تھے غزل گوئی کا یہ حال تھا کہ ایک حمام میں سب ننگے ——— انشا چلاتے ہے

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

جرأت نے اخلاق فلق کے نعرہ مارا ہے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

مصحفی ہونٹ چبا چبا کے گنگناتے ہیں ہے

انگڑائی لے کے اپنا مجھ پر خسار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

اس ہنگامہ بد تمیزی کی لے بڑھتی گئی ناسخ اور آتش کے زمانے تک پورا شباب تھا ایک دن لکھنؤ کو دہلی پر رشک آتا تھا اب لکھنؤ دہلی کا محسود ہو گیا اور عبرتناک ہے یہ امر کہ اہل دہلی ناسخ کا ذکر پڑھنے لگے۔ مومن خاں اعتراف کرتے ہیں کہ ناسخ کے رنگ میں غزل کہنا چاہی مگر ممکن نہ ہوا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی سخن سنجی و سخن فہمی مسلم تھی آتش اور ناسخ کا موازنہ کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ او مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجا است، قریب ہم انکارند و ہر دو را ہموزن شمارند و قباحت این تحقیق لایخفیٰ علیٰ من لہ حظ من الفہم و مع ذلک فذکرئ طبعش سخن نیست ،، فاعتبروا یا اولی الابصار!

پھر ناسخ کی تعریف میں دریا بہا دیتے ہیں۔

پسیم چمن طبعش نکہت ریز، شمیم گل فکرش ملال ریز، طائر بلند پرواز غورش جز بشاخ سدرہ آشیاں نسازد، و مرغ تیز بال خیالش جز بہ بام فلک جلوہ نیندازد، والا مایہ، عالی پایہ، بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاش مضامین تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال .... یک دو سہ شعر از غزلہائے جدیدہ ہم کہ بعض احبا از لکھنؤ ارمغاں کردہ بودند نگارش یافتہ "

انتخاب میں یہ شعر بھی ہے ہے

ہم نے جو تیری بنائی ہے ترے موبات کی
نافہ مشکیں بنا ہے منھ ہر اک ناسور کا

جس کے بعد کچھ لکھنے میں پیچھے ہیں ناسور پڑ جانے کا اندیشہ ہے مختصر یہ کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ مومن کے دیوان سے سیکڑوں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فرمانا محض انکسار رہ جاتا ہے کہ ناسخ کا تتبع نہیں کر سکتے۔ کیا اور بہت کامیابی سے کیا۔ ذوق و شاہ نصیر کو تو دہلی کا ناسخ ہی کہنا چاہیے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میر، سودا اور درد کے بعد لوگوں نے شاعری کو یا تو ہوس کاری کا آلہ بنا لیا یا زمین آسمان کے قلابے ملانے کا مشغلہ۔ بہت کم شاعر ایسے تھے جن کا شعر دماغ کے بجائے دل سے نکلے اور اس میں دہلی یا لکھنؤ کی تخصیص نہیں تھی۔ زبان کو صیقل ضرور ہوئی مگر تخئیل کا آئینہ گرد آلود ہو گیا۔

علاوہ بریں مجھے حسنِ اتفاق سے ایک ایسے شاعر کا کلام دستیاب ہو گیا ہے جو ناسخ اور آتش کا پیشرو تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و آتش کی شاعری اسی کا نقشِ ثانی ہے اور یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے (قطعِ نظر اس سے کہ ابتدا میں ان کا وطن دہلی تھا یا لکھنؤ یا اور کوئی مقام) ناسخ و آتش سے بہت پیشتر انفرادیت برتنا شروع کر دی تھی اور شاعری کی ایک جداگانہ شاہراہ نکالی تھی جس میں جذبات کی تڑپ کے بجائے شکوہ و بلند آہنگی زیادہ تھی اور صداقت کی جگہ تصنع نے لے لی تھی۔ یہ شاعر قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں۔ ان کے حالات (الا ماشاء اللہ) سخن شعرا و گلستانِ ہند وغیرہ تذکروں میں تفصیل سے درج ہیں اور اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ اختر وہی ہیں جن کا یہ قطعہ ہے

کل شیخ بن کے مجتہد العصر ساقیا ۔۔۔ دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ازراہِ تبختر کہ بے سمیا ۔۔۔ معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا (تا اختتام)

زبان زدِ خاص و عام ہے۔

اختر۔ ملک الشعرا قاضی مولوی محمد صادق خاں صاحب ولد قاضی محمد لعل ہوگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے مگر وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ جامع الکمالات شخص اور لکھنؤ کے مشاہیر شعرائے وقت میں شمار کئے جاتے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد اور تحصیلداری کے عہدے پر مامور تھے ۔۔۔۔۔۔۔ طبیعت کی شوخی، کلام کی بلندی، اور حسنِ تشبیہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ غازی الدین حیدر والیِ لکھنؤ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ چونکہ ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا اس وجہ سے شعرائے لکھنؤ انھیں بکمال فخر اپنا ہم صفیر و ہم وطن بیان کرتے ہیں اور درحقیقت وہ اپنی قیام گاہ کے واسطے مایۂ افتخار و نازش تھے انھیں اکثر فنون میں مثلاً شعبدہ بازی میں کمال حاصل تھا۔ تبحرِ علمی کے علاوہ فنِ سخن و دقائقِ شعر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ بندشِ مضمون، نازک خیالی، نادر الکلامی، اور خوش گوئی میں لاجواب تھے۔ مصحفی، انشا اور جرأت کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ آتش، ناسخ، وزیر اور صبا کے زمانہ تک زندہ رہے ۔۔۔۔۔۔ بعد غدر ۱۸۵۸ء لکھنؤ میں وفات پائی۔ ان کا کلام عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ بہرحال جس قدر مختلف تذکروں میں نظر سے گذرا اسی کا انتخاب درجِ تذکرہ کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی طبعزاد کتابیں حصارِ مطبع کی زیرِ حفاظت نہ آنے پائیں اس سے کمیاب بلکہ نایاب

ہیں گو چند غزلوں خصوصاً اس غزل (قطعہ) نے جسے ہم منتخب کلام کے شروع میں نقل کرتے ہیں فرط شہرت سے بقائے دوام کی سند حاصل کر لی ہے۔ نواب غازی الدین حیدر کی نظر عنایت نے فکر معاش سے فارغ البال کر کے عمائدین کے زمرے تک پہونچا دیا تھا مگر وضع مولویانہ رہی، طالب علموں کا ساتھ نہ چھوڑا...... (از تذکرۂ خمخانۂ جاوید)

رائے بہادر مسٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوتا ہے کہ اختر ۱۸۱۲ء میں لکھنؤ پہونچے۔ واجد علی شاہ نے بھی ان کی قدر کی پھر کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اختر کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

اختر کے دیوان میں جو میرے پاس ہے یہ مقطع ہے ؎

کہدے اختر کوئی اب شاہ زمن سے اتنا نہیں لائق ہے تمھیں دعویٰ سرداری وخواب

عجب نہیں کہ اسی کی بدولت عتاب شاہی نازل ہوا ہو۔

اختر کے کردار میں یہ مقطع ہیرے کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک خود مختار مطلق العنان بادشاہ کو اس دھڑلے سے نصیحت کرنا مستحق ہزار ستائش و آفریں ہے۔

صاحب قاموس المشاہیر نے سال ولادت بربنائے قیاس ۱۸۰۸ء یا ۱۸۰۹ء لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اس طرح ان کی مدت حیات اکاون سال ہوتی ہے کیونکہ سال وفات متفقہ طور پر ۱۸۵۹ء ہے۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ اختر کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ان کا سنہ جلوس ۱۸۱۴ء ہے جس سے ۱۸۵۹ء تک ۴۵ برس ہوتے ہیں۔ گویا اختر سات برس کے تھے جب ملک الشعرا کا خطاب ملا! علاوہ بریں تذکرۂ آب حیات میں ہے کہ اختر اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے ناسخ کے ابتدائے دور شاعری میں اس کا دل بڑھایا اور قدر دانی کی۔ اپنے زمانے کے زبردست عالم اور محقق تھے اور علمی و ادبی تنازعات میں منحصر علیہ قرار پاتے تھے۔ ان سب امور سے گمان ہوتا ہے کہ ناسخ سے عمر میں بڑے تھے۔ ناسخ کا انتقال ۱۸۳۸ء میں بعمر ۶۵ سال ہوا۔ ۱۸۱۴ء یا اس کے قریب جب اختر کو ملک الشعرا کا خطاب ملا ناسخ کی عمر ۴۱ سال ہوتی ہے۔ غالباً اس وقت اختر کی عمر بھی چالیس پچاس برس کی ہو گی۔ آدمی کی شہرت ایک دم سے نہیں ہوتی نہ اوائل عمر میں ملک الشعرا کا خطاب ملتا ہے۔ اس طرح ان کی عمر ۸۰ یا ۹۰ برس ہوتی ہے جو غیر معمولی نہیں۔

ان سب باتوں کو جانے دیجئے خود اختر کا کلام تبلاتا ہے کہ ناسخ و آتش کے دور کے پیشتر کا ہے کیونکہ انکے یہاں وہ الفاظ بکثرت ملتے ہیں جن کو ان لوگوں نے متروک کر دیا تھا۔ مثلاً نت، جائے ہے، وغیرہ معشوق کے لئے پیارے کا لفظ آپ ناسخ یا آتش کے یہاں نہیں پائیں گے اختر نے قدما کی طرح بہت آزادی سے استعمال کیا ہے

طلب کرتا ہے دل سینے میں سو دل سے کہاں پیارے
یہاں تو مدتوں سے ہے پڑا سونا مکاں اپنا
اسی طرح جائے ہے سے

اٹھ جائے ہے جو غم دل سے تو درد آن بسے ہے
صد شکر کہ یہ گھر کبھی ویراں نہیں رہتا
سمجھو کر کی جگہ محض سمجھ سے

ہم عدم سے آئے تھے دنیا کو عشرت گہ سمجھ
قافلے جاتے جو دیکھے جی دہل کر رہ گیا
لفظ میاں بمعنی معشوق سے

کیا کیا تھے میاں عہد ہمارے ترے باہم
وہ عہد کہاں اُس ترے پیماں کو ہوا کیا
جھمکی بمعنی جھلک سے

جھمکی سی کچھ دکھا کے وہ خورشید رو مرا
پلکوں کو میری نور کا فوارہ کر گیا
نت بمعنی ہمیشہ سے

نت رہی رخ پہ ترے ایک نظر کی امید
بر نہ آئی کبھی اِس دیدۂ تر کی امید
مت بمعنی نہیں سے

کر رحم اے تصور مژگان یار بس
نوک سناں سے مت دل زخم آشنا کو چھیڑ
اپنے کے بجائے اپنے کے سے

ہمشکل جو داغ اپنے کے پائے پر طاؤس
دیکھے جہاں چھاتی سے لگائے پر طاؤس
تشتی تپیدن سے

کی تشتی تپیدن جو زبس اُس نے چمن میں
ہے نکہت گل، گرد پر افشانی بلبل
پوچھتا ہے کی جگہ پوچھے ہے سے

تڑ کیا پوچھے ہے تو تیر نگہ کا ظالم
دیکھ لے سینۂ غربال نمار کھتے ہیں
بتوں یا بتو کی جگہ بتاں سے

کب تلک جور و جفا تم کو نہیں خوف ذرا
اے ستم پیشہ بتاں ہم بھی خدا رکھتے ہیں
جیوں بمعنی مثل سے

عشق میں اس کے گھلا ایسا کہ جیوں روغن نفت
آتش و آب میں اب دیکھئے یکساں ہوں میں

زینت مذکر ؎

سنو طرف چمن ہو زیب گلشن جس طرح
خط نے یوں زینت دیا اس ماہ کے رخسار کو

جان مذکر ؎

ساتھ ہی جان نکل جائے گا تن سے میرے
کھینچو تیر کو سینے سے میاں آہستہ

مرقد مونث ؎

دامن کشاں جو گزرا تو اس طرف سے قاتل
ہے حشر پاس برپا مرقد پہ کشتگاں کی

مطلع یہ ہے ؎

کیا خاک ہم کریں سیر اس گلشن جہاں کی
یاں برگ برگ گل سے آتی ہے بو خزاں کی

بھر نظر بجائے نظر بھر کے ؎

ہوشوں کی بزم میں میں شب کا عالم کیا کہوں
بھر نظر چہرے کو اس کے جس نے دیکھا دنگ تھا

اختر کا کلام لکھنوی رنگ کا بہترین نمونہ ہے، ہنوٹ ہے مگر لطف کے ساتھ۔ زبان کا چٹخارا ہے مگر سوقیت سے کوسوں دور خیال میں رفعت ہے۔ اسلوب بیان میں تازگی و دلکشی ہے بشکوہ الفاظ و جزالت بھی ہے۔ دلچسپ تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں اور سوز و گداز بھی ہے مگر کم۔ اور یہی خصوصیات ناسخ و آتش کے منتخب کلام کی ہیں، خرافات سے مطلب نہیں۔

چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

فصل گل سن کے گئے سیر چمن کو لیکن
حیف واں رنگ خزاں قفل در گلشن تھا

رنگ خزاں کو قفل در گلشن کہنا کس قدر بدیع ہے۔

اسی طرح سایۂ جسم کو رہزن کہنا ؎

منزل پرخطر عشق کا کیا حال کہوں
سایۂ جسم بھی واں اپنے لئے رہزن تھا

اور سنئے ؎

شب جو پہلو میں نگار آتشیں رخسارہ تھا
داغ دل وقف گداز گرمیٔ نظارہ تھا

یا ؎

ہے بھرا دل میں جو اختر مہر آتش طلعتاں
سینہ اپنا مشرق نور محبت ہو گیا

مراعات النظیر کی دھن میں مہر (محبت) کو مذکر نظم کر گئے یہی خبط بڑھتے بڑھتے ان کے بعد کے شاعروں میں جنون کی حد تک پہنچ گیا

آپ کو اتنے ہی شعروں سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ زبان آہستہ آہستہ اپنا چولا بدل رہی تھی اور ناسخ و آتش سے بہت پیشتر سادگی و صدق جذبات کو چھوڑ کر تکلف و تصنع و مبالغہ و بلند پروازی کی طرف جا رہی تھی۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کا جنون بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اختر کے یہاں اس کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دراصل اس کے پردے میں وہی اُپج اور ایجاد کا ولولہ کہ انفرادیت کا ثبوت دیں کارفرما ہے۔ جذبات نگاری سے لوگ قطعاً بے نیاز ہوگئے تھے اور یہی دھن تھی کہ کوئی نئی بات کہیں خواہ کیسی ہی مضحک اور بعید از ہوش و خرد ہو۔ وہ بھول گئے تھے کہ واقعی کو انوکھے پن سے بیان کر دینے میں جو تاثیر اور لذت ہے وہ جھوٹ کے پل باندھنے میں ہرگز نہیں۔

بات یہ ہے کہ جذبات و محسوسات کی مصوری کے لئے درد مند دل درکار ہے وہاں فارغ البالی و عیش پرستی نے بوالہوسی کے سوا کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہمیں اب تک صرف آتش کا علم تھا جو قریب قریب تارک الدنیا تھا اور بے حد غیور و قانع۔ یہی کردار بڑی حد تک اس کے کلام سے جھلکتا ہے اسی پایہ کے اختر بھی تھے جیسا کہ ان کے مقطع سے پتہ چلتا ہے اور اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ عیش پرست واجد علی شاہ کو نصیحت کرنے میں دریغ نہیں ہوا فطری رجحان لوگوں کو شاعری کی طرف مائل کرتا تھا مگر کیریکٹر کے زیر اثر حقیقت سے دور ہو جاتے تھے کیونکہ متین و سنجیدہ جذبات و خیالات کی جگہ عریانی و ابتذال نے لے لی تھی اور شاعری عیاشی کی مترادف ہوگئی تھی۔ اختلاط بہت پہلے شروع ہوگیا تھا۔ پورا مظاہرہ ناسخ آتش اور ان کے تلامذہ کے عہد میں ہوا۔

اختر نے اپنے عہد کے بعض شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں آتش یا ناسخ کا نام نہیں ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ غزلیں اس زمانے کی ہیں جب ان لوگوں کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ ان کے معاصرین میں کوئی نفضل تھے جن کا مصرع اس طرح تضمین کیا ہے ؎

اختر تو سن لے نفضل سے اب صف ہوئے یار　　　خون ہزار بوسہ بدل جوش زن رہا

اس مصرعۂ نفضل نیز اختر کے متعدد اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ "طرز بیدل" میں ریختہ کہنے والے غالب سے پہلے بھی تھے کوئی نور و افضل تھے۔ مقطع میں ان سے دوستانہ شکایت کرتے ہیں ؎

نور و افضل نے ہماری یاد ہی دل سے بھلا　　　تھی جدائی سے مگر ان کو فراموشی غرض

ایک مقطع سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے شاگرد بہت سے تھے جن میں مدہوش کا درجہ ممتاز تھا ؎

گرچہ اختر اپنے سب شاگرد ہیں اہل سخن　　　پر جسے ممتاز کہئے سب میں وہ مدہوش ہے

تفاخر شاعرانہ سے بھی بعض اوقات شاعر کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور مفید و دلچسپ معلومات کا اضافہ ہوتا ہے

یہ مقطع میں بنیاد وطن بنگالہ کی طرف پر لطف اشارہ کرتے ہیں

نسبت چاہئے اختر کو لے یاران بنگالہ ۔۔ یہ اپنے وقت کا ہندوستاں میں فخر رازی ہے

خاک لکھنؤ کی دامنگیری کا انھیں بھی اعتراف ہے ؎

چاہتے ہیں عاشق بنگالے کو ہم دامن فشاں ۔۔ پر کریں کیا لکھنؤ کی خاک دامن گیر ہے

ایک مقطع میں فرماتے ہیں ؎

میں وہ شیریں سخن ہوں ہند و بنگالے میں اے اختر ۔۔ کہ طوطی مجھ سے پڑھتا نسخۂ شکر مقالی ہے

طبیعت کے اظہارِ ثقیل و ناموس الفاظ اور ترکیبیں لانے میں ناسخ بدنام ہیں مگر اس بدعت یا براعت کا سہرا بھی اختر کے سر ہے ملاحظہ ہو ؎

تڑپ ہے ماہیٔ دل اپنا بستے بیچ ہی میں ۔۔ ہوا کیا حلقۂ کاکل اسے تالاب آسائش

(زمین ہے ۔ سیماب آسائش ، باب آسائش)

ایضاً ؎

اختر خیال خال رخ یار کے سبب ۔۔ نسبت سرائے دل ہے مرا النار فیض

ایضاً ؎

رخ پر تیرے دیکھی تھی کبھی زلف مجعد ۔۔ ہے روکش سنبل مرا دود جگر اب تک

ایضاً ؎

دے کسو کو اگر نسخۂ حسن الغفار ۔۔ تو اس جہاں میں وہ اختر سا کیمیا گر ہو

ایک اور بات ہے جو اختر کو ناسخ و آتش سے پہلے کا شاعر ثابت کرتی ہے ان کی بیشتر غزلیں سات یا زخمی کی ہیں ۔ شاذ ایسی ہیں جن میں ۱۵ یا ۱۶ شعر ہیں ۔ حالانکہ ناسخ و آتش کی غزلیں شیطان کی آنت ہوتی ہیں

(مرزا جعفر علی خان) اثر لکھنوی

بہاری اسکول کی اردو شاعری اور اسکی تخلیق کے اسباب

بہار کی علمی و ادبی تاریخ اس قدر تاریکی میں ہے، کہ عام طلبہ کے لیے اس پر سرسری نظر ڈالنا حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ زمانہ کی ناقدریاں ایک طرف، خود یہاں کے اہل کمال میں شہرت طلبی کی خو پیدا نہوئی نتیجہ یہی ہوا کہ آج ہمارے پیش نظر ہے دہلی و لکھنؤ کے اکابر رجال کی تصنیفات و تذکرے پڑھ جائیے، آپ کو مشکل سے چند بہاری شعراء و ادبا کے حالات ملیں گے۔ وہ بھی اس قدر ایجاز و اختصار کے ساتھ کہ ان کا وجود و عدم برابر ہے۔

تالیفات متداولہ میں بہاریوں کی غیر موجودگی نے دوسرے صوبوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دیں اور اب مشکل سے بہار سے باہر یہاں کے اساتذہ کی سیادت علم و ادب تسلیم کی جاتی ہے، اکثر مشاہیر بہار بھی تذکروں اور تاریخوں میں دہلوی یا غیر بہاری مشہور ہیں حالانکہ ان کی علمی زندگی یہیں پروان چڑھی۔ مثال کے لئے مرزا عبدالقادر بیدل کو لیجئے، تمام تذکرہ نگار مرزا سرخوش، میر تقی، میر حسن ان کے بدیع شعری اور جلالت علمی کے قایل ہیں لیکن کوئی یہ نہیں لکھتا کہ یہ بہار کے رہنے والے تھے، بلکہ سرخوش تو ان کو شاہجہان آبادی بتاتے ہیں۔

اس وقت نہ تو اس کا موقعہ ہے کہ تفصیل و اطناب کے ساتھ بہار کی تاریخ ادب مدون کی جائے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ عنوان کے لحاظ سے بہار میں اردو کی ترقی کے تمام ادوار پر کوئی بسیط نظر ڈالی جائے اسلئے مختصراً ان ابتدائی مرحلوں کا تذکرہ کیا جائے گا جو ایک محقق کے لئے اس وادی خار زار میں بدرقۂ راہ کا کام دے۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ مختصراً علم و ادب کے ان مخفی دفائن کا تذکرہ کیا جائے جن پر ایک نظر ڈالے بغیر بہار کے شاہد علم و ادب کے صحیح خط و خال نمایاں نہیں کئے جاسکتے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل نظرئے قابل غور ہیں۔

صوفیہ - چھٹی اور ساتویں ہی صدی ہجری سے یہاں مختلف صوفی خانوادوں کی خانقاہیں موجود ہیں جہاں اور منیر میں بڑے بڑے صوفی علماء عرب و عجم سے ہجرت کر کے آئے، یہ اولیائے کرام جب یہاں آباد ہوئے تو جین مذہب بودھ اور برہمنیت کا زور تھا، بالخصوص جین اور بدھ مذہب کی خانقاہوں نے سارے صوبہ کو اپنی آغوش میں لے رکھا

چنانچہ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے بیس سیل بہار کی خانقاہ میں پندرہ ماہ تک قیام کرکے "یوگ شاستر" کی تکمیل کی، کوہ برابر، گوراڈولی، گوراپربت، اُلواس آشرم، روہین نالا، رشیاسرنگ آشرم، مندار گیری، کنڈگام (مولد مہابیر جی) سمید شکھر (جینی تیرتھنکروں کے "موکش" کا مشہور مقام واقع ضلع ہزاری باغ) وکرم سیلا دہار، وغیرہ جو اب جینی اور بدھ مذہب کے آثار قدیمہ میں ہیں اسوقت فروغ پر تھے اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقراء ان میں ذکر و شغل کرتے تھے۔ جینیوں کی مذہبی کتابیں عموماً مگدھی، سنسکرت، پراکرت، کنڑی اور تامل میں پائی جاتی ہیں۔ اسیطرح بودھ مذہب کی کتابیں پالی اور سنسکرت میں ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، پراکرت، کنڑی اور تامل کے عناصر شامل تھے، جس طرح عربی زبان پر بابلی و آرامی، عبری و حبشی زبانوں کا اثر پڑتا ہے، اور ہماری مذہبی ادبیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے اسی طرح جینیوں اور بودھوں کے مذہبی افکار و وظائف نے بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، کنڑی، تامل اور پالی وغیرہ زبانوں کا اثر ڈال رکھا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل جب صوفیہ یہاں بغرض تبلیغ و ارشاد تشریف لائے تو انھوں نے اسی مخلوط مگدھی زبان میں وعظ و پند شروع کیا، اور یہیں سے مقامی زبان پر عربی و فارسی کا بھی اثر پڑا بہار کے صوفی خانوادوں کے حالات ابھی دنیا کی نظروں سے محجوب ہیں خود اہل بہار بھی اپنے بزرگوں کے حالات سے نابلد ہیں، آج کتنے بہاری ہیں جو حضرت مولانا جمال الدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ شہاب الدین جگجوتؒ (جو پھلواری میں آسودہ ہیں) کے حالات زندگی سے واقف ہیں، اسی طرح یہاں کے صوفی ادب کا بڑا خزانہ یا تو غیر مطبوعہ ہے، یا امتداد زمانہ نے اس کو تلف کردیا پھر بھی حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کی تصنیفات اور منیر، پھلواری اور بہار کے بعض صوفیہ و محدثین کے علمی کارنامے محفوظ ہیں۔ حضرت شرف منیری رحمۃ اللہ سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ تھے، لیکن آپ نے شیخ ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہروردیؒ (سلسلۂ سہروردیہ کے بانی) کی مشہور کتاب آداب المریدین کی جو فارسی شرح لکھی ہے، وہ تصوفی ادب کا ایک شاہکار ہے، مولانا سید کمال علی صاحب (معاصر شیخ علی حزیں) نے مولانا محمود شبستری کی کتاب "گلشن راز" کی شرح لکھی، مولانا عبد الغفار ہنداوزی نے ادب المفرد بخاری کا اردو میں ترجمہ کیا، کیفیت العارفین اور کنز الانساب مولفہ مولانا سید عطا حسین منعمی، اور الدر المنثور مصنفہ مولانا عبد الرحیم صادق پوری کو بھی اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا صوفیہ کی خدمات رشد و ہدایت نے ہماری زبان پر گہرا اثر ڈالا، "کنز الانساب"، اور "الدر المنثور" سے پتہ چلتا ہے کہ بہار کے صوفی علماء، عرب و عجم سے آئے، یقیناً ان کے ساتھ مذہبی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ بھی ہوگا۔ انکی زبان عربی رہی ہو یا فارسی لیکن انکی تصنیفات عموماً فارسی میں ہیں، باہمی میل جول اور ارتباط و تعلقات نے ایک نئی زبان

پیدا کر دی، اور یہ زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں سے یقیناً مختلف تھی، اس لیے آج بھی بہار کے ہر مسلمان کے گھرانے میں مسلمانوں کے معزز اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی ایسی اردو بولی جاتی ہے جو لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ کی بول چال سے مختلف ہے، اور یہ اثر ہے اسی مخلوط تمدنی زبان کا جو ان کے آبا و اجداد باوجود علم و فضل تبلیغ و ارشاد کی غرض سے برتتے آئے۔ اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت جتنے بڑے بڑے صوفیہ و بزرگان دین تشریف لائے انھوں نے مقامی زبان میں زیادہ تر عربی زبان کے عناصر شامل کئے حضرت تاج فقیہ کی کے دور بہار سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ایرانی شعرا اور فارسی ادبیات

افاغنہ دہلی کے عہد میں بھی بہار میں ہمیشہ ایک عامل آیا کیا۔ اور اس کے ساتھ فارسی زبان کی بھی ترویج ہوتی رہی ضیاء برنی، فیروز شاہی، فرشتہ، اور روضۃ الصفا کے صفحات کا جائزہ لیا جائے۔ تو پتہ چلے گا، کہ افغانی عامل نے یہاں اپنے عہد حکومت کے کتنے نقوش چھوڑے ہیں افاغنۂ دہلی کے زوال کے بعد جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تو ایرانی ذوق کے مختلف اصناف کی تقلید شروع ہوئی، چمن و حدیقہ کی آرائشیں، نقوش و نگارش کی دلاویزیاں۔ خطاطی و مصوری، ادب و شعر سا سب شعبے ایرانی مذاق کا پتہ دیتے ہیں۔ متقدمین صوفیہ کی کتابیں فارسی میں تو پہلے ہی سے موجود تھیں اب ایرانی شعراء کی آمد شروع ہوئی "صبح صادق" کے اوراق میں آپ کو کافی تعداد ان ایرانی شعرا کی ملے گی جو عظیم آباد میں آئے اور یہاں فارسی شاعری کا ایک ایسا بلند ذوق پیدا کر دیا کہ دہلی کے سوا اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی، "صبح صادق" کا مصنف مرزا محمد صادق بن محمد صالح اصفہانی ۱۰۲۶ھ سے ۱۰۳۲ھ تک پٹنہ میں مقیم رہا مصنف نے قزوین، لاہجان، یزد، گیلان وغیرہ کے بہت سے شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو عظیم آباد کو رشک ایران بنائے ہوئے تھے مثلاً مولانا نادم گیلانی، حکیم عارف لاہیجی، مولانا معز الدین یزدی، مولانا محمد حسین قزوینی وغیرہ۔ انھیں شعراء کے قدوم کی برکت کا نتیجہ ہے کہ شاہ ابوالحسن فرد، شاہ علی حبیب نصر، مولانا محمد حضرت شاہ الفت حسین فریاد جیسے بلند پایہ فارسی شعراء کے علاوہ صرف پھلواری میں فارسی زبان کے تقریباً پچاس صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں، ایرانی شعراء کی آمد کا سلسلہ "صبح صادق" کے مصنف ہی تک ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ سید شاہ الفت حسین فریاد (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے زمانہ تک سید محمد اشرف کا مقبرہ (واقع عظیم آباد) ایرانیوں کا ماویٰ و ملجا تھا، ابوطالب ملا جوقی، اور حاجی ملا بابا جیسے اساتذۂ ایران مشاعرہ میں شریک ہوا کئے۔ شیخ علی حزیں بھی راجہ شتاب رائے عظیم آباد کے یہاں ٹھہرے، خان آرزو نے "مجمع النفائس" میں اس پر تعریض بھی صرف کی ہے۔

صوفی مہاجرین اور ایرانی شعراء نے صرف بہار ہی میں زبان پر اثر نہیں ڈالا، بلکہ سارے ہندوستان پر کیا

[illegible] پنجاب و اودھ ، دکن و بنگال ہر جگہ انھیں عناصر کے اختلاط نے مقامی زبان میں ایک تغیر پیدا کر دیا دہلی میں اکبر اعظم اور عبدالرحیم خانخاناں کی ادبی سرپرستی اور بارش کرم نے بے شمار ایرانی شعرا کا ایک وسیع حلقہ بنا لیا تھا۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ ، عادل شاہیہ ، قطب شاہیہ اور نظام شاہیہ نے بہت سے ایرانی شعرا کی سرپرستی کی، بعض دکنی سلاطین خود بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں ۔ مثلاً فیروز شاہ عروجی ، یوسف عادل شاہ یوسف ۔ اسمٰعیل عادل شاہ وفائی وغیرہ ، وفائی اپنی شاعرانہ متانت و لطافت اور شگفتہ بیانی کے لئے تمام دکنی بادشاہوں میں ممتاز ہے ۔ فرشتہ نے ان تمام سلاطین کا کلام درج کیا ہے ۔ سلاطین کے اسی ادبی ذوق نے دکن کو رشک ایران و توران بنا دیا چنانچہ عہد بہمنیہ میں ملک الشعرا شیخ آذری اسفرائنی ۔ ملا عبدالکریم ہمدانی ۔ ملا سامی وغیرہ نظر آتے ہیں خواجہ حافظ اور مولانا جامی کو ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے ۔ اسی طرح عہد عادل شاہی میں مولانا ملک قمی ۔ ظہوری ترشیزی ۔ رضائی مشہدی ، اور دور نظام شاہی میں ملک قمی اور ظہوری کے علاوہ میرزا صادق کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح آدان قطب شاہی میں میر محمد مومن استرآبادی ، نے جو محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعر و ندیم خاص تھے ۔ دکن کو نوازا ، ان کے علاوہ مولانا اشرف ماژندرانی ، میر معز فطرت ، مولانا نظیری ، نیشاپوری ، تقی اوحدی نے بھی دکن میں قیام کیا اور یہاں کے باشندوں کو اپنے افکار عالیہ سے اثر پذیر کیا ۔ دکن کی اردو شاعری پر ان ایرانی شعرا کا اثر پڑا جس طرح اہل بہار کے روزمرہ کی زبان میں مگدھی زبان کا اثر پایا جاتا ہے ، لیکن فرق یہ ہے ، کہ بہار کا ادبی خزینہ مقامی زبان کے ثقل و ضغطہ سے زیادہ تر پاک رہا ، اور دکن میں مقامی زبانوں ۔ تامل ، کنھڑی ، تلنگی وغیرہ نے ادب و انشا پر بھی اثر ڈالا ، دکن میں ریختہ کے کثیر التعداد شعرا گذرے ہیں اور یقیناً انھوں نے ایرانی شعرا سے استفادہ کیا پھر بھی فضلی ، سید حمزہ ، فراقی ، فخری ، لطفی ، عزتی حیدرآبادی ، صبائی احمد آبادی ، سعدی دکھنی ، سراج اورنگ آبادی نصیر اللہ آزاد ، ولی وغیرہ کے کلام کا جائزہ لیا جائے ، تو ان میں مقامی بول چال کا کافی اثر پایا جاتا ہے ۔ برخلاف اس کے بہار کے قدیم شعرا ، سید عماد ، غلام نقشبند سجاد ، مرزا بیدل ، محمد روشن جوشش ، جذب ، انتظار ، فغاں وغیرہ کے کلام میں زیادہ صفائی اور فصاحت پائی جاتی ہے ۔/

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ، کیا بہار کا ادبی خزینہ دہلی و لکھنؤ سے مستغنی ہے ؟ دہلی کے متعلق تو ذیل میں تفصیل کیساتھ عرض کیا جائیگا ، لیکن لکھنؤ کے باب میں تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ بہار کی قدیم اردو شاعری پر اسکا اثر پڑا ، ہاں عہد متاخرین میں ناسخ اسکول کی شاعری نے شیخ امان علی سحر ، رشک ، وزیر ، اور برق کی وساطت سے بہار پر اثر ڈالا ، چنانچہ شیخ علی حسن جو یا عظیم آبادی (صاحب دیوان) رشک کے شاگرد تھے ، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے سحر سے ، اور مولانا مرشد حسین کامل ، دربھنگوی ، اور سید احمد حسین تمنا نے خواجہ وزیر سے اصلاحیں لیں

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) اور ہمارے عہد میں مکرم حضرت تمنا پھلواروی مدظلہ اور مولانا حکیم ضمیر الحق قیس آروی (جن کا دیوان طبع ہو رہا ہے) اسی اسکول کے پیرو ہیں، میر انیس اور مرزا دبیر بھی آئے اور اپنے مراثی سے عظیم آباد کی مجالس ذکر کو رشک اودھ بنا دیا اور اپنے تلامذہ بھی چھوڑے، حضرت امیر مینائی نے بھی قدم رنجہ فرمایا لیکن یہ سب آخر عہد کی باتیں ہیں بہار میں تو میر سے بہت پہلے اردو شاعری کا رواج ہو چکا تھا اور مختلف تذکروں اور تاریخوں میں اس عہد کا کلام مذکور ہے

آیئے اب اس اہم مسئلہ پر غور کریں کہ کیا بہار کی اردو شاعری دہلی اسکول کی پیرو ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دہلی اور عظیم آباد کے درمیان ربط و اختلاط بہت قدیمی ہے۔ لیکن اگر یہی دہلی اسکول کے تفوق کا سبب ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خود دہلی اسکول پر بہار نے بھی اثر ڈالا، مذاہب فلسفہ میں اسکندریہ کے یہودی اسکول اور فلسفہ اشراقی میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، اہل نظر جانتے ہیں فلسفہ کا ایک طالب العلم حیران رہ جاتا ہے، جب وہ فلسفہ اشراقی کے مشہور قاید فلاطینوس اور اسکندریہ کے یہودی فلسفہ کے علمبردار فیلو کے نظریات میں یگانگت پاتا ہے ایک عرصہ تک یہ موضوع محل نظر تھا کہ ان میں کون مقدم کون مؤخر ہے اور کس نے کس پر اثر ڈالا، ولیت کا فخر فلسفہ اشراقی کو ہے یا یہودی فلسفہ کو، یہ تو ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مشرکین یونان سے تنفر تھا اور یونانی علما بھی ان کو حقارت ہی کی نظر سے دیکھتے تھے، پھر فلاطینوس، اور فیلو کی یہ ہم نوائی کیسی؟ آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑا، کہ انہیں باہمی اثر و تاثر نہیں ہے بلکہ دونوں نے ایک ہی ماحول میں ایک ہی قسم کے اثرات کے ماتحت آزادانہ ترقی کی، میرا خیال بھی دہلی اسکول اور بہاری اسکول کے متعلق یہی ہے، ہرگز بہاری اسکول دہلی اسکول کے تتبع کا نتیجہ نہیں۔ ہاں شعرائے دہلی سے یہاں کے بعض اکابر رجال نے اصلاحیں لیں مثلاً میر حسن کے استاد میر ضیا دہلی سے عظیم آباد چلے آئے، اور یہیں راجہ شتاب رائے کے لڑکے کے یہاں وظیفہ یاب ہوئے جس کا خود میر حسن نے تذکرہ کیا ہے اسی طرح علامہ سید کمال علی صاحب عظیم آبادی کے دونوں صاحبزادوں اشکی و جمال نے خواجہ میر درد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا (ملاحظہ ہو حیات فریاد ص ۱۵۷) لیکن اس کو کیا کیجئے خود میر تقی میر جعفر عظیم آبادی کے شاگرد تھے، غالب نے بیدل کا کلام سامنے رکھ کر مشق سخن کی۔ "نسخہ حمیدیہ" میں غالب کے بیسوں اشعار بیدل کے ساتھ ارادت و نیازکیشی میں پائے جاتے ہیں مرزا بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) اور غلام نقشبند سجاد (متوفی ۱۱۶۳ھ) کے اردو اشعار دہلی اسکول کے کس شاعر کے تتبع کا نتیجہ ہیں نکات الشعرا میر تقی، تذکرہ میر حسن، مخزن نکات قایم چاند پوری میں بیدل کے صرف دو شعر پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے جسم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

سید صفیر بلگرامی نے بھی تذکرہ "جلوۂ خضر" میں بیدل کا ایک اردو شعر لکھا ہے۔
بیدل کا بقیہ اردو کلام یا تو ضائع ہو گیا یا کہیں گمنامی میں پڑا ہے۔ سید خواجہ عماد الدین عماد (۱۰۶۹ھ۔ ۱۱۴۲ھ) و سید غلام نقشبند سجاد (۱۱۰۶ھ۔ ۱۱۷۳ھ) کا کلام پھلواری میں حضرت مکرم مولانا تمنا مدظلہ کے پاس محفوظ ہے "معارف" پھلواری (بابت صفر ۱۳۳۲ھ) میں حضرت تمنا مدظلہ کے قلم سے غلام نقشبند سجاد کی زندگی پر ایک بسیط مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ خواجہ عماد کا کلام ملاحظہ ہو۔

جب بیچ چمن کے فصل بہاری آوے ہے
تب جوش جنوں تلوا میرا کھجلائے ہے

بیچ نظر کے ادھر ادھر ہر دم آئے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر بھی ٹک دیکھے کو ترسائے ہے

جب سی چھوڑیں کھانا پینا تیرا دوانہ الفت میں
خوں جگر کا پیوے ہے۔ اور غم غصہ کو کھائے ہے

آئے اپنے ہاتھ وہ موہن کہیں عماد اب اسکی آس
اسکے کارن کرن جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

تذکرہ نگاروں کی کثرت رائے کے مطابق غلام نقشبند سجاد میر تقی سے پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے کلام میں ایک ایسا سوز و درد ہے کہ پڑھنے کے بعد ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بھٹی کو چلا کیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجادستی
تھا رات تلک تو کام اس کو اشغال ستی اور اور ادستی

ٹک میری طرف سے باد صبا کہتی جا کر صیادستی
اب جاں لبوں پر بلبل کے پہونچی تیری بیدادستی

تنہائی فرقت میں اپنا کیا کیا نہ یہ دل گھبراوے ہے
بہلے ہے جو یہ ٹک ناشدنی تو صرف تمہاری یادستی

جب آگ دھندھکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم
کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو یارو تم اک ناشادستی

اے باد سحر اے موج صبا لے جلد ہماری آکے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امدادستی

سن پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے یہ گھر اللہ کا ہے
اب کھود کے اس کو پھینکوائے وہ بت نہ کہیں بنیادستی

جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے پچتاوے اور افسوس کرے
بتلاؤ کوئی شکوہ کریں کیا ایسے ستم ایجادستی

گھٹانا تو بہت اب جاوینگے ہرگز نہ کسو کے کوچہ میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشادستی

[illegible] ہے وہ کب کا تقوی کو بھٹی میں تو اسکی گزرے ہے
سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو اب سجادستی

اب آئیے اس مسئلہ پر غور کریں کہ بہاری اسکول پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک محقق کو کن مراحل سے گزرنا ہوگا ہر چند یہ مسئلہ شرح و بسط کا طالب ہے۔ لیکن مختصراً ان ماخذ کا تذکرہ کیا جائے گا جن کو پیش نظر رکھنے کے

بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے شعرائے ریختہ کے متعلق تو عموماً فضلائے دہلی، اودھ اور دکن کے تذکرے نظر آتے ہیں ان میں نکات الشعرا میر تقی، مخزن نکات قائم چاندپوری، تذکرہ میر حسن، چمنستان شعرا شفیق، تذکرہ مصحفی، آب حیات آزاد، گلشن بیخار شیفتہ زیادہ مشہور ہیں افسوس ہے بہار کے اردو فارسی شعرا کی طرح بہاری تذکرہ نگاروں کو بھی زمانہ نے فراموش کردیا حالانکہ محمد روشن جوشش (معاصر میر حسن) عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل مولف "گلزار ابراہیمی" ناظر وزیر علی عبرتی (متوفی ۱۲۸۰ھ) مولف تذکرہ "معراج الخیال"، سید علی محمد شاد مولف "حیات فریاد"، نواب سید امداد امام اثر مولف تذکرہ "کاشف الحقائق"، تمام حضرات بہار کے بہت ہی بلند پایہ تذکرہ نگار گزرے ہیں لیکن ان میں چند حضرات تو مجمل طور پر دنیا میں روشناس ہیں بقیہ گمنامی میں ہیں، بہار میں فارسی شعرا کے بھی بعض مستند تذکرے پائے جاتے ہیں مثلاً نواب آغا علی خاں مولف تذکرہ "نشتر عشق" کا وطن بہار ہی تھا "سفینہ خوشگو" کے مصنف بندرا بن داس نے یہیں عظیم آباد میں وفات کی، دونوں تذکروں کے مخطوطات پٹنہ اورینٹل لائبریری میں موجود ہیں تذکرہ نگاروں کے علاوہ نواب غلام حسین خاں مولف "سیر المتاخرین" بھی یہیں کے رہنے والے تھے مصنف نے اس کے ایک حصہ میں بہار کے صوفیہ وغیرہ کا حال لکھا ہے۔ ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیمی کے علاوہ فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا تھا جو بہت ہی مشہور ہے۔ اس کا نام صحف ابراہیم ہے اس کتاب کا ایک مخطوطہ پٹنہ لائبریری میں ہے۔ جوشش کا تذکرہ ناپید ہے اس کے متعلق صرف تذکرہ میر حسن سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ میر حسن جب اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے، تو عظیم آباد میں جوشش بھی اپنا تذکرہ تالیف کر رہے تھے۔ عبرتی راجہ پیارے لعل الفتی کے شاگرد تھے، الفتی کے خاندان میں میر حسن کے خاندان کی طرح نسلاً بعد نسل شاعری کا رواج رہا چنانچہ انکے لڑکے کنور بہاری لعل ضمیر اور پوتے کنور سکھراج بہادر رتمتی بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ ضمیر تو زبان عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، ایکدفعہ اعداد و ہندسہ کے متعلق علامہ سید غلام حسین مشہور ریاضی داں سے اور ضمیر سے عربی زبان میں خوب مباحثے ہوئے، کنور سکھراج بہادر رتمتی نے چند بار مہتم بالشان مشاعرے کئے، چنانچہ صفیر بلگرامی (ساکن آرہ) نے بھی تذکرہ "جلوۂ خضر" (جلد ۲) میں ایک مشاعرہ کا تذکرہ کیا ہے جس میں وہ خود ۱۲۹۶-۹۷ھ میں مدعو تھے، اور گلدستہ مرسوم بہ "تحفۂ انجمن رتمتی" میں انکی غزل بھی چھپی تھی۔ عبرتی مرحوم نے دو تذکرے لکھے ایک معراج الخیال دوسرا ریاض الافکار، اول الذکر میں شعرا کا تذکرہ ہے ثانی الذکر میں نثر نگاروں سے بحث کی ہے۔ لیکن ضمناً شعرا کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ صفیر بلگرامی .... بہت بڑے محقق زبان، اور مختلف فنون ادبیہ کے ماہر تھے۔ ان کی ایک تالیف "جلوۂ خضر" بہت مشہور ہے۔ یہ بڑی محنت و کاوش، تحقیق و استقرار کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں ایک دہلی اسکول کی شاعری اور اس کے اساتذہ و متبعین کے متعلق ہے

[illegible] کی شاعری بالخصوص ناسخ و آتش جیسے اسکولوں کا فرق و امتیاز دکھایا گیا ہے۔ ناسخ کی خصوصیات و انکی ادبی تحقیق سے مکمل بحث کی گئی ہے۔ یہ صحیفہ اس قدر فاضلانہ و محققانہ ہے کہ شاید ہی اتنا بڑا ذخیرہ معلومات کہیں اور یکجا دستیاب ہو سکے۔ آخر میں ایک عجیب ناسخ کی شاعری پر علی الرغم طبع آزمائیاں کیا کرتا ہے، جہاں تک شاعرانہ شگفتگی و برجستگی، احساسات و تاثرات کا تعلق ہے، یقیناً ناسخ کی شاعری میرے لئے بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، ہماری شعرائے میر ضیا، شیخ راسخ، عطا بلوی اور فقیر بہاریوں میں میر و درد، میر حسن و قائم، سودا و غالب کا کلام مجھے زیادہ محبوب ہے، عہد حاضر میں جہاں تک انفرادی پسند کا تعلق ہے، اصغر گونڈوی کے شاعرانہ افکار میرے لئے حد درجہ دلآویز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی میں ناسخ کو زبان اردو کا بہت بڑا قائد اور مصلح خیال کرتا ہوں جن نقاد نگاہوں نے بصیرت و تعمق کے ساتھ ناسخ کی لسانی خدمات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ اردو کو اس منزل ترقی پر پہونچانے میں ناسخ اور آپ کے تلامذہ نے بڑی جگر کاویاں کی ہیں میرا خیال ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جبکہ لسانیات کے محققین ناسخ کی خدمات زبان پر فلسفیانہ روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ناسخ اسکول کا مطالعہ کئے بغیر اردو کی صحیح تاریخ مرتب کرنا احاطۂ امکان سے باہر ہے جہاں تک جذبات کی برانگیختگی، پیام اور اثر آفرینی کا تعلق ہے، ناسخ اسکول نے کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔ لیکن زبان کا خط و خال کچھ اس طرح درست کیا کہ اردو شاہد رعنا بن گئی۔

اب چند الفاظ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بہار میں اردو شاعری کے کتنے اسکول ہیں؟ بہار کے باکمال شعرا کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے، اور جو کچھ طبع ہو چکا ہے، وہ بہت مختصر ہے، پھر بھی شعرائے بہار کے افکار عالیہ کا جتنا حصہ ہمارے احاطہ معلومات کے اندر ہے، ان کی بنا پر ہم بعض قیاسی نتائج مرتب کر سکتے ہیں ہر چند ابھی تحقیق و استقرار کا میدان وسیع ہے اور امتداد زمانہ ہماری بہت سی قیاس آرائیوں میں تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

(۱) دہلی اور دکن میں فارسی شاعری کا شباب ہے۔ عہد جہانگیری سے لے کر دور عالمگیری تک تمام اکابر رجال فارسی میں شعر کہتے ہیں دور جہانگیری کے شعرا ابو طالب کلیم، ملا سرابی، ملا شیدا، طالب آملی، حکیم رکنائے کاشی، عہد شاہجہانی کے مرزا منیر و دانش، محمد قلی سلیم، سالک یزدی، صائب تبریزی، میر صیدی، قدسی مشہدی، عصر عالمگیری کے محمد سعید اعجاز و سعید اشرف، محمد زماں راسخ، ناصر علی، تقی، محمد علی ماہر، مرزا سرخوش، موسوی خاں فطرت وغیرہ نے ۱۰۱۱ھ سے ۱۱۱۸ھ تک نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان میں فارسی ہی کا ذوق پیدا کر رکھا تھا لیکن شعرائے عالمگیری کے عہد میں ایک ایسا بہاری شاعر تھا جس کی تجلیات لطیف، وجدانات شعری، الہامات صوفیانہ، اور کشف حقائق نے اردو کی مدی کے نقش و نگار روشن کرا دیا بلکہ آج ہندوستان کے بے مثل نقاد ادب (حضرت مولانا نیاز فتحپوری مدظلہ)

تو اس کو تمام شعرائے ایران سے ممتاز بناتی ہیں، یہ مرزا عبدالقادر بیدل کی ذات ہے۔ اس میں شک نہیں بیدل کے چند اشعار متفرق طور پر نکات الشعراء، تذکرہ میر حسن میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کے پہلو بہ پہلو بیدل کے اشعار پڑھ کر پھر بہاری اردو کی فوقیت کا اندازہ لگائیے، فطرت کہتے ہیں۔

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے — در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

بیدل کہتا ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں — اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے جسم میں

بیدل کے اردو اشعار میں بھی اس کی وہی شاعرانہ قادر الکلامی اور رفعت فکری کار فرما ہے جو اس کے فارسی کلام میں ہے اور جس نے اس کو تمام فارسی شعراء میں ممتاز بنا دیا ہے، زبان کی صفائی صاف بتا رہی ہے کہ بیدل نے اردو میں بھی اس سے پہلے بہت کچھ کہا ہوگا۔ شاید زمانہ نے اس کو برباد کر ڈالا، یا پھر کہیں "تبرکات خاندانی" میں ہو، بہرحال دور عالمگیری کے اس بہاری شاعر نے اپنی ندرت افکار کے بہت کچھ نمونے چھوڑے۔ اور مقامی لوگوں میں ذوق سخن پیدا کر دیا ہر چند بیدل کے عہد میں یا اس سے پہلے بہار کے اندر اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی اس عہد کا کلام غیر مطبوعہ ہے اور بہاری اہل قلم پوری طرح مدبرانہ صرف کر کے ان اکابر کے حالات و کلام فراہم کر رہے ہیں غلام نقشبند سجاد اور اشرف علی خان فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پذیر ہوئی، ہر چند میر تقی نے نکات الشعراء میں فغاں کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتایا ہے لیکن امید تو فارسی کے شاعر تھے، اردو میں انھوں نے صرف دو شعر موزوں کئے میر صاحب نے ان کے دونوں شعر نقل کئے ہیں جو امید نے میر صاحب کو سید حسن رسول نما بناری قدس سرہ کے عرس کی تقریب میں بمقام بنارس سنایا تھا فغاں بہار کے رہنے والے تھے میر صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں "بندہ بخدمت او بسیار مربوطم"، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فغاں نے میر صاحب کے دل پر کوئی خاص نقش ارادت چھوڑا تھا۔

(۲) بیدل کی وفات کے تقریباً چونتیس سال کے بعد مضافات عظیم آباد کے ایک قریہ "سائیں" میں شیخ غلام علی راسخ پیدا ہوئے نصف صدی کے اس درمیانی زمانہ میں بہار کے اندر اردو شاعری نے کافی ترقی کر لی تھی بیدل اور سجاد کے نقوش میں زیادہ جلا ہو رہی تھی، میر ضیا، فغاں، اشکی اور جمال نے عظیم آباد کو "دامان بہار" بنا رکھا تھا میر ضیا دہلی سے آ گئے تھے اشکی و جمال نے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کر لی تھی، اسی دور میں راسخ نے بھی شعر کہنا شروع کیا۔ آب حیات آزاد اور خیالات خریار علامہ شاد میں ان کا وہ مشہور شعر درج ہے، جو انھوں نے میر تقی کو سنایا تھا، اس میں شک نہیں راسخ کے ذوق شعری کو میر صاحب کی شاعری سے خاص مناسبت تھی، اسی لئے وہ میر صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کے لئے گئے

راسخ میر صاحب کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں خود میر نے ان کو "فخر میر" کا لقب دیا لیکن تلمذ سے پہلے راسخ کے کلام میں کافی پختگی آ چکی تھی فرماتے ہیں۔

اب ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے   قطرہ پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

راسخ کی عظمت شہرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بہار میں میر صاحب کی شاگردی سے پہلے فروغ پا چکی تھی، راسخ ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۸ھ میں وفات کی اس عہد کے تمام اکابر الفتی، اشکی، جمال، عبرتی، فدوی سب میں راسخ کی شاعری کو زیادہ فروغ ہوا، شاہ ابوالحسن فرد (متوفی ۱۲۶۹ھ) اور غلام علی راسخ دونوں حضرت شاہ نور الحق تپاں کے شاگرد تھے، شاہ نور الحق صاحب بڑے محدث بھی تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے "عجالۂ نافعہ" آپ ہی کے لئے لکھی تھی تپاں پھلواری کے رہنے والے تھے، آپ نے ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا اس لئے راسخ اسکول بلا واسطہ بہاری اسکول ہے راسخ کے تلامذہ میں مفتی انور علی یاس آروی (متوفی ۱۲۶۲ھ) بہت اہمیت رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔

یاں طرز سخن میں اے یاسؔ   راسخ کے یادگار ہیں ہم

یاسؔ مرحوم ایک جید عالم اور فارسی کے مستند شاعر تھے، آپ کا دیوان ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوا تھا یاس کے سوانح حیات اور شاعری پر سالنامہ ساقی (۱۹۳۲ء) میں ایک تبصرہ ہو چکا ہے۔

(۳) بہار میں تیسرا اسکول سادات بلگرام کا ہے، یہ لوگ بلگرام سے آرہ اور گیا تو چلے آئے چنانچہ سید خورشید علی خورشید بند علی ہند غلام یحییٰ یحییٰ، سید محمد مہدی خبر، میر امامی، سید فرزند احمد صفیر اس خانوادہ کے اہل کمال گزرے ہیں صفیر (متوفی ۱۳۰۸ء) سے پہلے آرہ میں مولانا انور علی یاس آروی کی شہرت ہو چکی تھی، اسی زمانہ میں سید سلطان عالم صاحب مارہروی آرہ تشریف لائے، لیکن صفیر نے اپنے عہد میں مجالس ادبی کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں اس کی نظیر ان سے قبل نہیں ملتی، صفیر نے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول دونوں سے استفادہ کیا چنانچہ جہاں انھوں نے غالب کو اپنا کلام دکھایا وہاں آتش کے شاگرد رشید شیخ امان علی سحر سے بھی اصلاح لی، دبیر کے سامنے بھی زانوئے تلمذ نہ کیا لیکن غالب، سحر، اور دبیر سے مشورہ سخن کرنے سے بہت پہلے ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا خود گھر میں سید صاحب عالم صاحب، میر امامی، سید محمد مہدی خبر موجود تھے میر امامی کا دیوان گرانقدر اور آرہ کے بعض حضرات کے یہاں آج بھی دستیاب ہو سکتا ہے میر امامی کی شاعری بہار ہی میں پھولی پھلی، اس لئے وہ ہماری تاریخ ادب کے ایک اہم باب ہیں صفیر نے اپنی تالیفات وتصنیفات کے علاوہ بہت سے باکمال شاگرد چھوڑے جن میں مولانا اسمٰعیل قمر قاضی واجد حسین وجد، سید امیر حسن بدر (صاحب مخمانہ) کا نام لیا جا سکتا ہے، یہ سب محلہ آرہ کے رہنے والے تھے۔

(۴) ماضی قریب اور عہد حاضر میں شمشاد کے شاگردوں نے بہار پر زیادہ اثر ڈالا، شمشاد لکھنوی تابع اسکول سے مشہور شاعر ہیں، فرنگی محل کے جید عالم تھے، اس لئے طبقہ علما میں آپ کی زیادہ پذیرائی ہوئی، چنانچہ مولانا شوق نیموی مولانا ضمیر الحق قیس آروی، حضرت تمنا پھلواروی، اسی اسکول کے علمبردار ہیں، مولانا شوق بہت بڑے علامہ تھے، حدیث میں آپ کی تالیف "آثار السنن" نہ صرف ہندوستان بلکہ حجاز میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور داخل نصاب ہے آپ کی ایک مثنوی سوز و گداز بہت ہی مقبول ہوئی۔

ہمارا زمانہ اردو ادب کے لئے دور نہضت ہے، اس وقت قدیم عربی اور یورپی شعرا کی طرح علمی، سیاسی اور معاشرتی نظم نگاری کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، پنجاب نے اقبال، اودھ نے جوش اور دکن نے علی اختر پیدا کئے بہار بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہا آج ہم اپنے وطن کے مایہ ناز بزرگ ڈاکٹر عظیم پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں سید عبد الغنی شمس اور احمد آرمان ایم اے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شمس صاحب کی نظمیں ندیم، نظرت وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں، آپ کی بہت سی نظمیں غیر مطبوعہ ہیں، آپ کی ذات سے اہل بہار کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں جامعہ شمس الہدی (پٹنہ) کا یہ عالم اپنی انشائے عالیہ، اور ادب لطیف کے لئے نقادنگاہوں میں گھر کر چکا ہے، شمس کی موجودہ زندگی سراپا شعر ہے، موسیقیت ہے ایک ایسی لطیف زندگی ہے جہاں عبوستاً قمطریراً قسم کا کوئی مولوی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے، اگر بہار کے اس نوجوان شاعر نے اپنی مشق سخن جاری رکھی تو پھر وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستان ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان پر فخر کر سکے گا۔

عبد المالک (آروی)

ملاحظہ: اس مضمون میں اساتذہ بہار کے متعلق محض اشارے کر دیے گئے ہیں ہمارے عہد میں بہار کے اندر بڑے بڑے شعرا موجود ہیں افسوس ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح شہرت و نمود سے یکسر علیحدہ ہیں، حالانکہ اجتماعی مفاد کے لیے افراد میں ان خیالات کا ہونا ضروری ہے، مگر کیا کیجئے بہار کے خمیر ہی میں زہد گزینی کا مادہ ہے، حضرت فضل حق آزاد، حضرت شفق عماد پوری، حضرت عرش گیاوی، شاہ نصیر عظیم آبادی، جناب نصیر (بیرسٹر) جناب بیدل (پروفیسر) ہمارے زمانہ کے صاحب کمال بہاری شعرا ہیں ان کے علاوہ گیا، عظیم آباد، پھلواری، آرہ تمام شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق ہے، اور ہر جگہ ماہران علم و ادب کی کافی تعداد موجود ہے،

دکن اور اردو شاعری

(سلطنت آصفیہ سے پہلے دکن کی اردو شاعری پر ایک نظر)

شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارہائے نمایاں اس سے ظہور میں آئے وہ اور وسائل سے نہیں آئے۔ نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت و جنبش ہوتی ہے۔

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اول نظم ہی کا رواج ہوا ہے کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے۔ اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلمبند ہوا کرتی تھیں۔ سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکومت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا سیکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت، جلوت، رزم و بزم سے خاص تعلق رہا۔ شاعروں کی کافی طور سے عزت افزائی کی گئی اور انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا جانے لگا۔

مگر دکھنی زبان میں ایسا نہیں ہوا یہاں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر کی ابتدا چونکہ ترجمہ سے ہوئی اور نظم کے بہ نسبت نثر میں ترجمہ کرنا آسان اور سہل تھا اس لئے غالباً نظم کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ نثر سے ابتدا کی گئی۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ دکھنی زبان کا پہلا شاعر کون تھا؟ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی کی طرف بھی اشعار منسوب کئے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے اس لئے سردست ہم کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔

ایک زمانہ تھا کہ اہل علم ولی اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا شاعر تصور کرتے تھے اب جدید تحقیقات اور مزید معلومات

کی بنا پر سلطان محمد قلی قطب شاہ المتوفی ۱۰۲۰ھ کو پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سلطان کے کلام سے خود اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اردو کا بالکل ابتدائی کلام نہیں ہے۔

جہاں تک ہم نے اب تحقیقات کی ہے اس کے لحاظ سے نظامی ما پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ کے دور حکمرانی میں موجود تھا۔

نظامی کی مثنوی "کدم راؤ و پدم راؤ" دستیاب ہوئی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ دکھنی شاعری کا ابتدائی نمونہ ہے بہمنی حکومت (۷۴۸ھ تا ۹۳۴ھ) کے کسی اور شاعر کا اس وقت تک کوئی کلام نہیں ملا ہے بہمنی حکومت کے زوال پر ۹۱۶ھ میں گولکنڈہ پر قطب شاہی اور ۸۹۵ھ میں بیجاپور پر عادل شاہی پرچم لہرانے لگا اور تقریباً دو سو سال کے بعد دونوں علم سرنگوں ہو گئے اس طرح ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلیہ جھنڈا بلند ہو گیا

اس عرصہ میں ان دونوں سلطنتوں نے علم و ہنر کی ترویج اور تمدن و تہذیب کے رواج دینے میں جو کچھ سعی کی تھی وہ ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی جب ہم ان کے مختصر رقبہ مملکت کو پیش نظر رکھ کر ان کی شان و شوکت اور دبدبہ طمطراق کو دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان دولت و ثروت اور بیش قرار لشکر کس طرح فراہم ہوتا تھا جس طرح ان کی دولت مندی اور ان کے زر و جواہر کی فراوانی بادی النظر میں افسانہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح ان کی علم دوستی اور اہل کمال کی قدردانی بھی حیرت انگیز ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور علم و ہنر کے مرکز اور تمدن و تہذیب کے گہوارے تھے۔ دور دور کے اہل علم و فضل یہاں کی قدردانی کا شہرہ سنکر آتے اور اپنی محنت و مشقت کا کافی صلہ پاکر نہال ہو جاتے تھے۔ یہاں کے چشمہ ہائے فیض کی آبیاری سے چمنستان علم و فضل سرسبز اور شاداب تھے۔ مے خانہ علم و فن معمور شعر و سخن کی مجلسیں آباد تھیں۔ گھر گھر شاعروں کے جمگھٹے ہوتے تھے۔ غرضکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کو اگر زمانہ سلف میں قرطبہ اور بغداد سے مماثل سمجھا جاتا تھا تو اب لنڈن اور برلن کو اس کے مقابل لا سکتے ہیں۔

عربی و فارسی سے قطع نظر ہم دکھنی بہ الفاظ دیگر اردو کی ترقی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یہ امر ہم کو معلوم ہے کہ اردو کی ابتدا دکن میں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے بہت پہلے ہو چکی تھی اور وہ اگرچہ عام بول چال کے دور سے گزر چکی تھی اور پھر نثر و نظم کے مدارج بھی طے ہو چکے تھے مگر پھر بھی نثر فقہ و تصوف کی ایک دو کتابوں تک محدود تھی اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا پتہ چلتا ہے ان دونوں سلطنتوں نے اردو کی سرپرستی فرمائی اور اس کو ترقی دیکر بارور اور مثمر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر عزت دی۔

ان خاندانوں کے خود کئی ایک تاجدار اچھے شاعر تھے انکا کلام آج تک موجود اور اپنے مصنفوں کی علمی قابلیت کی زندہ گواہ

سلطان محمد قلی اور سلطان محمد اور عبد اللہ قطب شاہ کے کلیات اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اردو کے جواہر پارے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کا شہ کار "نورس" اور علی عادل شاہ کا کلیات اور مثنوی بدیع الجمال درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہیں۔

ان حکمرانوں کے دور کے مسلسل اور طویل نظموں کے نمونے موجود ہیں جو صرف کسی اور زبان کے ترجموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اپچی اور طبع زاد بھی ہیں صنف شاعری کے متعدد اقسام مثلاً مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی اور قطعہ میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی یادگار میں شعر و سخن کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں۔

ان کی شاعری میں رزم و بزم۔ واقعہ نگاری۔ مرقع نگاری، عشق و محبت تصوف و فلسفہ۔ روزمرہ و اخلاق سب کچھ موجود ہے۔ اسلوب بیان کی جدت تخیل کی بلند پروازی خیالات کی ندرت اور سادگی و صفائی تسلسل اور پاکیزگی انکے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے جن جن شاعروں اور ان کی تصانیف کا پتہ اب تک چلا ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

گولکنڈہ

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	فیروز	سنہ ۹۷۵ھ	؟
۲	محمود	سنہ ۹۷۵ھ	؟
۳	وجہی	سنہ ۹۸۸ھ	مثنوی قطب مشتری۔ مرثیہ
۴	سلطان محمد قلی	سنہ ۹۸۸ھ	کلیات
۵	احمد	سنہ ۹۹۰ھ	لیلیٰ مجنوں بمصیبت اہل بیت
۶	سلطان محمد	سنہ ۱۰۲۰ھ	کلیات
۷	غواصی	سنہ ۱۰۲۰ھ	.
۸	قطبی	سنہ ۱۰۳۰ھ	مثنوی تحفۃ النصائح
۹	جنیدی	سنہ ۱۰۳۵ھ	مثنوی ماہ پیکر
۱۰	سلطان عبد اللہ	سنہ ۱۰۳۵ھ	کلیات
۱۱	ابن نشاطی	سنہ ۱۰۳۵ھ	مثنوی پھول بن

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۲	طبعی	سنہ ۱۰۸۱ھ	مثنوی بہرام و گل اندام
۱۳	ابن	سنہ ۱۰۶۷ھ	قصہ ابوشحمہ
۱۴	غواص	سنہ ۱۰۷۵ھ	قصہ حسینی
۱۵	غلام علی	سنہ ۱۰۷۵ھ	مثنوی پدماوت
۱۶	سیوک	•	
۱۷	فائز	"	
۱۸	لطیف	سنہ ۱۰۸۰ھ	ظفرنامہ
۱۹	افضل	"	محی الدین نامہ
۲۰	نوری	"	
۲۱	قاسم	"	
۲۲	مرزا	"	
۲۳	شاہی	"	

بیجاپور بیجاپور کے شعراء اور ان کے تصانیف کی فہرست یہ ہے :—

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	شاہ میران جی	سنہ ۹۰۲ھ	خوش نامہ، خوش نغز، شرح مرغوب القلوب
۲	ابراہیم	سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۳۶ھ	نورس
۳	برہان الدین جانم	سنہ ۹۷۵ھ	وصیت الہادی، سکھ سہیلا وغیرہ
۴	آتشی	سنہ ۱۰۵۰ھ	؟
۵	مقیمی	سنہ ۱۰۵۰ھ	مثنوی چندر بدن و مہیار
۶	امین	"	بہرام و حسن بانو
۷	شوقی	"	فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ
۸	صنعتی	"	قصہ تمیم انصاری
۹	ملک خوشنود	"	مثنوی ہشت بہشت

شمار	نام شعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۰	رستمی	۱۰۵۵ھ	مثنوی خاور نامہ
۱۱	دولت	۱۰۵۵ھ	تکمیل بہرام و حسن بانو
۱۲	علی عادل شاہ شاہی	۱۰۶۶ھ تا ۱۰۸۳ھ	کلیات اور مثنوی الجمال
۱۳	نصرتی	۱۰۶۰ھ	گلشن عشق۔ علی نامہ۔ تاریخ سکندری
۱۴	شاہ ملک	۱۰۶۰ھ	شریعت نامہ
۱۵	امین الدین اعلیٰ	۱۰۷۵ھ	رموز السالکین۔ محبت نامہ وغیرہ
۱۶	ہاشمی	"	یوسف زلیخا
۱۷	مرزا	"	مرثیہ
۱۸	ایاغی	"	نجات نامہ
۱۹	سیوا	"	روضۃ الشہدا
۲۰	شغلی	"	
۲۱	مومن	۱۰۸۰ھ	اسرار عشق
۲۲	قادر	"	غزل
۲۳	شاہ من عرف	"	"
۲۴	معظم	"	شجرۃ الاتقیا۔ گنج مخفی

ادھر گولکنڈہ میں وجہی کی قطب مشتری۔ غواصی کی سیف الملوک ابن نشاطی کی پھول بن طبعی کی بہرام و گل اندام۔ غلام علی کی پدماوت اور لطیف کا ظفر نامہ شہ کار ہیں تو ادھر بیجاپور میں صنعتی کا قصہ تمیم انصاری۔ رستمی کا خاور نامہ۔ نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ۔ اپنی خوبیوں سے ادب اردو کے جگمگاتے نگین ہیں۔

ان دونوں سلطنتوں میں مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت کے مرثیے اپنے سوز و گداز سے خاص اثر پیدا کرتے اس زمانہ کے مرثیوں سے مجلس عزا میں حقیقی طور پر اشک باری ہوا کرتی تھی۔ ان کا جوہر مرثیہ بن تھا۔ غواصی۔ کاظم۔ مرزا شاہی اور ہاشمی کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل گئے۔ اسطرح

عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا اور اب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ اور پھر سلطنت مغلیہ کا بھی دکن ہی مستقر ہوگیا۔

قطب شاہی پایۂ تخت گولکنڈہ اور عادل شاہی دار الحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے لیکن اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کا دار الحکومت ہونے کے لحاظ سے امراء اور علماء و شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا بن گیا

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعراء اردو کے ساتھ بیحد مراعات کئے جاتے تھے انکی ان کی تصانیف کا معقول صلہ دیا جاتا تھا نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے لیکن مغلیہ دور میں اس قسم کی قدردانیوں کے کم ہوجانے کے باوجود قابل افراد بلا کسی صلہ یا قدردانی کی امید کے اردو میں شعر و سخن کی داد دینے لگے تھے۔ علاوہ ازیں عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکھنی شاعری کی قدردانی کی اور نصرتی کو ملک الشعراء کے خطاب سے مشرف کیا تھا۔

اورنگ آباد کو اورنگ زیب عالمگیر نے سنہ ۱۰۶۲ھ میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا اسی وقت سے اس کی رونق زیادہ ہونے لگی تھی۔ فتح گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد اس کی ترقی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ تمدن و تہذیب کے ساتھ علم و فن میں بھی ترقی ہونے لگی۔ شعر و شاعری کا بھی چرچا بڑھا۔ اس طرح اردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعراء نے اپنی یادگار میں بہترین کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔

سنہ ۱۰۹۸ھ میں تقریباً پورا دکن سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تھا اور سنہ ۱۱۳۷ھ میں حضرت آصفجاہ اول نے اپنی حکومت کی بناڈالی اس (۴۰) سالہ مدت میں بھی اردو کے کئی ایک شعراء مشہور ہوئے جن کی مثنویاں۔ دیوان اور مرثیے آج تک موجود ہیں

اس زمانہ کے شعراء جن سے ہم واقف ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۱	عاجز	سنہ ۱۱۰۰ھ	مثنوی ملک مصر
۲	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	عشق صادق - ہدایت نامہ
۳	امین	سنہ ۱۱۰۹ھ	یوسف زلیخا

سلہ تذکرہ فتوحات موسوم ریاض حسنی مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکاری نظام

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۴	ذوقی	سنہ ۱۱۱۰ھ	وفات نامہ ۔ مرثیے
	وجدی	سنہ ۱۱۱۵ھ	تحفۂ عاشقاں، منطق الطیر
۵			باغ جانفزا
۶	بحری	سنہ ۱۱۱۶ھ	من لگن
۷	اشرف	سنہ ۱۱۲۵ھ	جنگ نامہ جیسدہ
۸	عشرتی	سنہ ۱۱۲۵	دیپک پتنگ ۔ نیہ درپن وغیرہ
۹	بحری	سنہ ۱۱۳۰ھ	
۱۰	طالب	"	
۱۱	بیچارہ	"	
۱۲	بتیم احمد	"	
۱۳	فراقی	"	
۱۴	ندیم	"	
۱۵	ولی ویلور	"	رتن دیدم ۔ روضۃ الشہدا
۱۶	ولی اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۱۹ھ	کلیات

سلطنت آصفیہ کے زمانہ میں اردو کی ترقی کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے ۔ ہماری کتاب دکن میں اردو کے تیسرے اڈیشن میں جو زیر طبع ہے اس کے متعلق پوری وضاحت کی گئی ہے ۔

نصیر الدین (ہاشمی)

تخلیق اُردو

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال
جس زباں کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
کم سنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
اس کے اسباب علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زباں افواج کی بھرتی نہ تھی
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
کس زباں میں ہندیوں کے ساتھ ہوتا تھا کلام
تاجروں اور صوفیوں اور لشکروں کا ہے قیام
کاروبار باہمی کا کس طرح چلتا تھا کام
کیا سوال آنکھوں سے ہوتا اور ابرو سے جواب
گفتگو ہند اور عجم کی تھی کوئی گونگے کا خواب؟

عقل و تہذیب و تمدن متحد تھے سب بہم
دلفریبی سے بتان ہند پہنچے تا حرم
مجتمع تھے اہل ہند اہل عرب اہل عجم
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم
لائے سوغاتیں وہ اور ان سے مداراتیں ہوئیں
پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں

چند تاجر آئے پھر درویش پھر فوجی نشان
پہلے ہی پنجاب ان چاروں کا لیتا امتحان
کچھ عرب، کچھ ترک، بعد ان کے مغل تھے پھر پٹھان
پاس جب سب یہ ہوئے پیدا کی ایک جامع زبان
اس زباں کا نام ہندی ہو گیا پھر ہندوی
بعد ازاں ہندوستانی، آخرش اردو ہوئی

اہل دیں نے کی اسی ہندی میں خدمت دین کی
پند اک منظوم ہے حضرت فرید الدین کی
اور اسی میں سعد نے دیوان کی تدوین کی
نظم خسرو میں بھی ہے ترکیب اسی آئین کی
پڑھ کے مخلوطات یورپ کیجیے گا غور بھی
کیا نہیں ممکن کہ ہو اس کے سوا کچھ اور بھی

الغرض اردو کا اول مستقر پنجاب تھا
نقطۂ مردم پئے اہل نظر پنجاب تھا
کیونکہ قصر ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا
دائرہ تھا دور تک مرکز مگر پنجاب تھا
جیسے خط رخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر
بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں
ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں

تھے قلم اس کے بھی تلواروں کیساتھ اسباب میں
وہ بہار جانفزا جب دولت آباد آگئی
ہند کے پودوں میں کچھ ایران کے پیوند تھے
مختلف نسب مذہب و تہذیب میں ہر چند تھے
تھے جو دونوں صورت شیر و شکر آمیختہ
بات جو تھی بند بند، اب دو بدو ہونے لگی
بات میں اک بات ہو یہ آرزو ہونے لگی
نثر ہی کے سلسلوں سے نظم کی کڑیاں بنیں
اہل جوہر گوندھ کے اس کو نفس کے تار میں
قدر و قیمت اسکی روز افزوں تھی ہر بازار میں
یہ جواہر قابل انگشتری ہونے لگے
انقلاب دہر نے بدلا جو رنگ آسماں
مثنوی پر مرثیہ پڑھنے لگے جب نوحہ خواں
ضبط رہتا کب تک آخر، اور کیوں رہنے لگا
حسن نے جرأت دلائی، عشق کے دفتر کھلے
منظر اردو پہ جب نظارے کے زیور کھلے
شاعر اردو میں اب خط جلی پیدا ہوا
ہاں ولی کے دل پہ سایہ تھا علی کے نور کا
ظرف موسیٰ کا دیا تھا حق نے، دل منصور کا
ایسی معراج ایسے اعجاز، ایسی امت پا گئے
اہل دہلی کو ولی سے کچھ ملا حسن بیاں
شاہ سعد اللہ گلشن نے کئے نکتے عیاں
خلق رنگین و فغاں و شاہ حاتم آبرو

سینچا دہلی کی فضا نے شبنم شاداب میں
بیل اسکی بڑھ کے گجرات و دکن پر چھا گئی
جوڑ ان دونوں میں گو یا نیشکر کے بند تھے
پھر بھی انسانی تمدن کے تو سب پابند تھے
مدھ بھرے ہونٹوں سے رس ٹپکا تو وہ تھا ریختہ
بے تکلف بیجا با گفتگو ہونے لگی
قید آزادی میں ہو یہ جستجو ہونے لگی
اس قدر بکھرے یہ موتی خود بخود لڑیاں بنیں
لے گئے بھر بھر کے موتی دامن گفتار میں
تھی رسا دربار میں پوچھی گئی سرکار میں
عادلی و قطب شاہی مشتری ہونے لگے
اٹھ گئے دنیا سے گجرات و دکن کے قدرداں
سوز سے پیدا کیا جذبات نے ساز فغاں
حسن اپنے عشق میں خود ہی غزل کہنے لگا
عشق نے کھولی زباں تو حسن کے جوہر کھلے
پھر دلی جذبات کے بھی میکدے کے در کھلے
میکشان ریختہ میں ایک ولی پیدا ہوا
رشتۂ الہام تھا جبریل سے بھی دور کا
اور ادھر معمورۂ دلی پہ عالم طور کا
آ کے دہلی میں ولی گو یا نبوت پا گئے
اہل دہلی سے ولی کو کچھ ملا فیض زباں
ہم سخن تھے دہلوی و اکبرآبادی وہاں
اور مظہر ناجی و یکرنگ و مضمون آرزو

سادگی تھی ریختہ کی مقتضائے کمسنی
بھولی بھالی شکل و صورت سیدھی سادھی بات تھی
بندشوں سے عہدِ طفلی تک تو آزادی رہی
پھر جوانی کا جنوں ہمراہ لایا قید بھی
ڈالے سودا کے تھے سب سلسلے زنجیر کے
عشق کی دیوانگی تھی اور نشتر میر کے

مثنوی کہہ دی حسن نے بے نظیر و بے بدل
ذوق نے موزوں کئے پُر درد نالے برمحل
ذوق کا شوقِ زباں دانی ہوا ضرب المثل
کعبۂ معنی بنا مومن کا ہر بیت الغزل
پھیر کے غالب نے رُخِ سجادۂ تخئیل کا
اک نیا میخانہ کھولا بادۂ تخئیل کا

دے گئے تھے کیا سبق وہ شاعرانِ ماسبق
ان ادیبوں پر جو روشن کر گئے چودہ طبق
لیکن افسوس، اب ہوا الٹا دورِ گردوں نے ورق
ہو گیا برباد دہلی کا وہ سب نظم و نسق
منتشر اہلِ سخن، اہلِ زباں ہونے لگے
طائرانِ خوش نوا بے آشیاں ہونے لگے

خاک و خوں میں مل گیا اس طرح دہلی کا چمن
رہ گئے گلہائے خلعت پوش بے گور و کفن
شامِ غربت سے بھی کچھ تاریک تھی صبحِ وطن
شمع کشتہ بن کے نکلے بزم آرائے سخن
کر چکا تھا دو شجاع الدولہ کی جو آرزو
آہ وہ سودا خود آیا بن بلائے لکھنؤ

جب یہاں یہ لوگ آئے اور ہی کچھ رنگ تھا
دیکھ کر ہر جوہری رنگینیوں کو دنگ تھا
سادہ کاری کا نگیں بے نقشِ زینت تنگ تھا
صیقل و مینا سے اب خورشید کا ہمسنگ تھا
یہ نگینہ جب ترشوایا تو ضو دینے لگا
لکھنؤ کی بزم میں آیا تو لو دینے لگا

جس قدر پہلو تھے اس کے سب کے سب روشن ہوئے
رہ گئے تھے رُخ جو تاریکی میں اب روشن ہوئے
خال و خط اسبابِ زینت کے سبب روشن ہوئے
آئینہ دیکھا تو رخسارِ ادب روشن ہوئے
خود نمائی کے لئے خود بینیاں پیدا ہوئیں
سادگی جاتی رہی، رنگینیاں پیدا ہوئیں

گو یہاں موجود تھے پہلے سے چند اہلِ کمال
مصحفی کا ذکر ہے مشہور اور انشا کا حال
میر کو بھی کھینچ لایا قدردانی کا خیال
یہ وہی تھے میر جن سے بات کرنی تھی محال
اپنی اردو کے تحفظ میں تھے گویا کم سخن
کس کی منہ میں تھی زباں، انسے جو ہوتا ہم سخن

میر پر گزرے تھے اتنے حادثاتِ رنج و غم
تھے بجائے روح و دم رگ رگ میں اب درد و الم
ہر نظر اک متنِ غم تھی، ہر نفس شرحِ ستم
ہر سخن اک نامہ بر تھا دردِ دل کا تازہ دم

رنگ شوخی لائے وہ کیا قیصر کے مضمون میں   جس کا دل ڈوبا ہوا ہو آپ اپنے خون میں
لکھنؤ اس وقت تھا عیش و طرب کا نغمہ گاہ   زمزموں پر ان کے نالوں کو کہاں ملتی پناہ
عاقبت بینی سے لیکن قدرداں تھا بادشاہ   میر کی نازک مزاجی سے بھی کرتا تھا نباہ
پھر جب آیا سوچی یہاں بھی گردش لیل و نہار   ہے جبھی سے شور بلبل جوش گل کی یادگار

انتزاع ملک پر جن کو ہوا رنج و تعب   انکے رنج و غم پہ بیدردوں کو ہے غیظ و غضب
نخل ماتم سے جو بیگانہ ہے گلچین طرب   پوچھتا ہے نے سے ہنس ہنسکر وہ نالوں کا سبب
یہ وہ سمجھے ہمنشینوں سے ہو جو چھوٹا ہوا   گل ہے کیوں افسردہ اپنی شاخ سے ٹوٹا ہوا

الغرض اب لکھنؤ کیا تھا، ادب کا اک چمن   کھل گیا گویا نیا اک درس گاہ علم و فن
کیوں نہ کھلتا، جمع تھے جب ایسے ایسے اہل فن   سوز و انشا، مصحفی و میر، سودا و حسن
ان ادیبوں کا جہاں مسکن بنے مدفن بنے   کیا عجب گر وہ ادب کا مرکز و مخزن بنے

اس فضا میں طائران فکر کے پر کھل گئے   پر کھلے کیا، وسعتِ اردو کے دفتر کھل گئے
فطرتِ سادہ پہ اب صنعت کے زیور کھل گئے   کھل گئی قسمت جو ادھر کی کہ جوہر کھل گئے
چشمے جو پنجاب کے دریا تھے دلی کے لئے   لکھنؤ والوں نے اس دریا سے موتی لے لیے

جو پرکھتے تھے انھوں نے دیکھ کر کھوٹے کھرے   سکے تلپٹ لے کے دار الضرب کو واپس کئے
ایسے چند الفاظ تھے معیار سے اترے ہوئے   جاوے ہے اور آوے ہے یا جا پڑے اور آوے
اس سے ثابت ہے کہ یہ داخل فصاحت میں نہیں   آج میں مستعمل ہیں تصنیف و اشاعت میں نہیں

دیکھی انگریزوں نے جب یہ معرکہ آرائیاں   جی میں سوچے گھیرے گی ملک بھر کو یہ زباں
قلعۂ دلیم میں اب کرنے لگے صف بندیاں   ہو چکا تھا زور نظم و نثر پہلے ہی یہاں
فوج انشا کی کماں انشا کو اول دے گئی   لکھنؤ میں پہلے اردو سے قواعد لی گئی

میر مجلس نثر کا فضلی تھا وہ مجلس لکھی   باغ اردو کی بہار آرایش محفل ہوئی
چار درویشوں کی بپتی میر امن سے سنی   اک عجب افسانہ تھا نثر سرور لکھنوی
ناشر اتنے ہو گئے اخبار ناشر ہو گئے   آخرش اردو میں سرکاری دفاتر ہو گئے

لکھنؤ والوں نے جو اصلاح میں تقدیم کی   جس نظام خاص پر جس طرح کی تنظیم کی

مصحفی نے اپنے شاگردوں کو جو تعلیم کی
ملک کے ہر ناظم و نثار نے تسلیم کی
صاف ہو کر اب زباں کے فیصلے دلکش ہو گئے
جملہ منسوخات ناسخ نذرِ آتش ہو گئے

موجد اپنے رنگ کے تھے شاعرانِ بےنظیر
بات میں بیباک جرأت ۔ فکر میں آزاد اسیر
بندشِ مضموں میں ناسخ اور سنوٹ میں وزیر
عشق میں سرگرم آتش جامعیت میں امیر
مرثیے کے مجتہد مرزا دبیر و میر انیس
اک بلاغت میں لطیف اور اک فصاحت میں نفیس

تھے روانی کے مجدد ہجر اور کیف و صبا
درد اور تاثیر میں ہمسر تعشق کا نہ تھا
فرد تھے رنگ تغزل میں رشید باصفا
قابل ذکر اور بھی استاد ہیں ان کے سوا
رند و برق و درخشاں مہر۔ نجم۔ قلق۔ فضل و نسیم
عاشق و منظر۔ جلال و شاد و جاوید و حکیم

اور شہروں میں بھی تھے اہل سخن شہرت پذیر
جیسے فرد کانپوری ۔ اکبر آبادی نظیر
شیفتہ سالک یقین۔ ممنون شہیدی و صفیر
قدر و مجروح و حضور و داغ و شاد و اکبر منیر
نظم ہوں کس طرح موتی اسقدر بکھرے ہوئے
کس نے کیے لٹ گئے کتنے گہر بکھرے ہوئے

جب ہمارے ہاتھ سے ہندوستاں جاتا رہا
مثل سکوں کے ہمارا ہر نشاں جاتا رہا
جوشِ دل جاتا رہا۔ زورِ زباں جاتا رہا
گم ہوا عشق ادب، حسن بیاں جاتا رہا
وہ ستارے کیا چھپے وہ رات ہی جاتی رہی
وہ سخنور کیا گئے وہ بات ہی جاتی رہی

شاعری کچھ کم نہیں لیکن اثر کچھ بھی نہیں
ہے بظاہر علم، باطن میں ہنر کچھ بھی نہیں
زوردار الفاظ ہیں معنی مگر کچھ بھی نہیں
چشم تصویر آنکھ ہے گویا نظر کچھ بھی نہیں
ذکر کے قابل نہیں ناواقفوں کے تذکرے
شاعری پر غیر شاعر کر رہے ہیں تبصرے

ہاں مگر ہے رازدارانِ زمانہ کا خیال
کرتی ہے تاریخ بیمارانِ ماضی کو بحال
پہونچے دربارِ دکن میں کچھ حکیمانِ شمال
کھل گئے ہیں چند اُردو محکموں کے ہسپتال
ضعف میں اس چارہ سازی سے کمی تو ہو گئی
صحت کامل نہ ہو، پر زندگی تو ہو گئی

اوس طرف تو زندہ کرتا ہے دکن مردہ علوم
اس طرف پنجاب میں ڈوبے ہوئے نکلے نجوم
شاعرانِ قدرتی و نثر خود رو کی ہے دھوم
اور اردو کی کمک پر ہے رسالوں کا ہجوم
عشقِ علمی کیجئے یا حسن تجارت مانئے
کچھ بھی ہو ناطق مگر یہ بھی غنیمت جانئے

ناطق ۔ لکھنوی ۔

لکھنؤ کی شاعری لکھنؤ اسکول کے قیام سے قبل

(یعنی)

اودھ کا سب سے پہلا جذبات نگار شاعر

(نواب آصف الدولہ بہادر)

ولادت ۱۱۶۱ھ تخت نشینی ۱۱۸۸ھ وفات ۱۲۱۲ھ ہجری

نواب آصف الدولہ، فرمانروایان اودھ میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور فرمانروا ہوا ہے لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسکی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اسکا پاکیزہ ذوق سخن تھا

پانچ لاکھ روپیہ خرچ کر کے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کرانا، شریف مکہ کی ایک لاکھ روپیہ سے مدد کرنا، اسی طرح بیشمار دولت انعام و اکرام میں تقسیم کر دینا غلط بخششوں کی تاریخ میں اسے خلعت دوام بخش سکتا ہے اور لکھنؤ کا وہ عظیم الشان عزاخانہ جو اسکے نام سے منسوب ہے ممکن ہے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی یاد کو کبھی فراموش نہ ہونے دے لیکن جو چیز حقیقی معنی میں اس کے نام کو زندہ رکھنے والی ہے وہ اسکی سخن سنجی ہے جسکا ذکر اور تو اور خود حضرات لکھنؤ نے بھی کبھی نہیں کیا،

شاہ عالم بادشاہ دہلی کے پندرھویں سنہ جلوس میں اودھ کی مسند وزارت پر ۱۱۸۷ھ میں متمکن ہوا اور ۱۲۱۲ھ بعارضۂ استسقا انتقال کیا اس چھبیس ۲۶ سال کے طویل عہد وزارت میں اُس نے کیا کیا حرکتیں کیں، کن کن خباثت میں مبتلا رہا، عیش و عشرت کی بدمستیوں میں ملک کی دولت کس بدتمیزی سے اڑائی، ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ان سے بحث کرنا موضوع زیر بحث سے علٰحدہ ہے لیکن یہ جستجو ہمارے لیے ضروری ہے کہ سرزمین اجودھیا میں جہاں اسکے باپ شجاع الدولہ کے زمانہ میں بھی کوئی شاعر پیدا نہ ہوا تھا اس میں یہ اہلیت کیونکر پیدا ہو گئی؟

دہلی و نواح دہلی کے شعراء میں سب سے پہلے اشرف علی خاں نے ہجرت اختیار کی اور ۱۱۶۵ھ میں اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشدآباد گئے وہاں سے لوٹے تو فیض آباد آئے (شجاع الدولہ کا زمانہ تھا) اور پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں ۱۱۸۶ھ میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے

ایک سال قبل انتقال کیا، ان کے بعد ضیاء الدین ضیا کا شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد جانا پایا جاتا ہے لیکن یہاں انکی کس مپرسی کا حال اس سے ظاہر ہے کہ وہ فیض آباد میں نہ ٹکے نہ لکھنؤ میں بلکہ عظیم آباد جاکر شتاب رائے کے بیٹے کا دامن پکڑا اور وہیں انکا انتقال ہوا، ضیاء کی ولادت و وفات کی کوئی تاریخ تذکروں میں درج نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ میر ضیا سودا کے ہمعصر تھے میر حسن کے استاد سودا کا سنہ ولادت ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے اگر میر ضیا کا سنہ ولادت زیادہ سے زیادہ ۱۱۳۰ھ قرار دیا جائے اور ۱۱۸۰ھ میں فیض آباد آنا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آصف الدولہ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔

میر ضیا کے بعد میر حسن فیض آباد گئے اور لکھنؤ بھی آکر رہے لیکن شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی کوئی توجہ حاصل نہ کرسکے کیونکہ انکا تعلق اگر رہا بھی تو لکھنؤ میں نواب سالار جنگ یا ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں سے اور وہ بھی اسد رجہ تنگی و عسرت کیساتھ کہ وہ خود لکھتے ہیں

"تاحال بہر نوع گزراں می نمائیم"

اس لیے ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کو ان تینوں شاعروں میں سے کسی کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جب وہ تخت نشین ہوا تو بیشک سودا، میر، سوز، مصحفی، انشاء بھی لکھنؤ پہونچے لیکن اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ سودا کا رنگ ہے نہ میر کا نہ مصحفی کا اتباع ہے نہ انشاء کا، البتہ سوز کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں سو ان کو بھی ہم سوز کا فیض صحبت اسلیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ استادی شاگردی رہی کتنے دن !

سوز کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا لیکن تاریخ وفات ۱۲۱۳ھ پر سب کا اتفاق ہے بعض نے عمرہ ۷ اور ۸ کے درمیان بتائی ہے بعض نے ۹۰ سال، بہرحال یہ یقینی ہے کہ تقریباً ۸۰ سال کی عمر انھوں نے پائی تھی اور اسی لیے ۱۱۳۳ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے سوز اول لکھنؤ کب پہونچے اسکی بھی صحیح تاریخ متعین نہیں ہوسکتی آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے آزاد نے غالباً میرزا علی لطف کے تذکرہ کو دیکھ کر لکھا ہے لیکن لطف کے بیان سے یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ وہ اسی سال لکھنؤ گئے البتہ لباس فقر اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے بظاہر یہ توضیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سال دہلی سے روانہ ہوئے اور سب سے پہلے فرخ آباد مہربان خاں رند کے پاس گئے لیکن فرخ آباد سے لکھنؤ و مرشد آباد کب گئے اس کا پتہ کچھ نہیں چلتا بعض تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آئے تو آصف الدولہ شاگرد ہوئے اور چند ماہ کے بعد انتقال کرگئے بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ آباد چھوڑ کر یہ لکھنؤ آئے اور جب انکا رنگ یہاں نہ جما تو مرشد آباد چلے گئے اور وہاں سے پھر ۱۲۱۲ھ میں واپس آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اسی وقت اختیار کرلی تھی جب وہ فرخ آباد سے پہلی مرتبہ لکھنؤ پہونچے تھے تو اس کا یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر نواب ان کا شاگرد ہوجاتا تو یہ بددل ہوکر مرشد آباد کیوں چلے جاتے،

میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند میں جو اس عہد کا نہایت مستند تذکرہ ہے نہ سوز کے تذکرہ میں آصف الدولہ کے استاد

ہونے کا ذکر کیا ہے نہ آصف الدولہ کے بیان میں سوز کے شاگرد ہونے کا۔ انھوں نے سوز کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ شاہ عالم کے اٹھارویں سنہ جلوس میں لباس فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں توکل و قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آکر انتقال کیا۔ اسی طرح تذکرہ بزم سخن (عوض علیخاں) میں بھی آصف کی شاگردی کا ذکر نہیں پایا جاتا

الغرض مجھے اسکے ماننے میں تامل ہے کہ آصف الدولہ سوز کے شاگرد تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آصف الدولہ ان کے کلام کو پسند کرتا تھا اور انکی شاگردی اختیار کرنے سے قبل اسکا انتقال ہوگیا۔ یا یہ کہ اگر شاگردی کا سلسلہ رہا بھی تو صرف چند دن جو نہ ہونے کے برابر ہے یہ درست ہے کہ اسکا کلام سوز کے رنگ کا ہے اور ممکن ہے اس بنا پر کوئی شخص یہ کہے کہ آصف الدولہ کا سارا کلام سوز ہی کا کلام ہے اور اسی لیے اب سوز کا کلام بہت کم نظر آتا ہے لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کیونکہ سوز نے جب کہا ہمیشہ سہل زمینوں میں اور مشکل ردیف و قوافی اختیار ہی نہیں کیے۔ برخلاف اسکے آصف الدولہ کے یہاں ایسی ایسی مشکل زمینیں نظر آتی ہیں کہ شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں نظر آئیں۔ اور میرے نزدیک یہ اثر تھا مصحفی اور انشا کی صحبت کا۔

بہرحال آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت پاکیزہ ذوق سخن لے کر آیا تھا اور اس میں سوز یا کسی اور کی صحبت کو دخل نہ تھا۔

آصف الدولہ کی ماں تاریخ اودھ کی وہ مشہور خاتون ہے جسے بہو بیگم کے نام سے آج لکھنؤ کا ہر ذی شعور جانتا ہے۔ بہو بیگم سسرال کا لقب تھا ورنہ انکا نام امۃ الزہرا بیگم تھا اور مؤتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ مؤتمن الدولہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں میر آتش کی خدمت پر مامور تھے اور بادشاہ نے ان کی لڑکی امۃ الزہرا بیگم کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ کو بیاہ دیا تھا امۃ الزہرا بیگم کا نشو و نما محمد شاہ کے اس دور میں ہوا تھا جب ہاں کے ذرہ ذرہ سے رنگینی و شاعری ابلتی تھی اسلیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس ماحول سے متاثر نہ ہوئی ہوں اور ان کے بیٹے آصف الدولہ میں یہ اثر منتقل نہ ہوا ہو

آصف الدولہ کی شاعری کی عمر کیا تھی یا یہ کہ کس عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اسکے متعلق تاریخیں اور تذکرے ساکت ہیں لیکن کلام کی کثرت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ شوق انھیں عنفوان شباب ہی سے شروع ہو گیا ہوگا

اُن کا جو قلمی کلیات میری نظر سے گزرا ہے بڑی تقطیع کے سیکڑوں صفحات کو محیط ہے اور تمام اصناف سخن اس میں پائے جاتے ہیں سب سے پہلے تقریباً ایک ہزار سے زیادہ اشعار کی مثنوی، حمد اور نعت و منقبت میں ہے، اس کے بعد چوبیس پچیس غزلیں فارسی کی ہیں اور مختلف اساتذہ فارسی و اردو کی غزلوں پر تضمینیں۔ جن شعراء کی غزلوں کی تضمین کی ہے ان میں خاص خاص یہ ہیں میلی، سعدی، نظیری، حافظ، سودا، سوز، احسن، مہر، جرأت، درد، مصحفی، ضیاء، اور سوزاں[1]۔

[1] تخلص تھا نواب احمد علی خاں شوکت جنگ کا جو نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں کا بیٹا اور نواب سالار جنگ کا بھتیجا تھا

اس کے بعد ایک نظم مسلسل "مثنوی حضور" کے نام سے ۲۶ اشعار کی ہے جس میں کسی لشکر کا حال بیان کیا گیا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے

آصف اک جی میں آئی ہے یہ چہل
لکھیے لشکر کا حال جزو اور کل

ایک مثنوی مرزا وزیر علی خاں بہادر کی شادی پر ہے جس کو انھوں نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور دوسری مختصر مثنوی وزیر باغ کی تعریف میں ہے۔ ایک حصہ ہزل و ہجو کا بھی ہے جس میں میر بججو، امیر مہتوا اور کریلا بھانڈ کا خاکہ ایسے فحش الفاظ میں اڑایا گیا ہے کہ ان کو کوئی سنجیدہ شخص پڑھ نہیں سکتا۔

کریلا کی ہجو کے چند اشعار جو بہت سنجیدہ ہیں نمونتاً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

نقل طرفہ ہے اک کریلا کی — آئی بے اختیار جس پہ ہنسی
پاک ساون کی رات اندھیاری — جا پڑا اپنی ماں پہ یکبارگی
ٹانگیں لیں اس چڑیل کی جو اٹھا — بولی وہ تجھ کو خیر ہے بیٹا
تب وہ ماں کا فلانا یوں بولا — میں جو تیری ازار کو کھولا

نہ بگڑ مجھ سے میں سنورتا ہوں
باپ اپنے کی نقل کرتا ہوں

خیر یہ ہزل و ہجو تو کوئی ایسی چیز نہیں جس پر حیرت کی جائے کیونکہ آصف الدولہ کی عمر ہی اس قسم کی بیہودگیوں میں صرف ہوئی لیکن تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب اس کے بعد غزلیات کا حصہ سامنے آتا ہے کہ شروع سے لیکر آخر تک سلاست و روانی کے سوا اور کچھ ہی نہیں۔

فارسی غزلیں کم ہیں لیکن جس رنگ کی ہیں اس کا حال ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا۔

پیوستہ کسے کہ کامران است — آں آصفِ خسروِ زمان ست
دل بُردن و باز رو نداون — ایں رسمِ کدام دلستان ست

تاثیرِ آہ بالبِ افغاں رسید و ماند — دستِ جنوں بچاک گریباں رسید و ماند

تضمینوں کے لیے جن اساتذہ اور ان کی جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے اس سے تو خیر آصف الدولہ کی پاکیزگیِ ذوق ظاہر ہوتی ہی ہے لیکن تضمینیں جس خوبصورتی سے کی ہیں ان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

تیلی کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔

بتیرا چاہا دل سے بھلاؤں ٹک نہ سکی یاد　　جوں جوں خیال کم کیا الفت ہوئی زیاد
جوں راہ میں دکھا اسے کرکے دل کو شاد　　گفتم بیا بوعدہ وفا کن جواب داد
خوش بر فریب وعدۂ ما دل نہادۂ

سعدی کے ایک شعر فارسی کی تضمین دیکھیے:-

صد چشم بر زخم خود کشودیم　　بر پائے تو روئے عجز سودیم
بیجا نہ چنیں وفا نمودیم　　آخر من و تو نہ دوست بودیم
عہد تو شکست و من ہمانم

حافظ کی غزل پر تضمین کی ہے، اس کے ایک شعر پر فارسی کے مصرعے ملاحظہ ہوں:-

اگرچہ پیش تو مجنون بیخود و رندم　　مزن بغفلت من طعنہ ناسزا ہیم
خوشم ز بیخودی خویشتن کہ ابلہم　　سحر کرشمۂ وصلش بخواب می دیدم
زہے مراتب خوابیکہ بہ ز بیداریست

حافظ کی ایک اور غزل پر تضمین کی ہے ایک شعر کے مصرعے ملاحظہ ہوں:-

چہ گویم از من احوال خاک گردیدن　　سراز جفائے تو اے جان من نہ پیچیدن
تعجب ست زمن سرگزشت پرسیدن　　زنقش چہرۂ عاشق ہمی توان دیدن
کہ ساکنان در دوست خاکسار انند

سوز کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے،

مرا جان جاتا ہے سنبھالو!　　کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو!

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے　　اسے جان کندن سے چلکر بچالو

آصف الدولہ نے پوری غزل تضمین کی ہے لیکن تذکرۂ بالا دو شعروں پر جو گرہیں لگائی ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں

ارے مجھ سے اور دوستی کرنے والو　　کسی سے مرے درد دل کی دوا لو
کسی طرح اب کی مجھے تم بچالو　　مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو
کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو

کہو کوئی جی تم پہ صدقو کرے ہے　　کہو کوئی تمھارا ہی دم بس بھرے ہے
کہو کوئی منہ نے پاؤں کو دھرے ہے　　کہو ایک بندہ تمھارا مرے ہے
اسے جان کندن سے چلکے بچا لو

تضمین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل شعر کے ساتھ مل کر بالکل ایک چیز ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آصف الدولہ اس میں کتنا کامیاب ہوا ہے سادگی و بے تکلفی، روانی و بیساختگی آصف کے ہر کلام میں نظر آتی ہے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں،۔

جب کوئی کسی کو یار کلپا وے گا　　یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دور مکافات میں سن اے غافل　　بیداد کرے گا آج کل پاوے گا

کیا تجھ سے کہوں کہ کس طرح گزرے ہے　　کیا دوں میں پتہ کہ جس طرح گزرے ہے
الغرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل　　گزرے ہے خیر جس طرح گزرے ہے

آصف جو گلی صنم کی ہم آتے ہیں　　ظلم و ستم و جور اور آفاتیں ہیں
ہر شب یہی عہد ہے کہ جانا چھوڑیں　　پر تخلی یہ کر روز پھر جاتے ہیں

یوں جی میں تمھارے ہے سمائی تو خیر　　ہم جانتے ہیں آپ ہی یہاں کیجیے سیر
خلقت ساری پڑی پھرے ہے میں ہی جاؤں　　اللہ رے تیرا بغض! اللہ رے بیر

فرقت کا ستم تو مجھ سے سہنا معلوم　　جو گزرے ہے دل پہ تجھ سے کہنا معلوم
وابستہ ہے تجھ سے زندگانی اپنی　　گر تو ہی چلا تو جی کا رہنا معلوم

ہر روز شب ہجر کا وسواس رہے　　ہر رات کو روز ہجر کا پاس رہے
یہ بے چینی تو اپنی جاتی ہے ابھی　　آصف کہنے سے نہ جائے تو پاس رہے

ذیل کی دو رباعیاں کس قیامت کی لکھ گیا ہے:-

ہر لحظہ تری گلی میں رہ جاتا ہوں — صبر و دل و دین و ہوش کھو جاتا ہوں
دیکھوں ہوں ادھر ادھر کہ جب کوئی نہیں — چپکے سے کہیں بیٹھ کے رو جاتا ہوں

آصف مرا عشق جوں جوں مشہور ہوا — توں توں بت مغرور وہ مغرور ہوا
میں کاہے کو چاہتا تھا رسوا ہونا — پر کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا

آپ نے دیکھا کہ رباعیوں میں کتنا پختہ رنگ تغزل رچا ہوا ہے اور زبان کی خامی بعض بعض جگہ کتنا لطف دکھاتی ہے اگر انہیں اشعار کو اٹھا کر آپ اسکی غزلوں میں شامل کر دیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہوگا

جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا، آصف کی زبان نہایت سلیس، انداز بیان حد درجہ سادہ، جذبات ہلکے قسم کے عاشقانہ ہیں اور اس کا رنگ شاعری "گفتگو کرنے" کی حد سے آگے نہیں بڑھتا اور ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے کلام میں دقت مضامین یا بلندی مفہوم ڈھونڈھنا بیکار ہے لیکن ردیف و قوافی کے سلسلہ میں اس نے اپنی دشوار پسند طبیعت کے سارے حوصلے نکال لیے چنانچہ بعض ردیف و قوافی ملاحظہ ہوں

جواب تلخ، حساب تلخ، لیکن شعر میں وہی سادگی ہے:-

کم ہووے یا الٰہی کہیں یہ مرض ہے — لگتا ہے اب تو نالۂ دل بحساب تلخ

صنم باقسمت، حجم باقسمت، اس زمین کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

کوچہ گردی سے اسے شوق ہے لیکن گاہے — اس طرف کو نہیں رکھتا وہ قدم باقسمت

گفتگو آتش کا پرکالہ، روبرو آتش کا پرکالہ، اس سخت و سنگین زمین میں کاوش دیکھیے:-

عجب شوخی، عجب گرمی عجائب حسن ہے واللہ — نہ آتش تو، نہ شعلہ تو، نہ تو آتش کا پرکالہ

بادام لذیذ، ناکام لذیذ، اس زمین کا ایک شعر ہے:-

دوستو عشق میں کچھ چیز نہیں بھاتی ہے — ورنہ کس کو نہ لگے خواب اور آرام لذیذ

اسی ردیف میں بحر و قافیہ بدل کر لکھتے ہیں:-

جو غمزدہ ہو ترے عشق کا وہی جانے — کہ کیا مزہ کی ہے غم کی بھی داستانِ لذیذ

اسی طرح کی سنگلاخ زمینیں خدا جانے کتنی اس نے پیدا کیں اور کسی ایک میں بھی اپنا رنگ نہیں چھوڑا غزلوں کا حصہ کئی سو صفحات پر حاوی ہے اور مشکل سے کسی غزل میں دو چار شعر ایسے ہونگے جو انتخاب میں نہ آسکیں

یقیناً آصف کے کلام میں درد کے جذبات کی گہرائی یا میر کے سوز و گداز کی برجستگی نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ معاملاتِ محبت اور واردات الفت سے وہ کسی جگہ نہیں ہٹا۔ وہی سہل و سرسری اظہار الفت وہی سادہ بیان ہجراں اور وہی تمام باتیں جو عام طور پر دنیائے محبت میں شکر و شکوہ کے طور پر بیان کی جاتی ہیں آصف کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

محبوب کے سامنے حرف مدعا لب تک نہ آسکنے کا ذکر تمام شعرا نے کیا ہے چنانچہ میر کا یہ شعر مشہور ہے

کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا ——— کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا

آصف نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

سب مجھی سے کہتے ہیں تو اس سے مطلب عرض کر ——— جب زباں یاری نہ دے تو عرض مطلب کیا کروں

اس غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:-

جان و دل تیار کر رکھوں نثار اس کا دلے ——— بے خبر آصف وہ آجاوے ادھر جب کیا کروں

کس قدر لطیف جذبہ ہے اور کتنے پُر لطف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے،

غیر کے ساتھ محبوب کو دیکھنا عاشق کے لیے ستم ہے لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسکو دیکھے نہیں آصف اس کشمکش کو یوں ظاہر کرتے ہیں

جو دیکھوں غیر سے باہم تو غیرت مارے ڈالے ہے ——— اگر آنکھیں چُراتا ہوں تو الفت مارے ڈالے ہے

اس غزل کے مقطع میں شدائد محبت سے گھبرا کر بیتاب ہو جانے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

کہاں کی یہ بلا پیچھے پڑی یارب کہاں جاؤں ——— مجھے تو رات دن یارو! محبت مارے ڈالے ہے

ہجر کی تنہائی بہت کٹھن ہوتی ہے لیکن جب محبوب آکر چلا جائے تو یہ تنہائی سے بھی زیادہ کچھ اور چیز ہو جاتی ہے، اور اس خلا کو محسوس کر کے جو بیتابی پیدا ہوتی ہے اسکی تکلیف کی کوئی انتہا نہیں، آصف اس کیفیت کو کس قدر سادہ لیکن دلدوز انداز میں ظاہر کرتا ہے۔

کیا حقیقت پوچھتا ہے میری تنہائی کی تو ——— جب کہ میرے پاس سے پیارے ترا جانا ہوا

محبت کی دلدادگیاں جن میں کچھ کچھ تمنا بھی شامل ہو قیامت کی ہوتی ہیں اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

کوچے سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اُٹھایا ——— سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا

کیسا رو رو کے وہ شب کرتا تھا مذکور ترا ——— وہی بیمار ترا خستہ و رنجور ترا

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا ——— نہ سُنا تم نے ماجرا دل کا

یہی حسرت ہمیں اے جان رہی مرگ تلک　　ایک دن تم نے نہ کی ہنس کے کبھی پیار کی بات

معشوق کی اداؤں کا ذکر ہلکی سی کیفیت محاکات کے ساتھ، تغزل کی جان ہے، آصف کے یہاں اس کی بھی بعض مثالیں بہت پاکیزہ ملتی ہیں۔

میں پوچھا اس سے کچھ تجھ میں دغا ہے　　تو مڑ کر، دیکھ کر، ہنس کر کہا "ہے"

مرے احوال کو سن سن کے یہ بولا آخر　　خوش نہیں آتی ہے آصف مجھے تکرار کی بات

تشبیہ و استعارہ سے ان کا کلام پاک ہے لیکن اگر کبھی کوئی شعر ایسا نکل گیا ہے تو بھی لطف سے خالی نہیں مثلاً ؎

عجب عالم نظر آتا ہے معشوقوں کے رونے میں　　ذرا دیکھو تو آصف شمع کے آنسو ڈھلکنے کو

فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں کہیں نہیں پائی جاتیں اگر کبھی کوئی ترکیب استعمال بھی کی ہے تو نہایت ہی ٹھیک و صاف مثلاً ؎

ہوا ہے جب سے تو اوجھل ہماری نظروں سے　　بسانِ خانۂ غارت زدہ سدا ہیں باز

چونکہ سادگی ان کے ذوق کی خصوصیت ہے اس لیے چھوٹی بحروں میں ان کی کامیابی عجیب ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہائے کیا آصف کو وہ دُکھ دے گیا　　لے گیا دل لے گیا دل لے گیا

کھُل گیا باراں برس کر لاکھ بار　　پر یہ اشکِ چشم نت برسے گیا

اب کوئی لمحہ میں آتا ہے وہ یار　　دل سے سارا دن یہی کہتے گیا

مومن کی غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" دُنیائے تغزل کی نہایت ہی مشہور و مقبول چیز ہے اور اس میں کلام نہیں کہ مشکل ہی سے دو چار چیزیں کلام اساتذہ میں ایسی نظر آئیں گی، آصف الدولہ نے بھی اسی بحر میں لیکن بہ تبدیل ردیف و قافیہ ایک غزل لکھی ہے اسے بھی دیکھ لیجئے

مرے یار کیسی ادا ہے یہ، کہ چمن میں جس گھڑی آ گئے　　کبھی گل کو آکے ہنسا گئے، کبھی بلبلوں کو رُلا گئے

مرے آگے سے جو گزر گئے، تو پلک سے لاگی نہ پھر پلک　　وہ جو ضبط کر کے رہا تھا میں، مرے اشک آکے بہا گئے

جو گزرتی ہی مجھے رات دن، ترے اشتیاق وصال میں　　سو کہوں گا حالتِ ہجر سب، کبھی روبرو جو تم آ گئے

نہ وصال ہی میں قرار تھا، نہ فراق ہی میں قرار ہے　　وہ وصال کیسا دکھا گئے، یہ فراق کیسا لگا گئے

یہ جو کہتے ہو کہ بتا سبب، ترے لگتے کیوں نہیں لب سے لب　　اُسی روز سے مجھے بڑ گئی، جو تم اپنی باتیں سنا گئے

یہ پیام دیجیو قاصدا، کہ خرابی اور تو کیا کہوں　　وہ جو جائے امن تھا ایک دل، غم و درد اس میں بسا گئے

مجھے آصف آہ یہ کیا ہوا کہ مدام نالہ و آہ ہے　　میاں یہ فسانۂ عشق ہے ترا بھید ہم بھی تو پا گئے

آپ دیکھیں گے کہ کلام آصف میں بہت سے وہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس وقت متروک ہیں مثلاً کنے (بمعنی قریب) تئیں، کوئی، دکئی، مباں، تلک، جیدھر، ادھر، وغیرہ لیکن اس نوع کے الفاظ اس عہد کے تمام شعراء میں پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ میر، درد، سودا اور سوز سب نے انھیں استعمال کیا ہے

آخیر میں ان کے چند منتخب اشعار درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں لیکن میرا یہ انتخاب کسی مکمل استقصا کا نتیجہ نہیں ہے اس لیے یہ سمجھ لینا درست نہ ہوگا کہ آصف کے کلیات میں اتنے ہی شعر کام کے ہیں حالانکہ اگر صرف اتنے ہوں تو بھی بہت ہیں اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں ہیں جو اصل مضمون میں آگئے ہیں

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں　　　آشنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دور ترا

قصۂ فرہاد و مجنوں رات دن پڑھتے تھے ہم　　　سو تو وہ ماضی پڑا، اب اپنا افسانہ ہوا
رات دن یہ سوچ رہتا ہے مرے دل کے تئیں　　　اے خدا یاں سے وہ جا کر کس کا ہمخانہ ہوا

قاصد تو لیے جاتا ہے پیغام ہمارا　　　پر ڈرتے ڈرتے لیجیو واں نام ہمارا
آغاز نے تو عشق کے یہ حال دکھایا　　　اب دیکھیو کیسا ہو دے گا انجام ہمارا

نامہ ترا میں لے کر منھ دیکھ رہ گیا تھا　　　کیا جانیے کہ قاصد کیا مجھ کو کہہ گیا تھا
کوچہ سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اٹھایا　　　سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا
کچھ بھی نہ سوجتا تھا اس دن مجھے تو آصف　　　جس روز اپنے یاں سے وہ رشک مہ گیا تھا

اس ادا سے مجھے سلام کیا　　　ایک ہی آن میں غلام کیا
یارو اس گلبدن کے تئیں ہم نے　　　کل صبا سے بھی کچھ پیام کیا
قصۂ جاں گداز اے آصف　　　تھوڑی سی بات میں تمام کیا

دردِ دل ہے قرار کے باعث / غم ہے تو اس نگار کے باعث
اک کروٹ سے سو نہیں سکتا / اس دلِ بیقرار کے باعث
چھاتی بادِ صبا نے کیا کیا خاک / میری مشتِ غبار کے باعث
دم رکا جائے ہے مرا آصف / گریۂ بے شمار کے باعث

رو رہا ہے جیسے یہ دلِ زار و نزار آج / ایسا تو روتے دیکھا نہ ابرِ بہار آج
آصف کو منہ لگایا ہے آج اُس نے ظاہرا / جاتا ہے دوڑ دوڑ جو واں بار بار آج

دردِ دل اپنا میں اس شوخ سے کہتا لیکن / جو چھپانے میں مزہ ہے نہیں اظہار کے بیچ
گر یہی نالے ہیں اے دل تو تری شورش سے / بیٹھنے پاویں گے نہ ہم کوچۂ دلدار کے بیچ

کوئی بات تو ہماری بھی مان اب خدا سے ڈر / کب تک دیا کرے گا ہمیں تو جواب تلخ
پھرتا ہوں کوہ و دشت میں روتا میں زار زار / تجھ بن ہوا ہے تم مجھے خانہ خراب تلخ
آصف کو عشق ہے وہ نہ مانے گا ایک بات / کیوں اس سے زیست کرتے ہو اے شیخ و شاب تلخ

بڑا چرچا پڑے گا اُس کا آصف / ہر اک بیدرد کو تو مت سُنا درد

ہم نہ سمجھتے تھے یار آصف شوریدہ بھی / عاشقوں میں اُس کے ہے عاشقِ فیروزمند

گزری جو تیرے غم میں دلِ نیم جان پر / کچھ پوچھ مت میں لا نہیں سکتا زبان پر
آصف کو جس نے عشق میں دیکھا ترے کہا / آتا ہے رحم میرے تئیں اس جوان پر

دل آصف پہ کوئی نہ رکھیو ہاتھ / جل رہا ہے وہ خاکسار ہنوز

یہ تیری بات کا کرنا لگا گئے ہاتھ پہ ہاتھ   رہے گا حشر تلک دوستی کی دستاویز

جو نالہ تھمتا ہے تو گریہ جوش کرتا ہے   غرض چھپائے سے چھپتا نہیں ہے عشق کا راز

کل تلک ہوتی تھی کچھ نبض میں گرمی محسوس   آج تو نبض ہی ہوتی نہیں اپنی محسوس
بات جو دل میں کھٹکتی تھی، ہوئی ظاہر آج   موت اس شخص کی مدت سے ہمیں تھی محسوس

نہ بیٹھو یار کوئی مجھ سے بیقرار کے پاس   کہ خوار ہے جو کوئی بیٹھے بیقرار کے پاس
کسی کے پاس نہ تو دل سے بیٹھ اے ظالم   مضائقہ نہیں یوں بیٹھ تو ہزار کے پاس
اٹھا کے پہنچا ہے کیا کیا خرابیاں تجھ تک   ذرا تو بیٹھ کبھو اپنے سوگوار کے پاس
یہ کون دوست ہے میرا جو تجھ کو منع کیا   نہ بیٹھ آصفِ غم خوار و غم گسار کے پاس

لاکھوں جفاؤ جور سہے اس کے لیک آہ   جاتی نہیں ہے دل سے مرے چاہ کیا کروں

آنا تو کیا کہ اس کا ادھر [illegible] کو گزر نہیں   اے آہ! تجھ میں اتنا بھی ظالم اثر نہیں
رکھتے ہیں دو جہان کے اسرار کی خبر   گو ہم کو اس کے عشق میں اپنی خبر نہیں
ہردم کی آہ سرد [illegible] رنج [illegible] و چشم تر   آصف یہ کیا ہے تیرے تئیں عشق اگر نہیں

ناصح ترے کہے سے نہ اس سے ملا کروں   لیکن جو دل ستائے تو پھر اس کو کیا کروں

کب تلک تیرے جدا رہنے کا غم کھاتے رہیں   کب تلک باتوں میں اپنے دل کو بہلاتے رہیں
گو برا مانے نہیں تو، اپنا اب یہ دھیان ہے   دل ترے کوچہ میں چھوڑیں اور ہم جاتے رہیں
تیرے رونے سے اب آصف لوگوں کو تکلیف ہے   بس نہ رو، کب تک بچارے کپڑے سکھلاتے رہیں

ہمنشیں پوچھے ہے کیا افسانہ میرے غم کا ہائے — غور کر ٹک دیکھ میں خود صورت افسانہ ہوں

جس سے میں اپنا حال کہا اس نے یوں کہا — تو نے تو مجھ سے حال کہا میں کہاں کہوں
مرتا ہوں اب تو جان ہی جاتی ہے دوستو! — لے آؤ اس کو جلد کوئی تو منا لاؤں

چشمِ عاشق میں یارو خواب کہاں — دلِ عاشق میں صبر و تاب کہاں
تجھ سے کیونکر کہے وہ اپنا عشق — آصفؔ اتنا وہ بے حجاب کہاں

کیا کریں کہنے میں ناصح یہ دلِ زار نہیں — ورنہ ترک اس سے تو اتنا کوئی دشوار نہیں
یوں تو دیوانہ ہوں کیا کیا نہیں بکتا رہتا — سامنے اس کے مگر طاقت گفتار نہیں

آصفؔ اس وقت میاں کچھ متردد ہے تو — آج سچ بولیو گھر میں ترے مہمان ہے کون

یہ ساری شیخیاں ہیں سن لو یارو سامنے ہو کر — کرے گر بات کوئی اس ستمگر سے تو ہم جانیں

فرہاد تھا یا مجنوں، پھر اچھا زمانہ تھا — اب لطف نہیں آصفؔ کچھ الفت خوباں میں

نہ جی چاہے تھا جسکے پاس سے اکدم سرکنے کو — سو اُسکے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر ٹپکنے کو

جاتا تو ہوں ہزار خرابی سے واں تلک — کیا جانیے وہ گھر میں بھی ہو اپنے یا نہ ہو

وہ ہوا حال سے مرے آگاہ — میرے حق میں تو کچھ نہ ہوئی واللہ
دل تو جاتا ہے اُسکے کوچہ میں — جا مری جان، جا خدا ہمراہ

عشق تم کرکے تو یہ کیا آصف ہے یہ اس کا خدا کے ہاتھ نباہ

نہ نالش کرو دل غم پنہاں کو پایاں نہیں میری داستاں کو
آصف ابھی میں نے کیا کہا تھا تک بند نہیں مری زباں کو

جی نکل جائے گا ظالم مرا اب جانے سے یاں نہ آنا ہی بھلا تھا ترے اس آنے سے

ملنے کو تجھ سے دل تو مرا بے قرار ہے تو آکے مل نہ مل یہ ترا اختیار ہے
تم زخم دل کی میرے خبر پوچھتے ہو کیا تیر نگاہ دل کے تو اب آر پار ہے
یہ پوچھو تو حال تیرے دوانے کا اب ہوا جیدھر کو جاکے آہ ادھر بار بار ہے

سمجھو ہے بولتا ہے پر نہیں ہے نہیں کچھ بولتا کیا جانے کیا ہے

کیا سبب آصف گئے جو نہیں چلا آتا وہ نہیں آج کیوں صحبت میں اسکے یار کچھ تم کم رہے

کہتے ہیں سبھی گئے گلی سے اک آصف نوحہ گر رہا ہے
جب تب اسے دیکھتا ہوں در پہ بس شام سے تا سحر رہا ہے

جان کیوں کھاتے ہو کچھ بھی جاؤ گے ناصحو اب تک مجھے سمجھاؤ گے

لینا خبر تو اس کی نہیں کا ہے نام آصف مدت سے وہ دکھی ہو تیری راہ کرے ہے
اور آخر کار آج میں نے اس کی خبر لے ہی لی گو وہ کبھی میری خبر لینے آکر نہیں رہا

نیاز

لکھنؤ کے موجودہ لکھنوی شعراء

انور حسین آرزو (عمر تقریباً ۶۰ سال)	دل یہ کھنچتے ہوئے نظر آسئے	کیوں جی پھر تم ہمارے گھر آسئے
محمد علی خاں آزاد (عمر تقریباً ۵۰ سال)	بال بھی تم نے مری لاش پہ کھولے نہ کبھی	بے اثر تھا اثر خواب پریشاں دیکھو
حکیم سید علی آشفتہ (عمر تقریباً ۴۴ سال)	پڑسے تم بو سکھنے والے سب ہو	جبھی جانتے تباہ و دل میں کیا ہے
مہدی حسن احسن (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اک جلوہ روشن ہے مری نزع کا عالم	میں شعلۂ آخر ہوں چراغ سحری کا
مرزا جعفر علی خاں اثر (عمر تقریباً ۴۰ سال)	جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں	سنگھے پھول ترے بستر کے
پیارے نواب برق (عمر تقریباً ۴۰ سال)	اب تو اکثر کوئی ماتوں کہا کرتا ہے	یہ صدا کس کی چلی آتی ہے ویرانے سے
سید حسین بیتاب (عمر تقریباً ۶۰ سال)	لینا ہے آج مشق تصور سے ایک کام	تصویر کھینچنا ہے تری جلوہ گاہ کی
نواب نبے صاحب سحر (عمر تقریباً ۴۴ سال)	نہ سنو میری داستان طویل	کہ یہ حسرت بھرا فسانہ ہے
سراج الحسن سراج (عمر تقریباً ۴۰ سال)	آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے	اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
ننھو میاں شفیق (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اے شفیق اپنے کو بھر رشک سکندر سمجھوں	آئینہ دل کا اگر اُن کی نظر تک پہونچے
ابو الفضل شمس (عمر تقریباً ۵۰ سال)	بروز حشر شہید دل کو سب نے بڑا دعویٰ	مزہ تو ہو جو نہ ثابت ہو جرم قاتل پر
علی نقی صفی (عمر تقریباً ۸۰ سال)	دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بہت دور نہیں	گر اس پر بھی ملاقات منظور نہیں
الطاف حسین عالم (عمر تقریباً ۵۲ سال)	سب ہیں آمادہ طرفداری پر اسکی خبر تر	ایسا مجمع اور میرا ہم زباں کوئی نہیں
مرزا محمد ہادی عزیز (عمر تقریباً ۶۵ سال)	اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن	بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
خواجہ عبدالرؤف عشرت (عمر تقریباً ۷۰ سال)	پانی پانی ہوئے غیرت سے پریرو غنچے	بے بلائے ہوئے شبنم جو چمن میں آئی
حکیم منتے آغا فاضل (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اُن کی ہنسی پہ آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے	اب دل خوشی کا بھی متحمل نہیں رہا
قدیر احمد قدیر (عمر تقریباً ۴۴ سال)	اب سر نہیں اُٹھنے کا سنگ در جاناں سے	میرا یہی قبلہ ہے میرا یہی کعبہ ہے
چھبن صاحب گوہر (عمر تقریباً ۴۰ سال)	کوئی پوچھے مرنیوالا کون تھا کیا نام تھا	یہ نہ کہہ دینا کہ میرا عاشق ناکام تھا
کاظم حسین محشر (عمر تقریباً ۷۰ سال)	اے چارہ ساز اتنی ہی مدت ہے زیست کی	جب تک کہ درد عشق ہمارے جگر میں ہے
جعفر حسین منظر (عمر تقریباً ۴۴ سال)	حسب منشا دل پرشوق کی باتوں کا جواب	دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

لکھنؤ کے موجودہ غیر لکھنوی شعراء

عبدالباری آسی میرٹھی (عمر تقریباً ۴۵ سال)
اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشاں ہوں میں

حامد اللہ افسر میرٹھی (عمر تقریباً ۴۴ سال)
رو رو کے انتظار کی گھڑیاں گزار دیں
یہ بھی خطا ہوئی ترے امیدوار سے

محمد حسین افقر موہانی (عمر تقریباً ۴۴ سال)
بہار آنے سے پہلے اک پریشاں خواب دیکھا تھا
کہ جیسے چھُٹ رہا ہے فصلِ گُل میں آشیاں ہم سے

محمد علی امید امیٹھوی (عمر تقریباً ۴۶ سال)
چار دن کی تھی زندگی لیکن
یہ بھی اُن کی خوشی نہیں، نہ سہی

محمد امین امین سلونوی (عمر تقریباً ۴۲ سال)
آپ عیسیٰ نفس سہی لیکن
میرے جینے کا کیا سہارا ہے

محمد احمد بیخود موہانی (عمر تقریباً ۴۴ سال)
تری غیرت کو اے نازِ ستمگر کیا ہوا آخر!
ترے ہوتے ہوئے ممنونِ جورِ آسماں ہوں میں

علی سکندر جگر مرادآبادی (عمر تقریباً ۴۴ سال)
الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں اُنھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

آل رضا رضا نیوتنوی (عمر تقریباً ۴۲ سال)
چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں
یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے

محمد زماں زماں الہ آبادی (عمر تقریباً ۴۵ سال)
اے غمِ دوست یہ تو سمجھا دے
کتنا اندوہناک ہوتا ہے

شمس الحسن شمس فرخ آبادی (عمر تقریباً ۴۲ سال)
یوں یکایک نظر اُٹھی اُن کی
ہم نے جانا کہ کامیاب ہوئے

محمد عمر شوکت تھانوی (عمر تقریباً ۳۲ سال)
موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ ہجر
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اِک ارماں نکلا

نواب حسین علی خاں طاہر فرخ آبادی (عمر تقریباً ۶۰ سال)
اُس کا ہر جلوہ حجابِ ناز سے کچھ کم نہیں
پردہ گرتا جائے ہے جتنا کہ اُٹھتا جائے ہے

مقبول عظیم عرش میرٹھی (عمر تقریباً ۴۵ سال)
اُن کے ہی ہو جائیں گے سب اُن کی صورت دیکھ کر
کون میرا ہم خیال و ہم زباں رہ جائے گا

محمد حسین عرشی کلیم پوری (عمر تقریباً ۴۴ سال)
کیوں سہارا دے رہی ہے موجِ دریا تو مجھے
لطفِ ساحل سے سوا نظّارۂ ساحل میں ہے

واجد علی فرخ بنارسی (عمر تقریباً ۴۲ سال)
وہ آئے بھی تو دید کا موقع کہاں نصیب
ہم سے تو اپنے ہوش میں آیا نہ جائے گا

ظفر مہدی گوہر جائسی (عمر تقریباً ۴۲ سال)
لے وہ تمہارا ایک لفظ موتِ دلِ حزیں سہی
کچھ تو کہو جواب میں ہاں نہ سہی نہیں سہی

محمد حسین نازش بدایونی (عمر تقریباً ۴۰ سال)
ہوں جادۂ ناکامیٔ اُلفت میں سبک گام
شاید کبھی اس راہ سے امید گزر جائے

نیاز محمد نیاز فتحپوری (عمر تقریباً ۴۴ سال)
گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھیے کہ دل بے بجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

مقبول حسین احمد وصل بلگرامی (عمر تقریباً ۵۰ سال)
ہائے وہ بزمِ ناز میں جلوۂ حسنِ خود نما
چہرے پر ایک تمکنت آنکھ میں کچھ غرور سا

یونس حسین یونس زید پوری (عمر تقریباً ۴۶ سال)
اب نہ کیجے گا توکل قدرِ وفا کیجے گا
یاد رکھیے کہ کہا تھا کسی سودائی نے

غزلگوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ جس نے محبت کی ہے اُسے تو خیر جاننا ہی چاہئے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے" کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہئے۔"

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے، اسی طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قایم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے۔ لیکن جس محبت کا تعلق غزلگوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، بھائی، اولاد اور اعزہ و احباب سے بھی ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ اس جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی یعنی روحانی محبت بھی ہے جسے وہ "Intellectual love" کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا تاہم اگر تھوڑی دیر کیلئے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزلگوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت پوست کی دنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں" معشوق نے کہا "میری بلا سے"۔ چلئے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں اُن تمام کیفیات و جذبات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہوسکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

جذبات محبت کا تجزیہ کیا جائے تو پہلے دو بڑی بڑی تقسیمیں وہ ہوں گی جن کا نام ہجر و وصال ہے اور پھر ان دونوں کے ماتحت جدا جدا کیفیات و تاثرات نظر آئیں گی۔ مثلاً ہجر کے بیان میں دل کی بیتابی، تمناؤں کا ہجوم، غم و الم کی فراوانی، بیچارگی و بے بسی، جنون و دیوانگی، حیرانی و مجبوری، بیماری، نزع اور موت سبھی کچھ شامل ہے۔ اسی طرح وصل میں، کامرانی و سرمستی، نشاط و ازخود رفتگی، شکر وصل و شکوۂ ہجراں، عدو کی بُرائی، اپنی تعریف، اور پھر فراق کے اندیشہ سے آیندہ کے لئے پیش بندیاں وغیرہ سیکڑوں باتیں شامل ہیں۔ لیکن یہ درست ہے کہ وصل کا میدان اتنا زیادہ وسیع نہیں ہے اور اسی لئے غزل گوئی کی وسعتیں زیادہ تر ہجر و فراق کی دنیا سے متعلق ہوا کرتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور موضوع محبوب کے حسن و جمال کی تعریف بھی ہے جسے آپ چارہ و تدبیر کے سلسلہ میں شمار کر سکتے ہیں یا پھر انھیں ہجر و وصال کی مختلف کیفیات میں کسی کیفیت سے بہرحال غزل کا دائرہ دنیائے شاعری میں ایک لحاظ سے بہت محدود ہے اور دوسری حیثیت سے حد درجہ وسیع۔ وہ اسلئے کہ شاعر محبت جنسی کے داعیات سے علحدہ ہو کر کوئی اور میدان اختیار نہیں کر سکتا اور یہ اس لئے کہ اس محبت کی کیفیات گو محدود ہوں، لیکن اُنکے اظہار کے طریقے غیر محدود ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ جنھوں نے "عشق حقیقی" کی مہمل اصطلاح وضع کی ہے یا جو شاعری میں تصوف کو شامل کرکے صنم اور صمد کا امتیاز اُٹھا ڈالنے پر مصر ہیں، انھیں مجھ سے اختلاف ہو، لیکن میری حقیقی رائے یہی ہے کہ "حقیقی عشق" بالکل بے معنی چیز ہے اور غزل گوئی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ تغزل میں اصل چیز صرف جذبات نگاری ہے اور ان کے مقابلہ میں الفاظ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کیونکہ جذبات و تاثرات کے اظہار کا ذریعہ صرف الفاظ ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ الفاظ کے تغیر و تبدل یا اُن کے حُسن و قبح کا کوئی اثر مفہوم و مدعا پر نہ پڑے۔ اندازِ بیان ہی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ کی مخصوص ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ علاوہ اس کے جذبات کی بلندی و سخافت سب الفاظ و اندازِ بیان پر منحصر ہے۔

مثلاً خواہش وصل کے مسئلہ کو لیجئے جو دنیائے شاعری کا نہایت پیش پا افتادہ مسئلہ ہے، اور مختلف شعراء کے مختلف اندازِ بیان پر غور کیجئے:۔

ایک کہتا ہے:۔ اتنا بھی منھ چھپانا کچھ خوشنما نہیں ہے

دوسرا کہتا ہے:۔ آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب

بلکہ اس سے بھی زیادہ کھُلم کھُلا یوں کہہ اُٹھتا ہے:۔ دو بوسے لونگا جانِ من ایک اِس طرف ایک اُس طرف

اگر یہ فرق مراتب انداز بیان سے پیدا نہیں ہوا تو پھر کس چیز کا کرشمہ ہے۔

انقلاب زمانہ اور بے ثباتی عالم کا بیان تقریباً تمام شعراء نے کیا ہے لیکن انداز بیان کے تفاوت سے اثر و مفہوم کے ارتقاء کا فرق ملاحظہ کیجئے۔

مصحفی کہتا ہے :-

کیسی اب اُنکی دھوپ میں جلتی ہیں تربتیں	سایہ میں یاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ

حاتم کا پاکیزہ انداز ملاحظہ ہو :-

ہمیں پوچھو تو ہستی اور عدم میں کیا تفاوت ہے	جو آیا اور کوئی بزم میں ہم ٹک سرک بیٹھے

اکبر الہ آبادی کی نازک تعبیر اس سے بھی بڑھ گئی :-

دُنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق	وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

لیکن ان سب میں اک کیفیت حزن و مایوسی تو ضرور ہے لیکن کوئی درس ولولہ نہیں - حالی کہتا ہے :-

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے	کل بتادیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

دیکھا صرف انداز بیان نے بات کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا -

عاشق کی حالت ہمیشہ دردناک رہا کرتی ہے اور اس کو شعراء نے بے شمار طریقوں سے ظاہر کیا ہے مثلاً ایک کہتا ہے :-

حال بیچارہ کا بہت خراب ہے آج

دوسرا اس کے وقت آخر کی خبر اس طرح دیتا ہے :-

سحر کرنا بہت دشوار ہے بیمار ہجراں کو

ذیل کے مصرعہ میں ہر چند نزع و موت کسی چیز کا ذکر نہیں لیکن دردناک حالت کی تصویر بہت زیادہ مکمل طور پر پیش کی ہے :-

حال اس غمزدہ کا ہم سے تو دیکھا نہ گیا

مومن، میر اور درد نے ایک ہی مضمون کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے، لیکن انداز بیان کا تفاوت ملاحظہ ہو :-

مومن کہتا ہے :-

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ	تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مدعا یہ ہے کہ جو دردناک حالت میری ہے وہ سب تمہارے ہی حسن فتنہ پرور کا کرشمہ ہے اس لئے اسے نہ دیکھو ورنہ ممکن ہے تمہیں نظر لگ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت لطیف بات کہی ہے، لیکن المناکی کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

میر کہتے ہیں :-

میرے تغیر حال کو مت دیکھ	انقلابات ہیں زمانے کے

دوسرے مصرعہ سے شاعر نے ایسے بلیغ انداز میں اپنی عبرتناک حالت پیش کی ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی، تاہم ایک کمی پائی جاتی تھی، وہ یہ کہ اس تغیرِ حال کا کوئی تعلق محبوب سے ظاہر نہ ہوتا تھا اور اسی لئے تغزل سے شعر ہٹ گیا تھا۔ درد نے اس سقم کو بھی دور کر کے شعر کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا:-

میرے تغیرِ حال پر مت جا ۔۔۔ یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

لفظ مہربان کے لطیف اشارہ سے اس شعر کو جس انداز سے درد نے تغزل میں لایا گیا ہے، وہ شاعرانہ بلاغت کی آخری حد ہے۔

الغرض اس طرح کی صدہا مثالیں ہیں جن سے انداز بیان کا اثر مفہوم و معنی پر بخوبی ثابت ہو سکتا ہے۔ اور انداز بیان کا تنوع منحصر ہے صرف الفاظ و ترکیب الفاظ کے اختلافات پر۔

اس سلسلہ میں یہ امر ضرور توجہ طلب ہے کہ جب ہر شاعر اس سے واقف ہے تو کیوں باہمدگر اس قدر فرق مراتب ہے یعنی کسی شاعر کا کلام دلکش اور کسی کا بے دلچسپ کیوں ہوتا ہے حالانکہ الفاظ وہی ہیں اور ان کا مفہوم بھی پوشیدہ نہیں۔ یہی وہ بات ہے جہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص شاعر پیدا ہوا ہے اور فلاں نہیں۔

جس طرح ایک نقاش کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط کے امتزاج سے اصل منظر آپ کے سامنے لے آوے، اسی طرح ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور اسی کا نام ذوق سلیم ہے۔ پھر جس طرح ہر نقاش کامیاب نقاش نہیں ہو سکتا، اسی طرح ہر شاعر کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا کیونکہ نقش صرف موقلم کی جنبش کا نام ہے اور نہ شعر محض الفاظ کے اجتماع کا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تاثرات و جذبات میں پستی و بلندی ضرور ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے ایک شعر کے پست و بلند ہونے پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محبت کا وہ جذبہ جس پر غزل کی بنیاد قائم ہے اپنے مقصود و مدعا کے لحاظ سے گو غیر فطری نہ ہو، لیکن اس کا غیر سنجیدہ ہو جانا یقینی ہے اگر اس کے اظہار میں احتیاط نہ کی جائے اور اسی احتیاط نے تشبیہہ، استعارہ، کنایہ وغیرہ بہت سی صورتیں انداز بیان کی پیدا کر دی ہیں، ورنہ یوں اگر نہایت معمولی الفاظ میں اس کو ظاہر کر دیا جائے تو پھر غزلگوئی کا بھی وہی عالم ہو جائے جو آج کل روس میں شادی کا ہے کہ راستہ چلتے میں نے ایک عورت کو دیکھا اور کہا "کیا تم مجھ سے نکاح کرو گی"، اور اگر اس نے جواب میں کہہ دیا کہ "ہاں"، تو گویا عقد ہو گیا۔ دونہ چلئے محبت ختم، میں کھیت کاٹنے چلا گیا اور وہ کپڑا بننے۔

اول اول جب دکن میں اردو غزلگوئی کی ابتدا ہوئی تو جذبات محبت کو نہایت سادہ طور پر ظاہر کیا گیا کیونکہ اول تو اس نوزائیدہ زبان میں الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا اور دوسرے یہ کہ جس چیز کو سامنے رکھکر شاعری کی گئی وہ زیادہ تر ہندی گیت تھے جن کی سادگی آج بھی اسی حال پر قائم ہے، لیکن چونکہ فارسی کے اثرات بھی کچھ کچھ اس میں شامل ہو چلے تھے اس لئے ہندی گیتوں سے اتنا تفاوت ضرور ہو گیا کہ عشق کا

اظہار بجائے عورت کے مرد کی طرف سے مرد ہی کے لئے ہونے لگا اور بحر و وزن بھی فارسی شاعری کے اختیار کئے گئے، تاہم ہندی زبان کے اثر کی وجہ سے جذبات میں فی الجملہ سادگی بھی تھی اور مقامی رنگ بھی زیادہ جھلکتا تھا۔ چنانچہ معشوق کو سجن یا پیا کہنا، بجائے بلبل کے پپیہا کا ذکر کرنا، اور تشبیہات وغیرہ میں ملک کی وضع و معاشرت، اور ملک کی پیداوار کو سامنے رکھنا، اردو کی قدیم شاعری کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مثلاً ولی دکنی کا شعر ہے :-

اے صنم تجھ جبین اوپر خال　　　ہندوی ہر دوار باسی ہے

یا داؤد دکنی لکھتا ہے :-

رات دن ہے پکار میں داؤد　　　جیوں پپیہا پیا پیا تجھ بن

اسی کے ساتھ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ خالص ہندی الاصل استعمال کئے جاتے تھے اور فارسی ترکیب کی آمیزش سے بالکل پاک ہوتے تھے۔ چنانچہ فغاں کا ایک مصرع ہے :-

یا نور آنکھوں، بسیلے نین، البیلی ہو چال

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

پیا بن میرے تئیں بیراگ بھایا ہے جو ہونی ہو سو ہو دو　　　بھبھوت اب تن کیوں کل رنگ لاکے جو ہونی ہو سو ہو دو

یا ــــ　　　جب تے سفر دے کیا تب تے غروب آوارہ ہوں　　　یا پیکہ بی آکر پیا مجھ کو بیں بلوا سے کر

الغرض اول اول ہندی گیتوں اور اردو کی غزلوں میں جذبات کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہ تھا، سوائے اس کے کہ اوزانِ شعر بیشک فارسی کے تھے اور معشوق بھی ایرانی تھا۔ ہرچند اس بدذوقی کا اظہار انھوں نے بکثرت کیا اور بعض نے تو اپنے محبوب لڑکوں کے نام تک ظاہر کرکے اس بدنمائی کو انتہا تک پہونچا دیا، لیکن جذبات و بیان کی سادگی کے لحاظ سے قدیم شعراء کی غزلگوئی کو حقیقی تغزل میں شمار کرنا پڑے گا گو وہ تنوع مطالب و اسلوب ادا کے لحاظ سے محدود ہی کیوں نہ رہی ہو۔

دکن کے وہ شعراء جو ولی سے کچھ پہلے گزر چکے ہیں ان کے یہاں تو نہیں لیکن ولی اور اُن کے ہمعصر سراج وغیرہ کے کلام میں فارسی شاعری کے زیر اثر، رعایت لفظی یا فارسی تشبیہات کی بھی کچھ کمی نہیں ہے۔

مثلاً ولی لکھتا ہے :-

جاری ہوئے آنکھو مرے لو سبزۂ خط دیکھ
سلے خضر تمام سیر کرا اس آب رواں کا

اس میں سبزۂ خط، خضر اور آب رواں کے الفاظ سب فارسی شاعری کا طفیل ہیں۔

اسی زمانہ کے ایک شاعر باقی کا شعر ہے :-

تیری انکھیاں حذاقت کا فر ہوا سارا جہاں　　اسلام اور تقوی کہاں زہد اور مسلمانی کدھر

یہ کفر و اسلام کا ذکر شاعری میں صرف فارسی شاعری کا نتیجہ ہے۔

الغرض فتح گولکنڈہ سے قبل قطب شاہی و عادل شاہی حکومتوں میں جتنے شاعر تھے اگرچہ ان کو اُردو زبان کا شاعر تو نہیں کہہ سکتے لیکن بہرحال جیسے اور جتنے بھی تھے صرف جذبات کا اظہار سادہ الفاظ میں کر دیا کرتے تھے اور یہی رنگ اول اول وَلی کا بھی رہا لیکن جب اورنگ زیب نے دکن کی حکومتوں کو مغلوب کر کے اورنگ آباد میں قیام کیا اور ہندوستان و ایران کے شاعروں سے یہاں کے شعرا کا ارتباط بڑھا، تو رفتہ رفتہ زبان کی سادگی (جسے بیرنگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) اور اسلوب بیان کی یکسانی مٹنے لگی اور فارسی خیالات فارسی تراکیب اور فارسی تشبیہات و استعارات کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ وہی وَلی جو صرف یہ لکھنا جانتا تھا :-

ترسے آنے کی باٹ اوپر بچھائے ہوں میں انکھیاں کو

جب دہلی سے واپس آیا تو یہ بولی بولنے لگا :-

سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا

وَلی کے اس دور کے کلام میں آپ کو "طرۂ طرار، سیہ بیاں تخش، آئینہ صاف، نقد ہوش، لب تصویر" ایسے الفاظ خالص فارسی ترکیب کے بکثرت نظر آئیں گے، تاہم جذبات نگاری کا جو ذوق پیدا ہو چکا تھا وہ مٹ نہ سکا اور ایرانی ذوق و ایرانی آورد و تصنع سے متاثر ہونے کے باوجود، تغزل کی سادگی کسی نہ کسی حد تک قائم رہی۔

دہلی کی حالت اس وقت یہ تھی کہ فارسی کے اچھے اچھے کہنے والے وہاں موجود تھے اور علاوہ سراج الدین علیخاں آرزو و میرزا عبد القادر بیدل، سلیمان قلی خاں داؤد، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، علی قلی خاں ندیم وغیرہ نہایت خوشگو شعرا پائے جاتے تھے لیکن اُردو سے بالکل نابلد تھے اور اگر کبھی بطور تفنن کچھ کہا بھی تو اس انداز سے جیسے کوئی نووارد انگریز کچھ اپنے خانساماں سے کہہ رہا ہے چنانچہ میرزا معز الدین فطرت عہد عالمگیری کے بڑے زبردست فارسی شاعر تھے، لیکن اُردو میں انھوں نے یوں گل افشانی فرمائی :-

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پری ہے (پڑی)　　در خانۂ آئینہ گتا (گھٹا) جھوم پری (پڑی) ہے

یعنی تیری زلف سیاہ کے خال سے دل کا یہ رنگ ہے جیسے آئینہ میں گھٹا چھا جائے۔

ایک اور فارسی شاعر قزلباش امید کی اُردو نوازی ملاحظہ ہو:-

بامن کی بیٹی (بیٹی) آج مری آنکھ موں (میں) پری (پڑی)　　غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لری (لڑی)

دوسرے مصرعہ میں "و" عطف اور لفظ (دگر) کسقدر عجیب چیز ہے لیکن اسکے بعد جب وَلی کا دیوان دہلی پہونچا اور دوسرے اورنگ آباد ی

شاعر وہاں پہونچے تو دفعتہً ذوق میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہی قزلباش امید جن کا شعر ابھی آپ نے پڑھا ہے اس دُھن میں لانے لگے:-

درو دیوار سے اب صحبت ہے ۔۔۔ یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں ۔۔۔ الحفیظ ، الحفیظ کہتا ہوں

خان آرزو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

میخانے آج جا کر شیشے تمام توڑے ۔۔۔ زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے ۔۔۔ چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ہر صبح آ و تا ہے تیری برابری کو ۔۔۔ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

ہر چند ان تمام اشعار میں روحِ فارسی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد عالمگیری میں بعض ایسے بھی الفاظ دور میں ایجاد ہوئے تھے جو آج تک استعمال ہو رہے ہیں مثلاً دل کے پھپھولے پھوڑنا - دن لگنا - یا تیجے کی رسم کو "پھول" کہنا -

تذکرۂ گلِ رعنا میں اس وقت کے بعض اور فارسی شعراء کا بھی اُردو کلام نقل کیا ہے مثلاً مرزا علی قلی خاں ندیم لکھتا ہے:-

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں ۔۔۔ بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بیقرارِ عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال ۔۔۔ مر چکے بیمار تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

مرتضیٰ قلی فراق کہتے ہیں:-

تماشہ اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے ۔۔۔ کریاں اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں ۔۔۔ کوئی ان ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

میر شمس الدین فقیر نے چھوٹی زمین میں کتنے صاف شعر نکالے ہیں:-

زندگی موجِ آب ہے گویا ۔۔۔ دم کا آنا حباب ہے گویا

خال تیرے بیاضِ گردن پر ۔۔۔ نقطۂ انتخاب ہے گویا

مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی دو چار شعر اُردو میں کہے ہیں، لیکن خاص اپنے رنگ کے:-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں ۔۔۔ اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے تم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا ۔۔۔ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

شہرۂ حُسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا ۔۔۔ اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

اشعار مندرجۂ بالا سے ہر چند یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان فارسی شعراء نے جو کچھ کہا وہ یکسر ایرانی خیالات کا پرتو تھا، لیکن اس سے

بھی انکار ممکن نہیں کہ زبان کے لحاظ سے دہلی نے جتنی جلد ترقی کی وہ دکن کے شعراء کو شاید عمر بھر نصیب نہ ہوتی اگر انھیں اہلِ دہلی سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ نہ ملتا۔ یہ درست ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا ذوق دکن سے منتقل ہوا، لیکن جس حد تک زبان کی ترقی و تہذیب کا تعلق ہے، دہلی، دکن کا ممنونِ کرم نہیں بلکہ خود دکنی کو شکرگزار ہونا چاہئے کہ وہ یہاں آکر آدمیوں کی بولی بولنے لگے ورنہ اُسی تجن، برما اور نیتیں میں پڑے رہتے۔ اس دور کے مصلحین زبان اردو میں سب سے زیادہ نمایاں نام شاہ حاتم کا نظر آتا ہے، یہ میر شاکر ناجی، غلام مصطفیٰ یکرنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر اور شرف الدین مضمون کے ہمعصر تھے اور اول اول اُسی اورنگ آبادی زبان میں شاعری کرتے تھے لیکن بعد کو کافی جدوجہد کرکے ایک انتخاب مرتب کیا اور ہندی کے بہت سے نامانوس اور ثقیل الفاظ ترک کرکے عربی فارسی کی آسان ترکیبیں اور دہلی کے محاورات استعمال کئے مثلاً

زندگی درد سر ہوئی حاتم　　کب ملیگا مجھے پیا میرا
ستم سے تیرے میں جاتا ہوں چھوڑ کھیو تو　　کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا
جو بیٹھے ہو تو اک آفت ہو　　اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
مفلسی اور دماغ اسے حاتم　　کیا قیامت کرے جو دولت ہو

لیکن باوجود اس کے عہد قدیم کے مطابق ذبح کو ذبی، شمع کو شمی، بیگانہ کو بگانہ، دیوانہ کو دوانہ لکھنے سے انھوں نے احتراز نہ کیا۔ اسی طرح نیتی، سنگت، رت، اور دھر کیدھر، یاں، واں اور ... استعمال برابر کرتے رہے اور بہ اتباع شعرائے فارسی جن کی زبان سے (ذ) بہ صورت (ز) ادا ہوتی تھی، ذ اور ز کا قافیہ بھی اور تھوڑے سے کو بھی جائز رکھا۔ صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر نے بیدل کا نام بھی اس دور کے مصلحین اردو میں لکھا ہے کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ اردو میں بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں، لیکن چونکہ اس "بہت کچھ" میں سے سوائے دو چار شعر کے اور کچھ باقی نہیں رہا اس لئے کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خان آرزو کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے ایک تصنیف "لغتہ اردو" پر کی تھی جو غدر کے زمانہ میں انھوں نے دیکھی تھی، لیکن اب وہ بھی سامنے نہیں کہ اس پر اظہار خیال ہو سکے۔ البتہ اس دور کے لوگوں میں مرزا مظہر اور فغاں کا مرتبہ نہ صرف بہ لحاظ زبان بلکہ بلحاظ جذبات نگاری بھی بہت بلند نظر آتا ہے کیونکہ جو رسم ایہام گوئی فارسی کے اثر سے اردو شاعری میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے نمونے ولی، سراج اور حاتم وغیرہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں، سب سے پہلے میرزا مظہر اور فغاں نے ترک کی۔ اس لحاظ سے ان کی خدمات نہ صرف اس لئے وزنی ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی تہذیب و شائستگی میں نمایاں حصہ لیا، بلکہ حقیقی رنگ تغزل کے معیار کو بہت بلند کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا

ہرچند مظہر کے کلام میں الفاظ "کسو، کبھو، انھوں کی، بیڑہ پان، اپر، موا، سجن" وغیرہ نظر آتے ہیں لیکن زبان کی سلاست و روانی اور جذبات کی فراوانی اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔

لکھتے ہیں:-

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے　　غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کیا زبان کے لحاظ سے یہ شعر عہدِ حاضر کی پیداوار نہیں کہلایا جا سکتا۔

اور ان کا یہ مشہور شعر:-

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا　　لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

کیا یہ لحاظ رنگ تغزل معیاری چیز نہیں۔

زبان کے لحاظ سے فغاں کا مرتبہ میرزا مظہر سے زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ ہر چند یہ قزلباش امید یا علی قلی ندیم کے شاگرد تھے جو فارسی کے شاعر تھے لیکن چونکہ احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے اسلئے ان کی اردو زبان بھی بہت شستہ تھی اور تنوع بیان کی وہ صورتیں جو فارسی میں رائج ہیں اُن سے بھی اردو میں کام لیکر جذبات نگاری کے بڑے بڑے پیارے اسلوب انھوں نے پیش کئے۔

زبان کا لطف ملاحظہ ہو:-

تجھ کو روزی ہو مرے یار دُعائیں لینا　　مجھ کو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا　　کیا پوچھتے ہو حال ہمارا سنا نہیں

اسلوب بیان کی بعض مثالیں دیکھئے:-

کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں　　یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

دلبستگی قفس میں یہاں تک مجھے ہوئی　　گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

صرف ۲۵ سال بلکہ اس سے بھی کم مدت میں، دکن کی ثقیل زبان اور وہاں کی تنگ و محدود غزلگوئی کا دہلی آکر اس قدر ترقی کر لینا حقیقتاً حیرتناک امر ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ یہاں کی سرزمین اکبر و جہانگیر کے وقت سے اس کی صلاحیت قبول کرتی جاتی تھی اور جب اورنگ زیب کا زمانہ آیا تو اس استعداد میں دکنی شاعری کی تحریک سے عملی جنبش پیدا ہوئی اور محمد شاہ رنگیلے کے وقت تک اسنے ایک بالکل جدید ہیئت و صورت اختیار کر لی۔

جس حد تک زبان کا تعلق ہے، اہلِ دہلی، دکن کی زبان کے قایل نہ تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اس سے بالکل علحدہ ہو کر اسلوب غزلگوئی استوار کیا جائے چنانچہ قائم نے صاف صاف لکھ ہی دیا کہ:-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک چیز لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اور شاہ وقت کی رنگین صحبتوں، عیش کوشیوں، اور فنون لطیفہ کی قدر دانیوں نے اس جذبہ میں قوت و استقامت پیدا کر دی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ولی دکنی ابھی بقید حیات ہی تھا کہ شاہجہان آباد میں شاہ حاتم، میرزا مظہر، فغاں، سودا، میر، درد اور سوز ایسی ہستیاں رونما ہو گئیں۔

جنھوں نے اگر ایک طرف زبان کو خس وخاشاک سے صاف کیا تو دوسری طرف غزلگوئی کے معیار کو اس بلند نقطہ تک پہونچا دیا کہ آج بھی اگر کسی معیاری شعر کی تلاش ہوتی ہے تو میر و درد ہی کے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔

اصلاحِ زبان کے باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ شاہ حاتم اور میرزا مظہر وغیرہ نے زبان وبیان دونوں حیثیتوں سے غزلگوئی کا رُخ کدھر سے کدھر پھیر دیا لیکن یہ سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہوگیا بلکہ ابھی جاری رہا اور زمانہ نے سودا کو پیدا کرکے یہ خدمت اُن سے لی۔ سودا شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ لیکن بلا کا ذہن دماغ لیکر آئے تھے، اور اُردو میں تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھنے کے لحاظ سے اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، جوش و خروش، معنی آفرینی، نزاکتِ تخیل، ندرتِ بیان، چستی بندش، قدرتِ بیان، الغرض فن شعر و انشا کے متعلق کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو ان میں بدرجۂ اتم نہ پائی جاتی ہو۔ اُردو میں قصاید کی ابتدا بھی انھوں ہی نے کی اور چونکہ فارسی زبان کے بھی ماہر تھے اس لئے یہاں بھی اسی بلند آہنگی کو برقرار رکھا۔ ہجویں ایسی کہیں کہ خدا کی پناہ، قطعے، رباعیاں، مستزاد، ترجیع بند، پہیلیاں، مخمس ایسے ایسے لکھے کہ معلوم ہوتا تھا ان میں سے ہر ایک کے لئے پیدا ہوئے تھے، الغرض فارسی میں جو مرتبہ امیر خسرو کو حاصل تھا، وہ اُردو میں سودا کو نصیب ہوا لیکن صحیح رنگ تغزل میں وہ میر، سوز اور درد کو نہ پہونچ سکے، کیونکہ وہ فطری سوز وگداز جو غزلگوئی کے لئے ضروری ہے اس سے یہ ناآشنا تھے تاہم اسالیبِ بیان کے تنوع کے لحاظ سے ان کو ایک اچھا غزلگو کہا جا سکتا ہے اور اصلاحِ زبان کے باب میں تو وہ سب میں ممتاز تھے۔

ذیل کے چند شعروں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زبان کی تہذیب و شایستگی انھوں نے کس حد تک پہونچا دی تھی:۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں
یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو نباہ — جھوٹی بھی تسلی ہو تو جیتا ہی رہوں میں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند — جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں
پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے ولے — دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ — کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

فارسی ترکیبوں کو بھی انھوں نے نہایت سلیقہ وخوبی سے استعمال کیا مثلاً

اے نالہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہو
بنتے تھے رشتۂ رگِ گل دام کے لئے
اک تیر میں وہ مرغِ بلند آشیاں گرا

اسی طرح کی سیکڑوں مثالیں فارسی ترکیب الفاظ کی اُن کے یہاں مل سکتی ہیں۔

جیسا کہ ابھی ہم نے کہا سوز و گداز اُن کے یہاں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن سادگی و سلاست اور اسلوب بیان سے کام لیکر انھوں نے یہ کیفیت بھی پیدا کر کے دکھا دی۔ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کے یہاں تغزل نہیں ہے:-

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب بھلی راتیں — دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ — کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا
نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں — کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

زبان کے لحاظ سے میر، درد، اور سوز ایک ہی درجہ رکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے کسی نے اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت سے نامانوس الفاظ کے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں، البتہ درد اور سوز کے یہاں ایہام کی شاعری بالکل نہیں پائی جاتی اور میر کے کلام میں یہ عیب بھی نظر آتا ہے۔ سودا نے اس سے بہت احتراز کیا۔ اسی کے ساتھ امرد پرستی کا جذبہ بھی میر کے یہاں نسبتاً اپنے عہد کے اکثر شعراء سے زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن بایں ہمہ معیار تغزل کے لحاظ سے کسی عہد میں اس کا نظیر پیدا نہیں ہوا اور سوز و گداز، عجز و نیاز، سادگی، والہانہ ربودگی، معاملات محبت کی چھان بین، تجزیۂ کیفیات، سلاست و روانی، آمد و بیساختگی کے لحاظ سے ارتقاء غزل گوئی کی جس منزل پر وہ پہونچا، کسی دوسرے کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یقیناً درد کے کلام میں بھی تقریباً یہی باتیں پائی جاتی ہیں لیکن بہ اعتبار کمیت و کیفیت میر کو نہیں پہونچتے سوز تو خیر نہایت ہی سیدھے سادے عاشق تھے اور سوائے اس کے صاف صاف الفاظ میں اپنے دل کا حال بیان کر دیا کریں، اینچ پینچ کی باتیں جانتے ہی نہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ درد کی شاعری میں میر سے زیادہ عمق ہے لیکن غزل میں جذبات کی گہرائی اتنی پسندیدہ نہیں جتنا ان کا فطری اظہار، سوز کے یہاں یہ رنگ زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ پھر میر کے کلام کی کثرت اور اس میں بھی کیفیات عشقیہ کے ہزاروں پہلوؤں کا نئے نئے اسلوب سے بکثرت اظہار ایسی خصوصیت ہے کہ سوز اور درد کے مقابلہ میں ان کو لامحالہ مرجح ماننا پڑیگا۔ ساری دنیا کے شاعروں کا کلام چھان ڈالئے لیکن میر کے نشتروں کا جواب مشکل سے ملیگا۔

اب حالِ دل ہے اُن سے کے دلخواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ
کب نیاز عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ — آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا
یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اسکے تئیں — اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا
نظر میر نے کیسی حسرت سے کی — بہت رو دئے ہم اس کی رخصت کے بعد

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی　　جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

الغرض کہاں تک کوئی لکھ سکتا ہے۔ اس کا دیوان ان جواہر ریزوں سے لبریز ہے۔

خواجہ میر درد کے کلام میں بھی اس رنگ کے شعر نظر آتے ہیں:-

دیکھی نہ تو یونہی دم دیکھ کہ اے غافل　　اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کیے　　جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے　　دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لیکن میر کے اشعار سے پھر بھی کچھ الگ معلوم ہوتے ہیں اور دل کے جلنے کی وہ بو ان میں نہیں ہے۔ زبان کی شیرینی و سادگی کے لحاظ سے سوز بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور جذبات محبت کو نہایت سہل و آسان الفاظ میں بیان کر دینا ان کی وہ خصوصیت تھی جو میر اور درد کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے کلام کا اقتباس نگار ماہ نومبر ۳۴ء میں شائع ہو چکا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ چند شعر یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں:-

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہو گیا　　عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا　　آہ یا رب راز دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

سر زانو پہ ہو اس کے اور ارمان نکل جائے　　مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا　　پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اشک خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے　　دور سے کبھی دیکھنے سے ہم گئے

کسی نے دم لی قسمت میں کوئی شام لیا　　ہمیں کچھ بھولے نہ آیا ایک تیرا نام سے آیا

الغرض تغزل نے زبان و بیان کے لحاظ سے اس عہد تک نمایاں ترقی حاصل کر لی اور ایک سودا و میر ہی پر موقوف نہیں، آپ اس عہد کے جس شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیں گے، زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت و سادگی آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ غزل کے علاوہ قصیدہ گوئی کی بھی سودا نے مستحکم بنیاد ڈال دی اور حسن نے سحر البیان لکھ کر مثنوی کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔ ہر چند حسن سے تقریباً دو سو سال پہلے دکن میں مثنوی کی بنیاد قائم ہو چکی تھی اور اس سلسلہ میں نصرتی کی گلشن عشق، ابن نشاطی کی پھول بن اور ہاشمی کی یوسف زلیخا کا نام عرصہ سے کانوں میں پڑتا چلا آتا تھا، لیکن زبان کے لحاظ سے جو حال دکن کی غزل کا تھا وہی مثنوی کا تھا۔ سب

پہلے میر تقی میر نے اس میں اصلاح کرکے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں اور اس میں شک نہیں کہ خوب لکھیں، لیکن پھر میر حسن نے بے نظیر و بدر منیر کی عشقیہ داستان لکھ کر نہ صرف بہ لحاظ پاکیزگی زبان بلکہ محاکات و سیرت نگاری کے لحاظ سے بھی اس صنف سخن کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اگر اُس وقت کی ٹکسالی زبان کا نمونہ دیکھنا ہے تو صرف یہ مثنوی پڑھ لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل اس میں کتنا البیلاپن پیدا ہو گیا تھا۔ چاندنی رات میں بدر منیر لب نہر ایک تکیہ و زرنگار کے نیچے مسند پر بیٹھی ہوئی ہے اس کی تصویر ملاحظہ ہو:۔

اُدھر آسماں پر وہ رخشندہ مہ	اِدھر یہ زمیں پر مہ چاردہ
دئے کہنی تکیہ پر اک ناز سے	سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں	لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں
وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے	وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہئے ٹھیک نک سک سے رنگ	نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ

بدن آئینہ سا دمکتا ہوا	گل باغ خوبی لہکتا ہوا
عیاں حسن و جا بجی گات سے	نمود جوانی ہر اک بات سے
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن	مرادوں کی راتیں جوانی کے دن

بے نظیر اور بدر منیر کی پہلی ملاقات کا سماں ملاحظہ ہو:۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے	بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے	لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن	کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

فراق کے بعد کی حالت دیکھئے:۔

تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی	دُر اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی	بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ	اکیلی لگی رونے منھ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا	نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے	محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اُٹھنا اسے کہہ کے ہا نجی چلو
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

الغرض پوری مثنوی اسی قسم کے نوادر سے مالامال ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ چند دنوں میں اُردو اتنی وسعت کیونکر اختیار کر سکی۔ یہ مثنوی میر حسن نے اپنی عمر کے آخر حصہ میں تصنیف کی تھی یعنی اسوقت جب سودا اور درد کا انتقال ہو چکا تھا، اور میر اور سوز دہلی کے اُجڑ جانے سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ میر حسن اس میں شک نہیں دہلوی تھے لیکن چونکہ عنفوان شباب میں فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ساری عمر بسر کی اس لئے میر حسن کے تمام کارناموں کو اصولاً لکھنوی دورِ شاعری سے منسوب کرنا چاہئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی برباد ہو کر لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اور تمام باکمال شعراء کھنچ کھنچ کر اسی طرف آرہے تھے، عیش و مسرت کی فراوانی تھی نئی نئی سلطنت کی اُمنگ تھی۔ زر و دولت کی کھپت تھی، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعروں کی طبیعت میں تازہ اُمنگ نہ پیدا ہوتی اور شاعری اسی حالت پر قائم رہتی جو دہلی میں پائی جاتی تھی۔ اس لئے نہ صرف یہ ہوا کہ شعراء دہلی کی شاعری سے متاثر ہوئے بلکہ خود سرزمین اودھ سے بھی جعفر علی خاں حسرت نے وہ صدا بلند کی جسے لکھنؤ اسکول کی شاعری کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

حسرت نے نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کا پورا زمانہ دیکھا تھا یعنی سودا، میر، سوز، مصحفی و انشا سب کا عہد انکی نگاہوں سے گزرا، اس لئے یہ کہنا کہ دہلوی اثرات سے ان کی شاعری بیگانہ رہی صحیح نہ ہوگا کیونکہ وہ خود دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن یقینی ہے کہ سب سے پہلا وہ شخص جس نے لکھنؤ کا ایک علحدہ رنگ قائم کر کے امرد پرستی کی طرف سے شعراء کی توجہ کو ہٹایا، حسرت ہی تھا۔ جراُت جنکی بیباک عریانیاں مشہور ہیں، انھیں کے شاگرد تھے، اس وقت تک دہلی کی شاعری نے محبوب کی نسائی حیثیت کو متعین نہ کیا تھا اور جس طرف دیکھئے وہی سبزۂ خط نظر آتا تھا، لیکن چونکہ لکھنوی معاشرت میں شاہدان بازاری کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا عام بات تھی اس لئے کنگھی چوٹی کا بھی ذکر شروع ہوا، چولی اور محرم کا بھی بیان ہونے لگا۔ یقیناً بہ لحاظ فطرت یہ میلان قابل قدر تھا لیکن اس سلسلہ میں عریانیاں اتنی بڑھ گئیں کہ آخر کار دہلوی رنگ تغزل کی لطافت بالکل پس پشت ڈالدی گئی اور جذبات کا رُخ حد درجہ پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ حسرت کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:-

چولی مسکی، بند ہیں ٹوٹے، سر کے بال پریشاں ہیں — اس بگڑے عالم پر تیرے لاکھ بناوٹ قرباں ہیں
کپڑے بدن کے ملے دلے ہیں بلکہ بدن سب ملا دلا — شب کے باسی پھولوں کا عالم کس سے کہیں ہم حیراں ہیں
مُنھ اترا ہو گال ہی نیلا، پلکیں جھپکیں آنکھوں میں خمار — نام خدا بگڑے عالم پر جمع ادائیں پنہاں ہیں
سچ کہو حسرت پاس رہے تھے رات، بنا جس سے یہ رنگ — اس کمبخت کی صحبت نے بیزار جہاں کے خوباں ہیں

یہ صحیح ہے کہ حسرت کے یہاں یہ رنگ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن اس ابتدا کی آخر انتہا ہونا تھی جسے جرأت[1] نے ترقی دی۔ اور پھر رفتہ رفتہ رعایت لفظی، ایہام گوئی زنانہ پن فحاشی، دعریانی، سوقیانہ طرزِ ادا اور بے حیائی و بے غیرتی کی وبا ناسخ اور اُن کے شاگردوں کی بدولت اتنی عام ہوئی کہ لکھنؤ اسکول آج تک اس کی وجہ سے بدنام ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری پر سب سے بڑا اثر وہاں کی حکومت کا پڑا، چنانچہ مصحفی و انشا بھی جو دہلی اسکول کے شاعر تھے لکھنؤ پہونچکر نوابان اودھ کے ذوق اور وہاں کے رنگ رلیوں کو دیکھ کر ایک حد تک متاثر ہوئے اور اسی لئے ان کا کلام لکھنؤ پہونچنے کے بعد پست ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا وہ شخص جس نے لکھنوی غزلگوئی کو بدنام کیا ناسخ تھا۔ اس کے بعد آتش اور پھر ان دونوں کے تلامذہ نے کچھ زمانہ تک اس رنگ کو قائم رکھا جو اسیر و امیر کے وقت تک باقی رہا۔ متاخرین میں سب سے پہلے جلال نے اس کو ترک کیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ دور ختم ہو کر جدید دور شروع ہوا جس میں اساتذۂ دہلی کا تتبع کیا جاتا ہے، لیکن سوز و گداز پیدا کرنے میں کہیں کہیں مرثیہ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو غالباً انیس و دبیر کی وجہ سے رائج ہوا اور مذہبی اثرات نے بھی اس کو تقویت پہونچائی۔

اس باب میں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، اُس عہد کے شعرا کا انتخابِ کلام بجائے خود ایک ایسی کُھلی ہوئی تنقید ہے جس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

ناسخ کا ایک شعر ہے:۔

راستی کا نام بھی اس شہر میں سُنتے نہیں   کیوں نہ ہوں سب لکھنؤ کے کوچہ و بازار کج

حیرت ہے کہ ناسخ نے لکھنؤ کی ناراستی میں کوچہ و بازار کا ذکر تو کیا، لیکن خود اپنے ذوقِ سخن کو بھول گئے جس سے زیادہ ناراست چیز شاید ہی کوئی دوسری پیدا ہوئی ہو۔

اب لکھنؤ کی بدنام و رسوا شاعری کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے جو رعایت لفظی، ابتذال معنوی، مبالغہ، عریانی، ایہام اور

---

۱ جرأت کے بعض اشعار اس رنگ کے ملاحظہ ہوں:۔

کیا کہیں وصل ہوئے پھر بھی زباں سے اپنے   حرفِ مطلب نہ کبھی خوف کے مارے نکلا

کیا جانے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر   جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

شب اسنے توڑ کر موتی کے سمرن مجھ سے گنوائے   دکھایا وصل میں عالم نیا اختر شماری کا

چاہ کی چتون مری آنکھ اسکی شرمائی ہوئی   تاڑلی مجلس میں سب نے سخت رسوائی ہوئی

آخری شعر اس رنگ کا ہے جسے بعد کو داغ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور تکمیل تک پہونچا کے چھوڑا۔

رکیک تشبیہات وغیرہ متعدد اسقام سے لبریز ہیں :-

ناسخ :-

آج ہوتا ہے دلا دو جو میٹھا میٹھا ۔۔۔ دھیان آیا ہو تجھے کس کے لب شیریں کا

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے ۔۔۔ کہوں آنکھوں کو میں ، بادام شیریں

کافر خط استوا بدن کا ۔۔۔ تیری سونے کی کردھنی سے ہے

کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشم مست کا ۔۔۔ نرگس کی شاخ بنگئی ہر موج آب میں

دے وہ پٹا تو اپنا ململ کا ۔۔۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شکم صاف کے قریں ہے ناف ۔۔۔ یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

آتش رخ سے آنکھ سینکتے ہیں ۔۔۔ کیا زمستان میں کام منقل کا

دیکھکر تجھ کو نہ کیونکر نعرہ زن ہوں سب رقیب ۔۔۔ بیشتر کتوں کو بھکواتا ہے جلوہ ماہ کا

مجھ سے ہلوا تا ہو اب لیزم جنوں زنجیر کی ۔۔۔ اور کو دعشق کی کہتا ہے آ مگدر اٹھا

بالوں کا کچھ اثر بغل یار میں نہیں ۔۔۔ پڑتا ہے عکس زلف سیہ فام دوش پر

مجھکو سودائی بنایا ہے دکھاکر آنکھیں ۔۔۔ تم دھتورے کا لیا کرتے ہو بادام سے کام

تیری ایسی انگلیاں ہیں استخواں جنمیں نہیں ۔۔۔ پور پور ان کی مگر خرمائے تر بے خستہ ہے

تو وہ خورشید ہے اٹھے جو گلستاں میں نقاب ۔۔۔ چہرۂ گل میں تلون ہو وہیں حربا کا

خصیہ الی اغنیا کی ہو عبث لے اہل حرص ۔۔۔ نقد سے خالی ہمیشہ کیسۂ دلاک ہے

تیرے تلوے اور رواں کے منھ سے سوا شفاف ہیں ۔۔۔ آئینہ بھی انکے آگے صاف جھانواں ہوگیا

ملگیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے ۔۔۔ ہوں جو عیسی بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

ناک رگڑے ہر گھڑی کیونکر نہ انکے سامنے ۔۔۔ بندے نتھنی کے سلیماں کی ہو خاتم ناک میں

مرگئے ایسے ہو کے لاغر ہم ۔۔۔ سوئی لایا ہے گورکن اپنا

ہوں میں عاشق انار پستاں کا ۔۔۔ ہوں نہ تربت پہ جز انار درخت

آتش :-

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی ۔۔۔ حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہو ایذا ان کو ۔۔۔ منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

لب شیریں کی تری چاشنی ممکن نہ ہوئی ۔۔۔ زن سے شکر ہوئی شکر سے بتاشے پیدا

دبھول بیٹھ کے بالائے سروائے قمری — چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہو نٹ کا
یہ جانتے تو تمھیں ہم نہ باندھنے دیتے — کمر کے ساتھ لپیٹے گا ناف کو ٹپکا
بیتاب دل کو تسکیں ہوتی ہے دید خط سے — وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں
وہ تنک مشرب ہیں ہم خمخانۂ افلاک میں — نشۂ زر ہو ہمیں گر شربت دینار کو
کیا اُستاد کو شاگرد اُس طفل پریرو نے — پڑھایا روز بسم اللہ علم عشق ملا کو
گھر سے خدا کے ملتے ہیں مضموں مجھے بلند — فکر رسا کمند ہے کعبہ کے بام کی
رند:- ہے عیاں حالِ سگِ اصحابِ کہف — جانور کی آدمیت دیکھ لی
ہے خوف جان کا ایسے چنکیت سے ہردم — بتا کے باہر و قاتل کہیں نہ ، ہول چلے
ساری رگیں ہوئی ہیں تنِ زار پر نمود — ناطاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا
رونے کی تجھے لہر جو اے چشمِ تر آئی — کوسوں نظر آئے گا نہ تاپو نہ ترائی
آتا ہے نام آوریِ کوہکن پہ رشک — اس مُنڈ چڑے نے پھوڑ کے سر کیا نمود کی
وہ ساتھ رکھتے ہیں اس طرح مجمعِ عشاق — صحابہ ساتھ لئے جس طرح رسول چلے
کیونکر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی — واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی
ہرجائی پن کی آپ کے کچھ انتہا نہیں — کٹتا ہے دن کہیں تو کہیں رات آپ کی
مجنوں کو کس قدر سگِ لیلیٰ عزیز تھا — دیوانے ہیں جو ہم ترے کتے کو "تو تو" کریں
خلیل:- دُکھتی ہیں آنکھیں حُسن پر آشوب یار سے — گھبراتا ہے موت کا جب سے نگاہ کی
بغل میں بیٹھیئے دل کی طرح سے آپ آکر — میں پاؤں پڑتا ہوں اُٹھئے نہ دردِ سر کی طرح
وصل کی شب پلنگ کے اوپر — مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں
کیا لکھوں شورشِ دل کاغذ میں — تاؤ کاکل کی طرح کھائے گا
ہم کیا تماشۂ عشق میں گھاتیں بتائیں گے — وہ خود جواریوں سے بھی زیادہ ہیں چالئے
دیکھی شبِ وصل ناف اُس کی — روشن ہوئی چشم آرزو کی
سینہ پہ نہیں گھاؤ تری تیغ کا قاتل — یہ دل میں مرے نیو محبت کی پڑی ہے
صبا:- صبح شب وصال ہی کیوں نعرہ زن ہوں — پڑتی ہے مو گری مرے دل پر گجر کے ساتھ

بوسہ کے مانگنے پہ نہ کیوں منھ تھوتھائیے / یہ ناز جانے کے اور سے اے نازنیں رہے

کون پوچھے گا ست زلفِ بتاں کے سامنے / زاہدو بالفرض داڑھی پر خدا کا نور ہو

خدا سمجھے وہ کلائیاں، پنجے کلے میں ہوں / ہتھ پھیریاں نصیب ہوں چندن سی ران پر

بیا ہے یار کا باغ جوانی دیکھئے / کیا شگوفہ لائے سینہ کا ابھار ابھی برس

اس سے نہ بار ہا پہ جب دلبر دلِ ناشاد آیا / اپنی آغوش میں افسردہ پری زاد آیا

پیغامِ وصل پر وہ مری بوٹیاں اڑائیں / دانتوں سے دیں جواب زبانِ سوال کا

وزیر :- سبزۂ خط دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے / جانور صد قفس چھوڑ دو کچھ اب صیاد کو

رنگ کندن سا تمہارا ہی عجب کیا ہے اگر / طوطیِ سبزۂ خط سونے کی چڑیا ہو جائے

لڑائی وصل میں اس جنگجو سے ہونے والی ہے / کٹاری گلبدن کے پائجامے نے نکالی ہے

لگا مضمون ہاتھ اس کان کی بالی کی مچھلی کا / یہ ہم نے چشمۂ خورشید سے مچھلی نکالی ہے

اس زمانہ میں آتش نے بیشک بڑی حد تک جذبات نگاری سے کام لیا لیکن کہیں کہیں وہ بھی بہک گیا اور اس کے شاگردوں میں تو سوائے ایک دو کے سب نے ناسخ ہی کا تتبع کیا۔ ہر چند اس زمانہ میں یہاں مصحفی و انشا بھی موجود تھے، لیکن انشا درباری شاعر تھا اور اس کا کام صرف نواب سعادت علی خاں کو خوش رکھنا تھا اس لئے اس کی ساری عمر مسخرہ پن میں گزری اور سوائے لفاظیوں اور بیجا تصنع و آورد کے صحیح رنگ تغزل سے اس کو کوئی سروکار نہیں رہا، لیکن آدمی چونکہ بہت ذہین و قابل تھا اس لئے کسی صنفِ سخن میں بند نہیں تھا، اور اپنی فطری ذکاوت کی وجہ سے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیتا تھا۔ مصحفی کی رسائی گو نواب کے دربار میں نہیں ہوئی لیکن انشا کے جھگڑے نے انھیں بھی پھکڑپن پر مجبور کر دیا تھا۔ جس حد تک نفس شاعری اور غزلگوئی کا تعلق ہے مصحفی کا مرتبہ انشا سے بہت بلند ہے، لیکن زبان میں کوئی خاص ترقی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ مصحفی اپنی پُرگوئی کے لحاظ سے سودا سے کسی طرح کم نہ تھے اور مشکل زمینوں میں ایسے ایسے صاف شعر نکال لیتے تھے کہ جواب نہیں۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انشا کے ساتھ مصحفی کی شاعری پر بھی اثر ڈالا اور کہیں کہیں آورد و صنعت کی وہ جھلک ان کے یہاں نظر آنے لگی جو یہاں مقبول تھی۔ ہزاروں غزلیں انھوں نے لکھ لکھ کر فروخت کر ڈالیں اور اس پر بھی ۷ - ۸ دیوان اپنے بعد چھوڑے کہ اگر ان کا انتخاب کیا جائے تو بہترین اشعار کی تعداد بڑے سے بڑے دیوان سے بڑھ سکتی ہے۔ الغرض اس دور میں مصحفی اپنے فن کا امام تھا اور غزلگوئی میں ایسے ایسے پاکیزہ اسلوب بیان پیدا کر گیا کہ اس سے قبل کسی شاعر کو اس حیثیت سے مصحفی کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

الغرض دہلی اُجڑنے کے بعد لکھنؤ میں جو صورت غزلگوئی کی پیدا ہوئی وہ کسی طرح پسندیدہ نہ تھی اور شاید یہ دور عرصہ تک

قائم رہتا اگر شاہانِ مغلیہ کے بالکل آخری دور میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ نہ پیدا ہو جاتے - ذوقؔ اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے سوداؔ کی سی خصوصیات رکھتے تھے اور ہرچند غزلگوئی میں وہ اپنے اُستاد شاہ نصیرؔ کی طرح جذبات سے الگ تھلگ رہے لیکن قصائد میں ان کا مرتبہ کسی طرح سوداؔ سے کم نہ تھا، اور زبان کی صحت و صفائی، الفاظ کی چھان بین، کلام کی تازگی، محاورہ کی برجستگی ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، ان کے کلام میں کہیں سوداؔ کا انداز ہے، کسی جگہ دردؔ کا اور کہیں کہیں جرأتؔ کا - یہ فطرت کی طرف سے کوئی مخصوص ذوق لیکر نہ آئے تھے بلکہ سعی و اکتساب سے ہر رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو جاتے تھے - اس وقت تک زبان متروکات کے بعد بہت صاف ہو گئی تھی، مثلاً :-

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا   تم وقت پہ آپہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا
عمداً تم اپنی رکاوٹ سے منھ بناتے ہو   وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو
ہے تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی   رکھیگی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

لیکن ذوقؔ کے یہاں صحیح تغزل کی روح مفقود ہے - البتہ اس کمی کو اس عہد کے جن شاعروں نے پورا کیا وہ مومنؔ و غالبؔ تھے - ان دونوں نے غزل میں فارسی ترکیبوں کو حد درجہ خوبی و لطافت کے ساتھ استعمال کیا، اور یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی ہندوستان کے تمام شاعروں کا مطمح نظر اسی کا تتبع ہے -

غالبؔ کا اُردو کلام بہت تھوڑا ہے اور اس میں بھی صحیح رنگِ تغزل چوتھائی حصہ سے زیادہ نہیں - مومنؔ نے البتہ بہت کہا اور خوب خوب کہا - ان کے لطیف اشارے کنائے، ان کی شیریں ترکیب الفاظ، ان کا سوز و گداز اور باوجود عشق بازاری کے انکے خیالات کی بلندی اپنا جواب نہ رکھتی تھی - اور طرزِ ادا کا تو حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ تھا - غالبؔ کے اُردو کلام کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے فارسی کے کلیات میں شامل ہو جانا چاہئے - مثلاً :-

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بیسروپا ہیں   کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا
ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بیمہریٔ قاتل   تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں فارسی ترکیبیں گوارا صورت سے اختیار کی گئی ہیں مثلاً :-

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو   ہمیں دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں   شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

یہ رنگ ان کا تنوع بیان کے لحاظ سے بہت دلکش ہے - لیکن اس سے بہتر ان کا وہ رنگ ہے جس میں انھوں نے سادگی و سلاست سے کام لیا ہے مثلاً :-

منھ مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　　نا امیدی اسکی دیکھا چاہیے
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

بلکہ یہ رنگ ان کے یہاں بہت کم ہے اور اس میں بھی سوز و گداز خال خال کہیں نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے مومن کے یہاں عشق و محبت کی گرمی اور سوز و گداز ہر جگہ نمایاں ہے، خواہ انھوں نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہو یا سلاست و روانی سے۔ پھر اندازِ بیان کی جدتیں، اسلوب ادا کا تنوع اور فارسی کی شیریں ترکیبوں کے ساتھ تو اسقدر لطیف کنائے کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تغزل کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا چاہے تو صرف مومن کا دیوان سامنے رکھ لینا کافی ہے۔ چند اشعار مختلف جذباتِ تغزل کے ملاحظہ ہوں:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ　　　آرزوہائے دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں
جاں نکلا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　　جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں　　　اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے
پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　　چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
کیا کیجے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں　　　جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　　کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

مومن تو خیر دلی سے باہر کہیں گئے نہیں لیکن غالب نے رامپور پہونچکر لکھنؤ کی شاعری کو کافی متاثر کیا اور آخر کار لکھنؤ میں جلال ایسے کہنے والے پیدا ہوئے اور ناسخ کی پیدا کی ہوئی بیہودگیاں رفتہ رفتہ کم ہوئیں۔

جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا ناسخ نے غزلگوئی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، لیکن زبان کی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ناسخ کی خدمات بہت اہم ہیں کیونکہ میر حسن و شاہ نصیر، سودا و میر اور مصحفی انشا تک کے زمانہ کے تمام ثقیل الفاظ اور نامانوس محاورات اس نے ترک کر کے زبان کو ایک صیقل شدہ آئینہ کی صورت دیدی۔

میر حسن و شاہ نصیر کے زمانہ میں الفاظ لو ہو۔ نت۔ نپٹ۔ تک، جگ، ہیگا، خاہ مخواہ، مت، کبھو، سمیت وغیرہ کثرت سے استعمال ہوتے تھے لیکن ناسخ نے ان سب کو ترک کر دیا۔ اسی طرح میر و مرزا کے عہد کے بہت سے مفرد و مرکب الفاظ کی اس نے اصلاح کی اور بعض کا استعمال یک لخت چھوڑ دیا۔ چنانچہ اُور۔ اُودھر۔ بیچ۔ تئیں۔ کریو۔ لاگا۔ تِن۔ تجھ بن۔ پھرتے ہے۔

میاں - بجن - کھوج - ٹل جانا - وسے - دیسے - وغیرہ وسیکڑوں الفاظ کی اصلاح کرکے زبان کو بہت مہذب و شایستہ کر دیا -

اس لئے جس حد تک صرف زبان کی اصلاح کا تعلق ہے ناسخ کی خدمات نہایت وزنی نظر آتی ہیں اور اسی نسبت سے لکھنؤ کو دہلی پر ترجیح دینا پڑتی ہے، لیکن تغزل کے لحاظ سے لکھنؤ کو دہلی سے کوئی نسبت نہیں ہے اور سوائے چند شاعروں کے کہ انھوں نے نوبیشک جذبات نگاری سے کام لیا، باقی سب نے ضلع جگت ہی میں وقت ضایع کیا دہلی میں بھی ایہام گوئی اور رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں لیکن بہت کم اور اگر شاہ نصیر و ذوق کو علحدہ کر دیا جائے تو کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس نے اپنی غزل گوئی کی بنیاد جذبات نگاری پر نہ قایم کی ہو -

لکھنوی شاعری کا یہ بدنما دور امیر مینائی کے وقت تک رہا، لیکن اس کے بعد شاگردان مومن و غالب کا کلام پھر مقبول ہونے لگا اور خود اہل لکھنؤ نے بھی آخر کار اس کو محسوس کیا کہ شاعری نام ضلع جگت کا نہیں بلکہ واردات قلب سے بحث کرنے کا ہے سب سے پہلے یہ احساس جلال کو ہوا اور اس کے بعد جب شعراء دہلی نے رامپور پہونچکر لکھنوی شعراء کو متاثر کیا تو رفتہ رفتہ وہ تمام نقائص و معائب دور ہونے لگے، حتی کہ اس وقت کوئی ایک بھی قابل ذکر شاعر لکھنؤ کا ایسا نہیں ہے، جو دہلوی اسکول کا پیرو نہ ہو، برخلاف اس کے دہلی کی حالت یہ ہوئی کہ شاگردان غالب کے بعد دہلی میں کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور اگر کوئی ہوا بھی (جیسے سائل و بیخود) تو استاد نے درجہ کا کہ غریب کو دہلی اسکول میں تو خیر کیا جگہ ملتی، لکھنؤ اسکول نے بھی نہ پوچھا - اور یہ دہلی کی وہ آخری اور حقیقی تباہی ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے

دہلی کی سرزمین سے سب سے آخر میں داغ ابھرے، لیکن ان کو دہلی اسکول کا شاعر کہنا درست نہیں کیونکہ ان کے یہاں سوز و گداز بہت کم پایا جاتا ہے - چونکہ انھوں نے شاعری میں جرأت کی تقلید کی تھی اس لئے ان کو لکھنوی اسکول کا غزلگو کہنا چاہئے لیکن ناسخ کے دور کا نہیں جلال و امیر کے دور کا اور اگر ان میں باہمدگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ جس بازاری رنگ کی شاعری داغ نے کی، اس کے لئے وہ پیدا ہوئے تھے اور امیر اس کے بھی اہل نہ تھے - رہگئے جلال سو وہ یقیناً داغ سے بہتر اور امیر سے بدرجہا بہتر کہنے والے تھے اب یہ اور بات ہے کہ وہ حیدر آباد پہونچ نہ سکے اور رامپور پہونچے تو امیر مینائی پہلے سے نواب کا پہلو دبائے بیٹھے تھے -

ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا کہ جلال کا مرتبۂ شاعری کیا تھا اور اگر قدرت سرزمین اودھ سے اسکو پیدا نہ کرتی تو دور ناسخ کے گناہوں کا کفارہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا - صفائی زبان، ندرت بیان، جذباتی رنگ، حلاوت و ملاحت، اس کے یہاں کیا نہیں ہے -

تغافل کر کے گئے شکر جھکا لیں تمنے کیوں آنکھیں   مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا　　مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا
سنے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں　　یہاں خطاب نہ تھا کچھ، وہاں جواب نہ تھا

گلہ ہے ہم سے کہ تم ضبط گریہ کر نہ سکے　　ہنسی جب آگئی اُن کو کب اختیار رہا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا　　تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا　　کبھی اسے رو کے ہنسا دیا، کبھی اس نے ہنس کے رلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا　　بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا

جو دل نہ ہو گا نہیں کا مجھ کو غم بھی نہیں　　تمنا رہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز　　آنکھ کم بخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

کر دے خبر اس خانہ برانداز سے کوئی　　روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلالؔ　　دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سُنے

دورِ حاضر کی غزلگوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے نہ کہ محض تصورات کا

لکھنؤ اور مختلف اصناف سخن

فرمانروایان اودھ کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا، دولت کی افراط تھی اور اسباب مسرت ونشاط کی فراوانی، ہر علم وہنر کا اُستاد لکھنؤ میں اکٹھا تھا اور ہر فن کا ماہر یہاں موجود۔ یہاں کا ایک شاعر اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

رتۂ کھل جاتا ہے یہاں کھوٹے کھرے کا پردہ　　لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

چنانچہ دیگر علوم وفنون کے علاوہ شاعری بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوکر ایک خاص صورت اختیار کرتی جارہی تھی سلطنت میں شیعی مذہب کی ترقی معراجِ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اور تمام امرا، وشرفا مجالس عزا میں شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم امرا بھی شہید کربلا کے غم میں آنسو بہانا باعث فخر وسعادت تصور کرتے تھے۔ اور سال میں شاید دو ہی چار دن ایسے گزرتے ہوں کہ جب کسی نہ کسی تقریب میں مجالس عزا نہ برپا ہوتی ہوں ان مجالس میں میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، اور دبیر وانیس کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور اس طرح سیکڑوں دردناک اشعار بچے بچے کو حفظ ہوگئے تھے۔ چونکہ اُس وقت لکھنؤ نصف شیعہ تھا اور مذاق شاعری پر مذہب اثر انداز ہو رہا تھا اس لئے اس باب میں شیعہ سنّی کی کوئی قید باقی نہ رہی، چنانچہ منشی امیر احمد نے بھی جنکا شمار حنفی علما میں تھا مصائب اہلبیت پر مسلسل اشک بہائے اور اس سعادت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا اثر نام علی میں ہے کہ لیتے ہی امیر　　کام بگڑے ہوئے جتنے ہیں سنور جاتے ہیں

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے　　کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

امیرِ خستہ جاں آفت میں ہے یا حیدرِ صفدر　　کرو امداد اسکی وقت ہے مشکل کشائی کا

امیر اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لیچل　　یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

اسی کے ساتھ اس وقت کی معاشرت پر بھی اک نگاہ ڈالئے۔ سامان عیش و عشرت کی فراوانی نے ایک عام کیفیت نشاط پیدا کر دی تھی اور ولادت، عقیقہ، بسم اللہ، شادی وغیرہ کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں رقص و سرود کی بزم منعقد کرنا فرض نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہیں تک اسی جگہ ختم نہ ہو جاتا تھا بلکہ علم مجلس سیکھنے، گفتگو میں لوچ اور حلاوت پیدا کرنے کے لئے شاہدان بازاری کی صحبت اس وقت کی تہذیب میں شامل ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے اور لکھنؤ کی یہ رنگینیاں بڑھکر خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئیں۔ تقریباً ۸ سال تک انھوں نے وہ داد عیش دی کہ محمد شاہ رنگیلے کی یاد دلوں سے محو ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں کی شاعری کے رجحانات کیا ہو جانے چاہئے تھے چنانچہ صاحب شعر الہند نے اس وقت دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کا جو فرق لکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ:۔

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں بالعموم نسائیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کا اثر داخلی وہاں کی شاعری پر پڑا۔

(۲) فارسی تراکیب کا لکھنوی شعراء کے یہاں فقدان تھا۔ لیکن شعرائے دہلی کا کلام اس سے مالا مال تھا۔

(۳) شعرائے دہلی مختصر غزلیں کہنے کے عادی تھے اور لکھنؤ میں سیر حاصل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور اسی وجہ سے ابتذال کا رنگ نمایاں تھا۔

(۴) شعرائے لکھنؤ میں روحانیت کا فقدان تھا اور خارجی اوصاف و لوازم کا ذکر اس کثرت سے ہوتا تھا کہ تغزل کا لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔

(۵) رعایت لفظی کے ساتھ ابتذال لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو گیا تھا۔

ہر چند رعایت لفظی و ایہام کی شاعری اہل دہلی نے بھی کی ہے یہاں تک کہ میرؔ، مومنؔ و غالبؔ کا کلام بھی اس سے خالی نہیں اور ابتذال و سخافت کے اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن ان سب کا عمومی رنگ جذبات نگاری تھا حتیٰ کہ شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کا کلام بھی جو دہلی کے دو بڑے زبردست غیر حقیقی شاعر تھے اس سے خالی نظر نہیں آتا۔

غزل مولانا نیازؔ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

> "شاعری کے تمام اصناف میں غزل گوئی جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے، اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل فارتقا تصوف ہے مگر تصوف سے مراد وہ علوئے فطرت، وہ عروج روحانیت اور وہ استعلاء تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گزر کر اپنے مرکز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات و بنیادی کہ جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل میں بھی جو منزل لب بام پیدا کرتی ہے،

شاہدِ اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے اور دنیاوی زیروبم میں بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر دم اسکو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلافِ استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھتا اور بہت کم ایسے ہیں جو بیدلؔ کے مرتبہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوں لیکن ایک فطری، وہبی شاعر خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل میں کیوں نہ ہو اس سوز و گداز، اُس درد و تاثیر، اُس عذوبتِ بیان، اُس حلاوتِ زبان و اُس حقیقت و صداقت سے معرا نہیں ہو سکتا، جو صرف فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی"

اس سلسلہ میں مولانا نیازؔ نے بھی لکھنؤ کی شاعری پر وہی اعتراضات کئے ہیں جو صاحب شعرالہند نے قایم کئے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ لکھنؤ کی شاعری کا دورِ اول جس نے پست احول، اخلاقی فرومایگی اور ذہنی تنگ نظری میں آنکھیں کھولی تھیں وہ بقول نیازؔ صاحب یقیناً صرف ناسخ و ذوق ہی پیدا کر سکتا تھا جن کی شاعری الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی۔ بے معنی صنایع اور اسی قسم کی بہت سی سطحی اور غیر سنجیدہ خصوصیات کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ دورِ ثانی میں اسیرؔ، امیرؔ، جلالؔ، منیرؔ، محسنؔ تسلیمؔ وغیرہ ایسے شاعر ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے اس رنگ کو ترک کر کے ایک اور کیفیت غزل میں پیدا کر دی جس میں دہلی کے جذبات کی سادگی اور لکھنؤ کی رنگینی دونوں کا امتزاج تھا۔

ریختی غزل کی ایک بگڑی ہوئی شکل ریختی کہلاتی ہے اور سعادت یار خاں رنگینؔ اس صنف کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں، لیکن مرزا قادر بخش صابرؔ اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ:۔

"یہ ادعائے محض ہے اسواسطے کہ انشاؔ سے بہت پہلے ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور تھیں"

تذکرۂ گلستانِ سخن میں ہے کہ:۔

"زبانِ اُردو میں اول ریختی کا رواج انشا اللہ خاں انشاؔ نے دیا۔ اور اس کے بعد سعادت یار خاں رنگینؔ نے خواہ اس سبب سے کہ اُن کی طبیعت کو خود اس صنف کلام کی طرف التفات تھا خواہ انشا اللہ خاں کے اثر صحبت سے اس نظم میں ایسی زبان آوری کی کہ گویا اس کو اپنا شعار کر لیا، اب اس عرصہ میں یار علی جان نے کمال جانکاہی کی اور اس نظم کی مشق حدِ کمال تک پہونچائی"

تذکرہ مہرِ جہانتاب میں بھی انشاؔ کو ریختی کا موجد تسلیم کیا گیا ہے اور رنگینؔ کو صرف شریکِ مشورہ قرار دیا ہے۔

صاحب شعرالہند نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ صنف اس قدر غیر مہذب الفاظ و مضامین کا مجموعہ ہے کہ اس دورِ تہذیب و شائستگی میں ان کے دو چار شعر کے

نقل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے"

گو میں اس سے متفق نہیں ہوں، کیونکہ بہت سے شعرا ایسے نکل سکتے ہیں جن کو یقیناً پیش کیا جا سکتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ جس حد تک عورتوں کی زبان، اور اُن کے مراسم وغیرہ کا تعلق ہے ریختی کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس صنف سخن میں انشا، رنگین اور جان صاحب بہت مشہور ہوئے ہیں۔

واسوخت: ایرانی شعراء کے دور متاخرین میں جب معاملہ بندی نے ترقی کی اور ان کے ادا کرنے کے لئے غزل کا دامن تنگ نظر آنے لگا تو وحشی یزدی نے واسوخت کو ایجاد کیا۔ اردو میں سودا نے سب سے پہلے اس کے اتباع میں واسوخت لکھی جس کی ہر ٹیپ فارسی زبان میں تھی۔ تذکرہ گلدستہ نازنینان میں جرأت کی واسوخت بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ متوسطین کے دور میں آتش نے بھی واسوخت لکھی اور اُس کے بعد شعراے لکھنؤ نے اس کو ایک خوب تر ین موضوع بنا لیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا۔ منشی امیر احمد نے دو واسوخت لکھی جو مینائے سخن کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ لیکن امانت نے اس صنف خاص میں بہت شہرت پائی اور مرثیوں سے کچھ عناصر علیحدہ کرکے واسوخت میں شامل کر لئے چنانچہ پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ:۔

"سب سے پہلے ضمیر نے مرثیہ میں سراپا لکھا اور دبیر، انیس اور دیگر شاعروں نے واسوخت میں سکو داخل کیا"

تذکرۂ شعر الہند میں امانت کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

"امانت کی واسوخت میں اور بھی چند باتیں ایسی جمع ہو گئیں جو اُس زمانہ میں نہایت مقبول تھیں اور اسی لئے وہ تمام واسوختوں میں بہت مشہور ہو گئی۔"

تذکرۂ مہر جہاں تاب میں امانت کے حالات میں لکھا ہے:

"این واسوخت کہ حالا شہرتے تمام دارد اگر راست پرسی در رعایات النفظ و دیگر صنایع بے نظیر افتادہ و بلطف سخن و چستی بندش بے سہیم"

اب اردو میں یہ صنف سخن مقبول نہیں ہے۔ لیکن بعض قدامت پرست البتہ تبرکاً تیمناً کبھی کبھی واسوخت کہہ لیا کرتے ہیں۔

قصیدہ: قصیدہ گوئی کی اصلی ترقی قدماء کے دوسرے دور میں ہوئی اور سودا نے اس صنف میں سب سے زیادہ شہرت اور ناموری حاصل کی۔ شعر الہند میں سودا کی قصیدہ نگاری کے متعلق حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:۔ سودا نے جہاں تک ممکن ہوا ہے قصیدے کی متانت و پختگی، الفاظ کی شان و شوکت، اور مضمون آفرینی پر پورا زور طبع صرف کیا ہے۔ اس نے مشکل لیکن دل آویز ردیفیں اختیار کی ہیں اور ان کو نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ قصائد میں بہاریہ تمہید ایک عام چیز ہے لیکن سودا نے جدید تمہید یں لکھی ہیں اور نہایت پُر لطف طریقہ سے گریز کیا ہے اور قصاید کو صرف حمد و نعت و مدح و ستائش ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ بعض قصاید میں

واقعہ نگاری بھی کی ہے اور ہر درجے کے لوگوں کے مشاغل اُن کے کاروبار اور اُن کے پیشے کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اُس سے اجمالاً اُس دور کی تمدنی اور اقتصادی حالت معلوم ہوسکتی ہے" لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سودا نے بعض جگہ ابتذال و فحاشی سے بھی کام لیا ہے۔ انشاء نے بھی قصاید لکھے ہیں لیکن شیفتہ ان کے متعلق یہ عام فیصلہ کر چکے ہیں کہ:-

"ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرا نہ گفتہ"

لکھنوی شعراء میں قصیدہ نگاری کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی ناسخ و آتش نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، آخیر میں محسن کاکوروی نے نعت کے بعض نہایت زوردار قصاید لکھے، متاخرین میں منیر، آمیر، جلال نے قصاید لکھے ہیں لیکن کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے۔

مرثیہ | مرثیہ کے لفظی معنی وصف میت کے ہیں اور اصطلاح شاعری میں مرثیہ اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شخص متوفی کے محاسن و فضایل درد و حسرت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے، یادگار انیس کے مصنف نے مرثیہ پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:-

"درد و غم کا جذبہ تمام جذبات انسانی سے قوی تر ہے اور حسرت و مصیبت کی کہانی عیش و شادمانی کی داستان سے زیادہ بااثر اور آنسوؤں کے تار یا گجرے کی لڑیوں سے زیادہ دلکش ہے، رنج و آلام سے متاثر ہونا فطرت انسانی کا خاصہ ہے اس لئے مرثیہ کا اثر قصیدہ اور منقبت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے ہر ایک مصرع دل پر نشتر چلاتا ہے اور ہر ایک شعر آہ و زاری کا مینھ برساتا ہے، یوں تو مرثیہ ہر مصیبت اور تباہی میں کہا جاسکتا ہے، لیکن ہمارے ملک میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر حضرت حسین اور اُن کے رفقا کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔

عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا ایام جاہلیت میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا عبد المطلب اور بعض دیگر ناموروں کے مرثیے عربی ادبیات میں اس وقت تک محفوظ ہیں اور حماسہ میں ایک مستقل فصل باب المراثی کے عنوان سے موجود ہے آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو زوال نہیں ہوا۔ حسان بن ثابت نے شہنشاہ کونین کی وفات پر ایسے مرثیے لکھے کہ اُس کا ہر ہر شعر تصویر سوز و گداز ہے، حضرت فاطمہ زہرا نے بھی اس سانحہ پر ایک دردناک مرثیہ کہا۔ خلیفہ دوم جناب فاروق اعظم نے بھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہلوایا لیکن افسوس ہے کہ محمد کے نواسہ پر آنسو بہانے کی کسی میں ہمت نہ تھی اور کربلا کے حشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا تصنیف نہیں ہوا جو زندہ رہتا خاندان امیہ کے جور و ستم نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں فرزدق نے ایک قصیدہ حضرت سجاد کی شان میں لکھا تھا، لیکن شاعر کو اس کے صلہ میں قید خانہ سے واسطہ پڑا اسی جباری کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعۂ کربلا نظم کرنے کی جرات نہیں کی خاندان عباسیہ کے زرین عہد میں متفرق اشعار چند غیر مشہور شعرا نے واقعۂ کربلا کے متعلق ضرور کہے لیکن ادبیات میں کوئی نقش قائم نہ کر سکے۔

ایران کی مقدس سرزمین نے خاندانِ رسالت کی غلامی کا حق ضرور ادا کیا اور جب اس ملک کو خود مختاری نصیب ہوئی اور شاہ طہماسپ صفوی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شعرا کو ائمۂ اہلبیت کی شان میں طبع آزمائی کرنا چاہیے لیکن قدرت نے یہ شرف محتشم کاشی کے لئے محفوظ رکھا تھا کہ وہ مصائب کربلا پر پہلی مرتبہ دردناک الفاظ میں نوحہ کرے۔ اس نے چند بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی تصویر ہے محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی میں شہرت پائی اور شوکت الفاظ کے زور سے ملا محتشم کے مرثیہ کا جواب دیا انھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات ابتدائے سفر سے اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینہ آنے تک نظم کر دئے۔

پھر تو ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا اور سیکڑوں شاعر مرثیہ کہنے لگے۔

ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ گوئی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ عہد جہانگیری میں اول اول شجاع الدین نوری نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اس کے بعد ہاشم علی برہان پوری نے مرثیے کہے اور ان دونوں کے بعد رام راؤ سیوا اور کاظم علی نے اس صنف میں شہرت حاصل کی ہاشم و کاظم کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ میرزا نامی ایک پاک طینت بزرگ تھے جو صرف مرثیہ کہتے تھے۔

گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ شعر و سخن کے فریفتہ تھے اور ان کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں ایک مرثیہ گو شاعر تھے جن کے اشعار ہاتھوں ہاتھ شمالی ہند میں پہنچے اور وہاں مجالس عزا میں پڑھے جاتے۔ جب زمانے نے گولکنڈہ کا ورق اُلٹ دیا تو ولی کو عروج ہوا اور اس نے بھی شہدائے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھ کر مرثیہ گوئی کا حق ادا کیا۔ ولی کی پیرانہ سالی میں سودا و میر کا عنفوان شباب تھا۔ محبان اہلبیت کو رلانے اور مجالس ماتم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مرثیہ گوئی کی ضرورت تھی چنانچہ ہر طبقہ کے شعرا توشۂ آخرت فراہم کرنے کے لئے نعت و منقبت کہتے اور ان میں سے بیشتر مرثیے بھی تصنیف کرتے تھے سودا اور میر کے عروج سے پہلے مرثیہ کا خوب رواج ہو چکا تھا اُس وقت کے مشہور مرثیہ گو میاں مسکین کا سودا نے اپنے شہر آشوب میں تذکرہ کیا ہے۔ میر تقی میر نے بھی مرثیہ کہا لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ اس شہنشاہ سخن کے دیوان میں شامل کیا جاتا۔ مرثیہ اول اول صرف چار مصرعوں کا ہوتا تھا اور ٹیپ کا بند نہ ہوتا تھا لیکن بعد کو اسنے مسدس کی صورت اختیار کی۔ مسدس کی ابتدا کس نے کی اسکے متعلق اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ سب سے پہلے حیدری کاکوروی نے لکھا جو احمد شاہ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔[1]

---

[1] ان کا یہ بند بہت مشہور ہے:۔

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے　　شب رخصت ہے بہنوں سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے　　سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منھ اسکا چومتی ہے اور یہی کہہ کہکے روتی ہے　　ارے اللہ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

اور بعض میاں سکندر کا نام لیتے ہیں جو مرزا کے معاصرین میں تھے۔ اور بہ تلاش معاش پنجاب سے لکھنؤ آکر یہیں تکیہ بے نوا شاہ میں رہ پڑے تھے۔ ان کا ایک نہایت دردناک مرثیہ آج تک گداگروں کی زبان پر رائج ہے اور شاید کسی جگہ مجلس میں بھی پڑھا جاتا ہو اس مرثیہ کے سال تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن چونکہ میاں سکندر سودا کے ہمعصر تھے اس لئے قیاس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا سنہ تالیف ۱۱۹۵ھ سے پہلے رہا ہوگا۔ دریائے لطافت میں انشاؔ نے لکھا ہے کہ :- بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت تک مرثیہ خوانی کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے مگر سلطنت کا مذہب شیعہ تھا امرا و اعیان ریاست اسی مذہب کے حلقہ بگوش تھے، عشق اہلِ بیت لکھنؤ کی خاک میں سرایت کر گیا تھا، مجالس عزا دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔ اہلِ ایمان آرزو کرتے تھے کہ اُن کی مذہبی مجلسوں میں مشاعروں سے زیادہ رونق پیدا ہو اور مرثیوں میں درد انگیز واقعات ظاہر کئے جائیں، اس لئے اہلِ کرم کی داد و دہش نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور چند ہی روز میں ایک کامل پیدا ہوا جس نے عاشقانہ شاعری سے دست بردار ہوکر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کی۔ یہ بزرگ مرزا دبیر کے اُستاد میر ضمیر تھے۔ بعد کو میاں دلگیر، میر فصیح اور میر خلیق نے بھی اسی صنف میں کمال حاصل کیا اور بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں یہ فن اس قدر ترقی کر گیا کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے فسانۂ عجائب میں اہل لکھنؤ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیہ گویوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور ان تمام مرثیہ گویوں کے نام گنائے ہیں جو اُسوقت موجود تھے یا اس سے پہلے اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد تک دلگیر، ضمیر، خلیق ہم پایہ سمجھے جاتے تھے اور مرثیہ گویوں کی زیادہ تر صرف بین پر تھی۔ مراثی کے بند ۱۲ سے لیکر ۳۵ یا ۵۰ تک ہوتے تھے اور بیشتر مرثیے سوز خواں ہی پڑھتے تھے۔ میر ضمیر نے روایات نظم کرنا شروع کیں تو مراثی ۵۰ بندوں سے بڑھکر ۷۰ یا ۸۰ کے ہونے لگے رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز ہوگئی۔ اور جب میر ضمیر نے رزم و سراپا کو بھی مراثی میں داخل کیا تو پھر اس کی طوالت کی کوئی حد نہ رہی۔ جس طرح قصیدہ تشبیب، گریز، مدح، دعا اور عرض حال پر مشتمل ہوتا تھا، اسی طرح مراثی میں چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور دعا لازمی قرار پائے۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں جو جدتیں کیں وہ یہ ہیں :-

(۱) رزمیہ لکھا (۲) سراپا شامل کیا (۳) اسپ اور اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھے (۴) صفائی بندش پر توجہ کی (۵) غلط الفاظ جو مراثی میں بے تکلف مستعمل تھے ترک کئے اور (۶) تحت لفظ پڑھنے کا رواج دیا۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو درد انگیز خیالات کے ساتھ ترکیب دیکر صرف اہل مجلس کو رُلانا تھا وہ اس کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے میر ضمیر کی تقلید اپنے کمالات میں موجب افزائش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور صرف درد و تاثیر کی نعمت سے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ فصیح نے البتہ رزم کو مراثی میں شامل کیا مگر وہ تھوڑے عرصہ

کے بعد عتبات کی زیارت کو تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی لیکن مشقِ سخن وہاں بھی جاری تھی اور ایک پُرزور سلام نجف سے بھیجا جو لکھنؤ میں بہت مقبول ہوا اس کا پہلا شعر یہ ہے :۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے ‌ ‌ ‌ سر اپنا کعبہ کے سنگِ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہے

میر ضمیر کے نامور شاگرد مرزا دبیر مرثیہ گوئی کی مشق کر رہے تھے۔ انھوں نے اُستاد کی پیروی میں حضرت علی اکبر کے حال کا مرثیہ طرزِ جدید میں لکھ کر سُنایا۔ خواجہ آتش بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ جب گھوڑے کی تعریف مرزا صاحب نے پڑھی تو خواجہ آتش نے پکار کر فرمایا :۔

"بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے کون کہتا ہے تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو، تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا"

اسی وقت میر خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر ببر علی انیس نے فیض آباد سے آ کر لکھنؤ میں مجلس پڑھی اور رزم و بزم کی وہ چلتی پھرتی تصویریں دکھائیں کہ آفریں کی صدا ہر گوشہ سے بلند ہونے لگی انھوں نے طرزِ مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسنِ کلام میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کو باہم ملا کر نئی صورت سے پیش کیا، اور آخر کار سب کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں۔

میر ضمیر جانِ عالم کے عہد تک زندہ تھے اور کہا جاتا ہے کہ دورِ آخر میں انھوں نے ایک بے نظیر مرثیہ ۱۸۰۰ بند کا لکھا تھا جو اگر شائع ہوتا تو دبیر و انیس دونوں کے چراغ گُل ہو جاتے۔ مگر غالباً یہ افسانہ ہی افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کا حریف اس صنفِ سخن میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف مرزا دبیر کی ذات ہے۔ ان دونوں باکمالوں کے نقشِ قدم پر چلنے والے سیکڑوں پیدا ہوئے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہے اُن کے بھائی، بیٹے بھی گوئے سبقت نہ لیجا سکے۔ خاندانِ انیس میں سے مونس و نفیس اور خاندانِ دبیر میں سے مرزا اوج نے بہت زور مارا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ کوئی ترقی نہ کر سکے۔

رہا یہ امر کہ ان دونوں میں صدر نشینِ فضیلت کون تھا۔ یہ مسئلہ اسوقت تک زیرِ بحث چلا آ رہا ہے، لیکن نقادانِ فن سے پوشیدہ نہیں کہ دونوں اصحاب کی روش جداگانہ ہے اگر میر انیس کے کلام میں فصاحت و شیرینی موجود ہے تو ملاحت مرزا دبیر کے کلام کا حصہ ہے، شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ہاں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انیس کی سادگی و تاثیر عرصہ تک باقی رہیگی اور دبیر کی شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی جلد فنا ہو جائیگی۔ دبیر کے صنایع و بدایع سمجھنے والے ہندوستان میں اُنگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں اور اگر انحطاط کا یہی دور رہا تو وہ دن دور نہیں جب صنایع و بدایع سے لطف اندوز ہونے والا جستجو سے بھی دستیاب نہ ہوسیگا۔ لیکن انیس کی سادہ زبان و محاورہ بندی ہر قوم کی چیز ہے اور اُردو زبان جب تک زندہ رہیگی انیس کا کلام سمجھا جائے گا۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے :۔

اردو کو رواج چار سو تیرا ہے | شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے | تو لکھنؤ کی ہے اور لکھنؤ تیرا ہے

میر انیس نے صنایع لفظی پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ مراعات النظیر کی مثالیں البتہ ان کے کلام میں بعض جگہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کو وہ عیب سمجھتے تھے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کیا کروں لکھنؤ میں رہتا ہوں"

طبقۂ متوسطین کے اساتذہ متاخرین میں امیر، جلال، امیر، تسلیم نے اس صنف سخن کی طرف متعلق توجہ نہیں کی۔ دور حاضر کے مشہور نقاد مولانا نیاز نے اپنے مخصوص رنگ میں بے نظیر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:-

"لکھنؤ میں جس بری طرح تغزل کی مٹی پلید ہوئی، وہ ناقابل عفو حد تک عفونت و گندگی سے برتر ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہیں یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اس نے انیس و دبیر کو یہاں پیدا کر دیا"

سلام | تذکرہ بہارستان سخن میں ہے کہ:-

"عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہیں، مگر ان کے مضامین کے تقاضے ایک دوسرے سے علحدہ انداز لکھتے ہیں فارسی میں سہرا، اس واسطے نہیں ہوتا کہ اس ملک میں دولہا یا دولھن سہرا نہیں باندھتے، سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ ضرور لاتے ہیں مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے سلام کی ترکیب کو باوجود رنگینی کے غزل سے علحدہ ہونا چاہئے۔ سلام گوئی کا لطف یہ ہے کہ باوجود شوخی و رنگینی کے غزل سے جدا نظر آئے۔ عموماً سلام میں واقعۂ کربلا، شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسین و مصائب حضرت خاتون جنت، علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی مسایل بھی منظوم کئے جاتے ہیں۔ میر ضمیر، میاں دلگیر، میر انیس و میر مونس اور مرزا دبیر کے سلام اردو زبان میں بہت مشہور ہیں۔

نوحہ اسلام کی ایک قسم ہے جس میں بین کیا جاتا ہے، آج کل یہ صنف مقبول نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت سی خواتین کا محبوب مشغلہ ہے اور آج کل بھی لکھنؤ کی خواتین اس طرف توجہ کرتی ہیں چنانچہ محترمی مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کی صاحبزادیاں اس فن میں بہت مہارت رکھتی ہیں[۱]

---

[۱] جناب اثر کی تین صاحبزادیاں ہیں - ایک قمر جہاں بیگم قمر دوسری بلقیس جہاں بیگم عصمت، تیسری انور جہاں بیگم انور - ان کے نوحوں اور سلاموں کا نمونہ یہ ہے:- قمر جہاں بیگم قمر

رحم کچھ حال پہ معصوم کے کھایا نہ گیا | تھوڑا پانی علی اصغر کو پلایا نہ گیا
جان دیدی غم شبیر میں روتے روتے | باپ کا داغ سکینہ سے اٹھایا نہ گیا

علیگڈھ میں بھی یہ فن بہت مقبول ہے اور ہر سال ۱۰-۱۲ نوحے لکھے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہوتے ہیں گو اُس کا مقصود محض تفنن طبع ہوا کرتا ہے۔

---

*

پھونک دی قالب اسلام میں شبیر نے روح — مٹ کے وہ نقش بٹھایا کہ اُٹھایا نہ گیا
باپ کی تاب و تواں ساتھ گئی بیٹے کے — لاشہ اکبر کا شہِ دیں سے اُٹھایا نہ گیا
ہاتھ رسّی سے تھے بندھے بال تھے چھوٹے چھوٹے — چہرہ بلوے میں سکینہ سے چھپایا نہ گیا
ہائے وہ خشک گلا کُند چُھری سے جو کٹا — ہائے وہ سر جو کبھی تن سے ملایا نہ گیا
اے قمر کوئی بھی بانو کا نہ ارماں نکلا — دودھ تک اصغر ناداں کا بڑھایا نہ گیا

بلقیس جہاں بیگم عصمت:-

شاہ دیں ہاتھوں سے تھامے دل ناکام آئے — جب سوئے نعش علی اکبر گلفام آئے
مسکراتے ہوئے جنت کو سدھارے تم تو — کس طرح اے مرے دلبر مجھے آرام آئے
بانو کہتی تھیں نہ نیند آئیگی تنہائی میں — پاس اصغر ترے کس طرح یہ ناکام آئے
ختم شبیر پہ ہے شیوۂ تسلیم و رضا — دل کو آرام نہ آئے اگر آرام آئے
رہ گئے یکہ و تنہا شہ بیکس رن میں — ظہر تک سب رفقائے شہ دیں کام آئے
کہتے تھے شوق شہادت میں شہ تشنہ گلو — دن ڈھلے جلد کہیں عصر کا ہنگام آئے
دربدر یوں ہوئے تشہیر حرم بعد حسین — کبھی کوفے گئے سر ننگے کبھی شام آئے
باپ کے سینے پہ سونے کی جسے عادت ہو — آہ کس طرح اُسے خاک پہ آرام آئے
تشنگی پر شہ مظلوم کی رو دنا عصمت — سامنے آنکھوں کے پانی کا اگر جام آئے

انور جہاں بیگم - انور:-

حوصلہ اے چشم گریاں رہ گیا — ماتم سرور کا ارماں رہ گیا
جسنے دیکھی حُسن اکبر کی بہار — صورت آئینہ حیراں رہ گیا
بارک اللہ اے شہ گلگوں قبا — مٹ چکا تھا نقش ایماں، رہ گیا
سہرا اکبر کا نہ دیکھا جیتے جی — دل میں بانو کے یہ ارماں رہ گیا
جس کا جی چاہے وہ لوٹے یا ستاسے — قافلے کا بے سر و ساماں رہ گیا
آج تک کہتا ہے اُٹھ اُٹھ کے غبار — بے کفن شاہ شہیداں رہ گیا
تیر جب اصغر کی گردن پر لگا — ایک ہچکی لے کے ناداں رہ گیا
بیکسی میں کوئی تو ہمدرد ہو — سینۂ سرور میں پیکاں رہ گیا
ہند انور ہم چلے آئے مگر — کربلا میں قلب نالاں رہ گیا

ہرسیہ | ہرسیہ ایک بے معنی لفظ ہے مگر ایک واقف کار کا خیال ہے کہ یہ "ہرسہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور غالباً ہرسہ سے مطلب خلفائے راشدین کی ظرافت آمیز ہجو ہے۔ مرثیہ کا مضمون پر عظمت تھا اگر ظرافت شامل نہ کی جاتی تو مجلس ماتم بزم طرب بن جاتی ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھنؤ کے زندہ دل حضرات نے یہ صورت نکالی کہ آٹھویں ربیع الاول کو عزاداری سے فراغت کرکے جشن عید منعقد کرتے تھے اور قاتلان حسین کے انجام پر خوشیاں مناتے تھے۔ اس عید میں میر ضمیر نے سب سے پہلے ہرسیہ پڑھا۔ مرزا دبیر اور میر انیس نے بھی تقلید کی میاں مشیر نے سارا زور اس پر صرف کر دیا اور مختلف قوموں اور اہل پیشہ کی اصطلاحوں کو کثرت سے نظم کرکے اردو شاعری کو ظرافت و شوخی کے انمول خزانہ سے مالا مال کر دیا۔ اب یہ صنف مفقود ہے اور کوئی استاد فن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

قطعہ | قصیدہ اور قطعہ میں بہت کم فرق ہے یعنی یہ کہ قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا اور اشعار کی تعداد چار سے کم نہیں ہوتی برخلاف اس کے قصیدہ میں مطلعوں کی تعداد مقرر نہیں اور طوالت میں وہ جتنا بھی بڑھ جائے کم ہے۔ قطعہ نگاری میں یہ ضروری ہے کہ شاعر کا کلام تغزل کا رنگ پیدا نہ کرے سوائے اس صورت کے کہ قطعہ بند اشعار خود کسی غزل کا حصہ ہوں چونکہ قطعہ نگاری تملق و درباری خوشامد کے لئے خاص موزوں نہیں تھی اس لئے اس صنعت میں جن شعراء نے کوششیں کی ہیں وہ ہر آئینہ کامیاب ہوئی ہیں فارسی میں سعدی۔ ابن یمین۔ نظامی۔ فردوسی۔ سنائی۔ خسرو۔ غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں۔ مگر غالب کے قطعات میں مداحی پائی جاتی ہے اردو شعراء میں قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ ہوئی۔ صادق علی خاں اختر، ذوق، ظفر، غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں۔ دور حاضر میں اس طرف توجہ نہیں ہے، فی الحال لکھنؤ میں عزیز اچھے قطعات لکھتے ہیں۔

منظوم افسانے | اردو زبان میں منظوم افسانے بالعموم مثنوی ہیں۔ اس کے لئے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی۔ مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شعر کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہر طرح کے مضامین اس میں گنجایش پا سکتے ہیں۔ تذکرہ بہار سخن میں ہے کہ:۔

"مثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسب مراد انجام پا سکتی ہے جس کو امور مذہبی اور معاملات خارجی کو موزوں کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہو وہ شاعر جو صرف امور مذہبی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالۂ قلم کر سکتا ہے مثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا مثنوی نگاری کے لئے شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے، اسے معاملات عالم سے پورے طور پر باخبر ہونا چاہئے اس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا درکار ہے اگر بندش مضامین میں سے اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے تو اس کی مثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکیگی۔ اردو میں سب سے پہلے میر نے منظوم افسانے لکھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے گو میر کی مثنویات میں خارجی مضامین کا فقدان ہے لیکن روحانی اور قلبی معاملات سے مملو ہیں

اُردو زبان میں مثنوی کی ابتدا مذہبی حیثیت سے ہوئی، قطب شاہ نے بھی ایک نعتیہ مثنوی لکھی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخطوطات میں محفوظ ہے۔ تمیمی نے بھی قطب شاہ کی بیوی خدیجہ خاتون کی فرمائش سے نماز نامہ مرتب کیا، اس کے بعد نصرتی نے گلشن عشق کے نام سے ایک مثنوی لکھی اور دوسری علی نامہ کے نام سے۔ اس کے بعد خواجہ محمود بحری نے ایک صوفیانہ مثنوی من لگن لکھی چنانچہ صاحب تاریخ شعرائے اُردو کہتے ہیں کہ:-

"افضل الدین خاں افضل، دکن کے متقدمین شعراء میں سے ہیں دکنی زبان میں ایک راجہ کے بیان میں ایک مثنوی لکھی زبان مغلق ہے"

شاہ مبارک نے بھی ایک مثنوی لکھی اور حیدر بخش حیدری نے اُردو میں شاہنامہ لکھا اور نظامی کی ہفت پیکر کا اُردو ترجمہ کیا اور دکنی زبان میں بہرام و گل اندام کو بھی نظم کیا۔

ایک شخص ساقی نامی نے بھی شاہ نامہ نظم کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد سودا اور آسخ نے کثرت سے مختصر مثنویاں لکھیں لیکن میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جعفر علی خاں زکی نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ انشا و جرأت نے اس طرف توجہ نہ کی البتہ مصحفی نے بحر المحبت مثنوی لکھی جو اب شائع ہو گئی ہے۔ صاحب شعر الہند نے خوب لکھا ہے کہ:-

جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو ڈوبتے ڈوبتے طلوع آفتاب کا مژدہ سنا جاتے ہیں اس اصول کے مطابق اس دور میں مثنویوں کی بھرمار تو کم ہو گئی لیکن میر حسن نے مثنوی بدر منیر لکھ کر مصحفی۔ انشا۔ جرأت سب کا کفارہ ادا کر دیا۔

اساتذۂ متوسطین میں ناسخ و آتش نے مثنوی کی طرف مطلقاً توجہ نہ کی البتہ شاگرد آتش پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم لکھ کر میر حسن کی طرح اس دور کے تمام شعرا کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ متاخرین میں قلق کی طلسم الفت کو شہرت ہوئی اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے تو قیامت ہی کر دی۔

اودھ کو گلزار نسیم اور طلسم الفت پر ناز ہے اور میر حسن کی بدر منیر کو یہاں کے لوگوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا میر حسن کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہزارہا اشیا کا منظر کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں دکھایا ہے لیکن کہیں فطری مصوری سے متجاوز نہیں ہوئے۔ گلزار نسیم کی بنیاد تخیل، رعایت لفظی تشبیہ استعارہ پر رکھی گئی ہے اس لئے فطری مناظر پیش نہیں کر سکتی البتہ طرز ادا نہایت شستہ، رواں اور صاف ہے۔

مثنوی طلسم الفت، گلزار نسیم و بدر منیر دونوں کا مجموعہ ہے۔ رعایت لفظی تشبیہ اور استعارہ کا التزام ہر جگہ موجود ہے اور بدر منیر کی طرح مناظر بھی تفصیل سے دکھائے گئے ہیں لیکن فطری کیفیت کہیں نہیں ہے۔ افسانے میں بھی تناسب نہیں ہے

اس کے بعد نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا دور آتا ہے۔ ان میں یقیناً ابتذال کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اگر مبتذل شعر نکال دیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بدر منیر و گلزار نسیم یا طلسم الفت کے ساتھ ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر بھی قابل ذکر ہے کیونکہ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی اس میں نظم کی ہے اور ان کے اخلاقی جرات کی داد نہ دینا یقیناً ظلم ہے۔ محسن نے بھی نعتیہ مثنوی چراغ کعبہ لکھی جو درد و تاثیر کے کیف سے مالامال ہے۔

مذہبی شاعری | صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ ولی کے عہد سے پہلے شعراء نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ حمد، مناجات اور مناقب پر مشتمل تھا۔ لیکن بعد کو یہ سلسلہ جاری رہا اور سودا اور میر نے نعت و منقبت میں متعدد قصائد لکھے۔ انشاء نے بھی زور طبع صرف کیا۔ شعر الہند میں ہے کہ اس عہد کے ایک باکمال بزرگ حضرت شاہ غلام محی الدین اویسی نے قرآن مجید کی تفسیر منظوم کی۔ البتہ دور وسطیٰ میں ناسخ و آتش نے صرف غزل کو جولانگاہ بنایا۔ اس دور کی شاعری میں دو اسکول نظر آتے ہیں حنفی۔ شیعی۔ حنفی اسکول نے خلفائے راشدین کی شان میں بھی قصائد لکھے لیکن شیعی اسکول میں مناقب اہل بیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مولوی غلام امام شہید جو امیٹھی مضافات لکھنؤ کے باشندہ تھے انھوں نے اس دور میں مذہبی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور غزل، مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند غرضکہ جملہ اصناف شاعری میں نعت گوئی کو وسیلۂ نجات تصور کیا اور شاعرانہ رنگ کی آمیزش اور تشبیہات و استعارات سے نعت گوئی کو مقبول بنایا۔ علاوہ ان کے اسی دور میں لطف علی لطف نے بھی نعت گوئی کی اور جو کچھ لکھا مدح رسول میں لکھا، گو وہ غلام امام شہید کا زور و اثر اپنے کلام میں پیدا نہ کر سکے تاہم جوش مذہبی سے اُن کا کلام خالی نہیں ہے۔ اسی زمانہ میں شہیدی نے نعت میں خوب خوب لکھا اور حق یہ ہے کہ کیفیت و تاثر کے لحاظ سے اُن کی نعت کوئی خاص مرتبہ کی چیز تھی۔

دور آخر میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور صرف محسن نے اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی مضامین کی بلندی الفاظ کا شکوہ بندش کی چستی اُن کا خاصہ نہیں تھا۔ اور رعایت لفظی کا بھی وہ خاص طور پر التزام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں کیف و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کا تعلق وجدان سے ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ قصاید لکھے۔ مثنویاں لکھیں اور استعارات کی جدت تشبیہات کی لطافت بندش کی چستی کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جہاں صفائی و سادگی سے کام لیا ہے وہاں بھی وہی کیف و قار کا عالم ہے۔

صوفیانہ شاعری | سب سے پہلے جو کتاب تصوف کی نظم میں لکھی گئی وہ من لگن تھی جو خواجہ محمود بحری کی تصنیف ہے اسکے بعد صوفیانہ شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ خواجہ حسن حسن نے مسئلہ وحدت الوجود کو اُردو میں نظم کیا اور کلیم نے فصوص الحکم کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا۔ میر فضل علی دانا نے ترک دنیا کر کے صوفیانہ شاعری کو اختیار کیا۔ تذکرہ میر حسن سے پتہ چلتا ہے کہ

شیخ فرحت نے بھی کچھ اشعار صوفیانہ رنگ کے کہے۔ خواجہ میر درد نے اس صنف خاص کو اپنا لیا۔ میر حسن کی مثنوی رموز العارفین حیدرآباد سے شایع ہو گئی ہے جس میں نکات تصوف کو قصص و حکایات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ راسخ نے نورالانظار مثنوی لکھی اور حکایات و تمثیلات سے تصوف و اخلاق کی تعلیم دی۔ اس کے بعد قدما کا تیسرا دور شروع ہوا تو صاحب شعرالہند کے الفاظ میں شاعری فقر و تصوف کی آغوش سے نکل کر امرا و رؤسائے دامن میں پرورش پانے لگی اگرچہ اس دور میں بھی گوشہ نشین مصحفی نے قدماء کی ایک یادگار محفوظ رکھی، تاہم بالعموم صوفیانہ شاعری کی رو رک گئی۔ اور انشا و جرأت کے "خارج از آہنگ" نغمات نے اس کو بالکل پست کر دیا۔

اودھ کے شاعروں میں ناسخ اور تلامذہ ناسخ اس کوچہ سے ناواقف ہی رہے آتش اور ان کے تلامذہ خلیل، رند، صبا کے کلام میں کسی حد تک تصوف کی چاشنی ضرور پائی جاتی ہے لیکن رموز تصوف سے یہ لوگ بھی آشنا نہیں تھے۔ البتہ شاہ تراب علی کاکوروی کا اردو کلیات صوفیانہ شاعری کا اچھا ذخیرہ ہے۔

اخلاقی شاعری | دور دہلی میں ناسخ نے اخلاقی مسائل کے لئے صائب کا تمثیلی رنگ اختیار کیا لیکن یہ تقلیدی طریقہ صرف شاعرانہ زور استدلال ثابت کرنے کا ایک ذریعہ تھا اس لئے یہ لوگ اپنے کلام میں اخلاقی اثر قائم نہ کر سکے۔ آتش اسکول میں قناعت توکل تجرد استغنا کے مضامین البتہ پائے جاتے ہیں لیکن اس کے بعد امیر و جلال نے اس صنف شاعری کو بالکل ہاتھ نہ لگایا۔

ہنگامہ مشرق ۱۸۵۷ء | انتزاع سلطنت کے بعد دلی اور لکھنؤ دونوں ویران ہو گئے ادبی انجمنوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ہزارہا کتب خانے نذر آتش ہو گئے اور جو باقی بچے وہ یا تو نخاس میں آئے اور ردیوں کے مول بکے یا گھروں میں سڑ گل کر تباہ و خراب ہوئے ارباب کمال ایک ایک کر کے اٹھ گئے کچھ رامپور گئے اور کچھ حیدرآباد چلے گئے لیکن یہ جماعت زبان کی امین تھی جہاں گئی اپنی خصوصیات کلام کو ساتھ لیتی گئی کو وہ گھرانے جہاں کی اردو مستند تھی دونوں ختم ہو گئے لیکن اودھ میں ایک بات ضرور باقی رہی کہ مضافات لکھنؤ میں بلگرام، سندیلہ، خیرآباد، کاکوری میں علم و فن کا چرچا باقی رہا اور اس لئے ان قصبات سے جو پس ماندگان لکھنؤ آکر آباد ہوئے وہ اردو کی خدمت پر بہت تندہی سے تیار ہو گئے اور گو لکھنوی وغیر لکھنوی کا فرق ہمیشہ قایم رہا لیکن مضافات اودھ والوں کو ہمیشہ لکھنوی تسلیم کیا گیا۔

اثرات مابعد | ہنگامۂ غدر کے اثرات یہ ہوئے کہ قلوب میں اضمحلال اور طبیعتوں میں افسردگی پیدا ہوتی گئی۔ ایام عیش کے افسانے خواب ہو گئے۔ حکومت و جاہ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ عیش کی داستانیں اور جوانی کے ولولے اور دولت کی ترنگیں سب خاک میں مل گئیں شاعری میں بھی انقلاب ہوا شہر آشوب تصنیف کئے گئے۔ اور وہ طرز شاعری جو نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ جان عالم کے دور میں چمک چکا تھا سرد ہو گیا رعایت لفظی ضلع جگت، استعارہ، تشبیہ سب بھولی بسری کہانیاں ہو گئیں۔

تہذیبِ جدید جب انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان میں کسب معاش کے لئے انگریزی تعلیم ضروری سمجھی گئی تو سرسید نے علیگڈھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی، اودھ میں بھی کیننگ کالج کھولا گیا اور مختلف مدارس ثانوی جاری کئے گئے، آخرکار ایک جماعت جدید تعلیمات سے آراستہ ہوکر ملک میں رونما ہوئی اور یہی ابتدا تھی جدید شاعری کی۔ اودھ میں نئے سرے سے ادبی انجمنیں قائم ہوئیں مشاعرے ہونا شروع ہوئے رسائل نکلے، مطابع کھولے گئے۔ اخبارات کا اجرا ہوا۔ لیکن ان ادبی خدمات کی سرپرستی حکومت سے متعلق نہ تھی بلکہ انفرادی مساعی پر محمول تھی۔ اور مختلف روسا نے ان بدنصیب شعرا کی عزت افزائی کی جو خود اپنی زندگی سے عاجز ہو چکے تھے اور اس سلسلہ میں راجہ نوشاد علی خاں، راجہ امیر حسن خاں اور حامد علی خاں بیرسٹر کے نام خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں

حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اسی دور میں خواجہ الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری (جو اصل میں اُن کے دیوان کا مقدمہ ہے) شایع کیا۔ یہ تنقید بے لاگ تھی اس مقدمہ نے آگ لگا دی اور لکھنوی شاعری پر اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی یہاں تک کہ اُردو شاعری کی طرف سے لوگوں کو تنفر پیدا ہونے لگا۔

یادِ رفتگان لیکن ایک نوجوان طبقہ جو سیاست و شاعری و ادب و مذہب کا بڑا علمبردار تھا سید سجاد حسین کی قیادت میں ادب کی پشت پناہی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بے ضابطہ کلب اودھ پنچ کے دفتر میں قائم کیا جس کے سربرآوردہ اراکین میں مرزا مچھو بیگ عاشق (ستم ظریف) نادر کاکوروی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی محفوظ علی کاکوروی، پنڈت جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد، خان بہادر اکبر حسین اکبر، منشی احمد علی شوق قدوائی، منشی واحد علی ایر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت بشن نراین در کے نام نظر آتے ہیں ان میں بعد کو مولوی نورالحسن نیر مولف نوراللغات منشی امیر احمد علوی، منشی ارتضا علی ثمر اور سید اعجاز حسین علوی اعجاز کا بھی اضافہ ہوا۔ اس طبقہ نے قدیم شاعری کی جانب سے مقدمہ شعر و شاعری کا جواب دینا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم خدمت منشی امیر احمد علوی نے انجام دی یعنی انھوں نے سید فضل الحسن حسرت موہانی کے اصرار سے معترضین کا جواب اُردو شاعری کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اُسی وقت سے اُردو شاعری کے شہ پاروں کی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قدر ہونے لگی اور شکسپیر، بایرن، جانسن، شیلے، ورڈس ورتھ کے ساتھ ساتھ انیس، محسن، امیر، غالب، میر، مصحفی وغیرہ کے ناموں سے بھی کان آشنا ہونے لگے۔

اودھ کے جدید شاعر اسوقت لکھنؤ اسکول کے جدید شعرا میں اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں مثلاً آرزو، صفی، عزیز، اثر، آشفتہ سراج اور ثاقب وغیرہ لیکن اگر دہلی لکھنؤ کے امتیاز کو نظر انداز کرکے تمام ہندوستان کو پیش نظر رکھا جائے تو ملک میں اور بھی بہت سے اچھے شاعر نظر آتے ہیں، لیکن جس حد تک صرف تغزل کا تعلق ہے حسرت موہانی کا جواب نہیں۔

مشیر احمد علوی ناظر بی۔ اے۔ کاکوروی

دہلی کے وہ شعراء جو لکھنؤ یا جوار لکھنؤ کی طرف گئے

اشرف علی فغاں — تقریباً ۱۱۶۸ھ میں دہلی سے اپنے چچا ربیع خاں کے پاس مرشد آباد گئے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد میں ٹھہر گئے (نواب شجاع الدولہ کا ابتدائی زمانہ تھا) لیکن پھر عظیم آباد چلے گئے اور راجہ شتاب رائے کے پاس ساری عمر ختم کر دی۔ ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

قیام الدین قائم — سودا کے ہمعصر تھے، دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی غالباً ۱۱۷۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں (نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی) کے پاس ٹانڈہ چلے گئے اور سو روپیہ مشاہرہ قرار پایا۔ جب نواب محمد یار خاں مرہٹوں کے فتنہ کے زمانہ میں رامپور چلے گئے تو یہ بھی وہیں پہونچ گئے اور ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔

سودا — پہلے فرخ آباد نواب احمد خاں غالب جنگ کے دیوان مہربان خاں رند کے پاس رہے۔ پھر ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد آئے، نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں آخر عمر تک رہے۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

سید محمد میر سوز — تقریباً ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ کر پہلے مہربان خاں رند کے پاس فرخ آباد گئے، اس کے بعد ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد گئے اور جب دوبارہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ پہونچے تو نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہوئے۔ یہیں ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔

میر — ۱۱۹۷ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ لکھنؤ پہونچے۔ ۳۰۰ ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی اور اخیر عمر تک یہیں رہے ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

ضیاء الدین ضیاء۔۔ دہلی کی تباہی کے بعد شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے۔ ٹھیک تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر لکھنؤ آگئے اور چند دن بعد عظیم آباد چلے گئے۔ یہاں شتاب رائے کے بیٹے نے ان کی قدر کی۔ یہیں انکا انتقال ہوا۔ تاریخ وفات نامعلوم ہے۔

میر محمد باقر حزیں۔۔ (شاگرد میرزا مظہر) دہلی چھوڑکر عظیم آباد نواب صولت جنگ کے پاس چلے گئے تھے۔

میر حسن ۔۔۔ عنفوان شباب میں دہلی سے فیض آباد گئے اور نواب سالار جنگ بہادر کی قدر دانی سے مرزا نوازش علیخاں ان کے صاحبزادہ کی صحبت میں رہے۔ سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوا۔

مصحفی ۔۔۔۔ انھوں نے دہلی سنہ ۱۱۹۰ھ کے قریب چھوڑا اور نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے یہاں قائم پہلے سے موجود تھے۔ اس لئے ان کی وساطت سے رسائی ہوگئی۔ چار سال بعد فیض آباد گئے۔ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اور یہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس لئے پھر دہلی چلے گئے اور وہاں سے پھر لکھنؤ آکر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ زمانہ آصف الدولہ کا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔

انشاء ۔۔۔۔ دہلی سے نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے متوسل ہوئے، پھر نواب کے دربار سے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں یہیں انتقال کیا۔

شاہ نصیر ۔۔۔۔ دہلی کے باشندہ تھے۔ اول مرتبہ مصحفی و انشاء کے زمانہ میں لکھنؤ گئے اور پھر ناسخ و آتش کے دور میں، لیکن زیادہ قیام نہیں کیا۔ اور حیدر آباد چلے گئے۔

نسیم ۔۔۔۔ دہلی کے باشندہ تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں یہیں انتقال کیا۔

نظام الدین ممنون۔۔ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن یہ بھی لکھنؤ آئے اور سرکار اودھ نے کافی قدر دانی کی، بعد کو اجمیر کے صدر الصدور ہوگئے

دہلی و لکھنؤ کے مشہور شعراء جو رامپور گئے

قیام الدین قائم ــــ ۱۱۸۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے اور جب نواب رامپور گئے تو یہ بھی وہیں چلے گئے۔

حکیم مومن خاں مومن۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں غدر سے پہلے رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔ مومن کا شعر ہے:۔

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

یہاں سے کب واپس گئے اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا

غالب ــــ غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔

میر حسین تسکین ــــ شاہ نصیر اور مومن کے شاگرد۔ نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے اور وہیں ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا۔

ضامن علی جلال لکھنوی۔ غدر کے بعد رامپور گئے۔ نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا اس کے بعد نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں

بھی وہیں رہے پھر لکھنؤ چلے آئے اور ۱۳۲۷ھ میں یہیں انتقال کیا۔

اسیر لکھنوی ــــ نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے۔ نواب کلب علی خاں کا بھی زمانہ دیکھا۔ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی

امیر اللہ تسلیم ــــ غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے نواب حامد علی خاں کے زمانہ میں انتقال ہوا (۱۳۲۹ھ)

ظہیر دہلوی ــــ ذوق کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کے ارادہ سے دہلی کو چھوڑا لیکن پہونچ گئے رامپور۔ نواب … خاں کا زمانہ تھا۔

امیر مینائی ــــ ۱۲۷۵ھ میں بعہد نواب یوسف علی خاں رامپور گئے۔ جب ۱۲۸۱ھ میں نواب کلب علی خاں تخت نشین

ہوئے تو ان کی بڑی قدر ہوئی۔ نواب کے انتقال پر حیدر آباد گئے اور وہیں ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔

داغ ــــ غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی وہیں

رہے پھر حیدر آباد چلے گئے۔

بحر لکھنوی ــــ یہ بھی نواب کلب علی خاں کے عہد میں رامپور گئے تھے۔

اصلاح زبان
اور
لکھنؤ کی گراں قدر خدمات

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اردو زبان پیدا ہوئی دہلی میں اور پروان چڑھی لکھنؤ میں۔ یہ بات کہ بچپن ہی کس کی گودوں میں پلی ہوش کہاں سنبھالے، اس کا بچپن جوانی سے کہاں بدلا اور آراستہ پیراستہ کن ہاتھوں سے ہوئی اور ترقی کی بلندیوں پر کس کس نے کہاں تک پہنچایا، اس کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں ہے

پیدا ہوئی دلی میں اور پلی دلی میں، پھیلی چمن ہند کے مختلف حصوں میں اور سنواری گئی لکھنؤ میں۔ اس لیے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے دہلی کے بھلے مانسوں کے بیشمار خاندان لکھنؤ آکر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں بس گئے لہٰذا ہندوستان کے کسی شہر کو دہلی والوں سے اس قدر ربط ضبط کا موقع نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں شہروں کی زبان میں ایک نوعی مشابہت ہوگئی اور سوا خاص خاص الفاظ اور محاورات کے، دونوں جگہ کی بات چیت اور لب و لہجہ میں کوئی مابہ الامتیاز تفرقہ باقی نہ رہا

وہ حضرات لکھنوی ہوں یا دہلوی جو اپنے آپ کو زبان اردو کا مالک خیال کرتے ہیں اور ان کو اس پر ناز ہے کہ صرف ہم ہی اردو زبان کے کرشن ہیں اور ہماری ہی زبان کو لوگ اپنی زبان تصور کریں اور ہمارے ہی بولے ہوئے روزمرہ اور محاوروں کا اتباع کریں، ان کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگر وہ ان ہی رنگ رلیوں میں پڑے رہے اور انھوں نے اپنی زبان کی خبر نہ لی اس کے محفوظ رکھنے کے وسیلے بہم نہ پہنچائے اور اس کے الفاظ و محاورات کو بڑی احتیاط اور سمجھ بوجھ سے اکٹھا نہ کیا اور اس کی نظم و نثر کو زمانے کے مزاج کے موافق مرتب نہ کر سکے تو ان کی زبان کا وہ سرمایہ جو ان کے بلے ہندوستان کی دوسری جگہوں کے مقابلے میں مابہ الامتیاز ہے حرف باطل کی طرح اردو کی زندگی لوح سے مٹ جائے گا اور یہی بری بھلی اردو جو عام اخبارات اور نئی نئی تالیفات اور تصنیفات کے ذریعے سے ملک کے کونے کونے میں نشو و نما پا رہی ہے اور جس کو وہاں کے لوگ تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں کچھ زیادہ نہیں دس بیس برس میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح بولی کہلانے کی مستحق ہو جائے گی۔

ناسخ کے قواعد

ناسخ کا مقرر کیا ہوا اصول یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ میں تصرف جائز نہیں سوائے اس حالت کے کہ عوام کے تصرف کی وجہ سے فصحا بھی اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں (اس لیے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال میں عوام کا خیال بھی ضروری ہے) یا فصحا نے خود تصرف کرکے اس قدر رائج کر دیے ہوں کہ وہ روزمرہ بول چال اور محاورے میں آگئے ہوں مثلاً گر فارسی اگر حرف شرط ہے اس کو اگر ہی باندھنا درست ہے چونکہ روزمرہ میں یہ اگر بگڑ کے بصورت گر ہوگیا اس لیے فصحائے فارس نے اس تصرف کو جائز سمجھ لیا لیکن بعض فصحا نے اسی اصول پر کہ خاص و عام کی بول چال میں گر نہیں ہے بلکہ اگر ہی ہے اگر ہی کے لفظ کو بغیر کسی تصرف کے جائز مانا ہے، اسی طرح جن ہندی الفاظ میں اردو فصحا نے تصرف کرکے اس کو اپنا بنا لیا ہے ان کے سوا ہندی لفظوں کا استعمال جائز نہیں مثلاً تمن (طرح) کے معنی میں اور ماس گوشت کے معنی میں، یہی وجہ ہے کہ اس قاعدے نے لکھنؤ اور دہلی کی زبان کو جو بالکل ایک ہی تھی دو مختلف صورتوں میں پیش کیا کیونکہ دلی والوں نے ہندی الفاظ کو جن کی تبدیلی اردو میں موجود ہے استعمال کیا ہے اور لکھنؤ کے فصحا نے اس کے استعمال سے گریز کیا ہے

یہ دور اصلاح اردو کا میر تقی میر تک جاری رہا اور میر کے آخر زمانے میں جب مصحفی اور انشا موجود تھے ناسخ نے اپنے اصلاحی طرز سے غزل گوئی شروع کی، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس جدید انقلاب سے اردو کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوگیا اول اول تو بعض اساتذہ برا بھلا کہنے پر اتر آئے چنانچہ مصحفی کی غزلیں اس کی شاہد ہیں لیکن جب خیال اور توجہ کرنے سے یہ بات دماغ میں آئی کہ یہ اصلاح قاعدے کے مطابق ہوئی ہے اور ناسخ نے اس کی داغ بیل قواعد صرف و نحو پر ڈالی ہے تو وہ بھی متفق ہوگئے

اردو کی پہلی کتاب قواعد

یہ خیال کہ انشا نے سب سے پہلے قواعد صرف و نحو مرتب کیے مجھ کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ انشا نے بہت سے اصلاحات اور صرف و نحو کے قاعدے خود ناسخ سے لیے تھے میرے نزدیک افضلیت کا شرف ناسخ کو ہے نہ انشا کو، اور میری رائے کی تائید صفیر بلگرامی کے جلوۂ خضر سے بھی ہوتی ہے

سب سے پہلی کتاب جو قواعد صرف و نحو میں مرتب ہوئی وہ شاہ حاتم کا مسودہ دیوان زادہ ہے اور صفیر بلگرامی کی بھی یہی رائے ہے کہ بیشک یہی پہلی تحریر ہے جو قواعد اردو کے نام کو حاصل کر سکتی ہے، شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی، بیگانہ کو بگانہ اور دیوانہ کو دوانہ کہنا ترک کر دیا لیکن اس ترک کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ملتا، اسی طرح ان کا بیان یہ بھی ہے کہ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرنا میں نے چھوڑا لیکن ان کے کلام کو دیکھنے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ان کی باتیں ہی باتیں تھیں اور ان کے کلام میں وہ متروک کردہ الفاظ پائے جاتے ہیں

مثلاً خجل کو خجِل ~ دیکھ سرو چمن ترے قد کو ن   خجل ہے پا بگل ہے بے بر ہے

صحن کو صحن ؎ اے حسن کے گلزار بہار چمن دل — گلشن ترے آنے سوں ہوا ہے صحن دل
چھتر کو چھتر ؎ بادشاہوں کو ہے گر تخت و چھتر کا تکیہ — ہے فقیروں کے تئیں پیر کے در کا تکیہ

شاہ حاتم اسی دوسری جگہ فرماتے ہیں ہندی کے لفظ مثلاً نین، جگ، نت وغیرہ میں نے ہی نظم اُردو سے مٹائے حالانکہ یہ الفاظ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

مثال بحر موجیں مارتا ہے — کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا
آب حیات جانے کتو نے پیا تو کیا — مانند خضر جگ سوں اکیلا جیا تو کیا

البتہ ناسخ نے ضرور اس کی پابندی کی کہ جو لفظ ترک کردیا ترک کر دیا — نہ خود اسے استعمال کیا نہ اپنے شاگردوں کو استعمال کرنے دیا ہندی الفاظ کے متعلق اس نے یہ اصول مقرر کیا کہ ترکیب کے ساتھ محاورے کی شکل میں یا ضرب المثل کے اندر جائز ہے مثلاً تن تنہا جگ یا بنت کا استعمال تو درست نہیں۔ بہرحال حاتم نے خود عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ قواعد صرف و نحو کی طرف سب سے پہلے اُن کو خیال ہوا، دیوان زادہ کے بعد مرزا جان طپش دہلوی کی کتاب ہے جو ۱۲۰۱ھ میں شمس الدولہ نواب احمد علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ کی فرمائش سے مرشدآباد میں لکھی گئی، اس کے بعد میر انبر جان گلکرائسٹ کی قواعد کا ہے جو ۱۲۱۷ھ میں لکھی گئی، انشاء نے دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ میں لکھی جس کا تاریخی نام اردوئے ناظمی ہے یہ مصطلحات طپش کے ۱۶ سال بعد اور قواعد گلکرائسٹ کے ۶ برس بعد لکھی گئی ہو اس لیے یہ عام خیال کہ انشاء نے پہلی قواعد مرتب کی درست نہیں ہے۔ ذیل کے نقشوں سے واضح ہو گا کہ ولی دکنی سے لیکر عہد ناسخ تک زبان و محاورات میں کس کس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں،

ولی دکنی اور میر و مرزا کی زبان کا فرق

ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا	ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا
نین	چشم	اچھے	ہے
کال	مصیبت	اس	گزشت
نمن	طرح	موہن	معشوق
درشن	زیارت، دیدار	ستی	سے
ساجن	معشوق	آپس	اپنے
جگ	دنیا	پیو	دوست، معشوق، یار

پپیہا	معشوق
برہا	عشق
پگ	پگڑی
سنسار	دنیا
باٹ	رستہ
سے	میں
سریجن	معشوق
دوجا	دوسرا
لگ	تک
کن	پاس
دستا	انند
پیتم	معشوق
رسیلا	[illegible]
[illegible]	[illegible]
درپن	آئینہ
دیکھنا	دیکھنا

بنا	بن
سون	سے
مکھ	منھ
انجھو	آنسو
برجے	سمجھے
چند	چاند
کدھیں	کبھی
اِتا	اتنا
درس	زیارت
دارو	دوا
گلن	پگھلنا
کدھی	کبھی
سین	سے
آرسی	آئینہ
جیو	جی

میر و مرزا اور ناسخ کی زبان کا فرق

میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان	میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان
پھر	لیکن	آگو	آگے
نپٹ	بہت	طرح غنچہ	غنچہ کی طرح
پرے	الگ	کریو	کیجیو
میں	میں نے	بدلا کرنا	بدلا لینا

لاگا	لگا	اُور	طرف
تین	تو	جوں ایندھن	ایندھن کی طرح
دوانہ	دیوانہ	چلا جا ہے	چلا جاتا ہے
ان نے	اس نے	پگاہ کا نالہ	نالۂ سحر
تجھ بن	بے تیرے	تنک	ذرا
اس کو پوچھنا	اس سے پوچھنا	میرے موے گئے	میرے مرنے کے بعد
سجن	صنم	طَرَفْ	طَرَفْ
حال سہنا	صدمہ سہنا	تجھ تئیں	تجھ تک
پون بہی	ہوا چلی	نِت	ہمیشہ
رنگ جھمکے ہے	رنگ جھلکتا ہے	بدشراب	بدمست
کسو	کسی	ٹھہرنا	جھکنا
جامۂ کم گھیر	کم گھیر کا جامہ	رو رکھنا	منھ رکھنا
اس دم تئیں	اس وقت تک	جاگہ	جگہ
شمع کا گلنا	شمع کا پگھلنا	اس کنے	اسکے پاس
داغ ہوں	داغ کھاتا ہوں	قاصد چلانا	قاصد بھیجنا
ندان	ہمیشہ	دارو	شراب
لوہو	لہو	انتہا لانا	انتہا کو پہونچنا
بستار	شہرہ	جائے باش	جائے بود و باش
دخترِ تاک	دخترِ رز	ہلاکی کو پہونچنا	ہلاکت کو پہونچنا
دامن چلنا	دامن مسکنا	بھروسا پڑنا	بھروسا ہونا
سر کو فرو لانا	سر کو فرو کرنا	خرابا پھیلنا	خرابی پھیلنا
جانا جاتا ہے	سمجھا جاتا ہے	نمط	طرح
ہر پات ہرے کے اوجھل	ہر ایک ہرے پتے کے اوجھل	اس کے گئے	اسکے جانیکے بعد
خاک میں رل جانا	خاک میں مل جانا	دار کھینچنا	دار پر کھینچنا
دریا کا سا	دریا سا	پالہ	پیالہ

دہلوی اور لکھنوی زبان کا فرق

الفاظ و محاورات دہلی	نام شاعر مع سنہ	کلام		لکھنوی زبان
تا	مصحفی سنہ ۱۲۱۱ھ تک	ب زخم قلم ذرا وا ہو	تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو	تا کہ
پیچاک	"	کہیں پیچاک آہ کر تحریر	دے بنا زلف کی کہیں زنجیر	پیچ و خم
طراحی، دو رکھنچنا	"	تیری طراحیوں سے دور کھنچا	کئی اہل سخن نے اس کو لکھا	طرحداری، دور تک کھنچا، بہت مشہور ہوا
رمز جتانا	"	مز شق القمر جتا دے تو	معجزہ اپنا ٹک دکھا دے تو	راز بتا دینا
نپٹ	"	ایک جا اک جوان خوش ظاہر	تھا نپٹ فن عشق سے ماہر	کامل بہت
نادیدہ	"	بہ تقاضائے عشق سنجیدہ	لیکن اس پر بھی تھا وہ نادیدہ	ندیدہ، لالچی
جوں، دوں	"	جوں پہ اس کے سما گئی جی میں	دوں کچھ اس کے بھی آگئی جی میں	جونہی، جیسے ہی، اسیوقت، ویسے ہی
ناگہ، حیران وار	"	جس کا ناگہ ہوا ادھر سے گزار	وہ رہا دیکھ اس کو حیراں وار	ناگہاں، حیران
دھائے	"	یک بیک اس جوان پر دھائے	لڑکے کیا آئے اک بلا آئے	چڑھ دوڑے
آنکھ مندنا	معروف سنہ ۱۲۳۱ھ تک	اور تو باتیں بری چھٹ گئیں سب بیتے جی	آنکھ مندی پر چھٹا ایک نگر دیکھنا	آنکھ بند ہونے پر
ہوئینگے	"	اس بڑھاپے میں بھی کم ہوئینگے لہری ہمسے	سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہمسے	ہونگے
ولے	"	رو ٹھنے کو تو چلے روٹھکے ہم واں سے ولے	لڑکے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کرلے جائے	و لیکن
آ	"	چشم ترسے گرچہ آمژگاں پہ پانی بھر گیا	اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں کا پانی بھر گیا	آکر
دیکھوں ہوں	فراق سنہ ۱۲۱۱ھ تک	میں رکھ کے ہاتھ جو سینے پہ اپنے دیکھوں ہوں	قدم جو رکھوں تو نقش قدم نہیں ہوتا	دیکھتا ہوں
تلک	"	دامن تلک گیا تھا کہیں اس کے دست دم	اللہ ری نازکی دہن چوڑی مسک گئی	تک

نمط	شاہ نصیر ۱۲۵۵ھ تک	کمان و تیر نمط ربط تھا مجھے اس سے	جب اس نے آپ کو کھینچا ہیں گوشہ گیر ہوا	کی طرح
کبھو، چھائیاں	"	کبھو جو اس رخ روشن پہ چھائیاں دیکھیں	گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں	کبھی، چھائیں ہوئی
دیکھ	"	فلک پہ دیکھ مرے دود آہ کا ٹکڑا	گھٹا ہے شرم سے ابر سیاہ کا ٹکڑا	دیکھ کر
سہمے ہے کیا	"	تیر خاکی ہے نگاہ سُرمہ آلود اسکی دیکھ	مرغ دل سہمے ہے کیا! ہے گا نشانہ تیر کا	کیا سہما جاتا ہے
کیونکہ	"	ہو ذوق ساقیا! بط مے کے شکار کا	پھندا بناؤں کیونکہ نہ بارش کے تار کا	کیونکر
چشم (معنی اُمید)	"	خاک اب پروانہ دل ہو نہ رکھے تجھ سے چشم	تیری آنکھوں پہ تو چربی چھاگئی یک بار شمع	امید
سُوجھے ہے	"	سرکشی بے وجہ کچھ کرتی ہیں زلفیں آپ کی	مجھ کو سوجھے ہے کہیں یہ مار اب کھاویں نہیں	معلوم ہوتا ہے
آئے جائے ہے، چیتو	"	اے غافلو! دم از رہ صفت آئے جائے ہے	چیتو! کہ نخل عمر کو یہ کھائے جائے ہے	آ جاتا ہے، ہوشیار ہو
کا ڑھنے	"	قبا دیکھی ہے پھلکاری کی یہ کس ماہ پارہ کی	فلک جو کاڑھنے سیکھا ہے ٹوپی چاند تارہ کی	کاڑھنا

وہی، ہو ویگا	میر ممنون ۱۲۶۰ھ تک	بخدا بندے کو وہی خط آزادی ہے	نامہ اغیار کو گر اب کی رقم ہووے گا	وہی، ہوگا
تقاضا کا	"	الٰہی وہ جو وعدے ہیں فاکس طرح ہوونگے	نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا	تقاضے کا
دُنبال	"	ہیں رواں ناقے کے دنبال ہزاروں بیتاب	دیکھیو پر دہ محمل نہ اٹھانا اپنا	پیچھے

تیرے بن	رنج ۱۲۶۱ھ تک	تیرے بن جب تک کہ میرا دم رہا	آہ اور نالہ ہی بس ہر دم رہا	بے تیرے

آفت رسیدگاں کا	احسان ۱۲۶۰ھ تک	پہونچ اے اجل کہ لب پہ اٹکا ہے کام جاں کا	حامی ہے کون تجھ بن آفت رسیدگاں کا	آفت رسیدوں کا

اس سبب	مانث ۱۲۶۵ھ تک	اے پری تیری زباں کی نہیں فہمید ہمیں	اس سبب اُٹھتی ذرا لذت دشنام نہیں	اس سبب سے
کیجے	"	مجھ کو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجے	آپ ہو رہیے مرے یا مجھے اپنا کیجے	کیجئے

دکھلا دکھلا	تسکین ۱۲۶۵ھ تک	دیکھے کیا میری طرف یاد ہے اس کو اپنی	چشمکیں غیر سے کریں مجھے دکھلا دکھلا	دکھلا دکھلا کر
کُو	"	اُس کُو میں مجھ کو جانے سے کرتا ہے منع ہائے	ناصح کو کوئی جا کے کرے پاسبان غیر	کوچہ
تسکین دیہ	"	نام تسکین وہ یہ مضمون تپش نازیبا	تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے	تسکین دہندہ

جاے جائے	مومن ۱۲۶۸ھ تک	بعد مدت اسی کوسے یوں پھر شبنگ آکر	جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے ہیں کہاں اپنا	جگہ جگہ
خطوں	،	کیا جواب آئے کہ کثرت سے مرے خطوں کے	گھِس گیا اب سیاہی بنی صنعت کا غذ	خطوں (دو تشدید)
مسیحی	،	لب کا ترے دعوی مسیحی	مراد رہے آزمائیں گے ہم	مسیحائی
کھوے	،	کیوں گر غیر سے مت مل تو کھوئے طعن سے زک کر	یہ کیوں کس واسطے ہم تیرے ایسے ہوگئے بس ہیں	تو کہتا ہے یا تو کہہ
صورت بلبل گلستاں بیاں	،	بریکس صورتِ بلبل نہیں نوا سنجی	یہ کیا ہوا کہ چپ لے گلستاں بیان لگی	تصویرِ بلبل رنگیں بیاں
بہتے بہلے بہل	"	پیغام سے بن گئے ہو کیونکر تسکین	باتوں میں بہل جائے عاشق ہی نہیں	بہلے بہل بروزن محل
شِمّر	،	دل ایسے شوخ کو مومن نے دیا کہ وہ ہے	محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا	شِمر
پاؤں وہ نازک	،	بجائے گریہ خاک میں اس نے وہاں کی خاک	گل کی تھی کیونکہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا	وہ نازک پاؤں
ہر بار لگا	،	نہ ٹکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا	ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اک تار لگا	بار لگاکر ٹانکنے
سم کھا موے	،	سم کھا موے تو دردِ دلِ زار کم ہوا	بارے کچھ اس دوا سے تو آزار کم ہوا	زہر کھا کر مرگئے
تغافلِ بسیار	،	ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی	تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا	تغافلِ کثیر
دو گیا	،	شوخیٔ قاتل کے میں قربان ہوں	کہتے رہے سب، یہ گیا دو گیا	وہ گیا

کھوج	ذوق ۱۲۷۱ھ تک	اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا	اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا	سُراغ
دارو	،	پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق	نامرد مرد - مرد جواں مرد ہوگیا	دوا
رو بشِ مرد	،	سو بار مر کے عاشقِ جاں باختہ ترا	اُٹھنے تو پھر کھڑا روشِ مرد ہوگیا	بصورت مرد
تا جی سے	،	آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے	جب تک اُسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا	جبتک جی سے
ناچار، سب فن	،	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ	سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا	ناچار، ہرفن
نالا	،	دیا قمری کو مصرع نالا	مصرع قدِ سرو پر بالا	نالہ

پریشان حالوں کی دیکھ	رسا ۱۲ھ تک	پریشان حالوں کی جب قدر جانو ہو گیا اس کو دیکھ حیراں دل	جو اس طرح ہو دل پریشاں تمہارا بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا	پریشاں حالوں کی بغیر تمہارا نون دیکھ کر

کوئی دن کی	خبیر ۱۲ھ تک	تو بہ تو کوئی دن کی ہے پھر آپ ہی حضرت	قابو میں نہ دل ہو گا تو کیا کیا نہ کریں گے	چند دن کی

سن پیے ہی بنی	عیش ۱۲۷۰ھ تک	زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے	ہاتھ سے اس کے مے پیے ہی بنی	بے پیئے ہی بنی
گرہ ہیں	نسیم ۱۲۷۳ھ تک	لاکھوں گرہیں ہیں دلِ عاشق کی طرح سے	شانہ شکن زلف کو سُلجھا نہیں سکتا	گرہ ہیں
برخیز حشر	״	گر جانتے جگائے گی برخیز حشر کی	احساں نہ لیتے راحتِ خوابِ مزار کا	غوغا حشر کا
کاہے سے	״	تھا کچھ تو جب بھی یہ نہ کہو تم کہ کچھ نہ تھا	گر کچھ نہ تھا تو کاہے سے سارا جہاں بنا	کس چیز سے
سبکجاں	״	لو فراغت ہو گئی کیسے سبک جاں ہو گیا	پاک دامن ہو گیا لڑتے گریباں ہو گیا	سبکسار
برہم	״	اوڑے اوراقِ گل بادِ خزاں سے	ہوئی برہم کتابِ گلستاں آج	ابتر
برہم	״	خیالِ کاکلِ برہم سے حال ہے برہم	پھنسی ہوئی ہے عجب دام انتشار میں روح	درہم
میری خاطر نے	״	سکھائی ہے نئی تدبیر مجھ کو میری خاطر نے	پسند آتا ہوں دشمن کو بھی تیری گفتگو ہو کر	میرے دل نے
کہویں	غالب ۱۲۸۵ھ تک	مومن و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید	مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں،	کہیں
کیے بغیر	״	گھر جب بنا لیا ترے در پر کیے بغیر	جانے گا اب بھی تو نہ میرا گھر کیے بغیر	بغیر کیے
وے	״	مقصد ہے ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام	چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کیے بغیر	ولیکن
جوں	آزردہ ۱۲۸۵ھ تک	جوں سُرمہ پائے یار آزردہ ہوں	میر کے دیواں کا انتخاب نہیں،	مثل
لے، سج	״	صبح لے آئینہ اس سج کو دکھایا ہم نے	رات اغیار سے ملنے کو جو تیار ہوئے	لیکر، سج دھج
چھٹانا	شیفتہ ۱۲۸۶ھ تک	ہے ترا سلسلۂ زلف بھی کتنا دل بند	پھنسنے سے پہلے ہی مشکل تھا چھٹانا دل کا	چھڑانا
ہم آغوش	״	تنگ اتنا نہ کرا شوق ہم آغوش کہ وہ	دھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانا شبِ وصل	ہم آغوشی
نیم کشت	״	کیا جانے درد زخم کو گو ہو شہیدِ ناز	جو نیم کشتِ خنجرِ رشکِ عدو نہیں	نیم کشتہ، نیم بسمل
ٹھنڈا دیا، کو	״	دیکھ کر چشمِ غضب کو اسکی میں نے رو دیا	چاہیے پانی ملا لینا شرابِ تیز کو	ٹھنڈا کر دیا، تھا
نہ کیجو	رفعت ۱۲۹۱ھ تک	نہ کیجو قصد تو پیکاں کے آزمانے کا	کہ زخمِ دل کو ہے پانی سے ڈھب جڑانے کا	نہ کیجیو
سدا	״	بیٹھ اے تیرِ ستم گر تو دلِ زار کے پاس	بیٹھتے یار ہیں دنیا میں سدا یار کے پاس	ہمیشہ
دولت	صابر ۱۲۹۱ھ تک	عصیاں کی دولت اب ہم تلے ہیں بعد مرگ	اُٹھنا رے غبار کو دشوار ہو گیا	بدولت
ہرجائی پنے	״	گر حرم میں اور گاہے دیر میں دیکھا اسے	طور ہرجائی پنے کا اُس پہ کیا زیبا ہوا	ہرجائی پن
مجھکو جگہ	״	مجھ کو جگہ کہاں ہو کہ آتا نہیں نظر	دل میں ترے تو غیر سے خالی مکاں مجھے!	میری جگہ
کار	״	دیر میں آکے ہوئے اور بھی جلوے سے دوچار	مل گئے وہ جو ضلالت سے پڑا کار مجھے	کام

سبک رفتہ	شفق ۱۲۹۱ھ تک	ہم سبک رفتہ چلے جانب صحرائے عدم	سیر ہستی کی مبارک ہو گراں جانوں کو	سبک رو
بچارہ	ساحر [illegible] تک	عزت ہم پوستاں بھی ہوئے اس کے تیغ عشق	ہیں بچارہ عمر بھر نہ کرد اندماں کا	فکر، خیال
خضر	،	ہوں راہ رو اس وادی پر خوف و خطر کا	جس میں نہ ملا نقش قدم ہم کو بھی خضر کا	خضر
ناموس	،	ناموس ضبط کھوتی ہے کیوں اے صدائے حور	اس بدگماں کو ہو نہ گماں مجھ پہ آہ کا	عزت
راز دیتے نہیں	،	راز دیتے نہیں ہم دوست ہو یا دشمن ہو	حال کہہ دیتے ہو تم غیر سے کیونکر اپنا	راز کہتے نہیں
ملنے کو ہوگا	داغ ۱۳۰۲ھ تک	آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں	آپ کے ملنے کو ہوگا جسے ارماں ہوگا	ملنے کا ہوگا
کوئی روز	،	جانے وہ جان کہاں یہ غم جاناں ہوگا	خانۂ دل تو کوئی روز میں ویراں ہوگا	چند روز
اب سے	،	زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائیں گے	اب سے وہ کام کریں گے کہ جو آساں ہوگا	آئندہ سے
سندیسا	،	سن کے وہ حال مرا غیر سے فرماتے ہیں	آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر	پیام
عاقبت	،	عاقبت کثرت عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتب اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
سحر کرتا ہے	،	دم اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
صبر کیے سے	،	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
اپنے بھی عکس سے ہے	،	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہو اپنے عکس سے بھی
کہے بنا	،	محشر میں حال دل دم پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا مجھے	کہتے بنا
ادا چھانا		ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی	اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی	کیفیت طاری ہونا

داغ کا کلام ابتداء شروع سے آخر تک دیکھ جائیے ان مزخرفات سے پاک ہے لیکن کہیں کہیں انھوں نے بھی وہی الفاظ و محاورات باندھے ہیں جو لکھنؤ میں متروک ہو چکے مگر ایسا شاذ و نادر ہے۔

بعض مقامات پر داغ نے خاص خاص دہلی کے محاورات لکھے ہیں جو لکھنؤ میں بالکل استعمال نہیں کیے جاتے۔

مثلاً	عاقبت کثرت عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتب اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
،	دم اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
،	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
،	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہو اپنے عکس سے بھی
،	محشر میں حال دل دم پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا مجھے	کہتے بنا

نورالحسن نیر (کاکوروی)

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تین حیثیتوں سے واضح کیا جا سکتا ہے

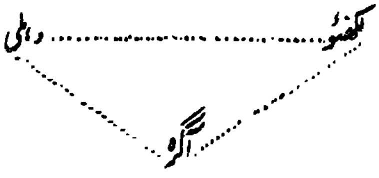
(۱) جغرافیائی حیثیت سے،

(۲) تاریخی حیثیت سے،

(۳) اس حیثیت سے کہ دہلی کے زمانہ شعر و شباب کی شہرت و عظمت میں شعرائے اکبرآباد (آگرہ) نے کتنا حصہ لیا؟

جغرافیائی حیثیت سے، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ آج سے چند سال پہلے تک ایک ہی صوبے کے تین ممتاز شہر تھے، ممالک متحدہ میں انہیں تین شہروں کو وقتاً فوقتاً دارالسلطنت بننے کا موقع ملا ہے اور یہی تین مقام مرکز ادب اردو رہے ہیں

انتقال دارالصدر کے بعد بھی جغرافیائی حیثیت سے آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین تھا اور ہے اس لیے دہلی اور لکھنؤ کو آگرے سے وہی تعلق رہا جو کسی نہال کے برگ و بار کو اصل سے ہوتا ہے، ہندوستان کے نقشے میں اب بھی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کے محاذی خطوط کا وسطی حصہ ہے



لہذا جغرافیائی اعتبار سے ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں اور لسانی حیثیت سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہونا چاہیے۔

تاریخی توضیح یہ ہے کہ آگرہ، سکندر لودی، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد سلطنت تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے اور اردو زبان ان میں سے آخری تین بادشاہوں کے زمانے میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے

---

[1] عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا اُسے "اردو" کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا

۱؎ ظہیر الانتشار

وہاں لین دین بدستور اسی مخلوط زبان میں ہوتا تھا، شاہجہاں نے اسے اور رونق دی، یہ شاہی بازار چونکہ اصطلاحاً اور لفظاً "اُردوئے معلّے" کہلاتا تھا اس لیے اس نئی زبانِ مرکب کا نام بھی اُردوئے معلّے رکھا گیا۔

صاحب "ظہیر الانشا" کے اس بیانِ محقق سے ظاہر ہے کہ اس مخلوط زبان (اُردو) کی بنا دسب سے پہلے قلعۂ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا، ہندی (اُردو) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اُردو شاعری وجود میں آئی۔

جلال الدین محمد اکبر کے عہد سے عہد شاہجہاں تک فارسی شاعری زیادہ مقبول و مروّج تھی جسے مغل سلطنت اپنے آبائی وطن سے ساتھ لائی تھی، اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعرا موجود تھے۔ مثلاً شیخ ابو واجد فارغی، علامہ فیضی بن ملا مبارک، میر حشمی ملا صبوحی چغتائی، ملا شیدا، محمد امین ذوقی، عبداللہ سحری وغیرہ وغیرہ، لیکن اردو شاعری کا رواج بتدریج عہد اورنگ زیب عالمگیر سے شروع ہوتا ہے

عہد شاہجہاں میں جب بعض سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت کا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل ہوگیا تو آگرے کے ادبا اور شعرا نے بھی دہلی کا رُخ کیا، حتّٰی کہ جب دہلی سے کاروانِ ادب لکھنؤ پہنچا تو میرِ کاروان میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹلی اور نواب لطف اللہ خاں صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی خلف مرزا جان علوی آگرے ہی کی شاعر خیز خاک سے اٹھے اور دہلی میں صدر الصّدور بن کر بیٹھے۔

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا مولد گوالیار تھا لیکن اگر میر و غالب کی نزادگاہ آگرہ ہونے کے باوجود انہیں دہلوی مانا جاسکتا ہے تو آبرو کو اکبر آبادی کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں، جن کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور جو عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں

عہد محمد شاہ میں (۱۱۶۰ھ) میر باقر علی مخلص اکبر آبادی نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے۔

خان آرزو کے ارشد تلامذہ میں میاں شرف الدین علی پیام اکبر آبادی بھی اسی عہد کے ممتاز شاعر تھے، بیشتر فارسی میں اور کمتر اُردو میں شعر کہتے تھے، یہ بھی آگرے ہی سے دہلی گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

اسی طرح میر باقر علی جعفر اکبر آبادی برادر زادہ نظام الدین ممنون آگرے میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں دہلی چلے گئے۔

میر باقر حزیں اکبر آبادی مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد اور سپاہی پیشہ آدمی تھے، سادات آگرہ میں سے تھے، یہ بھی آگرے سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے بنگال چلے گئے۔

میر تقی میر، میر عبداللہ اکبر آبادی کے فرزند اور ہمشیرزادہ سراج الدین علی خاں آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر اپنے باپ عبداللہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں راجہ ناگرمل کی رفاقت میں

کچھ دن بسر کیے، دہلی اب اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اس لیے دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا، اور وہاں سے دوسرے شرفا اور امرا کی طرح آپ بھی لکھنؤ چلے گئے۔

محمد عارف عارف اکبرآبادی، میر تقی میر کے دوست، اور شیخ شرف الدین مضمون کے شاگرد تھے، رفوگری پیشہ کرتے تھے جب میر تقی میر دہلی گئے تو عارف اپنے دوست کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے خود بھی دہلی چلے گئے۔

مغل سلطنت کے آخری تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد آگرے سے دہلی پہنچے - مرزا رفیع سودا، میر اکبرآبادی کی طرح دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، مگر ان کے شاگرد رشید شاہ نصیر اور شاہ نصیر کے شاگرد ابراہیم علی خاں ذوق دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالب اکبرآبادی نے اپنا پرچم سخن ایسا لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

سنہ ۱۸۶۹ء یعنی مرزا غالب کی وفات تک، آگرہ اور دہلی کا اتحاد و تعلق شاعرانہ اسی نوعیت سے تھا جس کا ذکر مجملاً میں کر چکا ہوں یعنی آبرو اکبرآبادی، آرزو اکبرآبادی، مظہر اکبرآبادی، مخلص اکبرآبادی، پیام اکبرآبادی، جعفر اکبرآبادی حزیں اکبرآبادی، میر اکبرآبادی، عارف اکبرآبادی، اور غالب اکبرآبادی یہ سب آگرے ہی کی خاک پاک سے تربیت یافتہ تھے آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے یہیں تعلیم پائی، یہیں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر تاریخ ادب اردو کا ہیرو بنا دیا۔

یہ میرا خیال یا بیان نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے مطالعہ کے تحت پر نکات الشعرا، مآثر الامرا، تصویر الشعرا، آب حیات، مخزن نکات، منتخب التواریخ، خزانۂ عامرہ، ظہیر الانشا، نتائج الافکار، تذکرہ سرخوش، مرآۃ العالم، گلشن بہار اور تذکرۃ الانساب وغیرہ کتابیں اور تذکرے موجود ہیں، ان تذکروں کو پیش نظر رکھ کر میں نے جو کچھ لکھا ہے میں اسے ایک تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں۔

آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق انہیں ارباب فضل و کمال کی ذات گرامی سے پیدا ہوا اور مرزا غالب اکبرآبادی ثم الدہلوی کے عہد پر کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گیا۔

آگرے میں مرزا غالب کے کئی شاگرد تھے، جن سے مرزا کا سلسلۂ اصلاح و مکاتبت تمام عمر جاری رہا، منشی ہرگوپال تفتہ، ہزدکی رائے بہادر شیو نرائن آرام اکبرآبادی (سکرٹری میونسپل بورڈ متوفی سنہ ۱۹۰۸ء) مرزا تفضل حسین خاں تفضل اکبرآبادی (جو آگرہ میں کتب داری

سلہ ان کا مولد قصبۂ جاجو ضلع آگرہ ہے اس لیے انہیں بھی اکبرآبادی ہی کہنا چاہیے (مخزن نکات)

کرتے تھے پھر ریاست الور میں ملازم ہوگئے تھے) مولوی سید مددعلی تپش اکبرآبادی، شیخ عبدالمجید رسوا اکبرآبادی، بابو ہرگوبند سہائے نشاط اکبرآبادی یہ سب مرزا غالب کے عزیز و شاگرد تھے ان میں سے اکثر دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔

مرزا غالب دہلوی بن جانے کے بعد بھی اپنے مولد و وطن آگرے کو نہیں بھولے وہ اکثر دہلی سے آگرے آتے رہتے تھے خصوصاً جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی خلف منشی حسین بخش اکبرآبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی کی سخن فہمی کے متعلق مرزا غالب خود فرماتے ہیں:۔

اس فرزانہ یگانہ (یعنی نبی بخش حقیر) کو کس درجہ سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر میں نے جبتک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں جانا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ (اردوئے معلّٰی)

مرزا غالب کا اکثر آگرے آنا، ان کے شاگردوں کا دہلی جانا، اور سلسلۂ مکاتبت و اصلاح برسوں جاری رہنا بھی دہلی اور آگرے کے تعلق شاعرانہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری دور برطانوی حکومت کی تاسیس و تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا، جب حکومت کو مرکزیت حاصل نہ تو ادب و شعر کی مرکزیت کہاں قائم رہ سکتی تھی؟ مغل سلطنت کے زوال نے جو عظیم سیلاب بے سکونی اٹھا وہ اپنے ساتھ ادبی رجحانات کو بھی بہا لے گیا، مرزا غالب کی موت دراصل آگرے اور دہلی کے رابطۂ شاعرانہ کی موت تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۹ء تک دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تاریخ کے کسی صفحہ سے ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام زمانے میں آگرے اور دہلی کی بساط سخن شعراسے معمور تھی، مگر ان میں پہلے سے ربط و اتحاد کا فقدان تھا، آگرہ میں ۲۹، ۳۰ سال تک شاعرانہ طوائف الملوکی رہی، شعر سے ذوق رکھنے والے آگرے ہی کے کسی دیرینہ مشق شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے رہے مگر میر و میرزا نے آگرے سے لکھنؤ اور دہلی پہونچ کر آگرے کا جو نام پیدا کیا تھا اسے باقی رکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی

مگر فطرت کو آگرے اور دہلی کا یہ قطع تعلق منظور نہ تھا، آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۹ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کرکے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا،

خدا کا شکر ہے کہ آج "آگرہ اسکول" "دہلی اسکول" کی طرح ایک علیحدہ[1] ادارۂ فکریہ تسلیم کیا جاتا ہے جو محاورات اور مصطلحات یا اردو میں مرزا داغ دہلوی کے مذہب کا تابع ہے۔

سیماب (اکبرآبادی)

---

[1] جب "آگرہ اسکول" دہلی اسکول کا متبع ہے تو پھر اس کا علحدہ ادارۂ فکریہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ (اڈیٹر)

وہ مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے

یا اُن کا نشو و نما یہاں ہوا

میر شیر علی افسوس ان کے والد نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل تھے اس لیے ان کا نشو و نما یہیں ہوا۔ بعد کو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

میرزا جعفر علی حسرت سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد، ان کے والد ابو الخیر کی اکبری دروازہ میں عطاری کی دکان تھی، ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ انھوں نے شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کا پورا زمانہ اور نواب سعادت علی خاں کا تھوڑا زمانہ دیکھا ہے

شیخ قلندر بخش جرأت فیض آباد میں نشو و نما ہوا، جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی، اول اول محبت خاں کی سرکار میں ملازم ہوئے اور پھر مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں انشا کا ان کا ساتھ رہا ہے ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

غلام علی راسخ وطن فیض آباد تھا لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۰ھ میں بعہد غازی الدین حیدر انتقال کیا۔

میر نقی ہوس فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا۔ مصحفی کے شاگرد تھے، اس لیے ان کا زمانہ ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان رہا ہوگا، تذکروں میں کہیں ان کا ذکر نہیں پایا جاتا، بڑے بے مثل شاعر تھے

شیخ امام بخش ناسخ (ولادت ۱۲۰۴ھ) فیض آباد میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما ہوا، نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں لکھنؤ گئے جب مصحفی اور انشا کا دور دورہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا ۱۲۵۴ھ)

کرامت علی شہیدی	ولادت بانس بریلی میں ہوئی، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، پہلے مصحفی کے شاگرد ہوئے اور پھر شاہ نصیر کے، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا
خواجہ حیدر علی آتش	فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے، نواب سعادت علی خاں کا زمانہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا۔ (۱۲۶۳ھ)
خواجہ وزیر لکھنوی	گوشہ نشین شخص تھے، غالباً نصیر الدین حیدر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا، واجد علی شاہ نے طلب کیا لیکن نہیں گئے، ناسخ کے شاگرد تھے۔
مرزا محمد رضا برق	مرزا کاظم علی خاں (مصاحب واجد علی شاہ) کے بیٹے تھے، ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کے ساتھ ٹیا برج گئے اور ۱۲۸۳ھ میں وہیں انتقال کیا۔
میر اوسط علی رشک	فیض آباد میں پیدا ہوئے، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ناسخ کے شاگرد تھے، نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، ۱۲۸۵ھ میں کربلائے معلی میں انتقال ہوا۔
امداد علی بحر لکھنوی	پیدائش ۱۲۰۰ھ بعہد نواب سعادت علی خاں، انتقال سنہ ۱۳[illegible]
مظفر علی خاں اسیر	نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملازم ہوئے اور واجد علی شاہ کا بھی زمانہ دیکھا، پھر رام پور چلے گئے ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔
ضامن علی جلال	۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، واجد علی شاہ اور امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، غدر کے بعد رام پور چلے گئے نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد پھر لکھنؤ آ گئے اور ۱۳[illegible]ھ میں انتقال کیا۔
امیر اللہ تسلیم	پیدائش فیض آباد، نشو و نما لکھنؤ، شاگرد نسیم دہلوی، واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا۔ غدر کے بعد رامپور گئے لیکن چلے آئے، نواب کلب علی خاں کے دور میں پھر گئے [illegible] نواب حامد علی خاں کے زمانے میں انتقال کیا (۱۳۲۹ھ)
مرزا سلامت علی دبیر	پیدائش دہلی (۱۲۱۸ھ) ۶، ۷ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے (عہد [illegible]) ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔
میر ببر علی انیس	فیض آباد میں پیدا ہوئے (۱۲۱۶ھ) لکھنؤ میں نشو و نما ہوا اور یہیں انتقال کیا
آغا حجو شرف	واجد علی شاہ کے مصاحب تھے اور انہیں کے ساتھ ٹیا برج چلے گئے تھے ۱۳[illegible]ھ میں انتقال کیا
مہربان خاں رند	پیدائش فیض آباد (۱۲۱۲ھ) [illegible] لکھنؤ آئے [illegible] آتش کے شاگرد ہوئے
وزیر علی صبا لکھنوی	۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا، اسی سال واجد علی شاہ معزول کئے گئے۔

لکھنؤ اور دلّی اسکول کے ریختی کہنے والے شاعر

ریختی کا رواج کب سے شروع ہوا یا ریختی کب ایجاد ہوئی۔ اس باب میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ سب سے پہلی ریختی سید شاہ ہاشم کے مرید، سید میراں ہاشمی نے لکھی۔ حضرت ہاشمی بیجاپور کے رہنے والے اور علی عادل شاہ بادشاہ بیجاپور کے درباری شاعر تھے جنکی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔ ہاشمی نے ۱۶۹۷ء میں انتقال کیا۔ ان کی ریختی کا یہ نمونہ ہے:—

اد جسدن گول کنڈی میں گئی ہو یاد ہیں باتاں   ہمیں تم مل کے بیٹھے تھے سکھی جسدن دلائے میں
مجھے بکڑے ہیں کی چھوڑ دا دیکھو ہانک مارونگی   خدا کی سوں میں کہتی ہوں بڑی بولکر پکارونگی
سجن آویں تو پردے سے نکل کر بہار بیٹھوں گی   بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
رضا گر مجھ کو دیتے ہو کروں گی گھر میں جا دارو   اگر مجھ ہو وسے گی فرصت صبح پھر آؤنگی چھوڑ دو
اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا جی   مجھے بدنام کرنے ہو کہیں نہیں جاؤنگی چھوڑ دو

دوسرے ریختی گو دکن کے سید محمد قادری خاکی تھے جو ولی کے معاصر اور دکن کے مشاہیر پیران طریقت سے تھے، آپ کا دیوان ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے آپ بھی ہاشمی کی طرح تصوف آمیز ریختی کہا کرتے تھے مثلاً:—

کرو پیو پیر سیں ظاہر یو سب مل سات سکیاں   جنم سب بحر میں غم کے تیرے بن نت یو کھوتی ہوں
یو جباری بین ہمکن ہو ملی جب دیکھ بالا سوں   بہی سوں برہ کی تب میں نکل پیو سات سوتی ہوں
رہوں میں کب تلک جھرتی جلا کر دل کیتیں کرتی   کہ اب غم کے پہاڑوں پر سیلاب ہے سر ٹرتی ہوں
مدد سوں شاہزادہ کی ترقی پا کے لے خاکی   کبھی وحدت کے دریا میں میرا میں بن ڈبوتی ہوں

انہی کے ساتھ اور ایک دکنی شاعر رحیم کے بھی چند شعر ملتے ہیں:—

اری نادان تیں اپنے سجن کو کیوں روٹھایا ہے   روٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے
بہت پچتائیگی میری نصیحت مان کہتی ہوں   سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تیرے دل ہونٹیا تجھ مہرباں اور پرنہ روٹھے گا   روٹھائے کو منائے بن تجھے کیسے سلایا ہے

یہ ریختی گو ۱۱۹۰ھ سے لیکر ۱۲۰۵ھ تک گزرے ہیں اور غالباً یہ ریختی کا پہلا دور ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سوائے دکن کے اور کسی جگہ اس کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ ۱۲۱۸ھ کے بعد نواب بدرالدین خاں بہادر امیر جنگ امیر دلدولہ لائق نے ریختی کہی ہے جو نواب سکندر جاہ بہادر کے داروغہ اسپ خانہ تھے۔

باہر مرے سیرے تو آسی ڈوعتبا اسے لارہی دوا   میں بلائیں تیری لیتی ہوں اری جاری دوا

اس موے ماتھی سلے پر تو زور جتن ہاروں   یا کوئی اور ہو تدبیر تو بتلاری دوا

کیا ہا کس نے کہا تیرے سے لائق شب کو   تجھ کو تو ہوئی قسم کہہ دے نہ شرماری دوا

ان کے بعد محمد صدیق قیس کا دور آتا ہے جس نے مستقل طور پر ریختی کا دیوان مرتب کیا۔

قیس حیدرآباد کے مشہور شاعر اور شیخ محمد خاں ایمان کے بھانجے تھے اور مہاراجہ چندو لعل اور شمس الامرا امیر کبیر کے مصاحب۔ ۱۲۳۰ھ میں آپ نے انتقال کیا اور چونکہ یہی زمانہ سعادت یار خاں رنگین کا ہے اس لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین کی ریختیوں کو دیکھ کر خود ریختی کہی ہے مگر یہ قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ رنگین کی ریختی کا دیوان جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۹ھ ہے اور قیس نے ۱۲۳۰ھ میں انتقال کیا ہے اس طرح قیس کا انتقال رنگین کے دیوان ریختی کی ترتیب سے انیس سال قبل ہو چکا تھا ظاہر ہے کہ مرنے سے دس بارہ سال پہلے ہی سے قیس نے ریختی کہی ہوگی اس طرح رنگین کے کلام کا قیس کے پیش نظر رہنا تقریباً ناممکن ہے۔

قیس نے اپنے دیوان ریختی پر یہ عبارت لکھی ہے:-

"منتخب دیوان ریختی قیس مسمی در بیگمات شوخ محل بادشاہی شاہجہاں آباد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیس نے بیگمات دہلی کی زبان سے متاثر ہوکر انھیں کی زبان میں شعر کہے ہیں اور اس لئے ان کا شمار دہلی اسکول کے ریختی گو شعرا میں ہونا چاہئے۔

قیس نے عموماً انھیں ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں جو رنگین کی ریختیوں کی ہیں نمونہ کے طور پر قیس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

تونے جڑیا وہ بنائی ہے کہ بس بول اُٹھے !   تیرے ہاتھوں کے میں قربان گئی مُغلانی!

ٹھیک ہیں مونڈھے تو اس کرتی کے لیکن اتنا   تنگ ہوتا ہے گلے میں سے گریبان ددا!

چنپا لگا تھا جس کے گریبان کے اوپر   کرتی وہ مری کیا ہوئی پستائی جمیلا !

لاڈ بازار کو جاتی ہے تو صدقے تیرے   بھول مت یاد سے لے آ میری ڈوری انا!

جس کی چڑیا کا وہ عالم تھا کہ اب اُڑ جائے   میں نے باجی سے جو کل شرط بدی ہاری گیا
کیا بنالائی ہے منہیارن مانی چوڑیاں   میں نے پہنوں گی کبھی یہ آسمانی چوڑیاں
اب کے رکھی ہوں دوگانا وہ طرحدار چھیل   نوجوان تپلی سی گوری سی دھواں دھار چھیل

قیس کے معاصرین میں اور کوئی ریختی کا شاعر دکن میں نہیں ملتا۔ البتہ ۱۲۸۰ھ کے ایک ریختی گو شاعر رائے گلاب چند ہمدم کا کلام مولوی سردار علی صاحب نے ہمیں مرحمت فرمایا ہے مگر ہمدم چونکہ رنگین اور انشاء کے بعد کے ہیں اس لئے ان کا ذکر رنگین اور انشاء کے بعد ہی کیا جانا مناسب ہے۔

انشاء اللہ خاں جو ریختہ کے مشہور شاعر ہیں ریختی کے بھی بڑے اچھے شاعر تھے مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم متعارفہ کی تکمیل کی اور دلی جاکر شاہ عالم کے دربار میں منسلک ہو گئے مگر چند ہی روز کے بعد دلی سے جی بھر گیا تو لکھنؤ پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق پیدا کر لیا اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے ۱۲۲۵ھ میں نواب سے روٹھ کر خانہ نشین ہو گئے اور نہایت ہی پریشان حالی اور تکلیف سے زندگی بسر کر کے ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ رنگین کی تتبع میں ریختی بھی کہنی شروع کی اور ایک دیوان مرتب کر لیا چونکہ انشاء نے دلی میں زیادہ دن گزارے تھے اور ان کے ریختہ کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ ہے اس لئے ان کا ریختی کلام بھی دہلی ہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چند شعر دیوان سے نقل کئے جاتے ہیں۔

ہاتھوں سے تیرے میں تو کمبخت عاجز آئی   جو کام ہو نگوڑا تیرا سو ہبلی کا
بندی کی دشمنی میں ناحق جو ہوں الٰہی!   لگ جائے ان کے منہ پر ازغیب کا تھپیڑا
چوٹی یہ تیری سانپ کی ہے لہر دوگانا!   کھاتی ہوں تیرے واسطے میں زہر دوگانا!
تھام تھام اپنے کو رکھتی ہوں بہت سا لیکن   کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا ندر والا
پوتوں پھلنا تجھے اور دودھوں نہانا ہو نصیب   بیاہ ہو سونے کے سہرے سے تیری عمر دراز!
اری بی ایک ہی عیار ہو تم !   ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم!
کچھ نہیں معلوم پوچھو کونسا میلا ہے آج   جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں
میں تیرے صدقے نہ رکھ اے میری پیاری روزہ   بندی رکھ لیگی تیرے بدلے ہزاری روزہ
جو ہم کو چاہے اس کا خدا انت بھلا کرے   دودھوں نہائے اور وہ پوتوں پھلا کرے
رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی!   اب تو نوبت بھی اٹھو اجی باجی! باجی!!

میں پچھاند کے کل رات جو دیوار نہ جاتی۔ کنڈی نہ ہلاتی۔ جاکر نہ جگاتی

منہ بند اس کو نہ آتی۔ جوبن کی وہ ماتی۔ تیوری نہ ہلاتی

اور چٹکیاں میں میرے تئیں بھیج اڑاتی۔ ہاتھ نہ پہ نچاتی۔ گاتی نہ بجاتی

کھانے کو نہ کھاتی۔ پھر تو نہ بلاتی سو سوہلے گاتی

سعادت یار خاں رنگین مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی کے بیٹے تھے سرہند میں پیدا ہوئے دلی میں نشو و نما پائی سپاہیانہ فنون کے ماہر تھے تمام عمر شہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوئی ۱۲۵۱ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ خود اپنے دیوان ریختی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ عورتوں اور خانگیوں کی تماش بینی کی وجہ سے ریختی گوئی کا شوق ہوا ایک پورا دیوان ریختی کا موجود ہے اس کے علاوہ چونتیس جلدیں ان کی مختلف تصانیف کی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں چونکہ دلی میں پرورش ہوئی تھی اور زبان پر دلی کے محاورات چڑھے ہوئے تھے اس لئے ریختی میں بھی دلی کی بیگماتی زبان استعمال کی ہے اس طرح یہ بھی دلی اسکول ہی کے ریختی گو شاعر ہیں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

چیونٹی پکڑ کے صاحب میں جھوٹے ڈالتی ہوں — [illegible] کا مینھ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا!

تم جو فلانی نے سی دی [illegible] — ہو گئی تنگ پہ پچھوا [illegible] سے نگوڑی انگیا

لونی میں [illegible] لال مرچیں — تیرے دونوں دیدوں میں بھر جائے آتوں

نہیں سے کلیجہ کو کیا اس کے ہوا لوگو ہے — کیا ان دنوں رہتی ہے دلگیر مری چھوچھو!

رائے گلاب سنگھ [illegible] امیر کبیر شمس الامرا بہادر کے متوسل تھے ۱۲۸۰ھ میں ان کی ریختیاں نواب شمس الامرا بہادر کے مطبع میں شائع ہوئیں حالات معلوم نہ ہو سکے مگر کلام سے پتہ چلتا ہے کہ پر مشق شاعر تھے اور دلی اسکول کا تتبع کرتے تھے نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

اے دوا چھوڑ گیا اب سے وہ اشکار والا — ہائے کیا ہووے گا کیا کیا میرا اندر والا!

کیا یونہیں اپنی جوانی وہ کرے ہے برباد — جس کا پردیس چلا جائے کوئی گھر والا!

چھپ چھپا کے تو کسی ڈھب سے بلا لیجو بہن — دیکھا [illegible] ہے جو وہ خنجر والا!

جس کی چمک سے آگے [illegible] — ایسی کوئی منگا دو جھلا جھل کی اوڑھنی

بجلی سی اک چمک گئی اسے [illegible] — خلوت میں رات ان کی یہ کچھ جھلکی اوڑھنی

سید امام علی بلگرامی انشا کے ہمعصر ایک اور بزرگ تھے یہ بھی ریختی اور غزل کہا کرتے تھے صاحبقراں تخلص تھا آخر عمر میں

لکھنو جاکر آصف الدولہ کے ملازم ہو گئے تھے۔

اب تک ہم نے جن ریختی گو شعرا کا کلام پیش کیا ہے وہ دلی اسکول کے تھے، صاحبقراں پہلے ریختی گو شاعر ہیں جو لکھنو اسکول سے متعلق ہیں قصبۂ بلگرام کی زبان پر لکھنو ہی کا اثر ہے پھر آصف الدولہ کی ملازمت اور لکھنو کے قیام نے صاحبقراں کی زبان کو لکھنو کے رنگ میں رنگ دیا تھا اس طرح دلی اسکول کا پہلا ریختی گو شاعر دکنی زبان کے ریختی کہنے والوں کو چھوڑ کر قلیش حیدر آبادی ہے اور لکھنو اسکول کا پہلا ریختی گو صاحبقراں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں:۔

کانوں کی نیچے بالی او میری بھولی بھالی ؛ اتنی تو اس نے دل چھپالی او میری بھولی بھالی!
باریک سا دوپٹہ لازم ہے گرمیوں میں ؛ او بی بی جی جسالی او میری بھولی بھالی!
جو دیکھتا ہے سر کو تھپڑ یہ مارتا ہے ؛ ہر گز نہ تو نے ٹالی او میری بھولی بھالی!

اس دور میں دو ایک ریختی گو دلی اسکول کے بھی نظر آتے ہیں جو بہت مشہور نہیں اور ناز نیں ان میں مشہور ہیں یہ لکھنو اسکول کے سب سے بڑے ریختی گو جان صاحب کے معاصر تھے، تاریخ کا خیال ہے کہ جان صاحب سے بھی پہلے تھے۔ ذوقی سے تلمذ تھا ۱۲۔۔ھ میں زندہ تھے دیوان نہیں ملتا مگر چند متفرق شعر ملتے ہیں جن میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں ذوقی کی وفات پر ایک قطعہ کہا ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔

نہیں نازنیں رنج کرتی کسی کا ؛ گیا جب سے دنیا سے مرتا ہے کوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے ؛ اگر میں نے ملنے کی حسرت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رلایا ؛ کہ اس پر دسے میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کالموں سے ہے الفت ؛ خصم ذوقی مرا تھا جبریں دسوئی
لکھی اس کی تاریخ اور یہ ہوا غم ؛ میاں ذوقی مرا آسیا روئی
نازنیں اتنا بھی ہرجائی پنا ؛ یہ تمہارے آگیا نیا دمیان میں!
سونا کبھی شوہر کو میسر نہیں ہوتا! ؛ غیرت سے اٹھیں باؤں سے تیرا گھر نہیں ہوتا!
کیا جانئے کیا کسبیوں میں شہد گھلا ہے ؛ گھر والیوں سے خوش کوئی شوہر نہیں ہوتا
ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا ؛ بڑا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
ہمسائی آئی تھی میرے گھر میں بنی ٹھنی ؛ ان کو تو دیکھو رات اسی پہ پھسل پڑے

قدسی کی غزل پر سیکڑوں شعرا نے خمسہ کہا ہے مگر باوجود ریختی میں تضمین لگانے کے نازنیں نے اس مزے سے مصرع

ہم پہونچ جائے ہیں کہ جواب نہیں :—

لونڈی سو جان سے قربان گئی تجھ پہ نبی اچھی محشر میں بجھا دیجو مری تشنہ لبی
تو ہے بندی کا وسیلہ دم حاجت طلبی مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

عورتیں جمع تھیں یک جا پہ حسن لے شاہ اُمم وصف یوسف وہ لگیں کرنے زلیخا سے بہم
دیکھ تصویر تیری بولی یہ بی بی مریم من بیدل بجمال تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

درد عصیاں سے جو تھی نازنیں کو بیتابی منھ پہ آنچل وہ ڈوپٹہ کا دھری روتی تھی
دیکھا اس دکھیا کا عالم تو اُسے کچھ نہ بنی سیدی انت حبیبی و طبیب تلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

میر یار علی جان صاحب فرخ آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں پرورش پائی آخر عمر میں رام پور جا رہے، ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۷ھ میں انتقال کیا نواب عاشور علیخاں سے تلمذ تھا۔ جان صاحب کو ریختی کا شاعر اعظم کہا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے ریختی کو بڑی ترقی دی اور نہایت عمدہ ریختیاں کہیں چونکہ لکھنؤ میں پرورش پائی تھی اور عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اور قیام لکھنؤ ہی کے زمانہ میں ریختی کہنی شروع کی تھی اس لئے لکھنوی کے رنگ میں ڈوب گئے، نموتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :—

میری آنکھوں نے بو انچاب سے دعویٰ کیا پانچ باری جب میں روئی پانچ دریا بہ گئے
گھر گھر گلا کروں کی اجی کوتوال کا چوری ہوئی پتا نہیں ملتا ہے مال کا
کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو ضرور
محرم کی جب کٹوری میں جگنو نظر پڑا پھبتی کہوں چراغ بنے کی ہے جھونجھ میں
کیا خانہ خراب اسکو دکھایا کوچہ اُلفت کا پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو
سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت
نہ وہ جلا پا ہے ہرگز سہا نہیں جاتا خدا دکھائے نہ پیڑو کی آنچ کا صدمہ
زناخی! بہت دل پریشان ہوگا نہ کر رات کو کنگھی سر میں تو اپنے
اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا ہو خیر دلہن دولھا کی ماتھا میرا ٹھنکا

تیسرے دن نہیں جاتے ہیں کسی کے گھر سے — اور رہ جاؤ بوا آج کا دن آج کی رات
ادھر آئی بوا اُدھر بھاگی — ہے جوانی بھی خواب کے مانند
میری ماما نے نکالی ہے نئی مجھسے چھیڑ — بھیجتی ہوں کہیں جاتی ہے یہ مردار کہیں

اس دور میں بہت سے ریختی گو گزرے ہیں مگر کسی نے جان صاحب کی طرح فقط ریختی کو اپنے لئے مخصوص نہیں کیا بلکہ ریختہ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ غزل ریختی کی بھی کہہ لیا کرتے تھے اس لئے اس عہد میں سوائے نازنین، صاحبقراں اور جان صاحب کے کوئی دوسرا مستقل ریختی گو کہلانے کا مستحق نہیں۔

چونکہ زمانہ بہت کچھ بدل گیا تھا اور وہ عیش و تنعم جو ریختی گوئی کا سبب تھا باقی نہیں رہا تھا اور تہذیبی نقطۂ نگاہ سے بھی ریختی بُری سمجھی جانے لگی اس لئے بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی۔

نازنین پر دلی والوں کی ریختی گوئی کا خاتمہ ہوگیا، دلی اسکول میں ریختی نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی قیس، انشا، رنگین، ہدم اور نازنین کے علاوہ بہت کم شاعر ریختی گو دلی اسکول میں نظر آتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں ریختی گو زیادہ پیدا ہوئے۔

اختر پیا یعنے جانِ عالم کے زمانے میں آغا حجو شرف اور گلشن الدولہ وغیرہ بہت سے ریختی گو پیدا ہو گئے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا کلام ہمیں نہیں ملا، عابد مرزا صاحب بیگم اُسی اُجڑے دربار کی یادگار ہیں، ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے چونکہ انکے والد حسین مرزا اختر پیا کے محلات میں کتاب خوانی پر مامور تھے اس لئے انھیں اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے ۱۳۱۵ھ سے ریختی کہنی شروع کی جب مٹیا برج مٹی میں مل گیا تو بیگم بھی عظیم آباد چلے گئے وہاں سے بھوپال اور پھر حیدر آباد آئے اور یہیں رہ پڑے اعلیٰ حضرت غفراں مکاں نواب محبوب علی خاں بہادر نے بیگم کی ریختیوں کو بہت پسند فرمایا اور اپنی فیاضی سے سرفراز فرماتے رہے۔

ہزاکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر پیشکار و صدر اعظم باب حکومت نہایت اچھے ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ فیاض اور قدردان امیر ہیں آپ نے بیگم کو اپنے یہاں رکھ لیا اور بیگم بھی اس طرح بیٹھ گئے کہ کسی اور کا نام تک نہ لیا اب تک سر مہاراجہ بہادر ہی کی محفلوں کی شمع بنے ہوئے ہیں لکھنؤ اسکول کے آخری ریختی گو ہیں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں۔

مردوے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں — بل ہے تیوری پر تو ہو ہندی کو اس کا غم نہیں
سوت بازی مجھسے لیجائے خدا کی شان ہے — وہ ہے چھتیسی اگر میں بھی کچھ اس سے کم نہیں
کرتی تھی ادھر کام اُدھر دیکھ رہی تھی — اے چھوکری اسوقت ترا دھیان کدھر تھا
جان اگر سب جانے والی جائے گی — بات تو ان کی نہ ٹالی جائے گی
بھاگ جائے گی یہ جب ہو گی جواں — چھوکری مجھ سے نہ پالی جائے گی

[illegible] اس گھر میں۔ اس گھر میں — ترا عاشق تجھے دونوں جگہ جاکر پکار آیا
[illegible] — کلیجہ تھام لو بی ابھی سنو تم داستاں میری
[illegible] — کھٹائی میں موے نے ڈال رکھیں بالیاں میری

[illegible] الہ آبادی ہیں آپ ارادت خاں واضح مصنف پنجرقہ و مینا بازار [illegible] ۱۲۸۵ھ میں دریاباد میں پیدا ہوئے امین الدین قیصر کے جو [illegible] لکھنؤ اسکول کے تھے اور خود بھی لکھنوی ماحول میں پرورش پائی [illegible] ۱۳۳۵ھ تک کے کلام کا "مجموعہ آرسی" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں غزل کے علاوہ [illegible] جیسا چونچلا نہیں مگر پھر بھی شعر اچھے کہتے ہیں اور آپ کی ریختیوں میں [illegible] نقل کئے جاتے ہیں :

[illegible] — دو دو امیری طرف سے بد گماں ہو جائیگا
[illegible] — دیاں ردیاں جسم کا بیٹی زباں ہو جائیگا
[illegible] — پہونچا ابر لکھنؤ دلی میں استر رہ گیا
[illegible] — ٹھاکر لے گئی جبا اٹھو کپھری بتہ مری سیل کا

[illegible] کے علاوہ چند اور شاعر بھی لکھنؤ اسکول کے ایسے ملتے ہیں جو کبھی کبھی ریختی کہہ بیٹھتے [illegible] خان پور اسٹیٹ ریاست بھاولپور پنجاب کے متوطن ہیں اور اب لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ایک دیوان ریختی کا چھپوا چکے ہیں جس میں اپنے آپ کو جان صاحب سے بڑھا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے مگر جان صاحب [illegible] کی ریختیاں [illegible] کلام کے ٹکر کی بھی نہیں چونکہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے مختلف دیہات اور [illegible] مقامات پر رہنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے . . . . بعض دفعہ تو بالکل گنواروں کی سی بولی بول جاتے ہیں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں :۔

[illegible] — یہ دونوں جھوٹیں جورات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر
بلا کی شوخی [illegible] بیان میں ہے — وہ موزی آج بان میں ہو کر مار ڈالا اُبھا اُبھا کر
[illegible] — بلا بلنگیہ سہ چراغ گھی کے فرد مسجد میں آج جاکر

بُوا یہ بیگم ہے لکھنؤ کی بڑی ہے دھوم اس کی گفتگو کی ذرا جو آنکھ اس سے دوبدو کی تو اسنے مارا جلا جلاکر

شبِ ہجر شعلہ نار ہے مرا بھی رہا دلِ زار ہے بوا صبر ہے نہ قرار ہے ہوا ورد کم تو بخار ہے

مجھے کیا چمن کی بہار سے مجھے کیا گلوں کے نکھار سے مجھے کیا کسی کے سنگار سے نہیں بر میں اپنا جو یار ہے

متذکرہ بالا ریختی گو شعرا کے کلام اور حالات سے ایک سطحی اندازہ ہو جائے گا کہ ریختی نے تدریجی طور پر کیا ترقی کی سنہ ۱۱۰۹ھ سے ۱۱۵۵ھ تک ایسے شعرا نظر آتے ہیں جنھوں نے زنانی بولی کو نظم ضرور کیا مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے ریختہ سے ہٹ کر کسی علیحدہ صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے یا ہندی شاعری کی تتبع میں عورت کی زبان سے اظہار جذبات کیا ہے بہرحال یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اُردو یا دکنی زبان میں عورتوں کے جذبات کو نظم کرنے کی کوشش ہاشمی نے کی، اشرف اور رحیم نے کی البتہ سنہ ۱۲۱۲ھ کے اوائل میں نواب بدرالدین خاں بہادر امیر الدولہ لائق نے بیگماتی زبان میں ریختی کہنی شروع کی ان کی زبان پر دلی کی بیگماتی اُردو کا خاصہ اثر تھا ان کے بعد محمد صدیق قیس نے اپنا ریختی کا دیوان مکمل کیا جو بیگماتی زبان کا خاصہ ذخیرہ مہیا کرتا ہے ان کی زبان نہایت صاف اور شیریں ہے ان کے بعد رنگین اور انشا نے ریختیاں کہیں جو اس عہد کی زبان کی جیتی جاگتی تصویر ہے تاہم ان ریختیوں میں جو کہا ہے اس کو مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستانِ سخن میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"صرف عورتوں کی گفتگو اور ان معاملوں کے سوا کہ مرتبہ شناسانِ سخن کے نزدیک فضول اور نازک دماغوں کے آگے نامعقول ہیں اور کچھ نہیں اور نامعقولیت سے مراد یہ ہے کہ کلام فحش آمیز یا کلمات شہوت انگیز سے زبانِ قلم کو آلودہ کیا ہے یہ تو اس نظم کے گوش و گردن کا پیرایہ بلکہ اس طرز کا خمیر مایہ ہے مراد اس سے یہ ہے کہ وہ باتیں جو عورتوں کو اثنائے خانہ داری میں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً کسی بہن بہیلی کے گھر مہمان جانا یا کسی بھائی بند کا اپنے گھر بلانا خصم سے توم چھلے کے گھڑوانے کی تمنا اور کرتی انگیا رنگوانے کا تقاضا اس طرح سے خرچ کئے ہیں کہ ان سے کچھ لطف یا نکتہ کہ شاعر خوش مذاق کو لذت دے حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ مختصر تعریف ہے ریختی کی جو ہمارے تذکرہ نویسوں نے کی ہے مگر ایک حد تک اس کی صحت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، قیس سے لیکر صاحبقراں تک سب اسی رنگ میں ہوئے ہیں نازنین نے البتہ ایک قدم ان سب سے آگے بڑھایا اور ذوق کی وفات پر ریختی میں قطعہ کہنے کے علاوہ قدسی کی نعتیہ غزل پر نعتیہ مصرع پہونچائے ان کے بعد جان صاحب نے تو ریختی کی کایا ہی پلٹ دی بقول مرزا صابر کے فحش آمیز شہوت انگیز نظم کے علاوہ بہن بہیلی کو گھر بلانے کرتی انگیا رنگوانے کے مضامین بھی باندھے مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور روزمرہ کے مضامین بھی نظم کئے ہیں چنانچہ نمونہ کے لئے چند شعر اس قسم کے نقل کئے جاتے ہیں:۔

چوری ہوئی پتہ نہیں ملتا ہے مال کا گھر گھر گلا کروں گی بوا کوتوال کا

یہ بات بیاہیوں سے کے ہوا بعد اتفاق — کنبے میں بیگما کے دولہا جو نظر پڑا
اُجڑا ہوا آبادی کا جب گھر نظر آیا — رونے لگی میں دیکھ کے جی میرا بھر آیا
گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا — غصہ سے مردوے کا عجب حال ہو گیا
کھلتی ہے جبھی بھوک ہیں کھانے کی حقیقت — سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا
یہ دل ہوس کے چپ بھی نہیں رہا جاتا — گلا جو کرتی ہوں چاہت کا ہے مزا جاتا
اور لیے بھیتی ہول بن آئے ہو لنگور سے — داڑھی منڈوا دیں باز آئی خدا کے نور سے

دیوان جان صاحب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس طرح کے سیکڑوں شعر ملیں گے جان کے بعد بیگم نے ریختی کو اور ترقی دی اور ریختی میں بڑی گنجایش پیدا کر دی چنانچہ اخلاقی اور نعتیہ مضامین بھی باندھے ہیں پہلے پہل جب بیگم حیدرآباد آئے اس وقت حیدرآباد میں لکھنؤ اور دلی دونوں اسکول کے شعرا کثرت تھے اور لکھنؤ کی زبان اور دلی کی زبان پر خاصے جھگڑے ہو رہے تھے لکھنوی ہونے کی حیثیت سے بیگم کو بھی طیش آگیا اور انھوں نے بھی ایک طویل ریختی کہہ دی جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک — سنا میں نے یہ آتوں کی زباں سے
زباں کے خلد کی ہے حور عورت — اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے
زباں کے ملک کی ملکہ ہے عورت — انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر — یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے
زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا — لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے
نگوڑی سوت جل ککڑی کے ہاتھوں — تنگ آئی بہت اب میں یہاں سے
یہ بیکاری بنی ہے سوت میری — نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے
وطن چھوڑا اسی شفتل کے پیچھے — دکن میں آئی میں ہندوستاں سے
چھڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے — چھپا کے منہ چلی آئی وہاں سے
موئی لاگ مجھ سے ہو گئی ہے — یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے
سند اس سے مجھے دی مفلسی کی — نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے
غرض ہونا ہے جو ہو جائے مجھ پر — میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے

سید تمکین کاظمی

لکھنؤ کی شاعری

شاعر ہمیشہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، گرد و پیش کے حالات، اس کے زمانے کے تمام اثرات و رجحانات، اس وقت کا تمدن و معاشرت یہ سب چیزیں شاعر پر اثر انداز ہوتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک ہی زمانہ کے مختلف شعراء پر ان چیزوں کا اثر اکثر مختلف ہوتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ دو ہمعصر شعراء کا کلام متضاد اوصاف کا حامل ہو اور دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر عام تجربات و حالات کو اپنی ذات پر منعکس کر کے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان حالات کے بیان میں خود اس کی شخصیت رونما ہو جاتی ہے، لیکن اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان دو مختلف رنگ رکھنے والے ہمعصر شاعروں میں ایک چیز ضرور مشترک ہو گی اور وہ چیز ماحول کا اثر ہے۔ ہماری زبان کی شاعری میں اس کی بہترین مثال جیسا کہ میں نے نقد الادب میں عرض کیا ہے میر تقی میر، میرزا سودا اور میر درد کے کلام سے ملتی ہے، گو یہ تینوں اہلِ کمال ایک ہی زمانہ میں تھے اور تینوں نے ایک ہی قسم کے حالات میں زندگی بسر کی لیکن ذرا گہرے مطالعہ سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ان تینوں نے اپنے ماحول اور اپنے زمانے کے واقعات اور حالات سے اپنی طبعی خصوصیات کے مطابق مختلف اثر قبول کیا، ہندوستان کی تاریخ کا یہ نہایت تاریک دور تھا مغلوں کی سلطنت دم توڑ رہی تھی، طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، نادر خاں کے حملے روہیلوں کی تاخت و تاراج، مرہٹوں کی لوٹ مار فرنگیوں کی روز افزوں سطوت و جبروت کا شور یہ سب چیزیں امن و آشتی اور اطمینان قلب اور سکون خاطر کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی تھیں، ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار نمایاں تھے، حساس اور گداختہ دل میر ان مصائب و آلام کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار روتے ہیں اور رُلاتے ہیں، سودا اپنے دل پر میر سے زیادہ قابو رکھتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ ان کی آنکھوں سے اشک جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل کا درد زہر خند میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی حالت پر ہنستے ہیں مگر ان کی طعن آمیز نظروں اور ان کے متبسم لبوں کے پیچھے ایک درد بھرا دل نظر آتا ہے جو اپنے ماحول اور اپنے ارد گرد کے حالات پر آنسو بہا رہا ہے، لیکن میر درد ان دونوں سے جداگانہ طریقہ پر ان الم انگیز واقعات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، وہ دہلی کے برباد ہونے پر میر تقی اور سودا کی طرح ترک وطن اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے ترک دنیا کو اولیٰ سمجھتے ہیں، وہ عارف ہیں، خدا شناس ہیں، درویش ہیں اس قسم کے واقعات و حالات کا اثر ان کو اور زیادہ خدا کی مصلحت اور اس کی رضا پر قناعت کے لئے مجبور کرتا ہے اور وہ عزلت گزینی اختیار

کرلیتے ہیں اور فانی چیزوں سے دلبستگی اور ان پر تکیہ کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں، قناعت، صبر، تحمل اور خودداری کے درس دیتے ہیں

کسی زبان کی شاعری میں مختلف ادوار کا قیام بھی ہر دور کے مخصوص ماحول کی بنا پر ہوتا ہے، اس لئے شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے جس دور میں شاعر ہے اس دور کے مخصوص ماحول کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس شاعر کے کلام پر صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی،

اس گفتگو سے نتیجہ نکلا کہ مختلف ادوار کے شعراء میں خواہ اور کسی حیثیت سے کوئی خاص فرق ہو یا نہ ہو لیکن .... جہاں تک ماحول کے اثر کا تعلق ہے ان میں ضرور نمایاں فرق ہوگا اور جو محاسن یا معائب کسی مخصوص ماحول کے اثر نے اس ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء کے کلام میں پیدا کردئے ہیں وہی محاسن یا معائب دوسرے دور کے شعراء میں تلاش کرنا تنقید کے اس اہم ترین اصول کو نظر انداز کردینا ہے۔

اُردو شاعری کو جب دہلی میں عروج ہوا تو وہ زمانہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا تھا، نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ درّانی کی غارت گری مرہٹوں کی لوٹ مار یہ چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور دہلی کے پریشان حال باشندوں کو تباہ و برباد کردیا ظاہر ہے کہ ان الم ناک واقعات کا اثر لوگوں پر بہت حزن انگیز ہوا ہوگا اور شاعر تو شدید الحس ہوتا ہی ہے، یہی سبب ہے کہ دہلی کے اس دور کے شعراء کا کلام بہت ہی یاس انگیز اور درد خیز ہے۔ ماحول کا اثر اسی کا متقاضی تھا، خصوصاً میر تقی میر جن کو اس دور کی ادبی جدوجہد کا قافلہ سالار کہنا چاہئے اپنے زمانہ کے واقعات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ بعض اوقات تغزل کے رنگ میں سیاسی اور تمدنی واقعات اور ان کے اثرات کی طرف صریحاً اشارے کرتے ہیں اور اس زمانہ کے واقعات کا ان پر اتنا اثر ہے کہ کہیں کہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ میں غزل کہہ رہا ہوں اور یہ شعر جو میں نے کہا ہے غزل کے اشعار میں شامل نہ ہوگا، سُنئے:-

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

شعر کے پردے میں میں نے غم سُنایا ہی بہت مرثیے نے دل کو میرے بھی رُلایا ہی بہت
ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

پھر پھر گیا ہے آکر منھ تک جگر ہمارے گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

اک آن اس زمانہ میں یہ دل نہ وا ہوا کیا جانئے کہ میر زمانے کو کیا ہوا

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

پس دہلی کے سیاسی انقلابات نے ہماری زبان کی شاعری کے اس دور میں یاس انگیز اور درد خیز کیفیات پیدا کر دیں، حزن و ملال اور درد و غم کے بیان میں تاثیر ہوتی ہے، یہ چیزیں دل میں چبھتی ہیں، یہی سبب ہے کہ شعرائے دہلی کے کلام میں کچھ ایسا اثر ہے کہ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

جب دہلی تباہ ہو گئی تو لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے وطن چھوڑ چھوڑ کر اطراف و اکناف ہند میں پھیلنے لگے، اس زمانہ میں مشہور اور مستند شعراء عموماً سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ ہوتے تھے یا ارکین دربار و عمائد و امراء ان کی پرورش کرتے تھے اس لئے دہلی کی تباہی کے بعد اگر کوئی خطہ ایسا تھا جہاں ہمارے شعراء کو قدر شناسی کی امید ہو سکتی تھی تو وہ لکھنؤ تھا، چنانچہ میر تقی میر، سودا، اور میر حسن وغیرہ نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور اہلِ لکھنؤ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور امید سے زیادہ انکی قدر افزائی کی حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، ان کو جاگیریں عطا کی گئیں اور شاہان اودھ نے اور ان کی دیکھا دیکھی امرائے دولت اور ارکین دربار نے ان کو اپنا مصاحب بنایا،

لکھنؤ میں اس وقت شعر و شاعری کا چرچا تھا، اول اول تو نوواردِ شعرائے دہلی کا یہاں کی زبان اور خیالات پر بہت اثر پڑا، انکی تقلید اور ان کے قدم بہ قدم چلنے میں اگر کچھ بھی کامیابی ہو جاتی تھی تو اسکو باعث فخر سمجھا جاتا تھا چنانچہ خود آصف الدولہ کے کلام میں شعرائے دہلی کا اثر نمایاں ہے، ان کے کلام میں فطری جذبات اور کیفیات دلی کا بیان ہے اور شاید اس حیثیت سے وہ قدیم لکھنؤ اسکول کے تمام شعراء میں ممتاز ہیں کہ ان کا کلام تاثیر سے خالی نہیں ہے مصحفی کے یہاں بھی میر کی تقلید کا اثر نمایاں ہے لیکن اس کے بعد ہی جو دور شروع ہوا وہ یکسر تاثیر سے معرا تھا اور اس کے کارنامے سطحی اور مضحکہ خیز مضامین کے انبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے

یہ زمانہ سلطنت اودھ کے عروج کا زمانہ تھا، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، ہر طرف رنگ رنگ رلیاں تھیں، چہل پہل تھی بےفکری تھی ان چیزوں کا گہرا اثر لکھنؤ کے تمدن و معاشرت پر پڑا اور اس ماحول نے شعر و شاعری کو بہت متاثر کیا، چنانچہ فطری جذبات اور تخئیل پر رعایت لفظی اور صنایع بدایع کو ترجیح دی گئی، تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی، سوقیانہ مضامین اور تبذل الفاظ اور محاوروں سے غزلیں لبریز نظر آنے لگیں اور کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی کے راگ بے تکلف مشاعروں میں الاپے جانے لگے۔

شیخ ناسخ فرماتے ہیں:-

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ستر انھوں نے جو بھرنے نہیں دیتا ہے بجا خوابیدار سے کیونکر خط قرآں ہوتا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا سر پہ ہر محبوب کے خط مانگ کا آرا ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارا ہوا

اس بے راہ روی کی بنیاد تو مصحفی اور انشاء کے وقت ہی سے پڑ گئی تھی لیکن اصل میں قدیم لکھنؤ اسکول آتش و ناسخ کے وقت قایم ہوا۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس دور کے شعراء کا کلام بے اثر و بے کیف ہے، اس کو واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ عشق و محبت کو آوارگی اور فسق و فجور کا مرادف بنا کر پیش کرتا ہے، اس دور کے کلام میں متانت اور ثقاہت کے بجائے ابتذال پیدا ہو گیا ہے اور معاملہ بندی نے اُسے "عریانیت" کی حد تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس دور کے شعراء نے زبان کی کوئی خدمت نہیں کی، انھوں نے زبان کی اصلاح کی، اس کو حشو و زوائد سے پاک کیا اور زبان کو وسعت دی گو ایک زندہ زبان کی اصلاح زمانہ کی ضروریات خود کرتی جاتی ہیں، اُس وقت زمانہ کا اقتضا یہی تھا کہ کوئی نہ کوئی ناسخ پیدا ہو۔ اگر اس کام کو ناسخ نہ انجام دیتے تو کوئی اور انجام دیتا، بہر طور لکھنؤ اسکول کا مقصد بظاہر شعرائے لکھنؤ کو دہلی کی تقلید سے آزاد کرنا تھا اور ناسخ اور ان کے متبعین نے اس مقصد کو کما حقہ پورا کیا، زبان میں جو اصلاحیں انھوں نے کیں اُنکو زبان نے قبول کر لیا یہاں تک اہل دہلی بھی ان اصلاحوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آخری تاجدار اودھ سلطان واجد علی شاہ اختر کے وقت تک لکھنؤ اسکول کے رنگ میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن اس کے بعد ہی سے ماحول میں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی انقلاب سلطنت نے لکھنؤ کی دنیا ہی بدل دی، نہ وہ رنگ رلیاں رہیں، نہ وہ تعیش کے سامان رہے، نہ وہ بے فکری اور بے خودی رہی، ہزاروں گھر تباہ و برباد ہو گئے، طرز بود و ماند میں فرق آنے لگا، تمدن و معاشرت نے دوسرا رنگ اختیار کرنا شروع کیا، اقتصادی مشکلات قدم قدم پر دامن گیر ہونے لگیں، آخر رفتہ رفتہ ان سب باتوں کا اثر لٹریچر میں بھی نمودار ہوا سطحی اور خارجی مضامین کی جگہ قلبی واردات اور داخلی مضامین نظم ہونے لگے، ہوتے ہوتے یہ جدید رنگ پختگی اختیار کرتا گیا

یہاں تک کہ آج لکھنؤ کا تغزل جس رفعت اور بلندی پر ہے وہ اس سے پہلے اُردو تغزل کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہماری شاعری کا قدیم لکھنؤ اسکول جب انتہائی عروج پر تھا تو اسی دور کے چند خوش فکر اور قادر الکلام شعراء نے تغزل کی بازاری اور مبتذل مضامین سے اکتا کر جولانی طبع کے لئے ایک اور میدان تلاش کر لیا جس نے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا، ضمیر اور خلیق اور ان کے بعد انیس اور دبیر کا مرثیہ کی طرف رجوع لانا فنی حیثیت سے نتیجہ تھا اسوقت کے پست تغزل کے رد عمل کا، اور اس میں شبہ نہیں کہ انیس نے مرثیہ گوئی کی بدولت اُردو زبان کے خزانہ کو انمول جواہر سے مالا مال کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ حالی اور آزاد نے نہیں بلکہ میر انیس نے جدید اُردو شاعری کا نہ صرف سنگ بنیاد نصب کیا بلکہ اس پر ایسی عمارت تعمیر کر دی جس کا جواب باوجود موجودہ وسائل ترقی کے ہم آج تک پیش نہ کر سکے، انیس نے مرثیہ کو معراج کمال پر پہونچا دیا اور مسدس کو اُردو شاعری کی وقیع ترین صنف بنا دیا جذبات کی صحیح ترجمانی، واقعہ نگاری کا کمال، تخئیل کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کا اعتدال، سلاست و روانی، فصاحت و دلآویزی یہ سب چیزیں میر صاحب کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، انیس ہی کا کلام ہے جس کے بھروسہ پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان نے بھی دنیا کے گنجینۂ خیالات میں اضافہ کیا ہے۔

ہمارے تمدن و معاشرت میں جو تبدیلی مغربی تعلیم و تربیت سے ظہور میں آئی اس کا اثر ہمارے لٹریچر کی سطر سطر میں نظر آتا ہے، چنانچہ لٹریچر کے اور اصناف کی طرح ہماری غزل بھی اس سے اثر پذیر ہوئی، ایجادات و اختراعات نے، ضروریات زندگی کی فراوانی نے اور علم کی ترویج نے خیالات میں بے انتہا وسعت پیدا کر دی ہے اور یہ وسعت محض لکھنؤ اور دہلی تک محدود نہیں ہے بلکہ سارا ملک اس سے مستفید ہوا ہے اور جہاں جہاں اُردو ادبیات سے ذوق رکھنے والے موجود ہیں ان سب کے ذوق کی تربیت ایک ہی قسم کے ماحول میں ہو رہی ہے اور موجودہ تعلیم و تربیت اور کلچر نے یکرنگی پیدا کر دی ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری زبان کی شاعری نہ صرف لکھنؤ اور دہلی میں بلکہ قریب قریب ہر جگہ جہاں اُردو زبان رائج ہے یکساں طور پر موجودہ تہذیب کا اثر قبول کر رہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ اور دہلی زبان کے مراکز ہیں، ان مقامات کے ذرہ ذرہ میں زبان کے نشو و نما کے اثرات موجود ہیں اس لئے موجودہ تہذیب اور موجودہ کلچر کا اثر یہاں کچھ قدیم ایشیائی تہذیب میں سمویا ہوا بھی ہے اور ذرا گہرا بھی ہے،

لیکن جہاں تک شاعرانہ ذوق کی تربیت کا سوال ہے لکھنؤ اور دہلی میں کافی فرق ہے، لکھنؤ کی فضا میں شعریت ہے، یہاں کے باشندوں کی گفتار میں، رفتار میں، آواز میں، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقوں میں شاعرانہ کیفیت موجود ہے، یہ چیزیں یہاں فطری ہیں وہبی ہیں، قدرتی ہیں جو ایک دہلی کیا شاید ہندوستان کے کسی اور خطہ کو نصیب نہیں۔ زمانۂ حال کا دہلی ایک بڑی تجارتی منڈی میں تبدیل ہو گیا ہے، اس پر کچھ عجیب قسم کی "کارخانہ داریت" غالب ہے اور وہاں کی فضا میں کچھ کرختگی سی، کچھ ثقل سا، کچھ گرانی سی معلوم ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ وہاں کوئی ایسا شاعر موجود نہیں ہے جو مقبول ہو۔

لیکن لکھنؤ میں آج کل بھی چند ایسے شعرا موجود ہیں جن کا کلام جب تک زبان باقی رہے گی اس کے ساتھ باقی رہے گا، صفی، عزیز، آرزو، اور اب سے کچھ مدت پہلے کے ثاقب یہ لوگ نہ صرف لکھنؤ کے لئے بلکہ اردو زبان کے لئے مایۂ صد ناز و افتخار ہیں، اور پھر نوجوان طبقہ کے شعراء میں حکیم آشفتہ نواب جعفر علی خاں اثر، سید آل رضا، قدیر، سراج اور منظر وغیرہ نہایت خوش فکر اور خوش گو شعراء میں سے ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری بالکل بدل گئی ہے لیکن عجب یہ ہے کہ یہاں کی شاعری پر اعتراضات کی نوعیت وہی ہے جو ناسخ اور ان کے تبعین کے کلام پر تھی، حالانکہ اب نہ وہ ماحول نہیں اور آج سے نہیں بلکہ علی سیان کا آل اور تعشق کے زمانہ ہی سے لکھنؤ کی غزل میں داخلی مضامین کی کثرت نظر آتی ہے، میرا منشا یہ نہیں کہنا کہ لکھنؤ کی موجودہ شاعری عیوب سے کلیۃً پاک ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لکھنؤ کی شاعری پر رائے قائم کرتے وقت قدیم لکھنؤ اسکول کو نظر میں رکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ خود موجودہ لکھنؤ اس اسکول کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت لکھنؤ میں غزل نے جو رفعت حاصل کرلی ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں اسے نصیب نہیں ہے، یہاں کے کسی مشاعرے میں شرکت فرمائیے تو آپ کو غزل کے اکثر اشعار کے وہ وہ مصرعوں میں تخئیل کا اعجاز نظر آئے گا، فطری جذبات کے نازک سے نازک خاکے، واردات قلبیہ کی سچی اور بے عیب تصویریں، زبان کا لوچ اور الفاظ کی موسیقیت یہ سب چیزیں کچھ اس رنگ سے پیش نظر ہوں گی کہ آپ کو حیرت ہونے لگے گی اور آپ مسرت خیز استعجاب کے اثر میں یہ سوچتے ہوئے وہاں سے آئیں گے کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ خیال کے نازک سے نازک پہلو کو بھی نہایت سے نمایاں تر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حامد اللہ افسر

عہد بعہد اردو زبان و شاعری کا ارتقاء

شہاب الدین غوری (۱۱۹۳ء) — چند کوئی شاعر ۔ عربی فارسی کے الفاظ اپنے دوہوں میں استعمال کیے ہیں جیسے محل، پیغام، فرمان، سلام وغیرہ

ناصر الدین محمود خلجی سے غیاث الدین تغلق تک (۱۲۵۳ء ۔ ۱۳۲۵ء) — امیر خسرو (۱۲۴۳ء ۔ ۱۳۲۵ء)

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

بابر (۱۵۲۶ء ۔ ۱۵۳۰ء) — بابر نے خود، روٹی، پانی، موتی، مجکا ر، مجھکو، کچھ، دیکھو، کے الفاظ استعمال کیے

سکندر لودی (۹۶۱ھ ۱۵۵۵ء — ۹۶۶ھ ۱۵۵۹ء) کبیر داس شاعر

دین گوایو دُنی سے اور دنی نہ آیا ہاتھ
پیر کہاڑی ماریو کا پہل اپنے ہاتھ
کبیر سریو سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک شاعر

ساس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کہرا پیارا
نانک شاعر ایو کہتا ہے سچے پروردگارا

شیر شاہ سور (۱۵۴۰ - ۱۵۴۵ء)

ملک محمد جائسی (پدمارت)

بنین چھوڑ جھاڑ جو با را
سرگ پتار بھیو اندھیا را

اکبر (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء)

تلسی داس جی

مایکو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

سور داس جی

سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج (بار)

جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء / ۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ھ)

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۷۹ - ۱۶۲۶ء)

سلطان محمد قلی (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱ء)

پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر نہ تو شاہاں اپر مجلس بنایا

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۲ - ۱۶۲۶ء)

پیا سن نولا من آنا را بھلایا ۔ نزاکت عجب سبز رنگ ہوں دکھایا

خاکی ——— ٹھانی ہے اپنے من میں اتبر ہی سر سجن ۔ تجھ ہیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

نوری ——— ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد ۔ بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

غواصی ——— طوطی نامۂ بخشی کو نظم کیا اور مثنوی سیف الملوک لکھی ۔

شاہجہان ۱۶۲۸ - ۱۶۶۶ء / ۱۰۳۷ - ۱۰۷۶ھ

سلطان عبد اللہ ۱۰۳۵ - ۱۰۸۲ھ

قطب شاہی) اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب ۔ دیکھتا ہوں تو رہنا مجھ میں تاب

نصرتی (عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی محمد عادل شاہ ۱۵۷۹ - ۱۶۶۰
مثنوی گلشن عشق ، علی نامہ

ابن **نشاطی** (عبد اللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ - ۱۰۸۲ء)
مثنوی پھول بن

اورنگ زیب ۱۰۶۸-۱۱۱۹ھ / ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء

ابو الحسن تانا شاہ دکنی ۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ / ۱۶۷۲-۱۶۸۷ء

کس ررکھوں کاں جاؤں میں مجھ دل پہ بھلی بھرا ٹے
اک باٹے گیئے ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹے

ہاشمی بیجاپوری (انتقال ۱۱۰۹ھ)

مثنوی یوسف زلیخا، دیوان ریختی

بیچارہ دکنی
پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا کا یوں ہوا
جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا

خوشنود دکنی
سب رین جاگے سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ میں درشن کو دکھلایا نہیں

سعدی دکنی
ہمنا تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

عزیز اللہ دکنی
مجھ ناتواں میں کیا سکت جو بولوں لیاں کی صفت
عاجز عزیز اللہ پر دکھن کے سب پیران مرد

غوثی دکنی
تیغ بھواں سے کن کہا گھائل ہمکو کرو
پلکاں کے یا خنجر ستی بسمل ہمکو کرو

قادر دکنی
ہر چند ہمن سب اٹھایا ہے ہاتھ　اب بھی نہ آزاد کہاں ہیہات
عالم منے ہر ایک یہ کہتا ہوگا　دکھن میں قادر اجھوں ہے قید حیات

لطفی دکنی
تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جی
دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے

ملک دکنی
تن من فدا کر دوں اس ہشیار ساقی اوپر
یک قطرہ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے

مہر علی دکنی
موتی دریا میں اپسکے تئیں کاں اگر دھو دیں
کہ تمن کے وہ بنا گوش کے ہمسر ہو دیں

اورنگ زیب ۱۰۵۷ - ۱۷۰۷ء / ۱۰۶۹ - ۱۱۱۸ھ

باشم دکنی

دکھن اور ہند دلبر ہمن سوں بیحجاب اچھے
گر کھڑے چاند سے برجن کے پیچ و تاب اچھے

بالقف دکنی

تمری انکھیاں اور زلف سے کافر ہوا سارا جہاں
اسلام اور تقوی کہاں زہد اور مسلمانی کدھر

شاہی دکنی (ندیم تانا شاہ)

ملنا تمھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ نہ کہے
کس کس کا منہ موند وں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

مرزا دکنی (ندیم تانا شاہ)

عارض ہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا
سمجھیں ہمن کلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا

فطرت موسوی

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پری ہے
در خانہ آئینہ گتا جھوم پری ہے

نامی دکنی

اوراں ترے ہیں بارہمن ہیں ترے غلام
اوراں کے ساتھ نامی کو شامل نکو کرو

نوری دکنی (شجاع الدین اتالیق وزیر زادہ تانا شاہ)

نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ بتا
حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا

افضل دکنی

پری ہے گل میں میرے بیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگاں کو ہانسی

ادجی دکنی

در پنا سیتی نگا وکو مائل نکو کرو
یہ دکھ اپس کے واسطے حاصل نکو کرو

اورنگ زیب کا آخری عہد

بہادر شاہ	۱۷۰۷ ——— ۱۷۱۲ء / ۱۱۱۹ ——— ۱۱۲۴ھ
جہاندار شاہ	۹ ماہ حکومت
فرخ سیر	۱۷۱۳ ——— ۱۷۱۹ء / ۱۱۲۴ ——— ۱۱۳۱ھ
محمد شاہ	۱۷۱۹ ——— ۱۷۴۸ء / ۱۱۳۱ ——— ۱۱۶۱ھ
احمد شاہ	۱۷۴۸ ——— ۱۷۵۴ء / ۱۱۶۱ ——— ۱۱۶۷ھ
عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ ——— ۱۷۵۹ء / ۱۱۶۷ ——— ۱۱۷۳ھ
شاہ عالم	۱۷۵۹ ——— ۱۸۰۶ء / ۱۱۷۳ ——— ۱۲۴۸ھ

وَلیؔ دکنی (۱۰۷۹ - ۱۱۵۵ھ) دو بار دہلی گئے

پہلا دور

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

دوسرا دور

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن
باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

تیسرا دور

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

فقیر اللہ آزاد دکنی (فراقی دکنی کے ساتھ دہلی گئے)

کوئی کسی ہی فن میں مجھ سے تو بر نہ آیا
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

احمد گجراتی

شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے در تک گئے

سراج دکنی (شاگرد سید حمزہ علی دکنی) (انتقال ۱۱۷۷ھ)

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جانا دکہاں سراج کہاں آفتابِ عالمتاب

داؤد دکنی (انتقال ۱۱۶۸ھ)

اے زاہد اس اُٹھاؤ جبیں کو زمین سے
جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے

عُزلت دکنی (وفات ۱۱۸۰ھ، دہلی میں سیر کے لئے آئے تھے ۱۱۶۲ھ)

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

شاہ مبارک آبرو

کریں جو بندگی ہو دیں گنہگار
بتاں کی کچھ نرالی ہے خدائی

مجھ بیت کیوں جنوں ستی خاطر نجیب کی
آئی بہت . تجھ کو خبر ہے بسنت کی

حاتم (۱۱۱۱ - ۱۲۰۷ھ)

جب سے تیری نظر پڑی ہے بلاک
تب سے انکھیں ہیں پلک سے پاک

مضمون

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کے

یکرنگ

دیکھو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے
اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

فغاں (۱۱۸۶ وفات)

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
کیا حال پوچھتے ہو فغاں کا نشانہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

قائم دہلوی

غرور حسن کیا ممکن کسی شاہ داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

سودا (۱۱۲۵ - ۱۱۹۵ھ)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فکر معاش و عشق بتاں، یاد رفتگاں
دو دن کی زندگانی میں کیا کیا کرے کوئی

میر (۱۱۳۷ - ۱۲۲۵ھ)

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا
سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

درد (۱۱۱۹ھ)

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

سوز (۱۱۴۱ - ۱۲۱۳ھ)

اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یا رب راز دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
میں کس کے ہاتھ لکھ بھیجوں میاں صاحب سلام
مجھے تو بھول جاتا ہے ترے دھڑکے سے نام

میرزا مظہر (۱۱۱۱/۱۱۹۵ھ)

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا
الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

قائم (۱۲۱۰ھ وفات)

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم
مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے
اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

ضیا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر رکھ دیا
اس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

کل کی رسوائی تجھے کیا کم تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

یقین

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لے کر چھوڑیگی آخر یہ بیماری مجھے

احسن اللہ بیان

مصلحت ترک عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

تاباں

عجب احوال ہے تاباں کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو ہوا سو ہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

فراق

دل تھا منا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

حزیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

اثر

اثر کیجے کیا کہ مر جائیے
مگر آپ ہی سے گذر جائیے

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا
جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

ہدایت

بھلا بتا تو مری جان کچھ ہدایت نے
تمہارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا

مگر یہی نا کہ بے اختیار ہو کے کبھی
کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا

حسن (۱۲۰۱ھ وفات)

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا
کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

افسوس

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہونچا

لطف

پاس ناموس محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

حسرت اُستاد جرأت (سنہ ۱۲۱۷ھ وفات)

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اُن کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

شاہ عالم

اکبر شاہ ثانی $\frac{۱۸۰۶ - ۱۸۳۷ء}{۱۲۴۸ - ۱۲۵۳ھ}$

بہادر شاہ ظفر $\frac{۱۸۳۷ - ۱۸۵۷ء}{۱۲۵۳ - ۱۲۷۴ھ}$

رنگین (۱۱۷۱ - ۱۲۵۱ھ)

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں بیرون خفقاں رہتا ہے

نصیر (۱۲۵۴ھ وفات)

دیکھ لیتی جو اُٹھا کر تو ترے ٹوٹتے ہاتھ
لیلیٰ اتنا تو نہ تھا بار وہ محمل بھاری

ممنون (۱۲۶۰ھ وفات)

دل میں کیا کیا ہوسیں عرضِ تمنا تھی مرے
تری چتون کا وہ ڈھب مانعِ تقریر رہا

مومن (۱۲۱۵ - ۱۲۶۸ھ)

جان نکلا وصل عدو بیچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

ذوق (۱۲۰۴ - ۱۲۷۱ھ)

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بوئے گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

نسیم (۱۲۰۲ وفات)

برق نے اک طرزِ بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں

غالب (۱۲۱۲ - ۱۲۸۵ھ)

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

ظہیر

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے
کبھی جو ذکر حریفانِ بادہ خوار آیا

جرأت (سنہ ۱۲۲۵ھ وفات)

ناصح میں اور ہم میں ہیں یہ طرفہ صحبتیں
ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے ہے

انشاء (سنہ ۱۲۳۳ھ وفات)

غصہ میں ترے ہم نے عجب لطف اُٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

راسخ (سنہ ۱۲۳۸ھ وفات)

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

رند (سنہ ۱۲۴۰ھ وفات)

پھینکدوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں اس پر تو ہے قابو اپنا

مصحفی (سنہ ۱۲۴۰ھ وفات)

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ناسخ (سنہ ۱۲۵۴ھ وفات)

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

آتش (سنہ ۱۲۶۳ھ وفات)

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

خواجہ وزیر (۱۲۷۰ھ وفات)

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

صبا (سنہ ۱۲۷۱ھ وفات)

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہیں کیا جانئے کیا یاد آیا

آغا حجو شرف (سنہ ۱۲۷۱ھ وفات)

ٹھہر گیا ہے لاکے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا، کون تھا؟

برق (سنہ ۱۲۷۳ھ وفات)

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم، موسم گل آنے دو

رشک (سنہ ۱۲۸۳ھ وفات)

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

تسکین (سنہ ۱۲۶۶ھ وفات)

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

شیفتہ (سنہ ۱۲۲۱ھ - سنہ ۱۲۸۶ھ)

ایسی رغبت سے کیا قتل. گماں کاہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو او۔ تم سے محبت نکلی

آزاد (سنہ ۱۲۰۴ھ - سنہ ۱۲۸۵ھ)

میں اور ذوقِ بادہ کشی۔ لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

ذکی (پیدائش سنہ ۱۸۳۹ء)

کس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے دشوار دیکھنا

امیر مینائی (سنہ ۱۲۴۴ھ - سنہ ۱۳۱۸ھ)

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آپ کی بھی کمر کہیں ہیں نہ کہیں

حالی (سنہ ۱۲۵۳ھ - سنہ ۱۳۳۳ھ)

عشق سنتے تھے جسے ہم یہ وہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

داغ (سنہ ۱۲۴۶ھ - سنہ ۱۳۲۲ھ)

جھلکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

انور (زمانہ نامعلوم)

بدمستیوں کا رنگ ہے جوش شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

ہر دور کے قابل ذکر شعراء

متقدمین		متوسطین		متاخرین		دور حاضر
دور اول	دور ثانی	دور اول	دور دوم	دور اول	دور ثانی	
ابراہیم عادل شاہ ثانی	ولی	سودا ۔ میر	مصحفی	شاہ نصیر	اسیر	مضطر خیرآبادی (مرحوم)
سلطان محمد قلی	آزاد	درد ۔ سوز	انشا	ناسخ	امیر	حسرت موہانی
سلطان محمد قطب شاہ	احمد گجراتی	قایم ضیا	راسخ	آتش	داغ	جلیل مانکپوری
عبداللہ قطب شاہ	سراج	یقین بیان	جرأت	ذوق	تسلیم	حفیظ جونپوری
خاکی ۔ نوری	داؤد	حزیں تاباں	حسن	مومن	جلال	آرزو ۔ صفی
غواصی ۔ نصرتی	عزلت	اثر فراق	رنگین	غالب	منیر	عزیز، اثر، ثاقب،
ابن نشاطی تانا شاہ	شاہ مبارک آبرو	ہدایت ۔ حسرت	ہوس	رشک	ظہیر	محشر، آسی، افسر،
بیچارہ ۔ سعدی ۔ خوشنود	ممنون		لطف	تسلیم	سالک	سیماب، سائل
عزیز اللہ ۔ غوثی	یکرنگ		افسوس	نظام رامپوری	ریاض	نوح، آغا شاعر
قادر ۔ لطفی ۔ ملک	کلیم		شہیدی	برق ۔ بحر	شاد	اصغر، جگر، فانی
مہر علی ۔ ہاشمی ۔ ہاتف	حاتم			شرف ۔ جلیل ۔ رند	نظم	آشفتہ، سراج
شاہی ۔ مرزا ۔ فطرت	فغاں			صبا ۔ وزیر ۔ شیفتہ	دبیر	ریاض (مرحوم)
نامی ۔ نوری (شجاع الدین)	میرزا مظہر			آزاد ۔ تسکین	انیس	امید امیٹھوی وغیرہ
افضل ۔ اوجی				ذکی ۔ حالی		

ہر دور کے مشہور یا بہترین شاعر

متقدمین		متوسطین		متاخرین	
دور اول	دور دوم	دور اول	دز.دوم	دور اول	دور دوم
غواصی	ولی	سودا	مصحفی	ناسخ	امیر۔ اسیر
ابن نشاطی	سراج	میر	جرأت	آتش	داغ
شاہی	مضمون	درد	حسرت	ذوق	تسلیم
بیچارہ	یکرنگ - حاتم	سوز - قائم	انشار - ہوس	مومن - غالب	جلال، ظہیر، سالک
	فغاں	یقین - تاباں	راسخ - رنگین	نسیم، شیفتہ، تسکین، حالی	شاد عظیم آبادی
	میرزا مظہر	اثر - حسرت	حسن - افسوس	نظام رامپوری	

دور حاضر

حسرت موہانی۔ مضطر خیرآبادی (مرحوم) جلیل مانکپوری ۔ ریاض خیرآبادی (مرحوم)۔ آرزو۔ صفی۔ عزیز۔ اثر۔ آسی۔ سیماب۔ اصغر۔ جگر۔ فانی

ہر دور میں چوٹی کا ایک ایک غزلگو شاعر

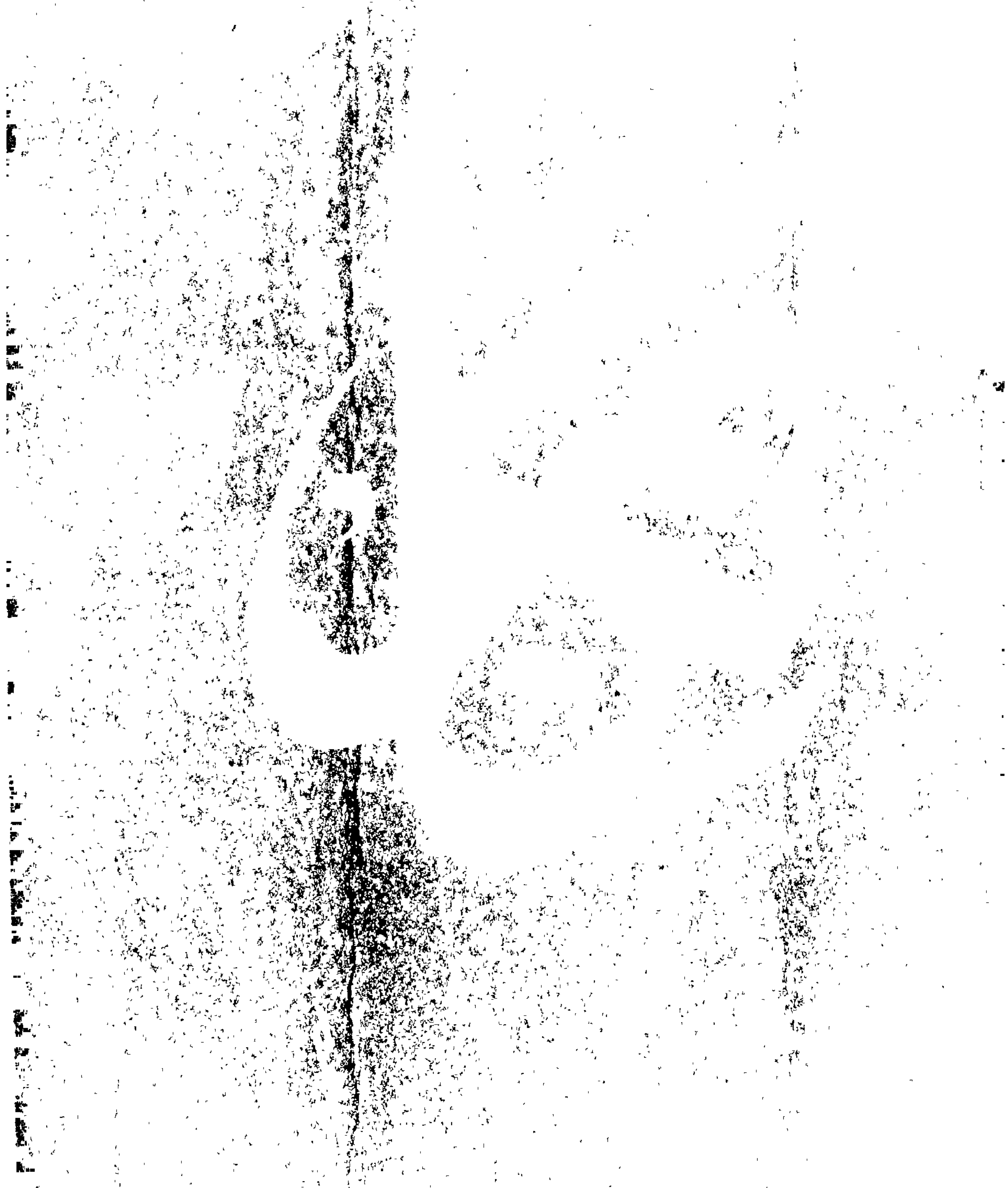
متقدمین		متوسطین		متاخرین	
دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم
غواصی	ولی	میر	مصحفی	مومن	داغ

دور حاضر

حسرت موہانی

نگار

شمارہ ۱	فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۳۵ء	جلد ۲



نرخنامہ اجرت اشتہار

	یکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	یک ماہ
صفحہ	۶۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
کالم	۵۰	۲۵	۱۳	۶
چوتھائی صفحہ	۲۵	۱۳	۶	۳

اجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ [illegible] وی پی کے ذریعہ سے وصول [illegible]
[illegible] کیلئے اشتہار دیا جائے [illegible] رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔
[illegible] نرخ وہی [illegible] رہیگا
اشتہار فراہم کرنے والے ایجنٹوں کا کمیشن بذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر

نگار کی [illegible]

[illegible]

کے حساب سے قیمت لی جائے گی

حصول جواب کے لئے ٹکٹ [illegible] ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری [illegible]
تو تعمیل دشوار ہے



نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین فروری ۱۹۳۵ء | شمارہ ۲

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	فروری ۱۹۳۵ء	شمارہ ۲

ملاحظات

ہندوستان کا جدید نظام سیاست

چونکہ ہمارا ملک ایک جدید آئین حکومت کے زیر اثر آنے والا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کی اشاعت میں اس پر ایک عمومی تبصرہ کرکے قارئین کرام کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔

اس سے ہندوستان کا ہر فرد آگاہ ہے کہ کانگرس ایک زمانہ سے اس امر کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام حکومت نہایت قیمتی اور حد درجہ خود غرضانہ ہے اور تاوقتیکہ خود اہل ملک کو ایوان حکومت میں کامل عاملانہ اختیارات نہ دئے جائیں، کوئی اصلاح ممکن نہیں۔ آخرکار بہت چیخ پکار کے بعد حکومت ہند اس بات پر راضی ہوئی کہ ایک کمیشن کی وساطت سے اہل ہند کے مطالبات پر غور کرے۔ چنانچہ سائمن کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس نے ہندوستان کا دورہ کرکے اپنی رپورٹ شایع کی۔ اس کمیشن کے تیور ابتدا ہی سے ایسے تھے کہ آزاد خیال تو خیر کیا اعتدال پسند حضرات نے بھی اس کی طرف سے کسی کامیابی کی توقع نہ پائی اور تقریباً ہندوستان کے ہر گوشہ سے سائمن کمیشن کی مخالفت میں آوازِ بلند کی گئی

اس میں شک نہیں کہ سائمن کمیشن نے اہل ملک کے خیالات کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور اگر وہ دیانت سے کام لیتی تو ملک کے رجحانات کا لحاظ کرکے کوئی مناسب لائحۂ عمل پیش کرتی، لیکن افسوس ہے کہ اُس کی کوئی سفارش ایسی نہ تھی جسے یہاں کا کوئی طبقہ قبول کر سکتا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کانگرس کا زور تھا اور ہر طرف سے یہی چیخ پکار سننے میں آتی تھی کہ اگر ملک کو آزادی کامل نہیں مل سکتی تو کم از کم ڈومی نین ہوم رول تو ملنا ہی چاہئے جو برطانیہ کے دیگر مستعمرات کو حاصل ہے۔ اکابر قوم جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے، بائکاٹ اور پکٹنگ کے سلسلہ میں روزانہ حکومت اور ارکان کانگرس کے درمیان تصادم کی خبریں آ رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک شاید غلامی کی آخری ساعتوں سے گزر رہا ہے۔

حکومت برطانیہ چونکہ جنگ و صلح دونوں زمانوں میں اپنی نرم و گرم پالیسی کبھی نہیں چھوڑتی، اس لئے اس نے اگر ایک طرف قانون کے شکنجہ میں لوگوں کو کسنا شروع کیا تو دوسری طرف گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر دی۔ اس سے مدعا یہ تھا کہ اہل ملک کی توجہ اس طرف مائل کر دی جائے اور کم از کم کوئی ایک ہی جماعت حکومت کا ساتھ دینے والی پیدا کر لی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حکمت عملی بہت کامیاب ہوئی اور سارا ملک گول میز کانفرنس کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسکے بعد ایک طرف کانگرس کا زور گھٹ جانے اور دوسری طرف برطانوی کابینہ کی تبدیلی نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور گول میز کانفرنس کا نتیجہ قرطاس ابیض کی صورت میں ظاہر ہوا۔

خیال تھا کہ قرطاس ابیض میں جو تجویزیں پیش کی جائیں گی وہ ملک کے ان مطالبات کے موافق ہوں گی جو گول میز کانفرنس میں پیش کئے گئے تھے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا، کابینہ میں قدامت پسند طبقہ کے اقتدار اور کانگرس کے کمزور پڑ جانے سے تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور جس طرح سائمن کمیشن رپورٹ کوئی صحیح چارۂ کار ثابت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح قرطاس ابیض بھی ایک بوسیدہ پارۂ کاغذ سے زیادہ نہ نکلا۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن تماشہ تو یہ ہے کہ اب جو پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے، اور جس پر ہندوستان کا آئندہ آئین حکومت قایم ہونے والا ہے۔ وہ قرطاس ابیض سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور ہندوستان کے کسی طبقہ نے اس کو نگاہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ اس کی سب سے زیادہ اہم و اصولی تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کو خود مختار کر دیا جائے، یعنی ہر صوبہ اپنے حالات کے لحاظ سے جو قانون مناسب سمجھے طیار کرے اور جو طریقے اس کی فلاح و بہبود کے لئے موزوں ہوں ان کو عمل میں لائے۔ اس میں شک نہیں کہ اُصولاً یہ تجویز نہایت مناسب ہے، کیونکہ ہندوستان کے مختلف حصوں کی آبادی اپنی تہذیب و معاشرت، اپنے عادات و خصائل اور اپنے جذبات و ماحول کے لحاظ سے یقیناً جداگانہ قانون کی مقتضی ہے۔ لیکن یہ خود مختاری جس انداز سے دی جا رہی ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ہم کسی شخص کو روپیہ کا صندوقچہ تو سپرد کر دیں لیکن کنجی اپنے ہی پاس رکھیں۔

قبل اس کے کہ آپ اس خود مختاری کی حقیقت کو سمجھیں، یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ آئین حکومت میں دو جماعتیں بالکل علحدہ علحدہ ہیں، ایک وہ جو قانون بناتی ہیں اور دوسری وہ جو نظم و نسق کی ذمہ دار ہے، یعنی ایک وہ جسے مجلس آئین ساز کہتے ہیں اور دوسری وہ جسے عمال حکومت کہنا چاہئے۔

پس اس صورت میں کسی صوبہ یا ملک کی خود مختاری کا حقیقی مفہوم صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قانون بنانے والی جماعت قانون طیار کرے

اور عمال حکومت بالکل اس قانون کے مطابق عمل کریں لیکن ہندوستان کے صوبوں کی خود مختاری کی صورت یہ ہوگی کہ مجلس آئین ساز قانون تو بناتی رہیگی مگر جماعت عمال اس قانون کی پابند نہ ہوگی۔

اس کی توجیہہ مشترک کمیٹی کی رپورٹ میں یہ کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں چونکہ منظم سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہیں اور مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ نیابت جاسنہ سیاست کی بنا پر باقی ہے اس لئے کسی سیاسی رائے عامہ کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور قیام امن و سکون یا حفاظت اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کی جماعت عاملہ مجلس آئین ساز کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ دلیل قرین عقل نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک بڑا سیاسی مغالطہ ہے۔ کیونکہ اول تو فرقہ وارانہ نیابت کی ذہنیت خود حکومت کی پیدا کی ہوئی ہے جو مشترک حق نیابت کو پامال کرکے وجود میں لائی گئی ہے اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں مسئلہ نیابت اذہنی نقص انہیں سے پیدا کیا جاتا ہے، کہ منظم سیاسی جماعتوں کے اختلافات کی بنا پر کسی طرح درست نہیں، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو صحیح باور کرلیں، تو بھی اس حقیقت کو کسی دلیل سے محو نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں خواہ ان میں باہمی اختلاف مذہب کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، اس مطالبہ میں پوری طرح متحد الخیال ہیں کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور کسی غیر قوم کی حکومت کو صرف اس لئے گوارا کرنا کہ وہ فریق ثالث کی حیثیت سے اُن کے مناقشات دور کرنے کا بڑے سے بڑا معاوضہ حاصل کرتی رہے، ملک کی سخت توہین ہے۔

رہگیا منظم سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا، سو یہ ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے ذمہ دار حکومت کا اور جب تک ہندوستانیوں کو حکومت کے اختیارات کامل نہ مل جائیں ان میں خالص سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ۔۔۔ الغرض جدید آئین حکومت میں بھی مجلس آئین ساز کی بیکسی و بیدست و پائی بدستور وہی قائم ہے جو اس سے پہلے تھی، البتہ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے مجلس آئین ساز میں حکومت کے نمایندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور اب ملک کے نمایندوں کی کثرت ہے لیکن اس سے نتیجہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ حکومت جس چیز کا نام ہے اُسے جو اختیار سیاہ و سفید کا پہلے حاصل تھا اس سے زیادہ اب مل گیا ہے۔

جدید آئین حکومت میں ہر صوبہ کے گورنر کو جو اختیارات عطا ہوئے ہیں وہ اتنے وسیع ہیں کہ مجلس آئین ساز کا وجود بالکل بے معنی ہوکر رہجاتا ہے۔ گورنر کو دو طرح کے اختیارات تفویض کئے گئے ہیں، ایک وہ جنھیں وہ خود اپنی ذاتی رائے سے استعمال کرسکتا ہے اور دوسرے وہ جنھیں اپنے وزراء کے ذریعہ سے بروئے کار لاسکتا ہے ۔۔۔ ان کی تفصیل بھی سن لیجئے:۔

جہاں تک ذاتی اختیارات کا تعلق ہے گورنر صوبہ میں امن، سکون قایم رکھنے کے لئے جس وقت جو چاہے تدبیر عمل میں لاسکتا ہے، اسی طرح تجارتی تفریق کو روکنے، اقلیتوں کے مفاد کی نگہداشت، سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ ایک مستبد حکمراں کی حیثیت رکھتا ہے اور مجلس آئین ساز سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔

اب آپ ان اختیارات کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تمامتر اختیارات گورنر ہی کو حاصل ہیں اور ملک و قوم کی آواز کو کسی اہم معاملہ میں دخل نہیں۔ تجارتی تفریق کو روکنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر برطانیہ و ہندوستان کے باہمی تعلقات تجارت کے سلسلہ میں اگر کبھی برطانوی تجارت

کو کسی قسم کا نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوگا تو ہندوستانی تجارت کے مفاد کو آسانی سے پامال کیا جا سکیگا۔ قیامِ امن و سکون کی ذمہ داری نہایت وسیع معنی رکھتی ہے یہاں تک کہ ملک کے جایز مطالبات کے لئے اگر کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا تو گورنر اس کو فرو کرنے کے لئے نہ مجلس آئین ساز کی پرواہ کریگا نہ مجلس وزراء کی۔ اس باب میں مجلس وزراء کو بھی بالکل علحدہ کر دیا گیا کیونکہ ممکن تھا وہ اہلِ ملک کے دباؤ یا مروت سے استبداد کو کام میں نہ لا سکتے۔

رہگیا اقلیتوں کا مفاد، سو اس سے مقصود گورنروں کے لئے یہ آسانی بہم پہونچانا ہے کہ وہ جمہور کی آواز کو آسانی سے دبا سکیں۔ اسی قسم کے دو ذریعے سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سرکاری ملازم مجلس آئین ساز یا مجلس وزراء سے بے تعلق رہیں گے تو لامحالہ گورنر کے اشارہ پر چلیں گے اور پبلک کے مفاد سے ان کا احساس بالکل بیگانہ رہیگا۔ اسی طرح ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں گورنروں کو موقعہ حاصل ہوگا کہ وہ جمہور کی خواہش کو رد کر سکیں۔

آئین سازی کے سلسلہ میں گورنر کے اختیارات اور زیادہ نامحدود ہیں، یعنی اس کو اختیار حاصل ہوگا کہ ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے جو قانون چاہے بنائے، جتنا روپیہ چاہے صرف کرے، جو آرڈیننس مناسب ہو جاری کرے اور مجلس آئین ساز کو معطل کر کے حکومت کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیلے۔

الغرض گورنروں کے ذاتی اختیارات پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور دنیائے حکومت کی تاریخ میں سوائے اس جدید آئین کے کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملسکتی جس میں مجلس آئین ساز اور حکومتِ عاملہ کے درمیان اس درجہ بے اعتمادی و بے تعلقی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

گورنروں کو علاوہ ذاتی اختیارات کے بعض اختیارات وزراء کی وساطت سے بھی مرحمت ہوئے ہیں یعنی مجلس وزراء کا ہاتھ مجلس آئین ساز میں بھی رہیگا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ پبلک کے نمایندوں کو جس حد تک مجلس آئین ساز میں ووٹ دینے کا حق ہے اس کو بھی ضعیف کر دیا جائے تاکہ کوئی تجویز باتفاق آراء پاس نہ ہو سکے۔

صوبجات بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس میں دو ایوان ہوں گے ایوانِ ادنیٰ کا نام لجسلیٹو اسمبلی اور ایوانِ اعلیٰ کا نام لجسلیٹو کونسل ہوگا۔ ان دونوں کو علاوہ مالیات کے برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور اگر بعض مسائل میں دونوں ایوان متفق الرائے نہ ہوں گے تو ان کا مشترک اجلاس کیا جائے گا اور کثرتِ آراء سے فیصلہ ہوگا۔ بظاہر یہ تجویز بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا راز یہ ہے کہ ایوانِ اعلیٰ کے ممبر چونکہ دولت مند طبقہ کے نامزد کئے ہوئے ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ایوان میں قدامت پسند و رجعت پسند لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور اس طرح گویا گورنر کا ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

اب مرکزی حکومت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اول اول کمیشن کی رائے یہ تھی کہ مرکزی حکومت کو بڑی حد تک غیر ذمہ دار رکھا جائے اور یہ صرف اس لئے کہ ہندوستانیوں کو کوئی موقعہ حکومت میں دخل دینے کا نہ ملے۔ لیکن بعد کو مشترکہ کمیٹی نے یہ سفارش منظور نہیں کی، کیونکہ اول تو ریاستوں نے اعتراض کیا کہ جب تک مرکزی حکومت ذمہ دارانہ ہو وہ وفاق میں شامل نہیں ہو سکتیں، دوسرا سبب یہ تھا کہ اگر مرکزی حکومت غیر ذمہ دار

ہوگی تو مجلس آئین ساز کے مقابلہ میں اس کی کوئی قوت باقی نہ رہیگی۔ اس لئے اب یہ صورت تجویز کی گئی ہے کہ محکمہ خارجہ اور دفاع براہ راست گورنر جنرل کے اختیار میں دیدئے جائیں اور باقی تمام امور کی ذمہ داری وزراء کے سپرد کردی جائے، لیکن شرط یہ ہے کہ جن امور میں گورنر جنرل کو خصوصی اختیارات سیاہ وسپید کے حاصل ہیں، ان پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

امور خارجہ پر گورنر جنرل کے اختیارات کے معنی یہ ہیں کہ حکومت ہند خود براہ راست نہ کسی دوسرے ملک سے کوئی معاہدہ کرسکتی ہے اور نہ بین الاقوامی سیاسیات میں حصہ لے سکتی ہے، بلکہ یہ تمام باتیں حکومت برطانیہ سے متعلق ہوں گی۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی علحدہ ہستی سیاسیات میں شمار نہیں ہوسکتی بلکہ وہ صرف تاج برطانیہ کا ایک ایسا ماتحت حصہ ہے جسے علحدہ کوئی مستقل ہستی نہیں مل سکتی۔

ہندوستان کی حفاظت و دفاع میں صرف گورنر جنرل کو ذمہ دار قرار دیا جانا محض اس لئے ہے کہ ہندوستانیوں کو نہ فوج میں زیادہ درخور پانے کا موقع مل سکے اور نہ فن حرب کے اصول سے ان کو آگاہی حاصل ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو تو ہندوستان مدافعت نہیں کرسکتا کیونکہ نہ وہ فنون جنگ سے واقف ہے اور نہ آلات حرب طیار کرسکتا ہے، لیکن اس عذر کی بنا پر کسی ملک کو ہمیشہ کے لئے اس فن سے بیگانہ رکھنا اور اس کو کبھی اس بات کا موقعہ نہ دینا کہ وہ ملک کی حفاظت کا اہل بن سکے کتنا غیر روادارانہ بلکہ غیر منصفانہ طرز عمل ہے۔

مالیات کا انتظام ہر چند مرکزی وزراء کے سپرد ہوگا، لیکن چونکہ اصل ذمہ داری گورنر جنرل کی ہے اس لئے وہ بجٹ میں مداخلت کرکے جس تجویز کو رد کرنا چاہے فوراً مسترد کرسکتا ہے۔

مرکزی حکومت میں دو ایوان ہوں گے، ایک کونسل آف اسٹیٹ کے نام سے، دوسرا ہاؤس آف اسمبلی کے لقب سے۔ اول الذکر ایوان کے ارکان ۲۶۰ تک ہوں گے جن میں ۱۵۰ ملک کے نمایندے ہوں گے ۱۰۰ ریاستوں کے اور ۱۰ گورنر جنرل کے نامزد کئے ہوئے۔ دوسرے ایوان کے ارکان کی تعداد ۳۷۵ تک ہوگی جن میں ۲۵۰ ملک کے نمایندے اور ۱۲۵ ریاستوں کے۔

چونکہ ان دونوں ایوانوں میں ایک بڑی تعداد ریاستوں کے نمایندوں کی ہوگی اور یہ نمایندے وہاں کی پبلک کے منتخب کئے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ ریاستوں کے نامزد کردہ ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں برطانوی ہند کے معاملات سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور وہ حکومت کی رائے کے خلاف کبھی برطانوی ہند کی رعایا کا خیال نہ کریں گے۔

ان دونوں ایوانوں کو برابر کے اختیار حاصل ہوں گے اور اختلاف رائے کی صورت میں دونوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا اور کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا، لیکن اس مشترکہ جلسے کے معنے یہ ہوں گے کہ اکثریت رجعت پسندوں کی ہوجائے گی، کیونکہ کونسل آف اسٹیٹ کے تمام اراکین صوبوں کے ایوان اعلیٰ کے منتخب کئے ہوئے ہوں گے اور مشترکہ اجلاس میں ان کی اور ریاستوں کے نمایندوں کی تعداد ملکر نصف سے زیادہ ہوجائے گی۔

الغرض مختصراً یہ ہے وہ جدید آئین حکومت جو ہندوستان کو ملنے والا ہے اور یہ ہیں وہ آزادیاں جو ملک و اہل ملک کو یہاں کے نظم و نسق میں عطا ہوئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات ان جملہ ناکامیوں کا ذمہ دار برطانیہ کی پالیسی اور یہاں کے قدامت پسند طبقہ کو

قرار دیتے ہیں، لیکن سیاسیات کے باب میں میرا مسلک ہمیشہ آزاد رہا ہے اور میں اس کو بالکل خلاف فطرت نہیں سمجھتا اگر برطانیہ اپنے مفاد کے لئے ہندوستان کی خواہشوں کو پامال کر دینا چاہتا ہے، کیونکہ وہ یہاں درس اخلاق و روحانیت دینے نہیں آیا بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو فائدہ پہونچانے کی نئی راہیں نکالنے کے لئے آیا ہے اور اُس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو سکتا اگر وہ ہندوستان کے مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دے۔ اس لئے حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا نہایت لایعنی بات ہے اور ان تمام ناکامیوں و مایوسیوں کا سبب خود ہمیں اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے۔

دنیا میں کوئی قوم اس وقت تک نہیں اُبھر سکتی، جب تک وہ خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کرے اور احساس آزادی کا ثبوت بجائے زبان کے اپنے افعال و کردار سے نہ دے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں آزادی کا احساس بڑی حد تک پیدا ہو گیا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کی سیاسیات کا قیام زیادہ تر مذہبی جذبات پر ہے اور وطنیت کا رشتہ کوئی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے اس وقت تک کوئی متفقہ آواز اہل ملک کی بلند نہ ہو سکی اور حکومت نے ہمیشہ اسی اختلاف کی آڑ پکڑ کر ملک کی آزادی کو اسقدر تعویق میں ڈالا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اسی طرح معلق رہیگا۔

گزشتہ ماہ کا رسالہ

افسوس ہے کہ جنوری ۱۹۳۵ء کے رسالہ میں ملاحظات کے لئے جگہ نہ نکل سکی اور مجھے بالکل اسکا موقعہ نہ ملا کہ اس بزم ادب میں شریک ہونے والوں کا شکریہ ادا کرتا۔

جس وقت اول اول میں نے اس کا اعلان کیا تو مجھے توقع تھی کہ مضامین کثرت سے اور اچھے موصول ہوں گے۔ سو جس حد تک کثرت کا تعلق ہے اس میں تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک "اچھے" ہونے کا سوال ہے یقیناً میری توقعات پوری نہیں ہوئیں اور بہت سے مضامین مجھے نظر انداز کرنا پڑے۔

۲۳۶ صفحات میں علاوہ میرے مضامین کے جو ۱۱۶ صفحات پر حاوی ہیں، ۱۲۰ صفحات دیگر حضرات کے ہیں اور اس طرح گویا نصف بار میرے احباب نے اُٹھایا جس کا میں از بس شکر گزار ہوں۔

مقامی احباب میں سب سے زیادہ مدد مجھے مسٹر مشیر احمد صاحب علوی بی اے سے ملی، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ خود ایک گرانقدر مقالہ تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی، بلکہ مولوی امیر احمد صاحب علوی اور مولوی نور الحسن صاحب نیّر سے بھی دو نہایت پاکیزہ مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ علاوہ اس کے جو اخلاقی اعانت انھوں نے کی ہے، اس کا اظہار چنداں ضروری نہیں، لیکن اعتراف لازم ہے۔

میں مرزا جعفر علی خانصاحب اثر کا بھی زیر بار کرم ہوں کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے مضمون بھیجنے میں اقدام کیا اور ایک ایسے بحث کو پیش کیا جو دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ اسی طرح جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی، جناب سید تمکین کاظمی، جناب افسر میرٹھی اور حضرت سیماب اکبر آبادی کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ انھوں نے میری التجا کو قبول فرمایا اور اس ادبی صحبت میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی۔

جناب ناطق لکھنوی کا میں خصوصیت کے ساتھ ممنون ہوں کیونکہ اگر وہ اپنی نظم "تخلیق اُردو" مرحمت نہ فرماتے تو رسالہ غالباً نظم کے لحاظ سے بالکل مہمل نظر آتا۔ جناب ناطق نے اس نظم میں جس خوبی و پاکیزگی سے اُردو شاعری کی تاریخ پر تبصرہ فرمایا ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

صوبۂ بہار کی شاعری پر بھی محترم مولوی عبد المالک صاحب آروی نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا، ان کا شکریہ میں اس لئے ادا نہیں کرتا کہ خود اپنے مضمونوں پر یہ سے اپنا شکریہ کب ادا کیا ہے۔

جنوری ۳۶ء کا نگار بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ جنوری ۳۶ء کا نگار ہندی شاعری کے لئے وقف ہو اور اگر ناظرین کرام گوارا فرمائیں تو بجائے نستعلیق کے ٹائپ میں شایع کیا جائے۔

عرصہ ہوا ہندی شاعری پر میری ایک کتاب "جذبات بھاشا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مجھے اس زبان پر عبور حاصل ہے درست نہیں، لگاؤ ضرور ہے اور بہت ہے۔ لیکن اس خدمت کو میں تنہا کبھی انجام نہیں دے سکتا اگر برادران وطن میری اعانت نہ فرمائیں۔ ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں پریاگ، کاشی اور اجودھیا کا سفر کروں کے اس زبان کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کروں اور اس زبان کے جتنے رتن میسر آسکتے ہیں وہ سب پیش کردوں

مسلمانوں میں اس زبان پر ماہرانہ عبور رکھنے والے بہت کم ہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس سے لطف اُٹھانے والوں کی کمی نہیں، اسلئے میں بہت ممنون ہونگا اگر ارباب قلم و اہلِ نظر اس باب میں اپنے علم و مشورہ سے میری اعانت فرمائیں گے۔ میں جن عنوانات پر مضامین چاہتا ہوں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:-

(۱) ہندی شاعری کی تاریخ ــــ (۲) ہندی شاعری کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شعراء کے کلام کا انتخاب اور ان پر تنقید۔ (۳) ہندی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر ــــ (۴) اُردو شاعری کا اثر ہندی شاعری پر ــــ (۵) مسلمان فرمانرواؤں نے ہندی شاعری کی ترقی میں کیا حصہ لیا ــــ (۶) ہندی شاعری کی عروض ــــ (۷) ہندی شاعری کے مختلف اصناف اور اُن کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ ــــ الغرض یہ اور اسی قسم کے بہت سے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں جن پر کامل تحقیق و استقصاء کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے اور غالباً ایک سال کی فرصت اس کے لئے ناکافی نہ ہوگی۔

مختصر تاریخ عالم اس کتاب میں نوع انسانی کے ظہور، اس کی تدریجی ترقی اور عہد قبل تاریخ کے متعلق (بقول اڈیٹر نگار) "نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اُردو میں کوئی کتاب اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس خوبی سے مرتب نہیں کی گئی۔" زبان کی سلاست، ترجمۂ اصطلاحات، انداز بیان کی دلچسپی اور ماخذ کی تحقیق و تفتیش اس تالیف کی نمایاں خصوصیات میں ہیں۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول سید نعیم احمد - باون پائگاہ لشکر (ریاست گوالیار)

اشو[1] زرتشت

اس کرۂ ارض کے اور ملکوں کی طرح فارس کا آدم زاد بھی شروع میں اوہام پرستی کا شکار تھا جو نابالغ دماغوں کی خو ہے۔ سحر و جادو اور رواج اور عجائب پرستی کے ساتھ چاند سورج اور قدرت کی دوسری روشن و نمایاں مخلوق کی پرستش مصریوں، بابلیوں اور ہندوؤں کی طرح ایرانیوں میں بھی جاری و ساری تھی ان قوتوں کے علاوہ ان کے اور بھی اپنے من گڑھت دیوتا تھے جن کو وہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں پوجتے تھے۔ وہاں کے پیشدادیوں[2] کے وقت میں ملک میں ایک وبا آئی اور بکثرت موتیں ہوئیں عزیزوں اور رفیقوں کی مفارقت سوہان روح تھی۔ انھیں ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے لئے زندوں نے مردوں کے مجسمے[3] بنائے اور ان کی منزلت کرنے لگے۔ یہ منزلت ترقی پاکر پرستش ہو گئی اور آخر ان کی عبادت ہونے لگی۔ پھر مختلف عناصر کے مجسمے بنے اور باضابطہ طور پر ان کے آگے بھی سر جھکنے لگے۔ یوں وہاں بُت پرستی کی بنیاد پڑی اور قوم کی قوم اس میں مبتلا ہو گئی۔ ان ہی پیشدادیوں میں مشہور ہوشنگ ہے۔ چقماق (چکمک پتھری) کی رگڑ سے آگ اسی کے وقت میں نکلی اور وہ عجیب سمجھ کر نور خداوندی سمجھی گئی۔ تہمورث[4] اس کے خلف کے زمانہ میں شیراسپ ایک عقیل و فرزانہ پیدا ہوا۔ اس نے نہ صرف سلطنتی امور میں بادشاہ کو مدد دی بلکہ فن کتابت ایجاد کر کے ایرانیوں کو تعلیم بھی دینے لگا۔ جمشید اسی تہمورث کا بھتیجا اور جانشین ہے۔ یہ وہی جمشید ہے جس کا جام ایرانیوں ہی کی محفل عیش میں نہیں بلکہ ہماری بزم ادب میں بھی اب تک گردش کر رہا ہے۔ اس کے زمانہ تک بُت پرستی اتنی ترقی پا گئی اور اس کی اہمیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ جمشید کو اپنے پرستش کئے جانے کی بھی ہوس ہوئی اور آخر وہ بھی ایک قوت تسلیم کر کے دیوتا بلکہ خدا کی طرح مانا جانے لگا۔ پیشدادیوں کے زوال پر کیانی ایران کے حکمراں بنے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا انھیں کے وقت میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بیرونی حملوں اور خصوصاً تورانیوں کی زیادتیوں سے ملک تاراج ہو رہا اور پھر شاہ پرستی کے زور سے رعایا تباہ اور مخلوق خدا سخت عذاب میں مبتلا ہو رہی ہے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی ملک و قوم پر ایسا کڑا وقت آتا ہے تو ان میں ہمیشہ ایک ایسا بندۂ خدا پیدا ہوتا ہے جس کے قوائے عقلی اس وقت کی ذہنیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ "مرد غیب" اپنے زمانہ کی حالت پر غور کرتا اور ملک و قوم کی حالت سدھارنے کے لئے آخر کوئی دوا تجویز کرتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے اور اس قانون سے اس وقت کا ایران مستثنیٰ کیونکر ہو سکتا تھا؟ کہتے ہیں کہ شاہ ایران کی نسل[5] اور

---

[1] پہلوی زبان میں اشو، حضرت کے ہم معنی ہے۔ [2] ایران کے اول حکمران۔ [3] گبن اور سفرنامہ مشرق دیا۔ از ولیم وی ر برگ انس ۱۸۳۵ء۔ [4] ٹھیٹھ فارسی لفظ خواہ مخواہ عربی بنا اور حرف ث اس میں داخل کیا گیا۔ [5] بندہش کتاب دعائے پارسیان و مسعودی۔

آفریدون و منوچہر کے خانوادے میں آذربیجان شمالِ ایران کی طرف (بزمانۂ کیخسرو) پوروسپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زرتشت[1] رکھا گیا۔ قدیم پہلوی میں زرتشت کے معنی دلاور دشمنگیں کے ہیں آذرشت بمعنی شترِ (اونٹ) یعنی شترِ خشمگیں۔ اس زمانہ میں ایسے نام و عرف اکثر رکھے جاتے اور وہ اچھے سمجھے جاتے تھے۔ زرتشت کی تعلیم و تربیت سات برس کے سن میں شروع ہوئی اسوقت کا بہتر سے بہتر معلم تجویز ہوا اور بہت کم عرصہ میں انھوں نے وہ سب حاصل کرلیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے ضروری تھا۔ رُشد تک پہونچتے ہی اُن کا پرفکر و روشن دماغ اپنے ملک و قوم کی ابتر حالت پر غور کرنے لگا اور کامل سات سال کی ریاضت مراقبہ یا تپسیا کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہونچے اور تیس سال کی عمر میں یہ نتیجہ یعنی اپنے خدا کا پیغام لیکر قوم کے سامنے آئے اور اُس کی تبلیغ کرنے لگے۔

یہ زمانہ لہراسپ و گشتاسپ کا ہے۔ زردشت سمجھے اور خوب سمجھے کہ ہماری قوم کے قوائے دماغی ابھی ایسے قوی نہیں ہیں کہ کسی نئی بات کے سننے پر بہ آسانی متوجہ ہوجائیں۔ اس لئے انھیں سلطنت کی طاقت سے مدد لینی پڑی اور وہ گشتاسپ کی معیت سے پوری ہوئی۔ اُن کی وہ کتاب (اوستا) جس میں اُن کے سکون و مراقبہ کے زمانہ میں احکامِ ربانی قلمبند ہوئے تھے ساتھ تھی پادشاہ وقت کے سامنے پیش کی گئی۔ گشتاسپ کو مخاطب کرکے آپ نے کہا کہ ہم پیامبرِ احکامِ خدا ہیں ہماری نصیحت سنو اس خدائے واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو زمین خدا کو کشت و خون سے بچاؤ جنگلوں کو کاٹو باغ بناؤ وہاں درخت لگاؤ زراعت کرو اور مویشیوں کو نگاہ رکھو۔ یہ تمھارے مصرف کے اور تمھاری زراعت کے کام کے ہیں۔ آتش یعنی آگ کا خاص لحاظ کرو اس سے تمھاری زندگی ہے وہ خموش نہ ہونے پائے! (اوستا) یہ احکام بجلی کی طرح کوندے اور دربارِ شاہی کو منور کرنے لگے اسوقت ایک عظیم الشان درخت نظروں کے سامنے نمودار ہوگیا۔ یہ حقیقتاً درختِ[2] خرد تھا جس کے پھل چکھ لینے کے بعد حیاتِ جاوداں ممکن تھی۔ ان احکام نے یزدان (نیکی) پرستی بتائی اور اہرمن (بدی) پرستی مٹائی۔ اسوقت کا سماں دقیقی[3] یوں کھینچتا ہے۔

زایوانِ گشتاسپ تا پیش کاخ   درختے گشن بیخ و بسیار شاخ
ہمہ برگِ او پند و بارش خرد   کسے کو چنیں بر خورد کے مُرد
خجستہ پے و نام او زرتُشت   کہ اہرمن بدکنش را بکشت

گشتاسپ متاثر ہوا ایمان لایا۔ جمشید کی فرعونیت دور ہوئی اور شاہ و گدا ایک ہوکر خالق کی طرف جھک گئے۔ یہ احکام چرمہ پر کندہ کرکے ملک میں تقسیم ہوئے۔ اسوقت سے پھر ایران یزدان پرست و موحد ہوگیا۔

کسی پیامبر کے لئے اگر معجزے (وہ بات جس میں دوسروں کو عجز ہو یعنی عادتاً وہ اُس کے کرنے پر قادر نہ ہوسکیں) کی بھی واقعی ضرورت ہے تو زرتشت کی زندگی میں اس کی بھی کمی نہیں اور کسی رسول کے مدعیِ رسالت ہوئے بغیر اگر اسے نبی تسلیم نہ کیا جائے تو اس پیغمبرِ ایرانی کے یہاں یہ دعویٰ بھی موجود ہے۔ اس پیغمبر کے صرف وہی پیغام و احکام نہیں جو مذکور ہوچکے اور بھی بہت ہیں اور وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مفید ہیں

---

[1] زرتشت اور زردشت دونوں درست ہیں۔ [2] ایسے استعارے تقریباً ہر مذہب کے ادب میں پائے جاتے ہیں! [3] دقیقی وہ مشہور فارسی شاعر جس نے سامانی سلطانوں کے حکم سے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ ناتمام رہ گیا۔ اور فردوسی نے اُسے پورا کیا۔

اور لائق عمل۔ مذکورہ احکام معاد و معاش دونوں کا راستہ دکھاتے اور زمین ایران کے جنگل کو پاک و صاف کرکے اس میں کشت و زراعت کا شوق دلاتے اور انسان کو متمدن بنا کر اسے تدبیر منزل بھی سکھاتے ہیں۔ معلوم ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں یعنی زردشت سے صدہا سال قبل چقماق سے آگ نکلی اور وہ متبرک نور خدا مانی گئی اور محفوظ رکھی گئی۔ قدرت کے اس قابل لحاظ عنصر (آتش) کا خیال اسوقت سے ہے زردشت اس کے بانی نہیں۔ انھوں نے دیگر عقلا اور رہبروں کی طرح اپنے زمانہ کی ہر اس چیز کو قایم رکھا جو اصول مذہب میں حارج ہو کر انسانی زندگی کیلئے مفید ہو سکے۔ ان میں سے ایک آتش بھی تھی جس کی اہمیت اور ہمہ وقت ضرورت مسلم ہے۔ اس لئے وہ اس مدار زندگی کی تائید میں بھی گویا ہوئے اور دیگر عناصر پر اسے ترجیح دیکر اس کی نگہداشت کو باقاعدہ بنا گئے۔

کیانیوں کا زمانہ کیقباد سے شروع ہو کر دارائے دوم پر ختم ہوتا ہے۔ پونے سات سو سال ایران اس خاندان کے تحت میں رہا اور اس عرصہ میں مذہب زردشت وہاں حکومت کرتا رہا۔ نہ صرف توحید و خدا پرستی ہی اس زمین پر پھیلی بلکہ اس مذہب کے احکام کی بدولت ارض ایران سلسلہ در سلسلہ جنگلوں سے پاک و صاف ہو کر قابل زراعت بنی اور ملک و قوم کی خوشحالی و آبادی اسوقت کے اور ممالک کو زیر کرنے لگی انھیں کیانیوں کے وقت میں دارائے اول کے ہاتھوں سے مصر و یونان فتح ہوا۔ اور اسی دارا کے قوت بازو سے بحر خضر کے قریب وہ سد[1] تعمیر ہوا جس نے ادہر کی وحشی قوموں (یاجوج ماجوج) کو متمدن زمین کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ دارائے دوم (۳۳۳ ق م) کے وقت میں سکندر یونان پر ایرانی حملہ کا بدلہ لینے کھڑا ہوتا اور فارس پر چڑھتا ہے۔ دارا اپنے خادموں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ اس لئے سکندر کو کھلا راستہ ملتا اور بہ آسانی وہ ایران پر قبضہ کر لیتا ہے۔ یونان اسوقت اپنی حکمت پر نازاں اور سولن و سقراط کا نہیں بلکہ افلاطون و ارسطو کا بھی مرید ہے۔ سکندر اسی ارسطو[2] کا شاگرد ہے۔ یونانی اپنے علم کے آگے کسی قوم کے مذہب و فلسفہ کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ ایران، یونان کا زبردست رقیب ہے۔ اس لئے یونانیوں کو اس کے مٹانے کی فکر ہے کہ اسے فنا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ فکر سکندر کے ہاتھ سے پوری ہوئی۔ وہ کیانیوں کی سلطنت ہی کو نہیں مٹاتا بلکہ مذہب زردشت کے خاتمہ کی بھی کوشش کرتا ہے کہ ایرانیوں کی شمع عقل کو گل کئے بغیر اس دنیا میں یونانیوں کا چراغ روشن نہیں ہو سکتا تھا۔ لشکریوں کے ظلم و ستم سے نہ صرف صنادید عجم ہی تباہ و برباد ہوئے بلکہ وہاں کے مذہبی کتبخانے تک نذر آتش کر دئے گئے اور یوں وہاں وہ قومی مذہب ایک عرصہ کے لئے خموش ہو گیا۔ سکندر کے بعد ایران میں مختلف مختصر حکومتیں قائم ہوئیں وہ ملوک الطوائف کہلاتی ہیں۔ یعنی وہ صوبجات میں تقسیم در تقسیم تھیں اور ان کے والی گو خود مختار اور آزاد تھے لیکن ان میں کا کوئی ایک پورے ملک پر قابض و متصرف نہ تھا اس لئے وہ کمزور رہیں اور مٹیں۔ آخر ساسانی اٹھے اور سارے ملک پر قابض ہو کر اسے مستحکم کرنے لگے۔ ان کا زمانہ اردشیر بابگان سے شروع ہو کر یزدگرد پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاندان نے چار سو سال ایران پر حکومت کی اور اپنے پیشروؤں کی طرح اپنے قومی مسلک کے پابند اور سکندر کی بدولت صنادید عجم اور مذہب عجم کو جو صدمہ پہونچا تھا اسکی تلافی میں سرگرم رہے۔

---

[1] یہ سد ہمارے یہاں سکندری کہلاتا ہے لیکن سکندر یونانی کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ وہ بحر خضر کی طرف گیا اور نہ اسنے وہاں کوئی سد باب کیا یہ دارا ہی جو اس طرف حکمران تھا اس لئے ذوالقرنین سے مراد یہ شاہ فارس ہے نہ کہ سکندر یونانی۔ [2] سکندر ایران کے متعلق سب باتوں میں ارسطو کے مشورہ پر چلتا تھا۔ (گبن)

بہرام شاہ اول اس گھر کا وہ مشہور شہریار ہے جس کے عہد میں حکیم مانی کی نشوونما ہوئی۔ یہ صورت پرست زردشت سے یزداں پرست کے مذہب کی شکل بگاڑنا چاہتا تھا اس لئے شاہی عتاب میں آیا اور قتل ہوا۔ یہ واقعہ ۲۷۶ء کا ہے جس کے بعد دو سو برس تک زمین ایران کسی قابل ذکر مذہبی انقلاب کا شکار نہ ہوئی۔ لیکن قباد بن فیروز کے زمانہ میں اس مذہبی سکون میں پھر ایک ہیجان آیا۔ مزدک نام ایک مرد اُٹھا۔ اس نے اپنا ایک نیا مسلک پیش کیا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کا مالک خدا ہے اور ہم سب اُس کی ملکیت ہیں۔ یہاں کی کوئی چیز سوائے اس ذات کے دوسرے کی نہیں ہو سکتی ۔ ہمیں سب کی شرکت ہے اور اس میں سب کا برابر کا حصہ ہے یہاں تک کہ دولت کی بیبیاں بھی تمام میں مشترک اور دوسروں کے تصرف میں آسکتی ہیں۔ یہ عقیدہ عام ہوا اور ہر طرح کے تصرفات شروع ہو گئے۔ ملک میں انارکی اور بدامنی پھیلی۔ حکومت اس فتنہ کو دور کر سکتی تھی لیکن شاہ وقت یعنی قباد خود مزدک کا مرید ہو گیا۔ اس سے یہ عقیدہ اور قوی ہو گیا۔ مزدک نے ایک دن بادشاہ قباد سے اُس کی ملکہ (مادر نوشیرواں) کو طلب کیا کہ اس کا وہ بھی حصہ دار و حقدار ہے قباد اس طلب کو رد نہیں کر سکتا تھا لیکن نوشیرواں نے منت کرکے اپنی ماں یعنی ملکہ کو اس ذلت سے بچایا اور جب سے وہ (نوشیرواں) مزدک اور اس کے پیروؤں کے پیچھے پڑ گیا۔ قباد کے بعد جب نوشیرواں تخت و تاج پر پہنچا تو ملک کے اصلی و قومی مذہب (زردشتی) کا نئے سرے سے شادیانہ بجایا لیکن اس عرصہ میں مزدکی ایران میں پھیل کر قوی ہو چکے تھے۔ ان کا استیصال آسان نہ تھا بادشاہ کچھ دن خاموش رہا آخر ایک دن مزدک پنجہ میں آیا اور نوشیروانی عدل نے ۵۳۱ء میں اُس کا فیصلہ کر دیا۔

سمجھنا چاہئے کہ وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ ہم محسوس نہ کر سکیں مگر وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے یہی حالت خیالات و عقائد کی بھی ہے مزدک گو بظاہر فنا ہو گیا مگر وہ اور اس کے عقائد فضائے ایران کو گھیرے رہے اور اس کے سو برس بعد ہی وہ عراق میں نمودار ہوئے جنگ صفین کے خوارج نے بھی یہی مزدکی عقیدہ پیش کیا اور لا الملک الا اللہ کا نعرہ مار کر اور مسلمانوں کے عقیدہ سے گریزاں ہو کر اپنا علم علیحدہ بلند کرنے لگے ان عجمی و عراقی یعنی مزدکی عقائد نے نہ صرف ساسانیوں اور مذہب زردشت کو کمزور کیا بلکہ تیسری چوتھی صدی ہجری کے مسلمانوں کے عقائد میں بھی تلاطم ڈالا اور وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا کیا ہے۔ نوشیرواں کے بعد ایران چین سے نہ رہا۔ ہرمز سوم اور بہرام کی حکومتیں ملک کے ان وزرا و امرا کے زیر اثر تھیں جو اپنے رسوخ و قوت کے لئے آپس میں جنگ کرتے اور تخت جمشید پر اپنے مطلب و اغراض کے شہزادوں کو بٹھاتے و اُٹھاتے تھے خسرو پرویز بھی اسی طرح تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ ہند کے آخر مغل بادشاہوں کے مشابہ ہے سلطنت کمزور رعایا منتشر اور فوج ابتر تھی ملکی و قومی مذہب (زردشتی) بھی شہ زور نہ تھا اور ظاہری ٹھاٹھ کے سوا ملک میں اور کچھ باقی نہ تھا۔ شیریں اسی خسرو کی وہ محبوب ملکہ ہے جو فرہاد سے منسوب ہو کر مشہور ہوئی اور ہمارے ادب کی زبان پر اب بھی چڑھی ہوئی مزا دے رہی ہے۔ پوران دخت و شاہنشاہ اور آرزم دخت ملکہ و شاہ شطرنج تھے ان کے بعد یزدگرد شاہ ایران بنا۔ یہ اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ کمزور و بےتجربہ نکلا۔ فارسیوں پر تازیوں کا تسلط اسی کے وقت میں ہوا۔ ضحاک کے بعد ایران اب دوبارہ عربوں کے ہاتھ آیا۔ قدیم قومی فاق تازہ ہوا اور ساسانیوں کا یوں خاتمہ ہو گیا۔

ساتویں صدی عیسوی تک موسوی مذہب ختم عیسوی مسخ اور ہندی و زردشتی بے سود ہو چکا اور خدائے واحد کی پرستش نابود نہیں تو سرد ہو چکی اور دنیا انتشار و ہیجان میں تھی اس لئے قانون قدرت کے موافق پھر ایک ایسے راہبر کی ضرورت تھی جس کی بلند آواز دنیا کو چونکائے اور کسی ایک ہستی کی طرف مخلوق کی گردنوں کو جھکائے۔ قدرت کی یہ عادت ایسی ضرورت کے وقت تازہ ہوئی اور ایک یہ صدا اس جگہ سے اُٹھی جہاں

اس وقت سے صدیوں قبل خلیل کی تکبیر فضائے عالم میں گونج چکی تھی۔ اسی ساتویں صدی عیسوی میں ہمارے پیغمبر عرب کا ظہور ہوا وہی احکام و فرمان لائے جو ان سے قبل دنیا میں آ چکے مگر فراموش ہو چکے تھے۔ آپ نے اس حکم خدا اور اپنے آنے کی خبر صرف اپنے ملک و قوم ہی کو نہیں دیا بلکہ دنیا کے مختلف ممالک و اقوام کو بھی دعوت بھیجی کہ وہ بخبری کا عذر کرکے پا.. نہ ہو جائیں۔ یہ پیام جس طرح موسویوں اور عیسائیوں تک گیا اسی طرح مجوسیوں زردشتیوں تک بھی پہونچایا گیا۔ عجم عرب کا ڈانڈا ہے اور ایک کا دوسرے پر اثر مدت سے چلا آتا ہے۔ اس لئے عجمی زمین پر بھی بہت جلد وہ آسمانی تحفہ بطور پاسخ بھیجا گیا۔ یہ خسرو پرویز کا زمانہ ہے۔ شاہ عجم عرب کی کسی ادا کا دلدادہ نہیں وہ ایسے پیغام و پاسخ کو بھی اپنی قدیم قومی نظر تنفر سے دیکھتا اور ٹال جاتا ہے۔

رسول عربی کا مقصد پیامبری تھا نہ کہ جنگجوئی۔ اس لئے انھوں نے عجم تک اپنا پیغام پہونچا دینے کے بعد وہاں کی زمین پر قبضہ اور عجم پر غلبہ کی نہ کبھی خود خواہش کی اور نہ اپنے بعد کے لئے ایسی فرمایش کر گئے۔ آنحضرت کے بعد جو ملک گیریاں ہوئیں وہ اسلامی فتوحات کے نام سے مشہور ہیں مگر حقیقتاً وہ عربی فتوحات تھے نہ کہ اسلامی! اسوقت عراق کا وہ حصہ جو عرب سے ملحق تھا عجمی اثر میں تھا اس لئے فارسیوں اور تازیوں کا تصادم لازمی تھا۔ کوششیں کی گئیں کہ اختلاف نہ ہو۔ عجمی اپنے قوم کی قدامت و شوکت پر نازاں بلکہ مغرور تھے عربوں کی سی قوم کی طرف کیا مخاطب ہوتے۔ اس غفلت کا نتیجہ اختلاف تھا اور اختلاف کا نتیجہ تصادم اور وہ ہو کر رہا۔ آخر تازی و فارسی میدان میں آ گئے اور ان کی سیاسی جنگ شروع ہو گئی۔

سنہ ۱ھ کے بعد ہی یہ اختلاف ہوا لیکن حق یہ ہے کہ عربی اسلامیوں نے اس معاملہ میں بھی بڑی طرحیں دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہ عجم اور ان کے درمیان وہ سلوک و مدارات قائم ہو جائیں جو دوسرے صاحب کتاب بادشاہوں کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔ اس خیال سے سنہ ۱۴ھ میں یزدگرد کے پاس ایک اسلامی وفد گیا اس کے سردار شیخ مغیرہ نے شاہ وقت سے مودت و مصالحت چاہی مگر وہ منظور نہ ہوئی۔ آخر نوبت بہ جنگ رسید۔ عجمی پسپا ہوئے اور چار سو سال کی ساسانی حکومت اور ہزار ہا برس کی فارسی سلطنت پامال ہو کر تازیوں کے دست تصرف میں آ گئی۔

پیغمبر عربی نے عجمیوں کو ہمیشہ بہ نظر لطف دیکھا۔ نوشیرواں عادل کے عہد میں اپنے وجود ذیجود پر آپ نے فخر فرمایا اور فارسیوں کو اپنی محفل و مجلس میں سرفراز کیا ہے۔ اور سلمان فارسی کا قصہ کسے معلوم نہیں کہ ان کے سے عجمی غلام کو آپ نے آقائے اعراب ہی نہیں بنایا بلکہ انھیں من اہلبیتی فرما کر اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ یہ وہی مذاق و اثر تھا کہ اہل بیت رسول میں فارسیوں کی ہمیشہ قدر رہی اور فارسی جنگوں کے بعد جب شاہزادی ساسانیان حضرت شہربانو مدینہ لائی گئیں تو جناب امیر کے تدبر و قدردانی سے وہ شہزادۂ عرب جناب امام حسین کے محل میں ملکہ و مالکہ بنکر رہیں۔ رسول عربی کی نسل ان شہربانوں کی جہت سے چلی او پھیلی اور آج دنیا میں لاکھوں سادات عرب و عجم کے اس اتفاق سے ہماری زمین پر نظر آتے اور فخر کرتے ہیں۔ اور کیا خوب کہا ہے ڈاکٹر گیگر (جرمن) نے کہ "علی کے اس تدبر نے قدیم عربی و عجمی نفاق ہی کو کم نہیں کیا بلکہ ایک ملک کے ملک اور قوم کی قوم کو بغیر جنگ زیر کرکے ہمیشہ کے لئے انھیں اپنا اور اپنے گھر کا غلام بنا لیا۔

عجمی و عربی مذہب میں حقیقتاً بال[1] برابر کا فرق تھا۔ اشو زردشت بھی غیب سے وحی لائے جوان سے پہلے دنیا کو اسی ذریعہ سے مل چکا تھا۔ اس آریا معلم عجم کا حکیم جاماسپ نام (ندیم شاہ گشتاسپ) ایک شاگرد رشید تھا اس حکیم وقت نے بطور پیشینگوئی گشتاسپ سے کہدیا تھا کہ عرب میں آیندہ ایک رسول کا ظہور ہوگا اور اس کا دین و آئین دنیا کو مسخر کرلیگا ؎

بگشتاسپ جاماسپ خود گفتہ بود — از این رازہ این راہ او رفتہ بود (شاہنامہ و زینۃ التواریخ)

مجوسیوں پر اس پیشین گوئی کا اس زمانہ سے اثر تھا اور وہ ایک "آنے والے" اور یہودیوں کے فارقلیط کے سے "محمود" محمدؐ کے منتظر تھے مجوسیوں کے دل و دماغ سے وہ خیال نہ گیا اور آخر نوشیرواں ؎

چنانکہ نیر روشن و آتش بہ خواب — کہ در شب برآمدے آفتاب

[1] مذہب اسلام اور کیش زردشت واقعی اس درجہ ملتے جلتے ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ہمارے آنحضرتؐ پر ان کے خاندان میں سب سے اول امیر المومنان حضرت علیؑ ایمان لائے اسی طرح اشو زردشت کی تصدیق پہلے ان کے چچازاد بھائی مدیو ماہ نے کی۔ آنحضرتؐ نے دشمنوں کے خوف سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ زردشت بھی اسی طرح بان ویج (مقامے در ایران) سے باختر جاتے اور وہاں تبلیغ کرتے ہیں۔ لا رہبانیت فی الاسلام ہمارا قانون ہے۔ اور زردشت کا بھی یہی آئین۔ قیامت کے قریب ہم بھی ایک مہدی و ہادی کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور زردشتی اس موقع پر شوشیان نام ایک بزرگ کے ظاہر ہونے کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ زردشتیوں کے یہاں قیامت میں جس پل پر سے گزرنا ہوگا اس کا پہلوی نام چنوات ہے اور عربی میں (جو اس کا معرب) صراط۔ ان کی ہماری ہمیر بھی اکثر ایک ہیں۔ شام کو چراغ دکھائی دیا اور ہم نے دعا پڑھی۔ زردشتیوں کے سامنے آتش نمودار ہوئی اور انھوں نے حمد کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ ہمارے ان کے مذہبی مراسم بھی دونہیں ہیں۔ ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں وہ بھی اپنی عبادت سے پہلے منھ ہاتھ دھوتے اور جسم پاک کرتے ہیں۔ ہماری نماز پنجوقتہ ہے اور ان کی عبادت بھی دن میں پانچ مرتبہ۔ اسے دیکھ کر اکثر ارباب دانش کا خیال ہے کہ ہماری پنجوقتہ نماز زردشتیوں کی تقلید ہے ورنہ اسلام میں وہ صرف تین دفعہ فرض تھی۔ موجودہ ایران کے صوبہ کرمان شاہ میں بہت سے آثار اور صنادید عجم ہیں ان میں تخت بوستان یعنی گلزار ایران نامی ایک عمارت بھی ہے اس میں چند مجسمے وہاں کے قدیم بادشاہوں کے بھی ہیں اور ایک اسٹیچو اشو زردشت کا بھی ہے ان سنگی تصویروں پر پہلوی زبان میں کچھ کندہ ہے۔ فرانس کے مشہور مستشرق اور پہلوی زبان کے عالم مسیو سلوسٹر دے سسی نے ان عبارتوں کو حل کیا ہے۔ شاہ پور کے مجسمے پر یہ تحریر ہے۔ "یہ تصویر خدا پرست شہنشاہ شاہ پور بادشاہ ایران (ایران) و انران۔ ایرن کی ہے۔ یہ بادشاہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح ایک بندۂ خدا اور یزدان پرست تھا اور اس کا خاندان آسمانی و بہشتی کہا جاتا ہے۔ وہی عالم لکھتا ہے کہ آر کے معنی پہلوی میں مومن کے ہیں ایرن اس کی جمع ہے یعنی مومنین اور ان کے معنی کافر کے ہیں ان ایرن کفار یعنی شاہ پور مومنوں اور کافروں دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس لئے ایران (جمع ار) کے معنی مومنستان (جائے مومنین) کے ہیں یعنی وہاں صرف خدا پرست بستے تھے۔ بیرونی مثل ترک و تاتاران ایرن یعنی کفار تھے۔ شاہ پور ان دونوں کا حکمراں تھا (تاریخ ایران از سرجان ملکم کا ضمیمہ صفحہ ۵۴ یہ وہ شہادتیں ہیں جن سے شاہان ایران اور ایرانیوں کا موحد خدا پرست اور مومن ہونا ثابت ہوتا ہے

چہل مایۂ زرد ہاں از برششں کرمی رفت تا اوج کیواں سرشس
برآمد برایں فرد ہاں از عجباز خراماں خراماں بہ کشی و ناز
جہاں قاف تا قاف پر نور کرد بہ ہر جا کہ بد ماتمی سور کرد

بادشاہ یہ خواب دیکھ کر چونکا تو تعبیر دانوں سے اس نے اس کی حقیقت پوچھی اسوقت کے ایک نرزانہ بزرجمہر نے تعبیر دی کہ

ازیں روز تا او چہل سال و بیشس نہد مرد ے از تازیاں پائے پیشس
کہ در پیش گیرد رہ راستی بہ پیچد ز ہر کثری و کاستی

حکیم جاماسپ کی اس قدیم پیشین گوئی پر نوشیرواں کا یہ خواب ایک زبردست اضافہ ہوا۔ عجمی چونکہ اور اس منتظر کے انتظار میں تھے کہ پیغمبر عرب اسی نوشیرواں کے مبارک عہد میں پیدا ہوئے۔ زردشتی پیغمبری و رسالت کو خود خوب سمجھتے تھے۔ نوشیرواں کے بعد جب آنحضرت کے ظہور کا چرچا ہوا تو مجوسی اگلی پیشین گوئی اور شاہی خواب کو یاد کر کے رسول عربی کا خیال کرنے لگے۔ یہ دین عجم گیا تو عجمیوں کو اپنے لا الہ اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کا کہدینا کیا دشوار تھا۔ اُنھوں نے بے تکلف اس دوسرے کلمہ کو بھی یاد کیا اور عربی مسلمانوں سے ملنے لگے۔ اس لئے عربوں کو اپنے مذہب کے معاملہ میں مجوسیوں سے وہ مقابلہ کرنا پڑا جو مشرکوں سے پیش آیا۔ لیکن عقائد کے توحد کے لئے ہمیشہ یہ ضرور نہیں کہ دو (ایک سے) کلمہ گویوں کی قومی یا خاندانی جنگ بھی دور ہو جائے۔ بنی امیہ و بنی عباس کبھی نہیں ملے۔ دونوں عرب تھے اور دونوں مسلمان۔ مگر ان کا نفاق اسلامی تاریخ کا ایک خونی باب ہے۔ اس لئے عرب و عجم کی وہ قومی منافرت کیونکر دور ہو سکتی تھی جو ضحاک کے وقت سے ان دونوں قوم کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ فارسی ضحاک اور ضحاکیوں کو اپنے ملک و قوم کا تاراج کنندہ جانتے تھے اور اس لئے وہ ضحاکیوں کے ساتھ جملہ عربوں کو اپنا عدو سمجھتے اور ان سے حد کی نفرت کرتے تھے۔ یہ تقاضائے فطرت ہے اس میں مذہب اور برادری کو دخل نہیں۔ عرب بھی عجمیوں سے کچھ کم متنفر نہ تھے۔ عراق عرصہ سے فارسیوں کے قبضہ میں تھا وہ عربوں کو ستاتے اور انھیں زیر رکھنا چاہتے تھے اس لئے مسلمان ہونے پر بھی ان دو قوموں کا دلی اتفاق جلد ممکن نہ تھا جو مجوسی بلا جبر و اکراہ محمد رسول اللہ کہنے پر آمادہ ہو گئے عرب اُن سے کسی طرح کا تعرض نہ کر سکتے تھے۔ مگر جنھوں نے ذرا تامل کیا وہ اصول اسلام کے برخلاف فوراً تشہیر کیا گیا اور یہ اسی نفاق کا نتیجہ تھا جو عرب و عجم میں صدیوں سے چلا آتا تھا۔ ان فاتحین کے قبضہ میں جو فارسی بلد نہ آسکے وہ اپنے مرکز سے قہستان جا کر سو سال وہاں مقیم رہے پھر ہرمز پہونچے اور پچاس سال وہاں گزارے اور بعد کو یعنی ۷۱۶ء میں ہندوستان آکر گجرات میں اپنے گھر بنا کر بسنے وہاں کے راجہ جے رانا نے انھیں پناہ دی اور شرط کی ہماری زبان[1] و عادات سیکھیں اور رہیں۔ جب سے یہ جلا وطن پردیس میں پڑے ہوئے اپنے ملک کو یاد کرتے اور اپنی قدیم مذہبیت و معاشرت کو غیر ملک میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ قوم اکثر لحاظ سے قابل ستایش ہے اس نے بیشک اسلام کو قبول کر لیا کہ وہ ایک ناقابل انکار اور مطابق فطرت مذہب تھا وہ مسلمان ہوئے لیکن عربوں کے عادات و خصائل کو اختیار نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ ان کی تہذیب و معاشرت سے اگر پست نہیں تو حد کے بیگانہ تھے۔ پھر یہ کہ انھوں نے کسی حال اپنی زبان نہیں دی۔ عربی فارسی پر گو دو سو برس مسلط رہی مگر آخر اُس کا فارسیوں نے اپنے کندھے سے اس لئے اُتارا کہ عرب اپنی زبان کے بل پر اُنھیں بھی عجم یعنی گونگا

---

[1] قصہ سنجان از کیقباد نوساری ۱۶۰۰ء

رکھتے تھے۔ ایک غیور قوم ایسی توہین کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی قدیم و شیریں زبان کو پھر اُبھارا اور عربی کو پس پشت ڈال دیا۔ اہل روم مفتوح ہوئے لیکن یونانیوں کی طرح وہ بھی اپنے فاتحین کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے۔ اُنھوں نے یونان پر قبضہ کیا مگر وہ یونانیوں کو زیر نہ کر سکے بلکہ ان کے تمدنی و دماغی اثر سے دب گئے۔ ایران میں بھی یہی ہوا۔ عرب اس پر قابض ہوئے مگر ایرانیوں کی ذہنیت اور اُن کی تہذیب و معاشرت سے ہمیشہ متاثر بلکہ مغلوب رہے۔ شروع میں عام طور پر اس کا اظہار نہ ہو سکا مگر بنی امیہ کے آخر زمانہ اور عباسیوں کے ابتدائی عہد میں سب کھل گیا۔ ہارون اور امین و مامون عرب باقی نہ رہے تھے بلکہ اچھے خاصے ایرانی تھے۔ مامون کی ماں تک فارسی تھی۔ شاہی محل اور خلیفہ کے دربار کی تہذیب و معاشرت ایرانی اور کسرائی ہو گئی تھی۔ برمکی کون تھے اور طاہر و یعقوب لیث حجازی و عراقی تھے کہ ایرانی و خراسانی اور ان کی ذہنیت تازی تھی یا فارسی؟ تاریخ سے نابلد جو چاہے کہہ دے مگر جو آنکھیں رکھتا ہے وہ بے تامل یہ کہہ دے گا کہ [illegible] کے بعد عرب، عرب نہ باقی رہے تھے بلکہ ایک طرف وہ شامیوں، رومیوں اور یونانیوں کے مرید تھے تو دوسری طرف ایرانیوں کے شاگرد رشید۔ اور اسی وجہ سے دوسری صدی ہجری سے عراقیوں، ساسانیوں، دیلمیوں اور غزنویوں بلکہ خوارزمیوں، سنجریوں، چنگیزیوں، مغلوں، اور صفویوں کے وقت تک کی بیشتر تصنیفات نثر ہوں یا نظم اور وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی حجازی خیالات سے کم اور ایرانی جذبات سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ یہ فارسی (پارسی) بے شک تعداد میں کم ہو گئے لیکن اپنے قوائے ذہنی میں دیگر عظیم قوموں سے اب بھی قوی تر ہیں۔ سر ولیم ہنٹر اپنی تاریخ ہند میں اور سر ہنری کوٹن اپنی نیو انڈیا (ہند نو) میں اس جماعت کو "Wonderful" یعنی "عجیب" لقب دیکر ہندوستان میں ان کی کارگزاریوں اُن کے فنون اور اُن کی صنعت و حرفت کے ثناخواں ہیں۔ یہ قوم اگر اپنے ملک میں رہتی اور قومی تنفر کے باعث اسے پامال کرنے اور اس کے اخراج کی فکر نہ کی جاتی تو آج ایران یونان و یورپ نظر آتا اور ایشیا و امریکہ پر بھی چشمک زن ہوتا۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ براعظم ایشیا تو خیر، ہندوستان اور ایران تک اُن سے کما حقہ واقف نہیں۔

مسلمان جن کا مذہب زردشتیوں کو بہ آسانی اپنی آغوش میں لے سکتا تھا وہ تک اُن سے غافل رہے اور ہیں۔ اس غفلت بلکہ منافرت کے اسباب میں سے بڑا سبب وہ تازی و فارسی تنفر بھی ہے جو ایک عرصہ سے ان دونوں قوموں میں چلا آتا اور ایک کو دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتا ہے۔ مشہور اور قابل لحاظ مسلمان مورخین[1] نے گو اس قوم کو موحد خدا پرست پابند مذہب اور آئین دوست بتایا ہے مگر ہم نے انھیں آتش پرست اور مشرک سمجھ لیا اور مشرکین سے بھی زیادہ اُن سے کنارہ کر لیا۔ دوسری طرف مسلمانوں سے اُن کی خود علیحدگی ہے۔ اس ملک میں وہ اپنے غیروں سے بے تپاک ملتے ہیں مگر یہاں کے مسلمانوں سے دور رہتے اور اُنھیں اپنا بنانے میں گریز کرتے ہیں حالانکہ اسلام سے قریب تر اگر کوئی مذہب ہے تو زردشتی۔ اور زردشتی مسلک سے نزدیک تر کوئی مشرب ہے تو اسلام۔ اس لئے ان دونوں کو آگے بڑھنا اور ملنا اور جلد معانقہ کر لینا چاہئے۔

(نواب) نصیر حسین خاں خیالؔ (مرحوم)

(نگار) یہ مقالہ نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کا اب سے دو ماہ قبل اُس وقت موصول ہوا تھا جب وہ بقید حیات تھے اور شائع اُس وقت ہو رہا ہے۔ جب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ یہ مضمون حقیقتاً پروفیسر رضوی کی کتاب "Parsis" پر ریویو کی حیثیت رکھتا ہے۔

[1] مثل [illegible] زمخشری، شہرستانی اور مسعودی و بیرونی۔

نواب صاحب مرحوم نہایت وسیع المطالعہ انسان تھے اور تحقیقی مضامین لکھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا جس کا علم سب سے پہلے غالباً ۱۹۱۶ء کی اُردو کانفرنس میں ہوا جب انھوں نے کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے اپنا بے مثل خطبۂ صدارت زبانِ اُردو کی تدریجی ترقی پر سُنایا۔

نواب خیالؔ کی موت اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمی حلقوں کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے جسکو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حال ہی میں داستانِ اُردو کے نام سے وہ ایک نہایت بسیط و جامع تصنیف مرتب فرما رہے تھے، جس کا ایک باب مغل اور اُردو کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب مکمل ہوچکی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اُس جماعت سے جس کے پاس یہ مسودہ موجود ہے درخواست کریں گے کہ جلد سے جلد اسے شائع کردے۔

مرحوم نے شاہنامہ پر بھی ایک بسیط ریویو اُردو میں لکھا تھا جسے سید ظہیر احمد صاحب پٹنہ سے کتابی صورت میں شایع کر رہے ہیں بہرحال اب کہ مرحوم کے علمی فیوض سے ہم محروم ہوچکے ہیں، ایک یہی تدبیر باقی رہ گئی ہے کہ اُن کے تمام افادات کو یکجا کر دیا جائے اور اُن کو تلف ہونے سے بچا لیا جائے۔

آج نہیں

آپ کو کل معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جو اُردو شاعری پر ایک جامع تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، کتنی قیمتی چیز ہے۔

نگار کے مومن نمبر و ظفر نمبر کے لئے روزانہ خطوط موصول ہوتے ہیں، لیکن اب وہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ چند دن کے بعد بالکل یہی حال جنوری ۳۵ء کے نگار کا ہوگا کہ آپ اس کی ضرورت کو محسوس کریں گے، لیکن نہ پا سکیں گے۔ پھر، کیا اس سے زیادہ ارزاں اور فایدہ کا سودا کوئی اور ہوسکتا ہے کہ صرف پانچ روپیہ میں آپ دو روپیہ کا ایک پرچہ بھی حاصل کریں اور سال بھر تک نگار بھی دیکھتے رہیں۔

جنوری ۳۶ء کا رسالہ اس سے زیادہ ضخیم شایع ہوگا اور ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اس لئے وہ حضرات جن کا چندہ ۳۵ء میں ختم ہو رہا ہے، وہ اسکو نوٹ کرلیں کہ خریداری قائم رکھنے کی صورت میں یہ نمبر ان کو مفت ہاتھ آئے گا، ورنہ یوں ان کو تین روپیہ ادا کرنے پڑیں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

ایک افسانہ جو مکمل نہ ہوسکا

(۱)

میں ایک افسانہ نگار ہوں۔

جب کبھی مجھے بخار آتا ہے تو میرے ذہن میں غیر معمولی تیزی و شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے۔

میں اس وقت کی حالت کو کچھ اس طرح بیان کرسکتا ہوں:۔

شدت کے ساتھ بخار چڑھا ہوا ہے، جسم بھن رہا ہے، رضائی اوڑھے پڑا ہوں، رات کی گہری خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی ہے، سب سو رہے ہیں، میں جاگ رہا ہوں، صرف جاگ ہی نہیں رہا ہوں ایک ناقابل بیان عذاب میں مبتلا ہوں، دماغ ایک ایسی مشین کی طرح کام کر رہا ہے جس کو انجام سے بے پرواہ ہوکر پوری رفتار کے ساتھ چلا دیا گیا ہو، کوشش کرتا ہوں کہ یہ شدید ذہنی مصروفیت ختم ہوجائے اور میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کی نیند سو رہوں، لیکن خیالات کی یورش کسی طرح ختم نہیں ہوتی، یہ سیلاب برابر بڑھتا چلا آتا ہے، کبھی ایک خیالی اسٹیج پر پہونچکر تقریر کرنے لگتا ہوں، اور اگرچہ اپنی زندگی میں کبھی کسی قابل ذکر مجمع کے سامنے تقریر کرنے کی جرأت نہ کرسکا لیکن بخار کی حالت میں رضائی میں منھ لپیٹ کر اس طرح بے تکان بولتا ہوں کہ بڑے سے بڑا خطیب اگر سن پائے تو رشک کرنے پر مجبور ہوجائے، پُر جوش اور ہیجان خیز ملفوظات کا دریا بہا دیتا ہوں، میرے جملوں میں کوئل کی پیہم کوک یا ایک کامل الفن مطرب کی تانوں کی کیفیت پائی جاتی ہے، ایک فقرہ دوسرے فقرے کی اس طرح پیروی کرتا ہے جس طرح موسلا دھار بارش میں ایک بوند دوسری بوند کی، اور الفاظ کی پاکیزگی کو صرف موتیوں کی نزہت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جب یہ بے پناہ تقریر کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تو میں، گھبرا کر رضائی سے منھ نکالتا ہوں اور تقریر کو دماغ سے علٰحدہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو جھنجھوڑتا ہوں، چند منٹ سکون رہتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد کسی ہنگامی موضوع پر شعر کہنے لگتا ہوں، اور باوجود اس امر کے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور عمر بھر میں مشکل سے تین چار مصرعے موزوں کرسکا ہوں، ایسی کامیاب نظم لکھتا ہوں کہ جو صرف ایک کہنہ مشق اور حقیقی شاعر ہی کا حصہ ہوسکتی ہے۔ نظم کا مفہوم مسلسل ہوتا ہے اور بے حد طویل ہوتی ہے۔ مختلف اشعار ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جس طرح کسی عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے۔ نظم ابھی مکمل نہیں ہونے پاتی کہ گھنٹے کی ٹن ٹن مجھے بیدار کردیتی ہے اور میرے دماغ کو شاعری کے اثر سے آزاد کردیتی ہے۔ میں مضطرب ہوکر کروٹ بدلتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر یہی کیفیت رہی تو صبح تک میرا کیا حال ہوگا۔ لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ اُس وقت مجھے افسانے کا پلاٹ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذہن بیک وقت قصے کے واقعات بھی تیار کرتا ہے اور اُن کو الفاظ کا جامہ بھی پہناتا ہے۔ میں نے

آج تک جس قدر افسانے لکھے ہیں اُن کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان بے حد سلیس و رواں ہوتی ہے، گویا ایک ندی ہے جو گنگناتی ہوئی خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ افسانے کا موضوع بھی سکون آمیز ہوتا ہے۔ یعنی کیا بلحاظ زبان اور کیا بہ اعتبار موضوع، میں کسی طرح کا جوش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرے افسانے ہنگامہ پرور نہیں ہوتے۔ زندگی کے خاموش اور پرسکون مناظر کی ترجمانی کرتا ہوں۔ ہیجانی چیزوں کی طرف اس لئے توجہ نہیں کرتا کہ اپنی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے اُن کو پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ افسانہ جو بخار کی حالت میں میرا ذہن تیار کرتا ہے یکسر ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ زبان اور موضوع دونوں جوش سے لبریز ہوتے ہیں۔ اس افسانے کی نوعیت اُس سمندر کی سی ہوتی ہے جو ایک زبردست طوفان سے ہم آغوش ہو۔ جب افسانے کی یہ کیفیت نقطۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو میں بیزار ہو کر کروٹیں بدلنے لگتا ہوں۔ غزل کے بعد پھر نظم کی باری آتی ہے اور نظم کے بعد پھر افسانے کی۔ اور یہ چکر یونہی قائم رہتا ہے۔ شاعری، خطابت اور افسانہ نویسی کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور خیالاتِ پریشاں کا سیلاب ایک مہیب بلا کی طرح قریب قریب رات بھر میرے دماغ پر مسلط رہتا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے بخار اُتر جاتا ہے اور یہ جنونی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ رات کی دماغی پیداوار پر غور کرتا ہوں۔ تقریباً سب کچھ بھول چکا ہوتا ہوں۔ کیا مجال جو کسی تقریر کا کوئی فقرہ یا کسی نظم کا کوئی مصرع بھی یاد آجائے۔ لیکن ہاں ایک آدھ افسانہ تھوڑا بہت دماغ میں محفوظ ہوتا ہے۔ پلاٹ سب کا سب یاد ہوتا ہے۔ رہی زبان اور انداز بیان، یہ چیزیں مجھے اپنی دسترس سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں کبھی رات کی طوفانی کیفیت انہیں پیدا نہیں کر سکتا۔ بہرحال دن میں کسی وقت قلم، دوات اور کاغذ لیکر بیٹھتا ہوں اور افسانہ لکھنا شروع کرتا ہوں۔ میری کوشش اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ زبان میں وہی حرارت اور وہی جوش پیدا کروں جو رات موجود تھا۔ موضوع کی نوعیت میری مدد کرتی ہے اور کامیابی کے آثار نظر آتے ہیں۔ محسوس کرتا ہوں کہ جو بات پیدا کرنی چاہتا تھا وہ پیدا ہو رہی ہے۔ مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے بخار چڑھنے لگتا ہے اور میں قلم کو ہاتھ سے رکھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

(۲)

رات مجھے بخار آگیا تھا۔ غالباً موسم کی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ شام کے وقت چڑھا اور نصف شب تک اُتر گیا۔ رات کے آٹھ نو بجے سے بارہ ایک بجے تک وہی کیفیت تھی جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اس دوران میں میں نے دھواں دھار تقریریں بھی کیں، طوفانی جذبات سے لبریز نظمیں اور افسانے بھی لکھے، مذہب، سرمایہ داری اور استعماریت پر مقالے بھی رقم کئے، ماموں جان کو شکایتوں اور دھمکیوں سے لبریز ایک طویل خط بھی لکھا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ کیا کیا کیا۔

اب سہ پہر کا وقت ہے۔ وہ کمزوری جو بخار سے پیدا ہو گئی تھی رفع ہو چکی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ رات کے افسانوں میں سے ایک افسانہ لکھوں۔ لیکن صرف پلاٹ رات کا ہوگا، زبان وغیرہ وہی ہوگی جو عام طور پر لکھتا ہوں۔ کسی قسم کا جوش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

(۳)

اللہ! ملازمت بھی کتنی بڑی مصیبت ہے! رات کے دس بجے ہیں، برسات کا موسم ہے، شام سے مینہ کی جھڑی لگی ہوئی ہے، گلیاں

اور کوچے سنسان پڑے ہیں، زمانے بھر کے کاروبار بند ہیں، دنیا تعطل اور فارغ البالی کے گہوارے میں آرام کر رہی ہے، لیکن میں ہوں کہ سفر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔

میرا گھر ہسپتال کا نمونہ بنا ہوا ہے، قریب قریب ہر شخص بیمار ہے۔ ایسے وقت میں میرا مکان پر موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن سرکاری ضرورتیں میری ضرورتوں پر مقدم ہیں۔ میرا سفر ایسا کام ہے جس کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا، ایسی نماز ہے جس کو قضا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا۔ میں مکان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوں۔

خدایا! یہ جدوجہد، یہ کشمکش، یہ مسلسل عذاب۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ کیا زندگی میں سچی راحت معدوم ہے؟ راحت مصیبتیں جھیلے بغیر نہیں مل سکتی؟ کیوں نہیں مل سکتی؟ آخر اس کیوں سبب؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا راز ہے؟

یہ جذبات تھے جن کو اپنے سینے میں لیکر میں گھر سے روانہ ہو رہا تھا۔ چلتے وقت شفیق اور حمید نے اسٹیشن تک ساتھ دینے کی آمادگی ظاہر کی۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہکر روک دیا کہ ابھی برسات کا زمانہ ہے، تم کہیں بارہ بجے تک واپس ہو سکو گے، مفت پریشان نہو، میں اکیلا چلا جاؤں گا، تم آرام کرو۔ میں نے سامان تانگے پر رکھوایا اور روانہ ہوگیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ کوئی راہگیر نظر نہ آتا تھا، گہرا سکوت ہر طرف طاری تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی مدہم روشنی اور گرد کی تاریکی میں اضافہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف سیاہی ہی سیاہی تھی۔ زمین، فضا، آسمان، ہر چیز سیاہ تھی۔ ویرانی، خاموشی اور سیاہی کے امتزاج سے دنیا پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کو الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ میرا تانگہ اس تاریکی کو چیرتا ہوا، اس جمود کو توڑتا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں عجیب کیفیت سے ہم آغوش تھا۔ میرے دل میں غم اور مسرت کے ملے جلے جذبات موجزن تھے۔ قدرت کے معصوم اور سنجیدہ مناظر سے لطف اندوز ہونے کی فطری صلاحیت مجھ میں موجود ہے۔ چنانچہ اسٹیشن پہونچتے پہونچتے میں گھر کے مادی افکار سے بہت بلند ہو چکا تھا، میری رجائیت میرے قنوط پر غالب آ رہی تھی، اور میرے دل میں لطیف احساسات بیدار ہو رہے تھے۔

اسٹیشن پہونچا تو وہاں بھی زیادہ اژدہام نہ تھا۔ گاڑی کے آنے میں دیر تھی، اس لئے اسٹیشن جس کا شور و شغب ضرب المثل ہے نسبتاً خاموش تھا اور باہر کی وسیع پر سکون دنیا سے ہم آہنگی کا اعلان کر رہا تھا۔ مسافر خانے میں دو تین سادھو ستار کے ساتھ نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ اور رات کی رنگینی میں اضافہ کر رہے تھے۔ میں بہت دیر تک دلچسپی کے ساتھ ان کا گانا سنتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری طبیعت کی اداسی بالکل دور ہوگئی اور جذبات و محسوسات کا وہ صحیح توازن مجھے حاصل ہو گیا جس کے ذریعہ میں دنیا کی ہر چیز کو خوشی اور مسرت کا سرچشمہ خیال کرتا ہوں۔

مسافر خانے ہی میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک نسبتاً تاریک گوشے میں چند عورتیں سفید ساریاں پہنے ہوئے بیٹھی ہیں۔ اندھیرے کے باعث ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے مجھے خبر نہ ہوئی کہ یہاں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کی قیمت کم سے کم میری زندگی ہو سکتی ہے جب گاڑی کے آنے کا وقت قریب آیا تو قلی نے میرا سامان پلیٹ فارم پر لا کر رکھا۔ اتفاق سے (بعض اوقات اتفاقات بھی کیسے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں) ان ملبوس والی عورتوں کا سامان بھی وہیں لا کر رکھا گیا جہاں میں اپنے سامان کے ساتھ موجود تھا۔ اور تھوڑی دیر میں

وہ خود بھی وہیں آکر بیٹھیں۔

پلیٹ فارم پر گیس کے ہنڈے روشن تھے۔ لوگوں کے خد و خال آسانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے اُس کو دیکھا۔ صرف اُسکی ایک جھلک دیکھی۔ اس طرح کہ آئندہ کے لئے کچھ دیکھنے کی خواہش دل میں باقی نہ رہی۔

حسین اور نوجوان عورتیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، میں دیکھتا ہوں، تھوڑی دیر متاثر رہتا ہوں اور پھر بھول جاتا ہوں۔ یہاں بھی غالباً یہی ہوتا۔ لیکن ظالم قدرت میری بربادی پر تلی ہوئی تھی۔ اُس کی سفاک بزم میں میری ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں برسات کی اُس مست و جوان رات کو، اُس پُرکیف موسم کو، اُس بھیگی ہوئی خنک فضا کو، دردیشوں کے اُس معصوم نغمے کو، اور آہ ایک پیکرِ حسن و شباب کی اُس ہوشربا جھلک کو یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اللہ! کیا یہ چیزیں میری دنیا کو زیر و زبر کر دینے کے لئے کم تھیں۔ میری زندگی کے نظام کو تہ و بالا کر ڈالنے کے لئے ناکافی تھیں۔ پھر کیا ضروری تھا کہ جب ریل آئے اور میں ایک ڈبے میں بیٹھوں تو وہ عورتیں بھی مع اُس پیکرِ حسن و شباب کے اُسی ڈبے میں آکر بیٹھیں لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا قدرت میری تباہی پر آمادہ تھی، اُس نے طے کر لیا تھا کہ یہ رات، یہ قاتل رات، میری زندگی کی رنگین ترین اور خونیں ترین رات ثابت ہو۔

آہ! کیا لکھوں، کس طرح لکھوں، کیونکر بیان کروں، الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ میں ڈبے کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہوں اور نگار (میں نے اُس کا نام نگار رکھ دیا تھا) بیچ میں، بجلی کے قمقمے کے بالکل نیچے۔ اُس کے حُسن کی تابانی کا یہ عالم ہے کہ دیکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ برقی لمپ کی روشنی اُس پر پڑ رہی ہے یا اُس کی روشنی برقی لمپ پر۔ اُس کے خد و خال میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے، ایسا تیکھاپن جس کو صرف ایک چابک دست مصور کا موقلم پیش کر سکتا ہے۔ اُس کی بھوؤں کے کھچاؤ کو میں نہیں سمجھ سکتا کس طرح بیان کروں، اُس کی آنکھوں کی خنجریت کے لئے کونسی نادر تشبیہ ڈھونڈ لاؤں۔ اُس کی پلکیں لانبی ہیں اور سیاہ، اس قدر سیاہ کہ اُن کے سائے میں آنکھیں بغیر سُرمے کے سُرگیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جب نظریں اٹھاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک سوئی ہوئی دنیا جاگ اٹھی، ایک پُرخروش میکدے کے دروازے کھل گئے۔ جب اُس کی پلکیں جھک جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مضطرب اور بے قرار دنیا نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ ایک طوفان خیز سمندر میں یک لخت سکون ہو گیا۔ اُس کی رنگت کی سرخی میں سفیدی کی جھلک نہیں، سبزی کی جھلک ہے گویا ایک ہلکے سبز رنگ کے شیشے میں گہرے سرخ رنگ کی شراب بھر دی گئی ہے۔ وہ ایک پیکرِ ناز ہے، مجسمۂ لطافت ہے، نزاکت کی تصویر ہے، شعریت اور موسیقی سے لبریز ایک نظم ہے، فردوس کی حوروں کا دلآویز نغمہ ہے، جوانی کی شراب کا چھلکتا ہوا جام ہے، نشے اور مستی میں ڈوبی ہوئی ایک انگڑائی ہے، نسوانی پیرہن میں ایک برقپارہ ہے، اُس کے وجود میں زندگی کی ساری حلاوتیں جمع ہو گئی ہیں، موسمِ بہار کی تمام شگفتگیاں اور شادابیاں سمٹ کر آگئیں ہیں۔

میں معمولی شکل و صورت کا انسان ہوں، حسنِ ظاہری سے مجھے کوئی حصہ نہیں ملا۔ لیکن یہ زمانہ میرے شباب کا زمانہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے جس کے اظہار میں مجھے ذرا باک نہیں کہ میں صنفِ نازک کے لئے اپنے اندر ایک بے پناہ کشش رکھتا ہوں۔ جب میں اپنی زندگی کے رومانی واقعات پر غور کرتا ہوں تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی کسی حسین و نوجوان عورت کو لائقِ توجہ سمجھا ہو اور اُس نے مجھ سے اعتنا نہ کیا ہو، میں نے اُسے ایک دفعہ نگاہ بھر کر دیکھا ہو اور وہ مجھے بار بار دیکھنے پر مجبور نہ ہو گئی ہو۔ آپ اس کو خودستائی پر محمول کریں گے لیکن

میں اس کو اپنی سب سے بڑی بدبختی خیال کرتا ہوں کہ یہی چیز میری بربادی کا باعث ہوئی ہے اور اسی نے میرے دل میں رنج و حسرت کے ناسور ڈال دیئے ہیں۔

میں نے نگار کو بھی دیکھا اور ایسی نظروں سے دیکھا جن میں میری روح کی تمام آرزوئیں، تمام پرستارانہ جذبات کھنچ آئے تھے۔ پھر نگار نے مجھے دیکھا اور ان نظروں سے دیکھا جو دل میں اتر کر نشتر بن جاتی ہیں اور چٹکیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ دیر قائم رہا۔

اس کے بعد نگار نے بہت جلد اپنی نگاہوں میں ایک والہانہ انداز پیدا کر لیا۔ اس کی نظریں میری نظروں کا بے معنی جواب ہونے کی بجائے کسی پیغام کی حامل ہو گئیں، اس کی آنکھیں باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگیں، وہ ایک آئینہ بن گئیں جس میں اس کی محبت صاف جھلکتی ہوئی نظر آنے لگی۔

آہ! کسی کو دیکھنا، محبت بھری نگاہوں سے دیکھنا ایک بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن جب دوسری جانب سے بھی ان محبت بھری نگاہوں کا جواب محبت بھری نگاہوں ہی کی شکل میں ملنے لگتا ہے تو یہ مشغلہ دلچسپی کی حدوں سے گزر کر کسی دوسری منزل میں پہونچ جاتا ہے، اس منزل میں جہاں زندگی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی، جہاں سر وبالِ دوش ہو جاتا ہے، جہاں جنون و دیوانگی کی حکومت ہے، جہاں عشق کی خونچکانیوں کی فرمانروائی ہے وہ مجھے دیکھتی رہی، اپنی قاتل نگاہوں سے دیکھتی رہی، میرے دل پر کسی زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتی رہی یہاں تک کہ میں دنیا، اسکی خواہشات اس کے آلام، اس کے افکار، اس کی مصروفیات، اس کی ہر چیز سے بالکل غافل ہو گیا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کسی مقتل میں پہونچ گیا ہوں، میرا تمام وجود زخموں سے چور ہو گیا ہے، لیکن ان زخموں میں ایک ناقابل بیان کیفیت ہے، ایک ایسی لذت ہے جس کے اظہار سے زبان قاصر ہے۔

اس کے بعد نگار نے ایک نئی شوخی سے کام لیا۔ وہ غالباً اس شغل میں زیادہ دلچسپی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اسوقت تک وہ بالکل میرے مقابل بیٹھی تھی لیکن اب اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے سامنے کی سیٹ پر آگئی اور اپنی ساتھ والیوں سے ہم دوش ہو کر بیٹھ گئی، گویا اب اس کی پشت میری طرف تھی، اور وہ مجھ سے قریب تر تھی، اس جگہ پہونچکر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ساری کے دامن کو اجازت دیدی کہ اس کا سرا ڈھلک کر نیچے گر جائے اور اس کے حسین اور سیاہ بالوں کو جو بظاہر نہایت تکلف کے ساتھ گوندھے گئے تھے بے نقاب کر دے۔ ظاہر ہے کہ میں اس ہوشربا نظارے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بے قرار ہو گیا، تڑپ اٹھا، دل میں بجلیاں بھر گئیں۔ پھر نگار نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہوئے۔ میری نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے ـــ اپنی ساری کے دامن کو دوبارہ سر پر رکھ لیا اسوقت گویا اس کی نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں "تم میرے حسین چہرے کی بانکی خصوصیات سے بہت متاثر ہوئے ہو، لیکن میرے بال بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہیں۔ یہ اتنے لانبے ہیں کہ جب میں ان کو کھول دیتی ہوں تو اپنی پیٹھ پر ایک بوجھ سا محسوس کرتی ہوں۔ ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اور تم نے دیکھا میں نے کس قدر تکلف سے ان کی آرائش کی ہے، کیسی محنت سے ان کو گوندھ کر گردن کے پچھلے حصے پر حلقوں کی شکل میں قائم کیا ہے، تم نے اس ہوشربا نظارے کو دیکھا؟"

اس طرح نگار نے کئی مرتبہ اپنے سر کو برہنہ کیا، اور ہر مرتبہ سر کو ڈھانکتے وقت پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ میرے برابر ایک مرد مع ایک عورت کے بیٹھا تھا، نگار مڑ کر پہلے اس عورت کو دیکھتی تھی، اس کے بعد ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈال کر اپنی

نگاہوں کو واپس لے جاتی تھی۔ شاید نگاہِ غلط انداز اسی کو کہتے ہیں۔

ہم گاڑی میں گیارہ بجے کے قریب سوار ہوئے تھے، اب ایک بجا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ انسانی دماغ ہر نوع کی مصروفیت سے آزاد ہو جانا چاہتا ہے اور انسان کو سو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ مسافروں پر غنودگی طاری ہونے لگی، ہر شخص اپنی جگہ پر جھومنے لگا۔

آہ! عورت کی فطرت بھی کس قدر عجیب ہے! کتنی ناقابلِ فہم اور کتنی پُراسرار، وہ نگار جو ابھی مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنے حُسن کی تمام رعنائیوں کو صرف کر رہی تھی، اپنی نگاہوں سے اپنے تاثر اور اپنی بے قراری کا اظہار کر رہی تھی، وہ نگار ایک برابر والی عورت کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی، مجھ سے غافل ہو گئی۔

شاید وہ ابتک چُہل کر رہی تھی، میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھی، مذاق کر رہی تھی، یا یہ دیکھ رہی تھی کہ اُس کے ترکش کے تیروں میں نشانے تک پہونچنے کی کس قدر اہلیت ہے اور وہ کس حد تک پیوست ہو سکتے ہیں۔ یا پھر اُس کی سفاک نسوانی فطرت اس بات کی خوگر تھی کہ دیکھنے والے کو بسمل بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ کچھ بھی ہو، میں تو اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا، میرے وجودِ معنوی پر ایسے زخم آئے تھے۔ جن کا اب مندمل ہونا بہت دشوار تھا۔

نگار سو رہی تھی اور میں........ ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اتنے میں وہ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اُترنا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھ کو ایک گہرے سہانے خواب سے بیدار کر دیا ہے، جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے، جنت سے اُٹھا کر زمین پر ڈال دیا ہے، اور دنیا اپنا سنجیدہ، بے کیف چہرہ لئے میرے سامنے کھڑی ہے، میں نے سوچا کہ اب مجھے اس گاڑی سے اُترنا ہوگا، یہاں کی رنگینیوں سے رخصت ہونا پڑے گا، یہاں کی لذتوں کو یہیں چھوڑنا ہوگا، لیکن پھر خیال آیا کہ میں نہیں اُتروں گا، نہیں جاؤں گا، یہاں سے جا کر میں کیونکر زندہ رہوں گا، میرا کیا حال ہو جائے گا، اُس کے بعد "سرکاری کام" یاد آیا اور میں نے پھر اپنے آپ کو اُترنے پر مجبور پایا۔

میں اسی تذبذب میں تھا کہ میری نظر نگار پر پڑی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو یقیناً میرے لئے گاڑی سے اُترنا ناممکن ہوتا۔ میں کس کا دل لاتا کہ نگار مجھے دیکھتی اور میں اُس کی نظروں کو، اُس کے ہدیۂ ناز کو ٹھکراتا ہوا چلا جاتا، اپنی زندگی کو کلیجے سے نوچ کر گاڑی میں پھینک جاتا۔ لیکن جب میں نے اُسے سوتا ہوا پایا تو میری پریشانی دور ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، ایسے میں اپنے اوپر جبر کر کے اُتر جانا چاہیئے۔ چنانچہ ایک فیصلہ کن انداز سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نہایت خاموشی سے، بالکل چوروں کی طرح نیچے اُتر آیا۔ ایک قلی سے آہستہ سے کہا کہ میرا سامان وہ رکھا ہے، اُتار لو، قلی سامان اُتار رہا تھا اور میں دعائیں کر رہا تھا کہ الٰہی نگار سوتی رہے، اُسکی آنکھ نہ کُھل جائے۔ مگر افسوس! جب قلی میرا تمام سامان اُتار چکا تو نگار اُٹھ بیٹھی اور وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی قلی نے سامان سر پر رکھ لیا تھا اور وہ چلنے کے لئے تیار تھا، صرف میری رہبری کا منتظر تھا۔ میں چلنے کو مُڑا تو نگار نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے "خدا حافظ" کہا۔ میرے اوپر بجلی گر پڑی، جہاں تھا وہیں جم گیا میں نے قلی سے کہا میرا سامان گاڑی میں واپس رکھ دو، میں یہاں نہیں اُتروں گا، آگے جاؤں گا، وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ اُدھر گارڈ نے بھی سیٹی بجا دی لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا، میں طے کر چکا تھا کہ اس کھیل کو آخر تک کھیلوں گا، اس مذاق کو کسی نتیجے تک پہونچاؤں گا، اس چہل اور اس ہنسی کو خونیں آنسوؤں کی حد تک کھینچ کر لے جاؤں گا، میں دیکھوں گا کہ دیوانگی، وحشت اور جنون کے دہکتے ہوئے شعلے........

لیکن میں کچھ حرارت سی محسوس کر رہا ہوں، شاید مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔

(طبعزاد)

اخترانصاری بی۔ اے (آنرز)

مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

(بہ سلسلہ ماہ دسمبر سنہ ۳۴ء)

اس میں شک نہیں کہ اعلانِ جمہوریت اور مسئلۂ صدارت طے ہونے کے بعد بظاہر کوئی ایسا مقصد نہ تھا جس کی تکمیل کے لئے مصطفےٰ کمال اُسی جوش و خروش سے کام لیتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ سب مبادیات میں داخل تھا اور اصلِ کار کی طرف متوجہ ہونے کا وقت تو اعلانِ جمہوریت ہی کے بعد آیا تھا۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال نے عنانِ صدارت ہاتھ میں لیتے ہی ملک میں اُن اصلاحات کو رائج کرنا چاہا جو اس وقت تک صرف اس کے ذہن میں موجود تھیں اور جن کا نام بھی وہ کبھی زبان پر نہ لایا تھا۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ جمعیت ملی جو حقیقتاً اسکے سیاسی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی تھی، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں پورا اقتدار حاصل کر چکی تھی۔ فوج کا ایک ایک سپاہی اس کے ہاتھ میں تھا اور بہ حیثیت صدر ہونے کے وہ ملک کی تنہا فرمانروا ہستی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب مزید انتظار کی ضرورت نہ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اقدام شروع کر دے۔

اس کے احباب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مذہب کا مخالف ہے۔ جس وقت کبھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی تھی تو اس کے جوش کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ "مذہب آتش فشاں مادہ کی وہ متحجر تہ ہے جس کے نیچے قوم کی مشتعل روح دبی ہوئی ہے، میں اس تہ کو توڑ کر قوم کی اس روح کو بروئے کار لاؤں گا۔" اس کا خیال تھا مذہب زہر ہے جس نے سیاست اجتماعی کو ہلاک کر رکھا ہے اور اس کا دور کرنا ضروری ہے۔

اس طرف مصطفےٰ کا خیال تو یہ تھا لیکن ملک کی حالت یہ تھی کہ ہر شخص مذہب کا شیدائی تھا، مولویوں کا اقتدار بدستور قائم تھا اور اس مسئلہ کو چھیڑنا گویا سارے ملک کو اپنا مخالف بنا لینا تھا، اسی لئے وہ خاموش تھا اور جب کوئی شخص اُس سے پوچھتا کہ جمہوریت ترکی کا مذہب کیا ہوگا تو وہ کوئی صاف جواب نہ دیتا۔ اسی طرح جمعیت ملی کے قیام کے وقت اس نے کوئی ذکر مذہب کا نہ کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ نام آتے ہی صورتِ حال بدل جائے گی اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

چونکہ مصطفےٰ کمال کی اس ذہنیت کا علم اس کے مخالفین کو بھی تھا، اس لئے انھوں نے قیامِ جمہوریت کے بعد ہی یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مصطفےٰ کمال مذہب کا دشمن ہے اور وہ اسلام و خلیفہ دونوں کو مٹا دینا چاہتا ہے۔

اس سے قبل جب عبدالمجید کو خلیفہ بنایا گیا تھا تو مصطفےٰ کمال نے ان تمام مراسم تزک و احتشام کے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا جو عموماً اس تقریب میں ادا کئے جاتے تھے۔ اسی طرح جب اسمبلی میں خلیفہ کے اختیارات کی بحث چھڑی تو اس نے یہ کہہ کر گفتگو کو ختم کر دیا کہ:

"خلیفہ کی حیثیت شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہیں اور اُسے کوئی اختیار نہیں مل سکتا۔"

جب خلیفہ عبدالمجید نے اپنے مشاہرہ میں اضافہ کئے جانے کے متعلق لکھا تو مصطفےٰ کمال نے ان الفاظ میں جواب دیا کہ "خلافت محض ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جس کا وجود بالکل غیر ضروری ہے، اور تمہارا میرے سکریٹری کو اس طرح کی تحریر بھیجنا سخت ناروا جسارت ہے۔"

الغرض اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات تھے جنھوں نے پبلک کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا تھا کہ مصطفےٰ کمال کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے مثلاً شیخ اسلام کی معزولی، اور برقعہ ونقاب کی مخالفت — اور اس لئے مخالفین کے پروپاگنڈا کا کافی اثر ملک میں ہوا۔

ملاؤں اور درویشوں نے مساجد میں سڑکوں پر، خانقاہوں کے اندر اور قہوہ خانوں میں الغرض ہر جگہ مصطفےٰ کمال کے خلاف سازشیں شروع کیں اور اس کے سیاسی مخالفین نے بھی اپنے ایجنٹوں اور اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ سے اس میں کافی حصہ لیا۔ اس کے بعد جب رفتہ رفتہ یہ تحریک زیادہ قوی ہوگئی تو مصطفےٰ کمال کی مخالف جماعت انگورا چھوڑ کر استنبول پہونچی اور خلیفہ عبدالمجید کا دامن پکڑا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مصطفےٰ کمال جو چاہے کرے لیکن خلافت اور خلیفہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا

عبدالمجید ایک سادہ مزاج اور خاموش آدمی تھے اور سازش کرنے والے انسان نہ تھے لیکن خلیفہ ہونے کے بعد وہ بحیثیت ظل اللہ امیر المومنین پورے تزک واحتشام کے ساتھ باہر نکلنا پسند کرتے تھے اور جب ملک کے تمام درویش وعلماء اور مصطفےٰ کمال کے مخالفین (رؤف، عدنان، رفعت، کاظم قرہ باقر وغیرہ) نے اُن کو آن گھیرا، تو ان کے اندر بھی ایک ولولہ پیدا ہوا اور وہ واقعی اپنے آپ کو تمام جماعت اسلامی کا مرکز سمجھنے لگے۔

مصطفےٰ کمال نے ان تمام حالات کا مطالعہ کیا اور سمجھ گیا کہ حالات اس کے مخالف ہوتے جارہے ہیں اور اگر اس رجحان کو بڑھنے دیا گیا تو کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ قدرت نے پھر اس کو ایک موقعہ دیا — یعنی سر آغا خاں اور سر امیر علی (مرحوم) نے مسلمانان ہند کی طرف سے مطالبہ کیا کہ خلیفہ وخلافت کو قائم رکھ کر اس کے احترام کو بدستور قائم رکھا جائے۔ یہ تحریر قسطنطنیہ کے اخبارات کو بھیجی گئی اور قبل اس کے کہ انگورا حکومت کو اطلاع ہوتی شایع بھی ہوگئی۔

مصطفےٰ کمال نے فوراً اس کے خلاف پروپاگنڈا شروع کیا اور اہل ملک کو بتایا کہ آغا خاں صرف اسمٰعیلی جماعت کے قاید وپیشوا ہیں اور عام مسلمانان ہند سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، علاوہ اس کے وہ انگلستان میں رہتے ہیں، انگریزوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں۔ چونکہ انگلستان کی طرف سے جذبات نفرت واکراہ لوگوں میں بہت قوی تھے، اس لئے اس پروپاگنڈا کا اثر نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اسمبلی سے قانون پاس کردیا کہ جو شخص جمہوریت کی مخالفت اور سلطان کی موافقت کرتا ہوا پایا جائے گا وہ ملک کا باغی سمجھا جائیگا اور اس کو سزا اے موت دیجائے گی۔

اسمبلی میں بعض مقررین نے خلافت کی موافقت میں بولنا بھی چاہا تو ان کو بٹھا دیا گیا اور اسمبلی سے یہ قانون پاس کرانے کے بعد مصطفےٰ کمال نے ان اخبارات کی گرفت شروع کی جو خلافت کی حمایت میں تھے اور آخرکار اس کے خلاف مذہبی جوش بڑی حد تک فرو ہوگیا۔

لیکن مصطفےٰ کمال کو ہنوز اطمینان نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اپنی فوج کے خیالات کا اندازہ کرے چنانچہ وہ سمرنا کے قریب پہونچا جہاں سالانہ پریڈ ہو رہی تھی۔ یہاں پہونچکر اس نے فوضی اور عصمت سے مسلسل کئی دن تک گفتگو کی اور ہر وقت اسی جستجو میں لگا رہا کہ اگر اس نے خلیفہ کو نکالنا چاہا تو کیا فوج اس کا ساتھ دیگی یا نہیں۔ آخرکار اس نے ایک دن فیصلہ کر لیا جو اسے کرنا تھا اور گورنر استنبول کے نام فوری احکام جاری کئے کہ عبدالمجید کے ترک دارالشام کے لئے جو فوج فراہم کیجاتی ہے وہ ہٹالی جائے اور اس کا وظیفہ بالکل کم کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ اس کے ساتھیوں کو فوراً علیحدہ ہو جانے کی ہدایت کی جائے۔

۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفےٰ کمال نے اسمبلی میں مسودۂ قانون پیش کیا کہ خلیفہ کو نکال دیا جائے اور تمام سلطنت ترکی جمہوری حکومت قرار دیدیا جائے۔ یہ قانون بغیر کسی مخالفت کے پاس ہوگیا اور اسی رات گورنر استنبول کو حکم دیا گیا کہ خلیفہ عبدالمجید کو طلوع صبح سے قبل ترکی سے باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ اس کی لفظ بہ لفظ تعمیل ہوئی اور اس طرح مصطفےٰ کمال نے گویا پہلا قدم کامیابی کی طرف اُٹھایا۔

مصطفےٰ کمال اپنے دشمنوں پر غالب آچکا، ملک پر قبضہ حاصل کر چکا، لیکن اہل ملک کو مفتوح کرنا ہنوز باقی تھا اور یہی دشوار ترین منزل ایسی تھی جس کا طے کرنا اس کا حقیقی مقصود تھا۔ انتزاعِ خلافت اور خلیفہ کو حدود ترکی سے باہر کرنے کے بعد اس کی صحت پھر خراب ہوگئی۔ اور جیسا کہ خرابی صحت کی حالت میں وہ ہمیشہ نیچی سطح پر آکر عامیانہ لطف و تفریح میں اپنے اوقات بسر کرنے کا عادی تھا، اب بھی اس میں منہمک ہوگیا یہی وہ زمانہ ہے جب اس نے لطیفہ کو طلاق دی۔ اس واقعہ کے متعلق مختلف حلقوں میں مختلف خیالات قایم کئے گئے اور بعض نے لطیفہ کے اخلاقی حالت کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال اپنی فطرت کے لحاظ سے سخت عملی انسان واقع ہوا ہے اور جذبۂ محبت و رواداری کبھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ اس نے عورتوں سے صرف اس لئے واسطہ رکھا کہ ایک مرد اپنی جنسی خواہشات پورا کرنے کے لئے ان سے ملنے پر مجبور ہے اور اس سے آگے بڑھکر اس نے کوئی پرواہ اُن کے جذبات کی نہیں کی، یہاں تک کہ وہ نکاح کو بھی چنداں ضروری چیز قرار نہیں دیتا۔

چنانچہ اول اول جب لطیفہ کو اس نے دیکھا تو یہی جذبات مصطفےٰ کمال میں موجزن تھے اور اگر لطیفہ اپنی فراست و دانشمندی سے کام نہ لیتی تو شاید نکاح کی بھی نوبت نہ آتی۔ اب صدر جمہوریت ہونے کے بعد لطیفہ نے اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے سیاسیات میں بھی دخل دینا شروع کیا جیسا کہ یوروپ کی تعلیم یافتہ خواتین کا دستور ہے اور مصطفےٰ کمال نے جو اپنے معاملات میں خدا کا بھی دخیل ہونا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی عورت کا، اس کو ناپسند کیا، آخرکار تعلقات بہت خراب ہوگئے اور سوائے اس کے کہ آپس میں جدائی ہو جائے اور کوئی صورت مناسب نہ معلوم ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد مصطفےٰ کمال کی دلچسپیوں میں پھر تغیر پیدا ہوا اور اس نے آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اس دوران میں دو مرتبہ اس کو ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ایک بار بم پھینکا گیا اور دوسری بار کھانے میں زہر دیا گیا۔ بم سے تو خیر بالکل صاف بچ گیا تھا، لیکن زہر نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا ہوتا اگر فوراً تدبیر نہ کیجاتی۔ بہرحال کچھ ان واقعات نے اور کچھ مرتبہ و وجاہت کے احساس نے

اُسے مجبور کیا کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہے اور ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھے چنانچہ اس نے اپنے مکان پر سرچ لائٹ (برقیہ) نصب کرادی اور حکم دیدیا کہ کوئی شخص بلا اجازت مکان کے قریب نہ آئے۔ جب وہ نکلتا تو ایک دستہ محافظ فوج کا اس کے ساتھ ہوتا اور جب چان قایا (اپنی فرودگاہ) سے انگورا جاتا تو اس چار میل کے راستہ میں مسلح سپاہیوں کی جماعت دونوں طرف کھڑی رہتی۔

اگر وہ کسی ہوٹل، قہوہ خانہ میں، یا کسی کے گھر جاتا تو اس کے پہونچنے سے قبل وہ جگہ مسلح پولیس کے سپاہیوں اور خفیہ پولیس کے آدمیوں سے جو ریوالور سے مسلح ہوتے بھر جاتی، البتہ عصمت وغیرہ بعض ممبران اسمبلی سے ملنے میں وہ اتنی احتیاط نہ کرتا تھا، حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ نہ وہ کسی پر اعتبار کرسکتا تھا اور نہ کسی کی رائے اپنے خلاف سن سکتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کے خلاف بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ طوفان اتنا بڑھ گیا کہ مصطفےٰ کمال ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ دیکھئے یہ سیلاب کب اس کے قدم اکھاڑ دے۔

ترکی کی اقتصادی حالت اس وقت حد درجہ دردناک تھی۔ لڑائی کی وجہ سے قصبے کے قصبے پامال و ویران پڑے ہوئے تھے، اور افلاس انتہائی حد تک پہونچ گیا تھا، جس وقت رعایا دیکھتی تھی کہ اس نے پانی کی طرح اپنا خون بہا کر دشمن کو ملک سے نکالدیا اور جتنے مصائب اس سلسلہ میں برداشت کئے جاسکتے تھے وہ سب اس نے برداشت کرلئے، لیکن اس کی پریشانی و عسرت کا وہی عالم ہے، تو وہ چیخ اٹھنے پر آمادہ ہو جاتی تھی، لوگ دیکھ رہے تھے کہ خلیفہ عبدالمجید کے زمانہ میں ان کو قہوہ تو مل جاتا تھا، بچوں کو کبھی کبھی شیرینی بھی میسر آجاتی تھی، بیوی کیلئے عید بقر عید نیا جوڑا بھی بن جاتا تھا، لیکن اب تو سد رمق کے لئے غذا بھی میسر نہیں اور روپیہ کا ملک بھر میں کہیں پتہ نہیں۔ بھاری بھاری ٹیکس لگائے جارہے ہیں، ملک کی تمام نوجوان آبادی فوج میں بھرتی ہوگئی ہے، زراعت اُجڑ گئی ہے، کاروبار بند ہیں اور کوئی صورت ان مصائب کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی۔

ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد ہر ملک کی حالت کم و بیش ایسی ہی ہو جاتی ہے، چہ جائیکہ ترکی جہاں پہلے ہی سے اقتصادی پریشانیاں پائی جاتی تھیں، اس لئے یقیناً اس میں مصطفےٰ کمال کا کوئی قصور نہ تھا، لیکن اس کے دشمن اس حالت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس کے خلاف لوگوں کو مشتعل کر رہے تھے اور آخر کار وہ اس حد تک کامیاب ہوگئے کہ یہ مسئلہ اسمبلی میں پیش ہوا۔ ممبروں نے کھلم کھلا عصمت اور اسکے ساتھ مصطفےٰ کمال پر بھی لعن طعن شروع کی۔ انھوں نے ترکی کی مالی و اقتصادی حالات پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ترکی لیرا (پونڈ) گرتا جارہا ہے ملک کی ساکھ ختم ہوگئی ہے، کوئی سرمایہ کسی قسم کا باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی جماعت سرمایہ لگانے والی ہے تو باہر کی، لیکن عصمت اس کی سنتا نہیں بندرگاہ سمرنا دو سال سے ویران حالت میں پڑی ہے اور مطلقاً اسکی درستی کا خیال نہیں کیا جاتا، جدید قوانین تجارت نے کاروبار کو اور زیادہ معطل کردیا ہے اور بازار بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں الزامات تھے جو عصمت اور مصطفےٰ کمال پر قائم کئے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کی جو حالت ان لوگوں نے بیان کی وہ بالکل صحیح تھی اور اس میں بھی کلام نہیں کہ مصطفےٰ کمال نے تمام مالی معاملات اپنے وزیر اعظم عصمت کے سپرد کردئے تھے اور چونکہ عصمت اور مصطفےٰ دونوں صرف سپاہی تھے اور اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لئے ان شکایات کا پیدا ہونا بالکل بجا تھا۔

اسمبلی میں یہ تمام مسائل بیان کئے گئے اور عصمت و مصطفےٰ کمال کے خلاف نااہلیت کا ووٹ پاس کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ لیکن

ممبران اسمبلی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دو فریق کے تعلقات حد درجہ کشیدہ ہو گئے۔

قسطنطنیہ میں بہ صدارت رؤف بے، جاوید کے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا اور مصطفیٰ کمال کی مخالفت میں ایک جدید جماعت قائم کی گئی جس میں بہت سے ساتھی مصطفیٰ کمال کے بھی شریک تھے اور مقصود اس جماعت کا یہ تھا کہ مصطفیٰ کمال کی خود مختارانہ حیثیت کو محو کر کے جدید نظام حکومت قائم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ ان دو مخالف جماعتوں کا ذکر ہونے لگا اور سڑکوں پر گلیوں میں جس جگہ دونوں جماعتوں کے آدمی مل جاتے تو آستینیں چڑھائی جاتیں۔ اسی دوران میں اسمبلی کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جہاں ریوالور باہر نکل آئے اور کشت و خون ہو گیا۔ ان مقتولین میں سے ایک کرنل خلیق تھا جس نے عصمت کے خلاف الزامات قائم کئے تھے۔ اور دوسرا علی شکری جسے مصطفیٰ کمال کی مخالفت کی وجہ سے عثمان آغا افسر باڈی گارڈ نے دعوت دے کر بلایا اور گولی سے ہلاک کر دیا۔ عثمان آغا نہایت خونخوار شخص تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ [illegible] آدمیوں کا خون اپنے ہاتھ سے کر چکا تھا۔ ہر چند یہ امر پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا کہ اس نے علی شکری کو مصطفیٰ کمال کے اشارہ سے قتل کیا، لیکن چونکہ وہ باڈی گارڈ کا افسر تھا اس لئے لوگوں کو قدرتاً یہی خیال کرنا چاہئے تھا۔

جس وقت علی شکری کی لاش دیکھی گئی تو تمام انگورا مشتعل ہو گیا اور عثمان آغا کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا۔ اول اول تو مصطفیٰ کمال نے اس کو گرفتار ہونے سے بچا لیا، لیکن جب ہنگامہ زیادہ ہوا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گارڈ کے سپاہی مصطفیٰ کمال کے دشمن ہو گئے اور اگر وہ فوراً وہاں سے بھاگ کر رؤف کے مکان میں پناہ نہ لیتا تو شاید ہلاک کر ڈالتے۔

مصطفیٰ کمال نے پبلک کی یہ حالت دیکھ کر ٹیکس عشر موقوف کر دیا تاکہ اضطراب میں کچھ کمی پیدا ہو، اور اسی کے ساتھ عصمت کو موقوف کر کے فتحی کو وزیر مقرر کیا لیکن پبلک نے اس تغیر کا یہ مفہوم لیا کہ مصطفیٰ کمال دب گیا ہے اور اب موقع ہے کہ اس کا سر ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے چنانچہ انھوں نے ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کی رو سے صدر کے اختیارات بہت محدود ہو جاتے تھے، اور ہر چند رایوں کی کمی سے یہ قانون پاس نہ ہو سکا، لیکن مصطفیٰ کمال سمجھتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ تمام رعایا اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے برہم تھی۔ جمعیت ملی کا نظام خراب ہو چکا تھا، اس کے اکثر ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، فوج پر اس کو پورا اعتماد نہ رہا تھا، مشرقی حصۂ ملک کے ملّا اُسکے خلاف جہاد کی طیاریاں کر رہے تھے، نسطوریوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور انگلستان نے قبضۂ موصل کا الٹی میٹم دیکر اس کی رہی سہی ساکھ کو بھی برباد کر دیا تھا۔

الغرض مصطفیٰ کمال کے لئے اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی کہ دفعتہً کردوں کی بغاوت کی خبر آئی جو نقشبندی درویشوں کی جماعت کہلاتی تھی اور شیخ سعید ان کا سردار تھا۔ انھوں نے جمہوریت کے خلاف اور خلیفہ و سلطان کی حمایت میں نہایت پُرجوش جہاد شروع کر دیا اور دو مہینے کے عرصہ میں حدود دیار بکر تک قابض ہو گئے۔

آپ مصطفیٰ کمال کی سیرت پڑھیں گے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جب کبھی مصائب نے گھیر کر اس کو مایوسی و ناکامی کی حد تک پہونچایا، اسی وقت کوئی نہ کوئی سبب ایسا ضرور پیدا ہو گیا کہ پھر وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کر سکے۔

چنانچہ اس وقت بھی بالکل یہی صورت پیش آئی کہ کردستان کی بغاوت کی وجہ سے ترکوں نے باہمی آویزش کو بالائے طاق رکھ کر

اور جس وقت مصطفیٰ کمال باغیوں کی سرکوبی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو ایک ایک ترک بچہ مسلح ہو کر اس کے ساتھ تھا۔

مصطفیٰ کمال نے جس عزم و استقلال، جس جرأت و ہمت بلکہ ایک حد تک جس سفاکی و بیرحمی سے کام لیکر اس فتنہ کو فرو کیا وہ اخبار بین جماعت سے مخفی نہ ہوگا۔ اس نے تمام کُردستان کو خون اور آگ سے برپا کر کے کھنڈر بنا دیا اور اتنا سخت قتل عام کیا کہ تاریخ میں دو ہی چار نظیریں ایسی مل سکتی ہیں۔

مصطفیٰ کمال نے خاص فوجی عدالتیں قائم کر کے اس کا صدر بلدحلمی کو بنایا جو اس کا نہایت پُرجوش حامی تھا اور تمام شیوخ کُردستان کو جن میں شیخ سعید بھی شامل تھا تہ تیغ کر دیا۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد ہی مصطفیٰ کمال نے اپنے مخالفین کی طرف توجہ کی اور اسمبلی کا جلسہ کر کے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ:-

"ملک کی حالت کبھی درست نہیں ہو سکتی، جب تک غداران وطن ہمارے اندر موجود ہیں اور رؤف، کاظم قرہ باقر، علی فواد، جو مخالف جماعت کے روح رواں ہیں، تمامتر ذمہ دار اس بغاوت کے ہیں، چنانچہ بغاوت کردستان سے چند روز قبل کاظم قرہ باقر اور علی فواد کا فوج سے استعفا دیدینا اور کاظم کا شیخ سعید سے خط و کتابت کرنا (اس نے ایک خط بھی کاظم کا پیش کیا) یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا کردستان کو بغاوت پر آمادہ کرنا۔ حقیقتاً کردستان کی ہمدردی پر مبنی نہ تھا، بلکہ انگلستان کی مدد کرنا مقصود تھا جس نے گزشتہ جنگ میں کُردستان کو ترکی کے خلاف جنگ کرنے کی پوری ترغیب دی تھی اور جس کے متعلق عہدنامہ سیورے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کو ایک خودمختار ریاست بنا دیا جائے گا۔ لیکن انگلستان کا بھی یہ طرز عمل کردوں کی فلاح کے لئے نہ تھا بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ اُسے موصل اور اس کے چشمہ ہائے پٹرول کی ضرورت ہے اور کُردستان اس سرزمین کی کُنجی ہے۔

آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ شیخ سعید نے خلیفہ کی حمایت میں علم بغاوت بلند کیا تھا اور یہ امر بھی آپ سے مخفی نہیں کہ خلیفہ اور انگلستان کے کیا تعلقات ہیں۔"

چونکہ مصطفیٰ کمال کو معلوم تھا کہ انگلستان سے ترکی کا بچہ بچہ بیزار ہے، اس لئے اس نے اپنی تقریر میں اسی مسئلہ پر زیادہ زور دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمبلی میں مصطفیٰ کمال کی مخالف جماعت کا زور بالکل ٹوٹ گیا جس کے بڑے بڑے اہم سردار مثلاً رؤف، رحمی، سدتان اور خالدہ ادیب خانم (جو آجکل ہندوستان میں ہیں) اس سے قبل ہی ملک چھوڑ چکے تھے۔

مصطفیٰ کمال نے اسی کے ساتھ ایک ہنگامی قانون پاس کرالیا کہ حکومت جمہوریت کے خلاف لکھنا یا بولنا بغاوت میں شمار ہوگا اور اخبارات کا نہایت سختی سے احتساب ہونے لگا۔ ہرچند اب مصطفیٰ کمال برسرِ اقتدار ہو گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک اس کی مخالف جماعت موجود ہے ہر وقت ردعمل کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس لئے اس نے چاہا کہ ان پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر باغیوں کا سا سلوک

کرے لیکن فتحی (وزیر اعظم) اور کیبنٹ کے بعض اور ممبران اس کارروائی کے مخالف تھے۔ انھوں نے کہا کہ مخالف جماعت میں سے اکثر ان کے دوست ہیں، اور بعض نے (مثلاً رؤف، علی فواد، کاظم قرہ باقر) نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ پھر علاوہ اس کے ان کے خلاف شہادت بھی ایسی مستحکم نہیں کہ وہ سیاسی مجرم قرار پائیں۔

مصطفیٰ کمال نے جمعیت ملی کی مرکزی کمیٹی کو طلب کیا لیکن اس میں بھی اختلاف آراء کی وجہ سے کامیابی حاصل نہ ہوئی یہ دیکھ کر مصطفیٰ کمال خاموش ہو گیا اور سمجھ گیا کہ ابھی مناسب وقت اس کارروائی کا نہیں آیا، اس لئے اس نے سوچا کہ اگر مخالف جماعت کے سردار دسترس سے باہر ہیں تو اُن کے ساتھیوں کو تو کم از کم صاف ہی کر دینا چاہئے اس لئے اس نے فتحی کو وزارت سے معزول کر کے پھر عصمت کو وزیر بنایا اور اس نے چن چن کر فریق مخالف کے ہمنوا لوگوں کو دار و رسن کے سپرد کرنا شروع کیا۔ اس نے پولیس کو ہدایت کی کہ مخالف جماعت کے سرداروں کی خاص نگرانی کی جائے اور جو ثبوت ان کے خلاف فراہم ہو سکے اُسے مہیا کیا جائے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مصطفیٰ کمال نے سمرنا جانے کا ارادہ کیا اور اس کے پہونچنے سے دو روز قبل پولیس نے تین آدمیوں کو مشتبہ حالت میں گرفتار کیا جو بم رکھتے تھے۔ ان کے پاس سے ایک خط سعید خورشید کا بھی برآمد ہوا جو اسمبلی میں مخالف جماعت کا نمائندہ تھا۔ اس بہانہ کے ہاتھ آتے ہی مصطفیٰ کمال نے تمام مخالفین کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا اور ان کے خلاف تحقیقات کرنے کے لئے دو جگہ عدالتیں قائم کی گئیں، معمولی قیدیوں کے لئے سمرنا میں اور اہم قیدیوں کے لئے انگورہ میں۔

سمرنا کے قیدیوں میں سے ایک شخص عارف بھی تھا اور جس وقت مصطفیٰ کمال کے سامنے ان قیدیوں کے احکام موت کے کاغذات پہونچے تو اسکو عارف کا نام بھی نظر آیا۔ یہ عارف وہی شخص تھا جو کسی وقت مصطفیٰ کمال کا انتہائی دوست رہ چکا تھا اور بڑے بڑے سخت اوقات میں اسنے اسکی مدد کی تھی، لیکن چونکہ وہ مخالف جماعت میں شامل ہو گیا، اس لئے ایک لمحہ تامل کئے بغیر اس کے حکم قتل پر بھی دستخط کر دئے۔

انگورہ میں جن لوگوں کے خلاف عدالت گاہیں قائم کی گئیں ان میں سوائے رؤف اور رحمی کے سب شامل تھے (یہ بھاگ کر نکل گئے تھے)۔

عدالتگاہوں کا صدر وہی بلد علی تھا جس نے کردستان کی بغاوت میں یہ خدمت انجام دی تھی۔ جسوقت ان سرداروں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی اسی وقت سے دُنیا کے مختلف گوشوں سے ان کی رہائی کے مطالبہ میں آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں، نیویارک، پیرس اور برلن کی یہودی جماعتوں نے تار پر تار بھیجنا شروع کئے کہ انکو رہا کر دیا جائے، مختلف مالی اداروں نے جن میں راسچائلڈ کے بنک (ویانہ اور لندن کے) بھی شامل تھے اپنی اپنی حکومتوں اور ملکی اخباروں پر زور دیا کہ جاوید کی رہائی کی پوری کوشش کریں بلکہ فرانس سے تو ایک خاص شخص (ساروت) انگورہ اسی لئے آیا کہ وہ مصطفیٰ کمال سے ملکر ذاتی طور پر اپنا اثر ڈالے کیونکہ یہ فری میسن لاج کا بڑا زبردست رکن تھا اور مصطفیٰ کمال بھی فری میسنری جماعت سے تعلق رکھتا تھا، لیکن مصطفیٰ کمال نے کسی ایک کی نہیں سُنی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان سب کو فنا کر دینا ضروری ہے — چنانچہ بلد علی خود ان لوگوں کے احکام موت، مصطفیٰ کمال کے پاس دستخط کے لئے لایا اور مصطفیٰ کمال نے ان پر دستخط کر کے حکم دیا کہ آج ہی رات کو تعمیل ہو جانا چاہئے۔ بلد علی کے رخصت ہوتے ہی مصطفیٰ کمال نے ایک جلسۂ رقص منعقد کیا اور بہت سے مہمانوں کو اس میں مدعو کیا۔ چنانچہ نصف شب کے وقت جب جلسۂ رقص اپنے انتہائی عروج پر تھا، انگورہ سے چار میل کے فاصلہ پر گیس کی روشنی میں گیارہ سولیاں طیار کی گئیں اور ٹھیک اسوقت جب یہاں شراب آلود قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی وہاں ترکی کے بڑے بڑے اکابر اپنا دم توڑ رہے تھے (باقی)

صفیر بلگرامی

آرہ اپنی علمی و ادبی مرکزیت کے لحاظ سے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معروف ہے، اس نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر اُردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کو ادب اُردو کی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی، اُردو کا قدیم ترین شاعر جو آرہ میں گزرا ہے وہ مولانا انور علی یاسؔ (متوفی سنہ ۱۲۶۳ھ) ہے، آپ شیخ غلام علی راسخؔ (متوفی سنہ ۱۲۳۸ھ) کے تلامذہ میں تھے، آرہ کی ادبی زندگی کا یہ دور اولین تھا، اسی عہد مامون میں مارہرہ و بلگرام کے ارباب سخن آرہ میں تشریف لاتے تھے، چنانچہ یاسؔ مرحوم نے حضرت سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ، سید محمد عسکری، سید بندہ علی وغیرہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے گزر جانے کے بعد ادبی قیادت کی عنان حضرت صفیرؔ مرحوم کے ہاتھ آئی اس عہد میں اُردو کو بہت بڑا فروغ ہوا چنانچہ مطبع کا قیام، مشاعروں کی بنیاد، تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ، صحافت کی ترویج اسی زمانہ سے متعلق ہے، اور اسکو ہم اپنی اصطلاح میں خیر القرون کہہ سکتے ہیں اسی دور کی برکات کا یہ اثر ہے، کہ آرہ میں سیکڑوں نامی و ماہر اساتذہ اُردو پیدا ہوئے، شیخ محمد حسن نظیرؔ، سید سبحان حیدر نذیرؔ، آغا حسن ظہیرؔ، لالا امر چند جمیلؔ، چودھری ریاض الدین آرزوؔ، برکت خاں سیفیؔ، سید لقمان حیدر اسی دور کے نکتہ سنج شعرا تھے،

صفیرؔ مرحوم کی قیادت کا یہ سلسلہ سنہ ۱۳۰۸ھ میں ختم ہوگیا اور وہ اپنے بعد ایسے ایسے نونہالان ادب چھوڑ گئے جنھوں نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دئے، مولانا اسمٰعیل مہرؔ، مولوی عظیمؔ، شاہ ابراہیم فوقؔ، مولانا ابراہیم فوقؔ، مولانا ضمیر الحق قیسؔ، قاضی واجد حسین وجدؔ سید امیر حسن بدرؔ مولانا ابو الفضل حشرؔ، چودہری فخر الدین فخرؔ، سید قمر الدین قمرؔ، جے نند کمار جوہرؔ نے اپنی نگارش جمیل اور بدیعہ انشا سے اُردو نظم و نثر کو بڑا فروغ دیا، مولانا مہرؔ بہت بڑے گلتراش اور صناع تھے، مولوی عظیمؔ ظریفانہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کے صاحبزادہ ابو البرکات برقؔ آرہ کے اُن اکابر شعرا میں ہیں جو مشاعرہ میں میر سوز کی شعر خوانی کے مناظر پیش کر دیتے ہیں شاہ ابراہیم فوقؔ اس عہد کے بہت بڑے ماہر سخن تھے، مولانا ضمیر الحق قیسؔ شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہیں آپ کو عروض میں پوری دستگاہ ہے، مولانا بدرؔ مرحوم کے "خمخانہ" پر "مخزن" (لاہور) میں ایک بار لکھا جا چکا ہے۔

آج میں اپنے وطن کے مشہور شاعر حضرت صفیرؔ کے حالات و کلام پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

نام و نسب ولادت و وطن | آپ کا نام فرزند احمد تخلص صفیرؔ ہے سنہ ۱۲۶۹ھ میں بمقام مارہرہ اپنے ننہال میں پیدا ہوئے۔

"شمس الضحیٰ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ایک سال کے ہوئے تو بلگرام آئے جو آپ کا آبائی وطن تھا، چار سال کی عمر میں قصبہ آرہ میں وارد ہوئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

سو ہو مسکن وطن سب اے سفیر تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

فرزند احمد بن سید احمد بن سید غلام یحییٰ بن سید بندہ علی بن سید خورشید علی بن سید خورشید علی کا سلسلۂ نسب سید ابوالحکیم بن سید ابوالقاسم بن سید حسن بن محمد بن محمود بن محمد کی وساطت سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام تک اور حضرت صغریٰ کا نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین تک پہونچتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سید محمد صغریٰ کے اخلاف میں سے تھے، سید صاحب نے ۶۱۴ھ میں بلگرام کو فتح کیا تھا اسکے بہت عرصہ قبل سید ابوالفرح واسطی اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ "سادات صغریٰ" خود کو واسطی کہتے ہیں چونکہ ان کے جد امجد واسط سے ہندوستان میں آئے تھے۔

اکثر مثالوں میں پتہ چلتا ہے، کہ انسان کی ذہنی ترقی اور تعمیر سیرت میں خاندان کو بہت بڑا تعلق ہوتا ہے، لیکن اس سے ہٹ کر اس کی کوئی اصلیت نہیں اگر ایک شخص علم و فضل کے ساتھ اچھے عادات و خصائل بھی رکھتا ہے، تو پھر اس کے لئے خاندان کا فخر کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن جہاں ہماری ادبیات میں بہت سے زہریلے جراثیم داخل ہوگئے وہاں خاندانی فخر و مباہات کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور آج سیرت پر مشکل تمام سے کوئی کتاب دستیاب ہوسکتی ہے، جو اس قسم کے ترہات سے پاک ہو، سر سید، نذیر احمد جیسے قومی فدائیوں نے بھی کسی نہ کسی پیرایہ میں اپنی خاندانی عظمت کا تذکرہ کیا اور "حیات جاوید" کے مصنف حالی نے تو سرسید بت بنا کر رکھ دیا۔

میں یہاں مختصراً سید فرزند احمد صاحب کے ان افکار پر ایک تنقید کرنا چاہتا ہوں، جو انھوں نے اپنے نسب و حسب کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں، فرماتے ہیں:۔

> "چونکہ سادات صغرادی بلگرام کو حفظ نسب کا خیال سب خیالوں سے بڑھکر ہے، اور اس کی احتیاط ابتک کہ سات سو برس سے زیادہ ہندوستان میں آئے ہوئے، بڑے زور شور سے رہی ہے، کہ دوسری قوموں کے جائے رشک، اور باعث استعجاب، اور وجہ رغبت اور اس حفظ نسب کی مشق یہاں تک کی گئی ہے کہ جس قدر قربت میں نسبت ملتی ہے، وہ باعث فخر ہوتی ہے، اور انتہا یہ ہوگئی ہے کہ احتیاط کرتے کرتے چار بھائیوں سے اگر بڑے بھائی کی اولاد سے منجھلے اور منجھلے کی اولاد سے چھوٹے کی اولاد کو وصلت واقع ہوئی اور اس وصلت کو تواتر ہوگیا ہے تو وہ بھائی اسی کا ہوگیا گویا بڑے اور منجھلے کو منجھلے اور چھوٹے سے اور چھوٹے اور منجھلے کو بڑے اور منجھلے سے قرابت ہی باقی نہیں رہی" (تاریخ بلگرام ص ۱۳۵)

"یہ قصبہ (بلگرام) سادات ہی کی بود و باش کے سبب سے مشہور ہوا ہے اور اعلیٰ درجہ کے ساکنین سادات ہی شمار کئے جاتے ہیں اور ان سادات کی ناموری "خاندانی" کے لقب سے شہرت پذیر ہوئی اور خاندانی ہونا خوبی اصلیت و نجابت و شرافت کی دلیل ہے، پس سادات صغرادی کے حفظ نسب نے یہ جلوہ دکھایا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہیں" (تاریخ بلگرام ص ۱۷۰)

"اگرچہ بفضل خدائے یکتا عاصی کے بزرگوار حسب و نسب میں نامور زمانہ اور علم و فن میں یگانہ ہوتے آتے ہیں"

(صفیر بلبل ص ۱۲۵)

صفیر مرحوم نے اسی طرح صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال، اور جلوۂ خضر کے کثیر صفحات رنگین کئے ہیں، میرا روئے سخن صفیر مرحوم کی طرف نہیں کیونکہ اب وہ دنیا میں باقی نہیں ہیں ان کو ایک بزرگ خاندان کا قابل رشک فرزند خیال کرتا ہوں، انفرادی اعتبار سے جو کچھ صفیر نے اپنے نسب و حسب کے متعلق لکھا ہے، وہ محل اعتراض نہیں، لیکن آپ نے سادات صغرادی کے عجیب و غریب تخیل نسبی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف نظریۂ قومیت بلکہ اسلام کی روح تعلیم سے بھی منافی ہے

سادات صغرادی کو بروایت صفیر حفظ نسب کا جنون ہے، جیسا کہ ان کے سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا اب غور طلب یہ امر ہے کہ واقعتاً یہ سارا داعیہ فضل و شرف بقول غالب "رعایت مستی و ذوق" کا نتیجہ ہے یا اس کے اندر کچھ حقیقت بھی ہے؟۔

ہم نے یہ مانا کہ سید ابوالفرح ہندوستان میں اہل و عیال کے ساتھ تشریف لائے تھے، اور اس لئے سادات صغرادی کی نسل میں کسی غیر عنصر کا شامل ہونا مستبعد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سید ابوالفرح اور حضرت امام حسین کے درمیان جو پشتیں گزری ہیں ان میں کوئی غیر فاطمی خون شامل ہوا ہے یا نہیں؟ پہلے تو حضرت امام زین العابدین ہی کی والدہ ایرانی تھیں اس کے بعد حضرت زید شہید کی والدہ ام ولد (ونڈی) تھیں پھر آپ کے صاحبزادہ عیسیٰ موتم الاشبال ساری عمر خلیفہ منصور اور مہدی عباسی کے آوان حکومت میں مخفی رہے اور لوگوں کو اجرت پہ پانی پلایا کرتے تھے، اسی لئے آپ کا لقب "سقہ" ہوگیا چنانچہ ۱۶۶ھ میں بمقام کوفہ آپ نے اسی اختفائی حالت میں وفات کی اس وقت آپ کی عمر چھیالیس سال کی تھی (ملاحظہ ہو صحاح الاخبار علامہ رفاعی ص ۳۹ و ۴۰) خلیفہ منصور ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا، اور خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات کی، چونکہ بروایت رفاعی، حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے ۱۶۶ھ میں بعمر ۴۶ سال وفات کی اس لئے ۱۲۰ھ آپ کی تاریخ ولادت قرار پائی، لہذا نتیجہ نکلا کہ منصور کے زمانہ خلافت میں آپ سولہ برس کے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس وقت مجرد ہوں گے اور آپ کو وطن سے دور مخفی طور پر اپنا عقد کرنا پڑا ہوگا اس کے بعد آپ کے صاحبزادے، زید، احمد، محمد و حسین پیدا ہوئے جو سادات صغرادی محمد کے اعقاب میں ہیں، کیا، سادات واسطی بتا سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے اس بے لبی و آشفتگی کی زندگی میں کسی فاطمیہ سے رشتۂ ازدواج باندھا تھا؟ ایسی صورت میں سادات صغرادی غور کریں کہ نسب و حسب کے پندار، اور رشتۂ ازدواج کے قیود میں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں، آج ہندوستان کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں ایسے صغرادی سادات کے گھرانے موجود ہیں جن کو ان کی برادری کے مجرمانہ قیود نے حد درجہ بے نام و ننگ بنا رکھا ہے، آپ کا علم و فضل مسلم، آپ کی فاطمیت مصدق، لیکن یہ محشرستان

رسوم کیسا؟ خدا کے لئے غور کیجئے ساڑھے چھ سو سال کے اندر آپ کی دنیائے خیال نے آپ کی برادری کے اندر کیسی قیامت برپا کر دی، اب آپ کے یہاں آزاد جیسا ادیب جلیل، عبدالجلیل جیسا لغوی، مبارک جیسا محدث، سید اسمٰعیل جیسا متکلم کیوں نہیں پیدا ہوتا، استغنا سے سید علی بلگرامی، اور یاسین، اب کئی سو برس سے آپ کے یہاں سے علم و ادب کا مہر درخشاں کیوں نہیں طلوع ہوتا، آپ جس کو موجب فخر سمجھ رہے ہیں وہ آپ کے تنزل ذہنی اور ادبار کا موجب ہے۔

صفیرؔ کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند اور سر برآوردہ تھا آپ کے اجداد پدری میں مسلسل کئی پشت تک شعر و ادب کا ذوق رہا، چنانچہ خورشید علی صاحب خورشید خود شاعر تھے، آپ کے فرزند بندہ علی بندہ اور پوتے غلام یحییٰ صاحب یحییٰ کو بھی شعر و سخن کا مذاق تھا صفیرؔ کے والد سید محمد صاحب نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا یہی خاندانی شاعری صفیرؔ مرحوم کو بھی ورثہ میں ملی۔

یہ تو ددھیال کی حالت تھی، آپ کے نانا سید صاحب عالم صاحب بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، غالبؔ نے "اردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" میں آپ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے آپ کا پایہ ادبی واضح ہوتا ہے، "صفیر بلبل" کے آخر میں حضرت صاحب عالم کی ایک تاریخ طبع بھی مرقوم ہے، غالبؔ نے بھی صفیرؔ مرحوم کی "رشحات" پر دیباچہ لکھا، جو عودِ ہندی کے آخری صفحات میں پایا جاتا ہے، الغرض صفیرؔ مرحوم چشتی شاعر تھے، آنکھیں کھولیں تو نانا اور دادا کی آغوش میں شعر و ادب کا درس لیا۔

تصنیفات | صفیرؔ مرحوم نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف اور شعر و سخن میں بسر کی، آرہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے اپنا مطبع "نثار آف انڈیا" قائم کیا جہاں سے اردو میں دو اخبار نکلے، آپ نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں ان میں بعض تو طبع ہو چکی ہیں اور بعض کا قلمی مسودہ آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔

"صفیر بلبل"۔۔۔ یہ آپ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے، جو ۱۲۹۰ھ میں آپ کے شاگرد شاہ حفاظت حسین نظیرؔ کے اصرار سے شائع ہوا تھا، مقالہ ہٰذا میں یہی کتاب پیش نظر رکھ کر آپ کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

"تاریخ بلگرام"۔۔۔ اس کا ایک مطبوعہ حصہ میرے پاس ہے، تاریخ طباعت مذکور نہیں یہ آپ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، اس میں سادات صغرا کا شجرہ، بلگرام کا جغرافیہ، محلات کی تفصیل، اور برادری کے رسوم و رواج کا مفصل تذکرہ ہے۔

"رشحات صفیر"۔۔۔ یہ آپ کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے، اس میں آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق مبسوط علمی بحث کی ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار سے استدلال کیا ہے، اسی کی ایک تلخیص "خلاصہ فیض صفیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"میلاد معصومین"۔۔۔ یہ کتاب بہت زیادہ مشہور ہے، اس میں ائمہ اثنا عشری کے حالات درج ہیں۔۔۔۔۔ "جلوۂ خضر" بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔۔۔ ان کے علاوہ آپ نے اور بھی غیر مطبوعہ کتابیں چھوڑی ہیں جن کا حال صفیر بلبل اور تاریخ بلگرام سے معلوم ہوتا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے تیس مثنویاں لکھیں، اردو میں پانچ قصے لکھے، "قصہ بوستان خیال" کی اٹھارہ جلدوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا، ۱۲۷۰ھ ہی میں غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا کہ کئی دیوان مرتب ہو جاتے اس کے بعد ستائیس سال اور زندہ رہے، خدا جانے کتنی غزلیں کہیں، ۱۲۸۱ھ میں لکھنؤ سے واسوخت کا ایک مجموعہ "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شائع ہوا تھا،

اس میں صفیر کا داسوخت بھی شامل ہے،

رفقاء و تلامیذ آرہ کے تہور، وجد، بدر، جمیل، نظیر، آرزو وغیرہ تو خیر ان کے تلامذۂ ارشد ہیں تھے ہی عظیم آباد کے بہت سے شعرا کے ساتھ آپ کے مراسم و روابط تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل بزرگوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

مرزا انور علی انور عظیم آبادی، مرزا یوسف بیگ یوسف عظیم آبادی، علی مرزا وفا عظیم آبادی، آغا مرزا عطا عظیم آبادی، حامد حسین عرف میرن صاحب نکہت عظیم آبادی، علی محمد شاد عظیم آبادی وغیرہ، ان تمام حضرات نے "صفیر بلبل" کی تاریخ طبع لکھی ہے۔

اولاد آپ کی پہلی بی بی بلگرام کی تھیں ان سے صرف ایک صاحبزادہ زندہ رہے، مثنوی معراج الخیال میں آپ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں :-

از من نور احمد است یک پور روشن کن خانہ چشم را نور

نور احمد صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے سید عنایت احمد دستگیر اور سید وصی احمد فانی دونوں ڈپٹی کلکٹر ہیں، دستگیر صاحب مشاعرے میں ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں، وصی احمد صاحب فانی بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں نثر میں آپ نے بہت سی موقر خدمات انجام دی ہیں، چنانچہ "نگار" میں "ملک خطا کے شہزادے" "گونڈ و گزشت" میں "دیر و حرم کا افسانہ" اور "ندیم" میں "جلترنگ کے تین بیٹے"، شایع ہو کر فانی صاحب کو غیر فانی بنا چکے ہیں، فانی صاحب سے مجھے غائبانہ عقیدت ہے۔

صفیر مرحوم نے دوسرا عقد آرہ میں کیا تھا ان سے دو صاحبزادے سید غنی حیدر اور حافظ سید ولی حیدر گہر صاحب ہوئے لوگوں کا بیان ہے کہ غنی حیدر مرحوم رفتار و گفتار، عادات و خصایل، شکل و صورت میں حضرت صفیر مرحوم سے بہت مشابہ تھے، غنی حیدر صاحب نے پہلے آرہ میں ایک "مطبع مصطفائی" قایم کیا اس کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے وہاں "مطبع ستارہ ہند" قایم کیا یہ مطبع ہندوستان کے چند اعلیٰ مطابع میں ہے، یہاں کی اعلیٰ طباعت وکتابت ہندوستان و ایران میں مشہور ہو چکی ہے غنی حیدر مرحوم نے آخری عمر میں حج کیا، آپ بہت بڑے خطاط ہفت قلم تھے، حافظ ولی حیدر صاحب "کتب خانہ حیدری آرہ" کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں آپ کو شعر و سخن کا بہت بڑا ذوق ہے، گہر تخلص کرتے ہیں اور آرہ کی "بزم ادب" کے صدر ہیں،

صفیر کی شاعری سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے، کہ صفیر مرحوم کے اجداد پدری و مادری دونوں میں نسلاً بعد نسلٍ شاعری چلی آتی ہے، اس لئے صفیر کو گہوارہ ہی میں شاعری کا درس ملا، پندرہ برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا پہلے اپنا کلام چھپایا، پھر دو تین سال کے بعد سید محمد مہدی متخلص بہ تجبر سے اصلاح لینی شروع کی، تجبر مرحوم صفیر کے دادا کے چچازاد بھائی تھے، اس کے بعد صفیر کو لکھنؤ کا شوق ہوا، اپنا کلام شیخ امان علی سحر کو دکھلایا مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی، مرزا سلامت علی دبیر سے اصلاح لی، سحر مرحوم نے لکھنؤ چھوڑا، اور دبیر کو عظیم آباد والوں نے مدعو کیا وہ یہیں آ گئے، صفیر مرحوم بھی عظیم آباد میں نواب الطاف حسین خان بہادر کے یہاں قیام پذیر ہو گئے آرہ سے برابر آمد و رفت کا سلسلہ قایم تھا، مرزا دبیر نے محبت و رافت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔

صفیر کی شاعری ایک معجون مرکب کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری پر خبر، سحر، دبیر کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے، چنانچہ خواجہ وزیر، حیدر علی آتش، صبا، قدر بلگرامی وغیرہ کے کلام سے بھی انھوں نے استفادہ کیا تھا بعض مقطعات میں صفیر نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے :-

شاگرد اول میرا تھا حضرت آتش صفیر　　　عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا

طرز وزیر میں لکھو اک بھی غزل صفیر　　　اب آپ کا کلام بھی پرکار ہو گیا

اب دیکھئے بقول صبا کیا بنے صفیر　　　آئی بہار داغ جنوں پھر ابھر چلے

صفیر قدر کا ہے اشتیاق مدت سے　　　ہمارا عزم سوئے بلگرام ہے بیشک

لیکن "صفیر مبل" پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں میر کے سوز و گداز، غالب کی مضمون آفرینی، وجدت طرازی، ناسخ کی نادرہ بندی، رعایت الفاظ، داغ کی رندانہ سیہ مستی وسلاست نگاری کی بھی کافی مثالیں موجود ہیں۔

طرز میر [1] ایک ایسے شاعر سے جس نے لکھنوی اساتذہ کی تربیت سے استفادہ کیا جو لکھنؤ کی ناسخی فضا سے متاثر ہوا، جس نے داغ کی رنگ رلیوں کو سراہا، جس نے شاہان اودھ کے عشرتکدوں کے اجڑنے پر ماتم کیا۔

صفیر کھا گئی حاسد کی آنکھ لکھنؤ کو　　　کہاں وہ دن کہاں پریاں کہاں وہ قیصر باغ

کیا ہم امید کر سکتے تھے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں لذت غم اور پیام روح کا سرمایہ بھی رکھتا ہوگا، لیکن جب اس کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو اس کے یہاں مثبت ایسے اشعار نکلتے ہیں جو میر کے سوگوارانہ انداز بیان سے مالا مال ہیں مثلاً

پھر کیا کروں نہ روؤں جو کہہ کے لئے دل　　　اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل

کیا شکوہ ہو اگر نہیں جاتے نہیں ہیں ہم　　　مدت سے تو بھی آپ میں آتے نہیں ہیں ہم

تو نے تو برچھے خاک میں مجھ کو ملا دیا　　　اے آرزوئے دل تو بھی مل جائے خاک میں

---

[1] (نگار) اول تو صرف چند اشعار پر اعتماد کرکے یہ حکم لگانا کہ صفیر کے کلام میں میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے درست نہیں دوسرے یہ کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ خود میر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے ۔ صفیر بلگرامی کو میر و غالب سے ممکن ہے بہت عقیدت رہی ہو لیکن رنگ سخن کو ان سے کوئی نسبت نہیں وہ خالص لکھنوی اسکول کے شاعر تھے اور اسی رنگ میں انھوں نے ہمیشہ شاعری کی

....

....

....

صاف ہم سے ہوا وہ گل اس وقت   بائے جب، موسم بہار نہیں

زندگی وہی جو ناکامیوں میں بسر ہو،

آج آتا ہے شوخ غارتگر   دین و ایمان کا خدا حافظ
پھر ہمیں یاد آیا کرے صنم   لے چلے ناصحا خدا حافظ

پابوس یار کی حسرت نہایت ہے صفیر   خاک میری کاش کے بنتی مکان نقش پا[1]

پھر گئے ہم سے یار کیا کہنا   یوں ہی کرتے ہیں پیار کیا کہنا

لباس ہیں نہ واقف نہ تاج سے واقف   تمھارے جیسی نہیں احتیاج سے واقف

اتباع غالب | "صفیر بلبل" میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام نے صفیر کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صفیر نے غالب کو دیکھا تھا، حضرت صاحب عالم صاحب مارہری کے نواسہ کی حیثیت سے غالب صفیر کو بہت ہی محبت و رافت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ "رشحات صفیر" کے دیباچہ میں غالب مرحوم لکھتے ہیں :-

سیدی سندی نور بصر، لخت جگر قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کی طول عمر، دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا، مانگتا ہوں جن کو مبدا، فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کردہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے اکس لطف سے ادا ہوئی ہے (عود ہندی ص ۱۸۳)۔

افسوس ہے کہ ہمارے وطن کے اس ہیرو نے بجائے دہلی، لکھنؤ کی طرف توجہ کی، اور سحر مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اگر وہ غالب جیسے شفیق اُستاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج صفیر بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، لکھنؤ کی شاعری کے اس صنف نے جو زلف و

---

[1] یہ شعر میر کے رنگ میں ہے تو ضرور، لیکن غالب کے ایک شعر سے مل جاتا ہے

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا   کسقدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

صفیر نے سادہ الفاظ میں جس آرزو کا اظہار کیا ہے، وہ غالب کی جدت تخیل اور بلند پروازی سے زیادہ اثر آفریں ہے یہی غالب اور میر میں فرق ہے۔ (نہ یہ رنگ ہے نہ غالب کا۔ اڈیٹر)

چوٹی اشاعت و زبان میں ہے و مسی سے متعلق تھا ان کے اندر پریشان نظری و ادبی گمراہی پیدا کر دی چنانچہ وہ اپنی فطری ودیعتوں سے کام نہ لے سکے لہٰذا صفیر مرحوم کو زیادہ مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اس عہد میں غالب کی مشکل پسندیاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں، لیکن آج وہ دور بھی آگیا جب ہندوستان کا ہر ادیب غالب کے مختصر اردو دیوان کا حافظ ہے، ہر انشاپرداز اس کے بدیعہ شعری سے استدلال کرتا ہے، فلسفی اور فلسفہ طراز نقاد اس کو ماہر نفسیات، مصور اس کو اپنا موضوع تخیل بنائے ہوئے ہے اور مشرق کا یہ فاقہ مست شاعر اپنی ناکامیوں اور حسرت نصیبوں کے بعد جب دنیا سے رخصت ہو گیا تو اہل دنیا اس کو چوم چاٹ رہے ہیں، غالب کی ناکام زندگی اور کامیاب موت فطرت کی ستم ظریفیوں کی ایک عبرت آموز مثال ہے۔

صفیر مرحوم نے غالب کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں ان میں دقت معنی اور بلندی تخیل کے ساتھ غالب کے مخصوص طنزیاتی رنگ کا بھی تتبع کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:-

زاہدا حور تری میری پری　　　خلد تیرا ہے پرستان مرا

فرط دعا جنت و حور و قصور سے　　　خم ہوکے شیخ صورت محراب ہو گیا

غالب کا ایک شعر ہے:-

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں　　　سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

صفیر کہتے ہیں:-

محفل میں اسکی آئے بھی لوگ اور چلے گئے　　　میں نامراد منت درباں میں رہ گیا

تخیل کے اعتبار سے دونوں شعر برابر ہیں البتہ غالب کے خاص اسلوب نے ان کے شعر میں زیادہ گداختگی و برشتگی پیدا کر دی ہے۔ صفیر کہتے ہیں:

نگاہ گرم، رحمت سے نہیں کم، زار کو تیرے　　　فروغ طالع اپنا شعلے کو، ہر خار و خس سمجھا

بالکل اسی معنی میں اور انھیں فقروں کے ساتھ غالب کے یہاں بھی ایک شعر ہے:-

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

غالب نے تصوف کی چاشنی پیدا کر دی ہے، صفیر معشوق کی گرم نگاہیوں کو رحمت بتاتے ہیں، لیکن دونوں کے یہاں اسلوب بیان ایک، مشبہ بہ، اور وجہ شبہ ایک، کیونکہ دونوں خار و خس کے جل اٹھنے کو "فروغ طالع" سے تعبیر کرتے ہیں،

صفیر کا ایک مطلع ہے:-

عشق اور حسن کا چرچا رہا دیوانوں تک　　　سب یہ ساماں تھا ترے بے سر و سامانوں تک

غالب فرماتے ہیں:-

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا　　　ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اسی طرح جستجو کی جائے تو صفیرؔ کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا غالبؔ کے کلام سے توارد ہو جاتا ہے، ذیل کے اشعار غالبؔ کی پیروی کا نتیجہ ہیں:۔

اُڑتی پھر گئی خاک مری کوئے یار میں — مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں میں رہ گیا
رندوں نے سمجھے معنی توحید دلاشریک — زاہد تو بحث گبر و مسلماں میں رہ گیا

ہے یاد شورِ خندۂ دنداں نمائے یار — سینے زخم بھرا ہے، دلِ چاک چاک ہیں

اُٹھاؤں کس طرح دل سے بتِ بے مہر کا فرقے — کہ فرطِ لاغری سے خود جہاں سے اُٹھ چلا ہوں میں

دکھا خدا کیلئے شمع، در کو ڈھونڈوں میں — ہجومِ گریہ میں تارِ نظر نہیں ملتا

دار الشفائے عشق کی ہے رسم و راہ اور — اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا

غالبؔ کہتے ہیں:۔ "میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

داغ کی پیروی | "صفیرِ بلبل" کے اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ناقد حیران رہجاتا ہے، کہ وہی شاعر جو میرؔ و غالبؔ کی زبان استعمال کر رہا تھا، جس کے الفاظ میں خواجہ دردؔ کے جذبات کارفرما تھے وہ یکایک اس ادنیٰ سطح پر کیونکر چلا آیا، یہ نتیجہ ہے اسی بے راہروی کا جو مختلف اساتذہ کے تتبع سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتی ہے، صفیرؔ مرحوم نے پیاپے ایسے اُستادوں سے اصلاح لی جو مختلف بلکہ متضاد رجحان رکھتے تھے، سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا کہ صفیرؔ کے ننھیال کو غالبؔ کے ساتھ گہرے مراسم تھے حضرت صاحب عالم صاحب اور غالبؔ دونوں کا کلام انھوں نے مطالعہ کیا پھر لکھنوی اساتذہ کے دواوین دیکھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک معجون مرکب بن گئے، ذیل کے اشعار داغؔ کے رنگ کے ملاحظہ ہوں:۔

رشک انگیز آج کیسا ماجرائے آب تھا — اُنکے سینہ پر جو دریا میں کفِ سیلاب تھا

یعنی معشوق نہا رہا ہے، اور کفِ سیلاب اس کے سینہ سے گزر رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمارے شاعر کو پانی میں رشک آتا ہے۔

ان دنوں بوسوں کے باقی ہو لگاتے جاتے — ورنہ سابق میں حساب آپ کا بیباق رہا

گڑگڑاتے تھے جو ہم کہتے تھے وہ — دیکھئے اب یہ مرا ہاتھ آیا

صفیرؔ کے یہاں اس رنگ کے اشعار کی کمی نہیں، وہی سطحیت، وہی بوالہوسی، وہی جذبات پست کی ترجمانی جو لکھنوی اسکول کے

ایک خاص دور میں مایۂ ناز فن تھی ان کے یہاں بھی ہے، ملاحظہ ہو:-

جوبن عارض سے ملاتا ہے تمہارے عارض
نہ ڈرو میں ابھی رکھے ہوں کنارے عارض

اور یہ مرحلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے:-

آرسی دیکھو بچو وصل میں پہنا ان کا
دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سارے عارض

اس سے بھی ایک پُرلطف شعر سنئے اور شاعر کے حساس دل اور ذہن رسائی کی داد دیجئے:-

نگار کا ہے انگیا نئی چھاتی پر جمائی ہے
یہ اس نے خاتمہ بالخیر اپنے پال ڈالے ہیں

شاعر نے اپنی روایاتی تہذیب سے ہٹ کر یہاں محض تفنن شعری کی بنا پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو نثر میں ادا کرنا "غیر مہذب" سمجھا جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ نے رنگین انگیا پہنی ہے، وہ اس کو دیکھ کر سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ نے "خاتمہ آم" کا پال ڈالا ہے۔
اسی قسم کی ایک اور شوخی ملاحظہ ہو:-

سودائے خام ہے طمع اس نونہال سے
سینہ سپاٹ ہے ابھی ہموار کیا کریں

پھل جوانی کا ملے غیرت گلشن کب تک
دیکھئے ابھرے پریرو ترا جوبن کب تک

الغرض "صفیر بلبل" کے صفحات میں اس نوع کی سطحی اور سوقیانہ شاعری کے اور بھی بہت سے نمونے موجود ہیں۔

ناسخی اسکول | صفیر کے یہاں ناسخیت بھی پائی جاتی ہے۔ محاورہ زبان، رعایت الفاظ، نازک تشبیہات و استعارات انکے یہاں بھی ہیں۔

چڑھ گیا جب سے نظر پر آپ کی
اپنی نظروں سے بھی بندہ گر گیا

رات دن سرمست رکھتے ہیں خیالات اے صفیر
دل بغل میں ہے کہ شیشہ بادۂ گلفام کا

ڈوب مرنے پر بھی سودائی اسیر آب تھا
موجیں تھیں زنجیر پا طوق گلو گرداب تھا

انکے لبوں نے قہقہوں پہ ایسا دھر لیا
کٹ کٹ کے رنگ لعل بدخشاں میں رہ گیا

بے وجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے
کچھ جوڑ مقرر کسی استاد نے مارا

وہ دھیان اس محیط حسن کا آنکھوں میں آ گیا
دیکھو کہ وہ حباب میں دریا سما گیا

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اٹھانے لگے   کبھی جو بھول پڑے ساشقوں کے مدفن میں

باتیں سُن سُن کے اسکی جیتے ہیں   چشمۂ خضر ہے ، دہن ہم کو

اساتذۂ فارسی سے استفادہ | صفیر مرحوم کے بہتیرے اشعار جامی، عرفی، حزیں، اور شعرائے متاخرین کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے، فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا،

صفیر کا ایک شعر ہے:-

ان لبوں کیلئے مٹی سے مری جام بنا   شکر ہے کام مرا گر بسر انجام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال یوں ادا کر گیا ہے:-

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یا رب   شاید دل حسرت کش لب بر لب جانان دارد

صفیر اور حزیں میں اگر کوئی فرق ہے، تو صرف اس قدر کہ ایک نے اردو میں کہا ہے، اور دوسرے نے فارسی میں، صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیمانہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا، اور حزیں ابھی اس کی تمنا میں ہیں۔

صفیر فرماتے ہیں:-

یہ نون نیستی کی خبر پیری میں ہے شیخ   اے جو راست سا قد تیرا خمیدہ بشکل نون ہوا

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل کا بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے، اس سے شیخ کو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے آخری دن آ گئے، اس کے قبل بیدل یوں کہہ گیا ہے:-

نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش   صورت قد دو تا آئینۂ ترکیب لا است

یعنی بوڑھاپے میں جھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بنجانا ہے، اس نے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے۔

صفیر کا ایک شعر ہے:-

اے دل تجھے تو عشق میں تو نا کہ بھلا   او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا

عرفی کہتا ہے:-

بلائے دیدہ و دل راز بے شتا بانم   کسے نگویدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر لفظی ردوبدل کے ساتھ صفیر اور عرفی کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم ملجاتے ہیں۔

صفیر کا ایک مطلع ہے:-

سرد تیرے چہرے سے ہو گرمی بازار شمع   اک گل پژمردہ ہو گویا گل بے خار شمع

صفیر شمع کی ضوفشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک "گل پژمردہ"

ہے، بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے:۔

گرچہ سازد زبان شعلۂ شمع انجمن پیرا
دراں محفل کہ حرفے زاں عذار آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کی غزل جو "موج ہے" کی ردیف میں ہے، اُردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس مستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال خمریات ابونواس اور میلدو خیام میں بھی مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے لیکن "صفیر بلبل" کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ بدر مرحوم نے اپنے اُستاد کی اختراع فائقہ اور بدیعہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

صفیر

جستجو اس کو ہے کس کی یوسف گم گشتہ کی
گردشوں میں رات دن ہے کاروان موج ہے

بدر

گاہ خم میں گہ سبو میں، شیشہ و ساغر میں گہ
منزلیں طے کر رہا ہے کاروان موج ہے

صفیر مرحوم نے "کاروان موج ہے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا، حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے، اور واقعتہً بتا دیا کہ "موج ہے" منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ کسی کے لب میگوں سے لمجائے گی، حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے، مولانا بدر اگر یہ فقرہ اپنے مصرعہ ثانی میں چسپاں کر دیتے تو ان کا شعر زیادہ بلند ہو جاتا! پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ صفیر "موج ہے" کو نہ تو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت

صفیر

چشم مست ساقی خود بیں ہے کیا موج شراب
آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہے گمان موج ہے

بدر

آسماں خم ہے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں
کہکشاں پر مجھکو ہوتا ہے، گمان موج ہے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں

صفیر

ہے ترے مینوش کے لب پر بیان موج ہے
چوستا ہوں رات دن ساقی زبان موج ہے

بدر

بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر
لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبان موج ہے

عبد المالک (آروی)

مکتوبات نیاز

نیاز نوازا،

کل انتہائی سراسیمگی کے عالم میں تھا کہ مکتوب گرامی پہونچا۔ سراسیمگی صرف اس لئے تھی کہ :۔

چشم ہماں، قوت دیدش ہماں

لیکن اس کا کیا علاج کہ —— پردہ ڈالا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے!

بارے شکر ہے کہ آپ کی تحریر سے اضطراب کچھ کم ہوا اور اس خیال سے یک گونہ تسکین ہوئی کہ دنیا میں کچھ "دل" اور بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ لبریز شکایت ہیں۔

میں نے متعدد بار لکھا کہ یہاں آئیں، اُن کو بھی ساتھ لائیں تاکہ ایک بار اور ہمیشہ کے لئے دیکھ کر یکسوئی حاصل کر لی جائے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نیت خراب ہے۔۔ بہر حال اب اگر کوئی تدبیر ہے تو صرف یہ کہ آپ (اور اگر نامناسب نہ ہو تو یہ فقیر بھی) دونوں ساتھ اچانک وہاں پہونچ جائیں اور اس حال میں گرفتار کر لیں کہ ان کے ہاتھ خون سے رنگین ہوں۔

یہ میں نے صرف اس لئے لکھا کہ آپ کی بیقراری یوں آپ کو چین نہ لینے دیگی، ورنہ یہاں تو اس نوع کا اضطراب ہمیشہ مایوسی ہی نظر آیا ہے اور سچ پوچھئے تو میری تسکین اسی میں ہے۔

صدیقی۔

زحمت تو ہوگی، لیکن از راہِ بندہ نوازی اختیار کیجئے اور جس طرح ممکن ہو قاضی صاحب سے ملکر یہ معلوم کر لیجئے کہ جو اطلاع انھوں نے مجھے دی تھی، کیا واقعی صحیح ہے —— انھوں نے مجھے متعدد خطوط لکھے، لیکن چونکہ ان کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی، اس لئے میں نے مناسب نہ جانا کہ محض ان کے بیان پر اعتماد کر کے اسقدر طویل سفر کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ قبلہ قاضی صاحب کس "ڈھب" کے آدمی ہیں۔ اس لئے ممکن ہو تو دیگر ذرائع سے بھی انکے بیان کی تصدیق کر لیجئے۔ میں آپکے جواب کا منتظر ہوں اور نہایت بے چینی کے ساتھ۔

شیخ صاحب،

واللہ، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں —— میں نے توبہ ہی کب کی تھی کہ توبہ توڑنے کا الزام مجھ پر قائم کیا جائے۔ مجھے معلوم تو ہو کہ یہ آپ

کہا کس نے، وہ کونسا "دشمنِ جاں" دوست ہے جس نے آپ کو یہ باور کرا دیا۔۔ استغفراللہ!

بہرحال آپ مطمئن رہئے کہ اگر "خونِ دل پینے" کا نام آپ کے یہاں بادہ خواری ہے تو

فتوائے مے زساقی کہ ترا گرفتہ ایم

میں وہاں اب بھی روز جاتا ہوں، اس سے پہلے بھی جاتا تھا، آیندہ کے متعلق بھی مجھے یقین ہے، آپ کو باور نہ آئے، یہ آپ کی خوشی ہے، حقیقت یہی ہے کہ:۔

اہمائیم و سیہ مستی ہر روزہ ہماں

قبلہ گناہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جسے "دعوتِ برگ دنوا" کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو "لذتِ جگر خواری" سے آگے نہیں بڑھتے۔ معلوم نہیں آپ نے مجھے کس معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ میری بے سروسامانی و آشفتہ حالی کا جو عالم ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں کہ:۔

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اس لئے ظاہر ہے کہ اس گناہ تک میری دسترس کہاں جو "اربابِ توکل" کے لئے "میرساماں" بن جاتا ہے۔ رہ گیا صرف "دل کا خون کرنا" سو بتائیے کہ وہ کونسی بڑی سی بڑی عبادت ہے جو نتیجہ کے لحاظ سے اس تحت میں نہیں آتی، فرق اگر ہے تو صرف "محرابِ مسجد" و "محرابِ ابرو" کا، اور یہ منحصر ہے ذوق پر۔

تو در نبرد و مہوشے و کنار و امن کوشے

من زاغ خوشتے و سیلِ نم چشم مے فروشے

معاف فرمائیے، اس سے مقصود نہ آپ کے خلوص کو صدمہ پہونچانا ہے، اور نہ آپ کو دعوتِ معصیت دینا بلکہ صرف

نوحہ بر خویش و بے نوائیِ خویش

لیکن اگر آپ کو یہ بھی ناگوار ہے تو میں معذرت کے لئے بھی طیار ہوں مگر صرف اس حد تک کہ

ز آیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

جانِ نیاز،

خدا کے لئے کچھ تو کہو کہ یہ سکوت میری کس "ہرزہ سرائی" کا انتقام ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل تم کس کی معیت میں ہو اور اس نے کیسے زبردست "فریبِ جلوہ" سے تمہیں مسحور کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس سے ملنا ترک کر دو، ملو اور ضرور ملو،

لیک، رہبر را شناس از راہزن

تمہاری عمر سے تو نہیں لیکن تمہاری فراست و دانائی سے ضرور بعید تھا کہ اتنے بدحواس ہو جاؤ گے۔

ہرچند اس عمر میں زیادہ "ہوش گوش" مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا اور یہ ان ہی جان پر کھیل جانے کا ہے، لیکن مرنے کا لطف "مار رکھنے" ہی میں ہے، اور جہاں تم یہ کھیل کھیل رہے ہو، وہاں اسکی توقع نہیں۔

بہرحال اگر ممکن ہو تو چند دن کے لئے یہاں آجاؤ، پند بزرگانہ سننے کے لئے نہیں بلکہ کوچۂ عشق کی راہیں سیکھنے کے لئے، ٹھوکریں کھانے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے — اور اگر جی چاہے تو یہ سننے کے لئے کہ :-

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

کل شام کو آپ کے برادرِ نسبتی شاہ صاحب کا ایک پیام لائے — پیام تو خیر میں نے سنا یا نہیں سنا لیکن یہ حیرت ابتک دور نہیں ہوئی کہ شاہ صاحب سے آپ کو یا میاں زاہد کو کیا واسطہ — میں نے اُن سے تو پوچھا نہیں، لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا قصہ ہے — کیا اس دوران میں آپ دہلی گئے تھے یا شاہ صاحب خود بریلی آئے تھے

اگر آپ واقعی اُن کے مرید ہوگئے ہیں تو خدا کے لئے مجھ سے کہہ دیجئے کیونکہ اُن کے کرامات کا تو میں عرصہ سے قایل تھا لیکن، یہ بات کبھی میرے ذہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ اُن کے فتراک رہبانیت میں آپ بھی کبھی صیدِ زبوں کی حیثیت سے گرفتار نظر آئیں گے۔

بہرحال اگر یہ صحیح ہے تو سوائے صبر کے کیا چارہ ہے، لیکن میں تو ایکبار آپ کی زبان سے سنکر "منزلِ یقین" تک ابھی پہونچ جانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پیر تو اس درجہ تک آپ کو جب پہونچائیں گے، پہونچائیں گے۔

عزیز مکرم۔

اس میں شک نہیں کہ غالبؔ کا جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ نہایت پاکیزہ ہے اور جذبۂ رشک کا اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے وہ گوناگوں کیفیات اپنے اندر لئے ہوئے ہے، لیکن یہ کہنا کہ غالبؔ اس خیال میں بالکل منفرد نظر آتا ہے، غالباً درست نہیں۔

غالبؔ[1] کے شعر میں دو ٹکڑے نہایت پاکیزہ ہیں۔ پہلے مصرعہ میں "دیکھنا قسمت" اور دوسرے مصرعہ میں "کب مجھ سے دیکھا جائے ہے" اس میں زیادہ لطیف شاعرانہ خوبی اس لئے پیدا ہوگئی ہے کہ "دیکھنا" دو علیٰحدہ علیٰحدہ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ "نظر کرنے" کے مفہوم میں اور دوسری جگہ "گوارا کرنے" کے معنی میں — اس وقت فارسی کا ایک شعر یاد آگیا، اسے بھی سُن لو۔

در محبت ہمسرِ جانِ مرا از رشک سوخت
آنکہ بر رویش نظر بسیار نتوانست کرد

---

[1] غالبؔ کا پورا شعر یہ ہے :- دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اس کے دوسرے مصرعہ میں جو کیفیت ہے اس کا غالب کے شعر میں کہیں پتہ نہیں۔ یہ شعر میرزا مظہر کا ہے جو غالب سے بہت متقدم العہد تھے۔ غالب کے سامنے یہ شعر تھا یا نہیں، اس کا علم کسے ہے؟ لیکن دونوں کا فرق تو کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں۔

شعر کے محاسن جن کا تعلق صرف وجدان سے ہے، ابھی بیان میں نہیں آسکتے، لیکن جانتا ہوں کہ تم مانو گے نہیں، اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

غالب کہتا ہے کہ: "قسمت کی خوبی دیکھئے کہ محبوب کو دیکھنے کے بعد خود مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے اور اس لئے میں اسے اب دیکھ بھی نہیں سکتا"۔

میرزا مظہر نے پہلے مصرعہ میں لفظ "بیشتر" کہکر دوسرے مصرعہ میں اس کو جس خوبی سے پھیلایا ہے، وہ شاعرانہ بلاغت کی انتہا ہے۔ غالب کے یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک پہونچکر ختم ہوگیا کہ از راہ رشک وہ محبوب کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ میرزا مظہر ایک منزل اور آگے بڑھ گئے یعنی باوجود اس رشک کے بھی ان کو اپنے دل پر قابو نہ تھا جسے لفظ "بیشتر" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے میرزا مظہر نے رشک کی تخصیص نہیں کی جس سے مفہوم زیادہ وسیع ہوگیا اور غالب کی سی تخصیص "انا ولا غیری" باقی نہیں رہی۔ پھر دوسرے مصرعہ کا انداز بیان تو جس قیامت کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

آپ بھی کیا داستان لے بیٹھے ــــ اے حضرت، آجکل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اسکو شیوۂ کافری کا پاس نہ اسکو آئین مسلمانی کا لحاظ ــ یہ وہ زمانہ ہے کہ:

چراغ کعبہ و بتخانہ بے پروانہ می سوزد

دنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہوگئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اس پر اصرار ہے کہ "ریش دراز بھی ہو اور منت کش شانہ بھی"!

....

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ وہ نظام تعمیری کو قائم رکھ سکے، تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے۔

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو سرمایہ داری کی حمایت کیوں نہ کیجئے کہ تاریخ مذہب کے باقیات میں سے اب یہی ایک چیز دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اب زمانہ "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار کا نہیں بلکہ "حی علی العمل" کا ہے۔

ما ہے کہ خضر داشت ز سر چشمہ در ربود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

لیکن آپ کیوں سمجھنے لگے ؟

آپ تو وعدہ کرنے سے کبھی تھکیں گے نہیں، لیکن یہاں پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا ہے - آپ کی نسبت میں زیادہ سے زیادہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے جو قیس عامری کو لیلیٰ کے عشق میں حاصل تھا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ لیلیٰ کے جھوٹے وعدوں سے تنگ آکر ایک دن غریب مجنوں کو بھی اونٹ کی مہار پکڑ کر آخرکار یہ کہہ دینا ہی پڑا کہ :-

بدار اے سار باں محمل زمانے
کہ عہد وصل را آخر زمان ست

اس لئے پیشتر سے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اس مرتبہ بمبئی جاتے ہوئے آپ میرے پاس نہ ٹھہرے تو خیر مجنوں والی حرکت تو ممکن نہیں کیونکہ فرق اونٹ اور انجن کا ہے، لیکن بخدا وہیں پہونچکر ایک ہنگامہ برپا کر دوں گا اور آپ کی ایک معذرت نہ سنوں گا۔ ہاں تو بتائیے، آپ کس تاریخ کو وطن چھوڑیں گے ؟

عجیب عقلمند انسان ہو — میں نے یہ کب لکھا تھا کہ تم خود اُن سے ملو اور معاملہ کو خراب کر دو — مدعا تو یہ تھا کہ تمھارے حالات ان تک پہونچ جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں - خیر اب میں کوئی اور تدبیر سوچوں گا، لیکن اگر تم نے پھر اپنی حماقت سے کوئی رخنہ پیدا کر دیا، تو — ؟

اپنے عمو جان سے میرا سلام کہو اور پوچھو کہ انھیں کچھ خبر ہے مجھ پر کیا گزر رہی ہے، وہ یہ سنکر غالباً صرف ہنس دیں گے۔ لیکن مجھے تم یہ لکھنا نہیں۔

آؤ، آؤ، اور تمام ان محشر سامانیوں کے ساتھ آؤ جو قدرت نے صرف تمھارے لئے مخصوص کر دی ہیں،

اے گرد راہِ تو بہ جہاں نوبہارِ من

لیکن اس کے کیا معنی کہ آنے سے قبل ہی تم نے اپنی واپسی کی تاریخ بھی متعین کر دی۔

نیاز

کُسُم

(۱)

پھاگن کا مہینہ تھا اور چاند اپنی پوری روشنی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ چاندنی کی پرسکون فضا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے، آم میں بور آچکا تھا اور اس کی مہک ہر سمت عام ہو اٹھی تھی، پپیہا جو تالاب کے کنارے ایک پرانے لیچی کے درخت کے سبز پتوں کے جھنڈ میں کہیں چھپا بیٹھا بول رہا تھا اور اس کی آواز قریب ہی کے ایک مکان میں بھی پہونچ رہی تھی، اس مکان میں رات تو تھی، لیکن نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس وقت ہمنتا اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھا، وہ کبھی مضطربانہ اس کی لٹ اپنی انگلی میں لپیٹ لیتا، کبھی اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگتا اور کبھی اس کے بالوں میں لپٹے ہوئے ہار کو کھینچتا اور اس کے چہرے پر لٹکا دیتا۔ اس وقت وہ اس شبنم کے سے خمار و کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا جو پھولوں کو گدگداتی ہے، اُن سے کھیلتی ہے اور اُن کو پریشان کرتی ہے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔

لیکن کُسم بے حس و حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی طرف چاندنی کی اس پرسکون کیفیت کو دیکھ دیکھ کر مست ہو رہی تھی، اور اس کے شوہر کی ساری دلچسپیاں اس کے سکوت میں ڈوب کر رہ جاتی تھیں۔

آخر کار ہمنتا نے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلائے اور نرمی سے کہا۔ "کہاں ہو کسم تم اتنی دور چلی گئی ہو کہ اگر ایک بڑی دوربین لیکر بھی تم کو نہایت غور اور اطمینان سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تم صرف ایک پہاڑ کی چوٹی ہو۔ ذرا میرے قریب آؤ۔ دیکھو یہ رات کس قدر خوشگوار ہے!"

کُسم نے فضا کی لامحدود وسعتوں کی طرف سے سر اپنے شوہر کی طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا۔ "مجھے ایک ایسا منتر معلوم ہے جو ایک لمحہ میں بہار کی اس خوشگوار رات اور چاند کو ٹکڑے ٹکڑے اور منتشر کر سکتا ہے۔"

ہمنتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کو زبان پر مت لانا۔ لیکن اگر تمہارے منتر ایک ہفتہ میں تین یا چار تعطیلیں پیدا کر سکتے ہیں اور رات کو دوسرے دن ۵ بجے شام تک طول دے سکتے ہیں، تو منتر ضرور پڑھو۔"

کسم نے اپنے آپ کو اور دور کرتے ہوئے کہا۔ "تم کو معلوم ہے؟ آج رات کو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ میں تم سے آج وہ بات کہدوں جس کو میں نے اپنے بستر مرگ پر تم سے کہنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج رات کو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم جو سزا بھی مجھے دو میں اس کو برداشت کر سکتی ہوں۔"

ہمنتا اس سزا کو مذاق میں اُڑانے والا تھا، اور وہ کوئی شعر پڑھنے ہی والا تھا کہ اُسے جوتوں کی چاپ قریب آتی ہوئی سنائی دی!

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اٹھانے لگے   کبھی جو بھول پڑے عاشقوں کے مدفن میں

باتیں سن سن کے اسکی جیتے ہیں   چشمۂ خضر ہے ، دہن ہم کو

اساتذۂ فارسی سے استفادہ | صفیر مرحوم کے بہتیرے اشعار جامی، عرفی، حزیں، اور شعرائے متاخرین کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے، فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا،

صفیر کا ایک شعر ہے :-

ان لبوں کیلئے مٹی سے مری جام بنا   شکر ہے کام مرا گردش ایام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال یوں ادا کر گیا ہے :-

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یا رب   شاید دل حسرت کش بر لب بنہد ورد

صفیر اور حزیں میں اگر کوئی فرق ہے، تو صرف اس قدر کہ ایک نے اردو میں کہا ہے، اور دوسرے نے فارسی میں، صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیالہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا، اور حزیں ابھی اس کی تمنا میں ہیں -

صفیر فرماتے ہیں :-

یہ نون ہستی کی خبر پیری نما میں ہے شیخ   اب جو الف سا قد تیرا ہمشکل نوں ہوا

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل کا بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے، اس سے شیخ کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے آخری دن آ گئے اس کے قبل بیدل یوں کہہ گیا ہے :-

نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش   صورت قد دو تا آئینہ ترکیب لاست

یعنی بڑھاپے میں جھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بنجانا ہے، اس لئے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے -

صفیر کا ایک شعر ہے :-

اے دل تجھے تو عشق میں تو نا کہ بھلا   او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا

عرفی کہتا ہے :-

بلائے دیدہ دل را بہ پیشتا بانم   کسے نہ گو یدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر لفظی رد و بدل کے ساتھ صفیر اور عرفی کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم ملجاتے ہیں -

صفیر کا ایک مطلع ہے :-

سرد تیرے چہرے سے ہو گرمی بازار شمع   اک گل پژمردہ ہو گویا گل بے خار شمع

صفیر شمع کی ضوفشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک گل پژمردہ

ہے، بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے:-

گر ساز و زبان شعلۂ شمع انجمن پیرا — دراں محفل کہ حرفے زناں عنقا آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے، کہ ان کی غزل جو "موج ہے" کی ردیف میں ہے، اردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے۔ سبب یہ اختیار تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس مستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال خمریات ابونواس اور میکدۂ خیام میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے، لیکن "صفیر بلبل" کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ بدر مرحوم نے اپنے اُستاد کی اختراع قافیہ، اور بدیعہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

بدر	صفیر
گاہ خم میں گہ سبو میں، شیشہ و ساغر میں گہ	جستجو اس کو ہے کس یوسف گم گشتہ کی
منزلیں طے کر رہا ہے کاروان موج ہے	گردشوں میں رات دن ہے کاروان موج ہے

صفیر مرحوم نے "کاروان موج ہے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا، حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے، اور واقعتہ بتا دیا کہ "موج ہے" منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ کسی کے لب میگوں سے مل جائے گی، حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے، مولانا بدر اگر یہی فقرہ اپنے مصرعۂ ثانی میں چسپاں کر دیتے تو ان کا شعر زیادہ بلند ہو جاتا، پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ صفیر "موج ہے" کو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت

بدر	صفیر
آسماں خم ہے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں	چشم مست ساقی خود بیں ہے کیا موج شراب
کہکشاں پر مجھکو ہوتا ہے، گمان موج ہے	آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہے گمان موج ہے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں۔

بدر	صفیر
بوسے کیا لیں لب ساغر کے لیتا جھوم کر	ہے ترے مینوش کے لب پر بیان موج ہے
لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبان موج ہے	چوستا ہوں رات دن ساقی زبان موج ہے

عبدالمالک آروی

مکتوباتِ نیاز

نیاز نوازا،

کل انتہائی سراسیمگی کے عالم میں تمہارا مکتوب گرامی پہونچا۔ سراسیمگی صرف اس لئے تھی کہ:۔

چشم ہماں، قوتِ دیدش ہماں

لیکن اس کا کیا علاج کہ ——— پردہ ڈالا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے!

بارے شکر ہے کہ آپ کی تحریر سے اضطراب کچھ کم ہوا اور اس خیال سے یک گونہ تسکین ہوئی کہ دنیا میں کچھ "دل" اور بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ لبریزِ شکایت ہیں۔

میں نے متعدد بار لکھا کہ یہاں آئیں، اُن کو بھی ساتھ لائیں، تاکہ ایک بار اور ہمیشہ کے لئے دیکھ کر یکسوئی حاصل کر لی جائے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نیت خراب ہے۔ بہرحال اب اگر کوئی تدبیر ہے تو صرف یہ کہ آپ (اور اگر نامناسب نہ ہو تو یہ فقیر بھی) دونوں ساتھ اچانک وہاں پہونچ جائیں اور اس حال میں گرفتار کریں کہ ان کے ہاتھ خون سے رنگین ہوں۔

یہ میں نے صرف اس لئے لکھا کہ آپ کی بیقراری یوں آپ کو چین نہ لینے دیگی، ورنہ یہاں تو اس نوع کا اضطراب ہمیشہ مایوسی ہی نظر آیا ہے اور سچ پوچھئے تو میری تسکین اسی میں ہے۔

صدیقی۔

زحمت تو ہوگی، لیکن از راہِ بندہ نوازی اختیار کیجئے اور جس طرح ممکن ہو قاضی صاحب سے مل کر یہ معلوم کر لیجئے کہ جو اطلاع انھوں نے مجھے دی تھی، کیا واقعی صحیح ہے ——— انھوں نے مجھے متعدد خطوط لکھے، لیکن چونکہ ان کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی، اس لئے میں نے مناسب نہ جانا کہ محض ان کے بیان پر اعتماد کر کے اسقدر طویل سفر کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ قبلہ قاضی صاحب کس "ذھب" کے آدمی ہیں۔ اس لئے ممکن ہو تو دیگر ذرائع سے بھی انکے بیان کی تصدیق کر لیجئے۔ میں آپکے جواب کا منتظر ہوں اور نہایت بے چینی کے ساتھ۔

شیخ صاحب،

واللہ، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں ——— میں نے توبہ ہی کب کی تھی کہ توبہ توڑنے کا الزام مجھ پر قائم کیا جائے۔ مجھے معلوم تو ہو کہ یہ آپ نے

کہا کس نے، وہ کونسا "دشمنِ جاں" دوست ہے جس نے آپ کو یہ باور کرا دیا۔۔ استغفر اللہ!

بہر حال آپ مطمئن رہئے کہ اگر "خونِ دل" پینے کا نام آپ کے یہاں بادہ خواری ہے تو

فتوائے مے ز ساقیِ کوثر گرفتہ ایم

میں وہاں اب بھی روز جاتا ہوں، اس سے پہلے بھی جاتا تھا، آیندہ کے متعلق بھی مجھے یقین ہے، آپ کو باور نہ آئے، یہ آپ کی زبردستی ہے، حقیقت یہی ہے کہ:۔

ما ہمانیم و ہمیں مستی ہر روزہ ہماں

قبلہ گناہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جسے "دعوتِ برگ و نوا" کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو "لذتِ جگر خواری" سے آگے نہیں بڑھتے۔ معلوم نہیں آپ نے مجھے کس معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ میری بے سر و سامانی و آشفتہ حالی کا جو عالم ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں کہ:۔

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اس لئے ظاہر ہے کہ اس گناہ تک میری دسترس کہاں جو "اربابِ توکل" کے لئے "میر ساماں" بن جاتا ہے۔ رہگیا صرف "دل کا خون کرنا" سو بتائیے کہ وہ کونسی بڑی سی بڑی عبادت ہے جو نتیجہ کے لحاظ سے اس تحت میں نہیں آتی، فرق اگر ہے تو صرف "محرابِ مسجد" و "محرابِ ابرو" کا اور یہ منحصر ہے ذوق پر۔

تو و زاہد اہوشے و کنارِ امن کوشے

من و لغزشے و سیلِ نم چشم مے فروشے

معاف فرمائیے، اس سے مقصود نہ آپ کے خلوص کو صدمہ پہونچانا ہے، اور نہ آپ کو دعوتِ معصیت دینا بلکہ صرف

نوحہ بر خویش و بے نوائیِ خویش

لیکن اگر آپ کو یہ بھی ناگوار ہے تو میں معذرت کے لئے بھی طیار ہوں مگر صرف اس حد تک کہ

ز آیندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار

جان نیاز،

خدا کے لئے کچھ تو کہو کہ یہ سکوت میری کس "ہرزہ سرائی" کا انتقام ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل تم کس کی معیت میں ہو اور اس نے کیسے زبردست "فریب جلوہ" سے تمھیں مسحور کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس سے ملنا ترک کر دو، ملو اور ضرور ملو،

لیک، رہبر را شناس از راہزن

تمھاری عمر سے تو نہیں لیکن تمھاری فراست و دانائی سے ضرور بعید تھا کہ اتنے بدحواس ہو جاؤ گے۔

ہر چند اس شعر میں زیادہ "ہوش گوشش" مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا اور یہ مزہ ہی جان پر کھیل جانے کا ہے، لیکن مرنے کا لطف "مار رکھنے" ہی میں ہے، اور جہاں تم یہ کھیل کھیل رہے ہو، وہاں اسکی توقع نہیں۔

بہرحال اگر ممکن ہو تو چند دن کے لئے یہاں آجاؤ، پند بزرگانہ سننے کے لئے نہیں بلکہ کوچۂ عشق کی راہیں سیکھنے کے لئے، ٹھوکریں کھانے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے — اور اگر جی چاہے تو یہ سننے کے لئے کہ:۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشہ می روی

کل شام کو آپ کے برادرِ نسبتی شاہ صاحب کا ایک پیام لائے — پیام تو خیر میں نے سنا یا نہیں سنا، لیکن یہ حیرت ابتک دور نہیں ہوئی کہ شاہ صاحب سے آپ کو یا میاں زاہد کو کیا واسطہ — میں نے اُن سے تو پوچھا نہیں، لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا قصہ ہے — کیا اس دوران میں آپ دہلی گئے تھے یا شاہ صاحب خود بریلی آئے تھے

اگر آپ واقعی اُن کے مُرید ہو گئے ہیں تو خدا کے لئے مجھ سے کہہ دیجئے کیونکہ اُن کے کرامات کا تو میں عرصہ سے قایل تھا لیکن، یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ اُن کے "فتراکِ روحانیت" میں آپ بھی کبھی صیدِ زبوں کی حیثیت سے گرفتار نظر آئیں گے۔

بہرحال اگر یہ صحیح ہے تو سوائے صبر کے کیا چارہ ہے، لیکن میں تو ایکبار آپ کی زبان سے سنکر "منزلِ یقین" تک ابھی پہونچ جانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پیر تو اس درجہ تک آپ کو جب پہونچائیں گے، پہونچائیں گے۔

عزیز مکرم۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کا جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ نہایت پاکیزہ ہے اور جذبۂ رشک کا اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے وہ گوناگوں کیفیات اپنے اندر لئے ہوئے ہے، لیکن یہ کہنا کہ غالب اس خیال میں بالکل منفرد نظر آتا ہے، غالباً درست نہیں۔

غالب[1] کے شعر میں دو ٹکڑے نہایت پاکیزہ ہیں۔ پہلے مصرعہ میں "دیکھنا قسمت" اور دوسرے مصرعہ میں "کب مجھ سے دیکھا جائے ہے" اس میں زیادہ لطیف شاعرانہ خوبی اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ "دیکھنا" دو علیٰحدہ علیٰحدہ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ "نظر کرنے" کے مفہوم میں اور دوسری جگہ "گوارا کرنے" کے معنی میں — اس وقت فارسی کا ایک شعر یاد آگیا، اسے بھی سُن لو:۔

در محبت بیشتر جانِ مرا از رشک سوخت
آنکہ بر روئش نظر بسیار نتوانست کرد

---

[1] غالب کا پورا شعر یہ ہے:۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اس کے دوسرے مصرعہ میں جو کیفیت ہے اس کا غالب کے شعر میں کہیں پتہ نہیں - یہ شعر میرزا مظہر کا ہے جو غالب سے بہت متقدم العہد تھے۔ غالب کے سامنے یہ شعر تھا یا نہیں، اس کا علم کسے ؟ لیکن دونوں کا فرق تو کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں۔

شعر کے محاسن جن کا تعلق صرف وجدان سے ہے کبھی بیان میں نہیں آسکتے۔ لیکن جانتا ہوں کہ آپ مانتے ہیں، اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

غالب کہتا ہے کہ:- "قسمت کی خوبی دیکھئے کہ محبوب کو دیکھنے کے بعد خود مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے اور اس لئے میں اسے اب دیکھ بھی نہیں سکتا؟"

میرزا مظہر نے پہلے مصرعہ میں لفظ بیشتر لکھکر دوسرے مصرعہ میں اس کو جس خوبی سے پھیلایا ہے، وہ شاعرانہ بلاغت کی انتہا ہے۔ غالب کے یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک پہونچکر ختم ہوگیا کہ از راہ رشک وہ محبوب کی طرف نہیں دیکھ سکتا - میرزا مظہر ایک منزل اور آگے بڑھ گئے یعنی باوجود اس رشک کے کبھی اُن کو اپنے دل پر قابو نہ تھا جسے لفظ بیشتر سے ظاہر کیا گیا ہے - علاوہ اس کے میرزا مظہر نے رشک کی تخصیص نہیں کی جس سے مفہوم زیادہ وسیع ہوگیا اور غالب کی سی تخصیص " انا ولا غیری " باقی نہیں رہی - پھر دوسرے مصرعہ کا انداز بیان تو جس قیامت کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

آپ بھی کیا داستان لے بیٹھے --- اے حضرت! آجکل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اُسکو شیوۂ کافری کا پاس نہ اِسکو آئینِ مسلمانی کا لحاظ - یہ وہ زمانہ ہے کہ:-

چراغ کعبہ و بتخانہ بے پروانہ می سوزد

دنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہوگئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اس پر اصرار ہے کہ ریش دراز بھی ہو اور منت کش شانہ بھی!

. . . .

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :-

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ وہ نظام تعمیری کو قائم رکھ سکے، تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے۔

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو سرمایہ داری کی حمایت کیوں نہ کیجئے کہ تاریخ مذہب کے باقیات میں سے اب یہی ایک چیز دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اب زمانہ " حی علی الصلوٰۃ " کی پکار کا نہیں بلکہ " حی علی العمل " کا ہے۔

را ہے کہ خضر داشت زسر چشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

لیکن آپ کیوں سمجھنے لگے ؟

آپ تو وعدہ کرنے سے کبھی تھکیں گے نہیں، لیکن یہاں پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا ہے۔ آپ کی محبت میں زیادہ سے زیادہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے جو قیس عامری کو لیلیٰ کے عشق میں حاصل تھا، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ لیلیٰ کے جھوٹے وعدوں سے تنگ آکر ایک دن غریب مجنوں کو بھی اونٹ کی مہار پکڑ کر آخرکار یہ کہہ دینا ہی پڑا کہ :-

بدار اے سار بان محمل زمانے
کہ عہد وصل را آخر زمان ست

اس لئے پیشتر سے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اس مرتبہ بمبئی جاتے ہوئے آپ میرے پاس نہ ٹھہرے تو خیر مجنوں والی حرکت تو ممکن نہیں کیونکہ فرق اونٹ اور انجن کا ہے، لیکن بغداد میں پہونچکر ایک ہنگامہ برپا کر دوں گا اور آپ کی ایک معذرت نہ سنوں گا۔ ہاں تو بتایئے، آپ کس تاریخ کو وطن چھوڑیں گے ؟

عجیب عقلمند انسان ہو — میں نے یہ کب لکھا تھا کہ تم خود اُن سے ملو اور معاملہ کو خراب کر دو۔ مدعا تو یہ تھا کہ تمھارے حالات ان تک پہونچ جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ خیر، اب میں کوئی اور تدبیر سوچوں گا، لیکن اگر تم نے پھر اپنی حماقت سے کوئی رخنہ پیدا کر دیا، تو — ؟

اپنے عمو جان سے میرا سلام کہو اور پوچھو کہ انھیں کچھ خبر ہے مجھ پر کیا گزر رہی ہے، وہ یہ سُنکر غالباً صرف ہنس دیں گے۔ لیکن مجھے تم یہ لکھنا نہیں۔

آؤ، آؤ، اور تمام ان محشر سامانیوں کے ساتھ آؤ جو قدرت نے صرف تمھارے لئے مخصوص کر دی ہیں،

اے گرد راہِ تو بہ جہاں نوبہارِ من

لیکن اس کے کیا معنی کہ آنے سے قبل ہی تم نے اپنی واپسی کی تاریخ بھی متعین کر دی۔

نیاز

کُلثُم

(۱)

پھاگن کا مہینہ تھا اور چاند اپنی پوری روشنی کے ساتھ چمک رہا تھا، چاندنی پر سکون فضا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے، آم میں بور آ پہلا تھا اور اس کی مہک سے تمام ہوا معطر تھی، پپیہا جو تالاب کے کنارے ایک پرانے نیچی کے درخت کے سبز پتوں کے جھنڈ میں کہیں چھپا بیٹھا بول رہا تھا اور اس کی آواز قریب ہی کے ایک مکان میں بھی پہونچ رہی تھی، اس مکان میں رات تو تھی، لیکن نیند کا کہیں پتہ نہ تھا اس وقت ہمنتا اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھا، وہ کبھی مضطربانہ اس کی لٹ اپنی اُنگلی میں لپیٹ لیتا کبھی اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگتا اور کبھی اس کے بالوں میں لپٹے ہوئے ہار کو کھینچتا اور اس کے چہرے پر لٹکا دیتا اسوقت وہ اس شبنم کے سے خمار و کیف میں ڈوبا ہوا تھا جو پھولوں کو گدگداتی ہے، اُن سے کھیلتی ہے، اور اُن کو پریشان کرتی ہے تاکہ وہ ہوشیار ہوجائیں۔

لیکن کلثم بے حس و حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی طرف چاندنی کی اس پرسکون کیفیت کو دیکھ دیکھ کر مست ہو رہی تھی، اور اس کے شوہر کی ساری دلچسپیاں اس کے سکوت میں ڈوب کر رہ جاتی تھیں۔

آخر کار ہمنتا نے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلائے اور نرمی سے کہا۔ "کہاں ہو کلثم تم اتنی دور چلی گئی ہو کہ اگر ایک بڑی دوربین لیکر بھی تم کو نہایت غور اور اطمینان سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تم صرف ایک پہاڑ کی چوٹی ہو۔ ذرا میرے قریب آؤ۔ دیکھو یہ رات کس قدر خوشگوار ہے!"

کلثم نے فضا کی لامحدود وسعتوں کی طرف سے سر اپنے شوہر کی طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا: "مجھے ایک ایسا منتر معلوم ہے جو ایک لمحہ میں بہار کی اس خوشگوار رات اور چاند کو ٹکڑے ٹکڑے اور منتشر کرسکتا ہے"

ہمنتا نے ہنستے ہوئے کہا: "اس کو زبان پر مت لانا، لیکن اگر تمہارے منتر ایک ہفتہ میں تین یا چار تعطیلیں پیدا کرسکتے ہیں اور رات کو دوسرے دن ۵ بجے شام تک طول دے سکتے ہیں، تو منتر ضرور پڑھو"

کلثم نے اپنے آپ کو اور دور کرتے ہوئے کہا: "تم کو معلوم ہے؟ آج رات کو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ میں تم سے آج وہ بات کہدوں جس کو میں نے اپنے بستر مرگ پر تم سے کہنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج رات کو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم جو سزا بھی مجھے دو میں اس کو برداشت کرسکتی ہوں"

ہمنتا اس سزا کو مذاق میں اُڑانے والا تھا، اور وہ کوئی شعر پڑھنے ہی والا تھا کہ اُسے جوتوں کی چاپ قریب آتی ہوئی سنائی دی!

اِن قدموں کی چاپ سے اس کے کان آشنا تھے، اس کا باپ سہری ہرکری آرہا تھا، اور ہنمنتا اپنے باپ کی اس آمد کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ دروازہ کے باہر کھڑے ہوکر اس کے باپ نے چلا کر کہا۔ "وہ ہنمنتا اپنی بیوی کو فوراً باہر نکال دو۔"
ہنمنتا نے اپنی بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالی، لیکن اس میں کسی استعجاب وحیرت کے آثار نظر نہ آئے۔ اس نے اپنے معصوم چہرہ کو اپنے دونوں نازک ہاتھوں سے چھپا لیا گویا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے زمین میں سما جائے ــــ پپیہا اپنی "پی کہاں" کا جگر سوز راگ بلند کر رہا تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی، دنیا کے محاسن لامحدود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہر شئے کس قدر جلد تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۲)

باہر سے واپس آکر ہنمنتا نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"
"بیشک" کُسُم نے جواب دیا۔
"تم نے مجھ سے اب تک اس کو کیوں چھپا رکھا"
"میں نے کئی بار کہنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ آواز میرے حلق میں اٹک جاتی تھی، میں ایک بدنصیب عورت ہوں۔"
"تو پھر سب کچھ صاف صاف بیان کردو۔"
کُسُم نے اپنی داستان، انتہائی متانت وسنجیدگی کے ساتھ بیان کردی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ننگے پاؤں انگاروں پر سے آہستہ آہستہ گزر رہی ہے اور کوئی اس بات کا احساس نہیں کرتا کہ وہ کس قدر جھلس گئی ہے، اس کی کہانی سُنکر ہنمنتا اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
کُسُم نے سوچا کہ اس کا شوہر چلا گیا ہے، اور اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا یہ بات اس کو تعجب خیز نہیں معلوم ہوئی۔ اُس نے اس واقعہ کو بھی روزمرہ زندگی کے ایک غیر معمولی واقعہ سے تعبیر کیا۔ اس کا دماغ صرف چند لمحوں کے اندر اس قدر معطل ہوگیا تھا کہ اُس کو دنیا ابتدا سے انتہا تک بالکل خلا معلوم ہوتی تھی اور اُن باتوں کی یاد جو اس کے شوہر نے گزشتہ زمانے میں اُس سے کی تھیں، اس کے حسین لبوں پر ایک خشک، افسردہ اور بے کیف تبسم کے سوا اور کچھ پیدا نہ کرسکی۔ شاید اسوقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت جو ایک انسان کی زندگی پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اور جو اپنے ساتھ اس قدر چاہ اور عمیق احساسات لائی تھی اور جس کی وجہ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی انتہائی تکلیف دہ، اور ایک لمحہ کی ملاقات انتہائی مسرت اور لطف آفریں معلوم ہوتی تھی جس کی وسعت لامتناہی اور جس کی زندگی دائمی معلوم ہوتی تھی ــــ کیا وہ اس قدر نازک بنیاد پر قائم تھی، صرف چند لمحے قبل، ہنمنتا نے اس سے کہا تھا۔ "کیسی خوشگوار رات ہے۔" وہ رات ابھی ختم نہ ہوئی تھی، وہی پپیہا ابتک "پی کہاں" کا راگ الاپ رہا تھا اور وہی نسیم جانفزا، کمرے کے پردوں کو حرکت دیتی ہوئی چل رہی تھی اور وہی چاندنی کھڑکی کے باہر ایک تھکی ہوئی ملکہ کی طرح محوِ خواب تھی۔ لیکن یہ سب کچھ غیر حقیقی تھا........؟

(۳)

دوسرے دن صبح کو ہنمنتا، افسردہ ومضمحل پیارے شنکر گھوسال کے گھر پہونچا۔ اور اس کو آواز دی "میرے لڑکے کیا خبر لائے ہو؟"

یارے شنکر نے اُس سے کہا۔

ہنمتا نے ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "تم نے ہماری ذات میں بٹا لگا دیا۔ تم ہمارے لئے تباہی کا
لث ہوئے ہو، اور اب تم کو اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑیگا۔" اُس نے اور کچھ نہ کہا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"اور تم نے شاید میری ذات کو بچا لیا اور اُس سے میرے اخراج کو روک لیا۔ اور مجھے پیار سے تھپکا اور دلاسا دیا؟" پیارے شنکر نے
ن آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

ہنمتا کا دل اُس وقت یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے بے پناہ غیظ و غضب کی آگ سے پیارے شنکر کو جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن وہ اپنے
عہ کی آگ میں خود ہی جل گیا۔ پیارے شنکر اُس کے سامنے مسرور اور مطمئن بیٹھا رہا۔

"کیا میں نے تم کو کبھی کوئی نقصان پہونچایا ہے؟" ہنمتا نے شکستہ لہجہ میں پوچھا۔

"مجھے صرف ایک سوال کرنے کی اجازت دو" شنکر بولا۔ "میری بیٹی ——— میری تنہا اولاد ——— اس نے تمہارے والد
یا ضرر پہونچایا تھا؟ تم اس وقت بہت کم سن تھے اور شاید اس کے متعلق کچھ نہ سنا ہو۔ لیکن اب سنو۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں جو کچھ
ہا تم سے کہنے جا رہا ہوں اُس میں تھوڑی سی ظرافت بھی ہے۔"

"تم بہت چھوٹے تھے جب میرا داماد، نا بکار، میری بیٹی کا بہت سا زیور چرا کر انگلستان بھاگ گیا۔ تم کو گاؤں کا وہ ہنگامہ یاد
کا جو اُس کے انگلستان سے پانچ سال کے بعد بیرسٹر ہو کر آنے پر مچا تھا۔ شاید تم کو اس امر کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس وقت تم کلکتہ میں
مکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ تمہارے والد نے اپنے آپ کو ساری ذات اور برادری کا سرگروہ سمجھ کر یہ اعلان کر دیا کہ اگر میں اپنی بیٹی کو اسکے
ہر کے گھر بھیجوں تو مجھے اپنی بہبودی کی خاطر اُسے یکلخت چھوڑ دینا چاہئے۔ اور پھر کبھی اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دینی چاہئے۔ میں تمہارے
پا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اُس سے التجا کی۔ "بھائی۔ مجھے اس مرتبہ معاف کر دو۔ میں اپنے داماد کی اس غلطی اور قصور کا کفارہ ادا
نے کو تیار ہوں۔ براہ کرم اس کو ذات میں شریک کر لو۔" لیکن تمہارا باپ پتھر کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن میرے
ان میں نہ تھا۔ میری پدرانہ محبت نے مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ میں اپنے بیٹے کو عاق کر دوں۔ چنانچہ اپنے وطن اور عزیزوں کو
حافظ کہہ کر میں کلکتہ چلا گیا۔ لیکن مصائب نے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں اپنے بھتیجے کی شادی کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تو تمہارے
مد نے لڑکی کے والدین کو ورغلا کر یہ نسبت تڑوا دی۔ اس وقت میں نے قسم کھائی کہ اگر میری رگوں میں برہمنوں کے خون کا ایک قطرہ
موجود ہے تو میں اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ اب میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ تمہاری سمجھ میں بخوبی آگیا ہوگا، کیوں؟ لیکن ذرا تامل کرو۔
امیں تم سے پوری داستان بیان کر دوں گا تو تم کو اور زیادہ اس میں لطف آئے گا۔ یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔

جب تم کالج میں پڑھتے تھے تو تمہارے مکان کے قریب ایک شخص ہیرداس چیٹرجی رہتا تھا، خدا اُس کے گناہوں کو معاف
ے۔ وہ اب مر چکا ہے۔ اس کے مکان میں ایک جوان بیوہ کسُم نامی رہتی تھی۔ وہ ایک کایستھ خاندان کی یتیم لڑکی تھی، لیکن تھی
ت سُندر۔ اور اس بے بوڑھے برہمن نے اس کو کالج کے طلبا کی حریص نگاہوں سے محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

لیکن ایک جوان لڑکی کے لئے، بوڑھے سرپرستوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا دشوار کام نہ تھا۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے گیلے اور بھیگے کپڑوں کو چھت پر پھیلانے کی غرض سے جاتی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اپنی چھت کو مطالعہ کے لئے بہترین مقام سمجھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا چھت پر تم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن لڑکی کے طرزِ عمل سے اُس کے بوڑھے سرپرستوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ وہ خانہ داری کے فرائض کی تکمیل سے جی چُرانے لگی۔ اور پاربتی کی طرح اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق رہنے لگی کہ رفتہ رفتہ کھانا پینا بھی بند ہونا شروع ہوا، اور نیندیں بھی حرام ہونے لگیں۔ بعض اوقات وہ اپنے سرپرستوں کی موجودگی میں بلا سبب رونے لگتی تھی۔

"آخرکار اس نے تم دونوں کو، اکثر چھت پر ایک دوسرے کو جھانکتے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات تم کالج بھی نہ جاتے تھے اور کتاب ہاتھ میں لئے چھت پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور مطالعہ اور تعلیم سے بھی اچانک خود پر غفلت برتنے لگے تھے۔ پھر وہ میرے پاس مشورہ کی غرض سے آیا۔ اور مجھ سے پوری داستان بے کم و کاست بیان کر دی۔ میں نے اس سے کہا۔ تم کو ایک مدت سے بنارس جا کر رہا جانے کی خواہش ہے اسلئے بہتر ہے کہ اب تم اس خواہش کو پورا کرو، اور لڑکی کو میرے حوالہ کر دو میں اس کی نگرانی کروں گا۔"

بوڑھا برہمن چلا گیا۔ اور لڑکی کو میرے سپرد کر دیا۔ میں نے اُس لڑکی کو سری تیرتھ جی کے مکان میں یہ کہہ کر رکھا کہ وہ اس کا باپ ہے! اسکے بعد جو کچھ ہوا وہ تم کو معلوم ہے۔ آج تم سے پوری داستان بیان کر دینے کے بعد میں انتہائی اطمینان محسوس کر رہا ہوں اور میرے سینہ پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے۔ کیا یہ ایک فسانہ نہیں ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس داستان کو قلمبند کر کے کتاب کی شکل میں چھپواؤں لیکن میں خود مضمون نگار نہیں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرے بھتیجے کو اس فن سے کسی قدر لگاؤ ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ وہ اس کو میرے لئے تحریر کر دے۔ سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ تم بھی اس کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ کیونکہ اس داستان کا انجام مجھے پوری طرح معلوم نہیں ہے۔"

اختتامی الفاظ کی جانب زیادہ توجہ کرتے ہوئے ہمنتا نے پوچھا "کسم نے اس شادی سے اختلاف نہیں کیا؟"

"اس کا قیاس کرنا ذرا دشوار ہے۔" شنکر نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو میرے لڑکے۔ کہ عورت کے دماغ کی ساخت کس قسم کی ہوتی ہے؟ جب وہ "نہیں" کہتی ہے تو اُس سے اس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے۔ دوسرے مکان میں منتقل ہونے کے بعد چند روز تک وہ تم کو دیکھے بغیر دیوانی سی ہو رہی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بھی اُس کے نئے مکان کا پتہ لگا لیا۔ کیونکہ کالج جاتے وقت تم راستہ کاٹ کر اکثر سری پتی کے گھر کے سامنے چکر لگاتے تھے، اور تمہاری نظریں، کالج کو تلاش کرنے کی بجائے ایک شریف آدمی کے مکان کی سلاخ دار کھڑکیوں میں گڑی رہتی تھیں جس میں صرف کیڑے پتنگے یا دیوانوں کی نگاہیں کچھ کامیابی حاصل کر سکتی تھیں۔ مجھے تم دونوں کی اس حالت پر ترس آتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تمہاری تعلیم میں ناغہ پر ناغہ ہو رہا ہے اور لڑکی کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔

ایک روز میں نے کسم کو بلا کر اس سے کہا۔ "سنو میری بیٹی۔ میں ایک ضعیف آدمی ہوں۔ اور تم کو میرے سامنے شرمانا نہ چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا دل اور تمہاری جان، کس کے واسطے ستی ہو رہی ہے اُس نوجوان کی حالت بھی قابلِ رحم ہے۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ میں تم دونوں کو متحد کر دوں۔" یہ سُنکر کسم کی معصوم آنکھوں سے موتی کی مانند آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے۔ اور وہ اپنا مُنہ چھپاتی ہوئی بھاگ گئی۔

اس کے بعد میں متعدد بار سری پتی کے گھر گیا - اور کُسم کو بلا کر اُس سے تمھارا ذکر کیا - رفتہ رفتہ میں اپنی باتوں سے اُس کی شرم وحیا پر غالب آ گیا - اور آخر کار ایک دن جب میں نے اُس سے کہا کہ میں تم دونوں کی شادی کی کوشش کروں گا تو اس نے پوچھا " یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ "

اُس کی فکر مت کرو " میں نے جواب دیا " میں تم کو ایک برہمن لڑکی ثابت کردوں گا " بہت دیر تک بحث مباحثہ ہونے کے بعد اُس نے مجھ سے استدعا کی کہ جب اس کے متعلق تمھارا منشا معلوم کروں " کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو ؟ " میں نے کہا - " وہ لڑکا بالکل دیوانہ ہو رہا ہے ان تمام پیچیدگیوں کو اُس سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ پہلے شادی ہو جانے دو - اس کے بعد جو کام بخیر وخوبی ختم ہوتا ہے وہ سب اچھا ہی ہوتا ہے - اور خصوصاً جبکہ اس راز کے فاش ہونے کا ذرا بھی خطرہ نہیں ہے ، کیوں راستہ سے بھٹک کر ایک نوجوان کی ساری زندگی تباہ و برباد کی جائے ؟ "

مجھے معلوم نہیں کہ آیا کُسم نے میری تجویز کو تائید کی یا نہیں - تاہم یہ بات میں دیکھتا تھا کہ بعض وقت وہ روتی تھی ، اور کبھی بالکل ساکت اور خاموش رہتی تھی - اور اگر میں کبھی کہتا کہ خیر اس معاملہ کو نظر انداز کردو تو وہ بحد مضطرب ہو جاتی تھی - جب حالات اس درجہ پر پہونچ گئے تو میں سری پتی کو شادی کا پیغام دے کر تمھارے پاس بھیجا - تم نے بلا پس و پیش بڑا اس کو منظور کر لیا - اور سب کچھ طے ہو گیا -

تاریخ مقررہ سے چند روز قبل سے ، مجھے اس کو اس امر پر رضامند کرنے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے انکار کردیا تھا - وہ مجھ سے برابر یہی کہا کرتی تھی " اچھا اس معاملہ کو نظر انداز کر دیجئے " میں اُس سے برہم ہو کر کہتا " بیوقوف لڑکی ! تیرا اس سے کیا مطلب ہے ؟ جب تمام معاملات طے ہو چکے ہیں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں ؟ "

اس نے کہا " یہ مشہور کرا دیجئے کہ میں مر گئی ہوں اور مجھے کہیں بھیج دیجئے "

میں نے کہا " اس نوجوان لڑکے کا کیا حشر ہوگا ؟ وہ اسوقت خوشی کے مارے ساتویں جنت میں پہونچ گیا ہے - محض اس امید میں کہ کل اُس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی ، اور آج تم چاہتی ہو کہ میں اُس کو تمھاری موت کی خبر بھیجدوں ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل مجھے اس کی موت کی خبر تم کو سُنانی پڑے گی اور اُسی روز شام کو تمھاری موت کی خبر میرے کانوں میں آ پڑے گی - نادان لڑکی کیا تیرا خیال ہے کہ میں اس عمر میں ایک نوجوان برہمن ، اور ایک بیوہ لڑکی کو قتل کرنے کے قابل ہو سکتا ہوں ؟

خوش قسمتی سے ، وقت مقررہ پر شادی بخیر وخوبی ، انجام پا گئی - اور اس اہم کام کی تکمیل کے بعد میں ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا - اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس سے تم بخوبی واقف ہو "

" کیا ہم کو ایسا ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچانے پر تم اکتفا نہ کر سکتے تھے ؟ " ہیمنتا نے ایک مختصر سے سکوت کے بعد کہا - " تم نے اب اس راز کو کیوں فاش کر دیا ؟ "

انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ پیار سے شنکر نے جواب دیا " جب میں نے دیکھا کہ تمھاری ہمشیرہ کی شادی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں - تو میں نے اپنے دل میں غور کیا - کہ میں نے ایک برہمن کی ذات میں تو دھبہ لگا دیا ہے - اور یہ محض فرض کی انجام دہی کی غرض سے کیا گیا تھا - اب یہاں ایک دوسرے برہمن کی ذات بھی خطرہ میں پڑ رہی ہے اور اس مرتبہ میرا یہ اہم فرض ہے کہ میں اسکو بچانیکی

کوشش کروں۔ اس لئے میں نے ان کو لکھ بھیجا کہ میں دعوے کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں کہ تم نے ایک شودر کی لڑکی سے اپنی شادی کی ہے"

ہمنتا نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اب اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟ جس کو میں چھوڑ دوں گا۔ کیا تم اس کو روٹی کپڑا دوگے؟"

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" پیارے شنکر نے متانت سے جواب دیا۔ "اب یہ میرا کام نہیں ہے کہ دوسروں کی چھوڑی ہوئی اور مطلقہ بیویوں کی دیکھ بھال کرتا پھروں۔۔۔ کوئی ہے، جاؤ۔ ہمنتا بابو کے لئے برف اور شربت لاؤ۔ اور پانی بھی"

ہمنتا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس خاطر تواضع کا شرمندۂ احسان ہوئے بغیر وہاں سے چل دیا۔

(۴)

چاند کی پانچویں رات تھی۔ اور بہت تاریک۔ پرندے ساکت تھے۔ بیری کا درخت زمین پر ایک سیاہ داغ کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اور بادِ صرصر کے جھونکے، ایک نیند میں ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح چل رہے تھے۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے اپنی تنویروں کو اس تاریکی میں اس لئے پیوست کئے دے رہے تھے تاکہ کوئی عمیق راز معلوم کر سکیں۔

کمرہ میں کوئی روشنی نہ تھی، ہمنتا کھڑکی کے قریب بستر پر بیٹھا ہوا تھا، اور سامنے تاریکی میں اپنی آنکھیں جمائے تھا۔ کُسم، فرش پر پڑی تھی، وہ اپنے دونوں سیمیں اور خوبصورت ہاتھوں سے اپنے شوہر کے قدموں کو مضبوط پکڑے ہوئے تھی اور اُس کا سر قدموں پر تھا۔ وقت ایک سمندر کی مانند تھا جو کامل طور پر سکوت میں ڈوبا ہوا ہو۔ رات کے صفحہ پر معلوم ہوتا تھا کہ قسمت نے ہمیشہ کے لئے یہ ایک تصویر نقش کر دی ہے۔۔۔ تباہی ہر طرف کھڑی ہے اُس کے بیچ میں ایک منصف ہے، اور مجرم اُس کے قدموں پر سربسجود ہے۔

پھر سلیپر کی چاپ سنائی دی، ہری ہر مکرجی نے دروازے کے قریب پہونچکر کہا۔ "بس بہت وقت ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اس لڑکی کو فوراً گھر سے باہر نکالدو"

جب کُسم نے یہ آواز سنی تو پورے جوش اور جذبات کے ساتھ ہمنتا کے پیروں سے چمٹ گئی۔ ان کو پیار کیا اور تعظیماً اپنی پیشانی اُن پر رکھدی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

ہمنتا اُٹھا۔ اور دروازہ کی طرف بڑھ کر بولا۔ "اباجان۔ میں اپنی بیوی کو نہ چھوڑوں گا"

"کیا کہا؟" اس کے والد نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا تو اپنی ذات کو چھوڑ دیگا؟"

"میں ذات کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے انسانیت کا خیال ہے" ہمنتا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو میں تم کو بھی چھوڑتا ہوں" اس کے والد نے کہا اور چلا گیا۔

(ٹیگور)

محشر عابدی بی۔اے

باب المراسلتہ والمناظرہ

کسبی کا دامن ایک ڈاکٹر کے ہاتھ میں

جناب ڈاکٹر محمد الیاس صاحب ۔ ٹکاری (گیا)

نیاز صاحب!

یہ میری کوتاہی فہم ہے کہ اب تک یہ سمجھتا رہا تھا کہ صرف جدت طرازی "نگار" کا حصہ ہے۔ لیکن ماہ اگست ۱۹۶۲ء کے پرچے کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ ہر بری بات یا بالفاظ دیگر سوسائٹی کے ہر ہر قانون کی توہین بھی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

کسبی والے مضمون میں فاضل مضمون نگار کی شعلہ بیزیاں دیکھ کر مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ غصہ در نج کی نہیں بلکہ حیرت و استعجاب کی اور حسرت و یاس کی ہے۔ اب اسے آپ یا تو میری قدامت پرستی سے تعبیر کریں یا کسی اور چیز سے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ جہاں جہاں علمی استدلال کا نام لیا گیا ہے بجز ابلہ فریبی کے میں اور کچھ نہیں پاتا۔ ایسے مضامین "نگار" کے صفحات کی تزئین تو کر سکتے ہیں لیکن سوسائٹی کے افراد کی عقل سلب نہیں کر سکتے۔

آپ نے جرائم کی دو قسمیں کی ہیں (۱) شخصی (۲) جماعتی۔ مجھے بھی تسلیم ہے۔ آپ کسبی کو کسی طرح کی مجرم نہیں پاتے اور میں کہتا ہوں کہ وہ دونوں طرح کی مجرم ہے۔ اول اس لئے کہ علمی دنیا میں کہیں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جہاں وہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھ گئی ہو۔ علاوہ ازیں کیا روحانیت کی موت کوئی موت نہیں؟ کیا فریب کاری سے کسی کسبی کو مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ پیشہ صرف اس لئے نہیں کرتی کہ دوسروں سے حصول زر کیا جائے۔

اب رہا جماعتی جرم کا سوال یہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے، شاید آپ بھی اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ بدترین امراض کے جراثیم یہیں سے تقسیم ہوتے ہیں ایک دو نہیں ہزاروں خاندان کی مٹی انہیں پیشہ وروں کے ہاتھوں پلید ہوئی اور تباہی و ذلت کے جہنم میں گر کر فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ آپ کہیں گے کہ نفس پیشہ میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی کسبی کو آپ اس سے

مستثنیٰ کر ہی نہیں سکتے۔

عورت اور مرد کے اتصال کی جو تین غرضیں آپ نے بتلائی ہیں۔ اپنی جگہ بہت صحیح ہیں۔ لیکن آگے چلکر آپ نے جس فریب سے کام لیا ہے اللہ کی پناہ۔ یکیا ضرور ہے کہ "بقائے نسل" اور "تدبیر منزل" کی تکمیل تو گھر یلو عورت کرتی رہے اور تیسری غرض یعنی "آلام حیات سے کسی قدر آسودگی" کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کیوں نہ ہم یہ تینوں تمنائیں ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیں کیا یہ تینوں تمنائیں اس درجہ ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ ایک ذات سے ان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اگر یہ حقیقت نہیں اور یقیناً نہیں تو یہ تقسیم کس بنا پر ہے۔ اور اگر فرض کریں کہ اول ہی دو اغراض کی تکمیل بیویوں سے ممکن ہے تو پھر نکاح و شادی کو آپ کیوں ضروری قرار دیں۔ ان کی تکمیل تو جانور بھی کر لیتے ہیں۔ وہ بچے بھی دیتے ہیں اور ان کی پرورش بھی ہو جاتی ہے۔ بچوں کو محض ایک مرد سے موسوم کرنے کا مقصد اتنا اہم نہیں کہ اس کے لئے نکاح و شادی کا اتنا بڑا بار آج کل کے "ترقی یافتہ دماغ" کا انسان برداشت کر سکے آپکو بھی اولیں دو اغراض کے جبلی ہونے کا اقرار ہے۔ اور رسم شادی قطعی جبلی شے نہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ کیوں اس سے بےخبر ہیں کہ جس ہندوستان کی سوسائٹی کا ماتم آپ کر رہے ہیں اس سے بہت زیادہ رنگین نظر آتا ہے وہیں کی سوسائٹی نے عورتوں کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اور لوازم کے ساتھ یہ بھی سیکھیں کہ ان کے مردوں کو کس آسائش کی ضرورت ہے۔ ان کی کوشش رنگینیاں مرد کے جمالیاتی ذوق کو پورا کر سکتی ہیں۔ ان کی کیا کیا ادائیں مرد کی طلب آسودگی کو پورا کر سکتی ہیں جس عورت میں ان کی کمی ہے وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن حقیقی معنی میں بیوی نہیں بن سکتی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہر عورت اس آواز پر کان نہیں دھرتی تو یہ افراد کا جرم ہے، اس سے سوسائٹی کے قانون میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔

آپ جس آسودگی کا نام لیکر کسی کی قربانگاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں اس کا کسی کے یہاں کہیں پتہ نہیں اس کی تمام اداؤں میں فریب۔ اس کی تمام رعنائیاں یکسر مکاری اور اس کی تمام رنگینیاں یکسر مصنوعی ہیں۔ وہ ریشمی ساری اس لئے اوڑھ محض اس لئے پہنتی ہیں کہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس ساری کے اندر ریشم سے بھی زیادہ نرم و نازک جسم چھپا ہوا ہے۔ وہ آپ کو رنگ و بو کی فضا میں صرف اس لئے لیجانا پسند کرتی ہے کہ وہاں پہونچکر آپ بہت زیادہ آسانی سے مسحور ہو جائیں اور اپنا سب کچھ اس پر نثار کرنے کو طیار۔ وہ اعضا کے ہر لوچ کے ساتھ آپ کے دماغ کو مسلسل ایسے جھٹکے پہونچاتی ہے کہ آپ مفلوج ہو کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔ وہ صرف تمثیل کرتی ہے عشق و محبت کی اسی عشق و محبت کی جو آپکے عجیب و غریب شاعرانہ دماغ کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ شے ہے جس کا جادو آپ پر سب سے زیادہ چلتا ہے اور اگر یہ فن ان سے چھین لیا جائے تو پھر ان میں آپ کے لئے کوئی دلکشی باقی رہے نہ جاذبیت۔

رہی یہ بات کہ سوسائٹی کے ان تمام جذبات کراہت کے باوجود یہ پیشہ اتنا شاداب کیوں نظر آتا ہے محض ادنیٰ تدبر اس مسئلہ کو حل کر دیتا ہے۔ یہ کرشمہ ہے محض حیوانی جذبہ کا جو مرد کو ہر اس شے کے پاس کشاں کشاں لیجاتا ہے جس میں نسائیت ہو۔ لوچ ہو۔ رنگینی ہو اور عطریت ہو۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ہندوستان کا مرد کتنا عجیب و غریب ہے۔ گھر کی بیویاں وہ نازو

عشوے کہاں سے لائیں جو کسبیاں صرف اسی لئے حاصل کرتی ہیں کہ مرد کو بیوقوف مرد کو دھوکا دیا جائے۔ یہاں سادگی ہے وہاں پُرکاری۔ یہاں خلوص ہے اور وہاں فریب کاری۔ بڑی ایک شریف بیوی اپنا سب کچھ شوہر کی ایک نظر التفات پر نثار کر دینے کو طیار ہے۔ لیکن ناکارہ مرد آسودہ ہو کر عرصہ تک فریب میں مبتلا رہنا پسند کرتا ہے۔ محض یہی تلاش اسے وہاں لیجاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے غرق کرانی ہے۔

آپ نے یہ نتیجہ خدا جانے کہاں سے نکال لیا ہے کہ مرد، ذلیل اور کمینہ۔ مرد جو کسبی کی گلی کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اسکے کوٹھے پر چڑھتا ہے سوسائٹی کی نظر میں قابل احترام رہتا ہے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب کبھی بھی وہ اس کے ارتکاب کی ہمت کرتا ہے تو ٹھیک اسی طرح جس طرح چور پولیس کی نظر سے بچکر سب کچھ کر جاتا ہے، ہاں حکومت کا قانون البتہ کسی کی طرح اس پر بھی کوئی دفعہ عائد نہیں کرتا۔

میں نے اس مضمون میں اکثر جگہ آپ کو مخاطب کیا ہے صرف اس سبب سے کہ مضمون کی اشاعت کی پوری ذمہ داری ایڈیٹر کے سر ہوتی ہے۔ اور آپ نے بغیر کسی اختلافی نوٹ کے کسبی والے مضمون کو شائع فرمایا ہے۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری اس تحریر کی اشاعت آپ ہرگز گوارا نہیں فرمائیں گے اور مجھے اس بارہ میں کبھی آپ کا مرہون منت ہونا نہیں پڑے گا پھر بھی اپنی مجرمانہ نقاشی کی معافی چاہتا ہوں۔

(نگار) اس تحریر کی شان نزول یہ ہے کہ اگست سنہ ۴۳ء کے نگار میں ایک مضمون کسبی کے عنوان سے جناب بزمی بھوپالی کا شائع ہوا تھا، جس میں پیشہ ور زنان بازاری کے متعلق بہت روادارانہ انداز سے بحث کی گئی تھی اور اُن کے وجود کو سوسائٹی کے لئے ایک ضرورت قبیحہ" (Evil Necessity) کے طور پر جائز ثابت کیا گیا تھا۔

محترم مراسلہ نگار کی یہ عتاب آمیز تحریر ستمبر ہی میں مجھے مل گئی تھی، لیکن میرے حیدرآباد کے طویل قیام اور پھر جنوری کے رسالہ کی طیاری کی وجہ سے اس کی اشاعت کا موقعہ نہ ملا۔ اس دوران میں ایک سے زائد بار ڈاکٹر صاحب موصوف نے طعن آمیز تقاضے بھی کئے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے قبل میں اس کی اشاعت پر قادر نہ ہو سکا۔ بہرحال اب میں اس کو درج کرتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ جس مسئلہ پر جناب بزمی نے اظہار خیال کیا تھا، اس کے لئے اسقدر رزمی انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

میرا کسی مضمون کو نگار میں شائع کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ میں اس کا موافق بھی ہوں۔ اس سے قبل بارہا خود میری اور میرے مسلک کی مخالفت میں مضامین موصول ہوئے اور میں نے انھیں شائع کر دیا، اس لئے مسئلہ زیر بحث میں صرف اس دلیل پر کہ میں نے بزمی صاحب کے مقالہ کی مخالفت میں کوئی نوٹ نہیں لکھا، مجھے اس کی موافقت کا مجرم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زنان بازاری کے خلاف ڈاکٹر صاحب کی برہمی کو دیکھ کر میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ ضرور ان کو اس پیشہ والیوں نے بہت ستایا ہے اور اسی لئے وہ یہ انتقام اُن سے لے رہے ہیں۔

ہم لوگوں میں یہ سخت عیب ہے کہ اپنی مخالفت میں کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے اور یہی وہ ذہنیت ہے، جس نے ہماری نہ صرف

اجتماعی و سیاسی بلکہ مذہبی زندگی کو بھی ناکارہ بنا رکھا ہے۔

اگر قریشی صاحب نے کسبیوں کی حمایت میں کوئی مضمون لکھا تھا، تو اس پر غور کرکے سنجیدگی سے اس کا جواب لکھنا چاہئے تھا، ہجو کی ضرورت نہ تھی اور پھر لطف یہ کہ اظہار برہمی بھی مقالہ نگار پر نہیں ہے، بلکہ مجھ پر ہے کہ میں نے کیوں اسے شایع کیا۔ درآنحالیکہ دُنیا کی کوئی اصلاح اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ریب و شک یا ایراد و اعتراض کی تمام صورتوں کو محو کرکے لوگوں کے قلوب کو متاثر نہ کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم مخالفین کی باتیں سُنیں اور اُن کے شبہات و اعتراضات کو دور کریں۔

پیشہ ور عورتوں کا مسئلہ سوسائٹی کا نہایت قدیم مابہ النزاع مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ان کے وجود کو بُری نگاہوں سے دیکھا گیا، لیکن دنیا ان سے پاک نہ ہو سکی، یہاں تک کہ حکومتوں کے قوانین بھی ادارۂ فحاشی کا استیصال نہ کر سکے اور یہ طبقہ جوں کا توں ابتک باقی ہے۔۔۔ اگر آپ نے میری تصنیف ترغیبات جنسی اب تک نہیں پڑھی تو اب مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ فحاشی کتنی قدیم چیز ہے اور اس کے رواج کے خلاف کیا کیا تدابیر اختیار نہیں کی گئیں، لیکن آخر کار سب کو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ شروع سے تشخیص ہی غلط کی گئی، یعنی زنان بازاری کے استیصال سے قبل اس امر پر کبھی توجہ نہیں کی گئی کہ آیا ان کا وجود نتیجہ ہے مردوں کی آوارگی کا، یا مردوں کی آوارگی نتیجہ ہے ان کے وجود کا۔

اگر آپ نے تاریخ تمدن کا مطالعہ کیا ہوگا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ عہدِ وحشت میں مرد و زن کے تعلقات کیا تھے، اُس وقت نہ نکاح کا رواج تھا، نہ کسی عہد و پیمان کا، ایک مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے تعلق رکھ سکتا تھا اور عورت کی حیثیت اس بازاری جنس سے زیادہ نہ تھی جس کو قیمت ادا کرکے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اب بھی بہت سی قوموں میں نقد معاوضہ ادا کرکے بیوی حاصل کرنے کا دستور باقی ہے۔

اس لئے اس سے انکار ممکن نہیں کہ تعلق جنسی کے سلسلہ میں مرد کی خواہش کو ہمیشہ فایق سمجھا گیا اور عورت اس امر پر مجبور کی گئی کہ وہ مرد کی اس خواہش کو طوعاً یا کرہاً پورا کرے۔ جب تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نکاح دازدواج کو اصلاح معاشرت کے لئے ضروری قرار دیا گیا تو اسکے بعد بھی ایک عورت کی پابندی ضروری نہ قرار دی گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ ظلم بھی غریب عورت پر روا رکھا گیا کہ وہ ایک ہی وقت میں خاندان کے مختلف مردوں سے تعلق رکھے۔۔۔ اس کے بعد جب انسانیت نے زیادہ ترقی کی تو بعض قوموں نے صرف ایک ہی بیوی کا مرد کو پابند بنانا چاہا اور بعض نے مرد کی تنوع پسند طبیعت کا لحاظ کرکے ایک سے زاید بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔

الغرض تعلق جنسی کے سلسلہ میں عورت کی حیثیت ہر ملک اور ہر زمانہ میں حد درجہ مظلومانہ رہی ہے اور مرد کی دست درازیوں اور متعدد عورتوں سے تعلق پیدا کرنے کی تمناؤں نے ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ادارۂ فحاشی کو قائم رکھا۔ پھر چونکہ صورت حال یہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ عورتوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا، جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ مرد کی اس ناجایز خواہش کو پورا کرتی رہیں اور حکومتوں نے بھی سوسائٹی کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نوع کے ادارۂ فحاشی کا قیام جایز قرار دیا۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ رواج فحاشی کی ابتدا مرد کی طرف سے ہوئی اور عورت نے اسے مجبوراً صرف اس لئے اختیار کیا کہ مرد زبردستی

سے اس سطح پر گھسیٹ کر لے آیا تھا اور اب سوائے اس پیشے کے کوئی دوسری صورت اس کی زندگی کی باقی نہ رہی تھی۔

میرے نزدیک مرد کے ان تمام مظالم میں جو اس نے عورت پر روا رکھے ہیں، بدترین ظلم یہی تھا اور تماشہ یہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ مرد اپنے آپ کو بہت آزاد و ترقی یافتہ کہتا ہے، عورت کی یہ مظلومیت اس کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

میرے فاضل مراسلہ نگار ان زنان بازاری کے سخت مخالف ہیں اور وہ زنان بازاری کے اتنے سخت دشمن ہیں کہ بقول شخصے اگر انھیں مل جائیں تو "کچا ہی چبا جائیں" لیکن انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں فرمایا کہ یہ بلا تو خود انھیں کی "جنس" کی لائی ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک خود مرد اپنی ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔

بیشک ان کے مکانات نہایت ہی پلید قسم کی بیماریوں کا گہوارہ ہیں۔ بالکل صحیح۔ ان کے گھر بدترین اخلاقی جرائم کا مرکز ہیں۔ یقیناً درست —— ان کی عشوہ فروشیوں نے ہزاروں گھر تباہ کر دئے، لاریب فیہ —— لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بیماریاں اُن کو کس نے لگائی ہیں، یہ اخلاقی جرائم کس کی وجہ سے قائم ہیں اور یہ مال و زند کی تباہیاں کیا اس لئے نہیں ہیں کہ مرد اپنے جذبات کا بندہ اور اپنے نفس کا غلام ہے۔

آگ کا کام جلانا ہے اور پانی کا بہا لے جانا، لیکن [illegible] کے اندر قدم رکھیں —— اگر آپ ایسا کریں گے تو دنیا آپ ہی کو بیوقوف بنائے گی، آگ اور پانی کو کوئی بُرا نہیں کہیگا۔

آپ اس طبقہ کے خلاف تو جہاد پر آمادہ ہیں لیکن خود اپنی جماعت کی اصلاح پر متوجہ نہیں جو اصل محرک و سبب ہے فحاشی کے قیام کا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی بازاری عورت زبردستی مرد کو اُس کے گھر سے گھسیٹ لے گئی ہو، کیا کبھی اس نے ایسا کیا ہے کہ وہ راہ چلتے آدمی کو بجبر اپنے کوٹھے پر کھینچ لائی ہو۔ پھر جب صورت حال یہ نہیں ہے تو کسی کا کیا قصور۔ شراب کی کشید اسی لئے جاری ہے کہ انسان اسے استعمال کرتا ہے، افیون کی کاشت اسی لئے ہوتی ہے کہ لوگ اس کے شایق ہیں، دنیا میں ہر پیداوار، طلب کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے اس لئے پیداوار کے خلاف احتجاج کرنا سخت لایعنی سی بات ہے کیونکہ وہ تو نتیجہ ہے طلب کا۔ ہم اصل سبب کو کیوں نہ دور کریں کہ ہمیشہ کے لئے انسداد ہو جائے، ورنہ یوں اگر اصلاح ہوئی بھی تو بالکل عارضی ہوگی اور اس کا قیام پائدار نہ ہوگا۔

جو تحریک مراسلہ نگار نے کی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں، اس سے قبل بعض حکومتوں نے بہ جبر قحبہ خانوں کو بند کرا کے سخت سزائیں پیشہ ور عورتوں کے لئے تجویز کیں، لیکن آخرکار اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور بعد کو مانع فحاشی قوانین منسوخ کرنے پڑے —— کیونکہ ان قوانین کے نفاذ سے مردوں کے اخلاق پر تو کوئی اثر پڑا نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی طور پر سوسائٹی کے اندر فحاشی کا رواج شروع ہو گیا جو بہت زیادہ مہلک و تباہ کن تھا۔

تنوع پسندی اور ہر جدید چیز سے لذت اُٹھانا، انسان کی فطرت ہے، اس لئے یہ نا ممکن ہے کہ مرد یا عورت کے ذہن سے اس خواہش کو دور کر دیا جائے، لیکن چونکہ عورت نسبتاً زیادہ صابر و ضابط اور زیادہ شرمیلی واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کی خواہش کو تو ہم سوسائٹی کے قوانین سے دبا سکتے ہیں لیکن مرد جو زیادہ بیباک پیدا ہوا ہے اور رسم و رواج کے ماتحت اس کی فحاشیوں کو اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا، مشکل سے قابو میں آسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک انسداد فحاشی نہ ہو سکا۔ اور نہ عملی طور پر پیشہ ور عورتوں سے دنیا کو پاک کیا جا سکا۔

بہرحال، میں اس باب میں معزز مراسلہ نگار کا بالکل ہمنوا ہوں کہ پیشہ ور عورتوں سے ملک میں ہلاکت و تباہی پھیل رہی ہے اور ہماری معاشرت میں ان کا وجود نہایت بدنما داغ ناصیۂ انسانیت کے لئے ہے، لیکن میں اس باب میں اُن سے متفق نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب دنیا کی رونق ان کے نہ ہونے سے کم ہو جائے گی، یہ طبقہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہیگا اور اس وقت تک کہ مرد خود اپنی فطرت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے۔ وجود یقیناً محال ہے، یہی چرچے دنیا میں رہیں گے۔ انسان اگر درندہ پیدا نہیں ہوا، تو اس کے فرشتہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں، اور غالباً دنیا کا لطف اسی پر قائم ہے۔

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہدِ ہمچو توئی یا ز فسقِ ہمچو منی!

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۴ ـ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی تلشی رام ولد کنوجی قوم تنبولی ساکن لال باغ لکھنؤ

بنام
۵ ـ بلھداس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۷ ـ دامودر داس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۱۲ ـ لالہ پرسوتم داس ولد لالہ ہرنرائن رستوگی ساکن اشرف آباد تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۷ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جایداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ ۲۳ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور بریں سے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۲۳ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط جج بخط انگریزی

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

چند دلچسپ نتائج مطالعہ

چینیوں کا جہنم ـــــــ

ہر مذہب میں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید، بہشتی ہو یا غیر بہشتی، معاد کا اعتقاد ضرور پایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں جنت و دوزخ کے جو حالات ان کئے جاتے ہیں، ان میں ہر جگہ عجیب و غریب شاعری سے کام لیا گیا ہے جو ہر ملک کے ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

مثلاً اگر کسی مذہب نے نہایت گرم ملک میں نشو ونما پایا ہے تو دوزخ نہایت شدید گرم ہوگی جہاں آگ کی لپیٹ ہے اور باد سموم کے جھونکے بخلاف اس کے قطب شمالی کے رہنے والوں کی دوزخ وہ ہے، جہاں ہر وقت برفباری ہو رہی ہے اور ہر چیز یخ بستہ نظر آتی ہے۔

الغرض ہر ملک کی مدنیت اور اس کے ماحول کو اعتقادات مذہب و معاد میں بڑا دخل ہوا کرتا ہے اور اگر کوئی شخص تحقیق کرے تو مذاہب مطالعہ سے اہل مذاہب کی فطرت، ان کے ماحول و تمدن اور ذوقِ شاعری کا علم بڑی حد تک اسے حاصل ہو سکتا ہے۔

مثلاً چینیوں کو لیجئے کہ ان کے یہاں جہنم کے دس یا اٹھارہ درجے قائم کئے گئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تقسیم جرائم اور کے لحاظ سے ترتیب قانون میں کافی دقّت نظر سے کام لیا تھا۔

ان کے یہاں جہنم کا پہلا درجہ قاتلوں، خودکشی کرنے والوں اور حیات بعد الموت کے منکروں کے لئے مخصوص ہے جس میں وہ بھوکے پیاسے جائیں گے اور روز مار مار کر زندہ کئے جائیں گے۔ چونکہ یہ تینوں زندگی کی نعمت کو ٹھکرانے والے ہیں، اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو ان کے سب حال تھی اور جس میں شاعرانہ تشبیہ و استعارہ دونوں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔

دوسرا درجہ جہنم کا جھوٹ بولنے والے کے لئے ہے، اس طبقہ میں صرف ایک صحرا ہے جس کے درختوں کے پتے تلوار کی طرح تیز ہیں جہاں دریاؤں کا پانی چوسنے کا ہے۔

چونکہ جھوٹ بولنے کا تعلق زبان اور حلق سے ہے اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو زبان اور حلق کو تکلیف پہونچانے والی ہے۔

تیسرے درجہ میں وہ لوگ رکھے جائیں گے جنھوں نے سرداران قوم کا احترام نہیں کیا ہے، یہاں سوائے نمک کے اور کچھ نہ ہوگا کھائیں گے اور اسی میں زندگی بسر کریں گے، اس سزا کا بھی شاعرانہ تعلق جرم سے ظاہر ہے۔

چوتھا طبقہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ملک کے محاصل ادا نہیں کرتے، جو ناکارہ دوائیں فروخت کرتے ہیں اور جو راستے میں کانچ کے ے ڈالدیتے ہیں یا اپنے جانوروں کو سڑک پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پتھروں اور لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کے نیچے دبا کر پیسا جائیگا۔

پانچواں طبقہ کافروں، ساحروں، غیبت کرنے والے، خوشامدیوں اور اپنا قرض نہ ادا کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور چھٹا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے قربانیاں پیش کرنے میں تامل کیا تھا، یہ ایک پنجرہ میں بند کردئے جائیں گے اور چوہے اور چڑیاں ان کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اسی طرح ایک درجہ زانیوں کے لئے ہے اور ان کی سزا عجیب غریب بتائی گئی ہے یعنی ایک زانی کی شخصیت متعدد شخصیتوں میں تبدیل کردی جائیگی اور ہر ایک پر علحدہ علحدہ عذاب کیا جائے گا۔ یہ شاعرانہ توجیہ کسقدر دلچسپ ہے۔

آپ دُنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس کے یہاں عذاب و ثواب کی شاعرانہ مصوری تقریباً اسی قسم کی نظر آئے گی اور اگر اس میں کوئی فرق ہوگا تو صرف اس نفسیاتی احساس کی وجہ سے جو مختلف قوموں میں اُن کے ماحول و تمدن کے لحاظ سے علحدہ علحدہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اب مذہبی شاعری کا یہ دور ختم ہو گیا ہے کیونکہ یہ زمانہ حقائق کی جستجو کا ہے اور محض ظن و قیاس پر اعتماد کر کے کسی نظریہ کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔

ترکی کی جدید اصلاحات

(۱) سنہ ۳۵ء کا آغاز ترکی میں مزید اصلاحات کے ساتھ ہوا ہے جن میں سب سے زیادہ اہم اصلاح ترکی خواتین کی سیاسی اہمیت کو بڑھانا ہے۔ اس سے قبل وہ میونسپل ممبروں کے حق میں رائے بھی دے سکتی تھیں اور خود بھی ممبر ہو سکتی تھیں، لیکن پارلیمنٹ میں انکی کوئی آواز نہ تھی۔ اب حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، یعنی ۲۲ سال کی عمر رکھنے والی خواتین ممبران پارلیمنٹ کے حق میں رائے دے سکتی ہیں اور ۳۰ سال کے عمر کی خود بھی پارلیمنٹ میں جا سکتی ہیں۔

(۲) ۶ سال قبل عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی حروف کا استعمال وہاں شروع ہوا تھا اور اس تحریک کے سلسلہ میں ایک عام رجحان تعلیم کا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اب مصطفےٰ کمال نے ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ کے اخراج کا بھی تہیہ کر لیا ہے اور اس باب میں اتنا قدغن ہے کہ وہ قدیم ناموں کو بھی ترک کر رہا ہے، چنانچہ خود اسنے اپنا نام بجائے مصطفےٰ کمال کے "اتاترک" رکھا ہے جسکے معنی "ترک اعظم" کے ہیں اور اپنے وزراء کا نام بھی بدل دیا ہے۔

چنانچہ اس تحریک نے وہاں کی زبان میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے اور اب وہاں کا ہر لٹریچر خالص ترکی زبان میں شائع ہو رہا ہے جس میں غیر زبانوں کا کوئی ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۳) مصطفےٰ کمال نے مشرقی موسیقی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے یاس و حزن پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کے ولولۂ عمل پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اس نے حال میں احکام جاری کئے ہیں کہ مشرقی موسیقی کی آواز کسی جگہ سے بلند نہ ہو، اور جدید مغربی اُصول پر اس کو مرتب کیا جائے۔

(۴) اصلاح مذہب کے سلسلہ میں اُس نے جدید احکام یہ جاری کئے ہیں کہ کسی مذہب کا پیشوا کوئی خاص لباس ایسا استعمال نہیں کر سکتا، جس سے اس کی مذہبی قیادت کا اظہار ہو، اس کے معنے یہ ہیں کہ نہ مسلمان علماء وہاں عمامہ و عبا استعمال کر سکیں گے

اور نہ عیسائی پادری اپنی دراز قبائیں ۔ اس اعلان سے وہاں کی عیسائی آبادی میں ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور پاپائے روم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان حالات میں وہاں عیسوی مدارس کا قایم رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔

مغرب اور جنگِ مستقبل

یقیناً اس وقت مغرب کا کوئی ملک جنگ کو ناپسند نہیں کرتا اور بظاہر دنیا میں امن و سکون پیدا کرنے کی کوشش ہر ملک کی طرف سے کی جارہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بے اعتباری اور امکانِ جنگ کی طرف سے خوف کا یہ عالم ہے کہ ہر قوم اپنی ساری قوت اسبابِ حرب کی طیاری میں صرف کر رہی ہے ۔

حال ہی میں مغرب کی اکثر سلطنتوں نے اپنے اپنے یہاں فوجی مشقوں اور مصنوعی جنگوں کی نمائش کی تھی اور اس سلسلہ میں جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ آیندہ جنگ کے ہولناک مناظر کی ایسی ڈراونی پیشین گوئی کرنے والے ہیں کہ اگر واقعی کبھی لڑائی چھڑ گئی تو شاید کرۂ ارض کو اپنی تباہی کے لئے کسی صورِ اسرافیل کے انتظار کی ضرورت باقی نہ رہیگی ۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ آیندہ جنگ بالکل فضائی جنگ ہوگی اور زمین کا فیصلہ ہوا میں ہوگا، لیکن اس ہوائی تاخت کی کامیابی میں سب سے بڑا مانع ایک تو جہازوں کا شور ہے جو بہت دور سے راز کو افشا کر دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ ان کے مقابلہ میں دوسرے ہوائی جہازوں کو اُڑانے کے لئے بھی اتنا وقت درکار ہوتا ہے کہ تباہیوں کو نہیں روکا جا سکتا ۔ لیکن ان مصنوعی جنگوں کی نمائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دشواریاں بھی دور ہوکر رہیں گی ۔ کیونکہ بعض ماہرینِ فن نے ایسے جہاز پیش کئے جن میں شور بالکل نہیں ہوتا اور برطانیہ کی وزارتِ بحری نے ایسے جہازوں کا بغور مطالعہ کیا جنکی آواز ۲۵۰۰ فٹ سے آگے نہیں جاتی ۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی انجینیروں نے اس کا بھی امکان ظاہر کیا ہے کہ وہ چھ چھ ہزار فٹ کے بلند مینار اس وضع کے طیار کر سکتے ہیں جہاں متعدد ہوائی جہاز رہ سکیں اور ضرورت کے وقت وہیں سے بالا بالا اُڑ کر دشمنوں کے جہازوں پر بم برسا سکیں ۔

فرانس نے اُڑنے والے دبابہ (Tank) کی بھی نمائش کی تھی ۔ گویا یہ خاص قسم کے ہوائی جہاز ہیں جن میں نہایت سریع چلنے والی توپیں بھی نصب کر دی گئی ہیں، اسی طرح کے اور متعدد آلاتِ حرب پیش کئے گئے جن کا استعمال مستقبل کی جنگ میں کیا جائے گا اور نہیں کہا جا سکتا کہ درندوں کی اس جنگِ ناخن و چنگال میں کون غالب رہیگا اور کون مغلوب، لیکن یہ یقینی ہے کہ شہری آبادی خواہ وہ کسی غالب ملک کی ہو یا مغلوب ملک کی، بکثرت تباہ و برباد ہوگی اور اس طرح آنے والی جنگ کا بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ اس نے سب سے زیادہ کتنے امن پسند شہریوں کو ہلاک کیا ۔

مغرب میں تعیینِ اُجرت کا معیار

جس زمانہ میں ہوور امریکہ کا پریسیڈنٹ تھا، اس کی بیوی نے چھ منٹ کے لئے آؤفشرِ سوت پر تقریر کرنے کے لئے تین ہزار ڈالر لئے

گویا فی منٹ پانسو ڈالر معاوضہ وصول کیا۔

رڈیارڈ کپلنگ مغرب کے مشہور فسانہ نویس سے اس وقت تک جتنا روپیہ کمایا ہے اس کا اوسط فی لفظ ایک شلنگ (تقریباً بارہ آنہ) پڑتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی شخص نے اس کے پاس ایک شلنگ کا منی آرڈر بھیجکر استدعا کی کہ ایک لفظ خط میں لکھ کر اسکو بھیجدیا جائے کپلنگ نے منی آرڈر وصول کر کے ایک کارڈ پر لفظ (Thanks) لکھ کر اس کے پاس بھیجدیا۔

آرنلڈ بنٹ کی سالانہ آمدنی سولہ ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے، برنارڈ شا اس سے بھی زیادہ یعنی ۲۰ ہزار پونڈ سالانہ کماتا ہے۔ نوبل کوارڈ کی عمر جب ۲۷ سال کی تھی تو اس کی آمدنی ۵۰ ہزار پونڈ سالانہ تھی۔ مسز اسکوئتھ نے اپنے حالات زندگی لکھ کر تیرہ ہزار پونڈ میں فروخت کئے اور مسٹر ہچنسن کو اس کے مشہور ناول (If winter comes) کا معاوضہ ۳۰ ہزار پونڈ ملا۔

حال ہی میں مسٹر لائڈ جارج کو ایک پبلشر نے ۹۰ ہزار پونڈ پیش کئے کہ وہ اندازاً تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب لکھدے سر آرتھر کنین ڈائل کو بارہ افسانوں کے لئے ۹ ہزار پونڈ دئے گئے۔ مسٹر چرچل کو بعض مضامین کا معاوضہ بحساب ۲۵۰ پونڈ فی مضمون دیا گیا۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے اہل قلم کا ذکر کیا کیا جائے جبکہ یہاں ایک گریجویٹ کی قیمت میں روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے سُنا ہے کہ کسی دفتر میں کلرکوں کے لئے یہ نوٹس لکھ کر لگایا گیا کہ "اُن کی تنخواہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے اس کے اعلان کی ضرورت نہیں"۔ یہ نوٹس دیکھ کر ایک کلرک نے کہا کہ "ہم خود ہی شرم سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتے، اس نوٹس کی ضرورت ہی کیا تھی"

بعض خرافات کی حقیقت

اس وقت ترقی عقل وعلم کے زمانہ میں بھی بعض عقاید ایسے پائے جاتے ہیں جو عہد قدیم کی واہمہ پرستی کی یادگار ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی نعل کو بہت مبارک چیز سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کو راستہ میں پڑی ہوئی مل جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سارا دن بلکہ پورا سال خوشی میں بسر ہو گا بعض لوگ تفاول کے طور پر اسے دروازہ پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔ ہر چند لوہے کی دریافت کو صرف ۳ ہزار سال کا زمانہ ہوا ہے اور آہنی چیزوں کی ساخت انسان کے عہد تمدن کی یادگار ہے، خصوصاً گھوڑے کی نعل کہ یہ تو بہت بعد کی چیز ہے، لیکن اس عقیدہ کا تعلق یقیناً عہد وحشت سے ہے۔

نعل کی شکل ہلال کی سی ہوتی ہے اور دنیا کی تمام وحشی قومیں رویت ہلال پر اظہار مسرت کیا کرتی تھیں، چونکہ چاندنی راتوں میں وہ درندوں اور دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رہتے تھے، چنانچہ لوہے کی دریافت سے قبل ہڈی یا لکڑی کے چاند بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی برکت سے وہ ردّ بلا کر سکیں گے۔ جب گھوڑے کی نعل بننے لگی تو وہ ہڈی یا لکڑی کے چاند بنانے سے بے نیاز ہو گئے اور اس کو ان کی جگہ سمجھا جانے لگا۔

بعض قوموں میں دستور ہے کہ جب بچہ کا دانت ٹوٹتا ہے تو اسے کسی بڑے درخت کی جڑ میں دفن کر دیتے ہیں، اس سے ان کا

مدعا یہ ہوتا ہے کہ بچے بھی قوت و رفعت میں اس درخت کے برابر پہونچ جائے ۔ ہندوستان میں عورتیں چوہے کے بل میں ڈالدیتی ہیں تاکہ ویسے ہی تیز اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت دانت بچے کے بھی نکلیں ۔ بعض قبائل میں یہ رواج اب بھی چلا آرہا ہے کہ جب لڑکا جوانی پر آتا ہے تو اس کے ایک دو دانت توڑ ڈالتے ہیں ۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے ، کیونکہ اُس وقت جب کوئی نوجوان قبیلہ میں داخل ہونا چاہتا تھا تو اسکے ایک دو دانت توڑ کر دیکھا جاتا تھا کہ اس میں تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے یا نہیں ۔

اہل مغرب کے نزدیک ۱۳ کا عدد بہت منحوس سمجھا جاتا ہے ، یہاں تک کہ بعض ہوٹلوں میں اس نمبر کا کوئی کمرہ ہوتا ہی نہیں ۔ بارہ نمبر کے بعد چودہ نمبر ڈالدیتے ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ (۱۳) ایسا ہندسہ ہے کہ وہ پوری طرح تقسیم نہیں ہوسکتا اور عہد وحشت کے لوگ چونکہ ریاضی سے بالکل نابلد تھے اس لئے کسر وغیرہ سے بہت گھبراتے تھے ، اور وہی احتراز ابتک چلا آرہا ہے ۔

انگریزی زبان کی ایک مثل ہے کہ بلی ۹ جانیں رکھتی ہے ۔ یہ واہمہ پرستی قدیم مصریوں کی یادگار ہے جو بلّی کی بڑی عزت کرتے تھے اور اسی جذبۂ احترام کی بناپر بجائے ایک کے اُس سے ۹ جانیں منسوب کرتے تھے ، ان کے یہاں ایک دیوی بھی تھی جس کا سر بلّی کا سا ہوتا تھا اور اس کو بھی نوجانوں والی دیوی سمجھا جاتا تھا ۔ الغرض اہل مغرب میں یہ خیال و اعتقاد مصر سے آیا ہے ۔

عورتوں میں آئینہ کا ٹوٹ جانا بُری فال سمجھا جاتا ہے ۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے ۔ قدیم انسان سمجھتا تھا کہ اس کا سایہ یا عکس بھی اسی کی ہستی کا ایک جزو ہے اور اس لئے اس کی ایذا خود روح انسانی کی ایذا ہے ۔

رات کو کتے کا رونا بھی منحوس بات سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ علامت ہے کسی کے موت کی ۔ اس کا تعلق بھی اہل مصر کی واہمہ پرستی سے ہے ، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتۂ موت کتے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے ۔

بعض قوموں میں دستور چلا آتا ہے کہ مہمان کے سامنے سب سے پہلے نمک پیش کیا جاتا ہے ، اس کا تعلق بھی انسان کے عہد جاہلیت سے ہے ، کیونکہ زمانۂ قدیم میں نمک نہایت نادر چیز سمجھا جاتا تھا اور اتفاق سے اگر انھیں کبھی میسر آجاتا تھا تو اس کو نہایت قیمتی چیز سمجھ کر بڑی احتیاط سے صرف کیا جاتا تھا ۔ پھر چونکہ مہمان کے سامنے بہترین چیز پیش کرنے کا دستور ان میں بھی تھا ، اس لئے سب سے پہلے نمک ہی پیش کیا جاتا تھا اور وہی رسم ابتک بعض قوموں میں چلی آتی ہے ، چنانچہ ہندوستان میں بوہرہ قوم اس کی بہت پابند ہے ۔

جاسوسی کی جدتیں

آیندہ جنگ کے امکانات کا اندازہ صرف آلات حرب کی طیاریوں ہی سے نہیں ہوتا بلکہ دوسری سرگرمیوں سے بھی ہوسکتا ہے ۔ مثلاً گزشتہ ۲۲ مہینوں میں تقریباً چھ سو آدمی جاسوسی کرتے ہوئے ممالک مغرب میں گرفتار کئے گئے اور کہا جاتا ہے کہ اندازاً دس ہزار ماہر فن جاسوس اسوقت یوروپ میں کام کر رہے ہیں ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت بے اعتباریاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور خود حلیف قوتوں کو بھی ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہیں رہا ۔

اس جگہ مختصراً یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاسوسوں کی جماعت اپنے ملکوں کو اطلاعات پہونچانے کے لئے کیسے کیسے عجیب طریقے استعمال کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے جاسوس اپنی خفیہ اطلاعات اُبلے ہوئے انڈوں کے ذریعہ سے روانہ کرتے ہوئے پائے گئے۔ یہ انڈے معمولی انڈوں کے ساتھ ٹوکروں میں رکھ کر روانہ کئے جاتے ہیں لیکن منزل مقصود پر پہونچکر جب ان کا چھلکا علٰحدہ کیا جاتا تھا تو اندر منجمد سفیدی پر سیاہی مایل بھورے رنگ کی تحریر نظر آتی تھی۔ اول اول تو یہ نکتہ کسی طرح سمجھ میں نہ آیا کہ چھلکے کے نیچے تحریر کیونکر منقوش ہوئی لیکن بعد کو بہت تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ اگر شکر اور پھٹکری کے پانی سے چھلکے کے اوپر لکھ دیا جائے تو اندر سفیدی تک پہونچکر ایک خاص رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اوپر کوئی علامت تحریر کی نظر نہیں آتی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب طریقہ یہ ہے کہ دھاگوں سے بنے ہوئے کپڑوں اور کارچوب کئے ہوئے رومالوں کے ذریعہ سے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ یہ پہلے سے طے ہو جاتا ہے کہ فلاں قسم کے ٹانکے کا مطلب فلاں ہوگا پھر انھیں مقررہ اصول کے مطابق چھوٹے بڑے آڑے ترچھے ٹانکے دیکھ کر مفہوم اخذ کر لیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک ایسا شخص جاسوسی کی علت میں گرفتار کیا گیا جو پرانے ٹکٹوں کے جمع کرنے کا شایق تھا اور اس کے البم میں سوائے استعمالی ٹکٹوں کے اور کچھ نہ تھا لیکن اسکی ترکیب یہ تھی کہ مختلف بندرگاہوں سے مختلف قسم کے ٹکٹ لفافہ میں بند کر کے اپنے ملک کو روانہ کیا کرتا تھا اور اس میں رمز یہ تھا کہ جس بندرگاہ سے خط پوست کیا جاتا تھا وہاں کے جہازوں کی تعداد اور ان کی قسموں کا پتہ ٹکٹوں کی تعداد اور قسموں سے لگایا جاتا تھا چنانچہ ایک بار اس نے تین ٹکٹ ما نٹی نگرو کے، دو پیرو کے اور چار جزیرۂ چلی کے بھیجے اس سے مطلب یہ تھا کہ فلاں بندرگاہ پر تین بڑے جنگی جہاز دو چھوٹے اور چار ہلکے کروزر موجود ہیں۔

دن کی روشنی میں تحت الاحمر (Infra - red) شعاعوں کے ذریعہ سے میلوں تک خبر پہونچائی جا سکتی ہے۔ ان شعاعوں کو ایک خاص شیشے کے ذریعہ سے محسوس کر کے ان کی اطلاعات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رات کے وقت چمنی کے اندر اس لمپ کو رکھکر ہوائی جہازوں کو بھی اطلاعات بہم پہونچائی جا سکتی ہیں۔

حال ہی میں جب جمعیت اقوام کے اجلاس جنیوا میں ہو رہے تھے اور جنگ چین و جاپان کے سلسلہ میں منچوریا کا قصہ درپیش تھا تو جاپانی جاسوس ہوٹلوں کے ملازموں کو بڑا بڑا انعام دیکر نوکریوں کی ردی حاصل کرتے تھے اور اس طرح بہت سی خفیہ قراردادیں انھیں معلوم ہو جاتی تھیں۔

ایک عورت کسی سفیر کے یہاں ملازم تھی اور اس کا کام کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ صاف کرنا تھا، جسوقت وہ باہر جاتی تھی تو اسکے کپڑے وغیرہ اچھی طرح دیکھ لئے جاتے تھے لیکن باوجود اس تمام احتیاط کے وہ سفیر کے یہاں کی بہت سی خبریں باہر پہونچا دیتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ جب کھڑکی کو رومال سے صاف کرتی تھی تو دور کسی بلند جگہ پر ایک آدمی کھڑا ہو کر دیکھا کرتا تھا اور یہ ہاتھوں کی مختلف جنبشوں سے اطلاعات بہم پہونچایا کرتی تھی۔

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جرمن جاسوس اپنے ساتھیوں کو جو فرانس میں موجود تھے رسایل موسیقی کے ذریعہ سے اطلاعات

بہم پہونچاتے تھے۔ ان رسالوں میں صرف موسیقی کے نشانات ہوتے تھے لیکن ان سے مدعا کچھ اور تھا۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ ان میں سے ایک شخص کی ڈاک کی جانچ کی گئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے پاس ہر ہفتہ جرمنی سے موسیقی کا ایک رسالہ آتا ہے تو شبہ پیدا ہوا اور آخر کار پتہ چلا کہ ہفتہ وار جو رسالہ بھیجا جاتا ہے اس کا ٹائٹل تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن گیت ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔

ایک بار کوئی جاسوس گرفتار کیا گیا جو ایک نقاش کی حیثیت سے مختلف قسم کی تیتریاں پکڑ پکڑ کر انکی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ یہ تیتریاں پکڑنے کے بہانے سے اونچے اونچے پہاڑوں پر پہونچ جاتا اور وہاں سے قلعوں کی اندرونی حالت اور ان کی جنگی طیاریوں کی اطلاع تیتریوں کے نقش و نگار کے ذریعہ سے اپنے ملک کو پہونچاتا تھا۔

جرمن جاسوسوں نے یہ ترکیب بھی کی تھی کہ بعض پیغامات مچھلیوں کے پیٹ میں رکھدیتے تھے اور انھیں دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیتے تھے دوسری بندرگاہ پر ان مچھلیوں کو پکڑ کے ان اطلاعات کو حاصل کرلیا جاتا تھا۔

چمنیوں کے دھوئیں کے ذریعہ سے بھی خفیہ اطلاعات پہونچائی جاتی ہیں۔ دھوئیں کی کمی زیادتی اور مختلف وقفوں سے ان کا نکلنا، خاص خاص اشاروں کو ظاہر کرتا ہے۔

نظر نہ آنے والی سیاہی میں (Sympathetic ink) کا محلول خاص چیز ہے۔ اس سے جو عبارت لکھدی جاتی ہے وہ یونہی تو نظر نہیں آتی لیکن نور البنفشی شعاعیں ڈالنے سے فوراً نمودار ہوجاتی ہے۔

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہوگیا تھا لیکن اب پھر شروع کردیا گیا ہے اور اپریل تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہوگئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کردی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرالینا رعایتی قیمت سے فائدہ اٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دو چند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اردو کے اس صنف انشاء سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

مینیجر نگار

ذوق کا مذہب

تھوڑے دن ہوئے، مجھے ایک خاص وجہ سے ذوق کے مذہب کے متعلق تجسس کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے سب سے پہلے آبِ حیات سے استفادہ کیا، کیونکہ آزاد مرحوم سے زیادہ شیخ کا کوئی راز دار نہ تھا۔ اور آبِ حیات میں جس شرح و بسط سے انھوں نے اپنے اُستاد کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس سے بعض حلقوں میں تو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اس کتاب کی تصنیف کی علت غائی صرف شیخ کی ذات اور شاعری کو اُجاگر کرنا ہے۔ مگر جب میں نے آبِ حیات کی ورق گردانی کی۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب وہاں یہ سطور دیکھیں :-

"فقراء اور بزرگانِ دین کے ساتھ انھیں ایسا اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علماء اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہیں کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔" (صفحہ ۴۶۶)

مانا کہ ان کی صلح کل طبیعت کی وجہ سے "ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا" مگر کیا یہ حال حضرت آزاد پر بھی نہ کھلا۔ کہ ان کا کیا مذہب ہے ان کا فرض تھا کہ اس باب میں اپنے علم کے مطابق لوگوں تک صحیح واقفیت پہونچا دیتے اور تذکرہ نگاری کا حق ادا فرماتے۔ بعینہٖ یہی الفاظ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق کے دیباچہ میں بھی لکھے ہیں۔ (صفحہ ۲۶)

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں خود دیوانِ ذوق کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔ اگرچہ یہ طریقہ نہایت غیر یقینی اور شبہات سے پُر ہے۔ مگر چونکہ اسکے علاوہ کوئی اور ماخذ نہ تھا (یا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں) اس لئے مجبوری تھی۔ دیوان کھولتے ہی پہلی غزل میں یہ اشعار نظر آئے :-

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا ۔۔۔ الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا
رہے نامِ محمد لب پہ یارب اول و آخر ۔۔۔ اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا
محبت اہلِ بیتِ مصطفیٰ کی نورِ برحق ہے ۔۔۔ کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا
دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحابِ پیمبر نے ۔۔۔ چراغِ راہ ہے اکرامِ اصحابِ کرم میرا
کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا ۔۔۔ کہ ہے دُرِ نجف ہو کر چمکتا دُرِ یتیم میرا
رہیگا دانہ افشاں مزرعِ امیدِ بخشش میں ۔۔۔ غمِ آلِ نبی سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا
شبہ بغداد کا خطِ غلامی ذوق رکھتا ہوں ۔۔۔ نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

[redacted]

اس ایک غزل میں جناب شیخ نے حمد و نعت کے دو شعروں کے علاوہ اہلِ بیت اور حضرت علی اور صحابہ کرام کی شان میں چار اشعار کہے ہیں۔ مقطع میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کا ذکر ہے اس سے مولانا آزاد کے مندرجہ صدر کلام کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان کو بزرگانِ دین سے اعتقاد اور وہ علما سلف کا بہت ادب کرتے تھے۔

اہلِ بیت اور خصوصاً شہیدِ کربلا کے متعلق انھوں نے بعض اور جگہ بھی لکھا ہے۔ اور ان کی محبت کو ذریعہ سعادت قرار دیا ہے فرماتے ہیں:۔

شعر
حُبِّ حسین ذوقؔ وہ شے ہے کہ جس سے حُر | تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

ایک رباعی میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں کا ذکر دیکھئے کس والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔

سبطین نبی یعنی حسن اور حسین | زہرا اور علی کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لئے | اے ذوقؔ لگا آنکھوں سے ان کے نعلین

ایک قصیدہ کو جو جناب سید عاشق نہال صاحب کی مدح میں تحریر فرمایا ہے، اپنے متعلق اس دعا پر ختم کیا ہے۔

نکلے ہے صبح حشر تو رنگ اس کا جز شفق
ہو سرخ ذوقؔ سے محمد کی آل سے

ان سب اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں حضرت علی اور ان کے اولوالعزم صاحبزادوں سے خاص وابستگی تھی اور ان کا رجحان بلاشبہ "تفضیلیت" کی طرف تھا۔ مگر جیسا کہ ان کے سرنامہ کی غزل سے عیاں ہے۔ انھیں غالی شیعوں کے مانند دوسرے صحابہ کبار سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ وہ انھیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور حامیانِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان کا مذہب وہی تھا جو عام اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ وہ سب صحابہ رسول کو ذکرِ خیر سے یاد کرتے ہیں۔ مگر اس میں صرف اتنا اضافہ تھا کہ وہ تفضیلی تھے انھیں حضرت علی سے خاص محبت نظر آتی ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے پچھلے دنوں حضور نظام دکن نے اپنے ایک اعلان میں اپنے مذہب کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حنفی سنی ہوں البتہ تفضیلیت سے ممتاز ہوں، حضرتِ ذوقؔ بھی ایک رباعی میں حضرت علی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اعلیٰ ہے علی کی امامت کا مقام | رکھتے ہیں خبر اس سے یہاں خاص نہ عام
جو لوگ صفِ اول میثاق میں تھے | پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا امام

اس کے باوجود وہ پہلے تینوں خلفاء اسلام کے حامیِ شریعت اور عابد و مرتاض ہونے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے | خوشی تا حاجیوں کو ہو سفرِ کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے | نماز اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیرِ منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر ہو

اس سے ظاہر ہے کہ شیخ مرحوم کا عقیدہ دوسرے سُنی حضرات سے الگ نہیں، انھیں خلفائے اربعہ میں سے ہر ایک سے محبت تھی وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے اور ان کی خدماتِ دینیہ کی تعریف کرتے تھے۔ ہاں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انھیں حضرت علی سے ان کے زہرا بتول کے شوہر اور حسنین کے والد بزرگوار ہونے کی وجہ سے خاص محبت تھی۔ مگر اس میں اتنا غلو نہ تھا کہ وہ دوسرے صحابہ کو غاصب قرار دے کر ان پر تبرہ بازی شروع کر دیں۔ وہ حُبِ علی کو نور سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر تبرہ کو اس نور میں ظلمت کی آمیزش سے کم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

تم بیٹھے بغل میں ہو رقیب دغلی کی کی گرم بغل ہم نے بھی گورِ بغلی کی
اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت کیا کام تبرہ کو محبت میں علی کی

الغرض میں نے دیوان ذوق کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت ذوق شیعہ نہ تھے۔ جن لوگوں کو یہ شک گزرا ہے کہ ذوق شیعہ تھے۔ مگر بہادر شاہ کے سُنی ہونے کے سبب سے وہ کھل کر اپنی شیعیت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے تقیہ کیا۔ میرے خیال میں ان صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی تائید میں ایک اور امر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے تعلقات شیخ مرحوم سے نہایت گہرے تھے اور آزاد ان کے ایسے شاگرد رشید پیدا ہوئے، کہ اگر وہ نہ ہوتے تو غالباً آج کوئی دیوان ذوق کا نام نہ جانتا۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اس خاندان سے ان کے معتقدات پوشیدہ رہے ہوں۔ اس لئے اگر اس پر بھی حضرت آزاد نے اپنے اُستاد کے حالات میں اس موضوع کو تشنہ چھوڑ دیا۔ تو اس کا کوئی خاص سبب ہونا چاہئے۔ دیوان ذوق کی ترتیب یا آبِ حیات کی تالیف کے وقت انھیں بہادر شاہ کی سیاست کا خوف نہ تھا کہ وہ تقیہ پر مجبور ہوتے۔ بس اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ ان کے اُستاد کا عقیدہ ان کے عقیدہ سے مختلف تھا۔ جس کا اظہار انھیں ناپسند تھا۔ خاندان آزاد کی شیعیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اگر ذوق بھی شیعہ ہوتے تو آزاد کے لئے مقام فخر تھا کہ انھیں بھی اپنا ہم نوا ظاہر کرتے۔ بہرحال اس باب میں ان کی خاموشی اور ابہام معنی خیز ضرور ہے۔

کیا آپ اس مسئلہ پر کچھ مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی معاصر کے قول یا کسی اور ماخذ سے آپ اور واقفیت مہیا کر سکیں۔ والسلام

مالک رام (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)

(نگار) آپ نے جس انداز سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے، اس سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ذوق کے عقائد مایل بہ تفضیلیت تھے، اور خلفاء ثلٰثہ کے سب و شتم کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ "حنفی" تھے اُصولاً درست نہیں۔

میں اس موقعہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا کہ حضرت علی کو افضل سمجھنے کا کیا مفہوم ہے اور محض عقیدۂ "افضلیت" ہی تشیع کے لئے کافی ہے یا نہیں، لیکن اس امر کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ شخص جو جناب امیر کی افضلیت کا قایل ہے لیکن خلفاء ثلٰثہ کے سب و شتم کو اچھا نہیں سمجھتا، اس کو بجائے حنفی تفضیلیہ کے

[redacted]

"شیعہ غیر تبرائی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔

آپ کہ دیوان کھولتے ہی جو غزل ذوق کی نظر پڑتی ہے، اس میں یقیناً صحابہ کا ذکر ہے، لیکن "خلفائے ثلثہ" کا تو نہیں صحابہ کی جماعت میں خلفاء کے علاوہ اور بھی تو بہت سے حضرات شامل تھے ـــ رہ گیا "شہ بغداد" کا ذکر سو ممکن ہے کہ صرف بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے ہو۔

رہا یہ امر کہ اگر ذوق شیعہ ہوتے تو آزاد ضرور اس کا اظہار کرتے، سو اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ ذوق، آزاد کی طرح کے غالی شیعہ نہ تھے اس لئے انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے ضعیف الاعتقاد شیعہ کو "شیعہ" کہا جائے۔

بہرحال یہ روایات ہیں جو آپ کے نتیجہ تحقیقات پر وارد ہو سکتے ہیں۔ لیکن خود میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ وہ شیعہ نہ تھے اور ان کی "تفضیلیت" محض تقلیدی یا روایتی بات تھی جو صوفیہ کے اثر سے ہندوستان کے اہل تسنن میں رائج ہوئی اور جس کا تعلق "اہل تشیع" کے عقیدۂ افضلیت علی سے کوئی نہیں ہے۔

باب الاستفسار

مہدوی جماعت اور امام مہدی

(جناب محمد ابراہیم صاحب - اعظم جاہی روڈ - حیدرآباد دکن)

یہاں حیدرآباد میں ایک جماعت مہدویوں کے نام سے پائی جاتی ہے - براہ کرم مطلع فرمائیے کہ ان کی کیا اصلیت ہے اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے - اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالئے کہ امام مہدی کا ظہور کیا حقیقت رکھتا ہے۔

(**نگار**) (۱) جونپور میں ایک صاحب سید محمد مہدی دسویں صدی کے آخر میں پائے جاتے تھے اور یہ اپنے آپ کو "مہدی موعود" کہتے تھے ان کی یہ تبلیغ چونکہ گجرات میں شروع ہوئی تھی اس لئے احمد آباد و دیگر بلاد گجرات میں ان کے ارادتمند معقول تعداد میں پیدا ہو گئے - ان کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ وہ حامل معجزات بھی تھے، یہاں تک کہ مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے اور گونگے بہرے کو اچھا کر دیتے تھے۔

کچھ عرصہ تک تو یہ جماعت بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے عقاید کا اعلان کرتی رہی، لیکن شاہ مظفر اول، والی گجرات نے سخت گرفت شروع کی اور ان میں سے بعض کو پکڑ کر قتل بھی کر دیا - اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی جب وہ احمد آباد کا گورنر تھا ان کو سزائیں دیں - نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اس کے عادی ہیں۔

اسی جماعت کے افراد بمبئی، دکن، سندھ، گجرات اور کہیں کہیں شمالی ہند میں بھی پائے جاتے ہیں - ان کا عقیدہ ہے کہ سید محمد مہدی، مہدی موعود اور آخری امام تھے - شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں سے علیحدہ ہیں۔

(۲) لفظ مہدی جس کے معنے "ہدایت یافتہ" کے ہیں، کلام مجید میں تو کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن یوں احادیث و تاریخ میں کثرت سے نظر آتا ہے - لغوی معنی میں اس کا استعمال تو اکثر لوگوں پر ہوا ہے، چنانچہ خلفاء اربعہ کو بھی "الراشدون المہدیون" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اہل تسنن نے حضرت علی کا ذکر بھی "ہادیا و مہدیا" کے الفاظ سے کیا ہے اسی طرح جریر نے حسان بن ثابت کو مہدی کے لقب سے پکارا اور امام حسین کو سلیمان "مہدی ابن مہدی" کہتا تھا - یہاں تک کہ خلفاء بنی امیہ کے نام کے ساتھ بھی ان کے ہوا خواہوں نے مہدی کا لفظ

اضافہ کیا۔ الغرض لغوی معنی میں اظہار عزت و احترام کے لئے یہ لفظ بہت سے امراء و خلفاء کے لئے استعمال کیا گیا، لیکن مہدی موعود کو یا مہدی منتظر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ حیثیت سب سے پہلے جناب حسین کے قتل کے بعد محمد الحنفیہ کو دی گئی جو جناب امیر کے صاحبزادہ (دوسری بیوی سے) تھے — ان کو مختار ابی ابن عبید نے دعویدار خلافت کی حیثیت سے پیش کر کے "مہدی ابن الوصی" کے لقب سے مشہور کیا۔ ہرچند انھوں نے خود اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا لیکن اس طرح ایک فرقہ کیسانیہ کی بنیاد ضرور پڑ گئی اور یہیں سے سلسلۂ امامت میں شیعی جماعت کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جس نے محمد الحنفیہ کی امامت کو تسلیم کر کے انھیں مہدی منتظر سمجھا اور دوسرا اثنا عشری گروہ جو محمد الحنفیہ کی امامت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ خاندان نبوت سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ مہدی کا عقیدہ ان کے یہاں بھی ہے لیکن اس طرح کہ وہ چھپے ہوئے ہیں اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے۔

چونکہ اس وقت دعویداران خلافت کی کمی نہ تھی اور نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعتیں ابھر رہی تھیں اس لئے اپنی حقانیت کے ثابت کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش کرتی تھی جس کا تعلق فرمان رسول سے ہو اور اسی سلسلہ کی چیز ظہور مہدی کا بھی مسئلہ تھا۔

اہل تسنن کے یہاں ظہور مہدی کا عقیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور بخاری و مسلم میں کسی جگہ مہدی کا ذکر نہیں ہے۔ عقاید کی کتابوں میں بھی کسی جگہ اس سے بحث نہیں کی گئی، البتہ دجال کا ظہور اور نزول عیسیٰ کا بیان ضرور پایا جاتا ہے جس کا مہدی موعود سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن خلدون نے تاریخ کے مقدمہ میں اس مسئلہ میں نہایت محققانہ گفتگو کی ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ ابتدائی حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں پائی جاتی اور یہ خیال بعد کو پیدا ہو کر وضع احادیث کا سبب بنا۔ ابن خلدون نے ۲۴ احادیث اس موضوع کی جمع کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔

بعض روایات کی تفسیر سے جو حالات مہدی موعود کے معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں کہ وہ آل فاطمہ سے ہوں گے، ان کا نام وہی ہوگا جو رسول کا ہے اور ان کے باپ کا نام بھی وہی ہوگا جو رسول اللہ کے والد کا تھا، خلق میں رسول اللہ کے مشابہ ہوں گے، چندیلے بال صاف ہوں گے، ناک اونچی اور آگے کو جھکی ہوئی ہوگی۔ جس وقت وہ ظاہر ہوں گے، دنیا میں فتنہ و فساد پھیلا ہوگا یہاں تک کہ اگر کوئی اللہ کا نام بھی زبان سے نکالے گا تو مار ڈالا جائے گا۔ یہ آ کر فتنہ و فساد کو رفع کریں گے اللہ کا نام بلند کریں گے، عدل و انصاف کو رواج دیں گے اور مسلمانوں پر ایسا زمانہ خوشحالی کا آئے گا کہ اس سے قبل کبھی نہ آیا تھا، اگر کوئی شخص ان سے کہیگا کہ "اے مہدی مجھے کچھ دو" تو وہ اسکے دامن میں زر و دولت بکھیر دیں گے۔

یہ حالات احادیث میں نہیں ہیں بلکہ مفسرین احادیث نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ الغرض اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کے ظہور کو تسلیم نہیں کیا جاتا البتہ اثنا عشری طبقہ اس کا قائل ہے اور ان کی آمد کا منتظر۔

بات یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کی جتنی احادیث ہیں وہ کسی طرح چنداں قابل لحاظ نہیں کیونکہ "علم غیب" کے جاننے سے خود رسول اللہ نے صراحتہً انکار کیا ہے اور اس نوع کی روایات صرف پروپگنڈا کے لئے وضع کرلی گئی ہیں۔

برتھ کنٹرول یا ضبطِ تناسُل

(جناب عبدالحی صاحب - کٹرہ - الہ آباد)

اس وقت برتھ کنٹرول کے متعلق دنیا میں زیادہ زور دیا جا رہا ہے کیا ہندوستان کے لئے اس پر عمل کرنا مناسب ہے اور شرعاً اس کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے - اس تحریک کا اصل مقصد کیا ہے؟

(نگار) جس حد تک جذبات یا عواطف کا تعلق ہے، انسان و حیوان دونوں میں زیادہ فرق نہیں، لیکن جو چیز انسان کو عام حیوانات سے جدا کرتی ہے وہ اس کی عقل و فراست ہے، یعنی ایک حیوان اس چیز سے معرا ہے اور انسان کی تمام ترقیاں اسی سے وابستہ ہیں - پھر چونکہ یہ دور، عقل و فراست کا دور ہے اس لئے جذبات و عواطف کے مقابلہ میں زیادہ تر اسی کے احکام پر عمل کیا جاتا ہے اور مسئلۂ "ضبط تناسل" بھی منجملہ اُن چند مسائل کے ہے جن میں جذبات پر عقل و مصلحت کو ترجیح دیجاتی ہے -

اب مختصراً موافق و مخالف دونوں جماعتوں کے دلایل بھی سُن لیجئے:-

ضبط تناسل کے محرکین کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جس طرح انسان تمام خواہشات میں عقل کا پابند ہے، اسی طرح خواہش تناسل میں بھی اس کو مصالح معاشرت و تمدن کا پابند ہونا چاہئے - غذا کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امر کی احتیاط رکھتا ہے کہ نامناسب یا زیادہ غذا سے اس کی صحت کو نقصان نہ پہونچے، اسی طرح تناسُل کے باب میں بھی مصلحت خاندانی، صحت ذاتی، منشاءِ اقتصاد اور تربیت صحیحہ کا خیال رکھنا ضروری ہے -

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ضعیف العقل ہیں، مجہول الاعضاء ہیں، اور نہایت خراب صحت رکھتے ہیں، اس لئے اگر ان کو افزایش نسل کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ نوع انسانی میں بیکار و لایعنی افراد کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اس سے دنیا کی اقتصادی حالت اور ملکی و ملی ترقی کو جتنا نقصان پہونچ سکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں -

تیسری دلیل یہ ہے کہ کرۂ زمین محدود مساحت رکھتا ہے اور انسان کا سلسلۂ تناسل غیر محدود ہے، اس لئے اگر ضبط تناسُل سے کام نہ لیا گیا تو ایک وقت آئیگا، جب کثرت آبادی سے (اور آبادی بھی وہ جس میں زیادہ حصہ ناکارہ افراد کا ہے) زمین پر آزادی سے سانس لینے کی جگہ باقی نہ رہیگی اور لامحالہ حرب و استعمار کے مصائب اور بڑھیں گے -

چوتھی دلیل یہ ہے کہ کثرت تناسُل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدور جماعت کے افراد بڑھیں گے، اس لئے لازماً اُن میں تصادم و تزاحم پیدا ہوگا اُجرت میں کمی ہوگی اور معیشت و معاشرت خراب ہو کر تمدن کو سخت نقصان پہونچے گا، برخلاف اس کے اگر ان کی تعداد کم ہوگی تو

اُبھر تیں بڑھیں گی اور ان کی معاشرت بلند ہو کر نظام تمدن پر اچھا اثر پڑے گا۔

مخالفین کی دلیل یہ ہے کہ ضبط تناسل ارادۂ خداوندی اور منشاءِ فطرت کے خلاف ہے اور اس حجت کو زیادہ تر اہل مذاہب پیش کرتے ہیں، کیونکہ انھیں کو افزائش نسل کا زیادہ شوق ہے اور اپنے جذبۂ شہوانی کو ضبط کرنے میں وہی سب سے زیادہ کمزور واقع ہوئے ہیں چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جہاں کیتھولک عیسائیوں کی جماعت زیادہ ہے، وہاں بہ نسبت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نسل زیادہ بڑھ رہی ہے۔

مادی علماء کا کہنا ہے کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی افزائش نسل کی بنا پر یہ ہے کہ جن طبقوں میں اولاد کی کمی کی شکایت ہے وہ اونچے اور متوسط طبقے ہیں اور انھیں طبقوں پر ملک و قوم کی علمی و دماغی ترقیاں منحصر ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ان طبقوں میں افراد کی کمی کو ہمیشہ طبقۂ عمال پورا کیا کرتا ہے یعنی رفتہ رفتہ نیچے طبقہ کے لوگ متوسط و اعلیٰ طبقہ تک پہونچ جاتے ہیں، اس لئے اگر اس جماعت میں ضبط تناسل کا رواج ہو گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ متوسط اور اعلیٰ طبقے دونوں آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گے اور تمدنی و علمی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچے گا۔

فرانس میں ایک زمانہ تک ضبط تناسل کی اتنی احتیاط کی گئی کہ عرصہ تک اُن کی آبادی بجائے بڑھنے کے برابر گھٹتی رہی، برخلاف اسکے جرمنی نے افزائش نسل کی کوششیں برابر جاری رکھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور آخر کار اس کو بھی ادھر توجہ ہوئی اور اُن خاندانوں کے وظائف مقرر کئے جن میں اولاد زیادہ ہوتی تھی۔

ایک امریکن خاتون مسز سانگر نے ضبط تناسل کی ایک کانفرنس میں اہل امریکہ کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

"اگر امریکہ دوسری قوموں کے لئے اپنے ملک کے دروازے اس لئے بند کرتا ہے کہ اُن کے امتزاج سے یہاں کی نسل خراب ہو جائے گی تو اسے یہ بھی توجہ کرنی چاہئے کہ خود ملک کے اندر ناقابل افراد کی زیادتی نہ ہو در انحالیکہ اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور امریکہ میں بیماروں، مجرموں اور ناقص العقل لوگوں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔"

اسی جلسہ میں انگریزوں کے ایک نمائندہ مسٹر بلانڈ نے کہا کہ:۔

"مدنیت کا مستقبل دنیا کے مسئلۂ آبادی حل کرنے پر موقوف ہے یعنی یہ کہ ہم کو دنیا کی لغو و ناکارہ آبادی زہریلی گیس کے ذریعہ سے کم کرنا پڑے گی یا ضبط تناسل سے۔ اگر آج کرۂ عطارد کا بسنے والا کوئی فرد کرۂ ارض پر آجائے تو وہ ہماری موجودہ حضارت کو دیکھ کر حیران رہجائے کہ یہ کیسی قوم ہے جو ایک طرف نسل بھی بڑھاتی جاتی ہے اور دوسری طرف اُن کے ہلاک کرنے کی بھی فکر میں ہے۔"

اسوقت دنیا میں تقریباً ایک ارب ۸۰ لاکھ نفوس پائے جاتے ہیں اور موجودہ پیداوار غذا کسی نہ کسی طرح ان کے لئے کافی ہو جاتی ہے لیکن اگر ازدیاد نسل کا یہی عالم رہا تو ایک صدی میں موجودہ آبادی دوچند سے زیادہ بڑھ جائے گی (کیونکہ ہر سال پندرہ ملین آبادی بڑھ رہی ہے) اور ضرورت ہوگی کہ کم از کم ۱۰۰ ملین ایکڑ زمین اور قابل زراعت پیدا کی جائے، درانحالیکہ اس کا کسی طرح امکان نہیں، اس لئے لامحالہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ قلت غذا، کثرت امراض اور تصادم باہمی کی وجہ سے مصائب دنیا زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مسٹر ہارلڈ کاکس نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ:۔

"اس تلخ حقیقت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سطح زمین بہت محدود ہے اور انسان کی قوت تناسل غیر محدود۔"

اس لئے اگر نسل کشی کو کم نہ کیا گیا تو ایک دن وہ آئے گا جب انسان ایک ایک انچ جگہ کے لئے باہم کشت و خون پر مجبور ہوگا اور نظام تمدن درہم و برہم ہو جائے گا۔"

بہرحال اس وقت متمدن دُنیا کا میلان زیادہ تر اسی طرف ہے کہ نسل انسانی کو بڑھنے سے روکا جائے اور صرف ایسے افراد کا اضافہ کیا جائے جو صحت جسم و عقل کے لحاظ سے دنیاوی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

ہندوستان میں بھی یہ تحریک روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور ہرچند اس وقت تک کوئی عملی قدم تو اس طرف نہیں اٹھایا گیا لیکن اس خیال کا پیدا ہو جانا ہی دلیل ہے اس امر کی کہ کسی نہ کسی وقت اس پر عمل ہو کر رہیگا۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ یہاں کے لئے یہ تحریک قابل عمل ہے یا نہیں، چنداں دشوار نہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ دُنیا میں جب کبھی کوئی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کا تعلق ہمیشہ ذہن انسانی سے رہا ہے نہ کہ جسم انسانی سے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ کام ہمیشہ "کیفیت و احساس" نے کیا ہے نہ کہ "مقدار و تعداد" نے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ناکارہ افراد کی زیادتی کبھی باعث برکت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بجائے فائدہ کے اس سے مضرت پہونچتی ہے۔

کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اگر ہندوستان کی آبادی بجائے ۳۶ کروڑ کے صرف ۱۸ کروڑ ہوتی تو یہ ملک اس وقت تک اسی غلامی کی حالت میں پایا جاتا۔ یقیناً اس سے بہت قبل بیداری و قوت عمل پیدا ہو جاتی اور اتنے کثیر افراد کو کسی ایک مرکز پر لانے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑتی۔ پھر اسی کے ساتھ اقتصادی دشواریوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ غریب و جاہل، بیمار و ضعیف بے عقل و معتوہ افراد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور عسرت و افلاس اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اس کا چارہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ فطرت پھر ان کو ہلاک کر ڈالے۔ اس لئے اگر افزایش نسل صرف اس لئے ہوتی جاتی ہے کہ ہم بار بار اُن کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہیں تو کیا اس سے زیادہ مناسب یہ نہیں ہے کہ ابتدا ہی سے ہم اس کی احتیاط کریں اور آفرینش و ہلاکت کے اس مسابقت میں بجائے فرشتۂ موت کے ساتھ دینے کے فرشتۂ امن و سکون کی راہ میں آسانیاں بہم پہونچائیں۔

تذکرۂ طوطیانِ ہند

کے نام سے شعر کہنے والی خواتین کا ایک تذکرہ شائع ہو رہا ہے، جس میں شروع سے اس وقت تک کی اردو شعر کہنے والی عورتوں کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہوں گے۔

جو اصحاب اس قسم کا مواد دے سکیں براہ کرم جلد روانہ کر دیں کیونکہ تذکرہ پریس میں جا رہا ہے۔

سید تمکین کاظمی۔ عثمان پورہ۔ حیدر آباد دکن

محبت سے پہلے

ابھی اختر نہ تھا میں مبتلا درد محبت میں
مگر پھر بھی تغیر ہو چلا تھا میری حالت میں

پسند آنے لگی تھیں پُرسکوں تنہائیاں مجھ کو
نہ بھاتی تھیں جہاں والوں کی بزم آرائیاں مجھکو

مجھے دنیا کے ہنگاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی
یہاں کے بے مزہ کاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی

مگر آغوشِ فطرت میں عجب آرام ملتا تھا
مناظر کی محبت میں عجب آرام ملتا تھا

پہونچتا تھا میں پو پھٹنے سے پہلے روز دریا پہ
نمودِ صبح کے منظر کو دیکھوں تاکہ جی بھر کر

فلک پر چودھویں کا چاند جب ہوتا تھا جلوہ گر
تو یہ جی چاہتا تھا باغ میں پھرتا رہوں شب بھر

بوقتِ شام جب شور و شغب معدوم ہوتا تھا
کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا

میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ساون کی سیہ راتیں
میرے دل کو سُنانا چاہتی ہیں راز کی باتیں

ہوائے گلستاں جب ناز سے اٹھلا کے چلتی تھی
تو قلب و روح میں اک دھیمی دھیمی آگ جلتی تھی

تڑپتا تھا میں قمری کی نوائے جانستاں سنکر
کلیجہ تھام لیتا تھا صدائے "پی کہاں" سُنکر

ادائے مست سے جس وقت کوئل کوک اُٹھتی تھی!
تو اُس کے نشتریں نغموں سے دل میں ہوک اُٹھتی تھی

گھٹا گھور گھر کے آتی تھی تو ہر ہر رگ پھڑکتی تھی!
دل سرشار کے ارمانوں کی چھاتی دھڑکتی تھی

وہ ارماں کیا تھے، کیسے تھے یہ مجھکو بھی نہ تھا معلوم
نہ اُن کی ماہیت ظاہر، نہ اُن کا منتہا معلوم

تمناؤں کی اصلیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی
ان ارمانوں کی نوعیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی

یہ حالت تھی کہ میں آٹھوں پہر خاموش رہتا تھا
کسی گہری سہانی فکر میں مدہوش رہتا تھا

تصور کی فضاؤں میں رہا کرتا تھا میں ہر وقت
کسی دریا کی لہروں پر بہا کرتا تھا میں ہر وقت

بنائی تھیں تخیل نے کئی رنگین دنیائیں
کہ جن میں دل، دماغ اور روح عیشِ بیکراں پائیں

میں دن رات آہ اِک موہوم مستقبل میں رہتا تھا
اُسی موہوم مستقبل کے قصے دل سے کہتا تھا

چھپی ہوتی تھی غمگینی مرے رنگیں خیالوں میں
بھری ہوتی تھی رنگینی مرے غمگیں خیالوں میں

مزا آتا تھا بے حد عشق پرورں کے فسانوں میں
محبت کی حدیثوں میں، مجنوں کی داستانوں میں

غنائی شاعری سے ہو گئی تھی گہری دلچسپی
ہوئی پہلے، نہ ہو آیندہ اتنی گہری دلچسپی
کوئی باجا بجاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا
رسیلے گیت گاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا

ستاتی تھی مجھے جس طرح موسیقی، سناؤں کیا
رلاتی تھی مجھے کس طرح موسیقی، بتاؤں کیا

حواس و ہوش پر وارفتگی سی چھائی رہتی تھی
طبیعت پر شباب افروز مستی چھائی رہتی تھی
نشے میں چور سی رہنے لگی تھیں خوابناک آنکھیں
چمکتی تھیں اُمنگوں کی ضیا سے تابناک آنکھیں
مرے سینے میں تھی آباد حسیات کی دنیا!
ہمیشہ مضطرب رہتی تھی یہ جذبات کی دنیا،
جوانی کا لہو میری رگوں میں گنگناتا تھا
بہت پُر کیف لیکن ایک مبہم گیت گاتا تھا

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آفت آنے والی ہے
محبت قہر بن کے روح پر چھا جانے والی ہے

اختر انصاری دہلوی

رقص

رقص کیا ہے؟ "دامنِ امکاں پہ نیرنگِ نشاط
نغمۂ حسن و محبت کا مسلسل ارتباط"
رقص کیا ہے؟ جنبشوں میں داستانِ آرزو
نرم و نازک لوچ میں لپٹی ہوئی سی گفتگو
رقص کیا ہے؟ شوق کا تحلیل ہونا لوچ میں
جوشِ احساسات سے موتی پرونا لوچ میں
رقص کیا ہے؟ نرگسِ مخمور کی بیداریاں
حسنِ خوابیدہ کی لذت کوشیاں ۔ ہشیاریاں
رقص کیا ہے؟ جلوۂ تقدیس کی بیباکیاں
داستانِ خامشی یا خامشی کی داستاں۔
رقص کیا ہے؟ پیکرِ حسن و لطافت کی ادا
ہوش کے انداز میں تعلیمِ پیمانِ وفا
رقص کیا ہے؟ ایک نغمہ حسن میں ڈوبا ہوا
انقلابِ سازِ ہستی کروٹیں لیتا ہوا
رقص کیا ہے؟ ایک تمہیدِ تماشائے بہار
محفلِ اسرار میں تشہیرِ لیلائے بہار
عشوۂ و ناز و ادا کی شاعرانہ گفتگو
یا نگاہِ نیم وا کی ملہمانہ گفتگو
خواہشوں کی بیقراری ولولوں کا اضطراب
کسوتِ مینا میں گویا لرزشِ موجِ شراب
ساغرِ ہستی میں جیسے ارتعاشِ موجِ نور
یا پیاماتِ الوہیت کا الہامی ظہور۔

شمیم بیاوری

"ہمت"

زندگی کی راہ سے انساں بھٹک جاتا ہی جب
منزلوں سے دور تر گھبرا کے تھک جاتا ہی جب

اعتبارِ زندگی مشکل نظر آتا ہے جب
ذرہ ذرہ دشمن و قاتل نظر آتا ہے جب

جب خیالِ راحت و آرام ہوتا ہے گناہ
مانگتا ہے موت کے سائے میں انساں جب پناہ

خستہ کام آتا ہے جب ملاح ساحل کی طرف
شام کو جب لوٹتا ہے اپنی منزل کی طرف

جب ہوائیں ڈال دیتی ہیں اُسے گرداب میں
موت کے ساماں نظر آتے ہیں موجِ آب میں

سب سے پہلے منحرف ہوتا ہے وہ تقدیر سے
کام پھر لیتا ہے اپنی "ہمت و تدبیر" سے

بادبانوں کو سنبھالے ۔ رُخِ ہوا کا دیکھ کر
اور وہ سہمی ہوئی سی اپنی کشتی پر نظر

مست اپنی دُھن میں اور چپو چلانے سے غرض
اپنی اُس چھوٹی سی کشتی کو بچانے سے غرض

رفتہ رفتہ ۔ جاں رُبا موجوں سے ٹکراتا ہوا
یعنی ساحل پر پہونچ جاتا ہے گھبرایا ہوا

"ہمت" ان جذبات کی بیداریوں کا نام ہے
منزلوں کو جن سے حاصل ایک "قربِ تام" ہے

"ہمت" ان بیتابیوں کی سرفرازی کا ہے رنگ
جن سے انسانوں کی "عقلِ تام" ہو جاتی ہی دنگ

"ہمت" ان بیداریوں کے خواب کی تعبیر ہے
"نصرتِ جاوید" جسکی "مستقل تفسیر" ہے

"ہمت" ان بکھرے ہوئے سے حوصلوں کا ہوش ہے
جن سے خود "رعنائی تقدیر" ہم آغوش ہے

"ہمت" ان کیفیتوں کا اجتماعِ خاص ہے
منحصر جن پر جہاں میں قسمتِ غواص ہے

"ہمت" اک انساں کے سر پر جگمگاتا تاج ہے
ہمت انسانی تمدن کے لئے معراج ہے

"ہمت" اس اعلانِ آزادی کی اک تمہید ہے
جسکی ہر منزل میں پنہاں انبساطِ عید ہے

"ہمت" و "مردانگی" وابستہ ہیں اس ذوق سے
جس کا افسانہ پڑھا کرتی ہیں قومیں شوق سے

"ہمت" ان بدمستیوں کا وہ "خیالِ خام" ہے
جن کا دنیا میں "رضا شاہ پہلوی" انجام ہے

"ہمت" اک تقدیرِ برگشتہ کا ہے واحد علاج
ورنہ کرلیں غیر قومیں آکے ہندوستان پہ راج

"ہمت" اس تکمیلِ خواہش کا ذریعہ ہے شمیم
جس کا احساں مانتی ہے آجکل "جنگ عظیم"

شمیم نعمانی بیاوری

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے — وہ اُن کے بھجن پیارے وہ گیت اُنکے سہانے
تاریکیِ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں — تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے
وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے — دہقاں بھی بھیرویں میں لگا تان اُڑانے
کوئل نے کسی کنج سے کوکو کی صدا دی — مُرغانِ چمن جاگ اُٹھے گانے لگے گانے
انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی — ملتا ہوا آنکھیں اُٹھا فتنوں کو جگانے
کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں — گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے
انگشتریِ حسن کے انمول نگینے — سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے — صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی — کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے
گہ شرم سے مُنھ اپنا چھپانا پسِ آنچل — گہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پر افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ

جذبات فرخ بنارسی

پھر کوئی تسکین وہ آشفتہ سامانی نہو — تو اگر سرگرم پرسش ہائے پنہانی نہو
عشق کو خود ترجمانِ عشق ہونا چاہئے — ورنہ وہ آئینہ ہی کیا جس میں حیرانی نہو
لوں ہر اک موجِ حوادث سے نیا درسِ حیات — زندگی گر وقفِ آلامِ گراں جانی نہو
ویسے ہی صرفِ تحیر ہے نگاہِ امتیاز — یوں نقاب اُلٹو کہ جلووں میں فراوانی نہو
ایک عالم ہے خریدارِ متاعِ نازِ دوست — اتنی بھی جنس گرانمایہ کی ارزانی نہو
اے مصیبت دینے والے یوں مصیبت دے مجھے — جان پر چاہے بنے لیکن پریشانی نہو
کیوں جنوں میں کوئی رسوا ہو گریباں پھاڑ کر — شغلِ بیکاری روا دار پشیمانی نہو
موجزن درد سے بھیری ہوئی ہے جان نار — میں تو مر جاؤں اگر گہوارہ جنبانی نہو
کیوں فریبِ سادگی ہو نشتر جان خیال — یوں ستم کیجے کہ احساس ستم رانی نہو
خوگر بیداد ہوں فرخ ازل کے روز سے — ایسی مشکل ڈھونڈھتا ہوں جسمیں آسانی نہو

فرخ بنارسی

شاعر

ہو سکی جب مادیت سے نہ تفسیر جہاں
ذہنِ فطرت میں ہوا تخلیقِ شاعر کا خیال
پہلے اُس کی روح کی تحقیق فرمائی گئی
پھر گداز و سوز سے تخلیق فرمائی گئی
پرتوِ روح القدس سے کر کے اُسکو فیضیاب
وحی اور الہام سے لبریز دیدی اک کتاب
اُس پہ اسرارِ حقیقت کر دئے فطرت نے فاش
عرش کی راہیں سب اُس پر کھول ڈالیں بے تلاش

"شاعر" آیا، کامیابِ منصبِ پیغمبری
محفلِ عالم میں لے کر ایک شمعِ رہبری
"شاعر" آیا ابر بنکر، گونجتا گاتا ہوا
مزرعِ ہستی پر اپنا سایہ پھیلاتا ہوا
"شاعر" آیا صورتِ جبریل پر تولے ہوئے
لب سے دل تک راستے الہام کے کھولے ہوئے
مادی دُنیا کو "شاعر" نے دیا درس و پیام
بھر گئی اُس کے پیام و درس سے دُنیا تمام

لیکن اے شاعر، وہ تیری شان و عظمت کیا ہوئی
وہ بلندی، اور وہ پرواز و رفعت کیا ہوئی
کیا ہوا "شاعر" وہ تیرا منصبِ پیغمبری
قابلِ افسوس ہے تیری یہ بے بال و پری
اب تخیل ختم ہے تیرا چمن کی فصل تک
اب تری پرواز ہے محدود ہجر و وصل تک

ہوشیار اے شاعرِ خوابیدہ قسمت ہوشیار
ہے مٹانے کا ترے دورِ فلک کو انتظار
تیری فطرت کو زوال آئے کہیں ایسا نہ ہو
نام بھی دُنیا سے مٹ جائے کہیں ایسا نہ ہو
قعرِ پستی سے اُبھر آنے کا پھر سامان کر
جوش میں آ اور عالم میں بپا طوفان کر
دیکھ تیری قوم پھر تیرے لئے ہے بیقرار
پھر ہر اک محفل میں ہے نغموں کا تیرے انتظار

اپنی قوت، اپنے ذہن، اپنی نوا سے کام لے
قافلہ تیار ہے۔ بانگِ درا سے کام لے

نبی احمد بریلوی



نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی [illegible]

" بیرون ہند آٹھ روپے " بیرون ہند [illegible]

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ بعد کو فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی

منیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

نرخنامۂ اجرت اشتہار

	یکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
نصف صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۶ "
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۶ "	۳ "

(۱) اجرت بہر حال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں

(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہو اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔

(۳) ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

(۴) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر



نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۵ء | شمارہ ۴

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اپریل ۱۹۳۵ء	جلد ۲۷

ملاحظات

ہم اور ہماری موجودہ تعلیم

تعلیم، تعلیم! جدھر جائیے یہی آواز کانوں میں پڑتی ہے، جس قاید و رہنما کو دیکھئے وہ ملک کی نجات کا ذریعہ تعلیم ہی کو بتاتا ہے ـــ نئے نئے مدارس کھلتے جارہے ہیں، بڑے بڑے کالج تعمیر ہورہے ہیں، طلبہ کی کثرت سے تعلیم گاہوں میں تل رکھنے کی گنجایش نہیں ـــ لیکن فلاح کی منزل کہاں ہے، ہم اس سے کس قدر قریب پہونچ گئے ہیں؟ - یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہمیں کسی طرف سے نہیں ملتا۔

جس وقت لفظ تعلیم ہماری زبان سے نکلتا ہے تو گویا کلیۂ مسلمہ کے طور پر ہماری مراد اُس سے انگریزی تعلیم ہوتی ہے لیکن انگریزی تعلیم کی کیا حقیقت ہے اسکے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے ہندوستان میں اسکے رواج پر مختصراً ایک تاریخی نگاہ

ڈال لیجائے۔

اب سے سوا سو سال قبل جب ہندوستان میں انگریزوں کی جماعت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنا اقتدار حکومت آہستہ آہستہ قائم کر رہی تھی، نہ باشندگانِ ہند کے سامنے انگریزی تعلیم کا کوئی سوال پیش تھا اور نہ کمپنی اپنی تجارتی اغراض سے ہٹ کر اس طرف کوئی توجہ کرنا ضروری سمجھتی تھی بلکہ یہاں کی قدامت پرستیوں سے اس کو اندیشہ تھا کہ مبادا مغربی تعلیم کی تحریک لوگوں میں بددلی پیدا کر دے جو کمپنی کے مقاصد کے منافی تھا۔ چنانچہ وارن ہسٹنگز نے تالیفِ قلوب کے لئے منجملہ دیگر تدابیر کے ایک تدبیر یہ بھی کی کہ مشرقی علوم و فنون کی ترقی میں کافی حصہ لیا اور جب ۱۸۱۳ء ایک لاکھ روپیہ ترویجِ تعلیم کے لئے بجٹ میں منظور کیا گیا تو سنسکرت اور عربی ہی کی اشاعت میں صرف ہوا اور دوسرے سال کمپنی کے ڈائرکٹروں نے گورنر جنرل کو ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کی قدیم روایاتِ تعلیم و معاشرت میں کوئی دخل نہ دے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اپنے رسم و رواج پر قائم رہنے کے لئے اُن کی مالی امداد بھی کرتا رہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جس قوم کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا اُسی کے ایک فرد نے سب سے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس کا نام موہن رائے تھا جو بنگال کا ایک برہمن تھا اس نے ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر کی مدد سے جو کلکتہ میں گھڑیوں کا تاجر تھا مغربی تعلیم کا سب سے پہلا ادارہ ہندو کالج کے نام سے قایم کیا اور ہر چند اول اول عیسائی مشنریوں اور ہندوؤں نے اس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا لیکن پندرہ سال کے اندر اندر اس تعلیم گاہ نے کافی اثر پیدا کر لیا اور متعدد انگریزی مدارس قائم ہو گئے۔

اس کے بعد ۱۸۱۹ء میں عیسائی مشنریوں نے سیرام پور میں کالج قایم کیا جس کا مقصود صرف مذہبی تبلیغ تھا لیکن اس کے بارہ سال بعد ایک مشنری الگزنڈر ڈف نے تبلیغ کے بجائے تعلیم پر زیادہ زور دینا مناسب سمجھا اور کلکتہ میں دوسرا اسکول و کالج قایم کیا۔

بمبئی میں مغربی تعلیم کا آغاز ۱۸۲۷ء سے ہوتا ہے جب وہاں الفنسٹن کالج قائم ہوا، لیکن مدراس میں ۱۸۰۶ء ہی سے مشنریوں نے اپنے مدارس قائم کرنا شروع کر دئے تھے اور اس لئے جب ۱۸۳۷ء میں وہاں کرسچین کالج قائم ہوا تو انگریزی تعلیم کا ذوق لوگوں میں کافی پیدا ہو چکا تھا۔

جب ۱۸۳۵ء میں حکومت کی پالیسی بدلی تو لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانہ میں تعلیمی فنڈ کی اعانت صرف ان مدارس کیلئے مخصوص کر دی گئی جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی اور حکومت کی یہ سب سے پہلی موثر تدبیر تھی جو اس نے مغربی تعلیم کے رواج کے لئے اختیار کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں عدالتوں کی زبان بھی بجائے فارسی کے انگریزی کر دی گئی اور ۱۸۴۴ء میں سر ہنری ہارڈنگ نے یہ اعلان کر کے کہ ملازمت کے لئے ان لوگوں کا حق مرجح سمجھا جائے گا جو انگریزی جانتے ہیں، ایک مستقل بنیاد مغربی تعلیم کی قایم کر دی۔ ہر چند اس وقت تک مسلمانوں میں کوئی میلانِ تعلیم انگریزی کا پیدا نہ ہوا تھا لیکن خود ہندوؤں کے اندر اس کا ذوق اس حد تک پہونچ گیا کہ جدید مدارس کی کثرت کے مقابلہ میں حکومت کے ذرایع امداد بہت

محدود نظر آنے لگے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس وقت تک تمام تعلیمی ذوق صرف اونچے درجے کے لوگوں تک محدود تھا اور ادنیٰ طبقہ کی تعلیم کی طرف نہ اہل ملک نے توجہ کی تھی اور نہ حکومت نے۔ اس طرف سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں سرچارلس ووڈ کی تجویز و سفارش پر توجہ کی گئی اور تعلیمی پالیسی میں ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو شامل کرکے محکمہ تعلیمات عامہ قائم کیا گیا۔ اس جدید پالیسی کی رو سے حکومت کی امداد صرف سرکاری مدارس ہی تک محدود نہ رہی بلکہ پرائیوٹ مدارس کو بھی اس میں داخل کر لیا اور اسی سلسلہ میں کلکتہ، مدارس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ چونکہ یونیورسٹیاں زیادہ تر حکومت کی امداد سے چل رہی تھیں اس لئے حکومت کا اثر ان پر ہونا چاہئے تھا لیکن ۱۸۹۲ء کے تعلیمی کمیشن نے حکومت کے ان اثرات کو کم کرکے پبلک کے مساعی کو زیادہ اُبھارنا چاہا اور حکومت نے اس تحریک کو پسند بھی کیا کیونکہ اس طرح تعلیمی مصارف کا بار اس کے سر سے کم ہو جاتا تھا۔ مگر عملاً اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور یونیورسٹیوں کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی۔

اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے پھر یونیورسٹی کمیشن قائم کیا اور ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹی ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے حکومت نے یونیورسٹیوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مدارس، یونیورسٹیوں کے ماتحت کر دئے گئے۔

اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنی مجلس عاملہ میں ممبر تعلیم کا اضافہ کرکے اس مسئلہ کو مرکزی اہمیت دیدی اور جب ۱۹۱۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اپنی رپورٹ شایع کی تو حکومت نے منجملہ دیگر اصلاحوں کے جنکا تعلق زیادہ تر نظم و نسق سے تھا اس اصلاح پر بھی زور دیا کہ الحاقی قسم کی یونیورسٹیوں کے بجائے ان کو مقامی ہونا چاہئے اور جب ۱۹۱۹ء میں رفارم ایکٹ کا نفاذ ہوا تو ہر صوبہ میں ممبر تعلیم کی نئی جگہ پیدا کرکے اس کو صوبہ کی حکومت سے متعلق کر دیا گیا۔ اور ہر چند ابتدائی مدارس زیادہ تر ہر ضلع کی میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے متعلق ہیں، لیکن ان کی نگرانی حکومت ہی کرتی ہے۔

اس وقت تمام ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے جن میں ابتدائی و ثانوی مدارس، ہائی اسکول، کالج وغیرہ سب شامل ہیں، تقریباً ۲۵۰۰۹۲ ہیں اور سوا کروڑ سے زیادہ طالب علم ان اداروں میں مصروف تعلیم نظر آتے ہیں جو ہندوستان کی آبادی کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہے اور جس کو دیکھ کر ایک شخص یہاں کے تعلیمی نظام اور حکومت کی تعلیمی پالیسی کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تمام داستان میں آپ کو کسی ایک جگہ بھی یہ سمجھنے کا موقعہ ملا ہے کہ انگریزی تعلیم کا نصاب ہندوستان میں کس اجتماعی یا عمرانی مصلحت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا اور کس "جذبۂ انسانیت پرستی" کے ماتحت حکومت نے یہاں تعلیم کو رواج دینا چاہا ہے۔

یہ بات بہت مشہور ہے کہ انگریزوں کا مقصد ہندوستان میں تعلیم رائج کرنے سے صرف اس قدر تھا کہ اُنکو دفتر کے لئے کلرک کافی تعداد میں ملتے رہیں جو انگریزی زبان میں معمولی خط و کتابت کر سکیں اور دفتر کے کاغذات اس زبان میں

مرتب رکھ سکیں۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حکومت کا مدعا تعلیم سے ایک تعداد ایسے خادموں کی فراہم کرنا تھا جو بہت کم اُجرت پر قیام سیاست میں اس کی مدد کر سکیں۔

جس وقت ہم انگریزی تعلیم کے نتائج پر غور کرتے ہیں تو ہمکو نہ صرف اس قول کی صحت کا بڑی حد تک اعتراف کرنا پڑتا ہے بلکہ ہم ان مضرتوں کو بھی محسوس کر سکتے ہیں جو اُصولاً اس نوع کی تعلیم سے پیدا ہونی چاہئے تھیں۔

اگر ہم تعلیم کے صحیح مقصد کو کسی ایک جملہ میں ظاہر کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ "تعلیم کی حقیقی غایت ملک و قوم میں احساس خودداری پیدا کرنا ہے" اور یہ حقیقت اتنی واضح و روشن ہے کہ آپ جس ملک کے نظام تعلیم پر غور کریں گے، وہاں بہ لحاظ نتیجہ دینا آپ کو یہی ایک چیز سب میں مشترک نظر آئے گی، لیکن جسوقت ہم ہندوستان میں اس کی جستجو کرتے ہیں تو ہمکو نتیجہ بالکل اس کے برعکس نظر آتا ہے اور غالباً دنیا کی تاریخ تعلیم و تعلّم میں یہ بالکل پہلی مثال نظر آئے گی کہ ایک قوم کے احساس غیرت و خودداری کا محو کرنے والا اس کا نصاب تعلیم تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اول اول ایسٹ انڈیا کمپنی نے علوم مشرقیہ ہی کی طرف توجہ کی تھی، لیکن اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ افراد قوم کے جذبۂ ملی کو اُبھارنا چاہتی تھی، بلکہ مقصود یہ تھا کہ یہاں کے لوگوں کو اپنی طرف مایل کریں اور ان کی زبان سیکھ کر ان کے جذبات پر اقتدار حاصل کر سکیں، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں کی غلامانہ ذہنیت کے لئے اتنی زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں اور بغیر کسی مزید انتظار یا اندیشۂ ردعمل کے اپنے مقصد کا اظہار کیا جا سکتا ہے، تو یہ تمام نمائشیں علوم مشرقیہ کی ختم کر دی گئیں اور صاف صاف کہدیا گیا کہ ہمکو تو صرف انگریزی جاننے والے خادموں کی ضرورت ہے، چند ایسے چاکروں کی ضرورت ہے جو ہماری زبان میں ہمارے احکام سنکر ان کی تعمیل کر سکیں، اور خلاف حقیقت ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اہل ہند نے اس صدا پر لبیک کہنے میں پس و پیش سے کام لیا۔

جس طرح ہندوستان میں اس وقت دو جماعتیں نظر آتی ہیں، اسی طرح اُس وقت بھی پائی جاتی تھیں، اور دونوں کی ذہنیتیں اس وقت بھی ایک نہ تھیں اور اب بھی نہیں ہیں۔ اُسوقت مسلمانوں کا جذبۂ خودداری اس لحاظ سے کہ ان کی سلطنت کے مٹے ہوئے نشانات ہنوز تازہ تھے، اتنا محو نہ ہوا تھا اور ہندو جن پر محکومیت و غلامی کی صدیاں گزر چکی تھیں اس احساس کو بالکل کھو بیٹھے تھے، چنانچہ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے جس نے انگریزی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کی وہ ہندو جماعت تھی مسلمانوں کا پس و پیش ہر چند صرف اس لئے تھا کہ وہ انگریزوں کو اپنی سلطنت و حکومت کا غاصب سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو پیش کیا گیا مذہبی رنگ میں اور ہمارے علماء کرام نے بجائے اس کے کہ وہ جذبۂ قومی کو اُبھارتے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کے جھگڑوں میں ڈالدیا اور مسلمانوں کے اس احساس سے جو مفید نتائج پیدا ہو سکتے تھے وہ سب خواب و خیال ہو گئے۔

ہم ابتدائی صفحات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے اسی امر کی کوشش کی کہ وہ یہاں کے علوم کو زندہ کرے، اور اسی لئے اس نے انگریزی سیکھنے پر دوسروں کو مجبور نہیں کیا بلکہ خود وہ یہاں کی زبان سیکھنے کی طرف مایل ہوئے

لیکن جب بعد کو انگریزوں نے محسوس کیا کہ یہاں کی قومیں خود اپنی زبان اور اپنے علوم کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو انھیں کیا غرض پڑی تھی کہ وہ خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لیتے۔

ممکن ہے ہندو جماعت اس پر فخر کرے کہ سب سے پہلے انھیں کے ایک فرد نے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کر کے انگریزی سیکھنے کی طرف ملک کو مائل کیا، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہی سب سے پہلی غلطی تھی جس نے ہوا کا رُخ پھیر دیا اور ہندوستان کے تعلیمی مستقبل کو تاریک کر کے رکھدیا۔

اس میں شک نہیں کہ علم محض کسی مخصوص زبان کا پابند نہیں ہے اور اجنبی ممالک و اقوام کی زبان سیکھنا بھی مستحسن ہے، لیکن اگر ہمارا یہ ذوقِ علم و زباندانی ہماری قومی خصوصیات کو چھین لینے والا اور ہماری اپنی زبان کو مٹا دینے والا ہے تو ایسے علم سے جاہل و بے علم رہنا بدرجہا بہتر ہے۔

اگر ہندوؤں نے سب سے پہلے انگریزی سیکھنے کی طرف توجہ کی تھی تو اس سے مقصود صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کریں اور پھر اپنی ہی زبان کی وساطت سے ملک میں ان کو رواج دیں، نہ یہ کہ انگریزی زبان ہی کو اصل مقصود قرار دیکر حکومت کی گرفت کو اور زیادہ مضبوط بناتے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو کالج کے بانی کا نصب العین صرف یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کو انگریزی زبان کی تعلیم سے آشنا کر کے، نوکری کا حصول اُن کے لئے آسان کردے جس کا اتباع بعد کو سرسید مرحوم نے بھی کیا اور اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ ہندو مسلمانوں کے بعض افراد کو چاکری کا ڈھب معلوم کیا لیکن تعلیم کے حقیقی فوائد سے یہ بھی محروم رہے اور وہ بھی۔

تعلیم کی برکات ثابت کرنے کے لئے مخصوص افراد کی نظیر پیش کرنا سخت حماقت ہے، کیونکہ تعلیم کا مسئلہ بالکل اجتماعی مسئلہ ہے اور جب تک اُس کی اجتماعی اہمیت پیشِ نظر نہ ہو اس کے حُسن و قبح پر ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اگر کسی ملک کا کوئی مخصوص طبقہ پڑھ لکھ کر ترقی کر جائے تو ہم اس کو تعلیم کی برکات میں تو ضرور شمار کریں گے لیکن نظامِ تعلیمی اسی وقت مکمل کہا جائیگا جب اس کے برکات بلاتخصیص طبقہ و درجہ سب پر موثر ہوں اور ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز اُٹھ جائے۔ پھر آج کہ انگریزی تعلیم کے رواج کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے غور کیجئے کہ اس نے ملک کو کتنا فایدہ پہونچایا اور ہماری ذہنی ترقیوں نے ہمارے تمدن و اخلاق میں کیا خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں۔

سب سے پہلے آپ ہندوستان کے اس طبقہ کو لیجئے جو جسمِ قومی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور جو صحیح معنی میں ہمارا "ان داتا" ہے۔ اگر آپ کو کسی گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے وہاں کی آبادی کا مطالعہ کیا ہوگا اور اگر آپ کے دل میں کچھ بھی اہلیت تاثر کی موجود ہے تو آپ ان کو دیکھ کر یقیناً حیران رہ گئے ہوں گے کہ کیا یہ واقعی اُسی خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہے جس نے متمدن ممالک کے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور کیا حقیقتاً ہم ان کا شمار انسانوں میں کر سکتے ہیں۔ اُن کے اسباب غذا (اگر فاقہ کر کر کے زندہ رہنے میں واقعی غذا کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے) اُن کے ملبوس (اگر حقیقتاً جامۂ تار تار کا شمار ملبوس

میں ہوسکتا ہے) اُن کے مکانات (اگر کسی موسم میں پناہ نہ دے سکنے والے جھونپڑے مکان کہلائے جاسکتے ہیں) اُنکی صحت و توانائی (اگر بیماریوں کا شکار ہو ہو کر اسبابِ علاج فراہم نہ ہوسکنے کی وجہ سے مرتے رہنا واقعی صحت و توانائی کی بات ہے) الغرض ان کی بیکسانہ زندگی کے جس پہلو پر آپ نظر کریں گے تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو انسانوں میں ان کا شمار ہی نہ کریں یا پھر اپنی انسانیت پر آنسو بہائیں جو ان مناظر سے دوچار ہوتی ہے اور بیخبرانہ گزر جاتی ہے۔ اگر تعلیم کا فائدہ کم از کم اتنا ہی قرار دیا جائے کہ وہ انسان و حیوان کے درمیان جس امتیاز پیدا کر دیتی ہے تو افسوس ہے کہ سوا سو سال کی تعلیمی جدوجہد ملک کی کثیر آبادی کو اس احساس سے آشنا کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی اور ہندوستان کے نصف سے زیادہ باشندے بدستور اس عہدِ وحشت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جب آدم کو بہشت سے نکلے ہوئے شاید چند ہی سال ہوئے ہونگے اجتماعی یا تمدنی احساس تو خیر بڑی چیز ہے، انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ زندہ رہنے کی صورتیں، بھوکے رہکر صرف سانس لیتے رہنے کے علاوہ اور بھی ہوسکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج تعلیم کا چرچا گھر گھر ہے اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہیں ہے جہاں علم کی روشنی نہ پہونچ گئی ہو۔ ممکن ہے اس کی تصدیق حکومت کے بجٹ طیار کرنے والے یا ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپلٹی کی صدارت کے لئے خاک چھاننے والے کر سکیں، لیکن گاؤں کی وہ آبادی جس سے تعلیم کے نام پر روپیہ چھین کر، کبھی صحیح معنی میں اس پر صرف نہیں کیا جاتا، شاید اس کی تصدیق نہ کرے۔

یہ حال تو ہوا اُس طبقہ کا جسے باوجود اساسِ معیشت سمجھنے کے ادنیٰ طبقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اب متوسط الحال طبقہ کی تعلیمی حالت پر غور کیجئے، جو ماہرینِ تمدن کے نزدیک ترقی علوم و فنون کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں اس طبقہ کے افراد بکثرت نظر آتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہر سال یہاں کی انتہائی تعلیم کا پروانۂ فراغ لیکر باہر نکلتے ہیں۔ لیکن جسوقت اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی یا ملک کی ترقی میں کیا حصہ لے رہے ہیں تو نتیجہ حد درجہ افسوسناک نکلتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جس کی ایک تعلیم یافتہ انسان میں جستجو ہونا چاہئے، اس کا جذبۂ خودداری ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے ابناء وطن کا وقار قائم رکھنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے، سو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ اسی احساس کا فقدان ہے، وہ مغرب اور ہر اس چیز سے جو مغرب کی کہلاتی ہے، اس درجہ مرعوب ہیں کہ ان کے نزدیک شائستگی و تہذیب کا صحیح معیار انگریز ہوجانا ہے۔ انگریز، وضع و صورت کے لحاظ سے، معیشت و معاشرت کے لحاظ سے۔ عوائد و مراسم کے لحاظ سے۔ ذہنیت کے لحاظ سے نہیں کیونکہ انگریز تو اپنے ملک پر قربان ہونے کے لئے طیار رہے اور اس جذبہ کا یہاں پتہ نہیں، اس کا اصل سبب وہی اصولِ تعلیم کی خرابی ہے۔ جب تک ایک ملک کے باشندوں کو خود ان کی مادری زبان میں تعلیم نہ دیجائے گی، اُسوقت تک نہ اُن میں کوئی ذہنی ترقی پیدا ہوسکتی ہے اور نہ جذبۂ وطنیت انمیں نشوونما پاسکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم نصابِ تعلیم پر غور کرتے ہیں تو اور زیادہ افسوس ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سب سے

زیادہ جس چیز کو اہمیت دی جاتی ہے وہ صرف انگریزی زبان ہے اور شروع سے ہمارے نوجوانوں پر اس کی اہمیت اتنی ثابت کر دی جاتی ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصود بجز زبان انگریزی کی مہارت کے کچھ نہیں رہتا اور اسکا نتیجہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اپنی زبان اپنی تہذیب اپنی معاشرت اور اپنی قومی روایات سے ان کو بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنا تفوق وہ اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک اچھا انگریزی داں ثابت کر سکیں، درانحالیکہ ان کی انگریزی دانی کی بھی جو حقیقت ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

وہ جب بات کرتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ جتنے الفاظ انگریزی کے انھیں یاد ہیں سب صرف کر دیں، جب وہ کسی کلب میں جاتے ہیں تو صرف انگریزی رسایل و جرائد ہی کی جستجو کرتے ہیں اور ان کو شرم معلوم ہوتی ہے کہ لوگ انھیں اُردو یا ہندی کے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ لیں۔ اپنی زبان میں بات کرنا، اپنی زبان کی کتابوں کو دیکھنا، اپنی زبان کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا ان کے نزدیک جہل و وحشت کی علامت ہے، توہین و خفت کا سبب ہے اور ایک ایسی ادنیٰ ذہنیت کا اظہار ہے، جسے وہ گوارا نہیں کر سکتے ——— خیر یہ تو بڑی بات ہے کہ وہ کسی انگریز سے گفتگو کرتے وقت یہ سمجھ کر کہ اُس کو بھی ہمارے ملک کی زبان جاننا چاہئے، اپنی مادری زبان میں خطاب کریں —— وہ تو آپس میں بھی جب تبادلۂ خیالات کریں گے تو انگریزی میں اور اگر مخاطب انگریزی میں جواب نہ دیگا تو اسکو حقارت سے دیکھیں گے۔ الغرض جلوت و خلوت ہر جگہ وہ انگریز بننے کی کوشش کرتے ہیں، درانحالیکہ ایک انگریز کی نگاہ میں وہ صورتاً و سیرتاً، اتنے ہی ذلیل ہیں۔ جتنا انھیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک انگریز بھی ہماری اس غلامانہ ذہنیت سے واقف ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جس قوم کے افراد اتنے بے غیرت اور بے حس ہوں اور جس ملک کے باشندوں میں اپنے وطن کی عزت و خودداری کا احساس اسدرجہ محو ہو گیا ہو، وہ کسی طرح اس کتے سے زیادہ نہیں جو ٹھکرائے جانے کے بعد بھی قدموں سے لپٹے رہنے پر مجبور ہے ——— انگریزی زبان کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ہمارے احساس انسانیت کو کیوں محو کر دے۔ کیا جس طرح ایک انگریز اپنی زبان پر ایک جاپانی، جاپانی زبان پر اور ایک فرانسیسی اپنی مادری زبان پر فخر کرنے کا حق رکھتا ہے، ہمکو حاصل نہیں اور کیا جس طرح وہ اپنی قومی خصوصیات اپنی قومی زبان کے ساتھ قائم رکھنے پر مُصر ہے، ہم نہیں کر سکتے۔ کیتنی شرم کی بات ہے کہ ہم ایک انگریز سے صرف اسلئے انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں کہ وہ اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ہم اپنی زبان میں گفتگو کر کے اس کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے کہ جس سرزمین میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے، جس ملک کی دولت سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے، وہاں کی زبان کو بھی وہ سمجھے۔ مانا کہ ہماری زبان ناکمل ہے وسیع نہیں ہے لیکن ہے بہرحال اپنی چیز، اپنے وطن کی چیز اور اگر ہم اسکو اسوقت تک کوئی ترقی نہیں دے سکے ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے نہ کہ زبان کا ——— آپ ایک انگریز گریجویٹ اور ایک ہندوستانی گریجویٹ کا مقابلہ کیجئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ جس حد تک کتابیں پڑھنے کا تعلق ہے، ہندوستانی گریجویٹ بدرجہا افضل ہے لیکن دنیا کے کاروبار میں، عملی زندگی میں، سوجھ بوجھ میں ایک انگریز گریجویٹ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اسکی تعلیم اسکی مادری زبان میں ہوتی ہے اور آپکا سارا وقت صرف غیر زبان سیکھنے میں صرف ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے وہ پڑھتے ہیں اپنے قوائے ذہنیہ کو عاملانہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے اور آپ پڑھتے ہیں گدایانہ طور پر نوکری کرنے کے لئے۔

(باقی آیندہ)

پارسی اہل کتاب ہیں

(مسلسل)

پارسیوں کے مذہبی ادبیات

دین زرتشتی کے اصول کی تشریح سے قبل اس کی مذہبی کتب و تصانیف کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا اور ۲۲۴ سال قبل مسیح پایۂ تخت فارس کو نذر آتش کیا تو تمام وہ تصنیفات و مخطوطات بھی ضائع ہوگئے جن کا تعلق قدیم ایرانی تمدن و فلسفہ اور دیگر علوم سے تھا[1]۔ اس غارتگری میں دین زرتشتی کی مذہبی کتابوں اور مقدس ادبیات کو اسقدر نقصان پہونچا کہ آج اس مذہب کے متعلق مکمل حالات معلوم کرنے اور بہم پہونچانے کی کوئی قابل وثوق صورت نظر نہیں آتی۔ موجودہ اوستا اصلی اوستا کا ایک جزو ہے اور اس کا بھی یہ حال ہے کہ اکثر دیگر ابواب کے جملے خلط ملط ہوگئے ہیں۔ موجودہ اوستا کی تدوین اصلی اوستا کی بربادی کے سالہا سال بعد عہد ساسانی میں ہوئی ہے۔ اور اس کی ترتیب یوں ہوئی کہ زرتشتی علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اور ان علماء کے ذہنوں میں جو کچھ باتیں اور جملے اصلی اوستا کے محفوظ تھے انھیں قلمبند کردیا ظاہر ہے کہ اس طرح اصل خیالات میں کتنا ردوبدل ہوگیا ہوگا[2]۔

اس امر کا ثبوت کہ آیا زرتشتی ادبیات کا وجود یونانی فتح سے قبل تھا یا نہیں، ایک یونانی مصنف ہرمیپو کی تحریر سے ملتا ہے جس نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی ایک مفصل فہرست مع عنوانات و مضامین تیار کی تھی۔ سکندر اعظم کی غارتگری کے بعد زرتشتی کتابوں کا محفوظ رہنا دشوار تھا تاہم کچھ باقی رہگئی تھیں لیکن ان کا خاتمہ بھی ساسانی عہد میں ہوگیا[3]۔ اس کے بعد عہد خلافت عباسیہ میں اس ادبی تباہی اور نقصان کی کسی حد تک تلافی کی گئی یعنی سلطنت نے اپنے خرچ سے قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب کو جمع کرایا اور ترجمہ کراکر کتبخانوں میں انکو محفوظ کردیا[4]۔

---

[1] تفصیل کے لئے مغربی و مشرقی علماء کی اُن تواریخ کا مطالعہ اس سلسلہ میں ضروری ہے جو انھوں نے تمدن ایران پر تصنیف کی ہیں۔ طبری شہرستانی، جیکسن، مارٹم اور ٹائل کے مصنفات خصوصًا قابل ذکر ہیں۔ براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور مالکم کی تاریخ ایران بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ [2] دائرۃ المعارف برطانیہ۔ میڈیا مصنفہ راگزن۔ تاریخ پارسیاں۔ مضامین ہاگ اور شرح مذہب زردشت مصنفہ دھلا۔ [3] میڈیا صفحہ ۴۷۔ دائرۃ المعارف۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان مصنفہ ٹائل اور شہرستانی طبری اور مسعودی کی تصانیف۔ [4] شرح مذہب زردشت اور رسائل شبلی صفحہ ۷۲-۱۷۱۔

طبری (۸۳۸ء - ۹۲۲ء) ناقل ہے کہ زرتشتی تحریریں ۱۲ ہزار چرمہائے گاؤ پر منقش و مرقوم تھیں[1] لہٰذا موجودہ اوستا پروفیسر جیکسن کے تخمینہ کے مطابق محض ۱/۴ حصہ اس اوستا کا ہے جو عہد ساسانی میں ترتیب پایا تھا[2]۔ بقیہ حصے آخری زرتشتی تاجدار کی حکومت کے بعد فنا و غارت ہو گئے۔

ہمیں اس جگہ یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ زرتشتیوں کی مقدس کتاب کی اصل زبان کیا تھی۔ اس کی زبان اوستائی تھی۔ یہ زبان آریاؤں کی ایرانی شاخ میں بولی جاتی تھی لیکن آریاؤں کی ایرانی شاخ بھی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک کو مشرقی ایرانی اور دوسرے کو مغربی ایرانی کے نام سے پکارتے تھے۔ اور اوستا کی زبان مشرقی ایرانیوں کی زبان تھی جو بیکٹریا اور اس کے ملحق مقامات میں مروج تھی۔ مذہبی ادبیات کے ایک حصہ کو گاتھا کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حصہ حضرت زرتشت کے کلام پر مشتمل ہے۔ بقیہ مذہبی ادبیات زبان اوستا میں ہے۔ مارخم لکھتے ہیں کہ[3]

> "اگر "وید" کو ہم موجودہ کتب میں قدیم ترین کتاب کہہ سکتے ہیں تو بلاشبہ بلحاظ قدامت فارسی گاتھا کا درجہ دوسرا ہے۔ اس کتاب میں ہمیں عناصر فطرت کی پرستش سے بلند تر کسی اور شے کی عبادت کی ابتدا نظر آتی ہے۔ ویدی نظموں اور مناجاتوں میں خالق اعظم اور آئندہ زندگی کے ادراک کا جو موہوم نقشہ ملتا ہے اُسکی تفسیر کے لئے ہمیں گاتھاہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔"

مذہبی ادبیات کے چند اجزا، اصلی اوستا کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہیں اور انھیں ژند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس مقدس ادبی مجموعہ کو ژند اوستا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پھر اجزائے ژند کی توضیح اور شرح جن کتب میں مرقوم ہیں انھیں پاژند کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عہد ساسانی میں جو کچھ کتابیں مذہبی مسائل و عقائد پر تصنیف و تالیف ہوئی ہیں اُن کی زبان عہد ساسانی کی مروجہ زبان پہلوی ہے۔

ہمیں اس سلسلہ میں اُن کاوشوں اور کوششوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو علمائے مغرب نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی جستجو اور ان کو منظر عام پر لانے میں کی ہے۔ مشرقی مصنفین میں طبری، مسعودی، شہرستانی، ابوالفدا، یاقوت اور البیرونی نے اپنے تصنیفات میں اس مذہب کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ ملا محسن فانی کشمیری مصنف دبستان مذاہب نے اس مذہب کا ذکر بوضاحت کیا ہے اور مجوسی علماء و فضلا علی الخصوص اُن کا جن سے ہندوستان میں ملاقات کا اُنھیں شرف حاصل تھا خاص طور پر کیا ہے۔

مغربی علماء میں پہلا شخص ہائڈ ہے جو اکسفورڈ یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ اس نے مغرب میں سب سے پہلے زرتشتی مذہب اور اُس کے ادبیات کے متعلق تحقیق و تفتیش کی۔ اُس نے ۱۷۰۰ء میں ایک ضخیم کتاب اپنی تحقیقات کے مطابق اس مذہب پر شایع کی تھی۔ ہائڈ کے بعد مشہور عالم اور سیاح انکیوڈو پیرن نے ہندوستان سے فرانس واپس جا کر ۱۷۷۱ء میں ژند اوستا کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شایع کیا۔ بعدہٗ معروف مستشرق سر ولیم جونس نے اس مذہب کے متعلق اکثر مصنفات شایع کئے۔ ۱۸۲۶ء میں ملک ڈین کے

---

[1] تاریخ ایران جلد اول باب ۱۲ مصنفہ مالکم — [2] زردشت مصنفہ جیکسن — [3] تاریخ ایران صفحہ ۳۴۔

رہنے والے ایک عالم نے جن کا نام ایرسمس رسک تھا ایک رسالہ زبان زند اور اُس کے ادبیات کے متعلق شایع کیا اُسی زمانہ میں پیرس کے ایک ماہر سنسکرت پروفیسر برنف نے اسی قسم کی ایک تصنیف شایع کی۔ ۱۸۲۹ء میں ہمبرگ کے جسٹس اولشاسن اور فرانسس بوپ نے ان لوگوں کی تقلید کی۔ پھر حکومت بویریا کی تحریک پر فریڈرک اسپیجل نے اُن مخطوطات کا ترجمہ کیا جو اسوقت یورپ کے کتب خانوں میں اس مذہب و زبان کے متعلق پائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر گیلگر کا احسان بھی پارسی مذہب کے ادبیات پر بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۵۲-۵۴ء میں ملک ڈین کے مشہور فاضل وسٹرگارڈ نے زند اوستا کو پہلی بار مکمل طور پر کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس اشاعت میں اس زبان کے قواعد اور لغت کو بھی بطور ضمیمہ شامل کیا۔ پھر ۱۸۵۸ء کے عرصہ میں ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے گاتھا کو شایع کیا۔

ڈاکٹر موصوف کا پارسی مذہب اور ادبیات مذہب کے متعلق ایک بسیط مضمون جو ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا تھا کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں وسٹ۔ گولڈزیہر۔ ڈارمیسٹیٹر۔ ملس۔ بارتھولومیو اور ڈاٹن جیسے مستشرقین کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

زند اوستا جو اب گم ہو چکی ہے اکیس جلدوں میں تھی۔ اردا ویراف نامہ سے بتفصیل معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی ادبیات یونانی حملہ کے وقت سکندر اعظم کے حکم سے کیونکر برباد و تباہ کئے گئے۔ ذیل میں اُن اکیس جلدوں کے نام مع اُنکے پہلوی ناموں کے ہدیۂ ناظرین ہیں۔[۱]

اسمائے اوستا	پہلوی نام	اسمائے اوستا	پہلوی نام
(۱) یتا	سودگر	(۱۱) منگھو	دادرک
(۲) اہو	درشتمنسار	(۱۲) شکیوتنہ نام	چید رستو
(۳) ویریو	بکو	(۱۳) انگھی اش	اسپیت
(۴) آتا	راماد	(۱۴) مزدائی	باکان پشت
(۵) رتش	نادر	(۱۵) خشترمچا	نکادم
(۶) اشد	پاجک	(۱۶) اہو راری	دباسرج
(۷) چید	زرتشتی	(۱۷) آ	ہوسپارم
(۸) ہچا	بارس	(۱۸) ییم	سکادم
(۹) ونگھی اش	کشکیسرب	(۱۹) دروگو بیو	ونددام
(۱۰) وزدا	وستاسپساستو	(۲۰) دوت	بادخت
		(۲۱) وستارم	ستودیشت

[۱] تاریخ پارسیان۔ دین زرتشت مصنفۂ مسانی۔ دائرۃ المعارف۔ ادبیات مقدسہ مشرقی اور دین ایرانیان۔ تاریخ ساسانیان کے مصنف نے جو بعہد مظفرالدین شاہ گزرا ہے اس سلسلہ میں مفصل حالات قلمبند کئے ہیں۔

پہلے حصے میں ۲۲ ابواب تھے۔ ان میں عبادت پرہیزگاری کے فوائد سے بحث کی گئی تھی۔
دوسرے حصہ میں بھی ۲۲ ابواب تھے جن میں مذہب زرتشتی کے عقاید سے بحث کی گئی تھی۔
تیسرے حصہ میں بیس یا اکیس ابواب تھے اور ان میں نجات پانے اور گناہوں سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا تھا۔
چوتھے حصہ میں ۳۲ ابواب تھے جن میں الٰہیات اور سائنس کے مضامین سے بحث کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حشر و نشر اور آیندہ زندگی کے متعلق بسوط بحث تھی۔

پانچویں حصہ میں ۳۵ ابواب تھے اور اُن میں علوم ہیئت اور نجوم سے بحث کی گئی تھی۔
چھٹے حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور اُن میں چند مذہبی رسوم اور تیوہار کا تذکرہ تھا۔
ساتویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے اور وہ بادشاہوں۔ عالموں۔ مذہبی رہنماؤں اور دیگر معزز شخصیتوں کے احکام سے معمور تھے۔
آٹھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں ملک پر حکومت و سلطنت کرنے کے اکثر عمدہ طریقے بتائے گئے تھے۔
نویں حصہ میں بھی ۶۰ ابواب تھے اور عقلمندی۔ پرہیزگاری۔ مذہبیت۔ نیک و بد اعمال وغیرہ جیسے مضامین پر بحث کی گئی تھی۔
دسویں حصہ کو ایک تاریخی کتاب کہنا چاہئے۔ اس میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں عہد گشتاسپ اور مذہب زرتشتی کے ابتدائی دور کی تاریخ قلمبند کی گئی تھی۔

گیارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے جن میں صفات باری تعالیٰ۔ حشر۔ آفرینش اور تمدنی فرائض کا ذکر تھا۔
بارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور وہ مسائل زچگی پر مشتمل تھے۔
تیرھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے جن میں زرتشت کے ابتدائی حالات زندگی کا تذکرہ تھا۔
چودھویں حصہ میں ۱۷ ابواب تھے جن میں خداوند عالم اور اُس کے مقرب فرشتوں کا ذکر تھا۔
پندرھویں حصہ میں ۵۴ ابواب تھے۔ اس میں دولت جمع کرنے کے متعلق حکایات و قصص بیان کئے گئے تھے علاوہ ازیں حیات کی معصومیت سے بھی بحث کی گئی تھی۔

سولھویں حصہ میں ۶۵ ابواب تھے اور اس میں شادی بیاہ کا تذکرہ تھا۔
سترھویں حصہ میں ساٹھ یا چونسٹھ یا پینسٹھ ابواب تھے اور اُن میں گناہ گاروں کی سزا اور حرام و حلال کے مسئلہ سے بحث کی گئی تھی۔
اٹھارھویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے جن میں اختیارات اور قوت کے صحیح استعمال کا طریقہ مندرج تھا۔
اُنیسویں حصہ کو وِهندیداد کہتے اور اس کا ذکر ہم بوضاحت آیندہ کریں گے۔
بیسویں حصہ میں ۲۰ ابواب تھے جن میں نیکی۔ عبادت گزاری اور بدکاری وغیرہ کے نتیجہ اور انجام سے بحث کی گئی تھی۔
اکیسویں حصہ میں ۳۳ ابواب تھے جن میں اہورامزدا اور اُس کے مقرب فرشتوں کی مدح و ثنائی کی گئی تھی۔
ان مذہبی ادبیات کے تذکرہ میں دائرۃ المعارف برطانیہ (جلد ششم طبع نہم صفحہ ۵۲۵) سے ذیل کا اقتباس پیش کردینا

مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"بابل کی دوسری فتح کے بعد ۵۱۵ سال قبل مسیح بہستون کا کتبہ عمل میں آیا جس پر دارا کی زبان سے مرقوم ہے کہ اُس نے قدیم کتاب یعنی قانون الٰہی (اوستا) کا ترجمہ کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ قوانین الٰہی کی ایک تفسیر او نماز کی ایک کتاب (زند) کا بھی ترجمہ کیا تھا۔"[1]

ڈاکٹر ہاگ کا خیال ہے کہ پارسیوں کے موجودہ مذہبی ادبیات کا قدیم ترین حصہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سو سال قبل مسیح کی تحریر ہے اور زند اوستا بحیثیت مجموعی تقریباً ۵۰۰ سال قبل مسیح وجود میں آیا۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر تائل کی تحقیق سے آخری حصہ اوستا ۴۰۰ سال قبل مسیح وجود میں آیا اور گاتھا اُس سے ۲ صدی قبل[2]۔ بہرحال اس بحث و اختلاف کا خاتمہ اسوقت تک ہونا دشوار ہے جب تک جدید محققین خود پیغمبر زرتشت کے عہدِ وجود اور زمانۂ رسالت کو طے نہ کرلیں۔ جہاں تک زند اوستا کی تصنیف کا تعلق ہے تمام علمائے یونان[3] اور علمائے مذہب زرتشت حضرت زرتشت[4] ہی کو اُس کا مصنف بتاتے ہیں لیکن مارخم کا بیان ہے کہ[5]:۔

"یہ خیال قابل وثوق نہیں لیکن اگر زردشت ان لوگوں کو بھی کہتے تھے جو مذہبی قیادت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے تو یہ اشکال دور ہو جاتا ہے، زردشت اول یا اس مذہب کے بانی کا نام اسپیتاما تھا۔"

راگزن نے بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے اس مذہب کے علماء کو زردشت کے لقب سے یاد کیا ہے[6]۔

ہرچند کہ متذکرۂ بالا جلدوں اور حصوں کا اب ملنا دشوار ہے لیکن اُن کے مضامین سے مطلع ہونے کے لئے ہمارے پاس دیگر ذرایع موجود ہیں۔ مثلاً زبان پہلوی کی دینکارد اور زبان فارسی کی "روایات" اس سلسلہ میں بے حد معاون ہیں۔ یونانی مصنفین ہیروڈوٹس وغیرہم کے بیانات بھی ہماری مدد کرتے ہیں[7] علاوہ ازیں اصلی حصص کے کچھ اجزا ہنوز باقی ہیں۔ اُنیسواں حصہ وندیداد اور دو کتابیں یسنا اور وسپارد تو بصورت مکمل پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ خورد اوستا کے نام سے بھی ایک کتاب ملتی ہے۔ اس میں محض نماز کا ذکر ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آخرالذکر تینوں کتابیں اُن اکیس حصص زند اوستا کے کچھ اجزا ہوں۔

ادبیات مقدسہ کی تاریخ کے متعلق ہاگ لکھتے ہیں کہ[8]:۔

"ایران کے سماری کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہخمنی سلاطین، اہورا مزدا پر ایمان رکھتے تھے اور اُنکی زبان اوستا سے ملتی جلتی کوئی زبان تھی۔ حقیقتاً ہخمنی سلاطین کا عہد زرتشتی ادبیات کے لئے ایک سعید زمانہ تھا اسی عہد میں تمام کتب مقدس ترتیب پاکر اکیس حصص میں منقسم ہوئے اور اُن کا نام نسک پڑا۔"

---

[1] دین ایرانیان مصنفۂ تائل و مترجمہ جی۔ کے۔ نریان — [2] مضامین ہاگ۔ ادبیات مقدسہ مشرقی — [3] دین زرتشت مصنفۂ بی۔ ایس سانی لیکن شرح مذہب زردشت مصنفۂ دھلا سے بھی تقابل کیجئے۔ — [4] تاریخ ایران صفحہ ۵۲ — [5] میڈیا صفحہ ۲۷۲ — [6] ادبیات مقدسہ مشرقی۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان — [7] مضامین ہاگ صفحہ ۵۴ — [8] تاریخ ایران مصنفۂ مارخم صفحہ ۹۴۔

اس عہد کا پتہ ہمیں "ارداویراف" سے معلوم ہوتا ہے جس میں مرقوم ہے کہ تقریباً تین سو سال تک مذہب زردشت پاکیزہ رہا اور لوگ شبہات سے مبرا رہے۔ ہمیں ادبی مصنفین کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکبار اسکندر اعظم نے شراب کے نشہ میں اخمنی سلاطین کے پایۂ تخت اور قلعہ کو جلا دینے کا حکم دیدیا۔ قلعہ میں ۲ جلد زرتشتی ادبیات مقدسہ بصورت مکمل موجود تھیں اُن میں سے ایک تو جل گئی اور دوسری یونانیوں نے رکھ لی۔ اگر کوئی مکمل یا غیر مکمل جلد بچ بھی رہی ہو تو اُس کا بعد کے ۵۰۰ سال کے عرصہ میں برباد ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اس عہد میں یونانیوں نے دین زرتشتی کی کسی قسم کی اعانت نہیں کی۔ اس عہد میں محض ایک نام وہالکاش کا ایسا ملتا ہے جس نے بقیہ کتب واجزا کی فراہمی کا حکم دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو نگار کا چوتھا حصہ[1])۔ عہد ساسانی کے اولین چند سلاطین نے ان منتشر تحریروں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا انتظام کیا تھا اور پھر دوسرے امن پسند سلاطین ساسانیہ نے ادبی مشاغل کی ہمت افزائی کی — اب موجودہ ادبیات مقدسہ کی بعض مشہور کتابوں کا ذکر سنئے۔ وھندیداد سے جس میں ۲۲ ابواب ہیں اُن ممالک کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں دین زرتشتی کی پہلے پہل تبلیغ کی گئی۔ زرتشتی قوانین اور دیگر رسوم مذہبی کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں اُس عظیم الشان واقعہ کا بھی ذکر ہے جس کا بیان تقریباً تمام کتب سماوی والہامیہ میں ہے۔ یعنی لوگوں کی بدکاری اور گناہگاری اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ خداوند عالم نے اُنھیں سزا دینے کی خاطر دنیا کو ایکبار بالکل تباہ کر دیا اور پھر از سر نو آباد کیا۔ اس کتاب میں مرقوم ہے کہ اُسوقت اہورامزدا نے اپنے چہیتے بندہ جمشید کو حکم دیا کہ وہ ایک حصار تیار کرے اور کُل مخلوق کا ایک ایک جوڑا اُس حصار میں رکھدے تاکہ وہ سب بربادی و تباہی سے محفوظ رہیں۔ بقیہ مخلوق کی تباہی کا باعث اس کتاب میں شدید سردی اور برف باری بتایا ہے۔

انجیل اور قرآن میں اس واقعہ کو حضرت نوح سے منسوب کیا گیا ہے اور تباہی کا باعث طوفان بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام حالات و واردات وہی ہیں جو وھندیداد میں مرقوم ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر تاراپور والا پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کا پر مغز مضمون بعنوان "حکایات بیا" جو کلکتہ ریویو میں شایع ہوا ہے ملاحظہ کرنا چاہئے۔ عرب مورخوں نے جمشید جناب سلیمان کا نام اور لقب بتایا ہے۔ میر خوند کی کتاب حبیب السیر جلد ۳ اور عبدالرحیم تبریزی (سنہ ۱۲۵۹ھ) کی ممالک المحسنین کا مطالعہ اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوگا۔ پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران جلد اول میں اس نکتہ پر بحث کی ہے۔

وھندیداد لوگوں کو پیشۂ کاشتکاری کی ترغیب دیتی ہے اور اسے ایمانداری اور ترقی کا پیشہ بتاتی ہے۔ اس میں اُن طریق کی تعلیم دی گئی ہے جن کے ذریعہ سے انسان میں راستی کی عادت اور بُرائی سے پرہیز کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں چند رسوم اور تیوہار کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اور یہی حکم آخری عہد کی دیگر تصانیف کا باعث ہوا کیونکہ اس وقت لوگ حضرت زرتشت کی اصلی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے اور مراسم میں افراط و تفریط سے کام لینے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسا کہ راگزن لکھتے ہیں[2]: "ان عہد اوستا کے کتب میں تعلیم زردشت کا اصل جوہر ضرور موجود ہے کیونکہ مذہبی پیشواؤں کے لغو احکام میں کچھ نہ کچھ حقانیت ضرور نظر آتی ہے"۔

---

[1] دین ایرانیان۔ خزینۂ مغ مصنفہ مولٹن صفحہ ۶۵ — [2] میڈیا صفحات ۱۴۱۔ ۱۱۳۔

وحشتدیداد کا اصل زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے لیکن اس ترجمہ کو بہت سے زرتشتی علما نے مشتبہ قرار دیا ہے اور اُن کا خیال ہے کہ محض جرمن مترجمین قابلِ وثوق ہیں۔ لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ڈرمیسٹیٹر نے زند اوستا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور اکثر مقامات پر ترجمہ اصل سے بالکل مختلف ہے۔ مسٹر گشتاسپ کے ۔نریمان، ڈاکٹر ٹائل کی کتاب "مذہب ایرانیان" کے ترجمہ کے دیباچہ میں اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر ٹائل کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

"جب تم ترجمہ ڈرمیسٹیٹر سے کوئی ٹکڑا نقل کرنا چاہو تو میرے اُن ترمیمات کا ضرور خیال رکھو جو میں نے اس سلسلہ میں کئے ہیں۔ کیونکہ میرے خیال میں اکثر مقامات پر ترجمہ ڈرمیسٹیٹر ناقابلِ وثوق ہے۔ اگرچہ آج کوئی عالم ایسا نہیں ہے جو ڈرمیسٹیٹر کی طرح اوستا کا ماہر ہو لیکن اُس کا اُصول ترجمہ ہی کچھ ایسا تھا جس نے اس کو برباد اور ناقابلِ وثوق کر دیا ہے۔"

لیکن فی الحال ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس "ناقابلِ وثوق" ترجمہ ہی کو سامنے رکھیں۔ ہم علمائے یورپ کی جانفشانیوں کے ممنون ہیں کہ انھوں نے زرتشتی کتابوں کو جہاں تک ممکن ہو سکا اُن کی اصلی صورت اور حالت میں منظرِ عام پر لائے، ہر چند یہ امر تقریباً ناممکن ہے کہ ایک ایسی قدیم زبان کی کتابوں کا ترجمہ ایسی حالت میں جبکہ زبان سیکڑوں سالوں سے مردہ اور غیر مستعمل ہو بالکل صحیح ہو سکے۔ صحیح ترجمہ کیلئے لازمی ہے کہ مترجم ویدک سنسکرت سے، زند و پہلوی تفاسیر سے اور جہاں تک اصلی اوستا کا تعلق ہے علم السنہ سے مقابلتہً بخوبی واقف ہو۔

بہرحال بحث کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ہمیں "یسنا" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یسنا میں ۷۲ ابواب ہیں۔ اس کی تحریر اوستا اور گاتھا دونوں زبانوں میں ہے۔ حقیقتاً یہ کتاب نماز اور عبادات کے متعلق ہے۔ اُن ابواب میں جو زبان گاتھا میں لکھے ہوئے ہیں حمد اور قصاید پر مبنی ہیں۔ ان میں مذہبی نکات اور مسائل پر فلسفیانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مقررہ اُصول عبادات سے بحث کی گئی ہے۔ گاتھا تعلیم زرتشتی کا ما حاصل اور اصل جوہر ہے۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ حضرت زرتشت کے اصل اور بجنسہ الفاظ و کلمات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے اس حصہ کو بہت زیادہ اہمیت دیجاتی ہے ہم نے کسی اور مقام پر گاتھا کا کچھ ترجمہ درج کیا ہے اور زرتشتی تعلیم کی اصل غرض سے بحث کی ہے۔

"یسنا" کا تذکرہ کر لینے کے بعد تیسری کتاب وِسپارد کا کچھ تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں ۲۲ ابواب ہیں۔ یہ حمد اور مناجات کا مجموعہ ہے جو مخصوص تہواروں کے موقعوں پر مذہبی پیشواؤں اور مقدس نفوس کو مخاطب کرتے ہوئے ورد کئے جاتے ہیں۔ ان کے ورد سے اہورامزدا کی اعانت اور رحمت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کتاب میں وہ اجزا بھی شامل ہیں جو یسنا میں اضافہ کئے گئے ہیں۔ اور اس کے اکثر ابواب یسنا کے چند حصوں سے متعلق ہیں اور اُن کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں[1]۔

---

[1] ادبیاتِ مقدسۂ مشرقی جلد ۱۴ صفحہ ۳۳۲۔

اِس سلسلہ کی چوتھی کتاب خورد اوستا ہے جو ژند اوستا سے مختلف ہے۔ اس مخصوص کتاب میں مندرجہ ذیل صحائف ہیں یشتہا، نیایشہا، آفرین کا نشا اور گاہا مع چند متفرق ٹکڑوں کے۔

یشتہا میں عبادت وادعیہ اور دیگر اعمال عبادت کی ادائی کے متعلق طریقے مندرج ہیں۔ اس میں علاوہ اہورا مزدا کے چند دیگر موجودات کی پرستش کا بھی ذکر ہے لیکن ہم آیندہ ابواب میں ثابت کریں گے کہ یہ بعد کے لوگوں کا اضافہ اور اُن کی من گھڑت باتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی زندگی میں جو کچھ آمیزشیں ہوئی ہیں اُن کا حوالہ دیکر یہ امر اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ پارسیوں کی یہ خامی چنداں قابل گرفت نہیں ہے عیسائی تو جناب مسیح کی پرستش کرنے لگے اور مسلمان جنھیں پیدا ہوئے ابھی تیرہ سو سال ہی ہوئے ہیں اولیا اور صوفیوں کا احترام پرستش کی حد تک نہ محض اُن کی زندگی میں بلکہ بعد مرنے کے کرتے رہتے ہیں۔ پارسیوں کی مذہبی تواریخ کو جن حادثات کا مقابلہ اور سامنا کرنا پڑا ہے اُس کا خیال رکھتے ہوئے یہ اضافہ اور افراط و تفریط کچھ حیرت انگیز نہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں پارسیوں کے مذہبی ادبیات کے انگریزی تراجم کی کمزوریوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ ان میں جہاں کہیں بھی فرشتوں اور دیگر اولیاؤں کے احترام و تقدیس کا ذکر ہے اور جہاں کہیں بھی عبادت خداوند عالم کا ذکر ہے ہر جگہ یکساں لفظ پرستش استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہی غلط تراجم بہت حد تک بدگمانی کا باعث ہوئے ہیں۔ کیونکہ لفظ "پرستش" عام ہے جب خدا کے لئے اس کا استعمال کیا جائیگا تو اس کے معنی عبادت ہوں گے اور جب اولیا یا فرشتہ کے لئے استعمال کیا جائے گا تو یقیناً اس کے معنی احترام اور تقدیس کے ہونگے یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہئے کہ مذہب زرتشت کے نزدیک خداوند عالم اور اُس کی برگزیدہ مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پارسی بھی خدا اور اُس کے برگزیدہ بندوں کے درمیان اتنا ہی فرق کرتے ہیں جتنا دیگر اہل کتاب اس مسئلہ اور نکتہ پر پروفیسر مولٹن نے اپنی ایک تصنیف میں بڑی خوبی سے بحث کی ہے[1]۔

اب ہمیں "گاہا" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اس میں زرتشتی مذہب نے اپنے پیروؤں کو شب و روز میں بہ اوقات مختلف پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس پارسیوں کی نماز پنجگانہ نے مسلمانوں کی تعداد و اوقات نماز پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے اور اسکی طرف پروفیسر ڈرمیسٹر اور گولڈزیہر نے بھی اشارہ کیا ہے[2]۔ گولڈزیہر لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی نماز جو یہود و نصاریٰ کے اثر سے وقوع میں آئی بلحاظ تعداد ایرانیوں کے اثر سے ظہور پذیر ہوئی نماز جس کی بنیاد خود حضرت محمد نے ڈالی تھی اصل میں دو وقت تھی پھر بعد کو ۳ وقت کر دی گئی۔ جیسا کہ خود قرآن میں اُسے "الوسطیٰ" کے نام سے موسوم کیا ہے[3]۔"

---

[1] خزینۂ علم صفحہ ۱۰۰۔ [2] ملاحظہ ہو "اسلام پر دین مجوس کا اثر" مرقومہ پروفیسر گولڈزیہر منقولہ جی۔ کے نریمان بہ کتاب "ایران و پارسیان" پروفیسر آرنلڈ کی "تعلیمات اسلام" بھی اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں اُن اسلامی عقاید سے جو پارسیوں سے ملتے جلتے ہیں بڑی خوبی و صفائی سے بحث کی ہے۔ [3] مشکواۃ المصابیح جلد ا کتاب ۴ باب نماز

زمانۂ حال کے ایک فاضل مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے بھی چند روز ہوئے اس خیال سے ہمخیالی کا اظہار کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :۔

"پارسیوں کے پنجگانہ نے جو اُن کی پانچ وقتہ نماز ہے اسلام کے لئے نمونہ کا کام کیا اور اسلام نے جو پارسیوں سے پہلے دو نماز پسند کرتا تھا ۳ وقت سے بڑھا کر پانچ وقت نماز کا حکم دیدیا۔"[1]

یہ امر زرتشت کی پیغمبری اور ان کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے۔ خود قرآن حکیم کا قول ہے :۔

"کوئی رسول کسی نئے مذہب کو پھیلانے نہیں آیا بلکہ پیغمبران سابق کی تعلیم کو زندہ اور اسکا اعادہ کرنے آیا۔"[2]

"نیائیشہا" نفل اور مستحب نمازیں ہیں۔ ان کی تعداد بھی پانچ ہے۔ ان نمازوں سے درجہ پارسی خدا کے دربار میں اُس کے پانچ اعلیٰ مظاہر یعنی آفتاب۔ ماہتاب۔ آب۔ آتش اور روشنی کے عوض شکرانہ ادا کرتے ہیں۔[3]

آفرینگان اُس نماز کو کہتے ہیں جو تیوہاروں کے موقع پر ادا کی جاتی ہے۔ اور مخصوص مواقع پر پیشوایان مذہب و دیگر مردہ اشخاص کی ارواح کی یاد تازہ کرنے یا موکل فرشتوں سے امداد طلب کرنے کے لئے ادا کرتے ہیں۔[4]

اب تک جو کچھ ذکر ہوا وہ دور آخر کے عہد اوستا کے مقدس ادبیات کے متعلق تھا۔[5] اب ہمیں زرتشتیوں کے پہلوی کتب سے بحث کرنی چاہئے۔ جہاں تک مذہبی روایات اور مذہبی مراسم و عادات کا تعلق ہے یہ کتب پہلوی بے حد مفید ہیں۔ وقتاً فوقتاً اضافہ کے باعث پہلوی ادبیات کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ "دکارکا" کی تاریخ پارسیان کے مطابق پہلوی تالیفات و تصانیف کی فہرست ۵۲ جلدوں میں ہیں۔ فی الحال ہم چند مشہور اور ضروری پہلوی کتابوں سے بحث کریں گے اور اُن کے مطالب بیان کریں گے۔

(۱) پہلوی زبان کی سب سے مقدس ترین کتاب "دینکارد" ہے اس میں تواریخ۔ نجوم اور مذہب کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اور اوستا کے ۲۲ نسخے کی شرح بھی بیان کی گئی ہے۔

(۲) "نیرنگستان"۔ اس کتاب میں ان مذہبی مراسم و تیوہاروں سے بحث کی گئی ہے جو دین زرتشت میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(۳) "شایست لاشایست" اُن اشیاء کا بیان ہے جو اس مذہب میں حلال و حرام ہیں۔

(۴) "دادستان دینی"۔ اس کتاب میں وہ فتاوے ہیں جو ایک زبردست مجتہد دین زرتشت نے عام طور پر مذہب اور دیگر مراسم دینی کے متعلق وقتاً فوقتاً صادر کئے تھے۔ اس کتاب میں قوانین نکاح و وراثت سے بھی بحث کی گئی ہے۔

(۵) "شکند گمانی وجار" اس میں خدا اور عالم کے وجود پر دہریوں کے مقابلہ میں دلائل و براہین پیش کئے ہیں۔

(۶) "بوندہشنی" اس کتاب کا اہمیت کے اعتبار سے "دینکارد" کے بعد دوسرا درجہ ہے۔ اس میں پارسیوں کے مذہبی اصول

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ اسٹیٹسمین مئی ۱۶، ۱۹۲۶ء کلکتہ۔ [2] سورہ ۵۰ آیت ۲۷۔ [3] تاریخ پارسیان۔ تاریخ ایران مصنفہ مارنم اور شرح مذہب زرتشت۔ [4] تاریخ پارسیان جلد دوم۔ [5] تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۱۰۱ - ۹۵۔

"ذ دنی" سے بحث کی گئی ہے اور تمام مخلوق پر نیکی و بدی کے اثرات کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے۔

(۷) "مینوخرد" اس میں روایات و اخلاقیات دینِ زرتشت کی شرح بیان کی گئی ہے۔

(۸) "مادیگانِ گشتنویان" اس میں اسرار الٰہی اور تصوف کے مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

(۹) "مادیگانِ ویراف" یا "ارداویراف نامہ" اس میں ارداویراف کے بہشت و دوزخ کے خواب کا بیان ہے ارداویراف دینِ زرتشت کے ایک مشہور ولی اللہ تھے۔ انھوں نے اپنی روحانی قوت سے خواب میں اُن مقامات کو ملاحظہ کیا جہاں نیک اور بد بندے بعد مرنے کے رکھے جائیں گے۔ اس مخصوص خواب کی غرض اصل حالات بہشت و دوزخ سے مطلع کرنا اور اُن افواہ کو دور کرنا تھا جو اسوقت عام لوگوں میں ان مقامات کے متعلق مشہور تھیں۔

(۱۰) "مادیگانِ یکم جہیتہ... تیسوں دنوں میں سے ہر روز کے الگ الگ فضائل کو بیان کیا گیا ہے جو ہر روز جس کام کیلئے مسعود اور مخصوص ہے بیان کیا گیا ہے۔

بقیہ ادبیات پہلوی میں یا تو ادبیات اوستا کے تراجم و شرح ہیں یا چند متفرق مسائل مذہبی سے بحث کی گئی ہے[۱]۔

ان کتابوں کے علاوہ چند کتابیں "پازند" میں چند فارسی تحریروں کے ساتھ پائی جاتی ہیں "فارسی روایات" دورِ آخر کی سب سے معروف اور معززکتاب ہے۔ اس کی تالیف ہندوستان میں پارسیوں کے بس جانے کے بعد ہوئی۔ اس کتاب میں اُن سوالات کے جواب درج ہیں جو پارسی مقیمان ہندوستان نے اپنے ہم مذہب ایرانی بھائیوں سے چند نکات مذہبی کو حل کرنے کی غرض سے ایران بھیجے تھے ۔ اس سلسلہ میں اُن خدمات کا ذکر جو مسلمانوں نے زرتشتی ادبیات کو جمع کرنے اور ترجمہ کرنے میں انجام دی ہیں لازمی ہے۔ عربوں کو ایران کے قرب و جوار میں رہنے کے باعث زرتشتیوں کے متعلق مکمل واقفیت رکھنا آسان تھا بلاشبہ اس کی کاوش میں انھوں نے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی۔ اسلامی دورِ اول کے خلفاء کو اُن کے زرتشتی مصاحبین نے دینِ زردشت کے مذہبی ادبیات کے متعلق اطلاعات پہونچانے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دی۔ مسلمانوں کو اقوام اور ملل کی تواریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے لہٰذا انھوں نے فارسی علم ادب کے اس مخصوص شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیں اس مخصوص مضمون پر اصل زبان سے تقریباً تمام کتب عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ اس کی تفصیل کے لئے تصنیفات ابن ندیم۔ حمزہ اصفہانی۔ البیرونی۔ مسعودی۔ طبری وغیرہ کا مطالعہ ناظرین کو کرنا چاہیئے۔ اوستا اور اُسکے ترجمہ پازند تفاسیر کا جہاں تک تعلق ہے ان مصنفوں نے ملک کے چپہ چپہ سے مخطوطات کو جمع کرکے اُن پر بالتفصیل بحث کی۔ اوستا کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور حمزہ اصفہانی نے اکثر مقامات پر اُس کی عبارت نقل کی ہے[۲]۔ اس کے علاوہ پہلوی زبان کی تمام کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

(باقی)

مترجم سید وجاہت حسنین، ام۔اے پروفیسر طاہر رضوی، ام۔اے

[۱] زیادہ تفصیل کے لئے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۹۰۔۱۰۳ ملاحظہ ہو۔ [۲] الفہرست صفحات ۴۵۔۲۴۴۔ کتاب التنبیہ الاشراف صفحات ۹۲۔۹۰۔ الملل والنحل صفحات ۹۲۔۱۸۵۔ ابن الاثیر جلد اول صفحہ ۱۱۰۔ دنیاوری صفحہ ۲۶ وغیرہ۔

ستارہ

میرے چھوٹے بھائی بہن میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہیں۔ میں اُن سے بے حد محبت کرتا ہوں، زیادہ مدت تک اُن سے جدا نہیں رہ سکتا، اُن کی خاطر ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنا کاروبار چھوڑ کر وطن جاتا ہوں اور اُن کی معصوم محبت سے دل کی پیاس بجھاتا ہوں۔

پچھلی دفعہ جب میں وطن گیا تو صبح چار بجے، سورج نکلنے سے پہلے گھر پہونچ گیا۔ امی جان کے سوا سب سو رہے تھے لیکن جوں جوں صبح ہوتی گئی سب یکے بعد دیگرے جاگتے گئے اور سلام کرکرکے میرے گرد جمع ہوتے گئے۔ آخر میں سب سے چھوٹی بچی سلیمہ رہ گئی۔ جمیل میاں نے اُس کو جگایا اور کہا کہ بڑے بھائی آئے ہیں اُٹھو! اُس نے اُٹھکر آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھا اور جلدی سے منہ چھپا لیا۔ بڑی مشکل سے اُسکا حجاب دور ہوا اور بالآخر وہ بھی میری گود میں آکر بیٹھ گئی۔

جب دن اچھی طرح نکل آیا تو ان سب کی توجہ کا مرکز میرا سوٹ کیس بنگیا۔ وہ جانتے تھے کہ بڑے بھائی ہمارے لئے سوغات لائے ہوں گے۔ چنانچہ بکس کھولنے کی فرمائش کی گئی۔ اور جب وہ کھلا تو سب بُری طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کی چیزوں کے علاوہ میں بہت سی مفید و غیر مفید اشیا جن میں بڑا حصہ کھلونوں کا تھا، اُن کے واسطے لایا تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ چیزیں میں اُن میں تقسیم کرتا وہ خود اپنا اپنا حصہ بانٹنے لگے اور مختلف چیزوں پر قبضہ پانے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

جس وقت میرا سوٹ کیس اس طرح تاراج ہو رہا تھا میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کمرے کے دروازے سے لگی ہوئی ہم سب سے چار پانچ قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اُس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بھولی بھالی شکل، سانولی رنگت، اُلجھے ہوئے بال، کپڑے میلے اور دیہاتی قسم کے، اُس کی ہئیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آس پاس کے کسی گھر سے تعلق رکھتی ہے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے آگئی ہے۔ وہ اس لوٹ مار کے منظر کو بہت انہماک کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی خفیف مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی چمک سے اُس کی دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے یہ خیال کرکے کہ یہ لڑکی میری موجودگی کے باعث قریب آنے میں جھجکتی ہے اُس کو اپنے پاس بلایا اور بکس میں سے ایک کھلونا دیا جس کو اُس نے بغیر تامل کے قبول کر لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس جذبے سے متاثر ہو کر میں نے اس لڑکی پر عنایت اور توجہ صرف کی ہے وہ بہت جلد میرے لئے ایک عذاب جان بن جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ لوٹ مار ختم ہوگئی اور بچے مجھے اور میرے سوٹ کیس کو بھول کر اپنے کھیلوں میں مصروف ہوگئے تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور ساتھ ساتھ امی جان کے بعض احکام کی بھی تعمیل کرتی جا رہی ہے۔ مثلاً "ستارہ! یہ دودھ کی پیالی سلیمہ کو دیدے"۔ "دیکھ بلی اندر گئی ہے اُس کو وہاں سے بھگا" "کوٹھے پر دیکھ خانم کیا کر رہی ہے، کچھ کام نہ کر رہی ہو تو کہنا امی بلا رہی ہیں"۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امی جان نے اس لڑکی کو نوکر رکھ لیا ہے۔ کسی نہایت حقیر معاوضے پر اُسکی خدمات حاصل

کرلی ہیں۔ پھر تائی جان نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اور اب یہ اپنے چچا کے ہاں رہتی ہے۔ اس کی چچی اس سے بہت محبت کرتی ہے لیکن ان بیچاروں کی مالی حالت ایسی نازک ہے کہ وہ اس کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ کم از کم بھوکی تو نہ رہے گی انھوں نے اسکو ہمارے ہاں ملازم کرادیا ہے۔

ہندوستان میں اس نوع کے یتیم بچوں کی کمی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی بہت سی لڑکیوں کو دیکھا تھا اس سے بدتر حالت میں دیکھا تھا۔ بھیک مانگتے ہوئے اور فاقہ کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جسقدر اثر میں نے اس لڑکی سے لیا کسی سے نہیں لیا۔ اسکا سبب شاید یہی تھا کہ وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ میں اسکو اور اسکی مظلومیت کو ہر وقت دیکھتا تھا اور ہر وقت دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔

میں دیکھتا تھا کہ وہ جھاڑو دے رہی ہے اور اگر جھاڑو دیتے دیتے کسی کھیل میں لگ گئی تو تائی جان نے جھڑک دیا ہے اور خوب پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی ہے۔ یا پھر باورچی خانے میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے۔ اُس کا چھ سات برس کا ننھا سا وجود بڑے بڑے برتنوں سے گھرا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بھر کی مظلومیت اور ستم زدگی اسی ننھے سے وجود میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اُسکے ماں باپ اپنی زندگی کے تمام آلام اور ساری مشقتیں اسی کو سونپ گئے ہیں۔ اور آج جبکہ اس کو کھیل کود اور دوسرے بے معنی مشاغل میں وقت ضائع کرنا چاہیے تھا وہ محنت کررہی ہے اور اپنی محنت و مزدوری سے اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ اگر وہ کام نہ کرے، جھاڑو نہ دے برتن نہ مانجھے، سلیمہ کو دودھ کی پیالی نہ دے، چھت پر جاکر خانم کو نہ بلائے، اور صبح سے شام تک ہزاروں احکام کی تعمیل نہ کرے تو وہ بھوکی رہ جائے گی، اُسے کھانے کو سوکھے ٹکڑے بھی میسر نہ آئیں گے۔ اور یہ سب کس لئے؟ صرف اس لئے کہ اُس کے سرپرست مفلس و نادار ہیں اور اُس کے ماں باپ مر چکے ہیں!!

میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک معصوم طفلانہ مسکراہٹ کھیلتی ہے لیکن اُس کی آنکھوں سے ایک ایسی بے چارگی اور غمگینی ٹپکتی ہے کہ دیکھنے والے کا دل کیفیات غم سے لبریز ہوجاتا ہے، جی زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پُر اسرار طریقے پر دنیا کے سارے مظلوموں کی فریادیں انھیں دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آکر جمع ہوگئی ہیں، کائنات کی تمام دردمندیاں انھیں میں کھنچ آئی ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں کڑھتا تھا کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ کہنے کی بات ہی نہ تھی۔ کون میری باتوں پر کان دھرتا؟ سب یہی کہتے کہ میاں دیوانے ہو، ذراسی بات ہے اُس کو افسانہ بنائے دیتے ہو، دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے، کوئی امیر کوئی غریب! ایسا نہ ہو تو دنیا کا کام کیونکر چلے۔

غرض اس لڑکی سے متعلق جو میرے جذبات تھے اُن سے دنیا واقف نہ تھی۔ اور اگرچہ [redacted] دوسروں کی طرح کچھ نہ جانتی تھی اور نہ جان سکتی تھی، تاہم میں سمجھتا ہوں اُس کو میری ہمدردی کا ایک غیر شعوری احساس ضرور تھا۔ ایک ننھا سا بچہ بھی دست شفقت کو پہچانتا ہے اور محبت بھری آواز کو سن کر مسرور ہوتا ہے۔ وہ تو پھر ایک سمجھدار لڑکی تھی، عقل اور شعور رکھتی تھی، میری ہمدردیوں سے کس طرح بے خبر رہتی۔ میں اُس کو کبھی جھڑکتا نہیں تھا اور جب اُس سے بات کرتا تھا تو میرے لہجہ میں ایک ایسی نرمی اور محبت ہوتی تھی

جس کو وہ کہیں اور نہ پاسکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب اُس کو میرے متعلق کوئی خدمت انجام دینی ہوتی تو وہ بڑی سرگرمی کا اظہار کرتی۔ بلکہ اکثر دوپہر کے وقت جب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو جاتی تو نہایت خاموشی کے ساتھ میرے کمرے میں آ کر کھڑی ہو جاتی اور دل ہی دل میں توقع کرتی کہ میں کوئی خدمت اُس کے سپرد کروں گا۔ میں اُس کا مدعا سمجھ جاتا۔ مجھے بے حد تکلیف ہوتی (جس دردناک منظر کو خیال برداشت نہیں کرسکتا اُس کو آنکھیں زیادہ دیر تک کیونکر دیکھ سکتی ہیں؟) اور میں خواہ مخواہ اُس سے کسی کام کے لئے کہتا مثلاً پینے کے لئے پانی منگاتا۔ وہ بہت خوش ہو کر پانی لاتی لیکن اُس کے بعد بھی بدستور اپنی جگہ میرے احکام کی منتظر رہتی۔ پھر میں اُس سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ "ستارہ تم کچھ پڑھتی پڑھاتی نہیں ہو؟" شاید یہ میرا پہلا سوال ہوتا۔ اس کے جواب میں وہ کہتی "اگلے سال میں مولوی صاحب کے مدرسہ میں پڑھنے جاتی تھی، وہ مجھے قاعدہ پڑھاتے تھے، پھر اماں مرگئیں اور میں یہاں آگئی، بڑے بھائی وہ کتاب میرے پاس رکھی ہے، تم پڑھا دیا کرو، میں امی جان سے پوچھ لوں گی۔" "ہاں میں تم کو پڑھاؤں گا" میں جلدی سے جواب دیتا "لیکن ستارہ! تم اپنی اماں کو بھی کبھی یاد کرتی ہو؟" وہ اس پر کچھ شرما سی جاتی اور نگاہیں نیچی کرلیتی۔ کچھ کہنا چاہتی لیکن نہ کہہ سکتی۔ اس کے بعد اُس کے باپ کا ذکر آتا۔ باپ کے متعلق وہ اور بھی کم جانتی تھی۔ اُسے مرے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔ اُس کے دماغ میں صرف چند واقعات کے دھندلے نقوش تھے۔ اور وہ اُنہی واقعات کو مختصر الفاظ میں دُہراتی۔ پھر اُس کے چچا اور چچی کے متعلق گفتگو ہوتی۔ اُس کی چچی اُس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اکثر اُس کے ماں باپ کو یاد کرکے اُسی کے سامنے رو یا کرتی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے ستارہ کو اپنے بدقسمت اور کم نصیب ہونے کا احساس بھی تھا اور اُس کی آنکھوں میں رنج و الم کی کیفیات اسقدر نمایاں تھیں۔ ان باتوں میں بہت کافی وقت گزر جاتا یہانتک کہ اندر سے "ستارہ، اری ستارہ" کی آوازیں آتیں اور وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کے لئے چلی جاتی۔

اس مرتبہ مجھے چند اسباب کی بنا پر بہت دنوں وطن میں رہنا پڑا لیکن اس تمام مدت میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب ستارہ کے خیال نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔ اُس کا وجود میری جان کے لئے ایک روگ ہوگیا تھا، ایک مستقل عذاب بن گیا تھا۔ میں کچھ کام کر رہا ہوتا یا کسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوتا اور سامنے سے ستارہ آجاتی — صرف اُس کا خیال آجاتا — تو تھوڑی دیر کے لئے دُنیا نظروں میں تاریک ہو جاتی، اور ہر چیز نفرت انگیز اور بیزار کن معلوم ہوتی۔ میں دل میں غور کرتا کہ آخر یہ کیوں ہے؟ اس جذبات پرستی کا کیا سبب ہے؟ اس لڑکی سے میں کیوں اسدرجہ متاثر ہوتا ہوں؟ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ صرف یہی خیال ہوتا کہ چونکہ بچوں کو میری زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے اور بچوں کے معاملے میں میں بہت حساس ہوں اس لئے ستارہ کی شخصیت سے بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہوں۔ بسا اوقات میں اپنے آپ کو سمجھانے کی بھی کوشش کرتا کہ آخر ستارہ ایسی بھی کیا مصیبت زدہ لڑکی ہے کہ میں اُس کے باعث اپنی زندگی کو بے مزہ کر ڈالوں۔ وہ ہنسی خوشی رہتی ہے اور بے فکری کے ساتھ اپنے دن گزارتی ہے۔ مجھے اُس کے غریب ہونے اور ایک خادمہ کی طرح کام کرنے کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے۔ لیکن پھر مجھے وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یاد آجاتیں اور وہ آنکھیں میرے سامنے ایک نئی دنیا پیش کر دیتیں۔ اس دنیا میں بہت سی لڑکیاں، کم عمر، کم نصیب اور شکستہ حال لڑکیاں، جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے میں مشغول ہوتیں۔ میں اس نظارے کی تاب نہ لاکر پریشان ہو جاتا اور سراسیمگی کے عالم میں خوفناک خیالات کو اپنے دماغ میں پناہ دینے لگتا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور ستارہ کے معاملہ میں میری ذکاوت حس زیادہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک صبح جب میں سو کر اٹھا تو چند آہنی ارادے میرے ساتھ تھے۔ یہ ارادے گزشتہ شب کے غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ اور ان کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی کوششیں فوراً اُسی صبح شروع کر دینا چاہتا تھا۔ ستارہ عام طور پر بہت سویرے، میرے ناشتے سے پہلے ہی آجاتی تھی۔ کیونکہ اُس کا گھر زیادہ دور نہ تھا، مشکل سے سو قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ لیکن اُس روز میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بھی چلا گیا اور ستارہ نہ پہنچی۔ تھوڑی دیر میں اتی جان کو بھی تشویش ہوئی اور انھوں نے ماما کو اُس کے گھر بھیجا کہ جا کر دیکھے اور اُس کے نہ آنے کا سبب معلوم کرے۔ ماما اُلٹے پاؤں واپس آئی اور اُس کی بھی کی طرف سے یہ جواب لائی کہ "ہمارے عزیز و اقارب اس بات کو بہت معیوب سمجھتے ہیں کہ لڑکی ملازمت کرے۔ اور اُن کے اعتراض کی وجہ سے اب ہم ستارہ کو نہ بھیجیں گے۔"

میں ماما کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے کمرے میں سُن رہا تھا جب میں اُن کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تو اس علم کے باوجود کہ اب ستارہ کو پیٹ بھر کر روٹی بھی مشکل سے ملیگی، مجھے ایک قسم کا اطمینان حاصل ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ دل میں بہت دنوں سے ایک کانٹا چبھا ہوا تھا، وہ کسی نے نکال لیا اور خلش کی بجائے سکون میسر ہوگیا۔

اختر انصاری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸؍ کے مجلد کتاب صرف ۸؍ میں اور غیر مجلد عار میں ملیگی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۸؍ میں اور غیر مجلد سے ۳؍ میں علاوہ محصول ۸؍ کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۵۷۴ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مصطفٰے کمال پاشا کی ابتدائی زندگی

اس سے قبل (یعنی نومبر ۳۲ء سے مارچ ۳۵ء تک) مصطفٰے کمال کے وہ حالات درج ہو چکے ہیں جن کا تعلق اس کے ورود قسطنطنیہ سے لیکر زمانۂ حال تک ہے، لیکن تصویر کا مکمل خاکہ اسوقت تک سامنے نہیں آسکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس "بطل اعظم" کی ابتدائی زندگی کس طرح بسر ہوئی اور رفتہ رفتہ کن حالات کے ماتحت اس نے ترقی کرکے یہ مرتبہ حاصل کیا۔

اس وقت تک ہم نے اس مسئلہ پر بھی روشنی نہیں ڈالی کہ انور پاشا وغیرہ دیگر اکابر ترکی سے مصطفٰے کمال کے تعلقات کیا تھے، ان میں باہم کر کیا اختلاف تھا اور نیز یہ کہ جنگ عظیم کے دوران میں اس نے کتنی اہم خدمات ملک و وطن کی انجام دیں۔ بہرحال اب یہ حصہ بھی پیش کیا جاتا ہے امید ہے کہ دو یا تین اشاعتوں میں مکمل ہو جائے گا اور اس طرح مصطفٰے کمال کی مکمل سیرت ناظرین نگار کے سامنے آجائے گی۔

نیاز

مصطفٰے کمال کے باپ کا نام علی رضا اور ماں کا زبیدہ تھا۔ ان کا وطن سالونیکا تھا۔ علی رضا فی الاصل رہنے والا تو البانیہ کے پہاڑی علاقہ کا تھا، لیکن کمسنی میں یہاں آگیا تھا اور یہیں بعد کو سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔

چونکہ تنخواہ کم تھی اور وہ بھی حکومت کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے مہینوں نہیں ملتی تھی اس لئے دفتر کے علاوہ فرصت کے وقات میں وہ چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت بھی کیا کرتا تھا۔۔۔ زبیدہ مصطفٰے کمال کی ماں بھی خالص ترکی نسل کی تھی اور حسب رواج پردہ کی پابند تھی اور تعلیم سے بالکل بے بہرہ۔ اس کا باپ جنوبی البانیہ کا رہنے والا تھا اور ماں مقدونیہ کی۔۔۔ زبیدہ دراز قامت، صبیح و تو انا، نیلگوں آنکھوں والی عورت تھی اور باوصف غیر تعلیم یافتہ ہونے کے بہت ذہین تھی۔

اسوقت ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت یہ تھی کہ عیسائی حکومتیں چاروں طرف سے ترکی پر دانت لگائے ہوئے تھیں اور ان میں سے ہر ایک اس فکر میں تھی کہ کوئی ٹکڑا اس کا غصب کرلے، روس کریمیا اور قافقاز پر قابض ہو چکا تھا اور قسطنطنیہ کی فکر میں لگا ہوا تھا، فرانس، شام اور ٹیونس پر متصرف تھا اور انگلستان، مصر و قبرص پر۔۔۔ جرمنی بھی سلطان عبدالحمید کو شیر جتیا بنا کر دیگر مغربی حکومتوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح اپنے حقوق وہاں پیدا کرلے۔۔۔ الغرض جس طرح ایک

لاش کے گرد گِدھوں کی ٹکڑی جمع ہو کر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے، اسی طرح مغربی حکومتیں، ترکی کی نیم جاں حالت سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھیں، لیکن چونکہ ان سب کی اغراض میں باہم گر تصادم ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اس خوف سے کہ مبادا عالمگیر جنگ شروع ہو جائے، ہر ایک مناسب موقعہ کی منتظر تھی۔

آخرکار ۱۸۷۷ء میں روس نے اس حالت منتظرہ کو دور کرنے کا فیصلہ کر کے جنگ کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجیں روانہ کر دیں ظاہر ہے کہ ترکی میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ برسرِ پیکار ہوتا۔ عساکر روس بڑھتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ دس میل رہ گیا — لیکن اسوقت بھی مغربی حکومتوں کا جذبۂ رشک و رقابت ترکوں کے لئے آیۂ رحمت بن گیا اور ڈسرائیلی نے برلن کانگریس میں تمام مغربی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ روس کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے کیونکہ یورپ میں قیام امن و سکون کے لئے ترکی کا وجود ضروری ہے۔

الغرض یہ حالات تھے ترکی کی بیکسی و بے بسی کے کہ ۱۸۸۱ء میں زبیدہ کے بطن اور علی رضا کے صُلب سے سالونیکا میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے مصطفیٰ رکھا۔

اس سے قبل ایک لڑکا اور پیدا ہو چکا تھا لیکن وہ زندہ نہ رہ سکا، ایک لڑکی ضرور موجود تھی (جس کا نام مقبولہ تھا) لیکن چونکہ لڑکا کوئی نہ تھا اس لئے مصطفیٰ کے پیدا ہونے کی ماں باپ کو بہت خوشی ہوئی اور لاڈ میں ایک بچہ جتنا خراب کیا جا سکتا ہے، اتنا ہی مصطفیٰ کو بھی کیا گیا۔

مصطفیٰ فطرتاً خاموش، کمزور، اور الگ تھلگ رہنے والا لڑکا تھا، جو زردی مائل نیلگوں آنکھیں اور بھورے بال رکھنے والے بچوں کی خصوصیات میں داخل ہیں نہ ماں باپ سے اس کو زیادہ علاقہ تھا نہ ساتھ کے لڑکوں سے، وہ گھر میں بھی ماں باپ سے زیادہ لگا لپٹا نہ رہتا تھا اور باہر بھی جب بچوں میں کھیلتا تھا تو سب سے علحدہ۔

علی رضا نے اب دفتری نوکری ترک کر دی تھی اور شہتیروں کی تجارت میں لگ گیا تھا، یہ چاہتا تھا کہ مصطفیٰ بھی اسی طرف متوجہ ہو، لیکن زبیدہ اس کو مولوی اور مذہبی آدمی بنانا چاہتی تھی۔

ابتدا میں اس کو محلہ کی مسجد میں پڑھنے کے لئے بھیجا گیا جہاں ابتدائی تعلیم قرآن کی ہوئی اور پھر شمسی آفندی کے مدرسہ میں۔

اسی زمانہ میں ناگہاں علی رضا کا انتقال ہو گیا اور چونکہ روپیہ پاس نہ تھا اس لئے زبیدہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئی جو سالونیکا سے باہر ایک گاؤں (لنراسن) میں کاشتکاری کیا کرتا تھا۔ یہاں پہونچکر مصطفیٰ کو بھی مزارعانہ خدمات سپرد کی گئیں، وہ اصطبل صاف کرتا، بھیڑیں چراتا، کھیتوں کی حفاظت کرتا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان خدمات سے خوش تھا، کیونکہ کھلی ہوئی ہوا میں رہنا، آزادانہ زندگی بسر کرنا اور محنت سے کام کرنا اس کی فطرت تھی۔ وہ یہاں پہونچکر تندرست تو ضرور ہو گیا لیکن اس کی خاموشی اور علحدگی پسند طبیعت اور زیادہ قوی ہو گئی

دو سال کے بعد اس کی ماں نے جو اس کو کاشتکار بنانا پسند نہ کرتی تھی اپنی ایک بہن کی مدد سے اُسے سالونیکا کے ایک مدرسہ

میں داخل کرادیا لیکن یہاں پہونچکر اس نے اُستادوں اور لڑکوں سے لڑائی شروع کردی، نہ وہ کسی قاعدہ کی پابندی کرتا تھا، نہ کتابوں کی طرف توجہ کرتا تھا، کھیلتا بھی تھا تو خود رائی کے ساتھ اور جو کوئی لڑکا دخل دیتا تو اس سے لڑتا تھا۔ ایک بار کسی معاملہ میں اُستاد نے اس کو خوب مارا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بگڑ کر وہاں سے چلا آیا اور پھر نہ گیا۔

زبیدہ نے اس کو بہت سمجھایا، زجر و توبیخ کی، لیکن وہ ماں کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا اور برابر سے اس کو ہر بات کا جواب سختی سے دیتا تھا۔

آخرکار زبیدہ کے بھائی نے کہا "لڑکا بڑا خودسر ہے یہ پڑھے وڑھے گا نہیں، اس کو سالونیکا کے فوجی اسکول میں بھیجدینا چاہئے، اگر وہاں یہ اہل ثابت ہوا تو فوج میں کوئی عہدہ اس کو مل جائے گا۔" چچا کی یہ تجویز اس کو پسند آئی اور باوجود ماں کی مخالفت کے وہ اسی پر اڑا رہا۔ وہ دوسرے فوجی نوجوانوں کو وردی پہنکر اکڑتے ہوئے دیکھتا تھا تو اس کے دل میں بھی ولولہ پیدا ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی اسی شان سے چلے پھرے اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں۔ ایک پنشن یافتہ فوجی افسر اس کے باپ کا دوست تھا۔ یہ اس کے پاس گیا اور اس کی مدد سے فوجی اسکول میں داخل ہوگیا۔

ہر چند اس کی تنک مزاجی و خودسری یہاں بھی وہی تھی، لیکن چونکہ فطرتاً اسے فوج کے کاموں سے دلچسپی تھی اس لئے اس کے ایک اُستاد نے جس کا نام بھی مصطفیٰ تھا، اس کی محنت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کو کسی چھوٹے درجہ کی تعلیم بھی سپرد کردی۔ اسی کے ساتھ اس کے نام کے ساتھ لفظ کمال کا بھی اضافہ کردیا تاکہ اس کے اور مصطفیٰ کے نام میں امتیاز پیدا ہوجائے۔

سترہ سال کی عمر میں جب وہ اس اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوا تو مناستر کے فوجی اسکول میں بھیجدیا گیا۔ مناستر کی حالت اسوقت یہ تھی کہ فوجوں کی آمد و رفت اور توپخانوں کی نقل و حرکت سے ہر وقت ہنگامہ برپا رہتا تھا کیونکہ یونان نے جزیرۂ کریٹ پر قبضہ کرلیا تھا اور ترکی نے اعلان جنگ کردیا تھا۔ اندرون ملک کی حالت یہ تھی کہ لوگ سلطان عبدالحمید سے ناخوش تھے کیونکہ وہ جدید اصلاحات کا حامی نہ تھا اور ہزاروں نوجوان ترک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا تھے، الغرض اندر باہر ہر جگہ بدامنی، بغاوت اور بے اطمینانی نظر آتی تھی۔ مصطفیٰ کمال اب اتنا ذیہوش ہوگیا تھا کہ وہ ان تمام حالات کا مطالعہ کرتا، کسی نتیجہ تک پہونچتا اور چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند واقع ہوا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ کس نتیجہ پر پہونچا ہوگا۔

وہ تعطیلوں میں سالونیکا چلا جاتا تھا لیکن اپنی ماں سے بہت کم ملتا تھا، کیونکہ اس نے رہوڈس کے کسی تاجر سے شادی کرلی تھی اور مصطفیٰ کمال کو یہ بات کچھ پسند نہ تھی۔ سالونیکا میں اس کی ملاقات ایک دوسرے نوجوان سے ہوگئی جس کا نام فتحی تھا۔ یہ فرانسیسی زبان خوب جانتا تھا اور ان دونوں نے ملکر انقلابی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ والٹیر، روسو، ہابس اور اسٹوارٹ مل کی انقلابی و اقتصادی کتابیں خصوصیت کے ساتھ ان کے پیش نظر تھیں۔

اُس وقت وہاں ان کتابوں کا مطالعہ جرم میں داخل تھا اور جس کے پاس یہ کتابیں پائی جاتی تھیں ان کو قید کردیا جاتا تھا۔ اس مخالفت نے مصطفیٰ کمال کو اور زیادہ ان کتابوں کی طرف مائل کردیا تھا۔

مصطفےٰ کمال اسی کے ساتھ ساتھ تقریر کرنے کی بھی مشق کرتا جاتا تھا اور سپاہیوں سے یہ خیال ظاہر کرتا رہتا تھا کہ ترکی کو اغیار کے چنگل سے بچانا، سلطان عبدالحمید کی لعنت سے آزاد کرانا ہر ترک کا فرض ہے۔

جب وہ مناستر کے مدرسہ کی تعلیم ختم کر چکا، قسطنطنیہ کے مدرسۂ حربیہ میں (Sub Lieutenant) بناکر مزید تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ یہاں پہنچکر اس نے جلدی جلدی تمام امتحانات میں کامیابی حاصل کی یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں کپتانی کے عہدہ پر مامور ہو گیا۔

مناستر اور قسطنطنیہ کے حربیہ مدارس میں جن نوجوانوں سے اس کی ملاقات ہوئی، اُن سب کو اس نے انقلاب کا حامی پایا یہاں تک کہ نوجوان افسر بھی اکثر اسی خیال کے تھے۔ بلکہ قسطنطنیہ کالج میں تو ایک انقلابی سوسائٹی وطن کے نام سے قائم بھی تھی۔ اسکے خفیہ جلسوں میں مصطفےٰ کمال بھی شریک ہوتا، انقلابی نظمیں لکھتا اور انقلابی تقریریں کرتا۔ اساتذہ بھی اس سے آگاہ تھے لیکن چونکہ دل سے انقلاب کے حامی تھے، اس لئے ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ جب سلطان عبدالحمید کو خبر پہونچی اور اس نے اسماعیل حقی پاشا کو اس سوسائٹی کے استیصال پر مامور کیا تو اس کے جلسے ہونا بند ہو گئے۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے شہر کی ایک گلی میں مکان کرایہ پر لیکر وہاں خفیہ جلسے کرنا شروع کئے چونکہ مصطفےٰ کمال انقلابی لٹریچر کا کافی مطالعہ کر چکا تھا اس لئے اس نے سوسائٹی کے مخصوص قواعد مرتب کئے، خاص نشانات ممبروں کے لئے وضع کئے اور منظم طور پر لوگوں کو اس میں شریک کرنے لگا۔ لیکن دوسری طرف حکومت بھی غافل نہ تھی اور آخر کار ایک دن جبکہ سوسائٹی میں کسی نئے ممبر کو حلف دیا جانے والا تھا، پولیس نے محاصرہ کر کے اس سوسائٹی کے تمام ممبروں کو جن میں مصطفےٰ کمال بھی شامل تھا گرفتار کر لیا۔

پولیس کے پاس کافی شہادت اس جماعت کے خلاف موجود تھی اور مصطفےٰ کمال کے ختم کرنے کے لئے تو بہت مواد موجود تھا، اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح اس سے قبل اور صدہا نوجوان سلطان کے غیظ و غضب کا شکار ہو چکے ہیں، وہ بھی ہو جائیگا اور اسی یقین کے ساتھ وہ قید خانہ کی اندوہناک زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی ماں بہن نے ملنا چاہا لیکن اجازت نہیں دی گئی۔

ایک دن ناگہاں دو سپاہی آئے اور اسے اسماعیل حقی پاشا کے پاس لے گئے جو قدیم خیال کا ترک افسر تھا۔۔ اس نے مصطفےٰ کمال سے مخاطب ہو کر کہا:۔

> "اس میں شک نہیں کہ تم میں کافی اہلیت خدمت وطن کی موجود ہے، لیکن افسوس ہے کہ تم نے اس اہلیت سے اچھا کام نہ لیا، تمہارا فرض تھا کہ سلطان کے مطیع و فرمانبردار رہتے لیکن تم نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ بہر حال سلطان تم پر رحم کرنا چاہتے ہیں اور اس مرتبہ تمہارے قصور کو معاف فرماتے ہیں، تم دمشق پہونچکر رسالہ میں جاکر اپنے عہدہ کا چارج لو اور احتیاط رکھو کہ آیندہ ایسی نازیبا حرکتیں تم سے سرزد نہ ہوں۔"

اسی رات کو مصطفیٰ کمال شام کی طرف جانے والے جہاز پر بٹھا دیا گیا اور ۱۰ دن کے بعد دمشق پہونچا یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ رسالہ دروزیوں کے خلاف روانہ ہونے والا ہے۔ دروزی جنوب دمشق کے پہاڑوں میں آباد تھے اور اکثر بغاوت کیا کرتے تھے مصطفیٰ کمال کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ عملاً کسی جنگ میں حصہ لے لیکن وہ اس موقعہ سے زیادہ خوش اس لئے نہ تھا کہ دروزی کسی جگہ سامنے آکر باقاعدہ جنگ تو نہ کر سکتے تھے بلکہ صرف غارتگرانہ حیثیت سے بدامنی پھیلاتے تھے اور جب فوجوں کو مقابلہ ہوتا تھا تو پہاڑوں میں جاکر چھپ جاتے تھے۔ اس لئے ترکی فوجوں کا کام صرف یہ تھا کہ انتقام لینے یا درس دینے کے لئے اُن کے غیر آباد گاؤں میں آگ لگا دیں یا ان کی کھیتیاں جلا دیں۔

جب اس مہم سے فارغ ہوکر (جسے جنگ کہنا مناسب نہیں ہے) مصطفیٰ کمال دمشق واپس آیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ یہاں بھی فوجی افسروں کے دل انقلاب کی طرف مایل ہیں اور سلطان عبدالحمید کی حکومت سے سخت بیزار ہیں، انقلابی سوسائٹی کی ایک شاخ قایم کی اور چند دن میں وہ تمام فوج کا منظور نظر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اہل دمشق اس تحریک کے مخالف تھے اس لئے وہ انقلاب کی تحریک کا دمشق سے شروع کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

اسی زمانہ میں اس کے بعض احباب نے لکھا کہ اصل مرکز بے چینی کا بلقان ہے، اس لئے کوشش کرکے اسے سالونیکا میں آجانا چاہئے۔ اس نے فوراً چند دن کی رخصت لی اور بندرگاہ یافا پہونچا۔ یہاں کا کمانڈر احمد بے تھا جو سوسائٹی کا ممبر تھا اس سے تمام گفتگو کرکے مصطفیٰ کمال بہ تبدیل نام ولباس پاسپورٹ حاصل کرکے مصر پہونچا اور وہاں سے ایتھنز ہوتا ہوا سالونیکا میں داخل ہو گیا۔ یونہ راستے میں اسے ہر جگہ خفیہ سوسائٹیاں نظر آئیں اور سارے ملک کو موجودہ حکومت سے بیزار پایا، لیکن سالونیکا پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ انقلاب کا مرکز اگر کوئی مقام ہو سکتا ہے تو وہ صرف سالونیکا ہے۔

سالونیکا میں وہ خفیہ طور پر فوج کے افسروں اور اپنے بعض ساتھیوں سے ملا اور یہ معلوم کرکے اسے اطمینان ہوا کہ سب اس کے ہم خیال ہیں لیکن قبل اس کے کہ کوئی نتیجہ برآمد ہوتا سلطان کے جاسوسوں کو علم ہو گیا اور اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے۔ قسطنطنیہ کا اڈجوٹنٹ کمانڈر (جمیل) جو سوسائٹی کا ممبر رہ چکا تھا، اس نے مصطفیٰ کمال کو کہلا بھیجا کہ وہ دو دن احکام گرفتاری کی تعمیل کو ٹالتا رہے گا اور اس دوران میں اس کو روپوش ہو جانا چاہئے۔ مصطفیٰ کمال فوراً بھاگ کر یافا پہونچا لیکن یہاں اس کی گرفتاری کے احکام پہلے ہی پہونچ چکے تھے۔ احمد بے جو گرفتاری کے لئے مامور تھا اور جو اس کا دوست تھا اس نے مصطفیٰ کمال کی وردی اس کے سپرد کی اور اسے غازا کی طرف روانہ کر دیا جہاں مفید لطفی فوج کا کمانڈر تھا۔

ادھر احمد بے نے قسطنطنیہ کو اطلاع دی کہ مصطفیٰ کمال تو اس دوران میں برابر غازا ہی میں رہا ہے اور شام کی حدود کو چھوڑا بھی نہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ اُدھر مفید لطفی نے بھی تصدیق کر دی کہ مصطفیٰ کمال اسی کے پاس غازا میں رہا ہے اور اس طرح خدا خدا کرکے اسکی جان بچی۔

اس کے بعد ایک سال تک وہ خاموش رہا اور کوئی موقعہ شکایت کا کسی کو نہیں ملا۔ افسران نے بھی اس کے کام کے متعلق نہایت اچھی رپورٹ دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سالونیکا تبدیل کر دیا گیا جہاں پہونچنے کی اس کو بڑی تمنا تھی۔

سالونیکا میں اس کو اپنے ساتھی بہت سے ملے اور اس نے کوشش کی کہ سوسائٹی کی جدید شاخ یہاں قایم کرے لیکن اس نے محسوس کیا کہ لوگ اُس سے کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں اور جب وہ کسی مجمع میں پہونچ جاتا تو لوگ باتیں کرتے کرتے رک جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفےٰ کمال حکومت کا جاسوس بن گیا ہے۔

ایک دن اس سے کسی دوست نے بیان کیا کہ اس وقت سالونیکا میں انقلابی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے موجود ہے۔ اس کے ممبران طالوی فری میسن لاج میں شامل ہو گئے ہیں کیونکہ از روئے معاہدہ حکومت ترکی اطالوی رعایا کو گرفتار کر سکتی ہے، نہ اُن کے گھروں میں جا سکتی ہے اور اس طرح انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کو وہاں جلسہ کرنے کا پورا موقعہ مل جاتا ہے۔ اسی دوست سے مصطفےٰ کمال کو یہ بھی معلوم ہوا کہ فوج کے اکثر افسران جن میں فتحی بھی شامل ہیں اس انجمن کے ممبر ہو گئے ہیں۔

آخر کار جب مصطفےٰ کمال کی طرف سے جاسوس ہونے کا شبہ زائل ہو گیا تو انجمن نے اس کو بھی ممبر بنا لیا۔ لیکن یہاں کی فضا کو اس نے پسند نہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ لاج حقیقتاً بین الاقوامی نہلسٹوں کا مرکز ہے اور زیادہ تر یہودیوں کے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، خالص ترکی اغراض و مقاصد سے بحث نہیں کی جاتی۔ خود اُسے نہ یہودیوں سے دلچسپی تھی نہ اُن کی بین الاقوامی اہمیت سے۔ وہ ترک تھا اور صرف ترکی قوم کی ترقی اس کا حقیقی مقصود تھا۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ بالکل نووارد تھا اس لئے اُس کو اندرونی رازکی باتوں میں شریک بھی نہ لیا جاتا تھا اور یہ بالکل اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ معمولی سپاہی کی طرح صرف تعمیل فرمان کرتا رہے، وہ خود ہر جگہ چھا جانا چاہتا تھا اور دوسروں سے اپنے احکام کی تعمیل چاہتا تھا۔ اسی لئے جلسوں میں اس کا انداز گفتگو نہایت تلخ ہوا کرتا تھا اور انجمن کی تمام کارروائیوں پر سخت تنقید کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو، لیکن کام کچھ نہیں کرتے، نظریے پیش کرتے ہو مگر عمل مفقود ہے۔

اس انجمن کے قائدین میں انور، جمال، جاوید، نیازی، طلعت خاص لوگ تھے لیکن مصطفےٰ کمال ان سب کو بہت معمولی عزائم و تدابیر کا انسان سمجھتا تھا اور جب ان کا نام آتا تھا تو نہایت حقارت سے سنتا تھا اور اتنی ہی تلخی سے ان پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ الغرض وہ اپنی افتاد طبیعت و بلندی عزم کی وجہ سے انجمن اتحاد و ترقی میں کوئی خاص جگہ نہ پا سکا اور نہ دل کھول کر اس سے ملنے کی لوگوں کو ہمت ہوئی۔

(باقی)

ظلم و استبداد کے خلاف ایک خاموش جنگ

سنہ ۲۰۰۰ قبل مسیح، جزیرۂ کریٹ کی خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زر و دولت کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ وہ خود اپنی محنت سے سب کچھ حاصل کرے اور اسلاف کی جمع کردہ دولت کو ہاتھ نہ لگائے، اسی لئے ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی ساری دولت جسم کے ساتھ سپردِ زمین کردی جاتی تھی اور اولاد کا اس سے مستفید ہونا بدترین اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔ تقسیم دولت کا اصول بڑی حد تک اشتراکیت پر مبنی تھا اور ہر شخص مشغول و شاد کام زندگی بسر کرتا تھا۔ قحط و فاقہ کا کہیں نام نہ تھا۔

الفامیس کا خاندان سارے جزیرہ میں بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ اور بڑی حد تک ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ حقیقی معنی میں وہاں سرداری کوئی شئے نہ تھی۔ آپس کے فیصلے کے لئے ایک پنچایت ہوتی اور اسی کے فیصلہ پر عملدرآمد ہوتا۔

الفامیس اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا اور نہایت ہی محبوب و عزیز۔ ابھی وہ صرف چار برس کا تھا کہ یونانیوں نے جزیرہ پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنالیا۔ عورتوں کو لونڈیوں کی طرح یونانیوں کے اشارہ پر چلنا پڑتا۔ مردوں کو ساری محنت حکومت کے لئے کرنی پڑتی اور ان کے جسمانی و دماغی مصائب کا معاوضہ اتنا حقیر دیا جاتا کہ مشکل سے وہ زندگی بسر کرسکتے تھے۔

جزیرہ کی تاریخ میں یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ کسی دوسری قوم کی حکومت وہاں قایم ہوئی، یہاں کے باشندے حکومت و غلامی، سرمایہ داری و مزدوری کے حقیقی مفہوم سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ وہاں فوج تھی کہ مدافعت ہوسکتی نہ استبداد و مظالم کی وہ خوفناک تصویریں کبھی سامنے آئی تھیں جو جذبۂ انسانی کو ابھار کر قوت کے سامنے اپنا آخری قطرۂ خون پیش کردینے پر مجبور کردیتی ہیں۔

اول اول جب یونانی جزیرہ پر قابض ہوئے تو وہاں کی شادابی دیکھکر حیران رہ گئے۔ ہر طرف زر و دولت کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یونانی ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک تنکا تک وہاں کے رہنے والوں کے لئے نہ چھوڑا۔

اس غارتگری کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تباہی جس خاندان کو ہوئی وہ الفامیس کا خاندان تھا۔ کیونکہ اس نے حکومت کے آگے سر جھکانے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے تمام افراد زنجیروں میں جکڑکر جلاوطن کردئے گئے لیکن کمسن الفامیس کو اپنے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ وہ جزیرہ میں بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ دیا گیا اور ایک

غریب گھرانہ میں حکومت نے اس کی پرورش کا انتظام اسوقت تک کے لئے کردیا کہ وہ مزدوری کرنے کے قابل نہ ہو۔ تعلیم و تربیت کا کیا ذکر تھا حکومت نے متوسط الحال طبقہ کے لئے بھی اسکو ناممکن بنادیا تھا۔

نصف صدی کا زمانہ اس واقعہ پر گزر چکا ہے، جزیرہ کی تمام دولت یونان میں منتقل ہو چکی ہے۔ جہاں کی زمین زعفران اُگلتی تھی آج بنجر پڑی ہے۔ اور رعایا کی تباہی کا یہ عالم ہے کہ سامان فاقہ شکنی بھی ان کے پاس موجود نہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فحاشی مذہب کا ایک جزو قرار پاگیا تھا۔ کنواری اور حسین لڑکیاں دیویوں کے لئے وقف کردی جاتی تھیں اور کاہنوں سے مئے سوار تھیں۔

جزیرہ کی دولت کوئی پوشیدہ راز نہ تھی اس لئے حکومت کے علاوہ یونان کی پیشہ ور زنان بازاری کا بھی ایک گروہ لوٹ مچانے کو وہاں آپہونچا تھا اور حکومت نے ان پر بھی ٹیکس عاید کردئے تھے ان میں ایک نوجوان لڑکی عذرا بھی تھی۔

الفامیس غیر معمولی حسین پیدا ہوا تھا۔ جوانی نے اس کے اعضا کو حد درجہ جاذب نگاہ بنادیا تھا۔ محنت اور کاوش کی زندگی نے جہاں اس کے چہرہ پر پژمردگی پیدا کردی تھی وہیں اس کے اعضا کو مضبوط و توانا بھی بنادیا تھا۔ مردانہ حسن و شباب نے اس میں وہ تمام کیفیات پیدا کردی تھیں جنھیں دیکھ کر ایک عورت مشکل سے ضبط کرسکتی ہے۔ عذرا نے الفامیس کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس پر عاشق ہوگئی۔

الفامیس جانتا تھا کہ عذرا یونانی عورت ہے اور ایک غلام کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ آقا کی ہمقوم عورت سے محبت کرے، اس لئے باوجود اس کے کہ وہ خود بھی بیقرار تھا۔ زبان سے ایک حرف نہ نکالتا تھا اور آہستہ آہستہ محبت کی آگ میں جل رہا تھا۔ ایک زمانہ دونوں کو اس آگ میں جلتے ہوئے ہوگیا۔ اور آخر کار الفامیس، عذرا کے بے انتہا اصرار پر ایک رات اس کے مکان پر پہونچا۔ عذرا نے اسے دیکھا اور جلدی سے اُسے ایک کوچ پر لیجا کر بٹھایا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک لفظ میں اپنی تمام تمنائیں بیان کردے لیکن الفاظ اور ان کی محدود وسعتیں محبت کی ترجمانی کے لئے اسے بالکل ناکافی نظر آئیں بالآخر الفامیس کی آغوش میں ایک عجیب عالم وارفتگی میں گر پڑی اور زانو پر سر رکھ کر بالکل کھو گئی۔ جب تھوڑی دیر کے بعد اس طوفان کا زور کچھ کم ہوا تو اس نے کہا۔

"الفامیس! بولو، تمھیں کس چیز نے تکلیف پہونچائی ہے۔ خدا کے لئے مجھے ان سفید ناگنوں میں شمار نہ کرو جو تمھارے ملک اور اس کے ایک ایک فرد کا خون چوسنے آئی ہیں۔ میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔ میرا جسم اور اس کا ایک ایک ریشہ تمھارا ہے، میری روح اور اس کی تمام گہرائیاں صرف اس لئے ہیں کہ تم ان میں سما جاؤ۔ میرا وجود صرف اس لئے ہے کہ تم اس پر چھا جاؤ"

الفامیس جواب تک اظہار محبت کے رموز سے واقف نہ تھا گھبرا گیا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کس طرح جواب دے۔ ستم رسیدہ انسان کو جب کوئی ہمدرد مل جاتا ہے تو اس کے قلب میں جذبات کا ایک دریا موجزن ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کا اظہار بجز اس کے اور کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بے اختیار رونے لگے یہی حال الفامیس کا ہوا۔ عذرا کی کرمفرمائیاں اس کے لئے

بالکل نئی چیز تھی۔ بچوں کی طرح بلبلا اُٹھا اور ہچکی بندھ گئی۔

الفامیس ۔ "عذرا تم کیا کہہ رہی ہو۔ اپنی فطرت۔ اپنی قومیت اور اپنی حکومت کے خلاف تم جنگ پر آمادہ ہو؟ مجھ سے تمھیں کیوں محبت ہو۔ ممکن ہے تم بہت زیادہ مہربان آقا ثابت ہو سکو"

عذرا ۔ "آقا! لونڈی کہو، لونڈی! مجھے دُنیا کی پروا نہیں، مال و زر کی احتیاج نہیں، الفامیس! باور کرو میں دنیا کی تمام طاقتوں کے خلاف تمھاری ہو کر رہوں گی۔ روح آزاد ہے اور قید و بند کی پابندیاں کسی طرح اس پر عاید نہیں ہو سکتیں"

الفامیس ۔ "عذرا، کیا کہہ رہی ہو۔ تم آزاد ہو میں غلام۔ میری زندگی اور اسکی تمام مسرتیں محدود ہیں۔ حکومت کا قانون جزیرہ کے کسی باشندہ کو کسی یونانی لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دیتا اور شاید اسی کو روکنے کے لئے شادی پر ٹیکس عاید کر دیا گیا ہے اگر وہ ٹیکس ادا کرے گا نہ اُس کی شادی ہو گی"

عذرا ۔ "الفامیس، تم اس راز کو نہیں سمجھتے۔ حکومت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسی شادیاں بالکل روک دی جائیں۔ اصل غرض یہ ہے کہ حکومت ابھی تک اس شبہ میں ہے کہ جزیرہ والوں کے پاس ابھی روپیہ موجود ہے لیکن قدیم روایات کے مطابق وہ اسے ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے گروہ کی آمد صرف اسی غرض سے تھی کہ باشندے عشق میں مبتلا ہو کر تمام زر و جواہر حکومت کے خزانہ میں منتقل کر دیں۔ میں تمھاری بے نوائی کی شہادت خود دوں گی اور حکومت کو یقین دلا دوں گی کہ تمھارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر اس کو بھی کسی نے نہ سُنا تو ٹیکس کی رقم اپنی طرف سے ادا کر دوں گی"

اسوقت الفامیس کی حالت اس مجبور شیر کی طرح تھی جسے کٹہرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ غصہ سے اپنی بوٹی نوچنے لگا۔

الفامیس ۔ "عذرا، ہمارا ملک تباہ ہو چکا ہے۔ ایک ایک فرد دانہ دانہ کو محتاج ہے۔ تمام کھیتیاں اُجڑ چکی ہیں۔ ملک ویران ہے۔ لیکن دشمنوں کو تسکین نہیں ہوتی۔۔۔ عذرا تم نے یہ کہا کہ میرے عوض ٹیکس تم ادا کر دو گی۔ لیکن تمھیں معلوم نہیں کہ یہ احسان اور وہ بھی کسی یونانی کی طرف سے مجھے کبھی گوارا نہیں ہو سکتا"

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں الفامیس و عذرا کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ آخر کار عذرا نے درخواست دیدی کہ وہ الفامیس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور حکومت نے اجازت بھی دیدی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ الفامیس کو ایک روپیہ ٹیکس حکومت کے خزانہ میں داخل کرنا ہوگا۔ عذرا جانتی تھی کہ ایک روپیہ کی حقیر رقم بھی الفامیس ادا نہ کر سکتا تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ خود یہ ٹیکس ادا کر دے۔

الفامیس کو بھی خبر ملی۔ عذرا سے کہنے لگا۔ "عذرا تم نے سنا، حکومت نے ٹیکس لگا ہی دیا۔ ایک روپیہ کی کیا حقیقت تھی لیکن آج جان دینے پر بھی یہ روپیہ نہیں مل سکتا"

عذرا ۔ "الفامیس تمھیں یاد ہو گا میں نے ابتدا ہی میں کہا تھا کہ حکومت اپنے شبہ کو دور کرنا چاہتی ہے کہ باشندوں کے پاس دفینے ہیں یا نہیں اور اسی لئے یہ ٹیکس عاید کیا گیا ہے کہ اگر یہ صحیح ہو گا تو تم ادا کر دو گے"

کئی ہفتے گزر گئے اور الفامیس کی صورت عذرا کو دکھائی نہ دی۔ عذرا کی افسردگی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک روز کوئی مزدور، جو الفامیس کے ساتھ کھیت میں کام کرتا تھا آیا اور اس نے ایک خط عذرا کو لاکر دیا، اس میں لکھا ہوا تھا:-

عذرا!

رخصت ہوتا ہوں اور شاید پھر کبھی واپس آنے کے لئے نہیں، میری آفرینش سے قدرت کو غالباً صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وہ حد درجہ پست و ذلیل انسان کو بھی وجود میں لا سکتی ہے۔ یہی حال میرے کل ہموطنوں کا ہے۔ فطرت کی یہ سب سے بڑی ستم ظریفی تھی جو میرے لئے روا رکھی گئی۔ دنیا اور بنایت حساس۔ اول اول جب میں نے تمھیں دیکھا آنکھوں کے ساتھ روح نے بھی نہ جانے کیا شئے پائی کہ یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اگر کسی طرح اپنی کلفتوں کو فراموش کرکے سکون سے ہمکنار ہو سکتا ہوں تو محض تمھاری معیت میں۔ تم نے میری تمناؤں کی پذیرائی کی۔ یہ تمھارا وہ احسان ہے کہ اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اپنی عنایتوں سے تم نے میرے مستقبل کو اتنا شاندار بنا دیا کہ میں نے اپنے تمام آلام بھلا دئے۔ لیکن عذرا! آج اجازت دو کہ اپنی قوم کی نکبت کی صحیح ترجمانی کر سکوں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے لئے تم دولت لٹا سکتی ہو۔ بڑے سے بڑا ٹیکس ادا کر سکتی ہو۔ لیکن یہ بدترین ظلم ہوتا، اور پھر ایک غیر محدود مدت کے لئے قوم کی غلامی مسلم ہو جاتی۔ حکومت کو غلط طور پر ہماری دولت کا یقین ہو جاتا۔ اور پھر کوئی صورت نجات کی باقی نہ رہتی اس لئے آج حکومت کے اس شبہ کو اپنی جان دیکر دور کرنا چاہتا ہوں۔

الفامیس

دوسرے دن تمام جزیرہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ سمندر نے ایک لاش کنارے پر اُگل دی ہے جو بعد کو الفامیس کی ثابت ہوئی تمام جزیرہ میں اس سے شورش پھیل گئی اور جب دوسرے دن عذرا کی لاش بھی اسی حالت میں دستیاب ہوئی تو یہ شورش بغاوت میں میں تبدیل ہوگئی اور آخرکار یونانیوں کو جزیرہ چھوڑ کر اپنے ملک واپس جانا پڑا۔

الیاس (اسلامپوری)

سوئٹزرلینڈ کا آئین حکومت

(ایک تاریخی نظر)

سوئٹزرلینڈ بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس کا رقبہ صرف ۱۵۹۷۶ مربع میل ہے اور آبادی ۴۰۸۰۴۰۰ ہے۔ ہمارے بہت سے معمولی شہر اس آزاد ریاست سے کہیں بڑے ہیں۔ لیکن اکثر عبارت سے یہ مملکت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد ملک ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے یورپ کا کشمیر سمجھا جاتا ہے اور اس بنا پر کہ لیگ آف نیشنز جیسے اہم ادارہ کا صدر مقام اسی ملک کے ایک شہر جنیوا میں ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اسوقت ہمیں اس کے ان پہلوؤں سے غرض نہیں بلکہ اُس منتظم سیاسی آئین کی طرف اشارہ کرنا ہے جو دنیا کے دستوروں میں بڑے پایہ کا سمجھا جاتا ہے اور حال کے بہت سے آئینوں کا ماخذ ہے چنانچہ ترکی حکومت تو آج اسی آئین پر عمل پیرا ہے۔ خالدہ ادیب خانم نے ابھی حال ہی میں ایک لیکچر میں فرمایا کہ ترک سوئٹزرلینڈ کے دستور کو اسلامی دستور سے قریب تر سمجھتے ہیں یا کم سے کم یہ کہ کوئی بات اس دستور میں اسلامی آئین کے خلاف نہیں ہے۔

اسی دستور کے متعلق ایک انگریز ماہر سیاست لکھتا ہے:-

"افراد ملک کی وہ آزادی جو بالغ شہریوں کے سیاسی اور ملکی حقوق کی مساوات پر مبنی ہے اس قدر مکمل صورت میں کہیں نہیں پائی جاتی اسی لئے اسوقت کوئی ایسی حکومت دنیا کے پردے پر نہیں ہے جس کا وفاقی، صوبجاتی اور فرقہ وار آئین اکثریت کی مرضی پر اتنا اعتماد کرتا ہو اور نئے حالات میں بنیادی تغیرات کے لئے اس قدر آسانیاں رکھتا ہو جتنا سوئٹزرلینڈ کا مندرجہ بالا آئین۔"

سوئٹزرلینڈ کے موجودہ آئین کی پہلی تعمیری اینٹ کب رکھی گئی، اس کا بتاتا تاریخ کی بہت پیچیدہ راہوں سے گزرنا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جس شکل میں آج وہ آئین پایا جاتا ہے اس کی ابتدا ۱۸۷۴ء سے ہوئی۔ ابتدا میں سوئٹزرلینڈ بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں پر مشتمل تھا جنھیں سوئٹزرلینڈ کی اصطلاح میں کینٹون (Canton) کہتے ہیں۔ اِن ریاستوں کی شیرازہ بندی نہ کسی وفاقی آئین سے تھی، نہ کسی مرکزی قوت کے ذریعہ سے، نہ ان ریاستوں کے باشندوں کی زبان ایک تھی اور نہ ان کی روایات مشترک تھیں۔ مگر ہاں معاشرت سب کی ایک ہی قسم کی تھی اور یہی چیز اُن کے لئے پارس بن گئی۔ ہوتے ہوتے سب کے خطرات مشترک ہو گئے۔ اس لئے ان میں یہ احساس آسانی سے پیدا ہو گیا کہ ہم سب کو

متحد ہو جانا چاہئے اور ایک مرکز پر آجانا چاہئے تاکہ ہماری قوت میں اضافہ ہو اور ہم پورے طور پر دشمنوں کا مقابلہ کرسکیں۔ اس خیال نے مجلس وفاق کو پیدا کر دیا جسے فیڈریٹیڈ ڈایٹ (Federated Diet) کہتے ہیں۔

اس مجلس کا جلسہ سالانہ ہوتا تھا اور ہر ریاست اپنا نمایندہ برابر اس میں بھیجتی تھی۔ اور تمام اہم معاملات پر اس میں مشورہ ہوتا تھا۔ ہر ریاست اس مجلس کے فیصلوں کی پابند صرف اسی حالت میں ہوتی تھی جب وہ باتفاق آرا پاس ہوں۔

کچھ دنوں کے بعد تحریک اصلاح مذہب (Reformation movement) شروع ہوگئی۔ اس تحریک نے جرمنی میں جنم لیا مگر اس کی لہریں یہاں تک بھی پہونچیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ریاستیں تو پرانے مذہب کی پابند رہیں اور کچھ اس نئی مذہبی تحریک کی موید ہوگئیں۔ اس سے آپس میں اختلاف پڑ گیا اور صدیوں مجلس وفاق کا اثر نہ رہا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں انقلاب فرانس کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اہل فرانس نے سوئٹزرلینڈ پر حملہ کر دیا اور اس مملکت پر قابض ہو گئے۔ اب انھوں نے پرانے دستور کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ تمام مقامی سیاسی ادارے ختم کر دئے گئے۔ ریاستوں کی خود مختاری پامال ہوگئی اور ملک کی تقسیم بالکل نئے طریقے پر کی گئی۔ پرانی حدود کو توڑ کر نئی حدود بنائی گئیں اور کل ملک کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قومی حکومت قائم کی جسے یہ اختیار دیا کہ اہل ملک سے فوجی خدمت طلب کرسکے۔ اور جو دیہاتی خود اختیاری حکومت کو پس پشت ڈال کر جس سے عوام مانوس تھے، ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ وہ دستور جس کی رو سے اس قسم کی حکومت وجود میں آئی دستور جمہوریہ (Constitution of the Helvetic Republic) کہلایا اور ۱۲ اپریل ۱۷۹۸ء کو نافذ ہوا۔ اس دستور کی ناکامی اول ہی روز ظاہر ہوگئی، اس لئے نپولین نے ایک نیا دستور بنایا اور اُن تمام شہریوں کو جن کی عمر بیس برس تک تھی، یہ اختیار دیا کہ اس پر رائے دیں۔ ۷۲۴۵۳ نے اس کے موافق رائے دی۔ اور ۹۲۴۲۳ نے اس کے خلاف۔ اور ۱۶۷۱۷۲ غیر جانبدار رہے۔ الخاموشی نیم رضا کے اُصول کے مطابق یہ کہا گیا کہ جو لوگ غیر جانبدار رہے ہیں وہ بھی فی الحقیقت موافق ہیں اور اس لئے قانون نافذ ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۰۲ء کو قانون نافذ کر دیا گیا۔ مگر حالات نے اس آئین کو بھی ناکامیاب رکھا۔ اب کی مرتبہ نپولین نے ہر ریاست کے لئے علحدہ قانون بنایا۔ یہ قانون ایک ایکٹ کی صورت میں مدوّن ہوا جس کا نام تاریخ کی کتابوں میں ایکٹ آف میڈی ایشن (Act of Mediation) لکھا جاتا ہے۔ اور ۱۸۰۳ء میں اس کا نفاذ کر دیا گیا۔ یہ آئین بھی صرف اسی وقت تک چل سکا جب تک کہ نپولین کی شمع اقبال روشن رہی۔ جونہی اس کو زوال ہوا، یہ بھی ختم ہوگیا۔

ان تمام تغیرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اتحاد کا تصور قوی ہوتا گیا۔ چنانچہ ۷ اگست ۱۸۱۵ء کو مجلس وفاق کی پھر تجدید ہوئی اور ۲۲ ریاستوں نے آپس میں حلف اُٹھایا کہ ہر ریاست اپنا آئین بنائے گی۔ اور وہ ریاستیں جو معاہدے کی رو سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گی، نہ صرف ایک دوسرے کے آئین کی وقعت کریں گی بلکہ اُسے تسلیم بھی کریں گی۔ گویا یہ طے پایا کہ ریاستیں ایک دوسرے کے تحفظ کے لئے سیاسی اشتراک عمل کریں گی اور غیر ملکی خطرات کو روکنے کے علاوہ

امن وسکون کے قیام میں ایک دوسرے کی مددگار بھی ہوں گی۔

اب سنئے کہ ان ریاستوں کو جو معاہدے کی رو سے ایک دوسرے سے وابستہ تھیں، رفتہ رفتہ مجلس وفاق میں مخصوص اقتدار حاصل ہو گیا اور اب وہ یہ چاہنے لگیں کہ جو اختیارات ان کو حاصل ہو گئے ہیں ان میں فرق نہ آئے۔ فطرتاً اس کا ردعمل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ ہوا اور وہ یوں کہ انتہا پسند جماعت اُٹھی۔ اور اس نے یہ چاہا کہ نہ صرف ان کی خود مختاری کو ختم کر دیا جائے بلکہ مجلس وفاق ہی کو ایک سرے سے اُڑا دیا جائے اور ایک جمہوری نظام قائم کر دیا جائے۔ اس سے آپس میں اختلاف پیدا ہو گئے اور وہ اس درجہ بڑھے کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سوئٹزرلینڈ کی لڑائی (۱۸۴۷ء) میں پہلے قدامت پسندوں کو فتح ہوئی مگر اس کے بعد دوسری لڑائی میں وہ ہار گئے اور مجلس وفاق میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ خانہ جنگی اچھی چیز ہے لیکن عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد، اسی خانہ جنگی سے ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اور اس کی کوشش ہونے لگی کہ ایک ایسا آئین بنے جسے تمام ملک کی تائید حاصل ہو۔ اور جو تمام ملک کو ایک شیرازے میں منسلک کر دے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کی مجلس وفاق نے ایک ایسا آئین ترتیب دیا جس پر دونوں جماعتیں متفق ہو گئیں۔ اس آئین کی رو سے جس میں قدیم وجدید دونوں جماعتوں کے جذبات کا پاس کیا گیا تھا دو مجالس بنائی گئیں۔ ایک کا نام نیشنل کاؤنسل رکھا گیا اور دوسری کا کاؤنسل آف اسٹیٹ۔ نیشنل کاؤنسل کا انتخاب براہ راست ہوتا تھا اور ہر بیس برس کی عمر کے باشندے کو اس میں رائے دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ یہ دونوں مجالس ملکر سات ممبروں کی ایک قومی مجلس انتظامیہ تشکیل دیتی تھیں جس کا نام فیڈرل کاؤنسل تھا لیکن یہ لازمی نہیں تھا کہ فیڈرل کاؤنسل کے ممبر انھیں لوگوں میں سے منتخب کئے جائیں جو مندرجۂ بالا دو مجالس کے ممبر ہوں۔ بلکہ یہ ممبر اُن لوگوں میں سے چنے جاتے تھے جو نیشنل کاؤنسل میں جانے کے واقعی اہل ہوں۔ بعض طاقتور ریاستوں کو یہ مخصوص اختیار دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنا ایک ممبر ایسا بھیجیں لیکن کسی ریاست کو ایک سے زیادہ ممبر بھیجنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ یہ فیڈرل کاؤنسل جو تین سال کے لئے منتخب کی جاتی تھی، سوئٹزرلینڈ کی آئینی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جو چیز اس کے اندر سب سے ممتاز نظر آتی ہے، وہ اُن بائیس خود مختار ریاستوں کا آپس کا معاہدہ ہے جنھوں نے کچھ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے اور جو اس آئین کے ذریعے سے بھی اور روں سے بالادست تھیں بہت سے ایسے کام جن کے لئے وہ براہ راست مجلس وفاق کے سامنے جوابدہ نہیں تھی، فیڈرل کاؤنسل کے سپرد تھے۔ گو یہ لازم نہیں تھا کہ ان معاملات میں وہ مجلس وفاق کی رائے حاصل کرے۔

پھر رفتہ رفتہ قدامت اور انتہا پسندی کے امتزاج سے ایسا توازن قائم کر لیا گیا جس سے قدامت پسند اور انتہا پسند دونوں مجلس انتظامیہ میں شیر وشکر ہو کر کام کر سکیں۔ اور جس سے رفتہ رفتہ ایک مرکزی قوت پیدا ہو جائے جو یکساں طور پر سب کے لئے مشعل راہ ہو۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ ایک طرف تو قدامت پسند اپنے خصوصی حقوق کو جو انھیں میونسپلٹیوں اور بعض محکموں میں حاصل تھے، قائم رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انتہا پسند تمام رعایا کی آزادی کے خواہاں تھے اور مخصوص رعایتوں کو پارہ پارہ کر ڈالنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہو چلا تھا کہ تمام ملک کے لئے ایک ہی قسم کے قانون اور عدالتیں ہو جائیں اور

ریلوے وغیرہ بھی حکومت کے ہاتھ میں آجائیں۔ چنانچہ دونوں مجالس نے سنہ ۱۸۷۴ء میں یہ طے کیا کہ مروجہ قانون کو بدل دیا جائے یعنی ایک نیا قانون بنا اور وہ رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ریفرنڈم کے سپرد کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے ایک مستقل فیڈرل ٹریبونل ([illegible]) قائم کیا گیا اور فوج کا تمام انتظام فیڈریشن کے سپرد کیا گیا۔ افراد کے حقوق و آزادی ضمیر کے تحفظ کا یقین دلایا گیا اور فیڈرل کاؤنسل اور فیڈرل ٹریبونل کے تحت میں یہ سب کچھ دیدیا گیا۔ کیونکہ اب تحفظات حقوق و آزادی ضمیر دستور کے اساسی اجزا بن کر مجلس واضع قوانین کے حلقے سے نکل چکے تھے۔ ریلوے کے انتظام کی ذمہ داری اور وضع قوانین پر ریفرنڈم بھی دستور میں ایزاد کئے گئے۔ یہ بڑا اہم تغیر تھا اور اس کے ذریعے سے آئین میں خاصا انقلاب ہو گیا لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس آئین کے ذریعے سے بھی سوائے اُن ریاستوں کے جنھوں نے اپنے اختیارات کو مرکز کے اختیارات میں مدغم کر دیا تھا، باقی ریاستوں کو خود مختارانہ اختیارات حاصل تھے۔ اور گو اس آئین کے ذریعہ سے ریاستوں کے اختیارات بڑھ گئے۔ مگر فی الحقیقت ریاستوں کی انفرادیت پامال نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس آئین میں بھی یہی رکھا گیا کہ ایک مرکزی مجلس کا تو انتخاب براہ راست تمام باشندے کریں اور دوسری مجلس کے ممبران ریاستوں سے نامزد ہو کر آئیں۔ مجلس انتظامیہ بھی تقریباً اسی اصول پر رکھی گئی۔ اس کے صدر کو کوئی اختیارات نہیں۔ وہ صرف سال بھر کے لئے مقرر ہوتا ہے اور جس طرح دیگر ممبران کسی نہ کسی محکمے کے انچارج ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک محکمے کا انچارج ہوتا ہے سنہ ۱۸۷۴ء کا دستور اجازت دیتا تھا کہ ریفرنڈم سے اس صورت میں ترمیم ہو سکیگی جب کہ ترمیم کے منظور ہونے کے لئے نمایندگانِ جمہور اور نمایندگان ریاست دونوں کی اکثریت ہو۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں ایک شق یہ بھی بڑھائی گئی کہ عوام کے مطالبے پر تغیرات بھی ہو سکیں گے۔

(باقی)

(ڈاکٹر) سید نجم الدین احمد جعفری (بیرسٹر)

باب المراسلۃ والمناظرہ

حیدر آباد کے نواب بہادر یار جنگ سے چند استفسارات مہدوی عقاید کے متعلق

نواب بہادر یار جنگ ۔ صدر کانفرنس مہدویان ہند
مہدوی منزل ۔ بیگم بازار ۔ حیدر آباد دکن

مکرم من

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ مزاج شریف ۔ فروری ۱۹۳۵ء کے نگار میں باب الاستفسار کے تحت جناب نے "مہدوی جماعت اور امام مہدی" کے عنوان پر روشنی ڈالی ہے جناب مہدی سے متعلق دوسرے فقرے میں جناب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے گو مجھے اس سے بھی اختلاف ہے مگر میں اس پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے خیال میں اب ہرگز وقت نہیں ہے کہ مسلمان آپس میں ان مسائل مختلف فیہ کے متعلق اُلجھیں اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوں لیکن مہدوی جماعت سے متعلق فقرۂ اول میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ان میں سے دو اُمور کی طرف آپ کو توجہ دلانا ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ اس سے مہدوی جماعت کی نسبت غلط فہمی کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ شاہ مظفر گجراتی اور اورنگ زیب کے ڈر سے مہدوی جماعت نے "تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اس کے عادی ہیں" یہ خبر میرے لئے جو مہدوی ہوں اور جس کا خاندان گزشتہ تین سو سال سے اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے بالکل نئی ہے ۔ اور نہ صرف ایک مہدوی کے اصول و عمل کے خلاف بلکہ برعکس ہے مہدوی جماعت ہمیشہ اور تاریخ کے ہر دور میں اظہار حق اور آزادانہ اپنے عقیدہ کے اظہار میں مشہور رہی ہے ہر زمانہ میں اس جماعت پر اسی آزادانہ اظہار مذہب کی وجہ سے مصیبتیں آئیں اس کو اپنے وطن سے خارج کیا گیا۔ قتل و خونریزی تک نوبت پہونچی مگر کبھی اس نے اظہار حق سے گریز کیا نہ تلبیس حق بالباطل کی مرتکب ہوئی۔ عالمگیر کا یہ قول اس جماعت میں بالتواتر مشہور ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "از تقیۂ شیعاں و از اظہار مہدویاں تنگ آمدہ ام" حیدر آباد میں مہدوی بہ تعداد کثیر آباد ہیں اور آج تک ان پر کسی نے یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ تقیہ کرتے ہیں۔

میں بحیثیت ایک مہدوی کے آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مہدویہ کے نزدیک تقیہ کذب ہے اور کذب ممنوع و مستوجب۔ وہ تقیہ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور آپ کو یہ اطلاع جو ملی ہے کہ وہ تقیہ کرنے لگے یا کرتے ہیں صریح غلط اور اس قابل ہے کہ براہ عنایت آپ نگار کی آیندہ اشاعت میں اس کی تردید فرمادیں۔

فقرۂ اول کا آخری جزو "شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں سے مختلف ہیں" بھی اس قابل ہے کہ اس کی تردید کی جائے جن ذرائع سے آپ نے یہ معلومات حاصل کیں مجھے افسوس ہے کہ وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ سوا مسئلۂ مہدویت کے کہ حضرت سیدنا و امامنا سید محمد علیہ السلام مہدی موعود آخر الزمان تھے مہدوی جماعت اہل سنت والجماعت کے معتقدات سے کوئی اصولی یا فروعی اختلاف نہیں رکھتی۔ مہدویوں کی فقہ اہل سنت کی فقہ ہے عبادات و معاملات و فرایض وغیرہ کسی امر میں ان کا کوئی جداگانہ عمل نہیں ہے۔ وہ ائمہ اربعہ کو مانتے ہیں اور بجز مسئلہ قرأت خلف الامام کے (جس میں وہ حضرت امام شافعی کی تقلید کرتے ہیں) بقیہ تمام امور میں وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ اگر شادی و غمی کے رسوم سے آپ کی مراد وہ ہندی رسوم ہیں جو ہندوستان میں اقامت کے بعد مسلمانوں کی تقاریب میں شامل ہوگئے مثلاً ہلدی مہندی شب گشت وغیرہ تو اس سے شاید ہی مسلمانوں کا کوئی فرقہ بچا ہوا ہو لیکن اگر طریقہ نکاح ایجاب و قبول گواہ و وکیل اور تکفین و تدفین میں آپ کا خیال ہے کہ مہدوی احکام اسلام اور عام مسلمانوں کے خلاف کوئی اور طریقۂ عمل رکھتے ہیں تو میں اس کی سختی سے تردید کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مہدویہ کا عمل ان تمام تقاریب میں وہی ہے جو عامۃ المسلمین کا ہے اور جو بالکل احکام اسلام کے مطابق ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ اپنی معلومات کی حد تک لکھا اور ان میں غلط ذرائع کی بناء پر غلطی کا واقع ہوجانا ممکن ہے اس لئے مجھے آپ سے شکایت نہیں ہے۔ مگر متوقع ہوں کہ اگر آپ میرے اس خط کو بھی تقیہ نہیں سمجھتے ہیں تو براہ کرم اپنی طرف سے یا میری طرف سے نگار کے صفحات پر مذکورہ دونوں امور سے متعلق تردید شایع فرماکر مجھے اور تمام جماعت مہدویہ کو ممنون فرمائیں۔

(نگار) میں نے فروری ۳۵ء کے نگار میں آپ کی جماعت کے بانی و مؤسس کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ نہایت مختصر بلکہ مقتصر تھا، کیونکہ میں خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کسی مسلک یا مشرب کے اُن جزئیات سے بحث کی جائے جن کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے۔ اور جن کے اعلان و اظہار پر بھی اب اس مسلک کی طرف سے کوئی اصرار نہیں کیا جاتا۔ لیکن آپ کی اس تحریر نے مجبور کر دیا کہ اب میں کسی قدر تفصیل سے کام لوں۔

اگر آپ صرف یہ لکھ دیتے کہ مہدوی جماعت تقیہ کی مخالف ہے تو بھی غنیمت تھا، اگر آپ محض اس تحریر پر اکتفا کرتے کہ

شادی و موت کے مراسم اُن کے یہاں مخصوص نہیں، تو بھی میں خاموش ہوجاتا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ کی تحریر سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ "مہدوی جماعت اہل السنت والجماعت کے عقاید سے کوئی اُصولی یا فروعی اختلاف نہیں رکھتی"

اس لحاظ سے کہ آپ کو فرقۂ مہدویانِ ہند کے صدر ہونے کا فخر حاصل ہے، یقیناً آپ کی معلومات اس باب میں زیادہ وسیع ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے علم ویقین کا ذریعہ کیا ہوسکتا ہے۔

اس کا دعویٰ تو غالباً آپ کو بھی نہ ہوگا کہ مہدوی عقاید کا علم آپ کو براہِ راست جناب سید محمد کی ذاتِ گرامی سے حاصل ہوا ہے، یا یہ کہ انھیں کی روحِ مقدس سے بلا کسی واسطہ کے آپ کو فیضان ہوا ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے علم کا ذریعہ بھی وہی کتابیں ہوں گی جو آپ کے اسلاف اور سید محمد صاحب کے اخلاف نے لکھی ہیں (اور ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا کہ مہدوی جماعت کے عقاید اُصول و فروع میں بالکل اہلسنت والجماعت کے مماثل ہیں) حیران ہوں کہ اگر یہ تقیہ نہیں ہے تو کیا ہے؟

میں فی الحال اس مسئلہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ جناب سید محمد جونپوری کا دعوائے مہدویت درست تھا یا غلط یا یہ کہ خود ظہورِ مہدی کا عقیدہ ہی سرے سے قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ اور نہ میں جناب سید محمد اور مسلکِ مہدوین کی سیرت و تاریخ پر نقد و تبصرہ کرکے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حقائق میں اوہام کو اور واقعات میں عجائب و غرائب کو کس کس طرح مخلوط کرکے عوام کو اس طرف مایل کیا گیا۔ بلکہ میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ کا دعویٰ عقاید کے متعلق کس حد تک درست ہے اور آپ کیونکر اپنے آپ کو اہل السنت والجماعت کے عقاید کا پیرو کہہ سکتے ہیں۔

ا۔ آپ کو معلوم ہوگا (اور آپ ہی کو علم نہ ہوگا تو کس کو ہوگا) کہ آپ کے مسلک میں جناب سید محمد جونپوری کی مہدویت کی تصدیق فرض ہے، اور ۹۰۵ھ کے بعد سے (جب انھوں نے اعلانِ مہدویت کیا تھا) اس وقت تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں یا آیندہ پیدا ہوں گے وہ سب بہ سبب انکارِ مہدویت کافرِ مطلق ہیں۔ اس لئے اہل السنت والجماعت جو اُن کی مہدویت کے قایل نہیں ہیں، آپ کے نزدیک کافر ہوئے۔ پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا یہ فرمانا کہ آپ کے عقاید وہی ہیں جو اہلِ سنت کے ہیں۔ یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ ایک کافر جماعت کے عقاید کی تصدیق کرنے والے ہیں؟ — اچھا اس کو بھی جانے دیجئے۔ ممکن ہے آپ اسے مغالطۂ منطقی قرار دیں، اور آگے چلئے۔

(۲) کیا آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ سید محمد صاحب خلفاء راشدین سے بہ لحاظ فضایل بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں؟ کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ سید محمد جونپوری قولاً و فعلاً معصوم تھے اور نیز یہ کہ بہ لحاظ مرتبہ وہ رسول اللہ کے برابر تھے — کیا آپ کی کتابوں میں یہ روایت نہیں پائی جاتی کہ تمام انبیا ناقص الاسلام تھے اور اس نقص کی تفصیل اس طرح بیان نہیں کی گئی کہ حضرت آدم صرف سر سے ناک تک مسلمان تھے، نوحؑ سر سے حلق تک، ابراہیم و موسیٰ سینہ تک اور عیسیٰ ناف تک مسلمان تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اہل سنت میں وہ کونسی جماعت ہے جو ان عقاید کی ماننے والی ہے۔ اگر آج بھی

آپ علماء اہل سنت سے استفسار کریں تو بالاتفاق سب کی طرف سے یہی جواب ملیگا کہ ان عقاید کا پیرو کافر و بیدین ہے۔

(۳) کیا عقیدہ خوند میر ہی، جسے آپ حضرات "ام العقائد" کہتے ہیں، یہ مذکور نہیں کہ مومن کامل وہی ہے جو دنیا ترک کردے اور معاش و معیشت کے لئے کوئی سعی و عمل نہ کرے، اور کیا عقیدہ کی رو سے وہ شخص جو خدا کو بچشم سر یا خواب میں نہ دیکھے، مومن کہلایا جا سکتا ہے۔ مجھے اس سے مطلب نہیں کہ آپ نے دنیا کو ترک کرنے کے بجائے اُسے "بہادر یار جنگ" ہونے کی حد تک حاصل کیا ہے، مومن ہیں یا نہیں، اور نہ میں یہ سوال کرنے کا مجاز ہوں کہ آپ نے خدا کو کب اور کس طرح دیکھا کہ آپ اس جماعت کی سرداری کے مستحق سمجھے گئے۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ جس حد تک اہل سنت کے عقاید کا تعلق ہے وہ ان دونوں باتوں سے بالکل علحدہ ہیں۔ نہ وہ ترک دنیا کو مستحسن جانتے ہیں اور نہ رویت خداوندی کو اسلام کی ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔

(۴) کیا سید محمد صاحب نے اہل سنت کی فرضی نمازوں کے علاوہ ایک اور نماز، ۲۷ رمضان کی فرض قرار نہیں دی (ملاحظہ ہو تالیف سید محمد مصطفیٰ مہدوی) اور کیا انھوں نے مال کی قلت و کثرت دونوں حالتوں میں زکوٰۃ میں بجائے چالیسویں حصہ کے دسواں حصہ ادا کرنا فرض قرار نہیں دیا۔ (ملاحظہ ہو زبدۃ البراہین مصنفہ سید عبدالرحیم بن اسحاق بن عبدالحی مہدوی) ۔حیرت ہے کہ باوجود اس کے اصول و فروع دونوں میں اپنے آپ کو اہل سنت کا مماثل کہتے ہیں علماء اہل سنت سے دریافت کیجئے کہ وہ ان بدعات کے مخترع کو کیا کہتے ہیں اور ان کے ماننے والوں کو کیا سمجھتے ہیں۔

(۵) شواہد الولایت جو برہان الدین (سید محمد جونپوری کے داماد تھے) کی تالیف ہے اور آپ کے یہاں بڑے مرتبہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کے اکتیسویں باب میں لکھا ہے کہ رسول اللہ نے مہدی کے اصحاب کا مرتبہ اپنے برابر ظاہر کیا ہے اور ان کے متعلق "ہم اخوانی بمنزلتی" کے الفاظ کہے ہیں۔ گویا بہ الفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ سید محمد صاحب کا مرتبہ رسول اللہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ اہل سنت کس حد تک اس عقیدہ کے پابند ہیں اور جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے، اس کے متعلق ان کی کیا رائے ہو سکتی ہے۔

(۶) پنج فضائل میں درج ہے کہ محشر میں محمد رسول اللہ اور سید محمد دونوں ایک نوری ہاتھی پر سوار ہوں گے جسکا نام محمودہ ہوگا، اور تمام انبیاء وغیرہ جلو میں ہوں گے، دانت اس ہاتھی کے اتنے لمبے ہوں گے کہ اس پر تمام فرقۂ مہدویہ سوار ہوگا، جب اس جلوس کا گشت ختم ہو جائے گا تو خدا کے روبرو ہاتھی آئے گا اور یہاں بی بی مریم کا نکاح رسول اللہ کے ساتھ اور بی بی آسیہ کا سید محمد جونپوری کے ساتھ ہوگا۔

معاف فرمائیے کیا اہل سنت اس عقیدہ کو برداشت کر سکتے ہیں۔

(۷) تنبیہ الغافلین میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ مہدوی جماعت کے لوگ اپنے جھونپڑے برابر برابر بنایا کرتے تھے۔

اور ہر جھونپڑے میں روزن ہوتا تھا تاکہ دوسرے جھونپڑے والے کے افعال سے آگاہ رہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک مہدوی اپنی عورت سے صحبت کرتا تو دوسرا مہدوی اسے دیکھتا رہتا اور یہ صرف اس لئے کہ تمام مہدوی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

کیا اہل سنت کی شریعت میں اس حرکت کو کبھی روا رکھا گیا ہے۔

(۸) جوہر نامہ میں مرقوم ہے کہ اس جماعت کے نزدیک کائنات میں چند چیزیں ایسی ہیں جو خدا کی مخلوق نہیں ہیں اور بعض ایک حیثیت سے مخلوق ہیں اور دوسری حیثیت سے غیر مخلوق۔ قسم اول میں جوہر اول اور روحِ حقیقی شامل ہیں، دوسری قسم میں رسول اللہ اور سید محمد جونپوری۔

اہل سنت کے نزدیک یہ عقیدہ شرک فی التوحید ہے اور اُن کے اُصول عقاید کے بالکل منافی۔

(۹) انصاف نامہ کے باب ہشتم سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں نعمت و خوندمیر نے جو مہدوی جماعت کے اولیا رکرام ہوئے ہیں مہاجر کے ترکہ میں اس کے جائز وارثوں کا کوئی حق نہیں رکھا بلکہ مہاجرین ہی میں اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔

کیا یہ فیصلہ احکام قرآنی کے خلاف نہیں ہے اور کیا اہل سنت اس کو کبھی گوارا کر سکتے ہیں۔

(۱۰)۔ مہدویہ کا عقیدہ ہے کہ اگر آنحضرت کے پاس ایک صدیق تھے تو سید محمد کے دربار میں دو تھے (سید محمود اور خوندمیر)، اگر رسول اللہ کے خلفاء راشدین چار تھے تو یہاں پانچ ہوئے ہیں اگر وہاں دس صحابیوں کو مغفرت کی بشارت دی گئی تھی تو یہاں بارہ صحابیوں کو۔ اگر رسول اللہ کی اُمت میں بہتر فرقے ہوئے تو یہاں چوہتر ہوئے جن میں صرف ایک عقیدۂ خوندمیر والا ناجی ہو۔ خوندمیر کو اسد اللہ الغالب کا بھی لقب دیتے ہیں اور ان کے بیٹے سید محمود کو امام حسین کے برابر بلکہ ان سے بہتر جانکر حسینِ ولایت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں مثلاً سید محمد جونپوری کی معراج، ان پر وحی کا نزول وغیرہ ایسی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد ایک سنی تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اُن کے عقیدہ کے آدمی ہیں۔ آپ خود جو چاہیں سمجھیں اور کہیں۔

ممکن ہے آپ یہ فرمائیں کہ اسلام کے اُصولی عقاید صرف توحید و تصدیق رسالت ہیں، اور چونکہ مہدوئین ان دونوں کے ماننے والے ہیں اس لئے اصولاً وہ مسلمانوں سے علحدہ نہیں ہو سکتے۔ میں اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیار ہوں، اور آپ کو کم از کم میں تو ضرور مسلمان کہدوں گا لیکن محض مسلمان ہونا تو اہل سنت میں شامل نہیں کر سکتا، ورنہ یوں تو شیعہ، خارجی، معتزلی وغیرہ سب اپنے آپ کو اہل سنت کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کے عقاید جنھیں بظاہر فروع سمجھا جاتا ہے۔ اُصول کو مجروح کرنے والے ہیں اور جس طرح آپکے نزدیک تمام اہل عالم کافر ہیں، بالکل اسی طرح اہل سنت کے نزدیک آپ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، کیونکہ آپ اپنے عقاید کی رو سے شرک فی التوحید، توہین رسول، ناجائز تاویل قرآنی، انحراف شرع وغیرہ سبھی کے مرتکب ہوتے ہیں، جن میں ہر چیز علحدہ علحدہ ایک شخص کو کافر بنا دینے کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ ان سب کا اجتماع کہ اگر جبرئیل بھی فرقۂ مہدوین کے اسلام کی شہادت دیں تو اہل سنت کا حقیر سے حقیر مولوی بھی ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔

مکتوبات نیاز

مکتوبات کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا کیونکہ اُن کو کتابی صورت میں شایع کرنے کے لئے تمام مسودات کاتب کو دئے جا چکے ہیں۔ لیکن ناظرین نگار کے پُرشوق اصرار کے سامنے ہم کو آخرکار پھر مجبور ہو جانا پڑا اور اب پھر اس سلسلہ کو شروع کیا جاتا ہے۔ مکتوبات نیاز دو ماہ کے اندر کتابی صورت میں شایع ہو جائیں گے اور ان میں علاوہ شایع شدہ مکاتیب کے، ایسے خطوط بھی ہوں گے جو اس وقت تک نگار میں شایع نہیں ہوئے اور نہ آیندہ ہوں گے۔

نیاز

سرکار — عتاب نامہ ملا۔ اگر یہ کہوں کہ اس کو دیکھ کر میں کانپ اُٹھا تو واقعہ کے خلاف ہوگا اور یہ نہ کہوں تو آپ اور زیادہ برہم ہوں گے۔ عجیب کشمکش میں ہوں کہ آپ کے غصہ کا احترام اور اپنی بے گناہی کا وقار دونوں بیک وقت کیونکر قائم رہ سکتے ہیں۔

اب تو کئی دن گزر گئے ہیں، غالباً غصہ کم ہو گیا ہوگا اور اپنی رنجش بیجا کا احساس تو خیر کیا، لیکن کم از کم دوسروں کی معذرت سننے کی تاب ضرور پیدا ہو گئی ہوگی۔

میں اصل معاملہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا، بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں آپ کا دشمن ہو سکتا ہوں، کیا میں اس درجہ بد اخلاق ہو سکتا ہوں کہ آپ اپنے محسن و کرمفرما سے منحرف ہو جاؤں۔ — آپ کو تو خیر کیا غصہ آیا ہوگا — غصہ مجھے آیا ہے جب آپ کا خط ملا اور میں نے دیکھا کہ آپ کے یہاں قدرِ وفا اس طرح کی جاتی ہے۔ بہرحال میں پھر وہی عرض کرتا ہوں جو اس سے قبل بارہا عرض کر چکا ہوں اور اگر اب بھی آپ کو اعتماد نہیں تو خدا حافظ۔

اگر ز بندگیِ چوں منے ترا عار ست
تو زندہ باش خریدار بندہ بسیار ست

اجی، کیوں بناتے ہو — وہ اور التفات جنھیں ظلم کرنا بھی گوارا نہیں! وہ تو کہئے

خود را بزور بر ستم یار بستہ ایم

ورنہ یہ ساری "میرزائشی" کب کی خاک میں ملگئی ہوتی۔

سچ پوچھو تو وضع نباہ رہا ہوں، ورنہ

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

یہ جانتا ہوں کہ فطرت بُری نہیں، خو بُری ہے اور یہ تم جانتے ہو کہ "خوئے بد" کے لئے بہانوں کی کمی نہیں۔ بہرحال مجھے کوئی خاص شکایت اُن سے نہیں ہے اور ہو بھی تو کس اُمید پر۔ تم نے یہ ذکر کر کے دبی ہوئی چوٹ اُبھار دی، اچھا نہ کیا مگر تم کیا اُن سے کم ہو۔ میں ایک ہفتہ کے بعد کلکتہ جا رہا ہوں۔ اگر تم نے حد درجہ اصرار کیا تو شاید ایک دن کے لئے تمھارے پاس ٹھہر جاؤں، ورنہ جی تو نہیں چاہتا۔

بیرحم و غافل اینچنیں، سفاک و قاتل اینچنیں!

میرے دوست۔

میں جانتا تھا کہ اُس محفل میں میرا ذکر آئے اور تم دبی زبان سے بھی کچھ نہ کہو۔ قیامت تک ممکن نہیں۔ واللہ لطف آگیا۔ تم یوں صاف صاف کہتے تو بات ہی کیا تھی، بہرحال تمہارا مقصود پورا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، میرا ذوق ضرور ایک حد تک آسودہ ہوگیا

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کسے!

صدیقی — جی ہاں، میں کشمیر سے واپس آگیا۔ لیکن اب آپ کو ساری داستان سُنانے بیٹھ جاؤں یہ میرے بس کی بات نہیں

حرفے ست ایں کہ در شب مہتاب گفتنی ست

اور اس کا موقعہ اب شاید ہی کبھی اس زندگی میں میسر آئے۔ چاندنی نام ہے انعکاس ماہ کا، نسیم باغ کی آبشاروں میں شالامار کے فواروں میں۔ سو وہ یہاں کہاں؟ آپ پوچھتے ہیں کہ وہاں سے آپ کے لئے کیا لایا۔ یہ پوچھئے کہ پاس کیا تھا جو بچا لایا۔

سرزمین حُسن و عشق کے زائرین کے لئے مایۂ ناز تہیدستی ہوا کرتی ہے نہ کہ پُرمایگی۔ مگر آپ اس سے کیا واقف۔ کبھی قربانی کی ہوتی تو جانتے۔

کرم نمائی کا شکریہ — ایک جلد "جمالستان" کی پیش کرتا ہوں، جب مشاغل حیات سے فارغ ہو کر آپ کسی اور کام میں وقت صرف کرنا پسند کریں تو اس مجموعہ پر بھی اک نگاہ ڈال لیجئے۔

داد کا طالب ہوں، کیونکہ شاعرانہ انکسار سے کام لیکر کبھی میں نے خود بھی اس کی بُرائی کسی سے نہیں کی — آپ اسکو جس نگاہ سے دیکھیں، لیکن چونکہ میرے ماضی کے بہت سے نقوش اس میں مرتسم ہیں اس لئے میں تو ان کی پرستش کرتا ہوں،

[redacted]

اور یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ:-

خود نمائی ندا شناسیہاست !

بندہ نواز — باور کیجئے "پیرِ کنعاں" کی طرح پیراہن پرست نہیں ہوں - زمرۂ اہلِ یقین سے ہوں۔ خلوتیانِ راز میں سے ہوں، اور جو کچھ کہتا ہوں اس کی حقیقت مولانا روم بیان ہی کر چکے ہیں کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس میں شک نہیں کہ صورت و وضع کے لحاظ سے وہ بہت دلکش چیز ہیں، علاوہ اس کے آنکھوں میں کشش بھی ہے اور باتوں میں کافی سے زیادہ دلربایانہ انداز بھی — لیکن آپ اس تبلیغ کو عمرو زید تک محدود رکھئے تو بہتر ہے، ورنہ کیا فائدہ، کسی وقت کوئی "رندِ ژولیدہ مو" بگڑ گیا اور ان کی کارگاہ درویشی کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھدئے۔

رہا میرا سوال، سو آپ کے فرمان کی تعمیل میں، لات و منات کی پرستش پر بھی طیار ہوں، ورنہ یوں آپ واقف ہی ہیں کہ میں خود کس مرتبہ کا انسان ہوں۔

ز طوطیانِ شکرخا نگوئے و از من جوئے
نشاطِ زمزمہ و لذتِ جگر خواری

آپ زندہ رہیں کہ آپ کی زندگی، زندگی ہے، میں کیا اور میری حیات کیا، حشرات الارض اپنے وجود کو گوارا بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ درندے نہیں ہیں، حالانکہ نظام عالم قائم ہے صرف درندگی پر اور جو سب سے زیادہ درندہ ہے، اسی کو سب سے زیادہ جینے کا حق حاصل ہے۔

بہرحال آپ کے ولولۂ حیات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں مگر رشک نہیں کرتا، خوشی اس لئے کہ اپنے حلقہ میں کوئی ایک تو "نبرد آزما" نکلا اور رشک نہ کرنے کا سبب یہ کہ میں آپ کی سطح پر آنے کا اہل ہی نہیں، سوختہ پر بھی ہوں اور شکستہ ناخن بھی۔

برنمی آید دلم با روزگار
شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم

اگر میں کبھی خط بھیجنے میں تاخیر سے کام لیتا ہوں تو خیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ

ہر دم ز یاد دم نی ردی تا یاد بسیار ست کنم

لیکن تم اپنے تغافل کی کیا تاویل کر سکتے ہو۔

تیغ برکف، بادہ در سر، خندہ پنہاں زیر لب

خیر یہاں تک تو صرف شاعری تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے کچھ خوش نہیں ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تمھیں یاد رکھوں۔ میں نے چلتے وقت تم سے کس منت سے کہا تھا کہ دیکھو عزیز کا خیال رکھنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا، لیکن مجھے یہ سنکر سخت صدمہ ہوا کہ تم اس غریب کو کبھی کبھی حاضری کا بھی موقعہ نہیں دیتے، ہمدردی کیا خاک کروگے۔

بہرحال میں تو مایوس ہوچکا ہوں اور اس لئے مطمئن ہوں، اس غریب کو ابھی تک البتہ یقین نہیں آیا کہ تم اسدرجہ سنگ دل ہو، لیکن آخر کب تک، ایک نہ ایک دن کلیجہ پر پتھر رکھ کر وہ بھی بیٹھ جائے گا۔

عزیز گرامی ــ کل مکتوب سامی ملا۔ آج اُس کی تعمیل کر رہا ہوں۔ امتثال امر کی اگر کوئی اور ایسی مثال نظر آئے تو مجھے بھی مطلع فرمائیے گا۔

تصویر بھی حاضر ہے اور سوانح حیات بھی۔ یہ بھی مختصر وہ بھی مختصر۔ خدا کرے آپ آیندہ جغرافیہ و ریاضی کے جھگڑوں میں مجھے مبتلا نہ کریں، کیونکہ مجھے بھی یاد نہیں کہ کب اور کہاں پیدا ہوا، زندگی کے دیگر سوانح کا ضبط و انحصار کیسا۔ تاہم سنہ پیدائش و وفات کی جگہ آپ "ازل تا ابد" لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی جگہ صرف یہ شعر

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم

صدیق مکرم۔

لطفِ عمیم نہیں چاہتا، نوازشِ خاص کا طلبگار ہوں، نگاہِ تماشہ طلب نہیں رکھتا کہ تماشائے نگاہ کی تمنا ہو۔ دنیا کے ساتھ آپ کا جو معاملہ بھی ہو، مجھے اس سے غرض نہیں، میں تو کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں جو میرے اور صرف میرے لئے ہو۔ اس لئے سوال التفات و عنایت کا نہیں۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو

خدا کرے یہ تقریب حسب دلخواہ انجام کو پہونچ جائے۔ دعاگو ہوں، جہاں رہونگا یہی زبان سے نکلے گا۔ شرکت پر اصرار نہ فرمائیے آپ کا حلقۂ احباب وسیع اور یہاں "طبع اندوہگیں" کا یہ عالم کہ خود اپنی زندگی سے بیزار۔ ممکن ہے کوئی صورت ناخوشگوار پیدا ہو جائے۔

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بُردیم دنیا را

قبلۂ محترم ۔ نامۂ گرامی جسے " دفترِ تدبیر و مصلحت " کہنا زیادہ موزوں ہوگا، پہونچا، ان مخلصانہ ہمدردیوں کا شکریہ لیکن کیا کروں فطرتاً کج بیں ہوں، اور آپ کی " صراطِ مستقیم " مجھے نظر ہی نہیں آتی، آپ فرماتے ہیں کہ بدنامی و رسوائی بری چیز ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں ۔

عشق منت می نہد آنرا کہ رسوا می کند

آپ کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ آنکھ بند کرکے اس آواز کی طرف چلو جدھر ساری دنیا جا رہی ہے، یہاں فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ جب تک خود اپنے اندر سے کوئی آواز پیدا نہ ہو قدم نہ اٹھاؤ ۔ آپ جرسِ کارواں کے پابند، میں صدائے قلب کا متمنی، آپ کو ایمن و طور کی جستجو اور یہاں

پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

الغرض ۔۔ من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

آپ ہی فرمائیے اتحادِ خیال کی کیا صورت ہو سکتی ہے ۔ تاہم آپ نے جس محبت و خلوص سے میری رہبری فرمائی ہے اس کی ضرور قدر کرتا ہوں اور متمنی ہوں کہ گاہے گاہے اس " خانماں خراب " کو ضرور یاد فرماتے رہیں ۔

" بزمِ سرور " کا اولین پیام اور میرے لئے !

بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم سبے

اربابِ بزم کی اس " رعایتِ ذوق " کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں ۔ فی الحال اس " اعترافِ عجز " ہی کو قبول کیجئے، شبِ ماہ سبزہ زار اور چند نوجوانوں کا اجتماع ! یہ آپ نے کیا سنایا، یہ میں نے کیا سنا معاذاللہ !

بہ بر مید از من دیوانہ بہ طفلاں خبرے

میں نے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا کہ شاید مجھے بھی " دعوتِ آب ہوا " دی گئی ہو ۔ لیکن پھر یہ سوچکر کہ

بچہ رو بہ جلوہ آید طلب نیاز منداں

نہ دل نیاز خرم نہ لب امید خنداں

صبر کرکے بیٹھ گیا ۔۔۔ تاہم میری دعائیں، میری تمنائیں اور میری ہر وہ خواہش جو پوری نہیں ہو سکتی آپ کے ساتھ ہے اور میری زندگی کے لئے یہ کیا کم ہے کہ

" ہوں تو کسی کی نگاہ میں ! "

کیوں صاحب خود ہی بدگمان ہونا اور خود ہی روٹھ جانا! قیس و فرہاد ہوتے تو ایک نہ ایک دن تنگ آکر وہ بھی استعفائے محبت پیش کر دیتے، چہ جائیکہ وہ جو خود "نازکیتائی" میں آپ سے کسی طرح کم نہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ آئینِ وفاکیشی میں جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے، اس سے وہ غریب زیادہ واقف نہیں، لیکن آپ اپنی دل آزاریوں کو بھی تو دیکھئے کہ رستم و اسفندیار ہوں تو وہ بھی خون تھوکنے لگیں، چہ جائیکہ اس نزاکت پسند متمدن دور کا آپ ہی کی طرح ایک نازک انسان۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی ان تمام بدگمانیوں کا باعث آپ کی شدید وابستگی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ہی کی تسکین سے کب اس کا اضطراب دور ہوتا ہے۔ نہ اُس کے شوق میں اعتدال، نہ آپ کی دارو گیر کی کوئی انتہا۔ ایک نہ ایک دن اس "کارگاہِ مینائی" کا ٹوٹنا ضروری ہے۔

بہرحال اس مرتبہ تو آپ مجھ پر احسان کیجئے اور کسی نہ کسی طرح من جائیے۔ اس کے بعد اگر پھر کبھی آپ کو "بیگانگی" کی شکایت اس کی طرف سے پیدا ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔

باب الانتقاد

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ نظم

کارامروز، مجموعہ ہے جناب سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا۔ اس میں کم و بیش ۱۳۰ نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں جو ادبیات و اخلاقیات، سیاسیات و اثریات کے تحت میں لکھی گئی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مفہوم و مقصود اور بیان و شاعری ہر لحاظ سے توجہ کے قابل ہیں۔

جناب سیماب کی شاعری کی تاریخ کا مجھے پورا علم حاصل نہیں ہے اور نہ اُن کے سوانحِ حیات سے کما حقہ آگاہی کہ میں اُن کی شاعری کے تدریجی ارتقاء اور اس پر اثراتِ ماحول سے بحث کر کے پورا حقِ انتقاد ادا کرسکوں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب سے بہت پہلے جب یہ رنگ تغزل کی طرف زیادہ مائل تھے، اُن کی غزل سن کر بھی مجھے لطف آتا تھا اور اب کہ ان کے دائرۂ شاعری نے وسیع ہو کر حیاتِ انسانی اور کوائفِ فطرت کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ بلحاظ شاعری اُن کی مذہب والی نظم کو بھی پسند کرتا ہوں، درانحالیکہ اُن کی طرح میں بحالاتِ موجودہ اس کا تقدس محسوس کرتا ہوں اور نہ اسے امن و تسلی کا مضبوط حصار سمجھتا ہوں[1]۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا، اس مجموعہ میں ہر رنگ کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور بادی النظر میں یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس مخصوص رنگ کے ساتھ ان کا فطری ذوق ملا ہوا ہے اور کس میں اکتسابی، لیکن غور کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور مختلف عنوانات کی مختلف نظمیں دیکھنے کے بعد مقابلاً ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان کا ادبی و محاکاتی رنگ زیادہ پختہ ہے اور چونکہ تمثالِ کیفیات کو وہ زیادہ تکمیل کے ساتھ بیان کرسکتے ہیں، اسی لئے "اعتبار و بصیرت" کا سامان جو ماضی و نقوشِ ماضی ہی کی داستانوں میں زیادہ مل سکتا ہے، اُن کے کلام میں اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔

ہر فطری شاعر کسی نہ کسی فطری پیغام کا حامل ہوا کرتا ہے گو یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دُنیا کے لئے مفید و ضروری بھی ہو۔ نظامِ فطرت میں اہرمن و یزداں دونوں دوش بدوش کام کر رہے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر خیّام و حافظ کی طرح ساری دنیا کو

---

[1] سیماب صاحب کے اشعار یہ ہیں:۔

روح کر سکتی ہے محسوس تقدس اس کا
اس کی قوت ہے شدید اس کا اثر لامحدود

مذہب امن اور تسلی کا ہے مضبوط حصار
اس کے پیرو پہ ہیں شیطان کی راہیں مسدود

مستِ مئے ہوشربا" دیکھنا چاہتا ہے، اس کے پیام کو ہم غیر فطری پیام سمجھیں ۔ بہرحال ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی موضوعِ سخن ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے اس کے دل کی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس لحاظ سے جب ہم جناب سیماب کی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق "کارِ امروز" سے اتنا نہیں ہے جتنا "فسانۂ دیروز" سے ہے یعنی جتنی خوبی کے ساتھ وہ "کل" کی داستان بیان کر جاتے ہیں، اتنی خوبی سے وہ "آج" کے حقایق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے یا یوں سمجھئے کہ وہ ماضی کے نقوش کو تو تکمیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں، لیکن حال کی تعمیر کا خاکہ ان کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ ارضِ تاج کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ تو اچھا لکھ سکتے ہیں لیکن دوسری ارضِ تاج پیدا نہیں کر سکتے ۔ اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کا شاعر جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ مسلمان جو ماضی کی یاد میں اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر چکا ہے، اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے ۔ جہاں آگ کا مفہوم "جمودِ یخ" سے زیادہ نہ ہو، وہاں اس آگ کی حقیقت بیان کرنے والے بھی غنیمت ہیں ۔ شمعِ محفل کی آتش افروزیاں جب معدوم ہو جائیں تو لگن کی خاکستر میں چنگاریاں ڈھونڈھنا بھی ہر شخص کا کام نہیں ۔

میں نے اس مجموعہ کا مطالعہ بالاستیعاب تو کیا نہیں اور نہ شعر و شاعری کی کتابیں بالاستیعاب پڑھنے کی چیزیں ہیں ۔ لیکن جب کبھی فرصت نصیب ہوئی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی نظم کو دیکھا ہو اور کاروبار کی الجھنوں اور علائقِ دنیا کے مخصوص سے علیحدہ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اسی فضا میں پہونچ گیا ہوں جسے بجز ایک حقیقی شاعر کے کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ جب اُن کی کوئی خالص ادبی نظم سامنے آ گئی تو یہ کیفیت زیادہ شدید محسوس ہوئی مثلاً ایک دن میں شام کو گھوڑدوڑ سے واپس آیا تو بہت مضمحل تھا۔ اضمحلال ہارنے کا بھی اور دن بھر خراب خستہ پھرتے رہنے کا بھی ۔۔۔ واپس آکر اس مجموعہ کو اٹھا لیا، فہرست میں "رنگین تیتری" پر نظر پڑی، اور جب ورق اُلٹ کر اس کو پڑھا تو بڑی حد تک کوفت دور ہو گئی:

دامانِ گل سے مستی بن کر اُلجھنے والی
اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی،

جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ
رنگوں کے ارتقا میں اک نقشِ برگزیدہ

یا ۔۔۔ اُڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم ۔۔۔ یا ۔۔۔ مہکا ہوا سا شعلہ، دبکی ہوئی سی مستی

کیسی پاکیزہ تلاش ہے، کتنا لطیف پیرایۂ بیان ہے ۔

اس کے بعد ہی میں نے "قلقلہ" والی نظم پڑھی، کیونکہ تیتری کے ساتھ ہی قدرتاً میرا خیال عورت کی طرف منتقل ہوا اور نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتنا لطف دے گئی ۔

چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

طلوع کون یہ ہوا صنمکدہ سے صبح کے
جبین مرمریں میں شمع بتکدہ سے لئے ہوئے

جگائے چتونوں میں اپنی ایک سحر حُسن کا
نظر میں بجلیاں لبوں میں زمزمے لئے ہوئے

[redacted]

خرام، آہ، وہ خرام جو اٹھے[1] پائے ناز سے　　دلوں کی پائمالیوں کا فیصلہ لئے ہوئے
قدم قدم پر ایک فتنۂ قیامت آفریں　　نقوش پا صد آئینۂ درآئینہ لئے ہوئے
جمال میں صبر سے ہرے ہزار درس عاشقی　　خیال میں مسرتِ مطالعہ لئے ہوئے

وہ بال جن پر اپنی جان ابر نوبہار دے
وہ چال جو نگاہ کو پیام انتشار دے

شمس کی نظموں میں میرے نزدیک سب سے بہتر نظم آن کی سری کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اکابر مذہب میں سری کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساسات حُسن کو بیدار کر سکتی ہے۔ انھوں نے بودھ اور رسول کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن اُن میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ گوتم بودھ کے ذکر میں ان کی شاعری کا لوچ اس سے آگے نہ بڑھ سکا کہ

برہمن زادوں کو ترے انفاس نے گرا دیا　　تخت شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرا دیا

بیخودی کے نام سے جب دورِ جام[2] بادہ تھا　　جب تجلّی حقیقت[3] سے ہر اک دل سادہ تھا
نفس تھا جب عیش کو رازِ بقا سمجھے ہوئے　　جب ہوس تھی صرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے

....

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تو نے دی　　غور کرنے کی دلِ انساں کو فرصت تو نے دی

رسول کائنات کی نظم میں پہلا بند تمہیدی بہت شاندار ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:-

مسلط بزمِ عالم پر ہوئی یوں تیرہ سامانی　　کہ تھی جگنو سے بھی کمزور سورج کی درخشانی
چمن کے رنگ سے تھا اہتمام افزد تاریکی　　سحر کے نور سے تھا انتظامِ ظلمت افشانی
شکنجہ جور و استبداد کا تھا اور دنیا تھی　　کہیں فخر جہانداری، کہیں فرِّ جہانبانی

اس کے بعد دوسرا بند شروع ہوتا ہے جس میں کہ خصوصیات نبوی کو نہایت پاکیزہ الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً

مگر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا　　سیاست میں بھی جینے کی محبت کی ادا پیدا

---

[1] اس مصرعہ کا آخری حصہ تکلف سے خالی نہیں۔ اول تو "جو ہے" کا دوسرا ٹکڑا "فیصلہ لئے ہوئے" سے بہت دور پڑ گیا ہے، دوسرے "پائے ناز" کی ترکیب بھی محل نظر ہے - پہلا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا - خرام آہ وہ خرام جو ادائے ناز سے - خرام کے بعد پاؤں کے ذکر کی ضرورت یوں بھی باقی نہیں رہتی۔ [2] دورِ جام کہنے کے بعد لفظ بادہ کا اظہار بلاغت و فصاحت دونوں کے منافی ہے۔
[3] "تجلی حقیقت" ثقیل ترکیب ہے یوں بھی کہہ سکتے تھے:- جب حقیقت کی تجلی سے ہر اک دل سادہ تھا۔

عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کر دیا جاری — نیا بتخانے کے ماحول سے کعبہ کیا پیدا
سیاست کو کیا آراستہ تہذیب کامل سے — تدبر سے کیا دنیا و دیں میں واسطہ پیدا

تیسرے بند کے بھی بعض شعر نہ صرف جذبات خلوص کے آئینہ دار ہیں بلکہ قوت فکر و شاعری کو بھی پوری طرح نمایاں کرتے ہیں، مثلاً

کہیں تو زندگی پیرایہ اعجاز لب عیسیٰ — کہیں تو خطبہ فرما اوج طایف پر کلیمانہ
فروغ آفرینش قوتوں پر تیری قائم ہے — کہیں تو شمع محفل ہے کہیں تو نور کاشانہ

لیکن سرگذشت کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے اس کا انداز کچھ اور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان نے سیماب صاحب کے ساز شاعری کے اُن تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو ان کے ذوق و احساس کو زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرنے والے ہیں۔ اس نظم کی ابتدا، ملاحظہ ہو:۔

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لیکر — سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لیکر
گزشتہ صبح محبت کو ڈھونڈھنے نکلا — اُف آفتاب، محبت کی روشنی لیکر

دوسرا بند پورا جذبات کی جان ہے، کیسے کیسے پاکیزہ شعر نظر آتے ہیں:۔

جمال و حسن کے کافر نکھار سے کھیلا — ریاض عشق کی رنگیں بہار سے کھیلا
سمجھ کے عالم فانی کو ایک بازیچہ — کبھی چمن سے کبھی کوہسار سے کھیلا

الغرض معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیماب صاحب قدرتاً تغزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جب موقعہ اس نوع کی گفتگو کا آجاتا ہے تو وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

قومی منظومات بھی اس مجموعہ میں متعدد نظر آتی ہیں جن میں مزدور، نوجوان ہندوستان سے ــ آزادی ــ اچھی نظمیں ہیں، لیکن خالص عشقیہ نظموں کے مقابلہ میں یہ بھی ہیچ ہیں چنانچہ چند اشعار سیماب صاحب کے اس حقیقی ذوق کے ملاحظہ ہوں:۔

یہ کون خلوتکدے کے پردے اُلٹ کے جلوے دکھارہا ہو — یہ کس کا کافر شباب رنگیں شفق کے خاکے اُڑا رہا ہو
یہ کسکی ہم آغوشی جنت کی ایک تصویر کھینچ رہی ہو — بہار رنگ و سرور بن کر یہ کون منظر پہ چھا رہا ہو

محبوب کے ماضی کی یاد میں ایک نظم لکھی گئی ہے، اس کا کیف ملاحظہ ہو:۔

مری نظر میں ہے دیباچہ شباب ترا — کہ مست حسن کے نغموں سے تھا رباب ترا
وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی — وہ اک مجسمہ، آلودۂ شراب ترا
وہ شوق کے لب تشنہ وہ تیرا عارض تر — وہ مشت خاک کے قبضہ میں آفتاب ترا

وہ ابتدائے محبت، وہ چاندنی راتیں   مرے کنار میں وہ پرسکون خواب ترا
کبھی وہ نرمیِ گفتار پہ ترا ہنسنا   کبھی وہ گرمیِ آغوش پر عتاب ترا
وہ شب کے سایہ میں کافر ملاحتیں تیری   سحر کے عکس میں وہ حسنِ لاجواب ترا

آگرہ کے آثار قدیمہ ان خصوصیت کے ساتھ تاج محل پر جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی پورے برانگیختہ جذبات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے بہت کامیاب ہیں۔ اس سلسلہ کی نظموں میں "تاج بہ کنارِ شفق" میرے نزدیک ان کی بہترین نظم ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں:۔

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب   فضاؤں کو سلامِ شام کر رہا ہے آفتاب
گلوں کے قہقہے چلے، کنول مہکا ہوا اٹھا   شفق ہوئی جو رنگ بار تاج جگمگا اٹھا
قزح بیاں بہ سبو بہار، بہار جار سو بہار   سمٹ کر آگیا ہے اک جہانِ رنگ و بو یہاں
یہ ہلکے ہلکے سائے یہ نکھار برگ و بار کا   کہ جیسے لمحہ اک یہی شباب ہے بہار کا

لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام محاسن کے یہ مجموعہ اغلاط سے پاک نہیں ہے تو ہم کو افسوس ہوتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر کلام میں خواہ وہ نظم کا ہو یا نثر کا ترقی و علو کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے، لیکن غلطیوں کا پایا جانا اور وہ بھی ایسی غلطیاں کہ جنہیں والا فکر ذرا سی تامل کے بعد ان کو رفع کر سکے۔ یقیناً بہت تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔

اغلاط شعر دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق عروض و قافیہ سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو ترکیب الفاظ اور فن معانی و بیان سے متعلق ہیں۔ اول قسم کی غلطیاں زیادہ تر نومشق شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ سیماب صاحب کے مجموعہ کو اس نوع کے اغلاط سے بڑی حد تک پاک ہونا چاہیے، لیکن دوسری قسم کی غلطیاں جو زیادہ تر کہنہ مشق شعراء ہی کے یہاں نظر آتی ہیں ان کے کلام میں بھی موجود ہیں۔

سیماب صاحب نے اپنے مجموعہ کی ابتدا تین فارسی رباعیوں سے کی ہے۔ پہلی رباعی میں خدا سے خطاب کیا ہے، دوسری میں رسول اللہ سے اور تیسری میں سلامی دنیا سے۔

پہلی رباعی یہ ہے:۔

اے ربِّ قدیم و کردگارِ امروز   دے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منتِ رحمتِ تو   لطف و کرمت ضامنِ کارِ امروز

اس رباعی میں ہر جگہ ترکیب اضافی اختیار کی گئی ہے مثلاً کردگارِ امروز۔ نزہتِ ماضی، رہینِ منت، ضامنِ کار وغیرہ لیکن پہلا ٹکڑا "ربِّ قدیم" صفت و موصوف واقع ہوا ہے۔ جو علم معانی و بیان کی رو سے خلاف فصاحت ہے۔ علاوہ اس کے رب کی صفت میں جب لفظ قدیم استعمال کیا جائے گا تو اس مفہوم میں "ازل و ابد" دونوں شامل ہوں گے، حالانکہ

محل کا اقتضاء یہ ہے کہ صرف ماضی یا عہد گزشتہ سے اس کو متعلق کیا جائے۔ اگر بجائے رب قدیم کے خالقِ دی کہا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

دوسری رُباعی یہ ہے:۔

اے سطوت دیروز و وقارِ امروز   نورِ فردا و جلوہ دارِ امروز
یک سطر مرتب، عالم از دفتر تو   مجموعۂ کار تست کارِ امروز

اس رُباعی میں رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے

تیسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ "تیرے دفتر کی صرف ایک ترتیب دی ہوئی سطر اک دنیا ہے"۔ لیکن چوتھے مصرعہ میں بیان کا یہ ارتقاء گھٹ کر اس حد تک اُتر آیا ہے کہ کارِ امروز کو اس کا مجموعۂ کار بتایا جاتا ہے، حالانکہ ہمارا تمام مجموعۂ کار اس کے صرف ایک نقطہ یا ایک اشارہ کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ چوتھا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا:۔

یک لفظِ تو، سماتۂ جملہ کارِ امروز

تیسری رُباعی ملاحظہ ہو جس کا عنوان اساسِ فردا ہے:۔

فارغ منشیں ز اقتدارِ امروز   مستقبل تست در کنارِ امروز
دانی کہ سواد دفتر فردا چیست   یک نقطۂ افزودہ بہ کارِ امروز

رباعی بہت اچھی ہے لیکن مجھے لفظ نقطہ پر اعتراض ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو کل کی ترقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی بنیاد آج ہی پڑتی ہے، مدعا یہ کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کام میں اضافہ نقطہ کا ہوا کرتا ہے یا نکتہ کا۔ ہر چند سوادِ دفتر کی رعایت سے نقطہ زیادہ مناسب ہے لیکن کارِ امروز کے لحاظ سے نکتہ ہونا چاہیئے پھر چونکہ کارِ امروز ردیف و قافیہ ہونے کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا اس لئے پہلے ہی مصرعہ میں تبدیلی کی ضرورت تھی اور اگر لفظ سواد نکال کر اساس اور دوسرے مصرعہ میں بجائے نقطہ کے نکتہ کر دیا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

اس کے بعد نوائے تجدید کے عنوان سے ایک ترجیع بند نظر آتا ہے جس کا پہلا بند یہ ہے:۔

میں کہ اس ہنگامۂ ہستی میں صرف نالہ ہوں   خونچکاں اپنے لبِ فریاد کا تبخالہ ہوں
اہمیت نشوونمائے دل کی باقی ہو چکی   اب ابر جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخ لالہ ہوں
میری ہر اک حسرت سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں   خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں
زندگی کی ڈھونڈتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں   اک حریمِ عیش کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

جب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں
مستیٔ تحقیق میرے نام میں باقی نہیں

اس نظم کے ذریعہ سے شاعر نے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے کہ ہم بحالت موجودہ نہایت ہی پستی و ذلت کی حالت میں ہیں لیکن ہمارا یہ زوال ہی اپنے اندر عروج کے اسباب پنہاں رکھتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کو شاعر نوائے تجدید کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کسی مخصوص خیال یا مخصوص نظریہ کے ماتحت کوئی نظم کہنا حد درجہ دشوار ہے کیونکہ فراوانی جذبات کی وجہ سے ایک شاعر بسا اوقات بہاؤ بیان کو بہت دور سے کھو بیٹھتا ہے اور متعارض خیالات نظم ہو جاتے ہیں۔ اب اسی بند کو دیکھئے کہ اس کے بیان میں کتنا عدم توازن اور کس قدر تخالف و تضاد پایا جاتا ہے۔۔۔ پہلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت ہنگامۂ ہستی میں میرا نالہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے تیغ آلہ سے خون ٹپکنا کہ یہ زاری و بیکسی کا انتہائی دلدوز منظر ہے۔ لیکن دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔

اول تو ماہیت کا پانی ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا دوسرے یہ کہ دل کے نشوونما کی ماہیت یہی ہو سکتی ہے کہ اس سے خون ٹپکے، سو وہ دوسرے مصرعہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کا پانی ہو جانا کیا معنی۔ اگر شعر یوں ہوتا تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

کیفیت تخلیق آب و رنگ کی باقی نہیں   اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخِ لالہ ہوں

تیسرا شعر یہ ہے:۔

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں   خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں

پہلا مصرعہ اصل مفہوم سے بالکل منافی ہے، کیونکہ ہر اک جست سے لاکھوں بجلیاں پیدا ہونا تو عروجِ عمل کا ثبوت ہے نہ کہ انحطاط و زوال کا۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں شعلۂ جوالہ مناسب نہیں علی الخصوص اس حالت میں کہ اس کے بعد ہی دوسرے شعر میں شاعر اپنے آپ کو خاکسترِ صد سالہ اور زندگی کی چنگاریوں سے بالکل خالی ظاہر کرتا ہے۔

ٹیپ کا شعر ہے:۔

اب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں   مستیٔ تخلیق میرے نام میں باقی نہیں

اگر دوسرے مصرعہ کا تعلق پہلے سے لف و نشر مرتب کی صورت میں ہے تو صہبا کا تعلق مستی سے تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیق کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح جام و نام میں باہم کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اگر ان دونوں مصرعوں کو علحدہ علحدہ مستقل مفہوم کا حامل سمجھا جائے تو بھی محض نام سے مستیٔ تخلیق کو متعلق کرنا بغیر ثبوت پیش کئے ہوئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس نظم کے دوسرے بندوں میں بھی کہیں کہیں اسی نوع کا عدم توازن پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ "خوابِ حسین" کی ترکیب توصیفی استعمال کی گئی ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ لفظ حسین نہ فارسی ہے نہ عربی۔ نظم درۃ التاج میں بھی ایک جگہ "مہمانِ حسین" نظر آتا ہے اور صفحہ ۸ پر بھی "جزوِ حسین" لکھا گیا ہے۔ نظم شعلۂ احساس کے آخری بند میں زندگی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ:۔

زندگی، ہستیٔ مرحوم پر احساں کر دے   پھر مرتب مرے اجزاء پریشاں کر دے

پھر بنالا مجھے رنگینیِ دامانِ بہار پھر گلستاں میں گل و لالہ بداماں کردے

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ یکسر آورد و تکلف ہے اور زندگی کو بغیر حرف ندا کے استعمال کرنا اس موقعہ پر مناسب نہ تھا۔

دوسرے شعر میں بنالا بجائے بنادے کے استعمال کیا گیا ہے اور گل و لالہ بداماں کی ترکیب بھی قابل احتراز تھی۔ فارسی میں گل بداماں۔ لالہ بداماں، علٰحدہ علٰحدہ لکھ سکتے ہیں لیکن گل و لالہ کو حرف عطف سے ملا کر گل و لالہ بداماں لکھنا درست نہیں۔

یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیِ دامانِ بہار پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کردے

اس طرح دونوں مصرعوں میں مجھے کی تکرار بھی ہوجاتی جو بیان کی قوت کو اور بڑھانے والی ہے۔

اس کے بعد کا شعر ہے:۔

جمع کر کے مرے سامانِ نواسنجی کو بربطِ خامشیِ عالم : مکاں کردے

بربطِ خامشی کے معنے یہ ہیں کہ خاموشی خود بربط کا کام دینے لگے، درانحالیکہ پہلے مصرعہ میں سامان نواسنجی کہکر خاموشی کے امکان کو دور کردیا گیا ہے۔

ایک نظم طلوعِ سیاست کے عنوان سے صفحہ ۱۴ پر نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

محفلِ عالم جمالِ حُسن سے خالی ہوئی صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمال اور حُسن تقریباً ایک ہی چیز ہے۔ فارسی میں لفظ جمال جلوہ کے معنے میں بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اسی وقت جب بجائے کیفیت ادراک کے کسی محسوس شے سے اسے منسوب کیا جائے، مثلاً جمالِ رُخ۔ وغیرہ۔ اس لئے اگر بجائے جمال کے فروغ یا وجود کا لفظ استعمال کیا جاتا تو یہ نقص دور ہوجاتا۔

اسی نظم کا آخری شعر یہ ہے:۔

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگیا نام اس قانونِ وضعی کا سیاست ہوگیا

شاعر اپنے مفہوم کو اچھی طرح ظاہر نہیں کرسکا۔ اس کی تعقید کو دور کرکے اگر نثر کی جائے تو عبارت یوں ہوگی کہ

"جو (قانون) عہدِ شخصیت کی مستقل لعنت ہوگیا، اس قانونِ وضعی کا نام سیاست ہوگیا"

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً ایک ایسا قانون ہے جو محض استبدادی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

"شخصیت" اور "قانونِ وضعی" دونوں اصل مفہوم سے بالکل علٰحدہ ہیں: نہ لفظ شخصیت سے (Autocracy) کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اور نہ قانونِ وضعی سے قانونِ استبداد کا۔

اس کے بعد صفحہ ۱۷ پر ایک نظم بیسویں صدی کرمی کے عنوان سے درج ہے۔ اس نظم کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے

اہلِ مذاہب کو باہم رواداری کی تعلیم دی جائے اور بتایا جائے کہ اس سے قبل ہر مذہب دوسرے مذہب کا احترام کرتا تھا۔
اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:۔

اک دور وہ تھا روح فزا کیفیت اندوز — کعبے میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز
تھا برہمن و شیخ میں اک ربط مسلسل — ناقوس و اذاں کا تھا ہر اک نغمہ دل افروز

شاعر اس خیال کے اظہار سے ابتدا کرنا چاہتا ہے کہ اب سے پہلے شیخ و برہمن یا مسلم و غیر مسلم میں بہت اتحاد پایا جاتا تھا اور ہر ایک دوسرے کی مسرت میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن پہلے شعر کے مصرعۂ دوم کی تعبیر ناقص اس مفہوم کو پوری طرح ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

اول تو بت خانے کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ظاہر کرنا تو یہی ہے کہ باوجود اس کے کہ بت خانہ کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں یہ رسم منائی جاتی تھی، تو پھر یہ کعبہ میں تھی اک عید" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ عید تو کعبہ والوں ہی کی ہے۔ اس لئے باہم ارتباط کے اظہار کے لئے اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہئے تھا۔

آتشکدہ میں عید تھی اور کعبے میں نوروز

چند اشعار کے بعد موجودہ حالت کو ان الفاظ میں دکھایا گیا ہے کہ:۔

ہر برگ میں ہر پھول میں مہکی ہوئی سازش — ہر ساز کی آواز میں دہکا ہوا اک سوز

پہلے مصرعہ میں مہکی ہوئی سازش محلِ نظر ہے اور دوسرے مصرعہ میں "دہکا ہوا سوز" اصل مفہوم کے منافی پڑتا ہے، کیونکہ ساز میں سوز ہی ہونا چاہئے خواہ وہ دہکا ہوا ہو یا بے دہکا ہوا۔ یہ شعر اگر یوں ہوتا تو مناسب تھا:۔

ہر برگ میں ہر پھول میں اک نکہتِ مسموم — ہر ساز کی آواز میں اک شورِ سکوں سوز

آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

مندر کے مغنی سے خدا را کوئی کہدے — اے مرغِ سحر ضبط ز پروانہ بیاموز

ضبط کی تعلیم صرف مندر کے مغنی کو دینا اور اہل صومعہ کو علحدہ کر دینا نظم کی اصل روح کے منافی ہے، علاوہ اس کے لول بھی مرغِ سحر کی رعایت سے پہلے مصرعہ میں بجائے (مندر کے مغنی) کے (مسجد کے موذن) کو لانا چاہئے تھا۔

اس کے بعد سیماب صاحب نے اہلِ عالم کے نام ایک پیغام پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں نظم اچھی ہے لیکن کہیں کہیں اسی نوع کے اسقام اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عہد ماضی اور اس کی محبت و صداقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ایک آندہ سی چتون میں بھی تھا حُسن کشاد — ایک دزدیدہ نظر بھی گرمیِ افسانہ تھی

ادل مصرعہ کا مفہوم انھوں نے یہ رکھا ہے کہ اگر پہلے باہم کر آزردگی بھی پیدا ہو جاتی تھی تو اس میں صداقت پائی جاتی تھی۔ لیکن بہ لحاظ فن شعر اس میں تین سقم نظر آتے ہیں، اول تو چتون کے ساتھ لفظ ایک کا استعمال زاید و بیکار ہے، دوسرے

لفظ (سی) یہاں بے موقع استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ محل تو یہ تھا کہ چتون کی آزردگی کو پوری طرح متعین کر دیا جائے نہ یہ کہ "سی" کہکر اس میں اور ضعف پیدا کیا جائے، تیسرے حُسنِ کشادگی ترکیب ناپسندیدہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ نقص ہے کہ مقصود بیان کے لحاظ سے لفظ افسانہ لانے کا یہاں کوئی موقع ہی نہ تھا (گرمی محفل) البتہ کہہ سکتے تھے اس کے علاوہ (دزدیدہ نظر) سے فسانہ کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ شعر یوں زیادہ برمحل ہو جاتا:۔

اپنی آزردہ نگاہی میں بھی تھا حُسنِ خلوص — اُن کی دزدیدہ نظر بھی رشکِ صد میخانہ تھی

اس نظم کے چوتھے بند میں شاعر نے اس خیال کو نظم کیا ہے کہ فطرت کے مظاہر و آثار جو پہلے تھے اب بھی وہی ہیں یعنی

دینِ فطرت بھی وہی آئینِ فطرت بھی وہی — صبح کی رو بھی وہی رفتارِ ظلمت بھی وہی

ہے وہی خاکِ چمن کی ماہیت[1] گُل آفریں — رس وہی غنچوں میں پھولوں میں لطافت بھی وہی

اگر اس بند میں تمام نوامیس فطرت کو اسی طرح سادگی سے بغیر کسی آورد و تصنع کے ظاہر کر دیا جاتا تو نہایت مکمل بند ہو جاتا لیکن دو شعر ایسے آ گئے ہیں جن کے ایک ایک لفظ نے بند کے اس انداز کو خاک میں ملا دیا۔ وہ دو شعر یہ ہیں:۔

چاند کی نظروں میں ابتک ہے وہی عالم کُشی — سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہی

گرمیِ تخلیق میں ابتک وہی ہے سوز و ساز — عشق میں اور حُسن میں رسمِ محبت بھی وہی

معلوم نہیں عالم کشی سے کیا مراد ہے۔ غالباً یہ کہ چاند کی نگاہیں دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں، لیکن یہ ترکیب بالکل ناپسندیدہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (حقیقت) بالکل بیکار ہے۔ اور اس نے بند کی خصوصیت بیان کو داغدار کر دیا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں لفظ (تخلیق) اسراسر بے محل ہے اور پورا مصرعہ بے معنی ہو گیا ہے۔

میرا مشورہ ان دونوں شعروں کے متعلق یہ ہے:۔

سینۂ خورشید میں ابتک وہی ہے التہاب — چاند کی کرنوں میں پروازِ لطافت بھی وہی

عشق میں اور حسن میں ابتک وہی ہے سوز و ساز — خوئے ضبط اُسکی وہی، اور اسکی نخوت بھی وہی

بعض بعض نظمیں اس میں ایسی نظر آتی ہیں جو بالکل نکالدینے کے قابل تھیں، ان میں سے ایک "ذروں کا مستقبل" ہے۔ اس نظم کو سیماب صاحب نے غالب کے اس شعر سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اس طرح اس کی ابتدا کرتے ہیں:۔

نہ ٹھکرا خاک کے ذروں کو یوں بائے حقارت سے — کہ ہر ذرہ ہے اک جزوِ حسیں[2] اجسامِ ہستی[3] کا

---

[1] یہاں ماہیت بجائے خاصیت کے استعمال کیا گیا ہے۔ [2] "جزوِ حسین" کی غلط ترکیب کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ [3] لفظ (اجسام) کے ساتھ (ہستی) کی تخصیص بے معنی ہے۔ صرف (اجسام) کہہ دینا کافی تھا یا پھر اسکی صفت جمیل وغیرہ بیان کیجاتی تو بیشک ایک بات پیدا ہو جاتی۔

اس نظم کا چوتھا شعر ملاحظہ ہو:۔

غرور و کبر جو ہر بنتے اب تک اُڑ گئے ہوتے — اگر ٹھنڈا نہ پڑتا جوشِ آتش زارِ ہستی کا

اگر اس شعر کی فارسیت اور ترکیب کی تمام الجھنوں کو دور کر کے سہل و سادہ الفاظ میں مفہوم کو ظاہر کیا جائے تو یہ ہوگا کہ۔ " اگر انسان فنا نہ ہوتا تو غرور و کبر باقی نہ رہتے" گویا کبر و غرور کا وجود انسان کے فانی ہونے کی وجہ سے ہے اور اس مفہوم کا اظہار ظاہر ہے

ساتواں شعر اس سے زیادہ بے معنی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

پسِ تکمیل جب اجسام مل جاتے ہیں مٹی میں — اُبھر آتا ہے ذرہ بن کے حصہ نقصِ ہستی کا

یعنی جب اجسام اپنی تکمیل کے بعد مٹی میں مل جاتے ہیں تو نقصِ ہستی کا حصہ ذرہ بن کے اُبھر آتا ہے۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہا ہے اور پہلے مصرعہ کی (تکمیل) اور دوسرے مصرعہ کے (نقص) کو وہ کیونکر مربوط کریں گے۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر نظم پر علحدہ علحدہ تبصرہ کروں اور نہ اس کی ضرورت، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے اسقام سے ان کی کوئی نظم خالی نہیں۔

اب میں مختلف مقامات سے مختلف اشعار پیش کر کے مختصراً اُن کی غلطیوں پر سیماب صاحب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

صفحہ ۴۱ — دے رہی ہیں مینارِ منزل سے پیامِ صبحِ نو — جلوۂ امید بن تصویرِ مستقبل میں آ

اصل لفظ مُنارہ اور مینار ہندی ہے اسلئے اُردو میں بغیر ترکیب کے تو مینار لکھ سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے فارسی یا عربی الفاظ کے ساتھ اسکی اضافت درست نہیں۔

صفحہ ۹۷ — وہ ناجائز جتھا، خود رائے، خود بیں۔ خود پرستوں کا — وہ ناشائستہ حلقہ بے حیاؤں، فاقہ مستوں کا

اُصولاً پہلے مصرعہ میں (خود رایوں، خود بینوں) ہونا چاہئے تھا۔ ہرچند اس کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ (خود رائے و خود بیں) (جتھا) کی صفت ہے اور اس مصرعہ کی نثر یوں ہوگی۔ وہ خود رائے، خود بیں ناجائز جتھا خود پرستوں کا۔ لیکن اس طرح اسکا تقابل دوسرے مصرعہ سے باقی نہ رہیگا۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا۔

وہ ناجائز جتھا، ہرزہ سرایوں، خود پرستوں کا

صفحہ ۱۱۹ — جب محفلِ افراد میں ہو انتشارِ مستقل — جب شورشِ ایام کی ہر موج طوفاں خیز ہو

پھیلی ہوئی ہو جب وبا دنیا میں استبداد کی — جب ہر نفس ہو مضطرب، ہر آنکھ اشک انگیز ہو

پہلے شعر کے اول مصرعہ میں لفظ (افراد) نہ صرف بیکار بلکہ غلط ہے، دوسرے مصرعہ میں شورش کے لئے تموج پیدا کی گئی ہے درانحالیکہ محض (شورش) کو تموج سے کوئی واسطہ نہیں۔ میری رائے میں یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

جب انتشارِ افراد کا اک مستقل آزار ہو — جب شورشِ ایام کا سیلاب طوفاں خیز ہو

دوسرے شعر میں اشک انگیز کی ترکیب درست نہیں۔

فارسی میں - اشک چکیدن - اشک ریختن ، اشک باریدن ، اشک چیدن ، اشک فشاندن ، اشک فرخوردن اشک رویدن ، اشک شکستن ، تو آتا ہے لیکن اشک انگیختن مستعمل نہیں اور نہ معناً درست ہے ، کیونکہ انگیزیدن اور انگیختن کے معنے بلند ہونے ، بلند کرنے کے ہیں ، اور پیدا کرنے ، ظاہر کرنے کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لیکن جب تک کسی چیز میں کیفیت بلندی کی نہ پائی جائے اس کے ساتھ اس مصدر یا اس کے مشتقات کا استعمال درست نہیں - آنسو میں کیفیت نیچے گرنے کی ہے نہ کہ اوپر بلند ہونے کی - یوں البتہ کہہ سکتے تھے :-

جب ہر نفس ہو مضطرب ، اور اشک خوں آمیز ہو

اس نظم کے دوسرے بند کا شعر ہے :-

پھولوں کے دل میں کھول دے باد چمن کے راستے ہموار کر دے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو

بکھرے ہوئی چیزوں کو ہموار نہیں کیا جاتا بلکہ یکجا کیا جاتا ہے -

اس بند میں ذرات ، جذبات ، حالات و محسوسات کو ہم قافیہ رکھا گیا ہے جس کی صحت کے متعلق سیاب صاحب کو خود ہی غور کرنا چاہیئے -

اس نظم میں عنوان کو ملا کر آٹھ جگہ (نصب العین) بہ سکون (صاد) استعمال کیا گیا ہے مثلاً

شاعر کے نصب العین میں تہذیب عالم ہے یہی وغیرہ وغیرہ - حالانکہ صحیح (نَصَب العین) بہ فتح (صاد) ہے -

عربی میں نصب و نَصَب دونوں آتے ہیں لیکن ان کے معنے میں فرق ہے - نصب کے معنے ، بحالت اسم تعب و غم کے آتے ہیں اور مصدری حالت میں قائم کرنا یا بلند کرنا - اور - نَصَب کا مفہوم ہے جد و جہد کرنا ، نَصَب العین سے مدعا کسی عزم یا منزل کو مخصوص و متعین کرنا ہے اور اس لئے نَصَب العین ہونا چاہیئے ، عربی میں بلند جھنڈے ، میلِ راہ اور نشانِ منزل کو نَصَب ہی کہتے ہیں -

صفحہ ۱۲۷ -

آہ ، لیکن ہے وہی تیرگیِ خلوتِ غم نہ تجلّیِ مسرت نہ تجلائے سکون

تجلّی و تجلاّ دونوں ایک ہی لفظ ہیں - اگر بجائے تجلائے سکوں کے تو لائے سکوں ہوتا تو یہ نقص دور ہو جاتا -

صفحہ ۱۲۸ - (نظم تاروں کا گیت)

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں ہم جنت کے پروانے ہیں لبریز شراب فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں

تاروں کے متعلق (جو رات دن گردش میں ہیں) یہ کہنا کہ وہ بے گردش کے پیمانے ہیں ، عجیب بات ہے ،

دوسرا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :-

لبریز جمال فطرت ہیں ، ہم نور بھرے پیمانے ہیں

اسی نظم کا ایک شعر ہے :-

ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم اپنی حقیقت بھول گئے
ہم اپنی حقیقت پہچانے، باطل کی لعنت بھول گئے

"ہم نے اپنی حقیقت پہچانی یا ہم اپنی حقیقت پہچان گئے" کی جگہ (ہم اپنی حقیقت پہچانے) نظم کیا گیا ہے۔

(باقی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۷۴ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۰۴ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیٰ ددبر ولد تلک قوم پاسی ساکن سرون کھیڑہ پرگنہ مہونہ ضلع لکھنؤ

بنام

۵ - رگھو لال رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ
۶ - جے کرشن لال کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
۷ - فتح بہادر کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
۹ - بدری پرشاد رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۷ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۴ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زاید نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ ۲۴ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنا برمزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور العدد پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کرسکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہوکر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۱۵ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

اَسَدُ اللہِ الغالِب

افرادِ عالم کے لئے جو رسول تھا اور عالمین کے لئے بشیر و نذیر بنا کر جس کو خدا نے آخری طور پر نسل انسانی کو غلط راہوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے سب سے بہتر قرن کے لئے بہترین قلوب کو چنا۔ اپنی صحبت اور رفاقت میں رکھا اور پھر ان میں ہر ایک کو "بایہم اقتدیتم اھتدیتم" کی سند عطا کر کے سارے بنی آدم کو حکم دیا کہ "ان میں سے جس کسی کی پیروی کروگے سیدھی راہ پاؤگے"۔

مردوں میں ایک ایسا جوان مرد اسلام نے پیدا کیا۔ جو جوانی سے پہلے بلکہ عہد طفولیت کے آغاز ہی سے اگر سات سال نہیں تو باتفاق محدثین و مورخین آغوش نبوت میں اپنی عمر کے آٹھویں سال قطعی طور پر آگیا تھا۔

محمد بن اسحاق "صاحب سیرۃ" نے لکھا ہے کہ " فاخذ[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیاً وضمہ الی صدرہ۔

پھر کون نہیں جانتا کہ جس نے نبوت کے آغوش میں ہوش سنبھالا تھا اس نے سب سے پہلی دفعہ جب غیب کے عالم قدس سے اس خاکدان شہادت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا تو کیا یہ وہی جگہ نہ تھی جس کے متعلق ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مخالف اثرات سے مامون ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے جلیل القدر محدث حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدث حاکم سے ناقل ہیں۔

"وقد تواترت[2] الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المومنین علیاً فی جوف الکعبۃ"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلی دفعہ جب اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے کھانے پر جمع فرمایا اور اس وقت دریافت فرمایا کہ میرا کون ساتھ دیتا ہے۔ تو ایک نو عمر بچہ نے جواب دیا کہ "گو میرے پاؤں کمزور ہیں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ ابولہب اس پر ہنسا کہ بس اسی ایک لڑکے کے بھروسہ پر تمہارا کام چلیگا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جسے لڑکا سمجھا گیا تھا اسی نے تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا اور جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ اس نے حضرموت کی بنی ہوئی سبز چادر میں اپنے کو اس وقت لپیٹا جس وقت سب کہہ رہے تھے کہ موت کی اس چادر میں لپیٹ کر سونے والا شاید کبھی نہیں اٹھے گا حالانکہ جو سویا تھا وہی جاگا اور ابد تک جاگ اسی کے لئے ہے۔ اور جو کفار حملے کے ارادے سے جاگ رہے تھے

---

[1] پھر لے لیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو (حضرت ابوطالب سے) اور لپٹا لیا اپنے سینہ سے۔ [2] یہ متواتر ہے کہ سیدتنا فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے امیر المومنین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی۔

وہی سو گئے اور نامرادی کی نیند صرف ان ہی کے لئے تھی۔

نبوت کی شعاعوں کو دیکھو تو دنیا میں کون پھیلا رہا ہے۔ بدر میں ادھر کفار حملہ آور ہیں اور ادھر رسول اللہ سربسجود ہیں کہ اگر آج اس چھوٹی سی جماعت کی نصرت نہ کی گئی تو اسے خدا! زمین پر پھر تیری پرستش نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے متعلق قرآن خبر دے رہا ہے کہ وہ گمان کر رہے تھے کہ ہم موت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں لیکن جب قریش کے سورماؤں نے اپنے پرچم ہلا کر غرور کے لہجہ میں پکارا کہ "یا محمد[1] اخرج الناس الکفاء" تو لوگوں نے اسی انیس (۱۹) سالہ نوجوان کو دیکھا جس کے متعلق ابولہب نے کہا تھا کہ کیا اس لڑکے کی مدد کام آئے گی؟ اور اسی کی مدد سے نہ صرف جنگ بدر بلکہ جنگ اُحد میں بھی مسلمان کامیاب ہوئے۔

پھر اور آگے چل کر دیکھئے کہ خندق کی بازی کس نے جیتی؟ خیبر کا دروازہ کس نے اکھاڑا؟ اور لوگ کیوں تعجب کرتے ہیں اگر حضور نے جناب امیر کو انا منک کہکر مخاطب کیا۔

محمد کا پیغام، جہاں کہیں پہونچا، اس کی پہونچانے والی وہی ایک ہستی تھی "البتہ تبوک میں وہ نہیں تھی لیکن جو تبوک میں رفاقت نبوت سے محروم کیا گیا۔ سنو! امام بخاری کی زبانی سنو کہ قلب نبوت نے پھر اس کو کہاں حاضر پایا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔
"الا ترضیٰ[2] ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ"۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تبوک کی غیر حاضری کتنی اہم حضوری کی شکل میں بدل دی گئی تھی۔

اب اس کے بعد دیکھو کہ وہ جو عالم قدس سے کعبہ میں آیا۔ اور کعبہ سے دوش اقدس پر آیا۔ وہ رسول کی زندگی کی آخری ساعتوں میں کہاں تھا۔ محمد بن اسحاق راوی ہیں کہ:۔

"علی ابن ابی طالب آپ کو غسل دے رہے تھے۔ اور انھیں اپنے سینہ سے لگائے ہوئے کہتے جاتے تھے:۔

"میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ زندگی اور بعد از زندگی ہر وقت آپ کتنے معطر اور خوشبو ہیں"

کیا پوچھتے ہو کہ جو شہادت میں کسی کے ساتھ تبرک گیا وہ غیب میں اس کے ساتھ کہاں نہیں ہے۔ اندازہ کرو کہ جو رسالت ہی کے گود میں پلا، رسالت ہی کی آغوش میں جس نے پرورش پائی، رسالت ہی کی دعاؤں نے جس کا سینہ کھولا۔ اسی کی تعلیم و افادہ کا دائرہ اگر سب سے زیادہ وسیع ہو تو کیوں حیرت کی جائے۔ محققین جانتے ہیں کہ اسلام میں فقہ حنفی کا بڑا حصہ سیدنا علی مرتضیٰ پر منتہی ہوتا ہے کیونکہ فقہ ابوحنیفہ کا اصلی سرمایہ وہی علم تھا جو کوفہ میں حضرت سیدنا علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ سے پھیلا

امہات المومنین کی پوری جماعت میں سے صرف حضرت صدیقہ عائشہ ہی سے علم کا وہ ذخیرہ کیوں منقول ہے جو

---

[1] یعنی آج ہمارے ہم پلہ لوگوں کو بھیجو — [2] کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مجھ سے تمہاری وہ نسبت رہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔

دو ہزار دو سو دس حدیثوں کی صورت میں حدیث کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں دوسری امہات المومنین سے جو حدیثیں مروی ہیں بمشکل وہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ اس کا سبب وہی ہو کہ "کل میسر لما خلق لہ" ہر شخص کے لئے وہی بات آسان کر دی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اور بلاشبہ حضور فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربین اصحاب میں سے ہر ایک کے سپرد کچھ فرائض تھے پھر دیکھو کتنی خوبیوں کے ساتھ ہر ایک نے اپنے مفوضہ فرض کو انجام دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ علی نے علم عرفان پھیلایا۔ لیکن دولت۔ سلطنت۔ حکومت امارت کی وسعت کا دائرہ آپ کے عہد میں رُک کر رہ گیا۔ یا رک گیا۔ یا روکا گیا۔ جو ناواقف ہیں اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کو حکومت کی قوت کی کس حد تک ضرورت تھی اور دولت کس نقطہ پر پہونچ کر دین و تقویٰ کے حق میں زہر بن جاتی تھی۔ ایک عامی دماغ اس کی تہ تک کس طرح پہونچ سکتا ہے؟ خضر کی ان مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے کہ کبھی کشتی بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ضرورت کشتی کے توڑنے ہی سے پوری ہوتی ہے۔ تاہم ان عامیوں سے یہ تو پوچھنا چاہئے کہ عہد صدیقی و خلافت فاروقی۔ دور عثمانی میں حکومت کے دائرہ کو جن طاقتوں نے وسیع کیا تھا۔ ان طاقتوں کا مہیا کرنے والا کون تھا؟ اگر بدر نہ ہوتا تو یرموک کا نظارہ کون دیکھ سکتا تھا۔ اور خیبر نہ کھلتا تو کیا مدائن کھولا جا سکتا تھا؟ کیسے عجیب لوگ ہیں جب آخر کو دیکھتے ہیں تو اول سے نابینا ہو جاتے ہیں اور جب اول کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر کو انھوں نے دیکھا ہی نہ تھا۔

سید محمد بادشاہ حسینی قادری (حیدرآبادی)
معتمد مجلس علماء دکن

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور مئی تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہو گئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کر دی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دو چند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اس صنف انشاء سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جا سکتی۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

لفظ امّی کا صحیح مفہوم

(جناب محمد عتیق صدیقی - ہند جدید کلکتہ)

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ :-

(۱) پیغمبر اسلام "اُمی" تھے اور ان کو مکتب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

(۲) قرآن کی جامعیت اور بلاغت بے نظیر ہے، دنیا آج تک نہ تو اس کا جواب پیش کر سکی ہے اور نہ مستقبل میں پیش کر سکے گی۔

(۳) اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے۔ اور مذہب کے لحاظ سے دنیا کو اب کسی دوسرے مذہب کی ضرورت نہیں۔

عام مسلمانوں کو تو جانے دیجئے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن "آسمانی" کتاب ہے اور اسلام "آسمانی" مذہب، جس کو خدا نے جبریل کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا وہ مسلمان (جن کو "علمائے کرام" ملحد، بے دین، لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لقب دیتے ہیں) جن کا عقیدہ عام مسلمانوں کے برعکس ہے ان کے دماغ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مُرتِب کی علمیت کا درجہ کتنا بلند ہو گا، لیکن اس خیال کی تائید کے لئے جب اوراق تاریخ اُلٹے جاتے ہیں تو وہاں پیغمبر اسلام "اُمی" نظر آتے ہیں۔ جو یقیناً غلط ہے۔

کیا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلہ پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ نیز اس سوال کے متعلق اپنی ذاتی رائے سے بھی مطلع فرمائیے۔

(نگار) قرآن بہ لحاظ تعلیم اخلاق یقیناً جامع و مکمل چیز ہے اور انشاء کے لحاظ سے بھی وہ عربی زبان میں اعجازی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اسلام کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے بشرطیکہ آنکہ اسکی اصل روح و تعلیم کو سمجھ کر اس پر

عمل کیا جائے۔ رہگیا رسول اللہ کا اُمّی ہونا سو اس کے متعلق بیشک گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر اُمّی کے معنے یہ لئے جائیں کہ انھوں نے باقاعدہ کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور علوم و فنون کا انھوں نے اکتساب نہ کیا تھا، تو یہیں کسی کو بھی اس میں کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ واقعی آپ کو کبھی اس کا موقعہ نہ ملا تھا، جیسا کہ خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸:-

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک

(یعنی اس سے قبل تو نے کوئی کتاب نہ پڑھی نہ لکھی)

الغرض قبل نزول وحی تو آپ کا نوشت و خواند سے ناواقف ہونا مسلم ہے، لیکن بعثت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے معمولی نوشت و خواند سے واقفیت حاصل کر لی تھی کیونکہ بعض تاریخی روایات سے آپ کا خود بعض مکاتیب کو لکھنا اور پڑھنا ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ آپ نے علوم و فنون حاصل کر لئے تھے پس ظاہر ہے کہ ایسی معمولی واقفیت نوشت و خواند کی ایک انسان کو صحیح معنے میں تعلیم یافتہ یا عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں بنا سکتی۔

لفظ اُمّی کے اشتقاق کے متعلق بھی لوگوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ام القریٰ سے لیا گیا ہے جو مکہ کا دوسرا نام ہے، بعض اسے لفظ امت سے ماخوذ بتاتے ہیں، اور بعض اس کا ماخذ عبرانی لفظ اموت بتاتے ہیں جس کے معنی بُت پرست کے ہیں اور چونکہ یہود عربوں کو بُت پرست جان کر اس لفظ سے یاد کرتے تھے اس لئے اپنے آپ کو غیر یہودی یا عرب ظاہر کرنے کے لئے وہی لفظ رسول اللہ نے بھی اختیار کر لیا۔

کلام مجید میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ایسے ایسے محل پر استعمال ہوا ہے کہ ہم کوئی ایک مخصوص معنی اسکے متعین نہیں کر سکتے

آل عمران کی اُنیسویں آیت ہے:-

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم

(اہل کتاب اور اُمیین سے پوچھو کہ کیا تم اسلام لے آئے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امیین سے مراد غیر اہل کتاب ہیں۔

اسی سورت کی آیت ۷۴ سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:-

ومن اہل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یودہ الیک ومنہم من ان تامنہ بدینار لا یودہ الیک الا مادمت علیہ قائما. ذلک بانہم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل۔

مفہوم یہ ہے کہ بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں دولت کا انبار سپرد کر دو تو وہ اسے واپس کر دیں گے، بعض

ایسے ہیں کہ ایک دینار کی امانت بھی واپس نہ کریں اگر انھیں مجبور نہ کیا جائے اور یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک امیین کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان کے باب میں کسی سے کوئی باز پرس ہو۔

لیکن سورۂ بقر کی آیت ذیل میں بھی لفظ اُن یہودیوں کے لئے بھی آیا ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے:۔

ومنہم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی ۔۔ یعنی یہود میں سے بعض ایسے آمی بھی ہیں جنھیں کتاب کا کوئی علم نہیں اور ہے تو غلط سلط۔ سورۂ جمعہ اور سورۂ الاعراف کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ آمی صرف عربوں کے لئے استعمال ہوا ہے مثلاً:

(۱) ہو الذی بعث فی الامیین رسولا یتلوا علیہ آیاتہ

(۲) الذین یتبعون الرسول النبی الامی

(۳) فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی

پہلی آیت میں امیین سے مراد اہل عرب ہیں اور دوسری تیسری آیت میں لفظ آمی نبی کی صفت واقع ہوا ہے جسکے معنے خواہ غیر یہود کے لئے جائیں یا غیر تعلیم یافتہ کے۔

اس میں شک نہیں کہ بعثت نبوی کے وقت جتنی قومیں عرب میں پائی جاتی تھیں ان میں کفار عرب ہی غیر اہل کتاب تھے اور اس لئے یہود و نصاریٰ نے جو صاحب کتاب تھے ان کو تحقیراً لفظ اُمّی سے خطاب کرنا شروع کیا جس کے اصلی معنی میں بے پڑھے لکھے ہونا کا مفہوم یقیناً شامل ہے۔

بہرحال رسول اللہ کا بے پڑھا لکھا ہونا ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اب رہا آپ کا یہ خدشہ کہ ۔

"جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مرتب کی علمیت کا درجہ" بہت بلند ہونا چاہئے۔ سو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ جس حد تک مذہب و تعلیمات مذہب کا تعلق ہے، ایک نبی یا رسول کا علوم ظاہری سے آگاہ ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ قرآن نہ فلسفہ سے بحث کرتا ہے نہ طبیعیات سے، نہ علم الکیمیا سے اس کو کوئی واسطہ ہے نہ فلکیات سے۔ وہ صرف اخلاق و تمدن کا درس دیتا ہے اور اس لئے رسول کا مرتبہ صرف اخلاقی حیثیت سے بہت بلند ہونا چاہئے، سو تھا۔

انسان بہ لحاظ فطرت دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک وہ جو دماغی حیثیت سے معمولی فہم و ذکا رکھتا ہے اور دوسرا وہ جسکا دماغ کسی خاص ذوق کے لئے غیر معمولی طور پر مناسب و موزوں واقع ہوتا ہے، اور اگر ایک رسول کو ہم دوسرے قسم کے انسانوں میں شمار کریں (اور یقیناً شمار کرنا پڑے گا) تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے خاص اہلیت اصلاح اخلاق کی لیکر آیا ہے اور یہ ذوق وہ ہے جس کے لئے کسی اکتساب کی ضرورت نہیں، اب رہا کلام مجید کا بہ لحاظ انشا پردازی اعجاز کی حد تک پہونچنا، سو اس کے لئے بھی تعلیم کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اہل عرب میں بڑے بڑے خطیب و شعراء سب

بے پڑھے لکھے تھے اور قوت بیان کا ملکہ ان میں فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ اگر کلام مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام یا الہامی کتاب نہ مانا جائے جس معنی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تو بھی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں، کیونکہ رسول اللہ نہ صرف یہ کہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، جہاں "سبعات معلقہ" کے شعراء نے جنم لیا تھا بلکہ ایک ایسے قبیلے اور گھرانے کے فرزند تھے جو یوں بھی ہمیشہ افصح العرب مانا جاتا تھا۔

بہرحال ایک پیغمبر کا علوم ظاہری سے واقف ہونا اس کے منصب کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری ہے اور اگر وہ زبان و انشاء کی حیثیت سے وہ کوئی چیز ایسی پیش کرتا ہے جو عقل انسانی کو حیرت میں ڈالدینے والی ہے تو اس کا تعلق صرف اس اہلیت سے ہے جسے وہ آفرینش کی طرف سے لیکر آتا ہے اور جو اکتساب و تعلیم سے یکسر بے بنیاد ہے۔

مطبوعات موصولہ

دلچسپ افسانے

مجموعہ ہے جناب کوثر چاند پوری کے ۲۵ افسانوں کا جو چھوٹی تقطیع کے ۱۸۰ صفحات پر شایع کیا گیا ہے۔ جناب کوثر کے افسانوں کا ایک مجموعہ "دلگداز افسانے" کے نام سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسرا مجموعہ شایع کرنے کی ہمت اُسی وقت ہو سکتی تھی جب پہلا ملک میں مقبول ہو چکا ہو۔

افسوس ہے کہ مجھے ان افسانوں کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا، لیکن سرسری تبصرہ کی غرض سے سرسری طور پر ورق گردانی سے میں اس نتیجہ تک ضرور پہونچا ہوں کہ کوثر صاحب جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، پلاٹ بھی دلچسپ پیدا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی معقول نتیجہ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ زبان و انشا کی دلچسپیاں بھی اکثر جگہ نظر آتی ہیں اور سیرت نگاری کے سلسلہ میں جزئیات کے استقصار کو بھی وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ طباعت و کتابت نہایت اچھی ہے اور قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ یہ ہے :- شمیم اختر ــ بیگم گنج ــ بھوپال۔

مقصود حیات

جناب حافظ غازیپوری کی کاوش دماغ کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، راجہ رام کالج کوٹاپور کے پروفیسر مسٹر بھالکڈے کی کتاب (Sexual problem in India) سے ماخوذ ہے۔ اس رسالہ کا موضوع "جنسیات" ہے جس کی طرف اُردو زبان کے مصنفین نے اسوقت تک بہت کم توجہ کی ہے۔ شادی بیاہ کا مسئلہ معاشرت کا اساسی مسئلہ ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس کی اہمیت کا اندازہ نہ علماء مذہب نے کیا نہ قائدین ملک و ملت نے۔

اس کتاب میں اسی مسئلہ پر نہایت ہی پاکیزہ و دلچسپ انداز سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عورت کا مرتبہ ماں ہونے کی حیثیت سے ملک کی ترقی پر کس حد تک موثر ہوتا ہے اور نکاح و ازدواج کی وہ کیا صورتیں ہیں جن میں عورت کی اس حیثیت کو نظر انداز کر کے ناقابل و نالایق افراد کا اضافہ ملک کی آبادی میں کیا جاتا ہے۔

اس رسالہ میں شادی کے موجودہ طریقوں پر بحث کر کے اس کے اصلاح کی ترکیب بھی بتائی گئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اگر ملک اس پر عمل کرنے کے لئے طیار ہو جائے تو نصف صدی میں وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ سکتا ہے۔

زبان و انشا کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں کیونکہ جناب حافظ غازیپوری اپنے ذوق ادب کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں اپنے اس ذوق کی رعایت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ مجلد نسخہ کی

قیمت بارہ آنے اور غیر مجلد کی نو آنے ہے ۔ ملنے کا پتہ یہ ہے :-

جناب حافظ غازیپوری ۔ اندرون حسن منزل ۔ الہ آباد

لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق دہلوی (مرحوم) کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ابوظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اُس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ سید ناصر نذیر فراق، دہلی کے مشہور انشاپرداز تھے۔ اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ زبان کی حلاوت، انداز بیان کی شیرینی، اردوئے معلّے کے ٹکسالی محاورے، تہذیب قدیم کے قواعد و مراسم کا بیان، الغرض اس چھوٹی سی کتاب میں وہ کیا چیز نہیں ہے جس سے اس وقت انشاء کی بڑی سی بڑی کتاب خالی نظر آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک وہ ختم نہیں ہوگئی۔ اور جب ختم کرچکا تو تاثر کا یہ عالم تھا کہ آنکھ اور دل دونوں رو رہے تھے۔

مسٹر شاہد احمد ڈیٹر ساقی کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ منثورات یکجا کرکے مرحوم ناصر نذیر فراق کی موت کو بہلوگوں کے لئے آسان بنا دیا قیمت ۱۲ ہے اور ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

راسپوٹین گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں راسپوٹین نے سلطنت روس کی تباہکاری میں جتنا خاموش لیکن عظیم حصہ لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ بظاہر صوفی و راہب تھا لیکن اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے اتنا زبردست شیطان تھا کہ شاید ہی اسوقت ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا مکار و شعبدہ باز صوفی اس کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔ راسپوٹین نے شہنشاہ روس اور اسکی بیگم پر اپنی شعبدہ کاریوں سے اتنا گہرا اثر قایم کرلیا تھا کہ خلوت و جلوت کی کوئی تفریق اسکے لئے باقی نہ رہی تھی اور ایوان شاہی کی ہر بلند بالا نوجوان لڑکی اس کے شبستان عیش کی شمع دل افروز نظر آتی تھی۔

اسی خوش نصیب شیطان کے حالات ہیں جو راسپوٹین کے نام سے پہلے کلکتہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار ہند میں بالاقساط شایع ہوتے رہے اور اب کتابی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ زبان و انشاء کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ان کے محاسن کی کافی ضمانت ہے۔ یہ رسالہ ۸ر میں دفتر اخبار ہند کلکتہ سے ملسکتا ہے۔

رہنمائے انجکشن ڈاکٹر مختار احمد صاحب ممتاز لاہوری کی تصنیف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انجکشن دینے کے کتنے طریقے ہیں، کس حالت میں، کہاں اور کیونکر انجکشن دینا چاہئے، مختلف امراض میں کون کونسی دوائیں کن حالتوں میں انجکشن کے لئے انتخاب کرنا چاہئے۔ کتاب فی الجملہ مفید ہے، اور وہ لوگ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو باقاعدہ ڈاکٹر تو نہیں ہیں لیکن ڈاکٹری معلومات انھیں حاصل ہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ طب جدید میور روڈ لاہور سے ۱۲ار میں ملسکتی ہے۔

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مارچ ۳۴ء کے نگار میں ہمارے فاضل دوست مسٹر اختر حسین بی۔ اے رائے پوری کا ایک مضمون "زبان بے زبانی" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، جس میں ایک درخت (برگد) کی زبان سے جذبۂ محبت کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی ۔۔ یہ داستان بھی اسی قسم کی ہے لیکن اُس بُت کی زبانی ہے جو اس برگد کے سایہ میں پڑا ہوا تھا۔ اس مقالہ کا موضوع یہ دکھانا ہے کہ ایک عورت اپنی فطرت کے لحاظ سے اتنی کمزور نہیں ہے جتنی اپنے ماحول کے لحاظ سے ہے۔ اور جسوقت اس کے سامنے روایات خاندانی اور تقاضائے محبت میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کر لینے کا سوال آتا ہے تو وہ کسقدر مجبوری کے عالم میں "پیمان وفا" توڑنے پر آمادہ ہوتی ہے ۔۔۔ اختر حسین صاحب ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ خوش قسمتی سے سنسکرت اور بنگلہ زبان کے بھی ماہر ہیں۔ چنانچہ اس مقالہ میں "ذوق واکتساب" دونوں کے امتزاج کا حُسن آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ نیاز

اے لوگو سُن لو کہ ہر شخص اپنے محبوب کی جان لیتا ہے۔ کوئی تیکھی تیکھی چتونوں سے اور کوئی میٹھی میٹھی باتوں سے۔ بزدل اپنے محبوب کو بوسہ سے قتل کرتا ہے اور بہادر تلوار سے۔ (آسکر وائلڈ)

گاؤں کے لوگوں نے صبح اُٹھ کر دیکھا کہ رات کے طوفان میں برگد کا درخت امربیل کو لئے ہوئے زمین پر گر پڑا ہے۔ بجلی اُسکے تنے میں ایک سیاہ تیر کی طرح پیوست ہو کر زمین میں غائب ہو گئی ہے۔ آشیانوں کے تنکے پرندوں کے بال و پر میں اُلجھکر ادہر اُدہر بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے آسمان سے نکالا ہوا فرشتہ ستاروں کی انجمن سے مشتری کو اُٹھا لایا ہو اُس کے تعاقب میں بجلیاں جھپٹی ہوں اور وہ بیدم ہو کر گر پڑا ہو۔ چبوترے کے خرابے میں ایک طرف میں سرنگوں پڑا ہوا ہوں، کل تک میں گنگا جل سے نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا۔ صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک اُنگلیاں پھولوں کی چادر مجھے اُڑھاتیں اور سرِ شام میرے اردگرد کے چراغ حُسن، محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصول آرزو کی دعائیں مانگتے۔ گویا عشق کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینہ میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی کہانی دفن ہے۔ حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ پھیلی اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے، مگر اس کی زبان و عبارت کو سمجھنے کے لئے ہوشیاری کی نہیں بیہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے۔ جب زمین ماضی کے خواب

دیکھتے دیکھتے بُدبُدانے لگتی ہے اور اس کی ڈوبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلمِ شفق سے لکھنے کے لئے شب کی سیاہی گھولتا ہے تو انسان اور بوم کے سوا ہر ذیحیات اُس کا ہمنوا اور ہمگوش ہوجاتا ہے۔

ممکن ہے میں 'باغ و بہار' کے اُس شہزادے کا بت ہوں جسے جادوگر نے پتھر بنا دیا تھا۔ کیا عجب کہ میں اس عشوہ فروش 'انسویا' کی صورت ہوں جسے اس کے شوہر کی بددعا نے سنگ جامد بنا دیا تھا۔ کیا ہوسکتا ہے کہ مجموعۂ الف لیلہ کی اس دکھیاری شہزادی کی جان ہو جس کا آدھا دھڑ پتھر کا تھا۔ پھر کوئی غزنوی مجھے سومنات کا بت سمجھ کر مسجد کی سیڑھیوں پر چننے کا اصرار کیوں کرے؟ گاؤں کے معمار کیوں مجھے اپنے مشقِ ستم کا ہدف بنائیں؟ کوئی چشمِ عبرت سے دیکھے کہ میرے سنگریزوں میں وہ چنگاریاں مضمر ہیں جو ان سیڑھیوں کو جلا دیں گی، ان پیروں میں آبلے ڈال دیں گی۔ ماضی کی یادیں اس زخم نصیب بُت کو یونہی سوگوار ماتم رہنے دو۔ دھوپ، پانی اور پالے میں پڑا پڑا وہ کچھ عرصے کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔ رگڑ نہ پہونچی تو رفتہ رفتہ اس کی گرمی کم ہوتی جائے گی اور ایک دن وہ آئے گا جب سنگ تراش اسے کاٹ کر کسی دہلیز پر ڈال دیگا۔

جب جانوروں کا مکروہ شور و شغب تھم جاتا ہے اور لیلیٰ شب کے رباب کو چاندنی کرنیں چھیڑنے لگتی ہیں، جب شمیمِ نیم شب کی چھیڑ سے تنگ آ کر رات کی کلی اپنا لاجوردی گھونگھٹ ہٹا کر لجائی ہوئی چتونوں سے شبنم کو دست درازی کی دعوت دیتی ہے۔ جب محبت کا دیوتا صوفی کے حجرہ میں شیطان کا غلبہ اور والدین کے گھروں میں بہرام بن کر داخل ہوتا ہے۔ تو یکایک محسوس ہوتا ہے کہ میرے سنگین جسم کی ایک ایک تہ کتابِ زندگانی کا ایک ایک ورق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں انگڑائی لیتا ہوا اُٹھوں اور دُنیا سے کہوں کہ بے زبان پتھروں میں بھی جان ہے۔ پجاریوں کا ہجوم کس خلوص سے میری پرستش کرتا رہا ہے۔ کتنے لوگوں کو میرے آگے عرضِ مدعا کر کے سکون و قرار حاصل ہوا ہے۔ کاش جیسے ہی کوئی ناکتخدا لڑکی میرے حضور میں اپنی تمنائیں پیش کرے، جیسے ہی ٹھکرائے ہوئے ارمان اور کچلی ہوئی آرزوئیں زبانِ حال سے فریاد کریں — یک بیک اس ساکت بت میں تھرتھری پیدا ہو، میرا دل دیپک راگ گاتا ہوا دھڑک اُٹھے اور اس کی آگ سب زبان درازوں کو خاک سیاہ کر دے اور محرومِ نطق بے زبانوں کے لئے ایک نیا جلوۂ طور بن جائے — ایسا طور جس کی تجلی غیر فانی اور دائم ہو مجھے اس تصور سے انتہائی اطمینانِ قلب ہوتا ہے کہ جب میرا ایک ایک ریزہ ایک ایک لفظ بن جائے گا اور جب میری گرمی گویائی میں متبدل ہوجائے گی، جب میں دنیا کو بتا سکوں گا کہ انسان کے بہائے ہوئے خون کا سیلاب چٹانوں کی صورت میں جم گیا ہے، جب میں ثابت کر سکوں گا کہ انسان چلتا پھرتا اور بولتا ہوا شہابِ ثاقب ہے۔ جب میں بُت شکنوں سے کہہ سکونگا کہ ہماری روح کو جسم کی قید سے آزاد کر کے تم نے اپنے دلوں میں بسا لیا ہے۔ تو انسانیت خودکشی کر لیگی! ہاں، اگر انسانیت مرد کے عشق کی طرح بیوفا اور عورت کے وعدوں کی طرح بے اعتبار نہیں ہے تو وہ یقیناً خدا سے کہیگی کہ اپنے عرش کے ساتھ اسی زمین پر اُتر آئے!۔۔۔ مگر معلوم نہیں وہ مبارک ساعت کب آئے۔

[redacted]

دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے، اور اس کے دلفریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہ جاتے اور سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سنا تھا، یا جب کوئی دیہاتی برات میرے گرد و پیش ٹھہرتی ہے اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے تیھروں کے ساتھ چوہے میں مجھے بھی لگا دیتی اور بڑوں کے ڈر سے ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی جھجکتی ہوئی آواز میں پریت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آ آ کر چھوتی ہیں ـــــ تو میں ان سے کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں۔ مگر جیسے پھانسی کی رسّی کا جھٹکا دمِ واپسیں آخری چیخ کو زباں پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے اوہام کی پابندی کسی دلہن کی زبان سے بوقت ایجاب و قبول "نہیں" نہ نکلنے دے ـــــ یہاں، سینے ہی میں میرے جسم لرزاں سے عالم نزع کی سی ایک ہچکی نکلتی اور سینہ میں رہ جاتی ہے۔ البتہ جب کبھی کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا اور مجھ سے ہمسخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اُسے زمین والوں کی سیاہ کاری سمجھنے لگتا ہوں۔

بہت دن ہوئے، سورج آہستہ آہستہ اُفق میں غائب ہو رہا تھا، گویا رات کی ناگن اپنے گو ہر شب چراغ کو نگل رہی ہو۔ ہوا اب ادھر ... ہول جھٹک رہی تھی۔ چراگاہوں سے لوٹتی ہوئی گائیوں کی گھنٹیاں انھیں تسلّی دے رہی تھیں کہ یہ قصاب کی چھری کے آرام کا وقت ہے۔ مجھ پر عبیر و گلال اور میرے سر پر آرتی کا چراغ رکھ کر پجارنیں رخصت ہو چکی، میرے سنگین جسم کی جلد پر پروانوں کی تڑپ ایک خفیف سی لرزش پیدا کر رہی تھی۔ میں ابھی اس سوچ میں غلطاں و پیچاں ہی تھا کہ جگنوؤں میں پتنگوں کے لئے کوئی کشش کیوں نہیں ہے کہ چبوترے پر پیروں کی چاپ سنائی دی اور میں نے دل کی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ ایک لڑکی پلکوں پر ٹھیرے ہوئے آنسو کی طرح میرے سامنے کھڑی تھرتھرا رہی ہے۔ اس کا رہ رہ کر دائیں بائیں دیکھنا، اپنی آہٹ سے آپ جھجکنا، موسم کی خنکی کے باوجود بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھنا، پلو کو سمیٹتے سمیٹتے یک بیک کانپ اٹھنا۔ یہ سب باتیں اس کی انتہائی بےچینی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے میرے آگے سر جھکایا اور درخت کا سہارا لیکر سہمی ہوئی بیٹھ گئی اور معلوم نہیں کس کا انتظار کرنے لگی۔

اپنے کو خدا سمجھنے کے فریب میں میں اتنے عرصہ تک مبتلا رہ چکا تھا کہ اب دوسروں کے محسوسات کو من و عن سمجھ سکتا تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس سرزمین پر عبادتگاہ ہی ایک ایسی جگہ کیوں ہے جہاں دو چاہنے والے مل سکتے ہیں مگر دیکھتا آیا ہوں کہ یونہی ہوتا ہے۔ ایسے واقعات سے مجھے چنداں دلچسپی نہیں لیکن اس دوشیزہ کے اضطراب میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ شوقِ ملاقات سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، نبض دوڑا کرنے لگتی ہے۔ خون کو کوئی پنکھا سا جھلا جاتا ہے۔ میں اس ولولہ کو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اس بیچاری کا دل بیٹھا کیوں جا رہا تھا۔ سانس کی جگہ ہچکیوں نے کیوں لے لی تھی؟ اس راز کا پتہ چلانے کے لئے میں اس کی روح سے ہم آہنگ ہو گیا۔

ایک گھونسلے میں شاما کا بچہ کنمنایا اور ماں نے اپنے پروں سے اسے تھپک کر سلا دیا۔ لڑکی نے آبدیدہ ہوکر اوپر دیکھا اور سوچنے لگی۔ "آج دلارے کو نیند کیسے آئے گی۔ اس کے پالنے کو اماں جھلائیں یا نہی رجنی گر وہ سوتا کب ہے۔ ہر شام کی طرح آج بھی وہ کالج سے میری واپسی کا منتظر ہوگا۔ جب تک میں پاس بیٹھ کر لوریاں نہ گاؤں وہ ہرگز نہ سوئیگا۔ اور ہائے میری مینا! جلدی میں اس کی کٹوری میں پانی بھرنا بھی تو یاد نہیں رہا۔ کہیں پیاسی نہ مرجائے۔ اچھا، اسوقت اماں کیا کر رہی ہوں گی۔ ابا کلب سے لوٹے ہوں گے، میرے لئے تصویروں کا البم وہ ضرور لائیں گے۔ اسے اوور کوٹ میں چھپا لیا ہوگا۔ راستہ بھر سوچتے آئیں گے کہ کامنی کو بہت چھیڑوں گا جب وہ بہت رونے کے قریب ہو جائے گی تو دوں گا۔ پھر وہ پگلی خوشی کے مارے ناچنے لگے گی۔ جب اماں کہیں گی کہ اسکول میں ڈرامہ ہے۔ لڑکی ہمجولیوں کے ساتھ ٹھہری ہے، نو بجے لوٹے گی تو ابا کچھ کبیدہ ضرور ہونگے جانے رجنی کیلئے کیا کیا لائے ہوں۔ لو ان کے ستار کے تار اتر گئے تھے۔ مجھ سے ٹھیک کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور ہاں، شام کو چمپلی میں پانی بھی تو نہیں دیا۔!

یہ پونے آٹھ بجے والی ریل جا رہی ہے۔ یہ نصیبوں جلی داہنی آنکھ رہ رہ کر کیوں پھڑک رہی ہے۔ اب تک راجین کیوں نہیں آیا آتا ہی ہوگا۔ دور سے اس کی آہٹ کو میں پہچان سکتی ہوں۔ داہنا قدم زور سے، بایاں دھیمے، کتنی بار کہا کہ یوں لڑکھڑاتے نہ چلا کرو مگر وہ کب مانتے ہیں...... رات ہی کو تو گھر بھر میں جاگ پڑ جائے گی۔ ابا کو سرجو سے معلوم ہوجائے گا کہ سب جھوٹ ہے، کالج میں کچھ نہ تھا، کامنی کا پتہ نہیں۔ ابا اماں پر بجلی سی گر جائے گی۔ دیر تک دونوں مبہوت رہیں گے اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھیں گے۔ کیا عجب کہ اسی وقت کپڑے پہن کر راجین کے مکان پر آجائیں۔ وہاں میں اُن کا سامنا کس منھ سے کروں گی! نہیں، ہرگز نہیں، میں پاگل ہوجاؤں گی۔ میں جانتی ہوں وہ زبان سے کچھ نہ کہیں گے مگر میں ان خاموش جھڑکیوں کو جیتے جی کیونکر برداشت کرسکوں گی اور اگر وہ ان کو بھی ساتھ لے آئے۔ تب تو میں زندہ نہ رہونگی اوف، اوہ اس خیال ہی سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔

آپ ہی آپ وہ جھک کر کھڑی ہوگئی۔ دیوانہ وار درخت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ پھر جب آنکھوں سے آنسو پونچھ کر انھیں جھٹکا تو دو چار قطرے نجھ پر بھی گر پڑے۔ بس یہ محسوس ہوا کسی نے نشتر لگا دئے۔ اب تک وہاں ٹیس سی اٹھتی ہے لیکن ساتھ ہی لطف بھی آتا ہے۔ پہلی اور آخری مرتبہ مجھ پر اخلاص کی دو چار بوندیں گریں مگر ان کے آگے گنگا جل کی وہ ساری گگریاں ہیچ ہیں جن سے لوگ گناہ کے دھبے دھونا چاہتے ہیں۔

کیا محبت مجھے یہ قوتِ گویائی بخشے گی کہ میں اُن کے سامنے حرف یہ جملہ کہہ سکوں ۔۔ ہم دونوں کی زندگی ایک ہے۔ چاند اور چاندنی، پھول اور نکہت تصویر اور رنگت کی طرح ہم الگ نہیں کئے جا سکتے۔ کیا کچھ دیر کے لئے حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر میں یہ کہہ سکوں گی۔ عورت بے زبان تھی کہ کل تک وہ محبت کی توہین کرتی آئی تھی۔ آج وہ خاندان اور سماج کی نہیں، محبت کی پرستار ہے۔ وقار اور عصمت کی خاک میں بڑی تلاش کے بعد اسے محبت کا ہیرا ملا ہے۔ اسے وہ کسی قیمت پر نہ بیچے گی

اب تک اپنے حسن کا عکس وہ بوالہوسی اور خود فریبی کے آئینہ میں دیکھتی آئی ہے - آج عشق آزادی کی آرسی لیکر اسکے سامنے آیا ہے، مجھے اپنی صورت اس میں دیکھنے دو - ماں کی ممتا اور باپ کی چاہت کی پٹی میری آنکھوں پر نہ باندھو - کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ — پاس پڑوس کی بوڑھی عورتیں میرے بڑے بول سے حیرت کی پتلیاں بن جائیں گی - والدین لعنت ملامت کریں گے، آسمان میں میرے لئے جگہ نہ ہوگی، زمین سونی ہوگی — اور اس خلا میں زندگی کا احساس ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح مدد کا طلبگار ہوگا - کیا میں خاندان کے دلدل میں پڑی ہوئی اسے ڈوبتی دیکھوں گی اور کچھ نہ کہوں گی — کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گریہ وزاری اور بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کردے اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر کہے کہ عورت اپنی روح کو پا گئی - اس کی خودی اپنے لئے ایک الگ خدا بنائے گی - وہ صرف رسم الفت کو مانیگی وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی - اس کے آئین الگ ہوں گے - کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ — کیا یہ ممکن ہے؟ -

ہیجان بت کے آگے گر کر وہ ایک سانس میں سیکڑوں دعائیں مانگ گئی - میرا شہ نشین اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا اس کی ہچکیوں کو سن کر پرندوں کے جوڑے کانپ اٹھے - نہ معلوم کیوں انھیں خدشہ ہوا کہ صیاد انھیں الگ کرنا چاہتا ہے - ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے فضا دیر تک متلاطم رہی - اس درخت پر سب نے بسیرا چھوڑ دیا اور جا کر دوسری ڈالیوں پر بیٹھ گئے - پروانوں کو یقین ہوگیا کہ ان کی وفا اور شمع کی جفا سب فریب ہے - دیر تک وہ اسی الجھن میں پھنسی رہی - گویا اس کی روح ایک دوراہے پر ٹھٹک کر کھڑی ہوئی تھی، جہاں سے ایک راستہ خاندان کی طرف اور دوسرا محبت کی طرف جاتا تھا - اوہام کے اندھیرے میں اس کی روح بھٹک رہی تھی اور کہیں راستہ نہ ملتا تھا - مجھے لوگ خدا سمجھتے تھے اگر انکی دلشکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اٹھتا کہ "اے وہ جو مجھ سے بڑا ہے، اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی فراہمی پیدا کردے کہ وہ مشعل راہ بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں — تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا! لیکن یہ نہ ہوا، آہ یہ نہ ہوسکا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، وہ دیا جھلملایا اور تاریکی کو زیادہ اندوہ فزا بنا کر گل ہوگیا -

"پرسوں ہولی ہے - کل شام کو ماموں گیا سے آئیں گی - اندو بھی ہوگی - اس سے ملے اب تین — تین کیوں پورے چار سال ہو گئے ہوں گے - کہا تو تمھارے لئے آسام سے ایسی ایسی چیزیں لائی ہوں کہ مرتے دم وصیت کر جاؤ کہ میری جان کے ساتھ ہیں اسلئے یہ بھی میرے ساتھ جلا دی جائیں یا قبر پر رکھیں گی - اور بڑی بھابھی تو آئیں گی - کتنا لطف آئے گا، کیسے جلسے ہوں گے! آج ابا سے کہنا بھول گئی کہ جھوٹے کے لئے ڈور منگوائیں اور ان پرانی پچکاریوں نے کیا ہوگا - میں تو اپنی سہیلیوں سے یوں رنگ نہ کھیلوں گی - اور ٹھیر دالی کے کان امیٹھوں گی کہ دو لعا گھر لے آئی اور ہمیں پوچھا تک نہیں - سچ میں تو اماں سے کہہ دوں گی کہ بوڑھوں کا جمگھٹ الگ ہو، کوئی تکلف بھی ہو"۔

طرب و نشاط کے اس تصور سے اس کا چہرہ دمک اٹھا - آنکھوں نے مسکرا کر آنسوؤں کی نمی کو گالوں پر خشک کر دیا - خوشی کے مارے اس بوان کی مٹھیاں بندھ گئیں - بچپن کی سکھیوں اور عزیز داروں کو سوچتے سوچتے بھی وہ آنکھیں بند کر لیتی

کبھی زیرِ لب مسکراتی اور چبوترے پر بکھری ہوئی پتیوں کو ہتیلی پر ملنے لگتی تھی۔ مگر چشم زدن میں یہ مسرت کافور ہوگئی، جیسے نفیرِ صبح پر کلی لبیک کہنے بھی نہ پائے اور مالی اسے توڑ لے جیسے محتسب کی دوڑ سے بتخانہ میں ماتم بپا ہو جائے۔ "نہیں یہ سب میرے لئے نہیں ہے۔ جب یہ قصہ انھیں معلوم ہوگا تو میں ان کی نظروں میں کتنی گر جاؤں گی۔ میرا نام آتے ہی وہ سب حقارت سے منھ پھیر لیں گی۔ میرا ذکر تک گوارا نہ ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی اُستانیوں کے ہاتھ بددعا کے لئے اُٹھ جائیں گے۔ بھولے بھٹکے میں کہیں سامنے آگئی تو وہ سب سر جھکالیں گی گویا میری بیجائی پر ان کی سیار دو رہی ہو۔ ابا اور اماں بھول جائیں گے کہ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے۔ محلے والے سرگوشیاں کریں گے، بھابھی ناک پر انگلی رکھیں گی، بھائی جان جنتری میں قیامت کی تاریخ ڈھونڈیں گے ـــــ اور میرا گناہ؟ میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے کیوں دیکھا اور اپنے دل سے کیوں مشورہ کیا۔ کیوں نہ شادی کے بازار میں والدین کے منھ بولے دام پر اپنے کو بک جانے دیا۔ کیا ان کلفتوں کو دیکھ سن کر میں زندہ رہ سکوں گی؟ آگ لگے اس محبت کو۔ کیا واقعی میں راجن کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی؟ ـــ نہیں...... یہ سوال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا......"

میں نے دیکھا کہ یہ وسوسہ اس کی روح میں ایک گتھی ڈال گیا۔ اس کی رگ رگ میں اس کشمکش کی وجہ سے اینٹھن سی ہونے لگی۔ درد و کرب کا یہ عالم میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ بار بار وہ اپنی ساری کا سرا گلے میں ڈال کر اسے گھونٹنے کی کوششِ رائگاں کرنے لگی۔ آپ اپنے کو اذیت دینے کے لئے دانت پچ پچا کر آنسوؤں کو ضبط کرتی، سانس روک کر ہچکیوں کو مسوس دیتی۔ ابھی وہ اسی بے بسی کی حالت میں تھی کہ سامنے ٹارچ کی روشنی دکھلائی دی اور کسی کی بیقرار آواز نے پوچھا "کامنی، کامنی۔" مگر وہ لڑکی یوں بے حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، کہ مجھے شبہ ہونے لگا آیا میں زیادہ بےجس ہوں یا وہ۔ نوجوان چبوترے پر چڑھ آیا اور اس کا نام لیکر متواتر پکارتا رہا مگر لڑکی خاموش رہی۔ پھر وہ قریب آیا اُسے ہاتھ کا سہارا دیکر کھڑا کیا۔ اور ستاروں کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے آخر یوں چپ کیوں ہو اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دئے۔

اس سے پہلے میں کئی بار دیکھ چکا تھا کہ عشق کی اُنگلیاں جب پہلے پہل بوسہ کے مضراب سے ربابِ حسن کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو کیسے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ایڑی سے لیکر چوٹی تک ایک تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے جیسے کسی نے بجلی کا تار رکھ دیا ہو، جیسے تتلی پھول پر بیٹھی ہو اور اس کے رنگین بازو پنکھڑیوں پر چپک گئے ہوں، جیسے بھونرا کنول کے پھول پر بیٹھا ہو، پتیاں سکڑ گئی ہوں اور وہ باہر نکلنا چاہتا ہو کہ دوبارہ گرفتار ہو ـــ ایک بے پئے کی مستی ـــ وہ پہلا پیار۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ آخری بوسہ کیا ہوتا ہے۔ جیسے محبوب کی مردہ لاش سے کوئی لپٹ جائے اور یہ سوچے کہ میری التجا اس کی آنکھ کھول دے گی، جیسے خواب سے جاگ کر کوئی پھر آنکھیں بند کر لے اس توقع پر کہ میں پھر اس جہانِ جمیل کی سیر کر سکوں گا، جیسے بچہ کھلونوں کو توڑ کر رونے لگے کہ اس کے آنسو ان ٹکڑوں کو یکجا کر دیں گے ـــ بس اسی طرح

اس لڑکی کی روح نیم جاں ہوکر اس کے بے رنگ و بو لبوں پر تڑپ رہی تھی اور اس نوجوان کی روح اُسے پکار رہی تھی — اُٹھ کہ میں تیرے لئے پیامِ حیات لائی ہوں، مجھے پہچان کہ میں تیری آواز کی بازگشت ہوں۔

آسمان پر ستارے آپس میں ٹکرانے لگے، پتیاں بل بل کر رونے لگیں، جگنو چشم زدن میں مینوا ہوگئے اور جب راجین نے اس کی باہیں چھوڑ دیں تو اُسے محسوس ہوا کہ زندگی میں کچھ کمی سی آگئی ہے۔

لڑکی نے جب اوسان سنبھالے تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سے جاگی ہے — اتنی گہری اور لانبی نیند کہ اس بیچ میں ایک جادو کی چھڑی نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوا کہ دماغ کی روشوں اور دل کے کھنڈروں میں کوئی لاش کو گھسیٹ رہا ہے۔ راجین کی آواز پر اسے شبہ ہونے لگا کہ دور سے کوئی اجنبی کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلا رہا ہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا — جب اس کی رنگین بیانی نے عشق کی ایک ایسی بستی بسا دی جس میں خود فراموشی، بیخودی اور سرشاری کے سوا کچھ نہ تھا، تو وہ چونک پڑی، اپنے کو سنبھالا اور بالوں کو سلجھاتی ہوئی بولی — نہیں نہیں، تمھیں دھوکا ہوا۔ میں تو تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ وہ کامنی مرچکی، اُسے بھول جاؤ وہ خاندان کے قفس میں رہتی آئی تھی، وہ اپنی بولی بھول چکی تھی۔ اُسے پرواز و رفعت کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ ماں اور باپ مقراض کے دو پہلو تھے جو اس کے پروں کو کتر دیتے تھے۔ ایک دن کسی جنس بیمایہ کی طرح یہ پنجرہ ایک چڑیمار کے گھر منتقل ہو جائے گا جسے عرفِ عام میں شوہر کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک روز تم قفس کی تیلیوں کے قریب آئے اور تمھارے آزاد نغموں نے میری خودی کی راکھ سے اُس موسیقار کو زندہ کیا جو میری روح ہے اور جو میری لاعلمی میں ہمیشہ وہیں تھی۔ میں بھی اس قید سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ اُٹھی اور اس حد تک کہ زمین و آسمان کی تیلیوں کو بھی توڑ دوں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ موسیقار جب نغمہ آفریں ہوگا تو مردنی ہنگامہ آرائیاں سکتہ میں آجائیں گی۔ وہ نادم ہوگا کہ اسکی زندگی کے تار کتنے بیربط اور اُلجھے ہوئے ہیں ..... لیکن ہائے ری، میری خود فریبی! میں نے قفس سے نکل کر دیکھا کہ میری روح ایک چمگادڑ تھی جو خاندان کے تاریک کونے میں ہی زندہ رہ سکتی تھی۔ روشنی میں آتے ہی اس کا دم اُلجھا اور وہ فضا میں اُلٹی اُڑنے لگی — مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔ ابھی اس پرندہ میں کوئل اور پپیہے کی سی خودداری پیدا نہیں ہوئی کہ صیاد اسے دام میں لاتے ہوئے گھبرائے۔ ممکن ہے کہ کبھی ایسا ہو سکے لیکن ابھی نہیں۔

میں پھر اُسی غلام گردش میں جاکر اپنے کو پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہوں۔ کل خاندان شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا۔ بہت سے سوداگر میری خرید کے لئے آئیں گے۔ میرے والدین انھیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کر کے وقار کے ترازو پر تولیں گے اور جو سب سے بوجھل ہوگا میں اُس کے سپرد کر دی جاؤنگی... کیا تم بھی اس نیلام میں بولی بولوگے؟ اگر آؤ تو سودے کے لئے تیار ہوکر آنا۔ مجھے وہیں پہونچا دو، جہاں سے

محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا۔ کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں۔

رقت سے اُسکے الفاظ گلے میں نوائے سوختہ بن کر رہ گئے اور تھوڑی دیر تک اس کے حواس کشمکش میں مبتلا رہے کہ جاگیں یا سوریں۔ میں اس محشرِ جذبات میں گم سم سا ہو گیا۔ فریبِ کائنات کا ایسا منظر پہلے نظر سے نہ گزرا تھا۔ جی چاہا کہ شہ نشین سے نیچے لڑھک پڑوں اور میرے جسم کا ہر ذرہ آنسو بن کر بہہ جائے۔ ابھی میں اسی کشش و پنج میں تھا کہ نوجوان نے بغیر کچھ کہے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لئے ہوئے چپ چاپ اس طرف چل دیا جدھر سے وہ آئی تھی۔ اس لڑکی سے تو وہ کچھ نہ بولا مگر چلتے چلتے مجھے ایک ٹھوکر لگا گیا۔ ہلکی سی ٹھوکر مگر ایسی کہ میرے دل و جگر الگ الگ ہو گئے۔ شاید چاند کے دل کا داغ ایسی ہی کسی ٹھوکر کا نقشِ پا ہے، شاید ایسی ہی ٹھوکروں سے سورج گہن میں آجاتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اسے دعا دوں یا بد دعا! جب اس نے کبھی مجھے دیوتا سمجھکر حصولِ مراد کی منت نہیں کی تو اس ناکامی کے بعد مجھے ٹھوکر لگانے کا اسے کیا حق تھا! ۔ کہہ نہیں سکتا، مگر اس خاک جبیں کے ذرات مجھسے کہتے ہیں کہ ایسی ہی ٹھوکروں سے بے جس دیوتاؤں میں جان پڑتی ہے۔

جب صبح ہوئی اور عبادت گزاروں نے مجھے بنایا سنوارا تو میں سوچنے لگا کہ کہیں پتھر سے موم تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر مجھ میں ایک عجیب تغیر ہو گیا ۔ ایسا کہ دھوپ میں سردی سے کانپنے لگتا اور رات کی نمی میرے لئے آگ بن جاتی۔ یہ تو تھا ہی، ساتھ ہی ساتھ جہاں آنسو کے دو قطرے گرے تھے وہاں ایک جلن اور جہاں ٹھوکر لگی تھی وہاں ایک کھٹک سی ہونے لگتی جب فضا خاموش ہوتی تو مجھے ہر طرف باجا سا بجتا سنائی دیتا اور جب کائنات کا ہر ذرہ شور فشاں ہوتا تو میرے لئے ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ گزرا کہ کچھ منچلوں نے دھوپ چھاؤں کے درختوں کے جھرمٹ میں ایک دیوی بٹھائی تھی اور ان کی باتوں سے میں سمجھا تھا کہ یہ میری دلہن ہے۔ ہنوز میں نے اس قسم کے کسی جانور کو نہیں دیکھا تھا تاہم یہ لفظ کتنا وجد آفریں تھا! میں ہزار جان اس دن کا منتظر رہا جب بہار کی آمد آمد ہو گی اور وہ ننھی سی مورت میرے آغوش میں بٹھلائی جائے گی لیکن ناگہاں کچھ لکڑہارے ایک روز وہاں آئے اور درختوں کو کاٹنا شروع کیا۔ بعد ازاں میں نے دیکھا کہ وہ جگہ بے برگ و بار پڑی ہے اور وہ مورت بھی سراب کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ اب تک مجھے کامل یقین تھا کہ اس بیچاری کو وہ سیہ بخت کہیں پھینک آئے لیکن نہیں ۔ آہ یہ نہ تھا! جب میں نے گزشتہ شب کے واقعات پر غور کیا تو دل پکار اُٹھا کہ اس مورت سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، وہ خود اُٹھ کر کہیں بھاگ گئی ہے! نہ میری آنکھوں کے آگے یہ درد انگیز سانحہ ہوتا، نہ سکون مجھ پر اس طریقہ سے حرام ہو جاتا۔

جب شام ہوئی تو میری وحشت اور انتشار کا رنگ پلٹا۔ دن بھر تو میں اس ناکام آرزو کو بد دعائیں دیتا رہا تھا کہ کیوں اس عورت کو میرے آستانہ پر بلا کر میری جان پر یہ ستم برپا کیا۔ مگر اب میں دل ہی دل میں منانے لگا کہ وہ پھر آئیں اور مجھے درد آشنا بنائیں، ایک بار دونوں ملکر مجھے ٹھوکریں لگائیں اور اسی وقت سب سے بڑا بُت میری زبان کھولدے اور میں چیخ اُٹھوں

وہ دونوں غم سے پسیج جائیں اور مجھے گود میں اٹھالیں، اپنی گستاخی پر شرمسار ہوں اور میں مچل جاؤں کہ جب تک ہر صبح تم دونوں میری پوجا نہ کروگے، میں ہرگز در گزر نہ کروں گا۔ وہ دونوں مجبور ہو جائیں میرے پاس کٹیا بنا کر رہنے لگیں اور ان کی زندگی اس برگد اور امربیل کی طرح ایک ہو جائے۔ ابھی میں یہ عجیب و غریب منصوبے باندھ رہا تھا کہ وہ نوجوان دور سے آتا ہوا دکھلائی دیا — مگر وہ اکیلا تھا۔

اس چبوترے پر سر جھکائے وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب سبزہ کی فراوانی سے زمین پر آسمان کا دھوکہ ہونے لگا تھا اور وہ دونوں اس پیڑ کی ڈال پر جھولا جھول رہے تھے۔ یکایک کسی شریر لڑکے کی غلیل کا نشانہ بن کر ایک مینا زمین پر گری تڑپی اور مر گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا جوڑا کچھ تنکے لئے ہوئے آیا اور اپنے آشیانہ کو آراستہ کرنے میں مصروف ہوگیا جو ابھی ادھورا پڑا تھا۔ پھر وہ اُسے پکارنے لگا اور جواب نہ پاکر اُسے ہر ہر ٹہنی اور ہر ہر ڈال پر ڈھونڈنے لگا۔ جب اس کی نظر نیچے گئی تو وہ چیخ کر لاش پر گر پڑا اور ہزار طرح اسے جگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ اُٹھی — نہ اُٹھی! پھر وہ ستم زدہ پرمیٹ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور مردہ مینا کے ادھ کھلے دیدوں پر اپنی چونچ سے سلائی پھیرنے لگا۔ کبھی وہ بیتابانہ دوسرے پرندوں کے پاس جا کر فریاد کرتا کہ دیکھو بسے ہوئے گھر اس طرح لٹتے ہیں کبھی آسمان سے شکایت کرتا کبھی زمین پر لوٹنے لگتا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھنے کی تاب وہ دوشیزہ نہ لاسکی تھی۔ اس کی آنکھیں شبنم فشاں ہوگئیں اور وہ نوجوان سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی ہوئی بولی — "وہ بیدرد اسے نہ مارتا تو کیا ہوتا!"

ایک لمبی سانس بھر کر وہ اُٹھا اور دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور آخر اس جگہ آ کھڑا ہوا جہاں کل رات آکر وہ بیٹھی تھی پھولوں کی وہ پنکھڑیاں اب بھی بکھری ہوئی تھیں جنہیں اُس نے اضطراب میں مسل ڈالا تھا۔ اب وہ مرجھا چکی تھیں۔ اس نے اپنی جیب سے خطوں کا ایک پلندہ نکالا۔ چراغِ تبخانہ سے پتنگے درسِ زندگی لے رہے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ہر خط کو لو دکھائی جس کی بھڑک میں محبت کی کہانی دم بھر میں خاکستر ہوگئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان میں کیا لکھا تھا — صرف اتنا دیکھا کہ آتش بجاں الفاظ غصہ سے آگ کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب خاک سیاہ ہوگئے ماسوا کاغذ کے ان ٹکڑوں کے جن پر آنسو کی بوندوں نے روشنائی پھیلا دی تھی۔

وہ ہاتھ باندھے درخت کا سہارا لئے، بت پر ایک پاؤں رکھ کر آنکھیں بند کئے دیر تک کھڑا رہا۔ نیم خوابی کی حالت میں اس نے دیکھا کہ اُس کی زندگی ایک باغ تھی، جہاں کی بہار خزاں نادیدہ نہ تھی؛ جہاں کے غنچے گل چیں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ یکایک اس میں ایک نیا پودا لہلہایا جس کے سایہ نے سارے باغ کو ڈھک لیا۔ اس سے ایسے ابخرات نکلے کہ کچھ دنوں بعد باغ ویران ہوگیا، کہیں پھل پھول کا نام نہ رہا۔ یہ عشق کا درخت تھا — جس کی دو ٹہنیاں تھیں —— مسلک اور عورت! اس باغ میں دو نہریں بہتی تھیں جو ان کی جڑوں کو سینچتی تھیں — لگاؤ اور الگاؤ! اکثر یہ ٹہنیاں باہم دست و گریباں ہوتیں اور وہ نہریں آپس میں گتھ جاتیں۔ ایک دن لگاؤ کی نہر سے ایک بیل پھوٹی جس کا نام "غرض" تھا

اور جو عورت کی ٹہنی سے لپٹ گئی۔ ان کی سازش سے دوسری ٹہنی سوکھنے لگی اور دوسری لہر بھی خشک سی ہوگئی۔

ابھی وہ درخت اس چوٹ سے سنبھل ہی رہا تھا کہ زندگی کے باغ میں سماج کا دیو وہم کی کلہاڑی لئے پہونچا اور دوسری ٹہنی پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی ٹوٹ کر گر گئی اور ساتھ ہی وہ بیل بھی سوکھ گئی۔

نوجوان آنکھیں مل کر زور سے بول اٹھا "کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا میرے دونوں شہ پر ٹوٹ گئے۔ کیا میری حقیقت برگد کے اس ٹھونٹھ سے زیادہ نہیں۔ کیا میں اس بت کی طرح بیزبانی کا گلہ کرتے کرتے مرجاؤں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نسیم زندگانی اس درخت کو تر و تازہ کر کے ان ٹہنیوں کو شاداب بنائے اور ان دونوں میں یگانگی کی روح پھونکے...... یا میں اس ویران نخلستان کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بساؤں جس میں بربادی کے سرچشمہ سے خلا کا بیج پھوٹے جس کا زہر زندگی اور موت دونوں کو ہلاک کردے!

یہ سوچتا اور مسلے ہوئے پھولوں کی خاک جلائے ہوئے خطوں کی راکھ کے ساتھ ہوا میں اڑاتا ہوا وہ چلا گیا۔ ایک مدت گزری، تاہم میں روز شام کو ان کا انتظار کرتا ہوں اور اکثر میرے کانوں میں اس کا وہ جملہ گونجا کرتا ہے جو بوقت وداع بکمال حسرت و یاس اس کی زبان پر تھا ـــــ "یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا"

زمین آسمان ہوتی اور آسمان زمین ہوتا تو کیا ہوتا! جنت جہنم ہوتی تو کیا ہوتا! دنیا کا ہر حسین بدصورت اور ہر بدصورت حسین ہوجاتا تو کیا ہوتا! اہرمن یزداں ہوتا تو کیا ہوتا! اگر زندگی بڑھاپے سے شروع ہوکر بچپن پر ختم ہوتی تو کیا ہوتا! یہ بت خدا بن جاتا اور خدا بت ہوتا تو کیا ہوتا ـــــ حسن باوفا ہوتا اور عشق بے وفا ہوتا تو کیا ہوتا! وہ مرد دھوکہ نہ کھاتا تو کیا ہوتا ـــ وہ عورت دھوکہ نہ دیتی تو کیا ہوتا۔

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے۔
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

اختر حسین رائے پوری

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی بُلاقی ولد تپو خاکروب محلہ فراش خانہ مصطفٰے منزل تھانہ چوک کوتوالی

بنام
۱ — گوپال ولد جے نرائن رستوگی ساکن محلہ رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۲ — گنگادھر ولد رام داس قوم رستوگی " "
۳ — بابو داس ولد چھین داس رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۴ — لالہ متھری ولد نامعلوم قوم رستوگی ساکن باغ مکا "
۵ — سندر لال رستوگی ملازم جگل کشور رستوگی باغ مکا تھانہ چوک کوتوالی شہر لکھنؤ
۶ — سندر لال بقال ساکن شیوالہ بھوانی سنگھ متصل ٹاٹ پٹی " " "
۷ — موہن رستوگی بازار کھالہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۳۱ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۵ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ اٹھارہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہوکر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعوی کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۲۲ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک



نرخنامۂ اجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۸۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۹ روپیہ
آدھا صفحہ	۸۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۷ "
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۶ "	۳ "

(۱) اجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں۔
(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانا ہو اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔
(۳) ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا
(۴) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر

نگار کی قیمت

سالانہ پاکستان کے اندر پانچ روپے ششماہی [illegible]
بیرون ہند آٹھ روپے [illegible]

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے [illegible] تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ [illegible] کے حساب سے قیمت لی جائے گی

منیجر

حصول جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار



نگار

جلد ۲۷	فہرست مضامین مئی ۳۵ء	شمارہ ۵

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	مئی سنہ ۳۵ء	شمارہ ۵

ملاحظات

(بسلسلۂ ماہ گزشتہ)

ہم اور ہماری موجودہ تعلیم

ہندوستان کی تعلیمی فضا کیا ہے اور تعلیم نے یہاں کے ذہن و دماغ میں کیا اُمید افزا انقلاب پیدا کیا ہے؟ اس کے سمجھنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ مختلف لوگوں سے سوال کیجیے کہ "تعلیم یافتہ" سے مراد اُن کی کیا ہے یعنی جب وہ ایک شخص کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں تو اُن کے دماغ میں کیا تاثرات ہوتے ہیں۔

بلا استثناء آپ کو ہر جماعت اور ہر طبقہ سے اس کا جواب یہی ملیگا کہ "تعلیم یافتہ" سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی کالج سے کوئی ڈگری حاصل کی ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس نے انگریزی زبان حاصل کی ہے اور اسی زبان میں چند مخصوص علوم و فنون کی تعلیم پائی ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات اس میں مذہبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل لوگ

کو بھی شامل کریں، لیکن خیر ہمیں اس وقت اُن سے بحث نہیں ہے کیونکہ جہاں سرے سے کوئی توقع ہی نہ کی جائے وہاں شکوہ و شکایت کا کیا محل ہے۔ الغرض تعلیم کا جو مفہوم عام طور پر ذہن نشین ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ ایک شخص معمولی انگریزی لکھ پڑھ سکے اور جس میں اتنی اہلیت موجود ہے وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہنے اور کہلائے جانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ پھر کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ عوام نے "تعلیم یافتہ" ہونے کا مفہوم کیوں متعین کیا ہے اور اس مفہوم میں انھوں نے ذہنی و اخلاقی ترقی و اصلاح کو کیوں شامل نہیں کیا؟ ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کے ماتحت ہم نے کوئی ذہنی و اخلاقی ترقی کی ہی نہیں کہ ہم اس کے علاوہ کچھ اور سمجھنے کا موقعہ لوگوں کو دیتے ۔ انھوں نے ہم کو جیسا دیکھا ویسا ہی سمجھا اور جو سمجھا وہی کہا۔ ممکن ہے آپ اس کو عوام کی سادگی و بے شعوری سے تعبیر کریں لیکن میرے نزدیک پبلک کا یہ اتنا زبردست طنز ہے کہ اگر ہم میں کچھ بھی احساس ہو تو ہم کو اپنی ذات سے شرم آنے لگے کیونکہ اس معنی کے ساتھ کسی کو "تعلیم یافتہ" کہنا گویا اس کو گالی دینا ہے۔

آیئے غور کریں کہ ایک جاہل شخص اور ایک تعلیم یافتہ انسان میں (خواہ وہ انگریزی کالج کا گریجویٹ ہو یا دیوبند کا فاضل) کیا فرق ہے؟ ۔ ایک جاہل شخص یقیناً کتابی علم سے محروم ہے اور اسے نہیں معلوم کہ آفتاب کے گرد زمین گردش کرتی ہے یا نہیں اور اس گردش سے شب و روز یا فصل و موسم کیوں ظہور میں آتے ہیں، وہ بلاشک یہ بھی نہیں جانتا کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کب حملہ کیا تھا اور خاندان مغلیہ کے کتنے بادشاہوں نے کتنے عرصہ تک یہاں حکومت کی، یہ بھی درست ہے کہ وہ ہوا اور پانی کے اجزائے ترکیبی سے ناواقف ہے، وہ یقیناً اس سے آگاہ نہیں کہ فرانس و امریکہ کا انقلاب کیوں ہوا اور اس کا اثر وہاں کی قوموں پر کیا ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ وضع و پوشش کے حسن اور معیشت و معاشرت کے تکلف و تصنع سے بےخبر ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کالج کے وہ فارغ التحصیل طلبہ جو طبیعیات و فلکیات کے ماہر ہیں، جو تاریخ عالم میں کافی درک و بصیرت رکھتے ہیں، جو ریاضیات کی موشگافیوں سے واقف ہیں اور جو کتابوں اور اخباروں کے ذریعہ سے تمام مسایل حاضرہ کا علم رکھتے ہیں، بہ لحاظ نتیجہ جاہلوں سے کیا امتیاز رکھتے ہیں؟ اگر تعلیم جدید کا نتیجہ صرف یہ قرار دیا جائے کہ اسکی وساطت سے نوکری کے حصول میں کچھ آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور قوم کے چند افراد کو تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کی جگہیں مل جاتی ہیں، تو بیشک ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم ہمارے لئے مفید ثابت ہوئی، لیکن اگر تعلیم کا حقیقی مقصود قوم کے نظام تمدن و معاشرت کو بلند و استوار کرنا ہے اور افراد میں ایسا ذہنی ارتقا پیدا کرنا ہے جو ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہو، تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم بجائے مفید ہونے کے اور

زیادہ مضرت رساں ثابت ہوئی، کیونکہ اگر ملک کی ساری آبادی جاہل رہتی تو کم از کم اس سے یہ فایدہ تو ہوتا کہ سب ایک سطح پر قائم رہتے اور فرقِ مراتب کا احساس بلندی و پستی کا امتیاز پیدا نہ کر سکتا، لیکن اب یہ حالت ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص غیر تعلیم یافتہ انسان کو غیر مہذب و ناشایستہ سمجھ کر اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا اور اس کے وجود کو زمین کے لئے بار سمجھتا ہے۔

تعلیم ہو یا کوئی اور چیز، متمدن انسان کی تمدنی دنیا میں اس کے فائدے کے ہمیشہ دو پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی، یعنی ایک یہ کہ ہر ہر فرد علٰحدہ علٰحدہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے اور دوسرا یہ کہ تمام افراد ملکر بہ حیثیت مجموعی قوم یا جماعت کے لئے مفید ثابت ہوں۔ پھر غور کیجئے کہ موجودہ تعلیم ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے کس حد تک قابل قدر ہے۔ جس حد تک صرف انفرادی مفاد کا تعلق ہے، اس کا حال اس وقت کسی سے مخفی نہیں کہ اگر تعلیم کے ادنیٰ ترین مقصد (یعنی حصولِ دولت و زر) کو سامنے رکھا جائے تو اس میں بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، چہ جائیکہ اجتماعی و قومی ترقی یا ذہنی و اخلاقی ارتقا کہ اس کا تو کوسوں پتہ نہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا طریق تعلیم نہایت خراب ہے اور جو نصاب تعلیم مقرر کیا جاتا ہے اس میں ملکی ضروریات یا قومی داعیات و مصالح کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

پہلے جب صرف مکتبی تعلیم کا رواج تھا تو کم از کم ایک مقصود تو سامنے ہوتا تھا اور وہ یہ کہ بچہ کو مذہبی انسان بنایا جائے۔ ہرچند یہ مقصود کوئی بلند مقصود نہ تھا اور نہ تمام نوعِ انسانی کے مفاد پر حاوی تھا، لیکن خیر ایک محدود جماعتی تنظیم تو اس سے متعلق ہو سکتی تھی، لیکن اب تو موجودہ تعلیم کی وجہ سے مرکزیت بھی باقی نہیں رہی اور سوائے اس ایک غرض کے کہ پڑھ لکھ کر نوکری مل جائے گی (جو حد درجہ خود غرضانہ و ذلیل ذہنیت ہے) اور کوئی سماجی یا ملکی تعلق اس سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

طلبہ کتابیں پڑھتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو چند سوالات کا جواب دیکر سند فراغ حاصل کرنا ہے اور کبھی ان کے دل و دماغ میں یہ امنگ پیدا نہیں ہوتی کہ وہ علم کو محض علم کے لئے حاصل کریں اور اس سے دوسروں کو فایدہ پہونچا کر نظام تمدن میں اپنی ہستی کو کارآمد ثابت کریں۔ وہ شیکسپیر کے ڈرامے پڑھتے ہیں محض اس مجبوری سے کہ وہ نصاب میں داخل ہیں اور کبھی ان کو یہ ولولہ نہیں پیدا ہوتا کہ وہ خود بھی شیکسپیر کی طرح اپنی زبان میں ایسا ہی کوئی کارنامہ چھوڑ جائیں، وہ سائنس و ریاضی کے مسایل کا علم حاصل کرتے ہیں، اس انداز سے گویا ان پر کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے اور کبھی ان میں یہ ولولہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی ان علوم کی مدد سے عالم ایجاد و اختراع میں

وہی مرتبہ حاصل کریں جو اہل مغرب کو حاصل ہے، وہ اکبر بادشاہ کی سارے سوانح حیات پڑھ جائیں گے لیکن ان میں کبھی وہ جذبۂ رواداری پیدا نہ ہوگا جو اکبر میں پایا جاتا تھا، وہ انقلاب فرانس کی مکمل تاریخ حفظ کرلیں گے لیکن خود انقلاب پیدا کرنے کی ذہنیت کبھی ان میں نشو و نما نہ پائے گی۔ الغرض وہ پڑھتے تو سب کچھ ہیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے جوں کے توں جاہل بنے رہتے ہیں اور اسی لئے جب کالج سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو وہ خود اپنی مدد کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتے دوسروں کو فایدہ پہونچانا کیسا؟

جیسا کہ میں نے ماہ گزشتہ کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا، نوع انسانی تین مختلف طبقوں میں منقسم ہے، سب سے بڑا طبقہ وہ ہے جسے ہم مزارعین اور محنت و مزدوری کرنے والوں کا طبقہ کہتے ہیں، دوسرا متوسط الحال لوگوں کا اور تیسرا اُمراء یا سرمایہ داروں کا۔ اس لئے اگر تعلیم کا مقصود یہ قرار پائے کہ وہ معیشت و معاشرت کے لحاظ سے ادنیٰ طبقہ کے انسان کو اعلیٰ طبقہ تک پہونچا دے، تو میں اس کو گمراہی سے تعبیر کروں گا، کیونکہ اس طرح ادنیٰ طبقہ کے تو اکثر افراد طبقۂ اوسط میں شامل ہو جائیں گے لیکن طبقۂ اوسط کے بہت کم افراد طبقۂ اعلیٰ تک پہونچ سکیں گے اور لامحالہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کی قوت مزدور طبقہ کی کمی سے اور زیادہ بڑھ جائے گی اور متوسط الحال طبقہ جو بہ حالت موجودہ کم پریشان نہیں ہے مزدور جماعت کے شمول سے اور زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جائیگا۔

میں اس کا قایل نہیں کہ سرمایہ داری کسی وقت دُنیا سے بالکل فنا ہو جائے گی، کیونکہ اگر نگاہ غایر سے دیکھا جائے تو بالشویزم بھی (جو سرمایہ داری کی سخت دشمن سمجھی جاتی ہے اور جو اشتراکیت کی انتہائی صورتوں کو بروئے کار لانے والی یقین کی جاتی ہے) حقیقتاً سرمایہ داری کو محو نہیں کرسکی، اور فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے اگر وہ انفرادی حیثیت رکھتی تھی تو اب اس نے اجتماعی صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت تو مٹ سکتی ہے، لیکن سرمایہ داری کی اہمیت کبھی محو نہیں ہوسکتی۔

پھر اگر ہندوستان کی موجودہ حکومت اور اس کے سیاسیات کو دیکھتے ہوئے اس امر کا امکان ہوتا کہ یہاں کی موجودہ سرمایہ دارانہ ذہنیت دور ہو سکتی ہے تو ہمارا فرض ہوتا کہ سب سے پہلے طبقۂ اعلیٰ کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی موجودہ ذہنیت کو بدلنے کی کوشش کی جائے، لیکن چونکہ اس کا امکان نہیں ہے، اس لئے جس حد تک تعلیم کا تعلق ہے اس جماعت کی طرف ہم کو توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ رہ گئے باقی دو طبقے سو بیک وقت ان دونوں جماعتوں میں عام تعلیم کرنے کی سخت ضرورت ہے، لیکن یہ بالکل اُصولی غلطی ہوگی

اگر ان دونوں کی تعلیم یکساں یا ایک ہی مقصد کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔

ہم کبھی اس کی توقع نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کے تمام گاؤں کسی وقت شہروں میں تبدیل ہو جائیں گے یا یہ کہ گاؤں کے رہنے والے سب کے سب شہر میں آکر زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ اس لئے گاؤں کی آبادی اور اس کے داعیات اور شہر کی آبادی اور اس کے ضروریات میں فرق کرنا ضروری ہوگا۔

گاؤں کا بچہ سب سے پہلے جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے وہ زراعت کا ماحول ہے اور اسلئے اس سے ہٹ کر اسکی تعلیم کا پروگرام متعین کرنا بالکل اصول کے خلاف ہوگا۔ البتہ وہ ابتدائی صنعتیں جو زراعت سے تعلق رکھتی ہیں بیشک اس میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسوقت جو صورت تعلیم کی دیہات میں رائج ہے وہ اس کی اگر بالکل ضد نہیں ہے تو اس کے موافق بھی نہیں ہے۔ ان کے لئے تاریخ و جغرافیہ، ریاضی و مساحت کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی فنِ زراعت اور اس کے متعلقات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

زمین کی قسمیں اور ہر زمین کے لحاظ سے اس کی پیداوار کے امکانات، آلات زراعت اور ان کا استعمال، آبپاشی اور اس کے مختلف طریقے، کھاد اور اس کی قسمیں، زراعتی جانوروں کی پرورش و حفاظت، دودھ اور مکھن کی پیداوار، ثمردار درختوں کے باغ طیار کرنا یہ تمام وہ باتیں ہیں جن کی تعلیم نہ صرف کتابی صورت میں بلکہ عملی طور پر ضروری ہے اور اسی کے ساتھ نجاری و آہنگری جو آلات زراعت طیار کرنے میں مدد دیسکے، سوت کاتنا، کپڑا بُننا، شکر بنانا، تیل نکالنا، صابن بنانا اور خیاطی یہ وہ صنعتیں ہیں جن کی عملی تعلیم دیہات میں ہونا چاہئے۔

اس وقت ہندوستان کی آبادی میں دس کروڑ ۳۲ لاکھ زراعت پیشہ ہیں اور صرف ایک کروڑ ۵۴ لاکھ وہ ہیں جو صنعت و حرفت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دیہات کی تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جو ہندوستان کی ۶۷ فی صدی آبادی سے تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک ہم اس جزو غالب کی اصلاح نہ کرلیں ملک کی فلاح و ترقی کا خیال دل میں لانا ہی فعل عبث ہے۔

ریاستوں کو چھوڑ کر اسوقت ہندوستان میں تقریباً ۶۷ کروڑ ایکڑ زمین قابل زراعت موجود ہے، لیکن کاشت ہوتی ہے صرف تقریباً ۲۲ کروڑ ایکڑ میں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ طبقۂ مزارعین تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بالکل ناواقف ہے کہ وہ زمین سے کیا کیا کام لے سکتا ہے اور وہ کونسی تدابیر ہیں جو اسکی قوت عمل کو بڑھا کر تمام اُفتادہ زمین سے فایدہ حاصل کرنے کا اہل اسکو بنا سکتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دیہی تعلیم بہت پھیل گئی ہے، لیکن قطع نظر اس سے کہ جو تعلیم وہاں

ہوتی ہے مفید بھی ہے یا نہیں، اس کی کثرت اشاعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسوقت ہندوستان میں ۱۶۹۸۳۵ مدارس ابتدائی پائے جاتے ہیں، جن میں شہری اور دیہی طلبہ کی مجموعی تعداد ۴۷ لاکھ سے زاید نہیں ہے اور اسی طرح ورنیکولر مدارس ثانوی ہیں (جن کی تعداد صرف ۴۵۸۹ ہے) کل ۵۴۲۱ طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اسی کے ساتھ اُس نسبت کو بھی دیکھئے جو گاؤں اور شہر کے طلبہ میں پائی جاتی ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندوستان کے طبقۂ مزارعین کی ۶۷ فی صدی آبادی میں ایک فی ہزار بھی ایسا نہیں ہے جسنے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہو یا یوں سمجھئے کہ مشکل سے فی گاؤں صرف تین آدمی پڑھے لکھے نظر آئیں گے۔ پس ظاہر ہے کہ جس ملک کے تعلیمی انحطاط کا یہ عالم ہو وہاں فلاح و ترقی کا کیا ذکر ہے۔

الغرض سب سے پہلے دیہات میں تعلیم کے رواج دینے کی ضرورت ہے اور تعلیم بھی وہ جو دیہی زندگی و دیہی مشاغل کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت اور قوم دونوں ملکر اس طرف توجہ نہ کریں۔

حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مخصوص قوانین کے ذریعہ سے کاشتکار کے ایسے حقوق متعین کرے جو اُسے زمین سے محبت کرنا سکھائیں اور زمینداروں کی جبر و تعدی اس کے اندر غلامانہ ذہنیت نہ پیدا ہونے دے، علاوہ اس کے محکمۂ صنعت و زراعت اور کواپریٹو بنک کو بھی محکمۂ تعلیم کا ساتھ دینا چاہئے تاکہ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ کاشت اور دیگر دیہی صنعتوں کے تجربات بھی اُن کے ذہن نشین کئے جائیں انکی تعلیم کے لئے ہر ضلع میں ایک بورڈ الگ ہونا چاہئے جو حکومت و قوم دونوں کا نمایندہ ہو اور سال میں ایکبار نمایش کے ذریعہ سے دیہات کی آبادی کو بتایا جائے کہ ایک ہی ضلع کے مختلف دیہات نے زراعت و صنایع زرعی میں کیا کیا اور کتنی ترقیاں کیں، اُصولِ حفظانِ صحت کی طرف بھی خاص توجہ کرنا چاہئے اور ہر ہر گاؤں میں لکچروں اور متحرک تصویروں کے ذریعہ سے اس کی اہمیت کو واضح کرنا چاہئے —— اس بورڈ کا فرض یہ بھی ہو کہ دیہات کے وہ لڑکے جو اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ہیں اُن کو وظایف دیکر شہر میں بھیجدے جہاں وہ اسی مخصوص فن کی تکمیل کریں جس کی طرف ان کا فطری رجحان ہے۔

رہی شہروں میں متوسط الحال طبقہ کی تعلیم اور موجودہ ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقررہ نصاب و طریقِ تعلیم و تربیت، سو اسکی ناکامی خود اس کے لغو و مہمل ہونے کی دلیل ہے۔ خیر اُن طلبہ کا تو ذکر ہی فضول ہے جنھوں نے صرف میٹرک تک تعلیم پائی ہے کہ اُن میں تو معمولی نوشت و خواند کی اہلیت بھی پیدا نہیں ہوتی

اور عملی زندگی میں وہ کسی قسم کا حصہ لینے کا شعور نہیں رکھتے، کالجوں کے گریجویٹ طلبہ بھی ذہنی و دماغی تربیت کے لحاظ سے کوئی ذمہ دارانہ کام انجام نہیں دے سکتے اور اپنی معلومات عامہ و واقفیت فنون کے اعتبار سے وہ صد درجہ ناقص ہوتے ہیں۔

اس سے قبل چونکہ دفاتر وغیرہ میں ان لوگوں کو ملازمت مل جاتی تھی اس لئے اس نقص کو زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب کہ عام بے روزگاری کی وجہ سے بقار حیات کے لئے بہت زیادہ جہد و مقاومت کی ضرورت ہے، تعلیم کے اس نقص کا احساس زیادہ ہوتا جارہا ہے اور لوگوں کو اس مسئلہ پر غور کرنا پڑرہا ہے۔

تعلیم کے انتہائی مقصد صرف دو ہوسکتے ہیں، ایک درستی اخلاق اور دوسرا اقتصادی فارغ البالی — میں اقتصادی صلاح کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ہماری بہت سی بداخلاقیاں پریشاں روزگاری سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی تدبیر صرف یہی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں صنعت و حرفت کی تعلیم کو لازم قرار دیا جائے۔

میٹرک کلاس اور بی۔ اے دونوں کو توڑ دینا چاہئے۔ ابتدائی درجہ تکمیل کا انٹرمیڈیٹ تک رکھا جائے اور آخری درجہ ام۔ اے کا — اسکول میں پہلے ہی درجہ سے آہستہ آہستہ کنڈرگارڈن اصول پر بچوں کو مختلف صنعتوں اور مختلف اوزاروں کے استعمال سے آگاہ کیا جائے، یہاں تک کہ دسویں درجہ کے بعد وہ کسی خاص صنعت کی تکمیل کے اہل ہوسکیں، اور اس کے بعد پورے دو سال میں وہ مہارت حاصل کرلیں۔ پھر اگر کسی کو تحقیقات و ریسرچ کا شوق ہو تو وہ مزید تین سال کے بعد تکمیل کا آخری درجہ حاصل کرسکتا ہے۔

اس وقت جو نصاب رائج ہے اس میں سے بعض چیزیں حذف کر دینا چاہئے اور بعض کو کم کر دینا چاہئے مثلاً فلسفہ کہ اس کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں ہے یا تاریخ و جغرافیہ کی بڑی بڑی کتابیں کہ صرف انکا ملخص کافی ہے، اسی طرح ریاضی کا معیار بھی گھٹا دینا چاہئے اور بلند تعلیم صرف ان طلبہ کو دینا چاہئے جو انجنیری وغیرہ سیکھنا چاہیں اسی طرح طبیعیات و کیمیا کی تکمیل بھی صرف ان کے لئے ضروری قرار دیجائے جو ڈاکٹری سیکھنے کی طرف راغب ہوں — ڈرائنگ بھی صرف ان طلبہ کو سکھانا چاہئے جن کو آیندہ چلکر نقاش و مصور بننا ہے — وہ طلبہ جو صرف ادب و انشا کے شائق ہیں ان کو نہ صرف انگریزی، بلکہ عربی، فارسی، اُردو اور ہندی سکھانا بھی لازم ہے۔ الغرض تعلیم و نصاب تعلیم میں اتنا تنوع پیدا کرنا چاہئے کہ ہر طالب علم اپنے مخصوص ذوق کے لحاظ سے کوئی لائن اختیار کرسکے اور غیر ضروری کتابوں میں اس کا وقت ضایع نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو تو کیونکر ہو؟ ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی!

پارسی اہلِ کتاب ہیں

(مسلسل)

حضرت زرتشت اور اُنکی تعلیمات

اب ہمیں دینِ زرتشت کی مخصوص کتب مقدسہ کو دیکھ کر معلوم کرنا چاہیئے کہ اس مذہب کے معتقدات و اصولِ دین کیا ہیں۔ جیساکہ اس سے قبل بیان ہوچکا ہے یسنا کے اُس حصہ میں جو گاتھا زبان میں ہے حضرت زرتشت کے وہ تمام اقوال وکلمات مرقوم ہیں جو حضرت زرتشت نے تبلیغ دین کے وقت اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے۔ یسنا کے تیسویں باب میں وہ اپنے خطبہ کو اس اعلان سے شروع کرتے ہیں کہ:۔ "ہر آدمی کا فرض ہے کہ اپنے اچھے اور بُرے کی تمیز میں اپنی عقل کو استعمال کرے۔ چونکہ یہ وقت نہایت اہم ہے لہذا لوگوں کو چاہئے کہ اپنے لئے ایک اپنا مذہب چُن لیں۔ اور خداوند عالم کے احکام کو بغور سنیں۔"

پھر وہ فرماتے ہیں کہ:۔ "ہر شخص کے لئے اِس دُنیا میں صرف دو راستے کھلے ہیں اور یہ دو راستے نیکی و بدی کے ہیں۔ نیکی کا راستہ نجات و مسرتِ ابدی کی طرف لیجاتا ہے اور بدی کا راستہ جہنم کی طرف لیجاتا ہے اور ہمیشہ کیلئے مصائب وتکالیف میں مبتلا رکھتا ہے۔ پس خدا نے ہر شخص کو عقل کا مادّہ عطا فرمایا ہے تاکہ وہ تباہ و برباد نہو جائے۔"

زرتشت نے نیکی وبدی کے دو متضاد کوائف کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں اُن کا ترجمہ ڈاکٹر جیمس مولٹن نے اس طرح کیا ہے:۔[1]

(۱) عقلمندوں کو چاہئے کہ خداوند عالم کی حمد وثنا کریں اور سچائی اختیار کریں۔ اس کے عوض وہ رحمت پائیں گے۔

(۲) اپنے کان اچھے کلام کے سننے میں استعمال کرو۔ دروغ وکذب میں دوراندیشی سے کام لیکر امتیاز کرو۔

---

[1] اشعار ایران قدیم صفحات ۹۲ - ۹۶ -

(۳) رفتار، گفتار اور کردار میں بھلائی اور برائی دونوں پائی جاتی ہیں۔ دانا وہ ہے جو ان دو دیرینہ ازواج میں نیکی کو اختیار کرتا ہے اور نادان وہ ہے جو برائی کو۔

(۴) جب یہ دو روحیں شروع میں ایک دوسرے سے ملیں تو انھوں نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ دنیا کے اختتام پر دروغ پرستوں کو بدترین زندگی نصیب ہوگی اور راستی پسند بہترین جگہ پائیں گے۔

(۵) ان دو روحوں میں دروغ پرست نے بدترین کردار کو پسند کیا اور راستی کے پیرو نے حق کو اپنا پیراہن بنایا۔

(۶) یقیناً جھوٹ مسرت سے محروم رہیگا اور وہ لوگ جنھوں نے سچائی کی پیروی کی ہے انھیں حسب وعدہ انعام ملیگا۔

(۷) پس اے لوگو اگر تم ان احکام پر جو "مزدا" نے تمھارے لئے مقرر کئے ہیں غور کروگے اور اس دنیا کے رنج و راحت کا خیال رکھتے ہوئے دروغ پرستوں کے دائمی رنج اور سچوں کے نیک انجام کو پیش نظر رکھوگے تو اس دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ شاد و خرم رہوگے۔

جیسا کہ خطبہ سے ظاہر ہے یہ خطبہ اس مجمع کے سامنے دیا گیا تھا جہاں ہر طبقہ اور نزدیک و دور مقامات کے لوگ جمع تھے۔ ان مخصوص باب کے متعلق راگزن لکھتے ہیں — "یہ وعظ دین زرتشت کے عہد اولین میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو مذہب عیسائیت میں "موعظت کوہ" کو حاصل ہے۔[1]

یہ مسئلہ خیر و شر بالکل ویسا ہی ہے جیسا قرآن اور انجیل میں ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کتب مقدسہ میں بھی لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلیں اور اس راستے پر ہرگز نہ چلیں جس کی طرف شیطان لیجاتا ہے۔[2] اللہ کے محبوب بندوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل کو کام میں لائیں تاکہ حق و ناحق (یعنی صواب و خطا) روشنی و تاریکی، نیکی و بدی، خدا اور شیطان میں تمیز کر سکیں۔ ہم لوگوں کے سامنے اس دنیا میں یہی دو راہیں ہیں۔[3] ایک طرف سیدھا راستہ ہے جو خدا اور آرام گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور دوسری طرف غلط راستہ ہے جہاں شیطان کی رہنمائی میں جہنم اور آلام ابدی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

شر یعنی بدی کے مخلوق خداوندی ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر "میکولوچ" لکھتے ہیں:[4] — "جو شخص جو کسی الہامی کتاب کو پڑھتے اور اس پر یقین رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ "بدی" خدا کے قبضہ سے باہر ہے یا بدی کو خدا نے خلق نہیں کیا۔ ہمیں اس خیال پر مجبور ہیں کہ بدی کو ایک ایسی مستقل مخلوق خدا سمجھیں جو خدا کی مشیت کا مل

---

[1] میڈیا صفحہ ۱۰۲ — [2] القرآن: درد ۵ آیت ۴۴ — [3] القرآن سورہ ۹۰ آیت ۱۰-۸ — [4] "صفات خداوندی" جلد ۳ صفحہ ۵، لندن ۱۸۴۳ء)

کے قبضہ میں ہے۔ ہمیں اس عقیدہ کے آخریں اور نامعلوم نتائج کے متعلق کچھ چون وچرا کی گنجائش نہیں۔

علامہ سر محمد اقبال اپنی ایک تصنیف میں ہیگل[1] اور ہاگ[2] کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں[3]: "یہ کہنا کہ صداقت و کذب کی دو روحوں کا ذات واجب الوجود میں یکجا ہو جانا یہ مطلب رکھتا ہے کہ بدی خدا کے وجود کا ایک جزو ہے اور نیکی و بدی میں کشمکش ہونا گویا خود خدا کا بدی سے جنگ کرنا ہے۔"

اس بحث کے سلسلہ میں شمس العلما شبلی نعمانی کے خیالات یہ ہیں کہ:— "تمام گناہ جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں وہ حقیقت امر یہ ہے کہ خود خداوند عالم کی مرضی سے سرزد ہوتے ہیں مگر اس حقیقت کے اقرار میں عوام کو شبہ ہوگا کہ ان کا بانی و باعث خود خدا ہے پس ہم اب اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خیر و شر خداوند عالم کی مخلوق ہے۔ اور یہ دونوں آخر کار اسی واجب الوجود میں مل جاتے ہیں، کیا قرآن حکیم نے شیطان کے انسانی امن و امان میں مخل ہونے کی شکایت نہیں کی ہے؟ کیا خدائے دانا و بینا کو خود اپنی خلق کی ہوئی شئے یعنی بانیِ شر کی آیندہ شرارتوں کا حال معلوم نہ تھا۔ بہرحال یہ سب امور اسرار خداوندی اور خلقت عالم میں ہیں۔

فطرت میں اجتماع ضدین ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ہم روشنی کی محض تاریکی کی بدولت تمیز کرتے ہیں۔ گرمی کا احساس سردی کی بنا پر کرتے ہیں، محبت کا مزہ نفرت کی تلخی سے پہچانتے ہیں اور صحت و تندرستی کی نعمت کا اندازہ بیماری کی تکالیف جھیلنے کے بعد ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے ہر شئے کا جوڑا پیدا کیا ہے کوئی شخص کسی شئے کے حُسن کا احساس اسوقت تک نہیں کر سکتا جب تک اُس کے خلاف بُرے نتائج سے اُسے مطلع نہ کر دیا جائے۔ حکم خداوندی کے مطابق پاکبازی راستی اور مذہب کے شاندار نتائج کی تشریح اُس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک شیطان کے بربادکن رویہ سے لوگوں کو مطلع نہ کر دیا جائے اور یہ امر بوضاحت نہ بتایا جائے کہ شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے خلاں خلاں آلام و مصائب میں گرفتار ہونا پڑتا ہے کامیابی کا اندازہ ناکامی سے ہوتا ہے۔ لیکن خدائے رحمان و رحیم اپنے پیارے بندے کے کسی ایسے کام کا جو ناکامی یا بُرے نتائج کا باعث ہوں ذمہ دار نہیں اُس نے ہر شخص کو کافی عقل عطا فرمائی ہے اور اُسے اس دار المحن میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ پس جو شخص اُس کے حکم کو دل و جان سے سنتا اور اُس پر عمل کرتا ہے وہ نجات ابدی حاصل کرتا ہے اور اس کے برخلاف جو اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا اور غلط راہ اختیار کرتا ہے تباہ و برباد ہوتا ہے۔

---

[1] مشرقی ایرانیوں کا تمدن بزمانۂ قدیم" ملاحظہ ہو۔ [2] مضامین ہاگ۔ [3] ارتقائے الٰہیات در ایران" صفحہ ۴۔۳۔

زرتشت کی غرض بھی یہی تھی کہ وہ فطرت کے دونوں رُخ کو مشرق کے اُن باشندوں کو سمجھاوے جو جہالت کے باعث نفسانی خواہشات کے غلام ہو رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہ خیال ایرانیوں کے لئے بالکل نیا تھا اور اسی لئے زرتشت نے اپنے سامعین کی ذہنیت کا لحاظ کرتے ہوئے یوں بیان کیا کہ:۔ " اصل میں دو روحیں تھیں جن میں سے ایک نیکی اور دوسری بدی تھی دونوں آپس میں ملکر اس طرح کام کرتی رہیں کہ انکا علحدہ کرنا بالکل ایسا ہی دشوار تھا جیسا دن اور رات کا۔ جو شخص نیک روح کی پیروی کرتا ہے اُسے چاہیئے کہ بد روح سے غافل نہ رہے کیونکہ یہی ہر وقت اُسے راہ غلط کی طرف گمراہ کرنے کے لئے مستعد رہتی ہے[1]۔ یہ دو روحیں ایکدوسرے کی مخالفت میں برابر برسرِپیکار رہیں اور ان کی یہ کشمکش تا روز قیامت جاری رہے گی اور اسوقت خدا نیکی کی مدد کرے گا۔ ہر شخص ان دو روحوں سے ایک کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ وہ شخص جو نیکی کو رہبر بناتا ہے وہ یزدان کا معین و مددگار سمجھا جاتا ہے اور وہ شخص جو بدی کو اپنا سردار تسلیم کر لیتا ہے اُس کا اہرمن کی فوج میں شمار ہوتا ہے پس جس نے یزدان کی مدد کی وہ جنت پائے گا اور جس نے اہرمن کی اطاعت کی وہ جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں شہرستانی کی مشہور کتاب سے چند جملے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے[2]۔ وہ لکھتا ہے:۔ "نیکی اور بدی۔ پاک و نجس یہ سب روشنی و تاریکی کی طرح وجود میں آئے ہیں۔ اگر ان کا وجود مدغم ہوتا تو دنیا قایم نہ رہ سکتی۔ ہر شئے کی ضد کا پیدا ہونا چونکہ لازمی ہے لہذا تاریکی کا وجود عالم آفرینش میں ایک لازمی امر تھا۔"

چونکہ عموماً لوگ معمولی دماغ و ذہنیت کے ہوتے ہیں لہذا نیکی اور بدی کا پہلے پہل سمجھانا سوائے اس صورت کے کسی اور طرح دشوار تھا۔

خواجہ کمال الدین لکھتے ہیں:۔ " ہم میں اکثر کوئی نامعلوم قوتیں اچھے اور بُرے کاموں کی تحریک کرتی رہتی ہیں ان قوتوں کو قرآن حکیم نے علی الترتیب فرشتہ و شیطان کے نام سے موسوم کیا ہے[3]"۔ نیکی و بدی میں باہم ربط ہونیکے مسئلہ کو حضرت زرتشت نے توام ارواح کی مثال دیکر سمجھایا ہے۔ پھر اس مثال کی روشنی و تاریکی۔ سچ و جھوٹ زندگی و موت جیسی مثالوں کو پیش کر کے وضاحت کی ہے۔ واضح رہے کہ بجنبہٖ اسی قسم کا موازنہ قرآن و انجیل میں بھی مرقوم ہے ان کتب مقدسہ میں بھی روشنی کو نیکی اور تاریکی کو بدی و گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے[4]۔ تاریکی کو گناہ اور شر کا نشان بتایا گیا (دیکھو ایوب ۱۹ آیت ۸۔ قرآن سورۃ ۲۴ آیت ۴۰) اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دن کی روشنی نیکی کی علامت اور

---

[1] قرآن حکیم بھی ملاحظہ ہو۔ سورۃ ، آیت ، ۱۰۔ [2] کتاب الملل والنحل۔ [3] قرآن حکیم سورۃ ۲-۷-۲۰۔ [4] اسلام اور مذہب زرتشت مصنفہ خواجہ کمال الدین۔

شب کی تاریکی گناہ کی علامت ہے۔ بلکہ مندرجۂ بالا تقابل اور موازنہ سے اسوقت کے لوگوں کی کم علمی کا خیال رکھتے ہوئے اس مسئلہ خیر و شر کی سادہ الفاظ میں تشریح کرنا مقصود تھا۔ زندگی اور موت کا تقابل بھی اسی طرح نیکی و بدی سے کیا گیا ہے اس جگہ زندگی سے مراد روحانیت اور پاکیزگی کی زندگی ہے اور موت کا مطلب نورِ ایمان سے محروم رہنا ضمیر نیک سے جدا ہونا۔ نیک اعمال کو چھوڑ کر شیطان کا مقلد ہو جانا ہے[1]۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زرتشتی فلسفۂ مذہب میں بدی کا نتیجہ موت ہے زرتشتی مذہب کے پیرو موت کو خداوند عالم کی ایک رحمت سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرتے ہیں

اُن کا اعتقاد ہے جب روح ہمارے مادی جسم کو چھوڑ کر خالص زندگی بسر کرتی ہے تو اُسے بلند معیار روحانیت کا نصیب ہوتا ہے اور روح تمام آلام و مصائب سے نجات پا جاتی ہے[2]۔ "موت تکمیل حیات ہے" (دینکارد جلد پنجم صفحہ ۲۳۰ مترجمہ پشوتن سنجانا) زندگی اس دنیا میں مختصر مگر آئندہ دنیا میں دراز ہے۔ (اندرز خسروی کاواتان پنجم "سوائے موت کے تمام امراض کی دوا مقرر ہے" (دینکارد جلد دوازدہم باب ہفتم صفحہ ۲۷) پس ہم اس نتیجہ پر بلا کسی شبہ کے پہونچتے ہیں کہ موت و بدی کا تقابل محض تشریح کی غرض سے دینِ زرتشتی میں ہوا ہے۔

اب ہم یسنا باب سی و یکم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس میں سب کے ارتقا اور کشمکش سے بحث کی گئی ہے یہ ترجمہ پروفیسر ملس کے ترجمہ سے ماخوذ ہے[3]۔

(۱) ہم اُن اُصول کو بیان کر رہے ہیں جو دروغ پرستوں کو تو یقیناً ناگوار ہوں گے لیکن ان لوگوں کے لئے جو مزدا پر ایمان و یقین رکھتے ہیں یہ بہترین کلام ہے۔

(۲) اگر اس طرح پر تمھاری روح سچائی کو اختیار نہ کرے گی تو میں حسب مرضی اہورا مزدا تمام اُن امتیازات کے ساتھ آؤں گا جو اہورا مزدا اپنے رسولوں کو عطا فرما کر اس دنیا میں حکومت کے لئے بھیجتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن رسولوں کی بدولت اُس کے بندے اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور پاکبازی کی زندگی بسر کریں۔

(۳) اے مزدا۔ مجھے اُس سزا سے جو تو نے گنہگاروں کے لئے مقرر کی اور اُن انعام سے جو تو نے نیکوکاروں کیلئے مقرر فرمائے ہیں مطلع فرما۔ تاکہ میں اُن کا دنیا میں اعلان کر دوں۔

---

[1] تقابل فرمایئے انجیل متی نور سے مراد روح اور جان ہے۔ اسی طرح تاریکی سے مراد موت ہے۔ قرآن سورۃ ۲۰ آیت ۱۱۔ [2] شکند گمانک وہیجار باب ۴ سطر ۸۰ اور باب ۱۲ سطر ۹ پھر اسکا حدیث جناب ختمی مرتبت منقولہ غزالی کیمیائے سعادت) صفحہ ۴ تقابل کیجئے۔ مفتی میر محمد عباس شوستری اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنی مثنوی "من و سلویٰ" میں بڑی خوبصورتی سے اسے نظم کیا ہے۔ [3] ادبیات مقدسہ مشرقی جلد ۳۱ صفحات ۵۳-۳۶۔

(۴) جب مزدا کے فرشتوں کے ساتھ ابدی رحمت ہماری التجا کی طرف متوجہ ہوگی تو دین کی رحمت اور تیری پاکیزگی کی اعانت سے ہم اُس قدرت اور قوت کا مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ ہم شیطان کا قلع قمع کر سکیں۔

(۵) اے راستی مجھے میرے بہترین حق (حصہ) سے آگاہ کرتا کہ میں اُسے تلاش کروں۔ اے پاک منشی مجھے اُس کا پتہ بتلا دے جس کے ذریعہ تمام نیکیاں اور خوبیاں پہچان سکوں۔ اے اہورا مزدا مجھے اُن چیزوں سے جو پسندیدہ اور غیر پسندیدہ ہیں مطلع کر دے۔

(۶) اہورامزدا مجھے اپنی سلطنت کے اُس حصہ کا جو پاکبازی کے نور سے منور اور نعمہائے جاودانی سے معمور ہے پتہ بتلا۔

(۷) تو ہر شئے پر قادر ہے۔ تو ان تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا بانی ہے۔ تو اپنے فیاض دماغ کے پرتو سے اولیا کے دماغ کو بلند خیال بناتا ہے۔ اور اُن کی پاک ہستیوں کی اعانت کرتا اور انھیں ترقی دیتا ہے (کیونکہ وہ تیرے مخصوص بندے ہیں) تو ہمیشہ یکساں ہے۔

(۸) اے اہورا مزدا تو ہی اپنے بندوں کے معبود ہونے کے قابل ہے۔ تو ہی پاک منشی کا بانی و مالک ہے۔ میری روشن آنکھوں نے تجھ ہی کو انسان کی نیکیوں اور زندگیوں کا مالک پایا۔

(۹) اے اھورامزدا میں تجھ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیندہ کیا کیا باتیں ظہور میں آنے والی ہیں۔ ۔۔۔ اور بدکاروں کی کیا سزا ہے۔ ان کا انجام دحشر کس طرح ہوگا۔

(۱۵) اے اھورامزدا اُس کی کیا سزا ہے جو بدی کرتا اور بدکاروں کی مدد کرتا ہے اور پاکباز کسانوں کو تکلیف پہونچانا اپنا مقصد حیات جانتا ہے؟۔

(۱۶) اُس کے کلام و اقوال کو سننا چاہئے جو دونوں جہاں کی حقیقت سے باخبر ہو اور وہی ہماری زندگی میں ہمارا رہنما ہو سکتا ہے جو بلا رد رعایت حق بات کہدیتا ہے اور اے اھورامزدا تیری جلائی ہوئی آگ جو تو نے اپنے بندوں کی رہنمائی کی خاطر جلائی ہے اُسی کی مطابقت سے وہ کلام کرتا ہے۔

(۲۱) اھورامزدا دائمی راستی۔ شہریاری۔ پارسائی۔ بُردباری اور پاک منشی اسی کو عطا کرتا ہے جس کے قول، فعل اور خیال اُسکی (یعنی اہورامزدا کی) مرضی کے مطابق ہوں۔

اس کے بعد زردشت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا لایا ہوا دین تمام دنیا کے لئے یکساں مفید و ضروری ہے اور ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ زردشت نے دیوپرستی کی بیخ کنی کی غرض سے اھورامزدا کی اعانت طلب کی تھی۔

بلاشبہ ابتداء میں دین زرتشتی تمام عالم کے لئے تھا اور اس مقصد کی تکمیل بھی عہد اولی میں دوسرے مذاہب والوں کو اس مذہب کا پیرو بنا کر کی گئی[1]۔ زرتشت کے حوارین دور دور دراز ممالک میں جا جا کر مزدا پرستی یعنی زرتشتیت کی زرین تعلیم کی تبلیغ کیا کرتے تھے[2]۔ یہاں تک کہ دیو پرستوں کے فرقہ نے بھی ان کی تقلید میں بت پرستی کی تبلیغ شروع کردی تھی[3]۔ یشتہا میں اکثر ایسے علماء اور اولیاء کا ذکر ہے جو اولاً تورانی تھے لیکن بعد کو اس نئے مذہب پر ایمان لے آئے[4]۔ پہلوی دینکارد (جلد دہم حصہ پنجم) کی یہ عبارت بھی اس مذہب کے مذہب عالم ہونے پر شاہد ہے۔" خالق یعنی اہورا مزدا نے اس دین کو محض ایران کے لئے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ دین تمام عالم کے لئے بھیجا گیا ہے تاکہ یہ مذہب کل اقوام میں پھیلے۔ باعتبار روحانیت اس مذہب کا تمام دنیا کے لئے لازمی قرار دیا جانا اس واسطے ضروری ہے کہ اس مذہب میں بہترین فلسفہ پاک ترین خیالات اور سچے کلمات یکجا مجتمع ہیں۔ علاوہ ازیں باعتبار ظاہری اس لئے مفید ہے کہ اسکی بنیاد پاک اخلاقیات پر ہے"

بہرکیف اس کے بعد زرتشت خداوند بزرگ و دانا و خلاق خرد و راستی کو مخاطب کرکے اُس کے مختلف اوصاف کو بیان کرتے ہیں اور پھر ہر صفت کے لئے ایک نام مقرر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مزدا سے عاقبت کے متعلق سوال کرتے ہیں اور مومنین (پیروان زرتشت) کے حقیقی عقاید کے متعلق جو ان کی سعادت و نجات کا باعث ہوگا دریافت کرتے ہیں پھر دروغ پرستوں کے انجام سے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ اور آخری بار مجمع سے مخاطب ہوکر لوگوں کو دیو پرستی سے باز رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

حضرت زرتشت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے متعلق ان کے تصورات و خیالات بہت بلند تھے۔ زرتشت کو خالق مطلق کے متعلق اسقدر معرفت اسوقت ہوئی جب وہ عناصر فطرت کی بے معنی پرستش سے متنفر ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی ادراک اور معرفت کی بنا پر خداوند عالم کے واحد الوجود ہونے کی تبلیغ کی اور یہ معرفت تمام مصلحین و پیغمبران مشرق کی تعلیمات دین سے ملتی جلتی ہے۔ انھیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا اور نیکی و راستی کی کامیابی کا یقین واثق تھا۔ دین زرتشت میں معاد یعنی آخرت کا تصور جسمانی نہ تھا۔ زرتشت کے خیال میں بہشت ایک ایسے مقام کا نام ہے جہاں انسان کو راحت و سعادت ابدی نصیب رہتی ہو اور خلاق عالم

---

[1] یسنا باب ۸ آیت ۷ اور باب ۶۱ آیت ۱۔ "نور ایران قدیم" صفحہ ۱۰۱۔ اور "جمعیتہ التواریخ" مؤلفہ فقیر محمد بن قاضی محمد رضا (کلکتہ ۱۸۳۶ء) صفحہ ۱۱۷۔ [2] یسنا باب ۴۴ آیت ۹۔ [3] یسنا باب ۹ آیت ۲۴۔ [4] یاشت باب ۱۳ سطر ۱۲۳۔ ۱۲۰۔ ۱۰۳۔ ۹۴۔

کے نورِ مقدس سے بالکل قربت رہتی ہے۔

توریت اور اوستا اس خیال میں متحد نظر آتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہودیت و دینِ زرتشتی نے عرصہ تک ایک ساتھ زندگی بسر کی ہے اور دینِ زرتشتی سے ان کے خیالات بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ جانسن و مولٹن وغیرہ جیسے فضلائے مغرب کا خیال ہے کہ عبرانی ادبیات نے اصولِ الہامی کو تعلیمِ زرتشت سے اخذ کیا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پیغمبروں میں زرتشت ہی پہلے وہ پیغمبر تھے جنھوں نے معاد کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار فرمایا۔[1]

اس سلسلہ میں ناظم کی کتاب تاریخ ایران سے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں[2]۔ "زرتشتی خدائے واحد یعنی ہورامزدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرنے کے بعد سزا و جزا اور روزِ حشر پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی گرفتاری سے قبل تک یہودیوں میں معاد یعنی آخرت کے متعلق کوئی خاص خیال و اعتقاد نہ تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ ڈاکٹر برٹن نے اس اعتقاد کی غیر موجودگی کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موسیٰ پیغمبرِ خدا تھے۔ بلکہ ڈاکٹر وہٹلی بھی اسی ثبوت کو اپنے مبحث رسالت جناب موسیٰ میں پیش کرتے ہیں۔ زرتشتیوں کے ساتھ تقریباً نصف صدی زندگی گزارنے کے بعد جب یہود اپنے وطن کو واپس گئے تب انھوں نے بھی اپنے یہاں اس مسئلہ اعتقادِ حشر و نشر کو رواج دیا۔ ایرانیوں نے جنت کا نام بہشت رکھا تھا اور یہودیوں نے بھی بعد واپسی اسی نام کو اختیار کیا جیسا کہ یہ لفظ عہد نامہ جدید میں اکثر جگہ مرقوم ہے[3]۔"

الغرض دیگر الہامی مذاہب اور تعلیمِ زرتشت میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا ہے اور اس پیغمبرِ ایران کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو ناپاک یا غیر الہامی ہو۔ بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل اُصول بھی وہی ہے جو تعلیمات موسیٰ۔ عیسیٰ اور محمد مصطفےٰ کا تھا۔ کسی شخص کو پہچاننے کے لئے بہترین ذریعہ اُس کا قول و فعل ہے۔ اس لئے کتاب گاتھا پر اعتماد کر کے جو اب تک اصلی حالت میں پائی جاتی ہے، ہم زرتشت کے پیغمبرِ برحق ہونے کا یقین کر سکتے ہیں۔

کتاب یشتہا بھی دینِ زرتشتی کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں اُن تغیرات کا حال معلوم ہوتا ہے جو پیشوایان مذہب نے وقتاً فوقتاً اس مذہب کی بیچارگی اور تنزل کے زمانہ میں کئے ہیں۔ مذہبی تعلیم کا ایسے اوقات میں تبدیل ہو جانا کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ اس طرح کے تغیرات اکثر مذاہب میں پیدا ہوئے ہیں۔

---

[1] "روحِ اسلام" مصنفہ سید امیر علی مرحوم صفحہ ۲۲۹۔ [2] صفحات ۶۱-۶۲۔ فٹ نوٹ بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ [3] لوقا ۲۳ آیت ۴۳۔

خورد اوستا کا تقریباً ½ حصہ یشتہا پر مشتمل ہے۔ اور اُس کی زبان و مفہوم دونوں گاتھا سے بالکل متفرق ہیں۔[1] یہ تصنیف یقیناً بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے اور مذہب زرتشتی میں نئی باتوں کا رواج دینا انھیں مصنفین کا کام ہے ہر چند کہ اھورامزدا کا خدا اور زرتشت کا پیغمبر خدا ہونا رکن ایمان رہا لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اُن اوصاف میں جو حضرت زرتشت نے اھورامزدا کے متعلق بیان فرمائے تھے کافی رد و بدل کر دیا۔ خدائے واحد کی پرستش کو فرشتوں کی پرستش سے کچھ اس طرح پر خلط ملط کر دیا گیا کہ خدا کا وجود بالکل نام ہی رہ گیا اور اسی بات نے ڈاکٹر ولسن (مشہور عیسائی مبلغ مقیم بمبئی) وغیرہ جیسے مخالفین دین زرتشتی کو اعتراض والزام کا موقع دیا۔[2]

یشتہا میں پیروان دین زرتشتی کو بعض رسوم و عواید کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بہت بعد کے پیشوایان مذہب کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ پارسی مصنفین کی کثیر تعداد نے یہ امر بخوبی واضح کر دیا ہے کہ "مُغ" درحقیقت اُس مذہب کے پیرو تھے جو ظہور زرتشت کے قبل ایران میں پایا جاتا تھا اور اُن کی ایک خاص جماعت بمقام "میڈیا" مقیم تھی۔[3] جب انھوں نے مذہب زرتشتی قبول کیا تو اپنے زہد و اتقا کی بنا پر مذہبی پیشوا بن بیٹھے۔ رفتہ رفتہ جب ایرانی مشرق سے مغرب کی طرف بڑھے اور ان زاہدوں (مغوں) کو پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہوا تو یہی لفظ "مُغ" جو کچھ عرصہ قبل بت پرستوں کا خطاب تھا زرتشتی دین کے مذہبی پیشواؤں کا لقب ہو گیا[4]۔ اور اس طرح موقعہ پا کر ان لوگوں نے زرتشتی احکام کے پردہ میں قدیم مراسم وعادات تورانی کو اس مذہب میں رائج کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر مولٹن لکھتے ہیں کہ[5] "مراسم کے اضافہ کے ذمہ دار مُغ ہیں۔ جس طرح پر ہندوستان میں آریاؤں کے سیدھے سادے مذہب کو برہمنوں نے پیچیدہ کر دیا اسی طرح مُغوں نے زرتشتی مذہب میں بہت سی فضول باتیں داخل کر دیں۔

مقدس آتش یا آگ کے احترام میں غلو کو راہ دینا اور مردوں کی لاش کو دھوپ میں اسوقت تک کھلا چھوڑ دینا جب تک گدھ گوشت و پوست کھا کر ہڈی کا ڈھانچا چھوڑ دیں، اس مذہب کے مراسم نہیں ہیں بلکہ قدیم تورانیوں سے ماخوذ ہیں اور اب زرتشتی مذہب کے ضروری ولازمی عادات میں داخل ہو گئے ہیں۔ مسٹر زیان لکھتے ہیں کہ[6]:۔ زرتشت کی بلند اور پاکیزہ تعلیم عہد ساسانی میں مُغوں کے ہاتھوں اپنی اصلیت سے علیٰحدہ ہو کر خراب ہو گئی۔ ان لوگوں نے

---

[1] "اشعار ایران قدیم"، "میڈیا"، "تاریخ پارسیان" اور "شرح مذہب زرتشت"۔ [2] "مذہب پارسی" (بمبئی ۱۸۴۳ء)۔ [3] "میڈیا" مصنفہ راگزن۔ [4] عہد اوستا و زرتشت صفحہ ۶۳۔ [5] "خزینۂ مُغ" صفحہ ۱۴۔ [6] دیباچہ "ایران و پارسیان" حصہ اول

زرتشت کی نیک تعلیم کو ضرورتِ وقت اور رفتارِ زمانہ کے مطابق ڈھالنا چاہا اور اس کا نتیجہ بہت بُرا ثابت ہوا۔"

"ڈاکٹر ایڈورڈ ورزی مین" لکھتے ہیں کہ:-[1] "عہد مابعد میں زرتشت کے بتائے ہوئے اصول کو پیشوایان مذہب نے بہت زیادہ پست کر دیا۔ مثلاً ہرمزد جسمانی ہیئت کو آگ قرار دیکر معبدوں میں آگ رکھی جانے لگی اور اس کی بالاعلان پرستش ہونے لگی اسی طرح مندروں کی تعمیر بھی بالکل نئی بات تھی جسے زرتشت نے ممنوع قرار دیا تھا۔"

بہرکیف پارسیوں کے مذہب پر محض اُن کے مراسم مذہبی دیکھ کر حکم لگانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی خامیوں کا وجود ہمیں اُن اقوام وملل میں بھی نظر آئے گا جو موجودہ زمانہ میں اہل کتاب سمجھی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک زرتشتی نماز ادا کرنے کے وقت آفتاب یا آگ کی طرف رُخ کرتا ہے لیکن کیا ایک یہودی عبادت کے وقت قربانگاہ کی طرف اپنی آنکھیں نہیں رکھتا، کیا عیسائی صلیب کے آگے نہیں جھکتے، اور کیا نماز کے وقت مسلمان قبلہ رو ہوکر عبادت نہیں کرتے؟

ایک مجوسی مصنف لکھتا ہے کہ:-[2] "شروع میں جب زرتشتی مذہب کے پیرو ہندوستان آئے تو انھیں مجبوراً بہت سے ہندوؤں کے مراسم اس لئے اختیار کرنے پڑے کہ اُن ریاستوں کے حکمران جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی اُن سے خوش رہیں اور اُن کی محافظت وسرپرستی کریں۔ کچھ عرصہ بعد یہ مراسم جو وقتی طور پر اختیار کئے گئے تھے توہمات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اصل مذہب سے متعلق سمجھے جانے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ہندوانہ مراسم وخصایل پارسیوں میں رائج ہو گئے۔"

اس مذہب پر ایک یہ بھی الزام ہے کہ اس نے حقیقی بھائی بہن کا عقد جایز قرار دیا ہے۔ اس اتہام والزام کے بانی وہ یونانی مصنفین ہیں جنھوں نے تعصب اور نادانی سے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے حقیقت امر یہ ہے کہ قدیم ایرانیوں کے عادات وخصایل سے ان یونانیوں کو مطلق واقفیت نہ تھی اس ناپاک رسم کا ذکر نہ تو اوستا میں ہے اور نہ پارسیوں کی کسی دوسری مقدس کتاب میں۔ پارسی اس رسم کے وجود سے بالکل انکار کرتے ہیں اور وہ حق بجانب ہیں۔

چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت اس مذہب نے بیشک دی تھی اور اسی کو لوگوں نے حقیقی بھائی بہن میں شادی کی رسم سمجھ لیا اور مطعون کیا۔ دائرۃ المعارف دین واخلاق میں لکھا ہے کہ:-[3] "موجودہ پارسی یہ کہتے ہیں کہ اس رسم کی اصلیت یہ ہے کہ حقیقی چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت دی گئی ہے اور بلاشبہ زمانۂ موجودہ میں ایسا ہی پایا جاتا ہے لیکن لفظ غیتوھید اتھا کے معنی یونانی اور لاطینی مصنفین نے غلطی سے حقیقی بھائی بہن

[1] تاریخ فتوحات سارسینس"، (لندن ۱۸۶۶ء) صفحہ ۱۴۔ [2] تاریخ پارسیان جلد دوم صفحات ۲۹-۲۲۸۔ [3] جلد ششم صفحات ۷، ۴۰۵

لے لئے اور غیر پارسی علماء کی ایک کثیر تعداد اس معنی پر متفق ہے۔"

یہ ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں مصر وغیرہ جیسے ملکوں کی اس بیہودہ رسم کا اتباع چند بادشاہوں نے کی ہو اور اس فعل قبیح کی اجازت علماء مذہب سے حاصل کر لی ہو لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مذہب نے ایسی تعلیم دی تھی یا یہ ناپاک رشتہ زرتشتیوں میں شرعاً جایز تھا۔ ہیروڈوس نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے[۱] کہ ایکبار عجمی سلاطین میں سے ایک سلطان نے جس کا نام کیمبیسس تھا مذہبی علماء سے دریافت کیا کہ حقیقی بھائی بہن میں شادی جائز ہے یا نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے اُن کے جواب سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ امر شریعت زرتشت کے مطابق جایز ہو یا اس رسم کا ایران میں کبھی بھی وجود تھا۔

جارج اولنسن اس الزام واتہام کی تکذیب میں لکھتا ہے کہ[۲] "مُغ اور اُن کے ہم مذہبوں پر یہ اتہام تراشنے والا اصل میں ٹیشیانہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا بیان ایسے واقعہ کے متعلق کسی طرح قابل وثوق نہیں ہو سکتا۔"

راگزن یناسے ایک مخصوص باب کا حوالہ دیتے ہوئے اس بحث پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں[۳]:-

"یہ ممکن ہے کہ یہ رسم ایرانیوں میں زمانۂ قدیم سے ہو اور اس نئے مذہب نے وقتی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہو۔"

لیکن ہم بہت جلد یہ امر ثابت کر دیں گے کہ دینِ زرتشت نے کسی وقت بھی کسی وجہ سے اس رسم قبیح کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق عہد اول و دور آخر کے تمام کتب مقدسۂ مذہب زرتشتی سے ہو سکتی ہے[۴]

راگزن لکھتا ہے کہ:-[۵] "یہ ناپاک رشتہ اور دیگر بیہودہ مراسم مصریوں۔ یونانیوں اور رومیوں میں پائے جاتے تھے[۶] ایک یونانی بیوی کو حق حاصل تھا کہ اگر اُس سے کوئی اولاد نہ ہو تو وہ کسی اجنبی سے شوہر کی اجازت لیکر ناجایز تعلق پیدا کرے تاکہ حمل قرار پائے اور اولاد ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی بھائیوں کی شرکت میں محض ایک عورت رہا کرتی تھی

---

[۱] "اوائل دین زرتشت" مصنفہ مولٹن صفحہ ۲۰۷ اور "عہد اوستا و زرتشت" مصنفہ سنجن۔ [۲] "پانچ عظیم الشان سلطنتیں" جلد سوم صفحہ ۱۳۳ [۳] میڈیا باب ۱۲ صفحات ۱۱۱-۱۲۔ [۴] یناسے اس باب کا نہایت ہی صحیح اور نفیس ترجمہ "منتخبات از اوستا و فارسی قدیم" مؤلفہ ڈاکٹر آئی۔ جے۔ اس۔ تاراپوروالا میں موجود ہے۔ تمام غلط فہمیاں لفظی نزاع کی بنا پر ہیں۔ حقیقتاً اس لفظ کے معنی چچیرے بھائی بہن ہیں نہ کہ حقیقی اگر حقیقتاً یہ رشتہ اس مذہب میں جایز ہوتا تو یقیناً مذہبی احکام میں کسی نہ کسی جگہ اسکی بابت اشارہ ضرور ہوتا مگر مذہبی احکام میں مطلقاً ذکر نہیں ہے۔ ناظرین "مذہب زرتشت" مصنفہ آئی۔ جے۔ اس تاراپوروالا (مطبوعہ مدراس) اور "تمدن ایرانیان قدیم" مصنفہ کلیمنٹ ہورٹ کا اس سلسلہ میں ضرور مطالعہ کریں۔ [۵] "میڈیا" صفحہ ۱۱۲۔ [۶] آثار قدیمۂ یونان و روم جلد ۲ صفحات ۳۹-۴۱ تیسرا ایڈیشن۔ [۷] مصر قدیم صفحہ ۱۶۳-۶۴-۲۱۲۔

یونانی اور رومی دیوی اور دیوتاؤں کی ننگی تصاویر اور مجسمے اب بھی نظر آتے ہیں۔ اور یہ امران ممالک کے پستی اخلاق اور تمدن کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔ راولنسن نے لکھا ہے کہ قدیم مصری معاشرت کے قانون کے مطابق جس طرح ایک حقیقی بھائی اپنی حقیقی بہن سے شادی کرسکتا تھا اسی طرح ایک لڑکا اپنی حقیقی ماں سے شادی کرسکتا تھا[1]۔ بلاشبہ ایرانی سلاطین اور ان ممالک میں بہت زیادہ قریبی تعلقات تھے۔ سیرس۔ کمبائسس و دیگر بادشاہان ایران اور ان ملکوں سے برابر جنگ رہی۔ اکثر جنبی ایران میں آکر بس گئے اور ممکن ہے کہ ان تعلقات نے ایرانی تمدن پر بھی اثر کیا ہو۔ ایکبار کیمبائسس نے حقیقی بھائی بہن کے درمیان شادی ہونے کے متعلق استفسار کیا تھا لیکن علمائے مذہب نے کسی ایسے ایرانی یا زرتشتی شریعت کے وجود سے انکار کیا۔ عہد ساسانی میں جب مُلحد مزدک نے اپنی غلط رسالت کا دعویٰ پیش کیا تو اکثر ناپاک و قبیح مراسم کو بھی داخل مذہب کرنا چاہا[2] لیکن جب نوشیرواں تخت ایران پر متمکن ہوا تو ان تمام خرافات کا بالکل قلع قمع کردیا اور دین زرتشتی پھر سلطنت کا مذہب بن گیا۔ لیکن جب ایران کی قومی سلطنت کا زوال ہوا تو کل انتظام ابتر ہوگئے اور عام طبقے میں پھر بداُصولیاں شروع ہوگئیں جب پیروان دین زرتشت ہجرت کرکے ہندوستان آگئے تو انھوں نے اپنے دیگر مخصوص قوانین کے ساتھ ایک قانون شادی بیاہ کے متعلق بھی حکومت برطانیہ کو بنانے پر مجبور کیا۔ یہ قانون "پارسی شادی و طلاق" (۱۸۶۵ء) کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس قانون کی غایت وغرض یہ تھی کہ وہ اس رسم کو اپنے مخصوص مذہب اور طرز تمدن کی مطابقت سے انجام دیں۔ اور ہم کو اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخصوص رسم کے متعلق اُن کے مذہب اور تمدن کے احکام بھی اسی طرح پاکیزہ ہیں جس طرح مسلمانوں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مروج ہیں[3]۔ موجودہ ایرانی زرتشتیوں میں مروجہ رسوم کے متعلق مستند حالات ہمیں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ کے ایک پروفیسر ولیم جیکسن کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ایک عرصہ تک ایرانی زرتشتیوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور ان کے مراسم و عادات کا غائر نگاہ سے مطالعہ فرماکر اپنی ایک تصنیف میں بوضاحت

---

[1] "تاریخ مناکحت انسانی" کے مصنف جلد اول ابواب پنجم و ششم میں اوگسٹائن ہیروڈوٹس۔ بلاڈٹس اور دیگر ماخذ سے نقل کرتے ہیں لیڈین۔ آمتین۔ سائپرین۔ فنیقین۔ ایٹرسکین اقوام میں یہ جائز تھا کہ لڑکیاں قبل مناکحت ناجائز کسب کرکے روپیہ کمائیں۔

[2] "دبستان مذاہب" مصنفہ محسن فانی۔ البیرونی۔ کتاب المعارف اور مروج الذہب وغیرہ — [3] اس قانون کے منظور ہونے کے سلسلہ میں مفصل معلومات تاریخ پارسی جلد ۲ مصنفہ کارکا سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

ذکر فرمایا ہے[51]۔ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب میں کسی جگہ بھی اس ناپاک رشتہ و رسم کے وجود کا ذکر نہیں کیا۔ اگر حقیقی بھائی بہن میں مناکحت کا دستور کسی زمانہ میں بھی ایران میں ہوتا تو یقیناً انھیں اس کا پتہ مل جاتا اور وہ درج کتاب کرتے۔

ہیروڈوٹس کی مذکورہ روایت کے علاوہ ایک مستند کتاب مصنفہ زنفن بھی ہے[52]۔ زنفن نے واقعہ "مراجعت دہ ہزار" کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے[53]۔ زنفن نے اپنی تصنیف میں کسی مقام پر بھی ایران کے امراء۔ رؤسا، سلاطین یا طبقۂ عام میں اس قسم کی رسم قبیح کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے کہ ملک ایران دوسرے ممالک کے برخلاف نہ محض قوانین بنا کر جرائم کا انسداد کرتا ہے بلکہ لوگوں کے اخلاق و آداب کو بھی سدھارتا ہے۔ اس ملک میں بچوں کو شروع ہی سے سخت دشوار قوانین و احکام کے ذریعہ پاکیزگی اور مذہب کا پابند بنا دیا جاتا ہے[54]۔

بلاشبہ زرتشتی مذہب کے ادبیات میں لفظ خیتوھیدا تھا مرقوم ہے لیکن اس لفظ کے معنی "رشتہ داروں کے درمیان شادی" ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی بتانے کے لئے ہم ایک معروف پارسی مصنف ڈراجی کارکا کی عبارت نقل کرتے ہیں[55]:— "اس کے اصلی معنی خود کو تفویض کر دینا ہے۔ اس آخری معنی کے اعتبار سے مذہب یا خدا کے کاموں میں خود کو لگا دینا یا حوالہ کر دینا ہے۔ اوستا میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں کیا گیا ہے۔"

اس مسئلہ پر ایک مفصل بحث "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی برانچ" ۱۸۸۸ء میں کی گئی ہے۔ اس مجلہ میں ایک فاضل "داراب دستور پشیوتن سنجانا" نے جو مذہباً زرتشتی ہیں "قدیم ایران میں حقیقی بھائی بہن میں شادی کا اتہام" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

اب ہم دوسرے مسئلہ پر بحث کریں گے یعنی مردوں کی لاش کو دھوپ میں گدھ کے آگے رکھ دینا۔ سو اس رسم کا پتہ ہمیں پیدائش زرتشت سے قبل کے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ رسم اصلاح و تعلیم زرتشت سے قبل مشرق میں جاری تھی جیسا کہ خود ایک پارسی مصنف مسٹر ای۔ اس مسانی اقرار کرتے ہیں[56]۔

ہیروڈوٹس[57] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اس رسم سے پرہیز کرتے تھے اور بجائے اس کے کہ مردہ کو

---

[51] "ایران گزشتہ و امروزہ" مصنفہ پروفیسر جیکسن — [52] "تعلیم سیروس" ملاحظہ ہو — [53] ۴۰۱ سال قبل مسیح — [54] "زینوفون" مصنفہ الکزنڈر گرانٹ صفحہ ۱۲۸ — [55] تاریخ پارسیان جلد دوم صفحہ ۱۶۳ اور "زرتشتی خواتین کا مرتبہ عہد قدیم میں" مصنفہ پشوتن سنجن صفحات ۴۹-۴۸ — [56] "مذہب زرتشتی" صفحہ ۲۸۴ ملاحظہ فرمائیے — [57] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۱۴ صفحہ ۸۲۳ —

زیر آسمان چھوڑ دیں اُسے دفن کیا کرتے تھے۔ اس رسم کا وجود محض پیشوایان مذہب میں تھا اور یہ اُن کی اجتہاد کی بنا پر تھا۔ عموماً ایرانی (پارسی) لاش کو موم سے ڈھاک دیتے تھے۔ عہد اخمنی تک طبقۂ مغ یا پیشوایان مذہب نے اسقدر اقتدار نہیں حاصل کیا تھا کہ عام لوگوں کو اپنی تقلید پر مجبور کرتے۔ سیرس اور دیروس[۱] وغیرہ سلاطین کے قبور و مقابر کی موجودگی اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاندان اخمنی کے زوال کے بعد دین زرتشت بھی تنزل کا شکار ہوا اور عہد ساسانی میں ان پیشوایان مذہب کا اقتدار بھی بہت زیادہ بڑھ گیا[۲]۔ چنانچہ مُغوں نے دیگر بدعات کے ساتھ اس رسم (مردہ کو زیر آسمان کھلا چھوڑ دینا) کی پابندی بھی عام پیروان زرتشت پر لازمی قرار دیدی۔

مغربی محققین اس رسم کو میڈیا کے رہنے والوں میں ظہور زرتشت سے بہت قبل رائج بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ[۳] "مُغ عناصر فطرت کو مقدس سمجھتے تھے لہٰذا اُن کے خیال میں زمین کو پاک رکھنا ضروری تھا" پس اسی خیال کی ماتحت اس رسم کا رواج بزور عام کیا گیا۔

مارخم[۴] کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ساسانی خاندان کے آخری تاجدار یزدگرد کی لاش اُس کے مرنے کے بعد التحنر رائی گئی اور وہیں اپنے بزرگوں کے مقبرے میں سپرد خاک کی گئی[۵]۔ علاوہ ازیں داریوش کے متعلق بھی ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ جب وہ جنگ میں مارا گیا تو اس کی لاش ایران بھیجدی گئی یہاں وہ اپنے آبا و اجداد کے ساتھ شاہی مقبرہ میں مدفون ہوا[۶]۔

اس سے لازماً ہم اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ یہ رسم عہد آخر کے اوستا میں اس مرقوم عقیدہ کے باعث وجود میں آئی کہ زمین کو ناپاک نہ کرنا چاہئے۔ زمانۂ حال کے اکثر پارسی اس رسم کو بنظر اکراہ دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اس رسم سے مخصوص پرخاش کی اسلئے ضرورت نہیں کہ جہاں تک اصل تعلیم مذہب کا تعلق ہے اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ اکثر عیسائی مردوں کے دفن کرنے کے خلاف ہیں اور جلانے کی رسم کو روز بروز ترقی دے رہے ہیں حقیقت امر یہ ہے کہ اعتقادات یا کسی مذہب کی تعلیم سے رسوم و عادات کا کوئی تعلق نہیں اور مراسم کا اختلاف زیادہ قابل اعتنا نہیں۔

اس بحث کے اختتام پر ڈاکٹر مونیر ولیم کے خیالات (مرقومہ کتاب ہندوستان جدید صفحہ ۲ ۸۶ مطبوعہ ۱۸۸۶ء لندن)

---

[۱] زینوفون لکھتا ہے کہ خود سیرس نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ اُس کی لاش مرنے کے بعد دفن کیجائے [۲] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۱۴ صفحہ ۹۲۳ "خزینۂ مُغ" مصنفہ مولٹن صفحہ ۱۲ [۳] شرح مذہب زرتشت صفحہ ۶۹ [۴] تاریخ ایران صفحہ ۴۹ [۵] ایضاً ۶۶۵ [۶] شرح مذہب زردشت صفحہ ۶۹

نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔۔۔ "میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ جس طرح اہل یورپ پارسیوں کی رسم کو بُرا سمجھتے ہیں اسی طرح پارسی اپنے نقطۂ نگاہ سے یورپ کی مروجہ رسم دفن کو یقیناً قابل مذمت سمجھتے ہوں۔ جب اپنے مردوں کو زیر زمین مدفون کرتے ہیں تو اس خیال سے کہ صدہا کیڑے اُن جسموں پر حملہ آور ہوں کے با خوف نہیں کھاتے کیونکہ ہماری نظروں سے یہ واقعہ پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح پارسی بھی اپنے مردوں پر گدھوں کو حملہ کرتے نہیں دیکھتے اور نہ اُن کی موجودہ شریعت دیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور اُن کا یہ سوال حق بجانب ہوگا کہ حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے کون قاعدہ زیادہ بہتر اور انسب ہے؟"

بہت ممکن ہے کہ اس رسم کو طبقۂ مُغ نے کسی دوسرے خیال سے بھی رواج دیا ہو۔ ان لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ مصری اپنے مُردے مستحکم اہرام (جو اب تک موجود ہیں) میں رکھتے اور ہندی اپنے مردے جلا دیتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں قومیں بُت پرست و مشرک تھیں پس انھوں نے مشرکوں کی رسم سے اپنے رسوم کو مختلف کر دینے اور مطابقت نہ رکھنے کے خیال سے قدیم تورانی رسم پر عمل کرنا شروع کر دیا ہو۔ اس رسم کی تفصیل کے لئے رسالہ تھیسوفیسٹ ماہ اگست و ستمبر ۱۹۱۲ء (مضمون شمس العلماء جمشید جی مودی) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

المختصر وہ مضامین اور مسائل جو اُن میں خلاف عقل اور قابل اعتراض نظر آتے ہیں اُنھیں خود پارسی بھی بُرا اور بیکار خیال کرتے ہیں اور اس لئے ان کو سامنے رکھ کر ہمیں یا کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔

مترجم سید وجاہت حسین ام، اے — پروفیسر طاہر رضوی ام، اے

دیر و حرم کے قصے

جہاں آرا اور چھتر سال

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی سب سے بڑی اور نہایت چہیتی بیٹی تھی۔ دارا شکوہ (ولی عہد) بھی سب بہنوں میں اس کو زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ بڑی صائب الرائے اور روشن خیال شہزادی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتی تھی۔ اُس کی نگاہ میں سلطنت تیموریہ کے بقا و عروج کا راز اور متحدہ ہند کی قسمت کا فیصلہ اکبر کے روادارانہ مسلک میں نہاں تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ خاندان تیموریہ کا چراغ اگر کوئی روشن رکھ سکتا ہے یعنی اگر اکبر کا نام لیوا کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف دارا شکوہ ہے۔ دارا شکوہ کی جانب داری کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سیاسی مصلحت کی بنا پر اکبر نے شاہی خاندان کی بیٹیوں کو کسی کی زوجیت میں دینا ممنوع قرار دیا تھا۔ اس لئے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں بالعموم ناکتخدا رکھی جاتی تھیں لیکن شاہی احکام تقاضائے فطرت کو تو مٹا نہیں سکتے، شہزادیاں لاکھ شہزادیاں ہوں پھر بھی انسان ہوتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم کا دل محبت کی چوٹ کھائے ہوئے تھا وہ اپنے محبوب سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن بادشاہ کی اجازت ملنی غیر ممکن تھی۔ ایک دفعہ دارا شکوہ نے جہاں آرا کی شادی نجابت خاں کے ساتھ کرنے کی تجویز شاہجہاں کے روبرو پیش کی تھی لیکن بادشاہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ دارا شکوہ کا خیال اس معاملہ میں مختلف تھا۔ گو جہاں آرا کو اپنے محبوب سے شادی کرنے میں دشواریاں نظر آتی تھیں تاہم اُسے یقین تھا کہ جب دارا شکوہ تخت و تاج کا مالک ہوگا وہ کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اُسے رضامند کر لے گی اس لئے جہاں آرا اور بھی دارا شکوہ کی معین و مددگار تھی۔ سلطنت کے اہم مسائل میں بادشاہ اکثر اُس سے مشورہ کرتا اور ولی عہد اُس کی بات پر ہمیشہ کان دھرتا تھا۔ اُسے اپنے مرتبہ کی عظمت اور اُس کی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ زندگی کی آئندہ صورتوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کو تیار ہو رہی تھی اُس کی اُمیدیں اور آرزوئیں سہری بھری تھیں۔ طبیعت کی اُمنگیں اور ارمان خوش خوش نکلنے کے لئے بیچین تھے گر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مقدر سے کسی کا بس نہیں چلتا۔

پادشاہ کی علالت کی خبر پھیلتے ہی ہوا کچھ ایسی بدلی کہ ملک میں طوفان برپا ہو گیا۔ بھائی بھائی اور باپ بیٹے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔ شجاع، مراد اور اورنگ زیب ہر ایک "تخت یا تابوت" کا نعرہ بلند کئے ہوئے دارالسلطنت پر یلغار کر رہا تھا۔ اورنگ زیب کا وار چل گیا۔ باپ کو قید کر کے بیٹے نے تخت و تاج پر قبضہ کیا۔ داراشکوہ کچھ عرصہ سرگرداں و پریشاں مارا مارا پھرا کیا بالآخر قید اور قتل ہوا۔ انقلاب زمانہ نے جہاں داراشکوہ کو مٹایا جہاں آرا کو بھی زندہ درگور کیا۔ باپ کے ساتھ بیٹی بھی قید ہوئی۔ اُسے قید ہونے کا اتنا غم نہ تھا جتنا زندگی کے ارمانوں اور اُمنگوں کی اُس دنیا کا یک لخت مٹ جانا جو اُس نے اپنے دماغ میں بسائی تھی۔ جس جنگ میں اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دیکر دارالسلطنت پر قبضہ کیا اُسی جنگ میں جہاں آرا کا محبوب بھی اپنی دلیری اور جانبازی کا کرشمہ دکھا کر کام آیا۔

جہاں آرا کو جب یہ خبر ملی تو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ درد دل راز سربستہ تھا اس لئے اُف کرنے کی بھی گنجایش نہ تھی۔ خون کے آنسو روتی لیکن چُپ رہتی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کا سر قلم کر کے باپ اور بہن کو تحفہ میں بھیجا۔ دیکھتے ہی زمین پاؤں کے تلے سے نکل گئی۔ کلیجہ پھٹنے لگا۔ زندگی کا آخری سہارا بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ جہاں آرا اب قیدخانہ میں بے یار و مددگار زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ مایوسی کے عالم میں پڑے پڑے ایک دن سوچنے لگی کہ آخر یہ ہیجان غم و اندوہ کب تک! دل کے بہلانے کی کچھ سبیل تو ہونی چاہئے۔ رفتہ رفتہ اس خیال نے ارادے کی صورت اختیار کی۔ دن تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں کاٹ دیتی لیکن شام ہوتے ہی جب شمع و پروانے کے سوز و گداز کا تماشہ آنکھوں کے سامنے ہوتا تو یہ بھی قلم ہاتھ میں لے کر اپنے درد محبت کے پُرلطف تصور کا نقش کھینچنے لگتی اور اس طرح طبیعت بہلاتی۔ جوں جوں طبیعت لگتی گئی محبت کی یاد نے خواب و خیال کی باتوں سے تجاوز کر کے داستان زندگی کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے اوراق پریشاں جہاں آرا کی قید حیات سے رہائی کے بعد بھی زمین کے کسی کونے میں پڑے رہے۔ صدیوں بعد جستجو کرنے والی نگاہوں نے ان اوراق پریشاں کو قعر گمنامی سے نکالا اور داستان کو مرتب کیا۔ یہاں سے نکل کر یہ بیش بہا خزانہ یعنی فارسی کا قلمی نسخہ جس پر ذیقعدہ ۱۰۶۹ ہجری کی تاریخ درج تھی پیرس یا لندن کے عجائب خانہ میں عرصہ تک محفوظ رہا۔

چند سال کی بات ہے کہ آندریہ بتوشوں* نامے ایک فرانسیسی خاتون مشرق کی سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئی۔ اسلامی دور کی عظمت کی یادگاریں آگرہ۔ فتحپور سیکری۔ اور دہلی میں دیکھتی ہوئی حضرت نظام الدین شاہ اولیا کی درگاہ پر پہونچی۔ کسی نے ایک قبر کی لوح کے پتھر کی طرف اشارہ کر کے دکھایا۔ اس پر شہزادی جہاں آرا بیگم کا نام

*The Life of a Moghul Princess by Andrea Butenschön (Routledge)

کندہ تھا۔ قبر کس مپرسی کی حالت میں زبان حال سے گویا تھی ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گُلے | نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ خاتون ابھی ابھی شاہجہاں اور ممتاز بیگم کا مزار تاج محل میں دیکھ کر آئی تھی۔ بیٹی کے مزار کی یہ کس مپرسی کی کیفیت دیکھکر حیران رہ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس معمہ نے دلچسپی پیدا کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہوئی۔ حسن اتفاق سے جہاں آرا کی سرگزشت کا قلمی نسخہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ فارسی سے غالباً فرانسیسی میں اور اب انگریزی زبان میں یہ نسخہ کتاب کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ تاریخ کی تاریخ ہے اور فسانہ کا فسانہ۔ تاریخ کی تحقیق اور چھان بین کا نہ دماغ ہے نہ یہ موقع، البتہ جہاں آرا کی ناکام محبت اور دردِ دل کا مرقع جو خود اُس کے قلم کا کھینچا ہوا ہے اخذ کرکے اُردو کے رنگ و لباس میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض چوٹ کھائے ہوئے دل اسکی قدر کریں۔ جہاں آرا اپنی بپتی یوں شروع کرتی ہے :-

انگوری باغ میں سرِ شام چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہرسنگھار پھول رہا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اُن کی مہک سے دماغ کو معطر کر رہے ہیں بجز آبشاروں کے زمزمہ کے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے اس عالم سکون میں دُلارے کی بانسری کے بول میری طبیعت کو اسی طرح بیکل کر دیتے ہیں جس طرح بندرابن کی کنجوں میں کنھیا کی بانسری رادھا کے من کو موہ لیا کرتی تھی۔ یہ عنفوان شباب کے نشہ کا سرور تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ اب تو دُلارے کے نقشہ کے خد و خال کا دھیان بھی یاد سے محو ہو گیا۔ مجھے اُس کی شکل بھی اچھی طرح یاد نہیں۔ لیکن پیار اور محبت کے راگ کو جس نے اور دُھن میں اُسنے چھیڑا تھا وہ من میں کچھ ایسی بس گئی کہ اُس کا سوز و گداز زندگی کا سودا ہو کر سر میں سمایا۔ وہی انگوری باغ ہے وہی سبزہ اور چمن لیکن پھولوں کی مہک اب طبیعت میں وہ مستی اور خروش پیدا نہیں کرتی۔ چاندنی اب بھی کھلی ہوئی ہے لیکن اس میں اب وہ نکھار نہیں۔ آبشاروں کا زمزمہ کانوں پر بار معلوم ہوتا ہے۔ دُلارے کی بانسری کے بولوں کی یاد بھی اب طبیعت میں گُدگُدی پیدا نہیں کرتی۔ شباب کے ساتھ شباب کی رنگ رلیاں بھی گئیں۔ ارمان اور اُمنگوں کے مٹنے کے بعد صرف حسرتیں رہگئیں۔ زندگی کی کایا پلٹ ہو چکی۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر یہ ماجرا کیا ہے کہ شباب میں محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل آج بھی دُکھتا ہے۔ اس زخم کو تو مدتیں ہوئیں کہ مندمل ہو جانا چاہئے تھا یہ بھی کوئی بات ہے کہ عمریں گزریں کہ ساقی کے ہاتھ سے جام لے کر صرف ہونٹوں سے لگانے کی گنہگار ہوئی تھی اور محبت کا نشہ ہے کہ آج تک نہیں اُترتا ہے اُس کا سرور مجھے آج بھی ایسا ہی مست اور دیوانہ کئے ہوئے ہے کہ جیسے روزِ اول عہد شباب کو گزرے جُگ ہوگئے لیکن کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں نے اپنے محبوب کو پہلے پہل دیکھا تھا۔

شہنشاہ دیوان عام میں دربار کر رہے تھے۔ راجہ اور مہاراجہ پنج ہزاری اور ہفت ہزاری سردار مجرا عرض کرنے کے بعد صف باندھے دست بستہ کھڑے تھے۔ میں محل کے جھروکے کی جالی سے کھڑی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی کہ راؤ راجہ نرالے بانکپن کی ادا کے ساتھ شاہی تخت کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا دکھائی دیا۔ اُس نے مودبانہ قدمبوسی کی اُس پر نظر پڑتے ہی مجھ پر سناٹا سا چھا گیا۔ میں نے نل کی تصویر دیکھی تھی۔ اس جوان رعنا کو دیکھتے ہی مجھے اُس کا شبہ ہوا۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کا سرور تھا۔ ہمارا ابتائی تھی کہ راجپوت سورمیرے سامنے نگاہیں بھی چار نہیں ہوئیں تھیں کہ اُس کا جادو مجھ پر چل گیا میں اُس کی زرخرید بونڈی تھی اور وہ میرے دل و جان کا مالک۔ وہ دن ہے اور آج میں نے پھر کسی اور پر وہ نگاہیں نہیں ڈالیں مجھے حیرت تھی کہ بڑے بڑے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دمینتی نے نل کے گلے میں کیوں جے مال ڈالا تھا۔ اُس لمحہ میں نے محسوس کیا اور آج بھی اُسے بھولی نہیں ہوں کہ اس میں کیا رازِ پنہاں تھا۔ سنتی ہوں کہ میرے بھائی اورنگ زیب نے شاہی حکم صادر کیا ہے کہ گانا بجانا حرام ہے اور ارباب نشاط نے اپنے ساز و سامان کو تجہیز و تکفین کے ساتھ دفن بھی کر دیا ہے لیکن سوز محبت کا وہ راگ جس کے لئے میں زندگی بھر بیچین رہی اور اُس کی وہ دُھن اور سُرے جو میرے من میں سمائی ہے بغیر اپنا سماں باندھے نہیں رہ سکتے۔ یہ سوز و ساز شاہی حکم کا پابند نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے راکھی بند بھائی کا روزانہ انتظار کیا کرتی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا وہ آئیگا اور مجھ سے ملیگا۔ جو راکھی میں نے اُسکے ہاتھ میں باندھی تھی وہ اُس کی قدر کرتا تھا اُس نے میرا ساتھ دینے اور حفاظت کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ایک دن جب سورج ڈوب چکا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکنے لگے تھے سرِشام وہ آیا۔ اُسے آتے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا میں ثمن برج میں سنگ مرمر کی جالی سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اُس نے سلام کیا میں جواب دیکر بیٹھ گئی اور سر سے پاؤں تک اُس پر ایک نظر ڈالی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میرے سامنے کوئی فرشتہ کھڑا ہے۔ بات کرنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کہوں ایک لمحہ کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔

آپ تشریف لائیے۔ بڑی تکلیف کی۔

راؤ راجا۔ (مسکراتے ہوئے)۔ شہزادی آپ یہ کیا فرماتی ہیں۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ ہمیں یاد ہے کہ شہنشاہ نے بڑے گاڑھے وقت میں ہماری مدد کی تھی اور ہم کو تباہی سے بچایا تھا۔ ہر راجپوت کے دل پر آپکے والد ماجد کی اطاعت و وفا کا نقش جما ہوا ہے جب تک ان ہاتھوں میں تلوار کا قبضہ پکڑنے کی سکت ہے یہ ہمیشہ آپ کے ننگ و ناموس کے لئے بے نیام رہے گی۔

میں۔ اور خود آپ کا ننگ و ناموس؟

راؤ راجا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور افسردہ لہجہ میں اُس نے کہا۔ سرزمین ہند زیرِ عتاب ہے۔ ہم نے خود اُسے اپنے ہاتھوں غارت کیا ہے۔ بھلا ہو ان برہمنوں اور چھتریوں کا جو اُس کے ننگ و ناموس مٹانے کا باعث ہوئے۔ شہزادی! آپ کی رگوں میں تو خود راجستھان کا خون دوڑتا ہے۔ آپ کو تو میواڑ کے سامرسی کا قصہ یاد ہوگا جب وہ دلّی اور اجمیر کے مہاراجہ اور ہند کی راجدھانی کی سلامتی کے لئے محمود غوری کے خلاف جنگ آزما ہوا تھا۔ آدھی رات بعد پلنگ پر پڑے پڑے اُسے ایک نورانی صورت دکھائی دی اور کسی نے اُس کے کان میں کہا کہ "تیرے بعد ہندوستان ہاتھ سے نکل جائے گا" کئی سو برس ہوگئے کہ دلّی کی راجدھانی مٹ گئی اور ہند کے عروج کا آفتاب اس لئے غروب ہوگیا کہ ہم راجپوت جو اُس کے ننگ و ناموس کے محافظ تھے خود آپس میں اُس کے تخت و تاج کے لئے لڑنے لگے۔

میں۔ راجپوتوں میں لڑائی تو قنوج کی راجکماری سنجوگتا کے لئے ہوئی تھی۔ راؤ راجا تمھیں یاد ہے کہ جب پرتھوی راج رن پر جا رہا تھا تو راجکماری نے اُس سے کہا تھا کہ چھتری کے لئے رن میں جان دینا امر ہونے کے برابر ہے اور جب وہ خود ستی ہوئی تو اُس کی زبان پر یہ لفظ تھے کہ۔ "یہاں نہیں میں پرلوک میں اپنے سوامی سے ملوں گی" کیا تمھارا بھی عقیدہ ہے کہ جو اس دنیا میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے چین رہتے ہیں لیکن زندگی میں ان کو یہ خوشی حاصل نہیں ہوتی اُنھیں موت ملا دیتی ہے؟

میں نے اپنے سوزِ محبت کے اُس راز کو جو ایک عرصہ سے میری طبیعت کو بے چین کئے ہوئے تھا اس سوال کے چند لفظوں کی تہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے سوال ڈرتے ڈرتے کیا تھا اور جواب سننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ میرے افسردہ دل کی کلی کھل گئی۔ اُس نے جواب میں کہا۔

شہزادی۔ چتا کی بھڑکتی ہوئی آگ انسان کی روح کو پاکیزگی نہیں بخشتی۔ نہ اس سے شانتی حاصل ہوتی ہے جس طرح گیان انسان کو سنسار کے مایا موہ سے چھٹکارا دلا کر نردان کی خوشی میسر کرتا ہے اسی طرح سے بھگتی دو قالبوں کو ایک جان بنا دیتی ہے۔ اس میں دُنیا اور عقبیٰ کی تخصیص نہیں۔

ان لفظوں نے میرے مجروح دل پر مرہم کا کام کیا۔ میں جالی سے اور قریب تر ہوگئی گویا کہ صرف یہی ایک پردہ مجھ میں اور میری خوشی میں حائل تھا۔ کاش میں اسے ہٹا دیتی۔ خوشی سے میرا بُرا حال تھا۔ لیکن اس کے چھپانے کے لئے میں نہ معلوم کیا کیا فقرے سوچ رہی تھی۔ مقدر کا لکھا کسی نے مٹایا نہیں۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے

دیوان عام میں فانوس روشن تھے لیکن گانے کی آواز اب سُنائی نہ دیتی تھی صرف آبشاروں کا زمزمہ باقی تھا اسکے سوا ہرطرف خاموشی طاری تھی اور ہم دونوں آہستہ آہستہ باتوں میں مشغول تھے میں آیندہ کی دقتوں کا ذکر کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ راؤ راجا سے پیمان وفا مکرر استوار کراؤں۔

راؤ راجا۔ "ایک زمانہ ہوا کہ ہندوستان کا شہنشاہ اکبر تھا۔ اس کی سلطنت ہمالہ سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسکا ہمعصر رانا پرتاپ تھا گو اُس کا راج بہت محدود تھا لیکن وہ میواڑ کے سامرسی کے تخت پر بیٹھا تھا پرتاب کا عقیدہ تھا کہ اپنے ترکہ اور ورثہ کو ہاتھ سے گنوانا سامرسی کے ننگ و ناموس کو برباد کرنا ہے"

جونہی راجا نے یہ داستان پارینہ چھیڑی مجھے اپنا بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا جب شام کے وقت محل میں میری انا مجھے میواڑ، بوندی اور امیر کے دلآویز افسانے سنایا کرتی تھی۔ میں نے راؤ راجا کا قطع کلام کیا اور بے تابی سے بول اُٹھی۔

اکبر کا دادا بابر تھا جس نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ پرتاپ رانا سانگا کا پوتا تھا جو بابر کا سب سے بڑا غنیم تھا جب بابر شکست کھا کر فرغانہ سے لوٹا تو ایک چھوٹی سی فوج سے اُس نے ابراہیم لودھی کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کیا اور اسی جرار فوج سے تمام راجستھان کے راجاؤں کا مقابلہ کیا۔ راجا تمھیں وہ روایت یاد ہے کہ ایک دن بابر کو سنگین خطرے کا مقابلہ تھا تو اُس نے اپنے ہوش سنبھالے۔ شراب سے توبہ کی اور سونے چاندی کے صراحی و ساغر سبھوں پر لات مارکر شراب لونڈھا دی۔ اُس کے تین سو سرداروں نے بھی اُسی کی تقلید کی اور تمام فوج جو مایوس ہو رہی تھی پھر تازہ دم ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتی ہوئی فتح یا موت کے لئے تیار ہوگئی۔ رانا سانگا کی فوج کثیر تھی لیکن چونکہ وہ غافل تھا اسی لئے بابر کو فتح اور سانگا کو شکست ہوئی۔ سانگا بے پروا اور غافل کیوں رہا؟۔

یہ سنکر راؤ راجا کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اپنی نظریں میری طرف گاڑ کر بولا:۔

ہم ہندو اسے مقدر کو اس حد تک کھورنے کا موقع دیتے ہیں کہ وہ بالآخر ہمیں اندھا کر دیتا ہے۔ شاید یہ غیبی آواز آخری مرتبہ چتوڑ میں اُسوقت سُنائی دی تھی جب میواڑ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اُس نے رانا سانگا سے کہا کہ اُسی کے قبیلے سے کوئی غدار اُس کے ننگ و ناموس پر دھبا لگائیگا۔ رانا سانگا بڑا پرتابی راجا تھا۔ اُس نے نہ معلوم کتنے رن سر کئے تھے۔ اُس کے جسم پر اسّی زخموں کے نشان تھے۔ وہ اپنی ایک آنکھ اور ایک بازو بھی تلوار کی نذر کر چکا تھا۔ میدان جنگ کے محشر کے خوف نے اُس کو کبھی آگے بڑھنے سے باز نہیں رکھا مگر مقدر کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا تھا۔

[redacted]

میں۔" توبہ، توبہ، راجپوت پر بزدلی کا الزام کون لگا سکتا ہے۔ مگر ہاں ہم تو اکبر اور پرتاپ کا ذکر کر رہے تھے۔ راؤ راجا۔ راجستھان کے تمام راجا ایک ایک کر کے اکبر کی اطاعت قبول کر چکے تھے اور سلطنت کے رُکن سمجھے جاتے تھے۔ ان میں صرف رانا پرتاپ اکیلا ایسا تھا جس نے اپنی گردن اکبر کے سامنے نہیں جھکائی۔ چوتھائی صدی تک جنگ و جدل کا محشر برپا رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ صرف ارادلی کی گھاٹیاں اور غار رانا پرتاپ کے لئے قلعوں کا کام دیتے تھے اور جنگل اُس کے محل تھے سونے چاندی کے تھالوں کی جگہ پتوں پر وہ کھانا کھاتا تھا اور مخمل کے گدوں اور قالینوں کی جگہ چٹائی اور گھاس پر سوتا تھا اور یہ سب اس لئے کہ اُس نے بیڑا اُٹھایا تھا کہ وہ باپا راول کی راجدھانی چتوڑ کو اکبر کے چنگل سے نکالکر آزاد کرے گا۔ ایک دن شاہی دربار میں یہ خبر آئی کہ رانا پرتاپ کے اہل و اطفال بھوکوں مر رہے ہیں اور چونکہ یہ نظارہ اُس سے دیکھا نہیں جاتا وہ اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ دربار مغلیہ کے اُن تمام راجپوت راجاؤں کے چہرے جو سلطنت کے رُکن اور ستون سمجھے جاتے تھے اس خبرِ وحشت اثر کو سنتے ہی فق پڑ گئے کیونکہ ان کو رانا پرتاپ کی ذات پر ناز تھا لیکن یہ خبر غلط نکلی۔ رانا پرتاپ آزاد جیا اور آزاد ہی مرا۔ البتہ چتوڑ واپس لینے کی حسرت اُس کے دل میں رہ گئی اور اُس کے ساتھ گئی۔ بالآخر غنیم کی یورش سے مجبور ہو کر اُس کے لڑکے نے ہار مانی اور شہزادہ خرم کے علم فتح و نصرت کے آگے میواڑ کے ارغوانی جھنڈے کو نیچا ہونا پڑا لیکن پھر بھی رانا پرتاپ کا لڑکا وہ دن دیکھنے کے لئے نہ جیا کہ اُس کا شمار بھی اراکین سلطنت مغلیہ میں ہوتا۔

راجا کی آنکھوں کی چمک اب مدہم پڑ گئی تھی۔ اُس کی آواز میں کیفیت سوز و درد تھی ایک لمحہ بعد اس نے کہا:۔

"شہزادی۔ رانی پدمنی کے محل کے اُجڑے ہوئے باغ میں آج بھی کوئلیں کوکتی ہیں۔ ان کھنڈروں میں اب بھی طوطے اور مینا چہکتے ہیں اور برسات میں مور اپنے پنکھ پھیلائے خوشی خوشی ناچتے ہیں میواڑ کی عورتیں رام اور کرشن۔ مہادیو اور گوری کے مندروں میں آج بھی پھول چڑھانے جاتی ہیں۔ رانا کُمبھ کے فتح و نصرت کا ستون ابتک آسمان سے باتیں کرتا ہے گویا اسکو چتوڑ کی تباہی کا کچھ بھی حال معلوم نہیں۔ اس کے تلے راجستھان کے بھاٹ آج تک پتا اور جے مل کے گن گاتے اور پتا کی نئی نویلی دلھن کی دلیری اور جانبازی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ وہ شیر دل دلھن تھی جو ہاتھ میں تلوار لئے فوج کی سرداری کرنے نکلی تھی اور رن میں سب سے پہلے کام آئی۔ راجپوتوں کے ننگ و ناموس کا یہ کرشمہ تھا کہ عورتیں بھی غنیم کے ہاتھوں میں پڑنا نہ چاہتی تھیں۔ رانی پدمنی کے ساتھ سیکڑوں عورتیں چتا پر چڑھ کر ستی ہوگئیں۔ قانون قدرت ہے کہ دنیا میں ہر چیز جو پھلتی پھولتی اور جیتی جاگتی ہے وہ ایک ایک

دان ضائع بھی ضرور ہوتی اور مرجاتی ہے لیکن صرف یوگی اور رشی جنگل اور کھوہ میں سادھ لگائے بیٹھا دھیان اور گیان میں مست رہتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے اس دنیا کے مزخرفات اور مکروہات کا پردہ اُٹھ جاتا ہے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ دنیا کی وہ سب باتیں جنکے لئے ہم جیتے ہیں ہر طرح کے دُکھ سہتے ہیں بلکہ جان بھی دیدیتے ہیں مایا اور متھیا ہیں۔ اُس کی آنکھوں کو نور ازل نے اس طرح سے روشن کر دیا ہے کہ اب اسکو سوائے اس کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خواہشات اور نفسانیت پر قابو پاکر صرف اپنے جلوۂ روحانیت کے زور سے کائنات قدرت کو اپنا مطیع رکھتا ہے اور سب پر حکومت کرتا ہے۔ وہی ہمارا مالک اور بادشاہ ہے۔ اکبر نے اس اصلیت کو سمجھ لیا تھا۔ اپنے فتوحات کے دوران میں گو اُس نے بعض مندروں کو ڈھاکر مسجدیں بنائیں لیکن بالآخر اُس نے اپنی عبادت گاہ چرخ نیلگوں کے زیر سایہ ہی قائم کی اور ہرکس و ناکس کو مذہب کی آزادی دی۔ گو اُس نے ہم راجپوتوں کو تلوار کے زور سے فتح کیا لیکن ہمارے دلوں پر اپنی حکومت انسانیت اور فراخدلی سے جمائی۔ اُس نے اپنے دربار میں ہندو کو بھی وہی فضیلت اور مرتبہ دیا جو مسلمان کو۔ گو رانا پرتاپ کے دم توڑنے کے ساتھ ہی ساتھ راجپوتوں کی رہی سہی آزادی بھی مٹ گئی لیکن اکبر کے زیر سایہ انھوں نے متحدہ ہند کی عظمت کا خواب دیکھا اور اس معیار کو پیش نظر رکھنا سیکھا۔ ہم نے اگر اپنا پرانا ورثہ اور ترکہ کھویا تو ایک نئی ملکیت اور دولت بھی معاوضہ میں پائی۔ اور یقین جانئے کہ جب تک خاندان تیموریہ میں اکبر کے نام لیوا موجود ہیں اور اُس اُلوالعزم ہستی کے نقش قدم اور مسلک سے آپ کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے ہم راجپوتوں کا جان و مال آپ پر سے نثار ہے۔ راجپوت صرف تلوار کا دھنی ہوتا ہے اور شہزادی میں اس تلوار کی جو میرے ہاتھ میں ہے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ آپ کے شہزادے دارا کے اور شہنشاہ کے ننگ و ناموس کے لئے ہر وقت و ہر لحظہ کام آئے گی اور میرا جان و مال آپ پر قربان ہوگا رہی ہند کی آزادی سو اس کو بھی ایک نہ ایک دن آنا ہے آج نہ سہی کل، کل نہ سہی پھر کبھی...

محلوں کی روشنی گل ہو چکی ہے۔ تارے آسمان پر جگمگا رہے ہیں، قلعہ کی دیوار کے نیچے دریا بہ رہا ہے میں تن تنہا چبوترے پر بیٹھی ہوں۔ گورا اُوراجا جا چکا ہے مجھے ہر سو اُسی کی صورت نظر آتی ہے چاروں طرف وہی دکھائی دیتا ہے اسی کی آواز میرے کانوں میں بسی ہوئی ہے اور محبت کا نشہ مجھے سرشار کئے ہوئے ہے میں اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوں دامن میں پھول چُن چُن کر ڈالتی جاتی ہوں اور بیٹھ کر ایک مالا گوندھتی ہوں۔ میں اس خیال میں مست ہوں کہ گویا میں اپنا سوئمبر رچانے کی تیاری کر رہی ہوں اور مجھ کو نہ صرف تمام دنیا بلکہ کل

کائنات خوش خوش نظر آتی ہے۔ دیوان عام میں شہزادوں۔ راجاؤں اور سرداروں کا دربار لگا ہوا ہے۔ میں شہنشاہ کے پہلو میں تخت طاؤس کے برابر مالا ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوں۔ شہنشاہ کا اشارہ پاتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوں۔ تمام راجاؤں اور سرداروں پر لاپروائی سے ایک نظر ڈالتی ہوئی جہاں راؤ راجا اپنی نرالی شان اور ادا سے کھڑا ہوا ہے پہونچتی ہوں اور مسکراتے ہوئے اس کے گلے میں جے مال ڈال دیتی ہوں اور اپنی شادی کے خیال سے مست ہوجاتی ہوں۔ یہ خواب تھا جو اُس رات میں چبوترے پر بیٹھے بیٹھے دیکھا کی۔ فوراً ہی مجھ کو شیخ ابن العربی کا وہ مقولہ یاد آیا کہ جس میں اُس نے بتایا ہے کہ انسان میں اگر قوت ارادی مستحکم و مضبوط ہو تو وہ اپنے خواب و خیال کو اصلیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ میں نے فوراً ہی ٹھان لی کہ میں اپنے محبوب کو نامۂ شوق لکھوں گی اور اُس کو اپنے رازِ دل سے ان لفظوں میں آگاہ کروں گی کہ اگر دارا کو اپنے بھائیوں پر فتح ہوئی اور وہ تخت تاج کا مالک ہوا تو پھر اکبر کے اُس قانون و رواج سے جس کی رو سے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں زوجیت میں نہیں دیجاتیں۔ قطع نظر کر کے اس پر آمادہ ہوجائے گا کہ وہ اپنی بہن کو شادی کرنے کی اجازت دے اور چونکہ بھائی کو بہن کی خاطر منظور رہے اور بہن کا دباؤ بھائی پر کافی ہے میری شادی اُسی کے ساتھ ہوگی جسکو میں چاہتی ہوں۔

(باقی)

پنڈت کشن پرشاد کول

مصطفےٰ کمال اور ترکی کا انقلاب حکومت

(مسلسل)

اسی دوران میں بالکل ناگہاں طور پر وہ انقلاب رونما ہو گیا جس کے لئے انور بے اور اس کی جماعت کوشاں تھی۔ اس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ نیازی ایک جماعت کو ساتھ لیکر جنوب مقدونیہ میں پہونچا اور حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی کے ساتھ انور نے انقلاب کا اعلان کرکے مشرقی مقدونیہ میں وہی کیا جو نیازی نے کیا تھا۔ مگر نہ کوئی خاص تنظیم تھی، نہ کوئی پروگرام سامنے تھا خود انجمن اتحاد و ترقی اس وقت تین سو آدمیوں سے زیادہ کی جماعت نہ رکھتی تھی اور فوج کے خیالات کا بھی صحیح اندازہ اس وقت تک نہ ہو سکا تھا۔

مصطفےٰ کمال خاموشی سے ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا اور اپنے فوجی فرائض کے علاوہ کسی اور تحریک میں حصہ نہ لیتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس قسم کی کمزور تدابیر پر کام کرنا جوا کھیلنا ہے اور وہ اس کے لئے طیار نہ تھا۔ لیکن اتفاق وقت کہ انور وغیرہ کی یہی کمزور تدابیر کامیاب ہو گئیں۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ جو فوجیں باغیوں کی سرکوبی کیلئے روانہ کیجاتی تھیں وہ خود تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بد دل تھیں اور ان سے جاکر مل جاتی تھیں، فوج پر فوج روانہ ہو رہی تھی اور حکومت کے خلاف انور کی جماعت میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ پایۂ تخت سے خاص اعتماد والی فوج بھیجی گئی لیکن اس نے بھی یہی کیا۔ جب خلیفہ عبدالحمید نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے فوراً چالاکی سے آئینی حکومت کا اعلان کر دیا اور انقلاب پسندوں کی اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ انور اور نیازی نہایت خوش خوش سالونیکا میں داخل ہوئے اور ترک و عیسائی دونوں جماعتوں نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔

سالونیکا پہونچنے کے بعد انور نے اولمپس پیلس ہوٹل کے بالاخانہ سے جدید آئینی حکومت کا اعلان کیا اور اسوقت مصطفےٰ کمال بھی دوسرے افسران فوج کے ساتھ انجمن اتحاد و ترقی کے ایک معمولی ممبر کی حیثیت سے کسی کونہ میں کھڑا ہوا تھا۔

اس اعلان کے بعد ہی تمام اکابر ترک جو پہلے بڑی بڑی خدمات پر مامور رہ چکے تھے، وہ بیس سال سے

دوسرے ممالک میں پناہ گزیں تھے واپس آنے لگے اور انھوں نے انجمن سے نوجوان کام کرنے والوں کو ہٹا ہٹا کر خود اس پر اپنا قبضہ جما لیا اور قسطنطنیہ پہونچکر حصول اقتدار کے لئے ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ نیازی البانیا چلا گیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا۔ انور بے، فوجی اتاچی بنا کر برلن بھیجدیا گیا اور مصطفیٰ کمال شمالی افریقہ روانہ کر دیا گیا تاکہ طرابلس کی فوجوں کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔

اسی آپا دھاپی میں سلطان کے ہوا خواہوں کو پھر موقعہ کام کرنے کا مل گیا اور انھوں نے قسطنطنیہ کی فوج کو ملا کر ملاؤں کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا شروع کر دیا کہ نئی حکومت کے علمبردار یہودی اور فریمیسن لوگ ہیں جو اسلام و خلافت کے دشمن اور مذہب یا ترکوں کی جماعت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ قسطنطنیہ کی افواج نے انجمن اتحاد و ترقی سے منحرف ہو کر اپنے افسروں کو گرفتار کر لیا اور خلیفہ کی حمایت کرنے لگے۔

انجمن نے مقدونیہ کی فوج سے مدد طلب کی۔ اسوقت محمود شوکت پاشا یہاں کی فوج کا افسر تھا جو خلیفہ عبدالحمید کا بہت معتمد علیہ افسر تھا۔ اس نے پہلے تو بہت پس و پیش کیا لیکن چونکہ اس کے اسٹاف میں بہت سے افسران ایسے تھے جو انجمن کے ممبر تھے (ان میں مصطفیٰ کمال بھی شامل تھا) اس لئے با دل ناخواستہ مجبوری و خوف کی وجہ سے اس نے مقدونیہ کی فوج کو قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیدیا۔ رسالہ کی کمان انور بے کے ہاتھ میں تھی اور مصطفیٰ کمال چیف آف اسٹاف تھا۔

انھوں نے قسطنطنیہ پہونچکر عبدالحمید کو تخت سے اتار دیا اور سالونیکا میں مقید کر کے اس کے بھتیجے کو تخت نشین کر دیا۔ ان تمام کارروائیوں سے انور بے کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگیں۔

لیکن مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھکر کہ وہ انور بے وغیرہ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا اور انجمن اتحاد و ترقی کے بعض اصول و طریق کار سے اس کو اختلاف ہے، اپنی توجہ انقلاب میں عملی حصہ لینے کی طرف سے پھیر لی اور اپنے فوجی فرائض کی طرف پوری طرح مائل ہو گیا چونکہ وہ فطرتاً سپاہی پیدا ہوا تھا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ترقی نہ کرتا، چنانچہ ۳۰ سال کی عمر سے قبل ہی وہ مقدونیہ میں "چیف آف اسٹاف" بنا دیا گیا۔

۱۹۱۰ء میں جنرل علی رضا کے ساتھ وہ ایک مشن پر فرانس بھیجا گیا اور یہاں سے وہ سالانہ عسکری میں شریک ہونے کے لئے پکارڈی گیا۔ جنرل علی رضا نے اسکی قابلیت و اہلیت کے متعلق نہایت اچھی رپورٹ کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پس پردہ سالونیکا کے مدرسہ حربیہ کا انچارج بنا دیا گیا۔

اس نے اسکول کی تنظیم میں نہایت دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی لیکن اسکے

عزائم کے لحاظ سے یہ خدمت بہت فروتر تھی اور وہ سیاسیات میں حصہ لیکر صحیح معنے میں ملک کی خدمات انجام دینا چاہتا تھا۔

اسوقت حالت یہ تھی کہ انور، طلعت اور جمال کا دور دورہ تھا اور جاوید وزیر مال تھا۔ مصطفیٰ کمال ان سب سے نفرت کرتا تھا، جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی حکومت کا اہل نہیں ہے۔ وہ علی الاعلان اپنے ان خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا، چنانچہ ایک دن اس نے پبلک میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ۔ "جدید حکومت بھی ہمارے درد کا علاج کرنے سے قاصر رہی کیونکہ دول عظمیٰ کی طامعانہ پالیسی ترکی کے متعلق پہلے سے زیادہ سخت ہوگئی ہے، جرمنی نے اپنا دست آز ترکی کے حلقوم تک پہونچا دیا ہے، غیر ملکی سرمایہ دار مراعات وحقوق حاصل کرتے جارہے ہیں جاوید نے بغداد ریلوے پر غیروں کو قابض بنا دیا ہے، اور ترکی جرمنی کے ہاتھ فروخت کیا جارہا ہے۔ اندرون ملک کی حالت بدستور اندوہناک ہے، نہ کوئی تنظیم ہے نہ مستحکم اصول سیاست، نہ ملازموں کو تنخواہیں ملتی ہیں نہ رعایا کو روٹی۔ اس لئے جب تک ترک جماعت بغیر بیرونی یا خارجی اثر قبول کئے ہوئے خود حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لیگی یہ بلا دور نہیں ہوسکتی۔"

مصطفیٰ کمال اب سٹیپر افسر تھا، اسکی قابلیت مسلم ہوچکی تھی، اس نئے افسران نے اس کے خیالات کا اثر قبول کیا اور اس کو مرکزیت سی حاصل ہوگئی۔ ان واقعات کی خبر جب محمود شوکت پاشا کو ملی جو اس وقت قسطنطنیہ میں وزیر حربیہ تھا، تو اس نے مصطفیٰ کمال کا تبادلہ سالونیکا کردیا۔ لیکن یہاں پہونچکر اور زیادہ اقتدار اسے حاصل ہوگیا اور جب انور بے وغیرہ کو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ کمال زیادہ خطرناک ہوتا جارہا ہے تو قسطنطنیہ بلاکر محمود شوکت پاشا نے اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ لیکن چونکہ شہادت کافی نہ تھی اور وہ مصطفیٰ کمال کی طرف سے مطمئن بھی نہ تھا اس لئے سوائے اس کے کوئی اور صورت سمجھ میں نہ آئی کہ سالونیکا سے ہٹاکر اسے پایۂ تخت میں رکھا جائے چنانچہ دفتر حربیہ میں اس کو مامور کردیا گیا۔

قسطنطنیہ میں ابتک سکون پیدا نہ ہوا تھا۔ مختلف جماعتیں اپنے اثر و اقتدار کے لئے کوشاں تھیں، ایک جماعت اگر آج برسر اقتدار ہے تو کل دوسری آگئی، پرسوں تیسری نے قبضہ جمالیا، اور کوئی ہستی ایسی نہ تھی جو اس اضطراب و انتشار کو دور کرسکے۔ انھیں جماعتوں میں ایک پارٹی جمال کی تھی جو جرمنی کی سخت مخالف تھی، وہاں کے فوجی معلمین کو نکالدینا چاہتی تھی اور سفیر جرمنی (وانگن ہیم) سے بھی متنفر تھی جو انور کا بڑا دوست تھا۔ مصطفیٰ کمال نے اسی پارٹی سے اپنے تعلقات بڑھائے اور کوشش کی کہ یہ لوگ اس کو اپنا رازدار بنالیں لیکن چونکہ اپنی

فطرت کے لحاظ سے نہایت آزاد، سخت گیر، صاف گو اور خودسر شخص تھا اس لئے لوگ اس سے خائف رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے نبھنا مشکل ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں (اکتوبر ۱۹۱۱ء) میں اٹلی نے بغیر اطلاع کے اپنی فوجیں طرابلس میں اُتار دیں اور ساحل کے ایک حصہ پر قبضہ کرکے شہر پر بھی تسلط قائم کر لیا۔ یہ سنتے ہی مصطفیٰ کمال ملک کے اندرونی سیاسی پیچیدگیوں کو بھول گیا اور اس نے دیکھا کہ یہ وقت اندرون ملک کے مسایل سلجھانے کا نہیں بلکہ دشمن کی مداخلت سے ملک کو بچانے کا ہے اور اس کو جلد سے جلد افریقہ پہونچنا چاہئے۔

اسوقت ترکی اور شمالی افریقہ کے درمیان سلسلۂ نقل و حرکت اگر کوئی باقی تھا تو شام و مصر ہوکر، کیونکہ اٹلی کی فوجوں نے سمندر پر قبضہ کرکے درۂ دانیال کو بند کر دیا تھا۔ پھر ادھر ترکی کی بحری قوت کا یہ حال تھا کہ سوائے دو جہازوں اور چند کروزر کے اور کچھ تھا نہیں، ان کا بھی یہی حال تھا کہ بوائلر زنگ خوردہ تھے، بحری سپاہ معدوم تھی اور جہاز شاخ زریں میں پھنسے پڑے تھے۔ اس لئے بحری راستہ سے فوج بھیجنا ممکن نہ تھا۔ مجبوراً خشکی کا راستہ تیار کر لیا گیا۔ انور بے جا چکا تھا اور فتحی بھی جو پیرس میں فوجی اتاچی تھا براہ مارسیل ٹیونس پہونچ چکا تھا۔ مصطفیٰ کمال اپنے دو دوستوں کو ساتھ لیکر براہ خشکی روانہ ہوگیا۔ جہاں ریل تھی وہاں ریل کے ذریعہ سے اور جہاں ریل نہ تھی وہاں گھوڑوں کے ذریعہ سے انھوں نے شام و فلسطین کے راستے طے کئے اور اسکندریہ پہونچے۔ یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ انگریزوں نے مصر کی غیر جانب داری کا اعلان کرکے ٹیونس جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ مصطفیٰ کمال یہ سنکر غصہ سے کانپ اُٹھا۔ کیونکہ مصر ترکی سلطنت میں شامل تھا اور انگریزوں کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ مصر کی پالیسی کا اعلان کرکے ترکی فوج و ترکی افسران کی راہ میں حائل ہوں۔ لیکن کیا کرتا خون کے سے گھونٹ پیکر خاموش ہوگیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب ساتھ چلنا تو ممکن نہیں ہے۔ سب کو علحدہ علحدہ جس طرح ممکن پہونچنا چاہئے۔

مصطفیٰ کمال عربی لباس پہنکر مغرب کی طرف جانے والی ریل پر بیٹھ گیا۔ جب وہ سرحد پر پہونچا تو وہ روک لیا گیا کیونکہ نہ وہ عربی زبان سے زیادہ واقف تھا اور نہ اس کی صورت و شکل سے عرب نژاد ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ یہاں ایک مصری افسر متعین تھا جس کے پاس مصطفیٰ کمال کا حلیہ پہلے ہی پہونچ چکا تھا۔ لیکن چونکہ یہ انگریزوں کا دشمن تھا اور ترکوں کا موافق اس لئے اس نے مصطفیٰ کمال سے تو کہدیا کہ تم اللہ کا نام لیکر طرابلس جاؤ اور اسی کے ہمشکل کسی اور شخص کو گرفتار کرکے اسکندریہ بھیجدیا۔

جسوقت مصطفیٰ کمال ترکی ہیڈکوارٹر (عین المنصور میں) پہونچا تو لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ افسران کی بہت کمی تھی اور مصطفیٰ کمال چونکہ پہلے سے اس سرزمین کا واقف الحال تھا اس لئے اس کی خدمات سے مفید ہونے کا اور زیادہ یقین تھا۔ اس کو فوراً میجر بناکر اس فوج کی کمان دیدی گئی جو بندرگاہ ڈرنا کے محاذ میں پڑی ہوئی تھی۔ یہیں عین المنصور میں انور بے بھی تھا جو سارے محاذ کا انچارج تھا۔

اٹلی نے اپنی بحری قوت کے زور پر ساحلی مقامات پر قبضہ کرلیا تھا لیکن اندرون ملک کے اندر وہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ ترکی فوجیں سامنے پڑی ہوئی تھیں اور تمام شمالی افریقہ مسلح تھا کیونکہ جہاد کا اعلان ہوچکا تھا اور تمام افریقی قبائل دور و نزدیک سے ترکوں کی حمایت کے لئے جمع ہو رہے تھے اور انور بحیثیت نائب امیر المومنین ہونے کے سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

انور نے ایک بڑا خیمہ نصب کرکے قالین وغیرہ سے اُسے آراستہ کردیا تھا اور یہیں وہ شیوخ قبائل سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس نے ہر قبیلہ کے لئے چالیس چالیس خیمے علحدہ کردئے تھے اور ہر خیمہ کے لئے ایک عورت کھانا پکانے کے لئے مقرر کردی تھی اور ہر قبیلہ کی فوج کے لئے تین ترک افسر مامور کردئے تھے اور ساری فوج اطمینان سے کام کر رہی تھی۔

مصطفیٰ کمال، فوجی عہدہ کے لحاظ سے انور کا ماتحت تھا اور اکثر دونوں کو ملنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن اتحاد رائے ان دونوں میں کبھی نہیں ہوا۔ دونوں کی رگوں میں اناطولیہ کا آزاد و جنگجو خون دوڑ رہا تھا۔ دونوں خودسر، خودرائے نڈر اور جری تھے، نہ یہ نکتہ چینی کو برداشت کرسکتا تھا نہ وہ ۔۔۔ فرق اگر تھا تو صرف یہ کہ انور عادتاً اپنے بلند عزائم کی پرستش کرتا تھا اور تدابیر کی تفصیل اور ان کے قابل عمل ہونے پر چنداں توجہ نہ کرتا تھا، لیکن مصطفیٰ کمال کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ وہ پورا بھی ہوسکتا ہے یا نہیں وہ واقعات و حالات کا تجزیہ کرکے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ کس کام کو کس طریقہ سے انجام دینا چاہئے۔ چنانچہ جب وہ سالونیکا میں تھا، اسی وقت وہ انور سے نفرت کرنے لگا تھا اور یہ جذبہ روز بروز شدید ہوتا جاتا تھا۔ ان دونوں میں بارہا سخت کلامی کی بھی نوبت آگئی لیکن فتحی نے ہمیشہ بیچ بچاؤ کردیا۔ یہاں بھی ان دونوں کی مخالفت و مغایرت کی یہی کیفیت تھی اور مصطفیٰ کمال نہ اس کی دعوتوں میں کبھی شریک ہوتا تھا اور نہ اس کے دربار میں۔ وہ الگ ایک چھوٹے سے خیمہ میں پڑا ہوا اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا اور انور کے اس اقتدار و مرکزیت کو دیکھ دیکھ کر جل رہا تھا۔

جنگ طرابلس تقریباً ایک سال تک جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، نہ ترک اٹلی کو ساحلی مقامات سے ہٹا سکے

اور نہ آئی اندرون ملک میں ایک انچ آگے بڑھ سکا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں (اکتوبر ۱۹۱۲ء) مانٹی نگرو نے اعلان جنگ کر دیا اور بلقان کی تمام عیسائی ریاستیں متفقہ قوت سے ترکی کے مقابلہ میں آگئیں۔

اس حادثہ نے ترکی کو مجبور کر دیا کہ وہ اٹلی سے صلح کر لے اور تمام ترکی فوجوں کو اس نئی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے افریقہ سے واپس بلا لے۔ چنانچہ کمال بھی فوراً واپس گیا۔ لیکن چونکہ سیدھا راستہ بند تھا اس لئے وہ آسٹریا، رومانیا اور بحر اسود ہوتا ہوا روانہ ہوا اور دسمبر کے پہلے ہفتہ سے قبل نہ پہونچ سکا۔

اسوقت یہاں کی حالت حد درجہ اضطراب وانتشار کی تھی۔ ترکی فوجیں تقریباً سب کی سب تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ سرویا شمال سے بڑھتا آ رہا تھا، یونان نے جنوب کی طرف سے بڑھکر سالونیکا پر قبضہ کر لیا تھا اور ۲۵ ہزار ترکی قیدی اس کے پاس تھے، بلغاریا سیدھا قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور شتلجہ پر جو قسطنطنیہ سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہے اپنا محاذ قائم کئے ہوئے تھا۔ الغرض پایۂ تخت کے اردگرد چند میل زمین اور ادرنا کے علاوہ جسکا محاصرہ بلغاریہ نے کر رکھا تھا تمام یوروپین ترکی ہاتھ سے نکل چکا تھا اور ان تمام تباہیوں میں اگر کوئی امید لگی ہوئی تھی تو رؤف سے جو حمیدیہ کروزر کو لئے ہوئے بحیرۂ ایجن میں ادھر ادھر دشمنوں کے بندرگاہوں یا ذخائر پر چھاپے مارتا پھرتا تھا۔

قسطنطنیہ زخمیوں سے بھرا ہوا تھا، اسپتال، کلیسا، مسجدیں، خانگی مکانات، ہوٹل، قہوہ خانے الغرض ہر جگہ زخمی ہی زخمی نظر آتے تھے اور ان کو غذا تک پہونچانا دشوار تھا۔ اسی زمانہ میں ہیضہ بخار بھی پھیل گیا جس نے اور ابتر کر دیا۔ پھر حکومت کی حالت یہ تھی کہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں لگی ہوئی تھیں اور کوئی ایسی مرکزی ہستی موجود نہ تھی جو اس انتشار کو دور کر سکے۔

مصطفیٰ کمال نے قسطنطنیہ پہونچکر سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ سالونیکا میں اسکے خاندان پر کیا گزری۔ کیونکہ یونانیوں نے وہاں نہایت بیدردانہ غارتگری کی تھی۔ بہت جستجو کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں اور بہن (مقبولہ) دونوں یہیں قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہیں، چنانچہ تلاش کر کے وہ ان سے ملا اور کیمپ سے اٹھا کر شہر لے آیا۔ اسکے بعد اس نے دفتر حربیہ میں حاضری دی اور گیلی پولی میں چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے اس کو مامور کیا گیا۔

اسوقت گیلی پولی میں ترکوں کی ایک فوج بلیر کے مقام پر بلغاریوں کے مقابلہ میں پڑی ہوئی تھی اور یہ ایسا اہم و نازک مقام تھا کہ اگر بلغاریہ کی فوجیں اس سے عبور کر جاتیں تو درۂ دانیال اور تمام ایشیائے کوچک ترکوں کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

مصطفیٰ کمال یہاں پہونچا ہی تھا کہ دشمن نے قلعۂ تلیر پر حملہ شروع کر دیا۔ قلعہ کی حالت یہ تھی کہ ۷۰ سال قبل جو استحکامات انگریزی انجینروں نے جنگ کریمیا کے موقعہ پر تیار کئے تھے وہی خراب وخستہ حالت میں پائے جاتے تھے اور ترکی فوج انھیں سے کام لے رہی تھی۔

مصطفیٰ کمال کے پہونچ جانے سے ترکی افواج میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی اور بلغاریہ کے حملوں کا جواب انھوں نے نہایت پامردی سے دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ شکست وفتح کا فیصلہ ہوتا، دول عظمیٰ نے صلح کا انفرنس طلب کرلی اور ریاستہائے بلقان نے اپنا یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ سوائے قسطنطنیہ تمام حصہ یوروپین ترکی کا انہیں تقسیم ہونا چاہئے اور اڈریانوپل فوراً بلغاریہ کے حوالہ کر دیا جائے جس کا وہ محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

ترکوں کی حالت اس وقت یہ تھی کہ ان میں مختلف جماعتیں کام کر رہی تھیں، ایک جماعت جو وزیر کامل پاشا کے ہاتھ میں تھی صلح چاہتی تھی خواہ وہ کتنی ہی ذلیل شرائط پر کیوں نہ ہو اور نوجوان جماعت اس کی مخالف تھی۔ اسی دوران میں انور بے طرابلس سے واپس آیا اور فوراً انجمن اتحاد وترقی کا جلسہ طلب کرکے نوجوان افسروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور دربار خلافت میں داخل ہوکر مجلس وزراء کو درہم وبرہم کر دینا چاہا۔ جس وقت انور بے اندر داخل ہونے لگا تو ناظم پاشا وزیر حربیہ نے اسے روکا، اس نے ریوالور نکالکر ناظم پاشا کو اسی جگہ ڈھیر کر دیا اور دوسرے وزراء کا بھی تعاقب کرکے باہر نکال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس وزراء پر نوجوانوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور محمود شوکت کو وزیر اعظم بناکر طلعت اور جمال کو کابینۂ وزارت کا ممبر بنا دیا گیا۔

ہرچند اس انقلاب سے بعض حلقوں میں بے چینی پیدا ہوگئی اور بعض گوشوں سے علانیہ مخالفت کی آواز بلند کی گئی، لیکن انور بے نے سختی سے کام لیکر اس اختلاف کو دور کیا اور بعض زیادہ خودسر لوگوں کو دار پر چڑھا کر اپنا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔

اس کے بعد انور بے کو سب سے بڑی فکر اس امر کی تھی کہ اڈریانوپل کو بلغاریوں کے ہاتھ سے کیونکر بچایا جائے چنانچہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ شاخ زریں سے ایک بیڑہ روانہ کیا جائے جو بمقام شاہ کوئی فوجیں اُتار کر بلیر کے جنوب سے دشمن پر حملہ کرے اور دوسری طرف سے بلیر کی فوجیں آگے بڑھیں، اس طرح شتلجہ کے محاذ سے دشمن ہٹ جائے گا اور اورنہ بچ جائے گا۔

اس کانفرنس میں مصطفیٰ کمال بھی شریک تھا۔ اس نے کہا کہ شاہ کوئی کی پہاڑیوں پر دشمن قابض ہے اسلئے وہاں فوجیں اُتارنا خطرہ سے خالی نہیں اور بلیر کی فوج بھی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے

یہ تدبیر ناقابل عمل ہے اور سوائے نقصان کے فایدہ کی کوئی توقع نہیں۔

انور بے یہ نکتہ چینی سنکر بگڑ گیا اور آخر کار اسی کی تجویز پاس ہوگئی ۔ ۸ ر فروری کو بلیر کی افواج نے حملہ کیا جسمیں مصطفیٰ کمال بھی شریک تھا۔ چند میل جانے کے بعد گہر نے ان کے اقدام کو روک دیا اور بلغاریوں نے بائیں طرف سے توپوں کی باڑھ مارنا شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کی نصف فوج ہلاک ہوگئی اور مصطفیٰ کمال کو واپس ہونا پڑا۔ شاہ کوئی کی طرف سے جس ترکی فوج نے حملہ کیا تھا اُس کو بھی پسپا ہونا پڑا اور چھ ہزار سپاہی اس میں بھی کام آئے

الغرض ایک ماہ بعد ادرنہ ہاتھ سے نکل گیا اور انور کو مجبوراً انھیں شرائط صلح پر دستخط کرنا پڑے جو مقتول کامل پاشا نے منظور کر لئے تھے۔ لیکن حُسن اتفاق سے اسی وقت خود ریاستہائے بلقان میں باہم گر جنگ شروع ہوگئی اور انور بے نے اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر پھر ادرنہ پر چڑھائی کردی اور ترکی جھنڈا نصب کردیا۔

(باقی)

باب الانتقاد

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ منظومات

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

صفحہ ۲۷ پر لینن روسی کو مخاطب کر کے انھوں نے ایک شعر لکھا ہے:-

بیکسی سے زرد چہرہ پر خوشی کا نور تھا		افسرِ شاہی بساطِ محفلِ مزدور تھا

افسر تاج کو کہتے ہیں اور تاج کو (بساط) کہنا غلط تعبیر ہے۔ (بساط) میں بسط یا پھیلاؤ کا مفہوم پنہاں ہے اسلئے (افسر) کو بساط کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

صفحہ ۳۷ پر فردوس گم شدہ کی نظم میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہے صدائے دشنۂ و نشتر سرودِ ارتقا		موت کی ہر چیخ ہے اسکے لئے آوازِ چنگ

ممکن ہے دشنہ کے استعمال کے وقت کوئی آواز پیدا ہوتی ہو، لیکن نشتر کے ساتھ لفظ (صدا) کا استعمال بالکل بے محل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ لفظ (صدا) بمعنی (طلب) لایا گیا ہے تو پھر دوسرے مصرعہ کے ساتھ اس کا توازن باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں (آوازِ چنگ) آواز ہی کے معنے میں ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں بھی (اس کے لئے) کی تکرار ضروری تھی۔

اسی نظم کا دوسرا بند شاعر نے اس دعوے کے ساتھ شروع کیا ہے کہ

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے		اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

حالانکہ اختلافِ رنگ و بو تضاد نہیں، بلکہ تنوع ہے۔

اس کے بعد اس تضاد کی صراحت کی ہے کہ:-

باغ میں لالہ بھی ہے، گل بھی سمن بھی خار بھی		ایک رنگیں خامشی مُہرِ لبِ فریاد ہے

ضد نہیں آپس میں ان کو باوجودِ اختلاف		جانتے ہیں سب نظام دہر بے بنیاد ہے

پہلے شعر میں لالہ، گل و سمن ہیں باہم دگر کوئی تضاد نہیں۔ اگر تضاد ہے تو صرف گل و خار میں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ صرف قافیہ پورا کرنے کے لئے لالہ، گل اور سمن لائے گئے ورنہ یہاں ان کی ضرورت نہ تھی۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا،

ایک ہی گلبن سے پیدا پھول بھی ہیں خار بھی

دوسرے مصرعہ میں (گویائی خامشی) کا فقرہ لالہ و گل وغیرہ کے لئے تو لا سکتے ہیں لیکن (خار) کی خامشی میں تو کوئی رنگینی نہیں ہے۔ علاوہ اس کے نہر لب فریاد کہنے سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ اُن میں واقعی کوئی احساس تضاد کا نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فریاد تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے۔

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں:-

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف　　فطرت گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

اس شعر نے اُس دعویٰ کو بالکل رد کر دیا جو شاعر نے پہلے شعر میں کیا تھا کہ "عالم ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے" نظم کہنے میں شعراء کی ناکامی کا اکثر سبب یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خود اپنے قول کے تضاد کو محسوس نہیں کرتے اور اس طرح پوری نظم غیر مربوط وغیرہ متوازن اشعار کا مجموعہ ہو جایا کرتی ہے۔ صفحہ ۳۶ پر آزادی کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

وہ اک حور مجسم ہے بہار صد چمن در بر　　نشاط دو جہاں در دل حیات انجمن در بر

(صد بہار در بر) اور (صد چمن در بر) علٰحدہ علٰحدہ تو ٹھیک ہے لیکن دونوں کو ملا کر (در بر) سے ترکیب دینا مناسب نہیں علاوہ اس کے جب (صد بہار در بر) کہہ دیا تو پھر (صد چمن در بر) یوں بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ یہ تو تنزل ہوا نہ کہ ارتقا ـــ دوسرے مصرعہ میں لفظ (در دل) بھی کھٹکتا ہے، کیونکہ (در بر) کی رعایت سے یہاں بھی کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو کسی محسوس شے کو ظاہر کرتا ہو اور اس لئے اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

نوید خرمی بر لب فروغ انجمن در بر

اس نظم کا دوسرا شعر یہ ہے:-

سیاہ دست لمبے بال، پیچ و خم سے بیگانہ　　نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاق رم سے بیگانہ

پہلے مصرعہ میں (سیاہ دست لمبے بال) کی نشست الفاظ کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے (وہ لمبے لمبے کالے بال) یا (وہ کالے کالے لمبے بال)۔ علاوہ اس کے (پیچ و خم سے بیگانہ) ہونا بالوں کا کوئی حسن نہیں ہے۔ شاعر کا اصل مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنے بالوں میں کسی کو پھنسا کر ہلاک نہیں کرتی اور اسی لئے (پیچ و خم)

سے اُن کو بیگانہ ظاہر کیا گیا، لیکن یہ غور نہ کیا کہ ان الفاظ سے مفہوم میں جو تغیر پیدا ہو جاتا ہے وہ اس (حور مجسم) کی تکمیل حُسن کے منافی ہے۔ اسی نظم کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو:-

خلش گُل کی جگر میں، درد دل میں درد لالے کا
ادھر اک ہاتھ میں مسجد، اُدھر گنبد شوالے کا

(دل میں درد لالے کا) تو خیر لالہ کے داغدار ہونے کی وجہ سے ٹھیک ہے لیکن (خلش گل کی جگر میں) کیوں ہو۔

دوسرے مصرعہ میں عجیب بات یہ ہے کہ ہاتھ میں مسجد تو پوری دکھا دی گئی لیکن شوالہ کا صرف گنبد۔ ہر چند جزو بول کے کل مراد لینا نادرست نہیں، لیکن مسجد کا ذکر بھی اسی انداز سے کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے مصرعہ کی ترکیب کا اقتضا یہ تھا کہ مفہوم یوں ظاہر کیا جاتا۔ ادھر اک ہاتھ میں مسجد اُدھر دوسرے ہاتھ میں شوالہ۔ لیکن دوسرے ہاتھ کی صراحت کہیں نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں مسجد و شوالہ دونوں ہیں تو پھر (ادھر اور اُدھر) کی صراحت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اس کے بعد کا شعر ہے:-

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لب خود رنگ پر تلپی ہوئی تکبیر کی موجیں

ناقوس سے کوئی نغمہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف آواز یا صدا پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے زبان پر تنویر کی موجیں کہنا بھی درست نہیں، کیونکہ (تنویر) اور (موجیں) دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ ان کا وجود کسی نمایاں اور کھلی ہوئی جگہ پر ظاہر کیا جائے نہ کہ زبان پر جو منھ کے اندر چھپی ہوئی رہتی ہے۔

دوسرے مصرعہ میں لفظ (خود رنگ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ مصرعہ پورا کرنا تھا۔

اور ایک شعر اسی نظم کا ملاحظہ ہو:-

ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا
جو اسکی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا

اس شعر میں سیماب صاحب نے لف و نشر غیر مرتب پیدا کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ گنگا کا تعلق ہمالہ سے ضرور ہے، لیکن طور سے زمزم کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ اس کے زمزم نام کنویں کا ہے اور محض زمزم بول کر اس کا پانی کبھی مراد نہیں لیا جاتا۔ میری رائے میں اس شعر کو یوں ہونا چاہئے:-

ہمالہ کی پری اور نجد کا اک جلوۂ رعنا
جبیں پر آب زمزم اور بالوں میں لئے گنگا

صرف ہمالہ (پہاڑ) کی رعایت، بلکہ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے لحاظ سے بھی (گنگا) کا تعلق بالوں سے زیادہ ہے۔

فضا کی وسعتوں میں اُڑنے والی اک ردا پر
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر

معلوم نہیں آزادی کی پری دفعتہً ردا کیونکر ہو گئی۔ (اک ردا پر لئے ہوئے ہے) ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے مصرعہ میں غالباً اسی ردا کو (ادائیں) کہا گیا ہے جو درست نہیں علاوہ اس کے اداؤں کا تیرنا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تنفس میں نجات اُسکے، ترنم میں حیات اُسکے
تکلم گلستاں اس کا جلو میں کائنات اسکے

دوسرے مصرعہ میں (گلستاں) کی رعایت سے بجائے (تکلم) کے (تبسم) لکھنا چاہئے تھا۔ علاوہ اسکے (کائنات) کی جگہ کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نجات و حیات کی قبیل سے ہوتا۔ یہ شعر یوں کر دیا جائے تو غالباً کوئی نقص باقی نہ رہے۔

تکلم میں [illegible] اسکے ترنم میں نجات اسکے
تبسم گلستاں اس کا تنفس میں حیات اُسکے

اس کے بعد کا شعر ہے:-

شگوفے برستا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا

پہلے مصرعہ میں (برستا ہوا) بجائے (برستا تھا) کے استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (تیوروں) جمع استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ (تیور) میں خود جمع کا مفہوم ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اس کو جمع کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ داغ کا شعر ہے:-

[illegible] آتے ہی وہ تیور [illegible]
تم کو انھیں باتوں نے [illegible] کیا

علاوہ اس کے تیور ہمیشہ خشونت و برہمی وغیرہ کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور شگفتگی سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے:-

برستا تھا شگوں اس کے تبسم سے محبت کا
جبین صاف پر تھا موجزن دریا صداقت کا

شعاع حسن لرزاں اسکے فردوسی اشاروں میں
بہار افروز پھولوں میں صباحت ریز تاروں میں

دوسرا مصرعہ پہلے سے بالکل علحدہ ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ بہار افروز پھولوں اور صباحت ریز تاروں میں کیا چیز تھی۔ اگر کہا جائے کہ دوسرا مصرعہ بدل واقع ہوا ہے فردوسی اشاروں کا تو مناسب یہ تھا کہ لفظ (یعنی) سے اس کی وضاحت کر دیجاتی۔

علاوہ اس کے بجائے (لرزاں) کے اگر (پنہاں) لکھا جاتا تو زیادہ برمحل ہوتا۔

صفحہ ۵۸— شگفت لالہ و گل اور اپنا سینۂ پُرغم

فارسی میں لفظ (شگفت) تعجب و حیرت کے معنے میں آتا ہے اور اس کا تلفظ (شِگِفت) بکسر (شین) ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے لئے فارسی میں (شگفتگی) کا لفظ مخصوص ہے۔

صفحہ ۲۰۸ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان چراغ ساحل ہے اور جو چیتا کی آگ کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔ اسکا دوسرا شعر ہے

اک جہنم تپش افشاں ہے سر مرکزِ آب ایک آتش کدہ لرزاں نظر آتا ہے مجھے

حالانکہ چراغ ساحل یا چِتا کے شعلہ کو جو ہمیشہ ساحل پر نظر آتا ہے، (مرکز آب) سے کوئی تعلق نہیں۔

صفحہ ۲۴۹ - ہے غلط تنقید، اہل معنیٰ عیب ترا

لفظ (تنقید) غلط ہے۔ عربی میں نقد و انتقاد تو آتا ہے لیکن باب تفعیل میں لاکر (تنقید) کبھی استعمال نہیں کرتے۔

صفحہ ۲۱۵ :- سینۂ گل چاک ہے، غنچے کے دل میں تیر ہے

معلوم نہیں غنچہ میں وہ کیا چیز ہے جسے سیماب صاحب نے (تیر) سے تعبیر کیا ہے۔

صفحہ ۲۰۵ - دل بر آتش، جان بلب ہو، وا اسرجا تا ہو دل میں

(دل در آتش) چاہئے۔

صفحہ ۱۹۹ - سینے میں ابتک روشن چراغاں

چراغاں کے ساتھ لفظ (روشن) مستعمل نہیں ہے۔ چراغاں کردن، چراغاں شدن وغیرہ تو لاتے ہیں لیکن چراغاں روشن کردن خلاف محاورہ ہے، وہ فارسی میں کہیں نہیں دیکھا گیا یوں ہونا چاہئے تھا۔ سینہ پر ابتک لیکن چراغاں

صفحہ ۱۹۰ - غالب کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

اے کہ تو راز بقا اندر زنا فہمیدہ ہے

یہ مصرعہ غالباً غالب کی دشوار پسند طبیعت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اور شاید اسی کاوش کے ساتھ کہ مفہوم سے بیگانہ رہے۔ لفظ فہمیدہ اور اس کے موجودہ صورت استعمال کے متعلق میں کیا عرض کروں، سیماب صاحب کو خود غور کرنا چاہئے۔

صفحہ ۷۷ پر صور ہجرت کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ نظم ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا رخ زیبا بھی بدنما خال سے خالی نہیں - اس کا ایک شعر ہے :-

ہجرت اک تمہید ہے وصل دل مہجور کی ہجرت اک تجدید ہے عام طلب دستور کی

پہلے مصرعہ میں وصلِ دل بجائے تسکین دل کے استعمال ہوا ہے۔ لفظ وصل ہمیشہ اس چیز کے ساتھ ترکیب دیا جاتا ہے

جو مطلوب ہوتی ہے اور اسی لئے وصلِ دوست، وصلِ حبیب وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں مطلوب (دلِ مہجور) نہیں ہے بلکہ اس کا سکون مطلوب ہے اور اس لئے (وصلِ دلِ مہجور) کی ترکیب نا درست ہے۔

دوسرے مصرعہ میں (عزمِ طلب و ستور) میں ترکیب اضافی ہے اور لفظ (طلب) کو مکسور ہونا چاہئے درانحالیکہ اس کا آخری حرف یعنی (ب) ساکن پڑھا جاتا ہے۔

صفحہ ۹۲ پر ایک نظم شہید کے عنوان سے درج ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

حدِ معلومہ ہستی سے گزرتا ہی نہیں ۔۔۔ صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں

پہلے مصرعہ میں لفظ معلومہ صفت ہے لفظ (حد) کی، حالانکہ (حد) عربی میں مذکر ہے اور اس کی صفت (معلوم) ہونا چاہئے نہ کہ (معلومہ) جو مونث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ (حد) اُردو میں مونث ہے لیکن ترکیب توصیفی میں اسکی صفت تو ہمیشہ مذکر لائی جائے گی۔

صفحہ ۹۴ پر منافق کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

منافق جس کو مارِ آستیں کہتے ہیں دنیا میں ۔۔۔ وہ ہے اک خطرۂ خاموش آغوشِ تماشا میں

دوسرے مصرعہ میں (آغوشِ تماشا) کا کوئی تعلق شعر کے مفہوم سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر بجائے (تماشا) کے (تمنا) کہا جاتا تو خیر یک گونہ ربط پیدا ہو سکتا تھا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے:۔

لہو پیتا ہے بنکر سانپ اخلاص و محبت کا ۔۔۔ وہ ڈاکو ہے، وہ غارتگر ہے انسانی شرافت کا

سانپ کا کام لہو پینا نہیں ہے بلکہ ڈسکر علٰحدہ ہو جاتا ہے، البتہ اگر بجائے سانپ کے (جونک) کہا جاتا تو لہو پینا ٹھیک ہو سکتا تھا۔۔۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

وہ اک تیوری جس پر سپیدی ہو سکوں افشاں ۔۔۔ وہ اک تیوری جو ہے غلافِ رنگ میں پنہاں

اول تو یہ ضروری نہیں کہ ہر تیوری پر سپیدی نظر آئے اور اگر اسے تسلیم کرلیں تو بھی اس سپیدی کا (سکوں افشاں) ہونا عجیب بات ہے۔

نقصِ تعبیر و معنی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہو زباں اسکی ۔۔۔ کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اسکی

زباں پر کچھ ہے دل میں کچھ نمونہ ہو دو رنگی کا ۔۔۔ خود اس کا ہر عمل شاہد ہو اسکی ظرف تنگی کا

صرف ان دو شعروں بلکہ پوری نظم میں منافق کی تصویر کھینچکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے اور جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں ہے۔ لیکن اس مصرعہ میں

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اسکی

بیان کا یہ التزام تمام نہ رہ سکا۔ کیونکہ یہاں دل و زبان دونوں کو گندہ دکھایا۔ اگر اس مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا کہ — "گو زباں بظاہر صاف ہے لیکن دل اس کا مزبلہ ہے" تو بیشک درست ہو سکتا تھا علاوہ اس کے زباں اور آرائیاں ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

دوسرے شعر میں (ظرف تنگی) کی ترکیب بجائے (تنگ ظرفی) کے استعمال کی گئی ہے۔ فارسی میں یوں تو (ظرف تنگ) لکھتے ہیں لیکن جب یائے مصدری کا اضافہ کر کے اسم معنی بنائیں گے تو موصوف و صفت کو الٹ کر علامت صفت یعنی (کسرہ) کو غائب کر دیں گے اور اسی لئے وہ (نازک بدنی) کہیں گے، (بدن نازکی) کبھی استعمال نہ کریں گے۔ (کم ظرفی، تنگ ظرفی) کہیں گے اور (ظرف کمی، ظرف تنگی) کبھی نہ بولیں گے۔ (کوتاہ آستینی) استعمال کریں گے اور (آستین کوتاہی) کبھی نہ لکھیں گے اردو میں اس قاعدہ کے خلاف صرف ایک لفظ (دست درازی) کا استعمال ہوتا ہے، لیکن فصحا ہمیشہ (درازدستی) لکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک اُستاد کہتا ہے:۔

مطلق پتہ ملا نہ گریبان صبح کا کیسی درازدستی شبہائے تار ہے

نیز سیماب صاحب نے اسی مجموعہ میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

تپش آلودہ حسرت سے برہم خاطری کیسی

حالانکہ (ظرف تنگی) پر قیاس کر کے انھیں (خاطر برہمی) لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۱۰۳ پر ایک نظم "دعوت غور و فکر" کے عنوان سے درج ہے اور اچھی نظم ہے لیکن اسی نوع کے نقائص اس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا دوسرا شعر ہے:۔

تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا کمال حسن و جمال کیا ہے، زوال شیب و شباب کیا ہے

پہلے مصرعہ میں اگر بجائے (تصرفات) کے (تحولات) ہوتا تو اصطلاحی رنگ پیدا ہو جاتا۔ دوسرے مصرعہ میں (زوال شیب و شباب) لکھا گیا ہے، درانحالیکہ شیب خود زوال کی صورت ہے۔ زوال شباب تو ٹھیک ہے لیکن زوال شیب کے معنے تو پھر از سر نو جوان ہو جانے کے ہیں — اسی نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

یہ نغمے کیوں حشر سامعہ ہیں، خمار کیوں ہے آل نَے سرود میں یہ صدا ہے کیسی، نوائے چنگ و رباب کیا ہے

(حشر) کے معنے گروہ اندر گروہ جمع ہونے اور اکٹھا ہونے کے ہیں۔ اور سیماب صاحب کی مراد یہاں سامعہ کی بیداری ہے یا اس کا لطف اندوز ہونا اس لئے بجائے (حشر) کے (نشر) استعمال ہونا چاہیئے یا (لطف)

اسی نظم کا ایک شعر اور ہے :-

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب یہ آسماں کیوں ہے گردشوں میں　　ہے بہر میں التہاب کیسا یہ نزہت ماہتاب کیا ہے

پہلے مصرعہ میں بجائے (گردش) کے (گردشوں) استعمال کیا گیا ہے۔ یوں بھی لکھ سکتے تھے :-

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب، فلک ہے گردش میں رات دن کیوں

دوسرے مصرعہ میں (التہاب) کی رعایت سے بجائے (یہ نزہت ماہتاب) کے (برودتِ ماہتاب) ہونا چاہیئے اس طرح لفظ (یہ) بھی نکل جاتا جو بے ضرورت استعمال ہوا ہے۔

صفحہ ۱۰۵ - ایک نظم "طور کی چوٹی پر" لکھی گئی ہے اور خوب ہے، لیکن بے اعتدالیاں ایسی بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

لگانا چاہتا ہوں سارے کوہ طور کا سرمہ

یہاں لفظ (سارے) بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ بجائے اس کے (خاک) بھی لکھ سکتے تھے۔

دوسرے بند کا پہلا شعر ہے :-

کلیسا میں تجھے ڈھونڈھا حرم میں بھی تجھے ڈھونڈا　　برہمن بنکے ہر بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

دوسرے مصرعہ میں لفظ (ہر) اور (بھی) کا اجتماع درست نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا تھا :-

برہمن بنکے۔ ہاں، بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

اسی بند کا ایک شعر ہے :-

وفورِ جستجو نے کر دیا اس درجہ کاہیدہ　　کہ دامانِ نسیم صبحدم میں بھی تجھے ڈھونڈا

لفظ (کاہیدہ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ وفورِ جستجو سے کاہیدگی تو پیدا ہو سکتی ہے، لیکن دامانِ نسیم کی جستجو کے لئے (کاہیدگی) ضروری نہیں۔ غالباً سیماب صاحب کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ کاہیدہ ہو کر (تنکا) بن گئے اور پھر ہوائے ساتھ ساتھ اُڑتے پھرے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ الفاظ سے اس کو ادا نہ کر سکے۔

تیسرے بند کا ایک شعر ہے :-

زمانہ ہو چکا پھر طور کا ماحول خالی ہے　　فضائے شوق میں خاکستر قلب و جگر کر دے

پہلے مصرعہ میں لفظ (پھر) بالکل بیکار ہے، اور (ماحول) کا خالی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا - بجائے (خالی) کے (افسردہ) لکھنا چاہئے۔

دوسرے مصرعہ میں (خاکستر قلب و جگر کردے) بھی صحیح نہیں - محاورہ میں یوں کہیں گے کہ " قلب و جگر خاک کردے - قلب جگر کو خاکستر کردے" لیکن ترکیب اضافی کے ساتھ اسوقت تک مفہوم پورا نہیں ہوسکتا جب تک یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ "خاکستر قلب و جگر" کو کیا کردے - یہ شعر یوں ہونا چاہئے

زمانہ ہوچکا ہے طور کا ماحول افسردہ ۔۔۔ خدارا پھر اُسے معمورہ برق و شرر کردے

صفحہ ۹۴:

کلیسا میں بھی مجھ کو موقع تکمیل نا ہے ۔۔۔ مجھے محراب کعبہ میں بھی اذن بت پرستی ہے

(موقع) کا لفظ کتنا بے موقعہ استعمال کیا گیا ہے - بجائے اس کے (فرصت) ہونا چاہئے تھا - جو (اذن) کی رعایت سے بھی یہاں حد درجہ موزوں ہے -

صفحہ ۹۵ - نظم "کسی کی یاد میں"

دور صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو ۔۔۔ اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھ کو

دوسرا مصرعہ بہ لحاظ محاورہ انداز و بیان صحیح نہیں - پہلے مصرعہ کی ترکیب الفاظ کا تقاضہ یہ تھا کہ مفہوم اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ اب اگر کبھی مسرت ہوتی بھی ہے تو بہت کم یا جلد فنا ہوجانے والی لفظ (کم) تعداد و کیفیت دونوں کے لئے مستعمل ہے لیکن اس مصرعہ میں یہ لفظ (کیفیت) ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے - اور تعداد کا مفہوم لفظ (کبھی) سے پورا ہوتا ہے - اس لئے میری رائے میں شعر یوں ہونا چاہئے تھا :-

دور صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو ۔۔۔ کہ مسرت کبھی ہوتی ہے تو کم کم مجھ کو

اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے :-

ہم نفس فکر خوشی کیا جو بہار آئی ہے ۔۔۔ زندگی میں ہے فقط فرصت ماتم مجھ کو

لیکن پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں آمد بہار کے خلاف یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ :-

ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گلریز

اس نظم کا دوسرا بند پورا اصلاح طلب ہے پہلا شعر ملاحظہ ہو :-

باغباں نظم غلط سے ہے پریشان ہنوز ۔۔۔ آشیانوں میں گلوں کا نہیں سامان ہنوز

معلوم نہیں (نظم غلط) کس مفہوم کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے علاوہ اس کے باغبان کی پریشانی اور آشیانوں کا سامانِ سکون سے خالی ہونا۔ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں۔

دوسرا شعر ہے :۔

پتہ پتہ سے ہے طاری وہی ہیبت اب تک ذرہ ذرہ میں بپا ہے وہی طوفان ہنوز

پہلے مصرعہ میں بجائے (سے سے) (پہ) چاہئے اور دوسرے میں بجائے (میں) مے (سے)۔

تیسرا اور چوتھا شعر ملاحظہ ہو :۔

منزل اک قافلۂ نو سے پریشاں ہے ابھی قافلہ ندرتِ منزل سے ہے حیران ہنوز

عظمت رفتہ کے آثار کہاں ہیں پیدا غلطی خیز فضائیں ہیں پشیمان ہنوز

نہ ایک مصرعہ کا رابط دوسرے مصرعہ سے پایا جاتا ہے اور نہ ایک شعر دوسرے سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کا تعلق نظم کے عنوان یا سیاق و سباق سے کیا ہے۔ (قافلۂ نو) سے کیا مراد ہے، پھر منزل کا اس سے پریشان ہو جانا اور قافلہ کا ندرتِ منزل دیکھ کر حیران رہجانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں عظمتِ رفتہ سے کس طرف اشارہ ہے اور غلطی خیز فضاؤں کی پشیمانی سے کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

پانچواں شعر یہ ہے :۔

ایک بھولی ہوئی امید بر آئی ہے مگر دل افسردہ میں باقی ہیں کچھ ارمان ہنوز

پھر بند اس شعر پر ختم کیا گیا ہے :۔

کہیں گل ہے، کہیں کلچیں ہے کہیں مالی ہے ابھی صدر چمنستاں کی جگہ خالی ہے

اول تو (بھولی ہوئی اُمید) کے متعلق یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وہ (یاد آئی ہے) نہ یہ کہ (بر آئی ہے) علی الخصوص اسوقت جبکہ اگلے شعر میں یہ کہکر (ابھی صدر چمنستاں کی جگہ خالی ہے) تکمیل آرزو کی طرف اس کی حسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "کہیں کلچیں ہے کہیں مالی ہے" لکھا ہے، حالانکہ گلچیں، باغباں اور مالی سب ایک ہی چیز ہیں۔

صفحہ ۹۷ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "اے چراغِ صبح سن" جو شاعر کی گزشتہ حسرتناک زندگی کا مرثیہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظم کیفیات سے لبریز ہے لیکن افسوس ہے کہ غلطیوں سے یہ بھی خالی نہیں۔

ایک بند میں اردو کی خوش کامی اور اپنی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

سرد ہے وہ انجمن جو تھی حق و باطل فروش ۔۔۔ لیگئے حصہ لقدر ذوق وقسمت دل فروش
عیشِ منزل ہے رہین ظلمت و بے رونقی ۔۔۔ ہو گیا نظروں سے پوشیدہ مہ منزل فروش
کون ہے اب کس سے سودائے محبت کیجئے ۔۔۔ آہ ، باقی ہے وہ محفل اور نہ وہ محفل فروش
جنس من صرف حریفاں شد خریداری کجا ۔۔۔ یوسفم ہمراہ گرگاں، گرم بازاری کجا

سیماب صاحب فارسی ترکیبوں کے استعمال میں اکثر جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور الفاظ و ترکیب کی ظاہری خوشنمائی سے اسقدر متاثر ہوجاتے ہیں کہ مفہوم کی طرف ان کی نگاہ جاتی ہی نہیں۔ پہلے شعر میں انجمن کی صفت (حق و باطل فروش) ظاہر کی ہے - فروختن یا فروشیدن کے معنے بیچنے کے ہیں اور فارسی میں ظاہر کرنے کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے - میرزا صائب کا شعر ہے :۔

ساکنان حرم از قبلہ نما آزادند ۔۔۔ رہنمائی بہ من ای خضر بیاباں مفروش

ظاہر ہے کہ (حق و باطل فروش) یہاں بھی اسی دوسرے معنے میں استعمال ہوا ہے اور مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہوسکتا ہے کہ "وہ انجمن جو حق و باطل کی ظاہر کردینے والی تھی اب سرد ہے" لیکن شاعر نے قبل و بعد، دستور انجمن کی جو کیفیت ظاہر کی ہے وہ یہ ہے کہ اغیار و حریف تو کامیاب ہوگئے لیکن وہ ناکام رہا - اس لئے اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ نکلیگا کہ شاعر کا دعوائے محبت باطل تھا اور اغیار کا حق، حالانکہ ٹیپ کے شعر میں وہ انھیں (گرگ) ظاہر کرکے اُن کے باطل ہونے کو ثابت کرتا ہے - یہ ہے وہ تضادِ معنوی جو اکثر فارسی ترکیبوں کے دلدادہ شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے - اسی طرح دوسرے مصرعہ میں اپنے حریفوں کو شاعر نے "دل فروش" ظاہر کیا ہے جو شاید اس کے نزدیک بڑی چیز ہے، درانحالیکہ ایک عاشق کا پہلا کام یہی ہوتا ہے۔

دوسرے شعر کا معنوی نقص ملاحظہ ہو :۔

پہلے مصرعہ میں تو یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف عیش منزل مفقود ہے اور دوسرے مصرعہ میں "مہ منزل فروش" کی پوشیدگی دکھا کر، منزل ہی کو غائب کردیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے (عیشِ منزل) کا رہینِ ظلمت و بے رونقی ہونا صحیح نہیں - منزل کو بے رونق کہہ سکتے ہیں نہ کہ (عیش) کو ---- "شاعر امروز" کے عنوان سے ایک نظم صفحہ ۱۱۰ پر نظر آتی ہے - اس میں سیماب صاحب شعراء موجودہ کو مخاطب کرکے دریافت فرماتے ہیں۔

حشر اُٹھایا ہے کبھی اک نغمۂ بیتاب سے ۔۔۔ کیا رباب دل کو چھیڑا ہے کبھی مضراب سے

کیا کسی کا دل پسیجا ہے ترے انکار سے — کیا کبھی شعلے تراشے ہیں لب گفتار سے

پہلے شعر میں لفظ (اک) زاید ہے اور (رباب دل) کے چھیڑنے کے لئے مضراب بھی کوئی خاص ہونا چاہئے مثلاً مضرابِ احساس، مضرابِ تاثر، محض مضراب بالکل غلط ہے۔

دوسرے شعر میں لب گفتار سے شعلہ تراشنے کی بدعت بھی پسندیدہ نہیں۔ لب سے شعلوں کی تراوش ہو سکتی ہے لیکن تراشنا لبوں کا کام نہیں۔ آگے چلکر چند سوال اور کرتے ہیں:—

کیا میسر ہیں تجھے انگڑائیاں تخییل کی — کیا صدا تو نے سنی ہے شہپرِ جبریل کی
شام کی تصویر کھینچی ہے سحر کے نور سے — تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے
لرزشِ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا — طرح کا مصرعہ کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا
پردۂ اسرار کی محرم ہے کیا تیری نگاہ — کیا نظر آتی ہے ہر ذرہ میں تجھ کو ایک راہ

پہلے شعر میں "تخییل کی انگڑائیاں" بالکل بے معنی بات ہے اور دوسرے مصرعہ سے پہلے مصرعہ کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اگر دونوں کے باہم مربوط ہونے پر اصرار کیا جائے تو پھر معنے یہ ہوں گے کہ تخییل کی انگڑائیوں کو شاعر نے شہپرِ جبریل کی صدا سے تعبیر کیا ہے، درانحالیکہ بالِ جبریل سے پیدا ہونے والی آواز کو تخییل کی انگڑائی کہنا حقیقتاً اس کی توہین ہے

دوسرے شعر کے بھی دونوں مصرعے دولخت ہیں علاوہ اس کے شاعر کے اصل مدعا سے بھی یہ شعر بالکل الگ ہے۔ سحر کے نور سے شام کی تصویر کھینچنا تو کوئی قابل فخر بات نہیں، البتہ اگر سوادِ شام سے سحر کا نور پیدا کیا جائے تو بیشک یہ ایک کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کافور سے بوئے کفن کا احساس بھی کسی ذہنی علو یا جذباتی ارتقا کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ ایک متشائم کیفیت کا اظہار ہے جس کو سیاب صاحب پسند نہیں کرتے۔

تیسرے شعر میں لفظ (طرح) بالکل بیکار ہے اور اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی —— یہ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا:—

مصرع تر بھی کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا — یا — مصرع تازہ کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا

شبنم اور پھول کی رعایت سے مصرع تر یا مصرعۂ تازہ زیادہ موزوں ہے۔

چوتھے شعر میں دریافت فرماتے ہیں کہ "کیا ہر ذرہ میں تجھ کو ایک راہ نظر آتی ہے" حالانکہ (ذرہ میں) کوئی راہ نظر نہیں آسکتی البتہ وہ کسی راہ کی طرف رہنمائی ضرور کر سکتا ہے —— یہ مصرعہ یوں ہونا

چاہیئے :- کیا نظر آئے ہیں ذروں میں کبھی خورشید داہ

اسی نظم میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

میں تر ستے پھپکے ہوئے جذبات کا قایل نہیں

(پھپکنا) درختوں کے نشو و نما کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جسم پر آبلے وغیرہ پڑ جاتے ہیں تو اسوقت بھی (چپکنا) بولتے ہیں، لیکن جذبات کے ساتھ اس کا استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ علاوہ اس کے معنًا یہ نقص ہے کہ اگر "شاعر امروز" کے جذبات واقعی اتنے گرم ہیں کہ وہ پھپک اُٹھے ہیں تو یہ دلیل گرمی جذبات کی ہے نہ کہ ان کی افسردگی کی، اور اس صورت میں "شاعر امروز" پر الزام کیا عاید ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۱۲۲ — نظم "آئینۂ افق"۔

کیا خبر سینے میں پیوست ہیں کتنے نشتر خون رستا نظر آتا ہے رگ جاں سے مجھے

پہلے مصرعہ کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ بہت سے نشتر سینے میں پیوست ہیں، لیکن دوسرے مصرعہ میں اسکا نتیجہ صرف خون کا رِسنا ظاہر کیا ہے۔ اس صورت میں خون برسنا چاہئے یا اس کو بہ نکلنا چاہئے۔

پھول سے ملتی ہے اک تلخ شراب انجام پھانس ہوتی ہے عطا خار بیاباں سے مجھے

پہلا مصرعہ بالکل بے معنی ہے اور پھول سے انجام کی تلخ شراب کا ملنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ دوسرے مصرعہ سے بھی کوئی خاص معنی پیدا نہیں کئے گئے، خار بیاباں سے پھانس عطا نہ ہوگی تو کیا پھولوں کی سیج ملے گی۔

اسی نظم کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

بیخودی میں جو کبھی میں نے جھکالیں نظریں موت نے چھیڑ دیا گور غریباں سے مجھے
رات کا ایک وہ حصہ جو سحر تک ہو سیاہ ایک انبار اندھیرے کا مہیب و ویراں
زندگی کی نہیں ضو ریز کہیں چنگاری صرف ہے راکھ کا اک ڈھیر فضا میں لرزاں

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کیا مفہوم ظاہر کرنا چاہا ہے۔ ہر لفظ دوسرے سے علٰحدہ ہے اور (چھیڑ دینے) کا محاورہ یہاں بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ مہمل ہے اور "اندھیرے کا انبار" بھی نہایت ناگوار بدعت ہے۔ تیسرے شعر میں راکھ کے ڈھیر کو فضا میں لرزاں دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ خود لفظ (ڈھیر) اس کا مقتضی ہے کہ اس کو ایک جگہ قایم و غیر لرزاں دکھایا جائے۔

اس کے بعد ایک نظم "نقص ہستی" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے نقائص بھی دیکھ لیجئے:۔

اس نظم میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قدرت نے انسان کو فانی بنایا، درانحالیکہ انسان کی خواہش یہ ہے کہ وہ فانی نہ ہو، اور اسی کے ساتھ خدا یا فطرت کو مخاطب کر کے یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ اگر انسان کی اس خواہش کو پورا کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ "خالق ہستی" کو مخاطب کر کے شاعر دریافت کرتا ہے کہ:۔

حریص اسدرجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیق انساں پر ۔۔۔ نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی

پہلے مصرعہ میں لفظ (حریص) اور (اسدرجہ) دونوں بے محل استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اس شعر سے پہلے فطرت کی شدتِ حرص تخلیق ظاہر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں (ہوس اسکو) کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ نشاطِ زندگانی کی ہوس انسان کو ہے نہ کہ فطرت کو اس لئے میری رائے میں یہ شعر یوں ہونا چاہئے:۔

ضرورت کیا تھی فطرت کو کہ وہ پیدا کرے انساں ۔۔۔ نہ تھی جب قدر خود اسکو نشاطِ زندگانی کی

اس بند میں ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو:۔

جو ندرت آشنائے جرعۂ آبِ بقا کر دی ۔۔۔ ز یک جامِ بقا لب تشنۂ صد میکدہ کر دی

پہلے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جرعۂ آبِ بقا مل گیا، درانحالیکہ اس سے قبل اسکے فانی ہونے پر سر دھنا جا رہا تھا۔ دوسرے مصرعہ سے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا اور بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ جامِ بقا پانے کے بعد انسان (لب تشنۂ صد میکدہ) کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر بے نیازِ میکدہ کہا جاتا تو خیر ایک بات تھی۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے:۔

مرا تا آشنائے جرعۂ آبِ بقا کر دی ۔۔۔ چرا کر دی کہ زیں مو تشنۂ صد میکدہ کر دی

دوسرے بند کے دوسرے شعر میں یہ خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ:۔

مجسم ہو کے لیتے بار یابی تیری محفل میں

لیکن چوتھے شعر میں جسمانیت کو غائب کر کے اظہار خیال یوں کیا جاتا ہے کہ۔

ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آ جاتے

تیسرے بند کا ایک شعر ہے:۔

زمیں پر عرش سے آنا زمیں سے قبر تک جانا ۔۔۔ یقیناً موت بعد موت ہستی بعد ہستی ہے

زمیں پر عرش سے آنا موت نہیں ہے کہ زمیں سے قبر تک جانا (موتِ بعد موت) کہا جائے۔ ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو:۔

شکایت نقص ہستی می کند عزم تلافی کن ۔۔۔ قوانین فنا را جذب الطاف اضافی کن

فارسیت کے لحاظ سے تو خیر یہ شعر جتنا گرا ہوا ہے محتاج بیان نہیں لیکن معنوی حیثیت سے بھی اسکا دوسرا مصرعہ مہمل ہے اور (الطافِ اضافی) بالکل بے معنی ترکیب ہے۔

(باقی)

مکتوبات نیاز

شفیق محترم ۔ پرسوں گرامی نامہ ملا۔ اور ہرچند آپ نے اس کا جواب بہ واپسی ڈاک طلب فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت سے پہلے مجھے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی ۔ معذرت خواہ ہوں۔

غالباً اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ جس حد تک سوال صرف تعمیل ارشاد کا ہے ، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے ، لیکن اگر بحث مصلحت اور طلب رائے کی آپڑی تو یقیناً اس باب میں آپ مجھے اپنا ہمنوا نہ پائیں گے۔

آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ دنیا میں آہن کا جواب آہن ہی سے دیا جا سکتا ہے میں خود علاج بالمثل کا بڑا حامی ہوں ۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ فطرت خود کسی خاص اُصول کی پابند نہیں ہے اور اس لئے ابنائے فطرت کے سامنے کبھی کبھی ایسی صورتیں آجاتی ہیں کہ جی تو چاہتا ہے تلوار کھینچکر سامنے آجائے کر لیکن کار برآری ہوتی ہے سپر ڈالدینے سے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ کو جو تکلیف پہونچائی گئی ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ انتقام لیا جائے ، اور میں بھی یہی چاہتا ہوں ، فرق یہ ہے کہ آپ انتقام لینا چاہتے ہیں اُسی ادنیٰ سطح پر آکر جو حریف نے اختیار کی تھی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بلندی فطرت سے ایک انچ نیچے نہ اُتریں۔

آپ کے احساس خودداری کو جو صدمہ پہونچایا گیا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے کے وقار نفس کا خون کر دیا جائے ۔ لیکن جب اس کا ضمیر ہی مُردہ ہو تو کیا صرف جسمانی آزار یا صعوبت قید و بند سے تلافی ممکن ہے ۔

لیکن اگر اس کے بعد بھی آپ کو اصرار ہو تو میں تعمیل فرمان کے لئے طیار ہوں ۔ مسودہ بھجوا دیجئے میں کسی ہوشیار وکیل سے مشورہ کر کے استغاثہ دائر کرا دوں گا۔

اللہ اللہ ، آپ اپنا شمار بھی ان لوگوں میں کرتے ہیں کہ " دآئیں تو جلاسئے نہ بنے " کیوں پاگل ہوئے ہو ۔ کیوں تماشہ بننا چاہتے ہو ــــ وہ منظر کبھی دیکھا ہے جب کشاں کشاں جانور کو ذبح

کی طرف لیجاتے ہیں ـــــــ بس سمجھ لو کہ یہی حشر تمھارا ہونا ہے۔

اس لئے اگر خیریت چاہتے ہو، تو بے چون و چرا، چپکے کان دبائے ہوئے کل ٹھیک ۷ بجے شام کو یہاں پہونچ جاؤ ورنہ

تو دانی خرقۂ پشمینہ داری

خط لکیا، " واسوخت " ملی - تم پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔ غصہ اس لئے کہ میرا کہنا تم نے نہ سنا، اور وہاں کی آمد و رفت ترک نہ کی - رحم اس لئے کہ جن نگاہوں کا یہ عالم ہو

کہ اندرون حرم می زنند قافلہ را

ان کے نزدیک تمھاری حقیقت ہی کیا ہے اور جو تباہیاں بھی تم پر نازل کریں کم ہیں۔ میں نے پہلے ہی تم کو سمجھا دیا تھا کہ انسان بعض اوقات خود اپنی صداقت سے بھی دھوکا کھاجاتا ہے اور آخر کار وہی ہوا ـــ تم کو اپنے خلوص پر اعتماد، اُدھر نمائش بے تعلقی میں محبت کا رنگ ــ تم کیا کوئی فرشتہ ہوتا تو وہ بھی اپنی جان سلامت نہ لے آتا ـــ ہاروت و ماروت کی مثال سامنے موجود ہی ہے، اس لئے اب یہ شور و واویلا کیسا؟

محبت میں دل کی سب سے بڑی قربانی یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اندمالِ جراحت بھی نہیں چاہتا۔

نخورد زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد

ہوش میں آؤ، اب بچے نہیں ہو نام خدا جوانی آئی ہے اور دیوانہ وار آئی ہے، تمھارا دل خون نہ ہوگا تو کیا تمھارے دشمنوں کا ہوگا۔

اب کہ ہاتھ پاؤں کانٹوں سے مجروح ہیں میں بھی یاد آرہا ہوں، وطن کی یاد بھی ستا رہی ہے ـــ لیکن جب پھولوں کی سیج پر ہوگے تو میں کیا خدا بھی یاد نہ آئے گا۔

کیوں گھبراتے ہو، بادل آئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے، آج زیادہ نہ روئے تو کل زیادہ ہنسو گے کیونکر

استغفراللہ، تم نے بھی عجیب مذاق کیا ـــ کل آپ کا خط لیکر وہ تشریف لائے اور اس تکلف و تصنع کے ساتھ کہ اب کیا کہوں ـــ

آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار، ہونٹوں پر دکھے کی بہار، گالوں پر غازہ، ابروؤں پر وسمہ، پنڈلیوں میں چھپا ہوا تنگ پاجامہ، پاؤں میں وصلی کا زرکار جوتہ، تنزیب کی تنگ اچکن، نیچے جامدانی کے کرتہ کی پھبن بس یوں سمجھ لو

برنشِش پیراہنِ گل تنگ بود

بیٹھتے ہی کلام کی فرمایش کی، مدعا یہ تھا کہ میں فرمایش کروں۔ بس پھر کیا تھا، یوں سمجھ لو کہ ۶ بجے شام سے آدھی رات تک جسمانی و روحانی کوئی اذیت ایسی نہ تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو۔ اخلاقاً پہلے تو دو چار غزلوں کی داد بھی دے دی، لیکن اس کے بعد جب زبان نے یارا نہ دیا تو خاموش ہو گیا، لیکن وہاں تو یہ عالم تھا گویا سیلاب ہے بند ٹوٹ گیا ہے اور دنیا کی کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی۔

خدا خدا کر کے جب بارہ بجے یہ دورہ ختم ہوا تو فرماتے کیا ہیں اجازت ہو تو صبح پھر حاضر ہوں۔ میں نے کہا کیوں آپ کا گھر ہے جب مزاج میں آئے تشریف لائیے، لیکن کل صبح میں ایک نہایت ضروری کام سے آگرہ جا رہا ہوں ۔ فرمانے لگے، خیر کوئی حرج نہیں میں صبح حاضری ضرور دوں گا کیونکہ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ سفر ملتوی ہو جائے ۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں ۔ میں اُن کے جانے کے بعد ہی فوراً اسٹیشن چلا آیا اور یہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں ۔ دیکھوں کب تک خارج البلد رہنا پڑتا ہے۔ خدا کے لئے کچھ بتاؤ کہ یہ کون ہیں، کیا ہیں اور تمھارے پاس کیونکر پہونچ گئے کہ یہ بلا تم نے میرے سر پر مسلط کر دی۔

معاطی الاعز،

اس میں شک نہیں کہ آپ سے زیادہ محبت کرنے والا مجھے اور کوئی نہیں مل سکتا، یہ بھی درست ہے کہ دنیا کی ہر آسایش میرے لئے آپ کے یہاں مہیا تھی اور قولاً و فعلاً ہر قسم کی آزادی مجھے میسر ۔ لیکن اب کیا کہوں کہ مجھے وہاں کیا وحشت تھی اور میرے لئے وہاں ٹھہرنا کیوں دشوار ہو گیا ۔ آہ،

کس چہ می داند کہ در بزم تو غمنا کم چرا

آقائے محترم،

دُنیا میں ظلم و ستم کی تباہکاریاں اتنی شدید نہیں ہیں، جتنی لطف و کرم کی ہیں ۔ اس کے انتقام کے لئے تو آستینیں چڑھائی جا سکتی ہیں، لیکن اس کا علاج سوائے سر جھکا کر خاموش رہ جانے کے اور کچھ نہیں ۔ پھر

غور فرمائیے کہ میں کب تک اپنے دل کا خون کرتا رہتا اور آپ کو کیونکر سمجھا سکتا کہ مجھ میں اب تاب تحمل باقی نہیں۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی تھی جو بالکل میرے ضمیر کے خلاف آپ کا دل دُکھانے پر مجبور کر رہی تھی اور اگر شاید دو دن اور میں وہاں رہجاتا، تو آج آپ کو منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا۔

بہرحال آپ کا ممنون احسان ہوں اور جب تک زندہ ہوں اس کا اعتراف کرتا رہوں گا۔ لیکن اب آپکے پاس آکر قیام کرنا بالکل ناممکن ہے۔ امید ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل پر آپ مجھے مجبور نہ کریں گے، کیونکہ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ میں بالکل خاموش ہوجاؤنگا اور پھر آپ کو اور زیادہ شکایت پیدا ہوجائے گی۔ خدا حافظ

بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

نام کتاب		اصلی قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
نگارستان	(نیاز فتحپوری)	عا ر	عہ ر	فراست التحریر	عہ ر	۸ ر
جمالستان	(نیاز فتحپوری)	للعہ ر	سے ر	شاعر کا انجام (نیاز فتحپوری)	۱۰ ر	۸ ر
ترغیبات جنسی	(نیاز فتحپوری)	سے ر	عا ر	فلسفۂ مذہب	عہ ر	۸ ر
مجموعۂ استفسار و جواب	(نیاز فتحپوری)	سے ر	عا ر	لالہ رخ	عہ ر	۱۲ ر
حکایات ہم کے ساتھ چند گھنٹے	(نیاز فتحپوری)	عہ ر	۸ ر	مثنوی زہر عشق معہ تصاویر و مقدمہ	عہ ر	عہ ر
مذاکرات نیاز	(نیاز فتحپوری)	۱۲ ر	۶ ر	فلسفۂ شوپنہار	عہ ر	عہ ر
جذبات بھاشا	(نیاز فتحپوری)	۱۲ ر	۶ ر	منچلے	۸ ر	۴ ر
فراست الید	نیاز فتحپوری)	عہ ر	۸ ر	گلافی اردو	۶ ر	۴

(۱) محصولڈاک ذمۂ خریدار ہوگا لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصولڈاک بھی نہیں لیا جائے گا

(۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہیئے۔

(۳) یہ رعایتی قیمت صرف اخیر جون ۳۵ء تک ہے، اسکے بعد شاید اس سے فایدہ اُٹھانے کا موقعہ نہ رہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

لکھنؤ کی داستان گوئی

دنیا میں کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں علم وادب اور تہذیب زبان کی ترقی محاکات اور قصص سے نہوئی ہو اسی لئے مہذب ملک میں آپ کو محاکات کے پرستار ملیں گے اور جس ملک کے جسقدر اقتدار وسیع ہونگے اسیقدر اس کے قصص و حکایات میں ترقی نظر آئے گی۔ بات یہ ہے کہ علم ادب قصص اور محاکات ہی سے ترقی پاتا ہے اور جب کسی ملک میں تمدن پیدا کرنا ہوتا ہے تو ملک کے نامور لوگ دوسری زبان اور دوسرے ملک کے قصے اپنی زبان میں ترجمہ کرکے ملک کو متمدن بناتے ہیں۔

ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج کب سے ہوا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ناچ گانے ستار اور مردنگ کا رواج کتھا میں بھی بہت ہو گیا تھا اور ہندوؤں کی عورتیں بھی کتھا میں شامل ہوتی تھیں لیکن اہل اسلام کی کوئی سوسائٹی کوئی تماشہ گاہ شہر میں ایسا نہ تھا جہاں وہ بیٹھ کر دل بہلائیں علاوہ اس کے بھاکا زبان سے ان کو دلچسپی بھی نہ تھی اس لئے صرف عورتوں کا مجمع دیکھ کر وہ بھی چلے جاتے تھے، اس بات کو فیضی نے محسوس کیا اور ایک طویل داستان اہل اسلام کی فارسی میں لکھی جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی؛ اسی سلسلہ میں فیضی نے بھی داستانیں لکھنا شروع کیں اور سب سے اخیر میں میر محمد تقی خیال نے کتاب بوستان خیال سات جلدوں میں تصنیف کی جس کی قبولیت کا حال سب کو معلوم ہے۔ جب اُردو زیادہ رائج ہوئی تو سب سے پہلے فیضی کی تصنیف داستان امیر حمزہ اُردو میں ترجمہ ہوئی اس کے بعد بوستان خیال کا ترجمہ خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان دہلوی نے کیا۔

سب سے پہلے مرزا طوسی نے داستان گوئی کے فن میں اصلاح کی اور جو غیر فصیح الفاظ داستان گوؤں کی زبان پر جاری تھے ان کو نکالا۔ لکھنؤ میں سب سے زیادہ مشہور داستان گو بڑے منشی (میر فدا علی) تھے جو اشعار کا استعمال کثرت سے کرتے تھے اس کے بعد چھوٹے منشی نے خوب نام پیدا کیا۔

نواب ہادی علی خاں شہزادہ نیشاپوری بھی نہایت اچھے داستان گو تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ فصیح و بلیغ داستان کہنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔

امیر خاں وزیر باغ کی کوٹھی میں بارہ برس شہزادہ ایرج کا حال سنایا کرتے تھے ہر بدھ کو ان کی داستان ہوا کرتی تھی۔ حیدری کے امامباڑہ میں بھی ہمیشہ داستان سنائی جاتی تھی۔ ایک نواب صاحب تھے چہرے کا بنوائے ہوئے آتے تھے اور نواب آغا حیدر افسوس آغا میر کی ڈیوڑھی پر داستان سنایا کرتے تھے سنا ہے کہ لکھنؤ میں کوئی شخص امبکا پرشاد کایستھ تھے، ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کے داستان گویوں میں ملازم تھے اور نواب کلب علی خاں عرش آشیاں کے عہد تک ملازم رہے، ایک مرتبہ کسی طلسم کا بیان ختم کئے بغیر نواب صاحب سے چھ مہینے کی رخصت لیکر لکھنؤ چلے آئے بعد ختم رخصت جب حاضر دربار ہوئے تو اسی جگہ سے بیان کرنا شروع کیا جہاں سے چھوڑ گئے تھے اس پر نواب صاحب نے بہت تعجب فرمایا اور ان کی یادداشت کی بہت تعریف کی۔ ان سب داستان گویوں میں رسالدار نواب محمد حسین خاں وثیقہ دار خاص مرتبہ کے تھے یہ نیشاپوری خاندان سے تھے اور پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے، نواب شیش محل کے دربار میں ہمیشہ داستان کہا کرتے تھے ان کی شہرت سنکر نواب بہرام الدولہ نے ایک مرتبہ حیدرآباد میں طلب فرمایا تھا۔ حضرت پندرہ روز وہاں قیام کیا اور ایک طلسم سنا کر چلے آئے وہاں ان کا دل نہ لگا کہتے تھے کہ داستان کی تعریف کرنے والے ایسے کہیں نہیں ہیں جیسے لکھنؤ میں۔ پھر رامپور طلب کئے گئے اور وہاں بھی کچھ دنوں قیام کرکے چلے آئے۔ ان کے بعد ان کے ایک شاگرد تھے مولوی احمد حسن ساکن وزیر گنج یہ بھی اچھی داستان سناتے خصوصاً مختار نامہ بہت اچھا بیان کرتے تھے۔ عہد شاہی کے بعد جب داستان گو کم ہو گئے تو منشی نولکشور نے ان داستانوں کو چھپوانے کی کوشش فرمائی اور اسی کام کے لئے منشی محمد حسین جاہ کو تجویز کیا یہ بڑے منشی میر فدا علی کے شاگرد تھے، ان کے پاس داستانوں کی بہت سی جلدیں قلمی محفوظ تھیں۔

ہوش ربا کی پہلی دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں جلد کا پہلا حصہ لکھا تھا کہ منشی صاحب سے معاوضہ کے متعلق کچھ جھگڑا پیدا ہوا، آخر ملازمت ترک کرکے منشی گلاب سنگھ لاہوری کے کارخانہ میں چلے آئے۔ منشی گلاب سنگھ کا مطبع اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھا مگر وہ اتنی بڑی کتاب فوراً نہیں چھپوا سکتے تھے اسلئے منشی گلاب سنگھ نے پہلے ایک مختصر ٹکڑا ہوش ربا کا چھاپا اور پھر منشی احمد حسین قمر لکھنوی نے دوسری جلد حصۂ پنجم لکھی، جسے منشی صاحب نے فوراً شایع کر دیا ملک تو اس کا منتظر تھا ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ پھر ہوش ربا کی باقی جلدیں جلد جلد چھپنے لگیں، لوگ کہتے ہیں کہ منشی قمر سے زیادہ کوئی زود نویس داستان گو نہ تھا۔

اب یہ بحث آپڑی کہ منشی محمد حسین جاہ اچھی داستان لکھتے ہیں یا منشی احمد حسین قمر اس کا فیصلہ ملک نے اس طرح کیا کہ منشی محمد حسین جاہ بزم اچھی لکھتے ہیں اور منشی احمد حسین قمر رزم بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک اور بھی داستان گو تھے ان کا نام تھا امیر خاں ان سے بڑھ کے عیاری کوئی نہ بیان کرتا تھا، لیکن وہ منشی صاحب کے یہاں نہیں گئے اور ان کو ناز تھا کہ ہماری عیاریاں اس حسن وخوبی سے کوئی نہیں لکھ سکتا داستانوں میں عمر عیار کی جتنی عیاریاں ہیں سب امیر خاں کے بیان کا چربہ ہیں لوگ کہتے ہیں کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے نواب صاحب رام پور کے ارشاد سے ایک داستان کہی تھی جس کا نام شگوفۂ الفت تھا یہ کتاب مطبع نامی لکھنؤ میں چھپی تھی اس میں طلسم اچھا باندھا تھا منشی اسمٰعیل منیر نے بھی ایک داستان نواب صاحب رام پور کے حکم سے لکھی تھی جس میں رزم بزم دونوں خوب تھیں مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے دربار میں حکیم میر ضامن علی جلال کے والد حکیم سید اصغر علی داستان گوئی کے عہدے پر ملازم تھے اور بعد ان کے نواب کلب علی خاں کی سرکار میں اسی عہدہ پر ملازم رہے۔

منشی احمد حسین قمر نے ہوش ربا کی جلدیں ختم کرکے صندلی نامہ شروع کیا یہ ہوش ربا کے بعد کا طلسم ہے اسمیں شہر فرعونیہ کی تباہی، لقا کی گرفتاری اور باغ ارم کی سیر خوب لکھی ہے اس کے بعد تورج نامہ کا سلسلہ قایم کیا جس میں امیر کی نقاب دار سے کشتی اور اسی حالت میں دونوں کی بیہوشی طلسموں کی لڑائیاں دیو اور جادوگروں کی چوٹیں درج ہیں۔ پھر دوسری جلد تورج نامہ کی لکھی ہے اس میں رستم ثانی فرزند ایرج کی داستان ہے۔ آٹھواں دفتر لعل نامہ ہے یہ دو جلدوں میں ہے جلد اول میں متفرق داستان ہے جلد دوم میں صاحبقراں کی روانگی طلسم خونخوار کی طرف بیان کی ہے، اس کے بعد منشی احمد حسین قمر نے طلسم خیال سکندری اور ہفت پیکر فتنہ نور افشاں کی جلدیں ختم کرکے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد شیخ تصدق حسین داستان گو نے جو ایک جاہل آدمی تھے داستان میں ایک نئی روش نکالی ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ یہ کاتبوں سے داستان لکھواتے تھے اور مطبع منشی نولکشور کو دیتے تھے ان کے یہاں عبارت آرائی اور چہرہ پردازی کم تھی اور جابجا جو داستان گو اشعار برجستہ ملاتے ہیں انکا لطف بھی کم تھا مگر کاتب اپنے اُستاد کی غزلیں شامل کرکرکے کچھ لطف پیدا کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب بھاولپور نے ان کو بلوایا تھا اور داستان سُنکر بہت محظوظ ہوئے لیکن زاید قیام نہوا انعام اکرام لیکر چلے آئے تھے منشی قمر کے بعد انھوں نے داستان لکھنے کا سلسلہ قایم کیا اور طلسم آفتاب شجاعت لکھا۔ آفتاب شجاعت ختم کرکے شیخ تصدق حسین نے گلستان باختر کی داستان لکھی اور طلسم نوخیز جمشید تین جلدوں میں

پورا کیا اس کے بعد طلسم خیال سکندری کی تین جلدیں لکھیں۔ اس کے بعد طلسم زعفران زار سلیمانی لکھا۔ اتنی کتابیں لکھنے کے بعد شیخ تصدق حسین کا بھی انتقال ہوگیا۔ منشی قمر اور شیخ تصدق حسین نے اسقدر داستانیں لکھی ہیں کہ ہندوستان میں کسی داستان گو نے نہیں لکھیں۔

لکھنؤ کے تمام داستان کہنے والے افیون کا استعمال بہت کرتے تھے اور اسی کے سرور میں داستانیں کہا کرتے تھے۔ اب لکھنؤ میں ایک شخص ٹوٹے مارے، افیونیوں کا نام زندہ رکھنے والے عید کی ٹڑ کی رونق مرزا ہلمن باقی رہ گئے ہیں، دن بھر کا مدانی بناتے ہیں اس میں جو پیسے ملتے ہیں افیون کی نذر ہو جاتے ہیں بٹیر تیار کرکے بیچ لیتے ہیں، مگر اگلے سال اس پر بھی اوس پڑگئی دو تین بٹیر بھاگ گئے ایک کی ٹانگ چوہے نے کاٹ لی وہ مرگیا، پارچہ والی گلی سے دوپلی ٹوپی چکن کی چار آنے کو مول لیکر اسے کفن دیا کمپنی باغ میں دفن کرنے چلے تھے کہ پولیس نے گرفتار کر کے دفعہ ۱۴۴ قائم کی بیچارے نے بہت منت کی سماعت نہ ہوئی اس نے کہا کمپنی باغ کو قبرستان بنا دیا آج تک تو اس میں کوئی قبر نہ تھی۔ یار دوستوں کی کوشش سے رہائی نصیب ہوئی بٹیر کا تیجہ کیا چالیسواں کیا سال بھر سوگوار رہے، مگر زندہ دل ہیں، عید کی ٹڑ میں جاتے ہیں افیون کی ڈبیا اور پیالی کلیجے سے لگائے رکھتے ہیں، ٹڑ میں بھی دو بجے دن سے حقہ کوئیلے تمباکو چلم اور افیون لیکر موتی جھیل سے کچھ فاصلہ پر ڈیرہ خیمہ ڈال دیتے ہیں اور بڑے زناٹے سے داستان شروع کرتے ہیں، کچھ گنے آتے ہیں کچھ میٹھے چاول اسی سے سب افیونیوں کی روزہ کشائی ہوتی ہے، مینڈھے لڑتے ہیں ایک چھوٹا سا میلہ ہوتا ہے مگر بیچارے مرزا ہلمن اپنی بساط کے موافق سب کی مدارات گنڈیریوں سے کرتے ہیں کبھی دو چار پیوندی بیر بھی میسر آگئے تو یہ اور بات ہے داستان شروع ہوتی ہے چہرہ زبردست بیان کرتے ہیں انکسار مزاج میں ایسا ہے کہ جہاں کسی اچھے داستان گو کا نام آتا ہے زور سے اپنے کان اینٹھ کر کہتے ہیں واللہ وہ اُستاد تھے میں ایک ناچیز ہوں انھیں کا نام لیکر کچھ داستان کہہ لیتا ہوں جاہل ہوں میرا ان کا کیا مقابلہ اگر داستان کہنے میں کسی نے جماہی لے لی تو غضب ہوگیا اب انسے داستان نہیں کہی جاتی اور جب تک چہرہ پتے کی افیون گھول کر نہ پی لیں حواس قابو میں نہیں آتے نواب محمد یوسف خاں خلف نواب مرزا ہادی بن نواب رفعت الدولہ بیان کرتے ہیں اب عید کی ٹڑ کیا ہوتی ہے اور مرزا ہلمن کیا چیز ہیں جو داستان کہیں گے بھیا غدر کے وقت تک کچھ داستان گوئی کا چرچا تھا اور عید کی ٹڑ بھی کچھ ہوتی تھی ہمنے ایک زمانہ میں عیش باغ کے میلہ کی رونق دیکھی تھی اور داستان بھی سنی تھی آخری میلہ میں بیس بیس کوس کے داستان گو آتے تھے اور مسجد کے قریب خیمہ میں ٹھہرتے تھے ان کی خاطر مدارات یہاں کے رؤسا کی طرف سے ہوتی تھی چار بجے سب داستان گو اپنی اپنی داستان سناتے تھے اور لوگوں سے داد لیتے تھے۔ حقہ ہر دم بھرا رہتا تھا اور لوگ جمع رہتے تھے دس بجے رات تک اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے ایک مرتبہ نواب ولایت علی خاں نے اپنے ملازم حسین علی داستان گو کو اس میلہ میں بھیجدیا جب سب داستان گو بیان کر چکے تو حسین علی خاں نے اپنی داستان شروع کر دی بس یہ جی چاہتا تھا کہ بیٹھے سنا کرئے، ہنستے ہنستے سب لوٹ گئے۔ اب تو کوئی داستان گو بھی ایسا نظر نہیں آتا۔ —— خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

آخری فیصلہ - مگر!

ہاں، سچ ہے! میں تمھیں دنیا کے ہر گوشہ میں بدنام کیا کرتا ہوں اور تم بیچاری، بے قصور، منہ بند، اناری کلی، مردم آزاری سے بے نیاز، ستم ظریفی، دغابازی اور صحبت آزادی پروائی سے بے بہرہ، "کوہسار" کی حسین وادیوں میں بیٹھی ہوئی ایشور کی مالا جپنے میں ہمہ تن مصروف اور سراپا عبادت بنی رہتی ہو۔

کیوں نہ ہو، اچھوں کے گُن، اچھے ہی ہوتے ہیں اور مجھ جیسے پاپیوں کے تاریک دل اور اُن سے تاریک تر راتیں انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا لینے تک چین نہیں پا سکتیں ـــــ سُنو، یہ ایک سرد رات تھی۔ اس قدر سرد کہ تم اور میں اپنے دبیز لبادوں میں بید کی مانند کانپ رہے تھے۔ ہرشچندر کے کھیت سے متصل، بیری کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایہ میں خاموش ہو جانے والی آگ کی دو ایک چنگاریاں آٹھ آٹھ دس دس لمحوں کے وقفے سے فضا میں رقص کرتی نظر آتی تھیں، پنڈت اپنی کتھا ختم کر کے ہیبت ناک ستار کندھے پر رکھے ہوئے پاس کی جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ کسان اور اُس کے ساتھی، رام اور سیتا کی داستان اپنے وفا شعار سینوں میں محفوظ کر کے سیاہ کمبل کو اپنے نیم عریاں جسم پر سمیٹے ہوئے نظروں سے غائب ہو چکے تھے ـــ اور میں اور تم، فلسفیانہ انداز میں اپنی اپنی خوابگاہ کو واپس ہو گئے۔

دوسری صبح میں بہت سویرے ہی جاگ اُٹھا تھا اور تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد نیم کے خوبصورت جھولے پر بیٹھا ہوا "جمالستان" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ دفعتہً تم، خلافِ عادت وہاں نمودار ہوئیں، اور آنکھیں مل مل کر اور بکھرے ہوئے گیسوؤں کو چہرے سے ہٹا ہٹا کر تبسم کا ایک نوشگفتہ پھول میری گود میں گراتی ہوئی وہاں سے چنبیلی کے جھنڈ کی طرف چل دیں، "جمالستان" میرے پاؤں کی لغزش کے بوسے لے رہی تھی اور میں کسی قدر بلند آواز کے ساتھ ــ

برو ایں دام بر مُرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

پھر ہنستے ہوئے تمھیں تمھارا یہ حسین تحفہ واپس کر دینے کی فکر میں موجودات کے ہر ذرہ پر مستفسرانہ نگاہیں

ڈال رہا تھا ـــــ پھر ایک سہانی شام، جب کہ ہم سیتارام کے "کرشن باغ" میں، پکّی پکّی نارنگیاں اور گدرائے ہوئے آم، درختوں سے گرا گرا کر ٹوکریوں میں جمع کر رہے تھے تم نے یکایک مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہضم کر جانے کی ٹھان لی اور میں چوکڑیاں بھرتا ہوا، نورانی فرشتوں کے آتشیں گرز کی حیات شکن زد سے بہت دور، ناگ بھنی کے اُس پار جا نکلا۔ جاڑوں کی ایک ٹھنڈی دوپہر کو میں عثمان ساگر کے رومان آفریں کنارے مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا میری آہنی گلوں پر موت کا ہیبت ناک رقص تمہارے لئے ناقابلِ برداشت تھا، میرے فلک شگاف قہقہے، تمہارے ہمدردی آمیز دشنام کا جی بھر کے مضحکہ اُڑا رہے تھے۔ عثمان ساگر کی بیتاب موجیں بڑی بڑی چٹانوں سے گزر گزر کر ہماری جانب دوڑتی چلی آ رہی تھیں اور میرے پاؤں پر گر گر کے رحم کی طلبگار ہو رہی تھیں۔

میں لااُبالیانہ انداز سے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے ہوئے پاس کے جھولے کی طرف بڑھ گیا اور بڑے بڑے پینگ لینے شروع کئے ـــ جھولا، آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور تم خوف کی انتہائی حالت میں، سر سے پاؤں تک ایک دلفریب لرزش اور سراپا استدعا بنی ہوئی، میری ختم نہ ہونے والی شرارت پر جھلا رہی تھیں۔

ایک خاموش رات، تم اور میں، ڈرائنگ روم کے مخملی نیلگوں قالین پر، بالکل تنہا چپسی کھیلتے ہوئے عجیب عجیب بازیاں بد رہے تھے۔ تم ہلکے نیلے لباس میں ملبوس تھیں اور میں ہلکے نیلے رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے نیلے آراستہ صوفوں، نیلے برقی قمقموں، پھولوں کے نیلے گلدستوں، کمرے کی نیلی دیواروں اور سینے میں کھدی ہوئی نیلی تصویروں کی خاموش گویائی کے مزے لوٹ رہا تھا۔

یہ کوئی تین سال پہلے کا واقعہ ہے، جب میں زندہ تھا اور تمہارے غرورِ نسوانی سے مغلوب، تم میرے خلافِ عادت مجھے تاش اور چپسی کھیلنے پر مجبور کرتیں اور میں اس جانب متوجہ ہو جاتا۔ تم میرے ہمراہ کھیتوں میں چہل قدمی کے لئے نکل جاتیں اور میں آنے والے امتحان اور شکسپیر، ملٹن اور براؤننگ کی غضب آلود دھمکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو فطرت کی رنگینیوں پر نثار کرنے لگتا۔

مگر آہ ـــــ ع

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں !

انسانی زندگی، متضاد کیفیتوں کا دوسرا نام ہے، اب تم، میرے لئے ایک ایسا افسانہ ہو جس کا دلفریب عنوان میرے دماغ سے نکل چکا ہے اور اُس کے منتشر اوراق تمہاری متلون طبیعت کی زہرہ شکن تاریکی میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے۔

میری زندگی، مجھے اب اُس جہاز کی مانند نظر آتی ہے جس نے ابدی سکون کی حالت میں ساحل چھوڑا تھا لیکن منزل سے کچھ دور، سمندر کی تلاطم خیز موجوں نے اُس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور وہ ان کی اِس بازی گری کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔

حضرت میر کا سوز و گداز اور شیلی کی سوگواری، تمہاری انتہائی کوشش کے باوجود مجھ جیسے خوش باش انسانوں پر قابو نہیں پا سکتی۔ اب میں جارج برنارڈ شا، منڈبرک، اور علامہ اقبال کی ہمراہی میں آدھی رات کا چراغ جلایا کرتا ہوں اور میرے دماغ میں ایک لمحہ کو بھی تمہارا خیال نہیں گزرتا۔ دنیا مجھے اب بھی تمہارے نام سے منسوب کرتی ہے لیکن میں انتہائی لاپروائی کے ساتھ اپنے کان اس طرف سے پھیر لیتا ہوں اور یہ ہے میرا آخری فیصلہ جو تم کو سُنانا چاہتا ہوں۔

مگر

یہ بھی جانتا ہوں، مجھے اپنے اس عزم پر قائم رہنے کے لئے کن روح فرسا اذیتوں میں مبتلا ہونا پڑیگا۔

اچھا تو آؤ۔ جانے بھی دو، کہاں کا فیصلہ اور کیسا عزم۔

رہے آزردہ ہم اس شوخ سے چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں یہ بھی

مرزا سرفراز علی حیدرآبادی

حکم قرار دئے جانے دیوالیہ۔ (دفعہ ۲۷۔ ایکٹ ۵ سنہ ۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب جج خفیفہ لکھنؤ۔

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی

مُلاقی ولد پتو قوم خاکروب ساکن محلہ فراش خانہ مصطفیٰ منزل تھانہ چوک لکھنؤ

مُلاقی کی درخواست دیوالیہ مورخہ ۳۱ جنوری سنہ ۳۵ء کو پڑھنے اور فریقین کے بیانات کو سُننے کے بعد یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مدیون مذکور دیوالیہ قرار دیا گیا اور وہ ۶ ماہ کے اندر اپنی درخواست بریت گذرانے۔　المرقوم ۱۱ اپریل ۳۵ء

بحکم عدالت۔ بشمبھر دیال منصرم عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کے سوانح حیات ہیں جنھیں مولوی امام الدین صاحب رام نگری نے مرتب کیا ہے۔ سیاسیات اسلام کی تاریخ میں جناب عمرو بن العاص کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو دوسری قوم میں کسی بڑے سے بڑے فاتح یا سپہ سالار کا ہو سکتا ہے اور جس وقت تک مصر وطرابلس کا وجود کرۂ ارض پر باقی ہے۔ ان کی یاد کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ فطرتاً حد درجہ غیور و جری پیدا ہوئے تھے، اسی لئے جب تک مسلمان نہ ہوئے تھے وہ اسلام کے سخت خطرناک دشمن رہے اور جب اسلام قبول کر لیا تو پھر اسی شدت و انہماک کے ساتھ وہ اس کے مددگار و معاون بھی ثابت ہوئے۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو لطل پرستی (Hero worship) کے جذبات سے خالی ہو اور اس میں شک نہیں کہ اکثر اقوام عالم کے عروج و ترقی کا سبب یہی جذبہ ہوا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قوتِ عمل مفقود ہو جانے سے، یہی جذبہ بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوا اور انھوں نے اسلاف کے کارناموں کو اپنے موجودہ زوال و انحطاط کا کفارہ سمجھنے کے علاوہ خود اپنے اندر ہی قوت عمل پیدا کرنے کی کوشش کی نہیں کی بہرحال مولوی امام الدین صاحب کی یہ سعی یقیناً قابل قدر ہے اور وہ حضرات جو مختصر الفاظ و صفحات میں اس فاتح مصر کے حالات دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ دس آنے اسکی قیمت ہے اور مسلم اکاڈمی پھلواری شریف سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

Whither Hyderabad. حیدر آباد میں ایک انجمن "جمعیت رعایائے نظام" کے نام سے قائم ہوئی ہے جو ملکی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے غالباً سب سے پہلی منظم جماعت ہے۔ اس جماعت نے حال ہی میں ایک سرکلر کے ذریعہ سے اپنے مقاصد و مطالبات کا اعلان کیا تھا اور اب کسی حیدر آبادی بزرگ سید عابد حسین صاحب نے ان تمام مطالبات کی تفسیر و تشریح انگریزی زبان میں اس نام سے شائع کی ہے۔

حیدرآباد میں ملکی تحریک تقریباً ایک رُبع صدی پہلے شروع ہوئی تھی، لیکن تعلیم کم ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی قوت نہ تھی، لیکن اب کہ جامعۂ عثمانیہ کے وجود نے وہاں عام تعلیمی ذوق پیدا کر دیا ہے اور ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان بیکاری کے عذاب میں مبتلا ہیں، اس تحریک کا قوی ہونا بالکل فطری امر ہے اور کوئی صاحبِ فکر ایسا نہیں جو اس کو مستحسن نگاہوں سے نہ دیکھے۔ حیدرآباد کی سرزمین سے فایدہ اُٹھانے کا حق یقیناً سب سے پہلے وہیں کے بسنے والوں کو پہونچتا ہے اور اگر اُن میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو اس کا محو کر دینا آسان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب اس نوع کی تحریک کسی ملک میں پیدا ہوتی ہے تو غیر ملکی جماعت کو ضرور نقصان پہونچتا ہے، لیکن دنیا میں ایک کے فایدہ کی بنیاد ہمیشہ دوسرے کے نقصان ہی پر قائم ہوئی ہے اور اس تصادم سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

میں چونکہ ہر سال حیدرآباد جاتا ہوں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ وہاں اسوقت ملکی و غیر ملکی لوگوں کے درمیان کتنی مغایرت پیدا ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں اہل ملک کامیاب ہوں گے اور انھیں ہونا چاہئے، لیکن جس وقت خود اندرون ملک کی آبادی اور اس کے حالات پر غور کیا جاتا ہے تو ہم یہ سمجھنے پر بھی مجبور ہیں کہ اب نہیں تو کل وہ وقت ضرور آئے گا جب یہی ملکی تحریک خالص فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرے گی اور پھر خود ملکی جماعتوں کے اندر کشمکش شروع ہو کر سوال ملکی و غیر ملکی کا نہیں بلکہ ہندو مسلمان کا رہجائے گا۔

حیدرآباد کے مسلمانوں کے سامنے تو یقیناً صرف یہ سوال ہے کہ حکومت کے نظم و نسق اور دفتروں کی ملازمت میں ان کو کیوں پورا حصہ نہیں دیا جاتا اور اگر ان کا یہ مطالبہ پورا ہو جائے تو پھر غیر ملکی لوگوں سے ان کو پرخاش کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن وہاں کے ہندؤں کے سامنے اس سے زیادہ اہم سوال مسلم و غیر مسلم حکومت کا ہے۔ یعنی جس طرح وہاں کے مسلمان طبقۂ عمال میں اپنی اکثریت دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح ہندو بھی یہی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اگر حکومت کبھی اس بات پر مجبور ہوئی (اور یقیناً ہو گی) کہ وہ اہل ملک کے اس مطالبہ کو پورا کرے تو وہ یقیناً اس پر بھی مجبور کی جائے گی کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کرے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ملکی مسلمانوں کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

بہرحال جس حد تک صرف اصولِ انصاف کا تعلق ہے، کوئی شخص حیدرآبادیوں کے اس جذبہ کو بُرا نہیں کہہ سکتا، لیکن وہاں کے مسلمانوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ اگر آیندہ کسی وقت ہندؤں نے اپنا حقیقی مطالبہ پیش کیا (اور یقیناً پیش کریں گے) تو کیا وہ اُسوقت اُسی خاموشی و فیاضی کے ساتھ حکومت کا

تمام نظم ونسق ہندوؤں کے ہاتھ میں دینے کے لئے طیار ہو جائیں گے، جس خاموشی وفیاضی کی توقع وہ اس وقت غیر ملکی مسلمانوں سے رکھتے ہیں؟ - اگر وہ انصاف و رواداری کے اس اصول پر کاربند ہونے کے لئے طیار ہیں تو بیشک ان کی یہ تحریک ہر طرح قابل تبریک وستایش ہے، لیکن اگر آگے چل کر اپنی اقلیت کو اکثریت آبادی کے مقابلہ میں اہم بنانا ناگزیر ہے تو وہ غیر ملکیوں کی مخالفت کرکے کیوں اُس حلیف کی اعانت سے اپنے آپ کو محروم کرنا چاہتے ہیں جس کی امداد حاصل کئے بغیر وہ آیندہ جنگ میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے۔

معلوم نہیں اس مسئلہ کا یہ نازک پہلو مسلمانانِ حیدر آباد کے سامنے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ اس آنے والے سیلاب کے مقابلہ کے لئے کیا طیاریاں کر رہے ہیں - کیا صرف یہی کہ غیر ملکیوں کو حیدر آباد سے نکالدیا جائے یا آیندہ اُن کو حیدر آباد آنے سے باز رکھا جائے ؟ اور اگر انھوں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے تو پھر سوا اسنے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے ——— تو ہر گناہ کہ خواہی بکن کہ معذوری ——

قرآن آموز تالیف ہے جناب نذیر بن ابی سلمٰی کی جنھوں نے قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا طریقہ اس کتاب میں بتایا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں بلا سمجھے بوجھے قرآن پڑھنے کی عادت قبیحہ بہت عام ہے اور ضرورت ہے کہ اہلِ علم ومذہب اس طرف متوجہ ہوں - لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے کہ شروع ہی سے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیجائے، البتہ جب مادری زبان کی تعلیم سے فارغ ہو کر ان میں کچھ عقل پیدا ہو تو بیشک قرآن کیا بلکہ قرآن کی تعلیم طرف ان کو متوجہ کرنا چاہئے اور یہ بغیر مطلب سمجھے ہوئے ممکن نہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ قابل مولف نے جو طریق تعلیم اس کتاب کے ذریعہ سے پیش کیا ہے وہ بہت پسندیدہ ہے اور ملک میں اس کو مقبول ہونا چاہئے۔ یہ پہلا حصہ ہے اور دفتر قرآن آموز احاطۂ شہزادہ محمد طاہر - لدھیانہ سے چار آنہ میں مل سکتا ہے۔

امہات الامہ شمس العلماء خان بہادر حافظ نذیر احمد مرحوم کی نہایت مشہور تالیف ہے جو کسی پادری کے جواب میں انھوں نے لکھی تھی، لیکن صرف اس لئے کہ انھوں نے اس میں اپنی خالص دہلوی زبان استعمال کی تھی مولویوں نے اس کو جلائے بغیر نہ چھوڑا۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، لیکن اب مسٹر شاہد احمد اڈیٹر ساقی نے جو حافظ نذیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں اس کو پھر شایع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان اعتراضات کے جوابات بھی شایع کر دئے ہیں جو اُس وقت

صاحب احسن التفاسیر نے دئے تھے۔ اس کتاب میں رسول اللہ کی ازدواجی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر حد درجہ جرأت سے کام لیکر ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن کو مولویوں کی عام جماعت کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور دفتر ساقی دہلی سے ملسکتی ہے۔

دیوان معروف تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر دہلوی کے شاگردوں میں ایک صاحب نواب الٰہی بخش بھی تھے جو معروف تخلص کرتے تھے۔ لیکن ان کا دیوان دستیاب نہ ہوتا تھا شاہ عبدالحامد صاحب قادری کو اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدر آباد میں ملگیا اور انھوں نے شایع کردیا۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں معروف کے سوانح حیات بھی ہیں اور کلام پر ہلکا سا تبصرہ بھی۔ ہرچند معروف کا کلام تغزل کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم اس کے شایع ہوجانے سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ تذکرہ نویسوں اور نقد کرنے والوں کو اب سے پونے دوسو سال کی شاعری اور اس وقت کی زبان کے نمونے تلاش کرنے میں اور زیادہ آسانی ہوجائے گی — طباعت وکتابت اچھی ہے، اور قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

علاج بہ ریڈیم رسالہ ہے لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا جو تجدید شباب کے باب میں کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں، اس سے قبل آپ کے متعدد رسایل اس موضوع پر شایع ہوچکے ہیں اور نگار میں ان پر تبصرہ بھی ہوچکا ہے اس رسالہ میں آپ نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ ریڈیم کے ذریعہ سے اعادۂ شباب کس حد تک ممکن ہے۔ رسالہ کی قیمت ۴ روپے ہے اور ڈاکٹر موصوف سے قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

رہنمائے تعلیم کا رڈکراس نمبر ماسٹر جگت سنگھ رہنمائے تعلیم کے مالک و اڈیٹر ان لوگوں میں سے ہیں جو کامیابی کی جستجو صرف سعی وعمل میں کرتے ہیں اور جب تک مقصود حاصل نہ ہوجائے چین سے نہیں بیٹھتے۔ یوں تو سرزمین پنجاب کا ہر فرد اس باب میں ہمارے صوبہ کے لوگوں سے ممتاز نظر آتا ہے، لیکن ماسٹر صاحب موصوف اس عزم مردانہ میں جو غیر معمولی خصوصیت رکھتے ہیں، وہ بہت زیادہ واضح و روشن ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اپنے رسالہ کا جوبلی نمبر نکال کر اپنی قوت عمل کا جو زبردست ثبوت دیا تھا اسکی مزید توثیق اب رڈکراس نمبر سے کی گئی ہے، جو اس موضوع پر اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل پہلی چیز ہے۔ وہ حضرات جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ اشاعت ازبس مفید و دلچسپ ہے اور اگر رڈکراس کی تحریک صرف اس لئے قابل نفرت نہیں ہے کہ اس کو صلیب سے نسبت حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو اسے عام دلچسپی نہ لیجائے۔

سرودِ زندگی جناب اسفر گونڈوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس پر ہم کسی آیندہ صحبت میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرینگے۔

باب الاستفسار والمناظرہ

اختر ریحانہ سے

مارچ کے نگار میں آپ کی تحریر شایع کرنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس موضوع پر جناب بزمی اور ڈاکٹر الیاس صاحب نے اظہار خیال کیا ہے، اس کے ایک ضمنی پہلو پر گفتگو کرنے کا موقع مجھے بھی مل جائے۔ نیز یہ کہ اگر آپ کو آپ کے موجودہ مشکلات سے نکالنے کے لئے کسی مشورہ کی ضرورت ہے تو کم از کم میری طرف سے تو آپ کو یہ یقین ہو ہی جائے کہ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن آپ کی تحریر کو شائع ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ استفسارات کی کثرت نے ایک تیسرا مسئلہ اور میرے سامنے پیش کر دیا اور وہ یہ کہ آیا کسی ایسی عورت کی تحریر شایع کرنا (جو آپ جیسا خوبصورت نام رکھتی ہو جسکا ذوق ادب آپ جیسا دلچسپ ہو اور پھر ایسے طبقہ سے بھی تعلق رکھتی ہو جو مادی ذرایع کی دسترس سے دور نہیں ہے)۔ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو "مقدار بادہ" اور "عارف قدح خوار" کی نسبت پر غور کرنا میرے لئے ضروری ٹھہرا دے۔

باور کیجئے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں سے یہ مطالبہ مجھ سے نہ کیا گیا ہو کہ میں بتاؤں آپ کون ہیں، آپ کا کیا پتہ ہے اور آپ کی ہستی کوئی فرضی ہستی تو نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ دنیا کے اس جذبۂ "قسمت آزمائی" کی تسکین مجھ سے کیونکر ممکن ہے، جبکہ حقیقتاً خود میں بھی اس باب میں یکسر استفسار و استفہام (؟) بنا ہوا ہوں۔

جتنے خطوط استفسار حال کے لئے موصول ہوئے ہیں، ان کے لکھنے والوں کی نیت کے متعلق یقیناً مجھے رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ یہ باور کرنے کا کوئی سبب موجود کہ انسانی ہمدردی کے علاوہ کوئی اور جذبہ ان سے اندر کار فرما ہے، لیکن میں یہ سمجھنے پر ضرور مجبور ہوں کہ اگر اسی بیکسی و بیچارگی کا اظہار کسی مرد کی طرف سے ہوتا تو شاید کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اور نفسیات انسانی کا یہی وہ پہلو ہے جو کبھی کبھی مجھ

یہ غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ عورت کی اس ادائے مظلومیت ہی نے مرد کو ستمرانی پر آمادہ کیا ہو۔ وہ ستمرانی جو مظلوم سے زیادہ ظالم کو تباہ و برباد کرنے والی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی عورت کا معصیت کے خیال سے گھبرا کر معصیت سے بچنے کا اعلان کرنا بجائے خود اتنی بڑی دعوتِ معصیت ہے کہ مشکل ہی سے کوئی مرد اس سے بچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ علی الخصوص اُسوقت جب یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہ صدائے لنترانی کدھر سے آرہی ہے۔ شمع سے زیادہ کسوتِ شمع پروانوں کی بیتابی کا سبب ہوا کرتی ہے اور نقاب و حجاب جلوۂ عریاں سے زیادہ بار رکھنے والی چیز ہے۔ اس لئے اگر وہ صحیح ہے جو مارچ کے نگار میں آپ نے تحریر کیا ہے اور آپ اپنی موجودہ زندگی سے واقعی بیزار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایک بار ہمت و جرأت سے کام لیکر سامنے نہ آجائیں۔ اور ایکبار اس جنس کے افراد کو تلافی کا موقع نہ دیں، جس کی طرف سے آپ لبریز شکایت ہیں۔ یہ ہے میری ذاتی رائے اس باب میں جس پر اگر آپ نے عمل کیا تو ممکن ہے میں اور میرے ساتھ بعض وہ افراد جو اس مسئلہ کی عمرانی اہمیت سے واقف ہیں کوئی تدبیر علاج و مداوا کی اختیار کر سکیں ورنہ ظاہر ہے کہ آپ کی طرف سے سلسلہ احتجاج اور دوسری طرف سے دلوا ہمدردی دونوں بے سود ثابت ہوں گے اور آئندہ میں نگار کے صفحات کو صرف "جولانگاہ عشق" بنانا کبھی پسند نہ کروں گا۔

مہدی و مہدویت کے باب میں

جناب ابورشید صاحب (حیدرآبادی) سے

مکرمی ــ آپ کی تحریر جس میں آپ نے جناب سید محمد صاحب جونپوری کی مہدویت کے متعلق مختصراً اظہار عقیدت وارادت کرتے ہوئے اہل تسنن کے عقیدۂ ظہور مہدی کو بحوالۂ کتب عقاید اہل تسنن ثابت کرنا چاہا ہے، پہونچی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں آپ کی تحریر بجنسہ شائع کر دیتا اور اس کا جواب دیتا اگر اس کی ضرورت ہوتی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اور میرا ایسا نہ کرنا اس بنا پر نہیں ہے کہ آپ نے جو انداز تخاطب اختیار کیا ہے، وہ حد درجہ غیر مہذب و ناشایستہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس کا طرز انشا اور استدلال نہایت غیر دلچسپ اور ناقابل برداشت حد تک فرسودہ و پامال ہے۔ جواباً یہ ظاہر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ آپ نے جو حجت اپنی تحریر میں پیش کی ہے

اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کا عقیدہ کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے

آپ نے اپنی تحریر کی ابتدائی چند سطروں میں لکھا ہے کہ نہ جناب سید محمد صاحب جونپوری نے کبھی دشمنوں کے خوف سے تقیہ کیا اور نہ اسوقت مہدوی جماعت تقیہ کی عادی ہے۔۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا صحیح و درست ہو لیکن اس کے بعد پورے چار صفحات اس کوشش میں سیاہ کر دینا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل تسنن کے یہاں کوئی اہمیت رکھتا ہے، البتہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آپ نے اپنے استدلال میں ایک قول تفتازانی کا شرح مقاصد سے نقل کیا ہے اور دوسرا بیہقی کا شعب الایمان سے۔ اس کے بعد آپنے پورے تین صفحات اس بحث کے لئے وقف کئے ہیں کہ علامۂ ابن خلدون نے جن احادیث پر نقد و جرح کر کے ظہور مہدی کے عقیدہ کو ناقابل تسلیم قرار دیا ہے وہ احادیث بالکل صحیح ہیں اور ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے غلط لکھا ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے دلایل کی طرف متوجہ ہوں، یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کسی جماعت کے کسی عقیدہ کی اہمیت اس وقت تک ثابت نہیں کر سکتے، جب تک جمہور اکابر علماء کا اس پر اتفاق نہ ہو کیونکہ جبتک ادنیٰ اختلاف بھی کسی عقیدہ میں پایا جاتا ہے اس وقت تک وہ ہر زمانہ میں نقد و تحقیق کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ اس کو اپنے استنتاج کے لحاظ سے تسلیم کرے یا مسترد کر دے۔

اب آپ خود اپنے پیش کردہ منقولات پر غور کیجئے کہ ان سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ علامۂ سعد الدین تفتازانی کے الفاظ یہ ہیں:۔۔

ذھب العلماء الی انہ امام عادل من ولد فاطمۃ

الفاظ (ذھب العلماء) کا مفہوم ہی صرف یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے اور کہنے والا خود اسکو ضعیف تسلیم کرتا ہے۔ رہگئے بیہقی سو انھوں نے شروع ہی میں ظاہر کر دیا ہے کہ۔ (اختلف الناس فی امر المھدی)

علامۂ ابن خلدون نے مہدی موعود کی جن احادیث کو ناقابل اعتماد ظاہر کیا ہے، ان کے راویوں کو آپ نے حد درجہ قابل اعتماد قرار دیا ہے اور اپنی تائید میں تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کی یہ کاوش بھی کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہونچتی کیونکہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ کتابیں معتبر ہیں اسی طرح کسی اور کے نزدیک ابن خلدون کی تحقیق قابل وثوق ہو سکتی ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ ان دونوں میں صحیح کون ہے چنداں دشوار نہیں۔۔ وہ لوگ جو ظہور مہدی کی احادیث کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں ان کا استدلال صرف

یہ ہے کہ ان حدیثوں کے راوی معتبر ہیں اور اصول درایت کی طرف مطلق اعتنا نہیں کرتے، لیکن ابن خلدون وغیرہ جو اس عقیدہ کے منکر ہیں وہ روایتاً و درایتاً دونوں طرح اس قسم کی احادیث کو مجروح ثابت کرتے ہیں اور اس لئے ایک تیسرا شخص جو راویوں کے ثقاہت وعدم ثقاہت کے متعلق اختلاف رائے سے گھبرا کر کسی نتیجہ تک پہونچنا چاہے وہ مجبور ہوگا کہ ابن خلدون کے قول کو صحیح باور کرے کیونکہ درایت بہرحال درایت ہے اور عقل انسانی اس کے احکام تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ جتنی احادیث پیشین گوئیوں کی رسول اللہ سے منقول ہیں اول تو وہ یوں بھی اصولاً زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھی جاتیں، چہ جائیکہ ظہور مہدی کی احادیث جن کے وضع کرنے کے لئے کھلے ہوئے سیاسی اسباب موجود تھے۔

جس طرح یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ امویین وعباسیین نے علویین کے مطالبات کو ضعیف اور ان کے اثرات کو کمزور بنانے کے لئے بکثرت احادیث وضع کیں، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ علویین نے خاندان بنی فاطمہ کے استعلاء کے لئے کافی سعی سے کام لیا، اس سلسلہ میں منجملہ دیگر تدابیر کے ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ امام منتظر اور ظہور مہدی کی پیشین گوئیاں رسول اللہ سے منسوب کر کے اپنے حق خلافت وامارت کو مضبوط کیا گیا۔

میں نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل السنن کی کتابوں میں کہیں نظر ہی نہیں آتا بلکہ صرف یہ لکھا تھا کہ اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت ان کے یہاں حاصل نہیں ہے اور اس عدم اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ہمیشہ اس مسئلہ میں باہم اختلاف رہا اور اجتماعی حیثیت سے کبھی اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ برخلاف اہل تشیع کے یا مہدویین کے کہ ان کے یہاں متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ظہور مہدی ضروری ہے اور اگر ان دونوں جماعتوں میں کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ ایک کے یہاں (جناب سید محمد صاحب جونپوری کی صورت میں) ظہور ہو چکا ہے اور دوسری جماعت کے یہاں امام منتظر ہنوز پردۂ خفا میں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب رونما ہوں

باب الاستفسار

الف لیلہ اور سند باد نامہ

(جناب مراد علی صاحب ـ پٹنہ)

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ کیا سند باد نامہ اور الف لیلہ دو علحدہ علحدہ کتابیں ہیں، اگر علحدہ ہیں تو الف لیلہ اور اس کی ترتیب میں کیا اختلاف ہے، خود الف لیلہ میں سند باد کا ذکر موجود ہے اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

(نگار) یقیناً دونوں کتابیں بالکل علحدہ علحدہ ہیں اور ہر چند ان کی ترتیب میں ایک نوع کی مماثلت ضرور پائی جاتی ہے لیکن دونوں کو ایک نہیں کہہ سکتے۔

سند باد نامہ کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے لڑکے کی تعلیم ایک حکیم سند باد کے سپرد کرتا ہے اور سند باد اس کو ہدایت کرتا ہے کہ سات دن تک خاموش رہے، اسی زمانۂ سکوت میں بادشاہ کی محبوب ملکہ اپنے سوتیلے بیٹے یعنی شہزادہ کے خلاف نہایت سخت الزامات قائم کرتی ہے اور بادشاہ اس کے قتل کا حکم نافذ کرتا ہے لیکن بادشاہ کے سات وزیر ہیں اور ان میں سے ہر ایک روزانہ ایک ایک قصہ کہکر تعمیل حکم کو ملتوی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ آٹھویں دن جب شہزادہ کا سکوت ختم ہوتا ہے تو وہ الزامات کو دور کرتا ہے اور بیگناہ ثابت ہوتا ہے۔ الف لیلہ میں ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ روز نئی عورت سے نکاح کرتا ہے اور صبح کو اُسے قتل کرا دیتا ہے لیکن جب شہرزاد سے اس کا نکاح ہوا تو اس نے روز رات کو ایک کہانی سُنانی شروع کی اور اس کو صبح تک نا تمام چھوڑ کر ایک ایک دن کی جاں بخشی حاصل کرتی رہی، یہاں تک کہ ہزار راتیں اسی طرح بسر ہو گئیں اور اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس نے رشتۂ اُلفت کو اور زیادہ استوار کر دیا اور اس طرح بادشاہ کی یہ مذموم عادت ترک ہو گئی۔

اسی نوع کا افسانہ بختیار نامہ کا ہے جس میں دس وزیر شاہزادہ پر الزام قائم کرتے ہیں اور وہ قصے سنا سنا کر اپنی بیگناہی ثابت کرتا ہے۔ طوطی نامہ بھی اسی انداز کا ہے۔

مسعودی نے الف لیلہ کے ذکر میں سندباد نامہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور ہر چند بعد کو یہ دونوں کتابیں ملا دی گئیں لیکن سندباد نامہ کا وجود الف لیلہ سے حقیقتاً بالکل علحدہ اور زیادہ قدیم العہد تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ سندباد نامہ قدیم ہندی افسانہ سدھ پتی سے ماخوذ ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سدھ پتی کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اس کے سات دن تک خاموش رہنے کا ٹکڑا ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایات فیثاغورس سے ماخوذ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

انارکی اور انارکزم

(جناب سید ابو اصغر صاحب - ہوشنگ آباد)

انارکی و انارکزم میں کیا فرق ہے، اس کی تحریک کب اور کس نے کی اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔

(نگار) انارکزم جسے عربی میں (فوضویت) کہتے ہیں ایک ایسی اشتراکیت پسندی ہے جو نہ صرف انقلاب حکومت کی آرزومند ہے بلکہ وجودِ حکومت کو بھی دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے۔ اور انارکی سے مراد سوسائٹی کی وہ حالت ہے جو انارکزم سے پیدا ہوتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انارکزم کا تعلق اصول و عقیدہ سے ہے اور انارکی کا حالت و کیفیت سے۔

فوضویت میں اشتراکیت پسندی کی شان پیدا کرنے والا سب سے پہلا شخص فرانس کا پراؤڈن Proudhon تھا۔ جو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۵ء میں مرا۔ یہ نوع انسانی میں انفرادی آزادی کا بڑا موید تھا اور کہا کرتا تھا کہ انسان پر انسان کا حکمراں ہونا انسانیت کی حد درجہ توہین ہے اور آزادی خیال و ضمیر کو محو کر دینے والی ہے۔ اسی لئے وہ ایک ایسے معاشری نظام کا خواہشمند تھا

جس میں حکومت تو کسی کی نہ ہو، لیکن ہر شخص اپنی اپنی جگہ اُصول و قاعدہ کا پابند ہو کر زندگی بسر کرے، اور انسانی ارتقاء کی یہی آخری حد ہے۔

اس کے بعد اس خیال کا سب سے بڑا حامی و مبلغ باکونن (Bakunin) ہوا اور پھر کروٹپکن (Kropatkine) یہ دونوں روس کے باشندے تھے۔

اس تحریک کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ انسانوں کو مکمل آزادی ملنا چاہئے اور حکومت خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری مٹنا چاہئے، کیونکہ حکومت بہرحال حکومت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس سے نوع انسانی کو جسمانی یا ذہنی تکلیف نہ پہونچے۔ اس تحریک کے حامی زمین اور سرمایہ کو قوم کی مشترک ملکیت بنانا چاہتے ہیں اور تعلیم کو عام۔ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت تمام افراد انسانی تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فطری قوانین کو ہر شخص سمجھ کر ان پر عمل کرے گا اور کسی خارجی حکومت یا سیاسی تنظیم کی ضرورت باقی نہ رہے گی —— باکونن کا قول تھا کہ سوسائٹی کے تمام قدیم اُصول کو توڑ دینا چاہئے، کیونکہ ان کی موجودگی میں نہ تعلیم عام ہو سکتی ہے اور نہ انسان کو مکمل آزادی میسر آ سکتی ہے۔

الغرض فوضویت کے بڑے اُصول صرف دو ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا معاشری۔ سیاسی یہ ہے کہ حکومت کے وجود کو خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو فنا ہو جانا چاہئے اور معاشری یہ کہ سرمایہ و دولت کو ملک عام بنا دینا چاہئے۔

اگر اس جماعت کے یہ اُصول صرف علمی نظرئے کی حیثیت تک محدود رہتے تو شاید دنیا ان کی طرف اعتناء بھی نہ کرتی، لیکن چونکہ انھوں نے حصول مقصود کے لئے قوت استعمال کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور وہ ہر قسم کی جنگ و قتال کے لئے طیار رہتے ہیں، اس لئے ہر زمانہ میں اس تحریک کی مخالفت کی گئی اور پوری سختی کے ساتھ اس کو دبایا گیا۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی ترقی کا معیار یہی ہے کہ وہ قانون یا مذہب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو متمدن ثابت کرے، یعنی دنیا میں امن و سکون کی حمایت اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ قانون یا مذہب اس پر مجبور کرتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انفرادی طور پر وہ ہر شخص کا فطری فرض ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ اگر آج دنیا کے تمام افراد اس مرتبہ تک پہونچ جائیں تو فردوس گم گشتہ ہم کو یہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن جس حد تک عمل کا تعلق ہے ہم کو یہ خواہش خود اقتضاء فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور فوضویت کا

قانون فطرت کی آڑ پکڑ کو جنگ کرنا خود فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے -

مرز و بوم کا اختلاف، آب و ہوا کا اختلاف، ماحول کا اختلاف اور سب سے زیادہ حوادث طبیعی کا ظہور - یہ تمام اسباب ایسے ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں اور ان سے انسان کے ذہن و دماغ کا متاثر ہونا بالکل غیر اختیاری امر ہے - اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وقت واحد میں تمام انسان کسی ایک بات پر متفق ہو سکیں اور سچ پوچھئے تو دنیا کی رونق اسی ہنگامہ وتصادم پر قائم ہے -

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ایک خیال کو کسی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ کسی ایک ملک کے لئے قابل قبول بنا سکیں لیکن تمام نوعِ انسانی کا اس پر متفق ہو جانا اقتضاء فطرت کے خلاف ہے - پھر چونکہ فوضویت کی تکمیل اسوقت تک ممکن نہیں جب تک نوعِ انسانی کے تمام افراد اس پر کاربند نہ ہو جائیں اس لئے اس تحریک کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور کبھی اس کی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ عالمگیر کامیابی حاصل کر سکے گی -

حسن گریزاں ہے

مرے سروناز! ابھی نہ جا!
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!
نہ ابھی سے پھیر نگاہ تو   میں نگاہ بھر کے تو دیکھ لوں
ترا پیار ہے مری زندگی   تجھے، پیار کر کے تو دیکھ لوں
تو قرارِ دل ہے - ذرا ٹھہر   میں ذرا ٹھہر کے تو دیکھ لوں
ابھی دل کی پیاس بجھی نہیں
خلشِ امید مٹی نہیں
کوئی دیر بھی تو ہوئی نہیں
یہ سکوں، یہ فرصتِ آرزو! یہ شبِ دراز - ابھی نہ جا
مرے سروناز! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا
ابھی ماہتاب ہے چرخ پر   تجھے، ماہتاب نہ دیکھ لے،
ہے یہ سوچ - لیلیٰ شب کہیں؟   تجھے بے نقاب نہ دیکھ لے!
پسِ پردہ، کوئی چھپا ہوا   تجھے بے حجاب نہ دیکھ لے:
کہیں، قدسیوں میں نہ گل کھلیں
کہیں کہکشاں کے نہ پر کھلیں
ترے نقشِ پا کی تلاش میں
کہیں، کھل نہ جائے نجوم پر، یہ حسین راز! - ابھی نہ جا
مرے سروناز ! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!
جو کبھی کسی نے سُنی نہ ہوں   وہ کہانیاں میں سُناؤں گا
جو نشاطِ روحِ بہشت ہوں   میں وہ گیت، خلد سے لاؤں گا
یہی شب ہے حاصلِ صد سحر   اسے لازوال بناؤں گا
کبھی نغمہ بار رہوں گا میں
کبھی گل طراز بنوں گا میں
تجھے دیکھ دیکھ جیوں گا میں
یہی "خوابِ خلد نما" رہے - یونہی، خلد ساز! ابھی نہ جا!
مرے سروناز ! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا
جو بسی ہے تیرے خیال سے   اُسی کائنات کا واسطہ!
تجھے - آہ! جس سے گریز ہے   اُسی التفات کا واسطہ!
غمِ بے ثبات نہ دے مجھے   کششِ حیات کا واسطہ!
جو مرا دو اشکِ چکیدہ ہو !
جو قرارِ جانِ رمیدہ ہو !
وہ دلِ روش سے کشیدہ ہو؟
جو نیاز شوق سے ضد ہے کچھ، تو بپاسِ ناز! - ابھی نہ جا!
مرے سروناز ! ابھی نہ جا!
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!
مجھے اب بھی وہم فراق ہے   "یہ عجیب وہم" مٹا بھی دے
ابھی ہوش شاملِ کیف ہے   یہ حجاب ہوش اُٹھا بھی دے
جو بسے ہیں تیری نگاہ میں   وہی خواب مجھکو دکھا بھی دے
مرا دل جمال نما — بنے
مرا ہر خیال - بقا، بنے
"ترا عشق" — میرا خدا بنے
چمنِ یقیں میں کھلا بھی دے - "گلِ امتیاز" - ابھی نہ جا
مرے سروناز ! ابھی نہ جا
مرے دلنواز ! ابھی نہ جا

شاہکار

ہوئی روزِ ازل تخلیق جب آدم کے پیکر کی
بڑھی تعظیم کرنے کے لئے ہر موج کوثر کی

فرشتے سر بسجدہ ہو گئے ایمائے فطرت پر
یہیں سے مہر لگ جاتی ہے انساں کی فضیلت پر

مگر منشائے فطرت کی ابھی تکمیل باقی تھی
ابھی اک "جلوۂ بے نام" کی تشکیل باقی تھی

صدا آئی ہمیں اک یاسمیں پیکر بنانا ہے
کرشمہ اپنی تخئیلِ درخشاں کا دکھانا ہے

اسے ترتیب دو صد رنگ جلوؤں سے حقیقت کے
سجا دو روح کو اس کی تبسم سے محبت کے

جمال و حسن کر دو جذب اسکے روئے روشن میں
ہزاروں بجلیاں بھر دو نظر کے چلبلے پن میں

بنا دو قاش اک مہتاب کی لب ہائے رعنا کو
چھپا دو ہر رگِ مژگاں میں طوفانِ تمنا کو

بسا کر مستیاں آنکھوں میں جانِ میکدہ کر دو
ملے جنت میں جتنی دولتِ جذب و کشش بھر دو

فروغِ ماہ سے لیکر اُجالے دو جِلا اس کو
بطور خاص دیدو دولتِ حُسن و وفا اس کو

جبیں کو اس کی آئینہ بنا دو نورِ ہستی کا
صحیفہ کھول دو اسکی نظر میں کیف و مستی کا

کرو تعمیر اسکی یوں، کہ مشکل ہو جواب اس کا
ستارے توڑ کر تاباں کرو رنگِ شباب اس کا

حیا کی گرمیوں سے روح تک اسکی لچک جائے
مرتب یوں کرو اس کو کہ جنت بھی چمک جائے

غرض یہ نقش ہوگا ایک نقشِ یادگار اپنا
اسے دُنیا میں بھیجیں گے بنا کر شاہکار اپنا

فرشتوں نے سُنا حیرت سے یہ اعلان فطرت کا
خمیر آب و گل میں بھر دیا ہر رنگ جنت کا

کرن اک عرش سے لیکر چمن سے مستیاں لیکر
بنایا اک ہیولا اور کیف افزو زرنگیں تر

خطوطِ چہرۂ زیبا کو ڈھالا جاذبیت میں
ہزاروں حُسن پیدا ہو گئے صانع کی صنعت میں

مزین کر کے اجزائے سرور و نور سے اسکو
نمایاں کر دیا کچھ اور خلد و حور سے اسکو

اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی اک موج نکہت کی
اسی نکہت کے سائے میں ہوئی تخلیق عورت کی

نجی احمد بریلوی

زاہدِ فریب کار

اندھیری رات ہے، سرد بزم ناؤ نوش ہے / فسونِ خواب سے جہاں کی انجمن خموش ہے
فضائے کائنات کو سیاہیوں نے بھر دیا / زمین و آسماں کو تیرگی نے ایک کر دیا
یہیں بسجدہ ایک زاہدِ فریب کار ہے / نگاہِ حق شناس میں جو ننگِ روزگار ہے
وہی جو دین کو خون چوستا ہے کائنات کا / بزعمِ خود جو راہبر ہے جادۂ حیات کا
وہی کہ جس کا آستانہ سجدہ گاہِ خلق ہے / وہی کہ جس کی ذات باعثِ گناہِ خلق ہے
وہی عبادتیں ہیں جس کی سیم و زر کے واسطے / بھرا ہے جس نے روپ لقمہ ہائے تر کے واسطے
شریکِ ربِ ذو المنن، مقلدِ فراعنہ / مرکبِ غرور و جہل، گمرہی کا آئنہ
عبائے زاہدانہ کس قدر نظر فریب ہے / گھنی دراز ریش اسکی سر بسر فریب ہے
عیاں جبیں سے انکسار و عبدیت کی شان ہے / مگر عمل کی پوچھئے تو شیطنت کی جان ہے
دماغ کبر، اتقا و زہد سے بٹا ہوا / غبارِ معصیت سے دل کا آئنہ اٹا ہوا
زباں پہ رٹ لگی ہے یا رحیم یا کریم کی / مگر نظر ہے بیکسوں کے مال پر لئیم کی

خدا ہی ایسی ہستیوں سے دہر کو پناہ دے
یہ لاعلاج عارضہ ہیں کائنات کے لئے

انجم رضوانی

نقش و نگار

مجالِ دید کس کو ہو گی ان کے روئے روشن کی / حریمِ ناز کو تکلیف ناحق دی ہے چلمن کی
خدا جانے ترے آوارۂ الفت پہ کیا گزری / کہیں سے آ رہی ہے کان میں آوازِ شیون کی
یہ فصلِ گل نے کیا تعلیم دی ہے دستِ وحشت کو / گریباں کی وہی حالت ہے جو حالت ہے دامن کی
بیابانِ محبت میں جنوں ہے خضرِ رہ میرا / نہیں دیوانہ میں جو بات مانوں عقلِ رہزن کی

نگار اک دن مجھے مل جائیگا درجہ شہادت کا
کسی کی تیغ سے وابستہ ہے تقدیر گردن کی

نگار



قیمت ۸ر

نرخنامہ اجرت اشتہار

	یکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۷۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۷ "
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۳ "

(۱) اجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں۔

(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانے والا ہو اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔

ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر

نگار قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی [illegible]

" بیرون ہند آٹھ روپیہ " [illegible]

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ [illegible] کے حساب سے قیمت لی جائے گی

منیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے



نیاز

نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین جون ۳۵ء | شمارہ ۶

دہلی سے اختر ریحانہ کی ایک اور دلچسپ تحریر وصول ہوئی ہے جو جولائی کے نگار میں شائع ہوگی۔

نگار

ایڈیٹر۔ نیاز فتحپوری

شمار ۶	جون ۳۵ء	جلد ۲۷

ملاحظات

حوا کی بیٹیاں ہندوستان میں

الہ آباد کا میور ہال تماشائیوں۔ نوجوان تماشائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سامنے ڈائس پر ایک طرف تمام وہ ساز جو ہندوستان کی موسیقی کا ساتھ دے سکتے ہیں قرینے سے چنے ہوئے رکھے ہیں اور دوسری طرف چند نوجوان لڑکیاں اور چند بہت کمسن حال و مستقبل کے تمام امکانات حسن و عشق لئے ہوئے جلسہ کے آغاز کا انتظار کر رہی ہیں۔ سیاہ بورڈ پر ایک لڑکی کے رقص کا اعلان نظر آتا ہے۔ اور ڈائس سے نیچے الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر بہ حیثیت ناظم جلسہ گھنٹی بجا کر آغاز کی اجازت دیتے ہیں۔

سازندے، تعلیم یافتہ سازندے اپنا اپنا ساز سنبھال کر ہم آہنگی کے ساتھ موسیقی کی پہلی آواز کھرج کے پردوں سے پیدا کرتے ہیں اور ایک لڑکی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ سال کی ہوگی۔ سر میں پھولوں کا ہار اور پاؤں میں گھونگھرو لپیٹے ہوئے سَم کی پہلی ضرب کیساتھ نمودار ہوتی ہے۔ گویا کہ ایک نوخاستہ تیتری ہے جو پو پھٹتے پیدا ہوئی اور سورج کی سب سے پہلی کرن پر رقص کرتی ہوئی یہاں پہنچ گئی ہے — اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی جنبش، اسکے ناتوان و کمزور اعضاء کی لرزش، فاختہ کی طرح اسکے چھوٹے چھوٹے سُرخ پاؤں سے لپٹے ہوئے گھونگھروں

کی باقاعدہ جھنکار۔ ایک ایسا سماں تھا جو حال سے قطع نظر اس کے امکانات مستقبل کو پیش کر رہا تھا۔ یہ لڑکی انھیں پروفیسر صاحب کی بچی تھی جو اس جلسہ کے مہتمم و نگراں تھے۔

اس کے بعد اور چند چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی طرف سے نمائش فن ہوئی۔ اور بڑی حد تک کامیاب۔ لیکن اس کے بعد جب دفعۃً بورڈ پر "مس بنا پانی مکرجی" کا نام نظر آیا تو لوگوں کے احساس میں میں نے خاص اضطراب محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دبا ہوا جذبہ دل سے زبان تک آ ابلا ہے ——— جذبۂ بے اختیار شوق ———!

چودہ پندرہ سال کی ایک بنگالی لڑکی۔ بنگلی اپنے سانولے رنگ کے لحاظ سے۔ اپنے لانبے لانبے سیاہ بالوں کے لحاظ سے —— بڑی بڑی آنکھوں اور کتابی چہرہ کے لحاظ سے ——— نازک قامت۔ لچکیلا بدن۔ شرمائی ہوئی چتون۔ سرخ ساری۔ سرخ بندی ——— ہارمونیم پر پتلی پتلی نازک انگلیوں کی متواتر جنبش اور ایک سماوی لحن کیف جو یونیورسٹی کی دل دوز رہ گئی! معلوم نہیں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری تھی۔ لیکن میری روح کا اعتراف شکست اگر بیان میں آ سکتا ہے تو وہ صرف یہ تھا کہ:

کہ چنیں سالہ گرمی آمد ایماں می برد

آواز کی نزاکت کی تعریف مومن نے یہ کی ہے کہ

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں ۔ اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

لیکن یہاں معاملہ صرف آواز کا نہیں تھا بلکہ لحن موسیقی کا تھا۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بولوں کے اتار چڑھاؤ کی نرم نرم پھانس دل کے اندر پیوست ہوتی جا رہی ہیں۔ اور جب وہ دفعۃً دوسری سپتک سے استائی کے بول ختم کرکے تان لیتی ہوئی کھرج کے پردوں تک آتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شعلہ لپکا اور پھیل کر رہ گیا۔ بجلی چمکی اور فضا کو منور کر گئی۔ یہ لڑکی بولپور (بنگال) کی رہنے والی ہے۔ اور غالباً شانتی نکیتن میں اس فن کی تکمیل کی ہے۔

شام کے جلسہ میں بولپور کی دوسری لڑکی "مس ہنترا مصرا" نے اس جدید فن رقص کی نمائش کی جو ٹیگور اسکول کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے اور جس کو موسیقی حرکات (Action Song) کہتے ہیں۔ اس نے اپنے رقص کے ذریعہ سے "شیو" کی ان آہانہ حرکات رقصیہ کو پیش کیا جو ہند و علم الاصنام کے شعبۂ فنون لطیفہ کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جس وقت اپنے پاؤں کو آہستہ آہستہ اٹھا کر فرش کی طرف مائل کرتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سارے کرۂ ارض پر چھا جانا چاہتی ہے اور جب اپنے ہاتھوں کو بلند کرکے نرم و نازک انگلیوں کو اوپر کی طرف تان لیتی تھی تو اس کے لچیلے جسم کے تمام پیچ و خم کے ساتھ یہ منظر کچھ ایسی کیفیت کا اظہار کرتا تھا جو کہ عام رقص میں یقیناً کبھی نہیں پائی جا سکتی۔ اس لڑکی کے کتابی چہرہ کے نازک نقوش۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ اور کھنچی ہوئی بھویں۔ جو جذبۂ محبت پرستی کی کھلی ہوئی علامتیں ہیں۔ اسوقت زیادہ تر ایک دیوی کی سی خودداری کو ظاہر کر رہی تھیں اور جسم کے توڑ مروڑ کا تو یہ عالم تھا گویا اس کی ساخت میں صرف زاویوں اور خطوط منحنی سے کام لیا گیا ہے۔ خط مستقیم سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

دوسری شام کے جلسہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ اور انتہائی تباہ کن منظر وہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی نوجوان

صاحبزادی نے اپنے اکتسابات فنِ رقص کا مظاہرہ کیا۔ نوعیت اور شخصیت دونوں حیثیت سے یہ رقص اُس رقص سے یک گونہ جدا تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ کیونکہ وہ رقص خداوندی تھا اور یہ رقص بندگی۔ اگر اُس میں شیوۂ غرور و پندار کو پیش کیا گیا تھا تو اِس میں ایک مُرلی کی سی پرستارانہ سپردگی و نتادگی کو۔ اُس میں صرف آرٹ تھا اور اِس میں آرٹ کیساتھ نسائیت بھی شامل تھی۔ اُس کو دیکھ کر روح دھڑکتی تھی اور اِس کو دیکھ کر دل!

اس لڑکی کا رنگ صاف۔ جسم صحیح و توانا۔ اور اعضاء سڈول تھے۔ اس کے جسم کی جنبش اور حرکات رقصیہ کی لرزش بہت زیادہ محسوس و مرئی تھی اور اگر چشم و ابرو کی سنجیدگی کو علیحدہ کر دیں تو اس میں تمام وہ کیفیتیں پائی جاتی تھیں جو انسان کو آرٹ سے زیادہ مطالعۂ حُسن کی طرف مائل کر دینے والی ہیں۔ مجھے اوروں کے احساس کی خبر نہیں لیکن کم از کم میں ضرور یہ خیال لیکر اٹھا کہ اکتسابِ فن کے لحاظ سے ایک اونچے گھرانے کی شریف لڑکی زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترقی کر سکتی ہے۔ لیکن جب تیسری شب کی صحبت میں مس آساکماری نے اپنے معجزاتِ فن پیش کئے تو میں حیران رہ گیا۔ اور میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ جس قوم کی عورتوں پر "آج" اس طرح طلوع ہوا ہے اس کا "کل" کیا ہو سکتا ہے۔

اس دور کی آزاد و تعلیم یافتہ لڑکیوں کی عمر کا اندازہ کرنے میں ہمیشہ مجھ سے غلطی ہوتی ہے اور باوجود انتہائی احتیاط کے ہمیشہ دو چار سال آگے بڑھ جاتا ہوں۔ لیکن میرے ایک رفیق ہیں (بالکل میرے برعکس بجائے افراط کے تفریط کے عادی ہیں) ان کی رائے ہے کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیرہ۔ چودہ سال کی ہوگی۔ بہرحال اسکی عمر اتنی ہو یا اس سے بھی کم۔ اپنے احساس کے لحاظ سے وہ یکسر پیکرِ شباب و رعنائی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کلی، پھول بن جانے کے لئے صرف صبح کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے آتے ہی نہایت متین انداز سے کھڑے ہو کر پہلے ساز کی آوازوں پر غور کیا اور پھر سر کے اشارہ سے ان کو کسی مقررہ تال پر قائم رہنے کی ہدایت کر کے اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا کہ وہ کسی دیوی کا سنگین مجسمہ تھی جس کے حضور میں نغمۂ عبودیت گونج رہا تھا، جس کی پوجا کرنے کے لئے اتنے لوگ جمع ہوئے تھے۔

آخرکار چند لمحوں کے سکوت و انتظار کے بعد اس خوبصورت مورتی میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک طرف جسم کو لچکا کر، کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس قدر نرمی و نزاکت سے آگے بڑھی گویا کہ طلوع صباح کا اوّلین احساس تھا، جو نسیم کے سب سے پہلے جھونکے کے ساتھ بجائے باصرہ کے روح و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ وہ آگے بڑھتی رہی، اپنے رنگین و نازک پنجوں کی ٹھوکر سے گھونگھروں میں ہلکی سی جھنکار پیدا کرتی ہوئی برابر بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ سم آیا اور پاؤں کی پُرقوت ضرب سے گھونگھروں میں ایک ہنگامہ پیدا کر کے پھر اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا کہ وہ زمانہ کے انقلاب و سکون کا مطالعہ کر رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ عام بازاری عورتوں کی طرح اس کی چشم و ابرو کی جنبش میں کوئی پیامِ شنوید نہ پایا جاتا تھا۔ اس کی کمر کی جنبش یا بدن کی تھرتھری میں طلبِ ہیجان کا کوئی سوقیانہ انداز مضمر نہ تھا لیکن اگر سوال صرف تباہی و بربادی سے پناہ مانگنے کا ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اُن سے زیادہ بے پناہ نہیں۔ اور کس میں اتنا ضبط و تحمل ہے کہ اپنی قربانیاں پیش کرنے کے لئے طلب و تقاضا

کا انتظار کرے۔

اسکا صندلی رنگ اس وقت تکمیل فن کے پندار سے گلابی نظر آتا تھا۔ اسکی وسیع پیشانی پر ابروؤں کا خم ایک خوددارانہ احساس کو ظاہر کرتا تھا جو کمال کی خصوصیت خاصہ ہے۔ اسکے پنکھڑی ایسے نازک لبوں کی لرزش خفی بتا رہی تھی کہ اسکے ناقابل ضبط جذبات میں ساز کے تاروں سے زیادہ نازک ارتعاش پایا جاتا ہے اور اسکے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم نازنین کی بار بار چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بجلی ہے جو تڑپ کر باہر نکل آنے کے لئے بے قرار ہے۔

اس کے رقص میں نہ مس تنزا کا آلہانہ انداز تھا۔ نہ مس بھٹاچاریہ کا سپاسگزارانہ۔ بلکہ یہ وہ کلاسکل چیز تھی جو موسیقی سے بہ حیثیت فن پیدا ہوئی اور جس کے بڑے بڑے علمبردار لکھنؤ میں بندا لکا اور بندادین تھے۔ وہی توڑے اور وہی ماتروں کی تقسیم۔ وہی راہنگرانہ عشوے اور جذبات عشق کی تحلیل و تنظیم۔

الفاظ کیفیات کے اظہار سے قاصر ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان کبھی کسی آرٹ کی تکمیل کا اعتراف کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔

یہاں تک تو خیر صرف شاعری ہی شاعری تھی۔ لیکن اب آیئے کچھ لمحے اس غور و فکر میں صرف کریں کہ جس قوم کی عورتوں کی آزادی اپنی پہلی منزل میں یہ کیفیت رکھتی ہے وہ آیندہ کیا کرنیوالی ہے۔ اور اس دورِ نہضت (Renaisance) میں اس کے مستقبل کی توقعات کے متعلق کیا پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن لڑکیوں کی طرف سے رقص و نغمہ کا یہ بیباک مظاہرہ کیا گیا۔ وہ کسی ایسے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتیں جہاں اخلاق کے خون سے فن کا نشو و نما ہوتا ہے۔ بلکہ اس معزز و تعلیم یافتہ جماعت کی افراد ہیں جو قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہے۔ اور جسے ہیئتِ اجتماعی کے نظام میں "دل و دماغ" ہونیکا مرتبہ حاصل ہے۔ اس لئے ہمارے دل میں قدرتاً جستجو پیدا ہوتی ہے کہ اس سے ان کا مقصود کیا ہے اور فطرت کی وہ کونسی ودیعتیں ہیں جو اس ذریعہ سے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

میں نے خود بھی غور کیا۔ بعض دیگر صائب الرائے حضرات سے بھی گفتگو کی۔ اور سب سے بہتر تاویل جو اسکی کی گئی وہ یہ تھی کہ رقص و موسیقی ہندوؤں کی مذہبی زندگی کا جزو لازم ہے اور اس دورِ ترقی میں ان کے دوسرے کلاسیکل فنون کے ساتھ اسکا ابھر آنا بھی ضروری ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے جہاں اپنی اور خصوصیاتِ معاشر کو ترک کر دیا تھا انھیں میں سے ایک موسیقی بھی تھی۔ لیکن اب کہ مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ اس کے تمام باقی ماندہ اثرات بھی فنا ہو چکے ہیں اور ہندوؤں کا جذبۂ قومیت اپنی تمام روایاتِ دیرینہ و خصوصیاتِ سابقہ کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کی عورتوں میں ناچ گانے کا ذوق نہ پیدا ہو اور رادھا و کرشن کے اس دور کی یاد تازہ نہ کی جائے جو ایک وقت ہند

مذہب اور ہندو آرٹ دونوں کی جان ہے۔

میرے ایک دوست نے جو عورت اور پردہ کے باب میں پورے "فرعون" واقع ہوئے ہیں۔ نہایت ہی سخت استہزاء کے ساتھ اعتراض کیا کہ اگر عورت کا رقص ورود خالص مذہبی چیز ہے تو اس کی نمائش کی کوئی وجہ نہیں اور سر محفل اسکے مظاہرہ کی کیا ضرورت ہے میری رائے میں وہ تاویل اور یہ اعتراض دونوں غلط ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہندو جماعت میں رقص و موسیقی کا رواج یقیناً مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور وہ لڑکیاں جو پبلک میں اس فن کو پیش کرتی ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کے دل میں کوئی جذبہ تقدس واحترام پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال اس کے آرٹ ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ اور اسکی تکمیل کے لئے پبلک میں مظاہرہ ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی فن نقد و تبصرہ کی منزل سے نہ گذرے مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کی اور تمام بُت پرست قوموں کی طرح ہندوؤں میں بھی کسی وقت فنونِ لطیفہ عروج پر تھے۔ اور بعد کو جب اسلامی حکومت یہاں قائم ہوئی تو اُن کا زوال ضروری تھا۔ کیونکہ اسلام سے زیادہ دشمن اس چیز کا کوئی اور نہ تھا۔ لیکن اب کہ مسلمانوں کی تہذیب کا اثر بھی تقریباً معدوم ہو چکا ہے اور دوسری طرف مغربی معاشرت و معیشت کے زیر اثر آزادی و بیباکی عام ہوتی جارہی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہندو پھر اپنے ان قدیم فنون کی طرف متوجہ نہ ہوں جو خود تو فنا ہو چکے تھے لیکن ان کی روایات بدستور قائم تھیں۔

ہندو عورتوں میں اس فن کا ذوق زیادہ تر بنگال اور مدراس میں پایا جاتا ہے اور اسکا سبب صرف یہ ہے کہ مغربی آزادی کا اثر سب سے پہلے انھیں دو صوبوں نے قبول کیا جس حد تک صرف موسیقی کا تعلق ہے مدراس کا ڈھرپد اسکول بہت قدیم چیز ہے اور دکھنی گوئیے اب تک اس پر قائم ہیں۔ رہ گیا بنگال سو اسکی اصل موسیقی پہلے جو کچھ رہی ہو مگر اب وہ خیال و ٹھمری کی موسیقی ہے جو غالباً واجد علی شاہ کے مٹیا برج جانے کے بعد وہاں رائج ہوئی اور اب اس کو غیر معمولی ترقی دیجارہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عورتوں کا اس طرف مائل ہونا بعض قدامت پرست حضرات کے نزدیک حد درجہ معیوب و مکروہ چیز ہے۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ اخلاقی خطرات بڑھ جانے کا بھی اس میں امکان ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عورت کا بے پردہ باہر آجانا اور جدید تعلیم کے زیر اثر اپنی انفرادی خودداری قائم کر کے مردوں کی طرف سے بے نیازانہ زندگی بسر کرنیکا جذبہ اس کے اندر پیدا ہو جانا کیا کم خطرناک ہے۔ اور اگر باوجود ان تمام خطرات کے اسکو دوبارہ پردہ کے اندر بٹھایا نہیں جاسکتا۔ اور تعلیم سے محروم نہیں رکھا جاسکتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ذوق رقص و موسیقی کی مخالفت کی جائے۔ اور وہ دیگر اکتسابات میں اسکو شامل کر کے اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے سے باز رکھی جائے۔

مسئلہ ازدواج میں اس وقت مرد کا رجحان جو صورتیں اختیار کرتا جاتا ہے اس نے عورت کو اپنی زندگی بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور وہ اچھی طرح سمجھنے لگی ہے کہ مرد کے ذوق کو آسودہ کرنے کے لئے اسے کیا کیا چھوڑنا اور کیا کیا اختیار کرنا ہے۔ پہلے مرد کی توقعات عورت کی طرف سے صرف یہ تھیں کہ وہ بچے کی پرورش کرے اور وقت پر کھانا تیار کر دیا کرے۔ اور اگر

تعلق جنسی کی خوشگواریاں زن و شو میں کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ اور نہ دوسری تفریحی دلچسپیاں اس سے متعلق ہوتی تھیں۔ لیکن اب وہ زیادہ آزاد ہوگیا ہے۔ ترقی معاشرت نے اس کے انعطافات زندگی کو زیادہ وسیع بنا دیا ہے۔ اس کے جدید رجحانات گھر میں بیوی سے بھی انھیں دلچسپیوں کے متوقع ہیں جو اسے باہر حاصل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے وہ مجبور ہے کہ اپنی رفیق حیات کے انتخاب میں بھی انھیں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اور اگر کوئی لڑکی ان اکتسابات سے معرا ہوتی ہے تو اسکو شوہر ملنے میں حد درجہ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ انتخاب زن و شو کے مسئلہ میں صرف یہ بات دیکھی جاتی تھی کہ دونوں کے خاندان شریف ہیں یا نہیں اور شرافت نسبی کے علاوہ کسی اور بات کا لحاظ ہی نہ ہوتا تھا۔ یعنی لڑکی کی صورت و شکل بھی کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ سیرت و سلیقہ کا کیا ذکر ہے۔ لیکن اب مسلمانوں میں بھی جہاں آزادی و تعلیم نسبتاً بہت کم ہے۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے یا نہیں۔ اور فنون خانہ داری سے واقفیت رکھتی ہے یا نہیں۔

ہندوؤں میں چونکہ تعلیم بہت زیادہ ہے اور تعلیم کے ساتھ ان میں آزادی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے وہ لڑکی میں اب یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ فنون لطیفہ سے آگاہ ہے یا نہیں اور اس لئے اگر ہندو خاندانوں میں رقص و سرود کی طرف میلان بڑھتا جا رہا ہے تو میں اسکو اقتضاء زمانہ کی مجبوری پر محمول کرتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ آگے کو چل کے اس سے بھی زیادہ کوئی اور تمنا عورت سے متعلق کی جائے گی جو اسے پوری کرنی پڑے گی۔

اس میں شک نہیں کہ فنون لطیفہ اور خصوصیت کیساتھ رقص، موسیقی کا ذوق عموماً جن جذبات کو ابھارتا ہے۔ وہ ضروریات زندگی سے اتنا تعلق نہیں رکھتا۔ جتنا عیش پسندی و تفریح سے۔ اور ظاہر ہے کہ اس ذوق کی فراوانی بے راہ روی کے بہت سے امکانات اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن جب مطلق تعلیم اور تعلیم کے ساتھ مطلق آزادی بھی خطرات سے خالی نہیں تو پھر خصوصیت کے ساتھ فنون لطیفہ کے اکتساب کی مخالفت کرنا اور تعلیم کے باب میں سکوت اختیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ لڑکیاں جو بالکل جاہل ہیں بہ نسبت تعلیم یافتہ لڑکیوں کے زیادہ آسانی کیساتھ دھوکے میں نہیں آسکتیں۔ اور جو تعلیم کیساتھ فن رقص و سرود بھی حاصل کرتی ہیں ان میں لغزش کی زیادہ اہلیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اگر نفسیات انسانی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرد کا عورت سے یا عورت کا مرد سے مغلوب ہوجانا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مغلوب ہونیوالے کے مقابلہ میں فریق ثانی کسی خاص بات میں فائق و برتر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کسی معمولی شکل والی عورت کا خوبصورت مرد کی طرف مائل ہوجانا۔ کسی حسین مرد کا معمولی شکل والی لیکن قابل عورت پر فریفتہ ہوجانا۔ روز کی باتیں ہیں۔ اس لئے اگر عورت اپنے اکتسابات کے لحاظ سے بلند مرتبہ کی ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ یوں آسانی سے مغلوب ہوسکیگی۔ اور مرکسی نا کس میں اس کیلئے کوئی جاذبیت و کشش نہ پائی جائے گی۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کی تعلیم و آزادی کو کیوں خطرناک بتایا جاتا ہے۔ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کو آزادانہ سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھ کر یا پبلک میں اس کے رقص و سرود سے متاثر ہوکر اگر مرد کسی ذہنی یا خیالی معصیت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اسکی کمزوری ہے۔ جو عورت کی اخلاقی کمزوری کو مستلزم نہیں۔ اور اس لئے میرے نزدیک عورت کی موجودہ ترقیوں کی

مخالفت صرف انتقام ہے اُس جذبۂ نارسائی کا جو مرد کو بیتاب و برہم کر دیتا ہے۔ اگر اسکو کوئی ایسی عورت میسر آجائے جو ان تمام صفات سے متصف ہو تو وہ اسکو بیوی بنانے پر نہایت خوشی سے راضی ہو جائیگا اور سو تاویلیں اسکے حُسن و اخلاق کی کریگا۔ لیکن جب تک اسکی دسترس سے دُور ہے وہ سو نقائص اسمیں پیدا کریگا اور اس تیور سے ذکر کریگا گویا عورت تو سپردگی کے لئے ہر وقت تیار رہے مگر اسکا بلند آلہانہ اخلاق اسکو گوارا نہیں کرتا۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس فریب میں زیادہ تر مسلمان مبتلا ہیں اور وہی ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو بے پردہ دیکھ کر سب سے زیادہ بدگمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسکا سبب یہی کم نصیبی جذبۂ نارسائی ہے کہ یہ چیز ان کو اپنی سوسائٹی میں ملتی نہیں اور اس لئے انگوروں کو کھٹا کہہ کر وہ اپنی تسکین کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس نمائش اخلاق کی عمر بھی زیادہ نہیں اور وہ وقت قریب ہے جب مسلمان عورت بھی اسی طرح اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی ہر جگہ نظر آئیگی۔ اور مسلمانوں کا معیار اخلاق بھی اُس کے پاؤں میں گھونگھرو باندھے بغیر نہیں رہیگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس وقت مسلمان عورتیں اس دَور سے گذر رہی ہونگی ہندو عورتیں اس منزل کو طے کر کے تمدن و عمرانیت کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہونگی اور ملکی و قومی زندگی کی اُن حقیقتوں سے گذر رہی ہونگی جن کا احساس اس وقت مسلمان مردوں کو بھی نہیں عورتوں کا کیا ذکر ہے۔

نگار جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں

ہندی شاعری کا پہلا دَور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چند بردائی اور اسکے ہمعصر شعراء۔ جگ نائک سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونۂ کلام۔ اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دَور (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعراء۔ متقلدین رامانند۔ بھاونند، رے داس، بھگت کبیر، گورو نانک دیو، میراں بائی، ملک محمد جائسی، تلسی داس، سور داس، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دَور (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیشو داس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیشو داس کے ہمعصر سندر داس، سیناپت، بابا دین دیال گر، بھوشن، متی رام، چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعراء۔ اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء۔ ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم (سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد) للو لال، سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار بھارتیندو بابو ہریشچندر۔ پدماکر۔ بینی پروین۔ سری دھر پاٹھک کی شاعری۔ شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر۔ اُردو شاعری پر ہندی کا اثر۔ ہندی وہی ہے! اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے۔ اور اُردو رسم الخط میں بھی۔

ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے مگر اس ایک پرچہ کی قیمت عہ ہوگی لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائیگی۔

(مینیجر نگار)

عربوں کا شوق سیاحت
اور
اُن کی تحقیقات جغرافی

صدر اسلام میں عربوں نے جب علم و فن کی طرف توجہ کی تو دُنیا میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ بازار علم کی متاع گراں ارز کے یہی تنہا خریدار تھے۔ اور حکمت و فلسفہ کی دُنیا ان کے وجود پر نازاں تھی۔ عرب لوگ جس وقت علم و حکمت کی غیر فانی دُنیا پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس وقت یورپین قومیں جہالت و ناواقفی کے تاریک بیابانوں میں سرگرداں تھیں۔ عربوں نے جن علوم کی طرف توجہ کی ان کے تمام نشیب و فراز پر پورا عبور حاصل کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں ایسی جامع کتابیں لکھیں جو عربوں کی ذہنی برتری کی آئینہ دار تھیں۔

جس شخص نے تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتا ہے [illegible] خدمت علم کی تحریک دفعتہً ایک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پیدا ہوئی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

اسلام کا آفتاب ساتویں صدی کی ابتدا میں افق عالم پر جلوہ گر ہوا۔ اور ابھی آٹھویں صدی کا چاند نہیں نکلا تھا کہ اُن کی حکومت ایک مستقل و پائیدار حکومت ہوگئی۔ ۶۳۳ء سے لیکر ۶۳۸ء تک عربوں نے شامی بلاد فتح کر لئے۔ اور ۶۲۲ء سے لیکر ۶۴۰ء تک فرات۔ سندھ اور جیحوں کے درمیانی علاقے اسلامی حکومت میں شامل ہوگئے۔ ۶۳۸ء میں مصر۔ ۶۴۳ء میں قیروان۔ ۶۴۹ء میں جزیرہ قبرص اور روڈس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ اور ۷۰۱ء میں بلاد ماوراء النہر۔ ۷۱۱ء سے لیکر ۷۱۳ء تک بلاد اندلس عربوں کے زیر نگیں ہوئے۔ غرض یہ کہ آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں خلفاء اسلام کی حکومت کا دائرہ ہندوستان سے لیکر اوقیانوس اٹلانٹک تک اور جبال قاف سے لیکر صحرائے افریقہ تک پھیل گیا۔

بلاد و ممالک کی تحقیق و معرفت میں عربوں نے بھی اپنی فتوحات سے وہی کام لیا جو رومانیوں نے لیا تھا۔ جس سرزمین پر قدم رکھا اس کے تمام حالات کو تفصیل سے معلوم کیا۔ اور جس شہر کی تسخیر کی اس کی تمام خصوصیات کو دریافت کیا۔ دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے عربوں کے دل میں علوم کے اکتساب کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اس جذبہ کی تکمیل میں ہر امکانی کوششوں سے کام لینا شروع کیا۔ چنانچہ وہ لوگ اپنی فطری ذہانت سے بہت جلد ان علوم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عربوں نے پہلے پہل یونانی لٹریچر کے ابتدائی سرمایہ کو سریانیوں سے حاصل کیا۔ اور سریانیوں نے اُن نسطوریوں سے اسکی تحصیل کی تھی جو شاہان روم کے ظلم سے

گھبرا کر فارس کی طرف بھاگ گئے تھے۔ یہ لوگ علوم و فنون میں عموماً اور طب میں خصوصاً بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے مدینۃ الرہا میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ جس کو زینون ایزوری نے اسی زمانہ میں برباد کر ڈالا۔ لیکن پھر انہوں نے جندیسا پور (خوزستام) میں اس مدرسہ کی دوسری یادگار قائم کی جو عرصہ دراز تک طالبانِ فن اور اربابِ علم و دانش کا مرجع عام رہی۔

عربوں نے جب حکمائے یونان کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا تو ان کی طبیعتوں میں ان تصانیف سے ایک خاص شیفتگی پیدا ہو گئی۔ اور وہ ان تصانیف کے بڑے دلدادہ بن گئے۔ اس تحریک کے اسباب خلیفہ ابو جعفر المنصور العباسی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور خلافت عباسیہ کے فرمانرواؤں میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے علم و فن کی طرف توجہ کی۔ خلیفہ ابو جعفر نے ملوک روم کے پاس متعدد وفود بھیجکر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں۔ اور ماہر فن مترجمین سے اُن کے ترجمے کرائے۔ دارالخلافتہ میں اربابِ علم و فن کی ایک جماعت تھی جو فلسفہ اور علوم میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اور خلیفہ منصور چاند کی طرح اسی جماعت کے ہالے میں رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی علمائے فن کی بہت سی جماعتیں تھیں۔ جو عصر خلافت کی رونق کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

اس باب میں تفصیل سے گفتگو کرنی چونکہ ہمارے اس مقالہ کے حدود سے خارج ہے۔ اس لئے ہم اس دلچسپ بحث کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے یہاں جغرافیہ کی کیا حیثیت تھی؟ اور وہ کیا اسباب تھے جو اس فن کی ترقی کا سبب ہوئے؟

پہلا سبب خلفاء راشدین کی وسعت فتوحات تھی۔ زمانۂ خلافت میں جو ملک فتح کئے جاتے تھے ان کی دو صورتیں ہوتی تھیں صلح و اماں یا جنگ و قوت۔ اور شریعت اسلامیہ میں ہر دو قسم کے مفتوحات کے لئے جداگانہ احکام ہیں۔ اس لئے ملکوں کا جغرافیائی علم ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ ہر مفتوح ملک اور ہر مسخر قبیلہ کے حالات کو جاننے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ پھر چونکہ ان کی حکومت کا دائرہ بڑی حد تک وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ جغرافیائی حیثیت سے ان تمام شہروں کے احوال سے بھی واقف ہوتے گئے۔

دوسرا سبب عربوں کے تجارتی سلسلہ کا غیر معمولی پھیلاؤ تھا۔ عربوں کی تجارت کا دائرہ خود اُن کی فتوحات سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ ان کی تجارت مشرق و مغرب۔ شمال و جنوب تقریباً دُنیا کے ہر ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ فینیشیوں کے زمانہ سے لیکر بطالسہ اور رومان کے عہد حکومت تک یہ لوگ بحر متوسط اور بلاد ہندوستان کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ اگر عربوں کے اس سلسلہ کو اور وسعت نظر کے ساتھ تاریخ میں ڈھونڈیئے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود فینیشی (فینیقی) قوم جو اپنے عہد حکومت میں دریاؤں کی مالک تھی۔ اصل میں شجرۂ عربیہ کی ایک شاخ ہے۔ اس لئے یہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی تجار عرب اسباب تجارت کی تلاش میں مشغول تھے۔ اور ایشیا و شمالی افریقہ کے سواد اعظم کے ساتھ بھی ان کا تعلق اسی بنا پر تھا۔ عربوں میں چونکہ قدرت نے تجارت کا ایک طبعی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس باب میں وہ درجہ حاصل کیا جو قدیم قوموں کو اُس وقت تک حاصل نہ ہو سکا تھا۔ حتیٰ کہ انکشاف امریکہ سے پہلے متاخرین کی بھی کسی جماعت کو وہاں تک رسائی نہیں حاصل ہوئی۔ تجار عرب دُنیا کے گوشہ گوشہ میں مصروف تجارت تھے۔ اور ان کے قافلے دُنیا کے چپے چپے میں تجارتی سامان کی خرید و فروخت کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ عربوں کے تجارتی راستے چار تھے۔

پہلا راستہ اندلس۔ یورپ۔ اور بلاد صقالبہ (روس) سے ہوتا ہوا بحر خضر۔ بلخ۔ اور بلاد تغزغز کو جاتا تھا۔ دوسرا شمالی افریقہ۔ مصر۔ شام۔ کوفہ۔ بغداد۔ بصرہ۔ اہواز۔ فارس۔ کرمان۔ سندھ۔ اور ہندوستان کا راستہ تھا۔ باقی دو راستے بحر روم کو عبور کرتے ہوئے ایک سویہ اور خلیج عجمی کو جاتا تھا۔ اور دوسرا اسکندریہ اور بحر احمر سے ہوتا ہوا بحر ہند میں مل جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عرب کی تجارت کا سلسلہ مشرق میں جزائر ایشیا سے لیکر چین تک اور شمال میں اواسط ایشیا اور بلاد صقالبہ (روس) سے لے کر بحیرہ بالٹک کے ساحلوں تک اور جنوب میں مشرقی افریقہ کے ساحل سے ماداگاسکر تک اور مغرب میں موڈان سے لیکر بحر اٹلانٹک کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔

منجملہ دیگر اسباب کے ایک بڑا سبب فریضۂ حج بھی تھا۔ اطراف عالم سے کعبہ کا قصد کرتے تھے (جیسا کہ اس وقت بھی بطریقہ جاری ہے) اور بغداد۔ قاہرہ اور دمشق میں سب لوگ جمع ہوتے تھے۔ پھر یہیں سے اقطار حجازیہ کے ارادہ پر سفر کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوگئے جنہوں نے مختلف بلدان و ممالک کے متعلق خود اپنے شاہدات اور غیروں کے سنے ہوئے واقعات کو مدون کیا۔ متقدمین اسلام نے مقامات کی تحقیق میں جو کتابیں تصنیف کیں وہ دو قسم کی تھیں۔ بعض کا منشاء صرف مشہور شہروں کا حال بیان کرنا تھا۔ اور بعض کا مقصود صرف ان مقامات کا بیان تھا جو عربوں کی روایات اور اشعار میں اکثر ملتے ہیں۔ جن مصنفین نے شہروں کی طرف توجہ کی وہ تقریباً اس میدان میں متقدمین حکماء یونان کے نقش قدم پر چلے۔ اور راستوں کی مسافت کو بھی متعین کیا۔ اس زمرہ میں ابن خردادبہ۔ احمد بن واضح۔ جیہانی۔ ابن الفقیہ۔ ابوزید البلخی۔ ابواسحٰق الاصطخری۔ ابن حوقل۔ ابوعبداللہ البشاری۔ حسن بن محمد المہلبی۔ ابن ابی عون البغدادی۔ ابوعبید البکری۔ قزوینی۔ یاقوت حموی۔ شمس الدین مقدسی۔ ابوالحسن علی الہروی۔ شریف ادریسی۔ ابوالفداء۔ ابوالعباس احمد السرخسی۔ علی بن حسین المسعودی۔ مراکشی۔ عبدالرشید الباکوری۔ ابوالقاسم شیرازی۔ شیخ ازہری الاسفرائینی۔ شیخ تقی الدین المقریزی۔ خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنی تصنیفات میں صرف اماکن عربیہ اور منازل بدویہ کے بیان پر اکتفا کی ہے ان میں ابوسعید سیرافی۔ ابومحمد الاسود غندجانی۔ ابوزیاد کلابی۔ محمد بن ادریس بن ابی حفصہ۔ ہشام بن محمد الکلبی۔ ابوالقاسم زمخشری۔ ابوالحسن عمرانی۔ ابوعبید البکری الاندلسی۔ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی۔ ابوالفتح نصر بن عبدالرحمٰن الاسکندری۔ برہان الدین۔ ابراہیم البقاعی۔ ابوالفتح محمد الہمدانی۔ ابن الجوزانی۔ علی بن محمد الخوارزمی۔ محمد بن ادریس الحنفی۔ ابوالمجد اسمٰعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی۔ ابوالفضل البقالی الخوارزمی۔ ابوعمر محمد الکندی۔ ابوعبداللہ محمد القضاعی۔ ظاہری۔ ابوالحسن احمد الاشعری۔ ابوسعید اصمعی۔ ابوعبید السکونی۔ حسن بن احمد الہمدانی۔ ابوالاشعث الکندی کا ذکر ضروری ہے۔

مسلمانوں میں ان کے سوا ایک دوسری سیاح جماعت بھی تھی۔ جس نے اپنی سیاحتوں کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ ان میں ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح کا نام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہے۔ ان ہی سیاحوں میں بعض اہل ادب نے جغرافیۂ طبعی میں بہت زیادہ تحقیق سے کام لیا۔ اسلامی شہروں کے علاوہ دوسرے ممالک کے حالات و واقعات بھی سپرد قلم کئے۔ لیکن غیر اسلامی ممالک کے متعلق ان لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ان کا بیشتر حصہ اگرچہ غیر محقق تھا لیکن پھر بھی ان کی محنت کی داد دینا پڑتی ہے

کیونکہ وہ لوگ ان قوموں کی زبانوں سے ناواقف تھے۔ اور ان قوموں کیساتھ چند ناگزیر اسباب کی بناء پر ان لوگوں کا اختلاط بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ابو الفدا نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"میں نے اس مختصر کتاب میں ان کی وہ تمام معلومات یکجا کر دی ہیں جو کتابوں میں متفرق طور سے موجود تھیں۔ اس فن میں اب تک جتنی کتابیں تالیف کی گئیں وہ اصل مقصود پر بہت کم حاوی ہیں۔ اقلیم چین جو اپنی عظمت اور کثرت آبادی میں شہرۂ آفاق ہے اس کی خبریں ہم کو بہت کم معلوم ہیں اور جو کچھ معلوم ہیں وہ بھی غیر محقق ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے متعلق بھی جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ تشنۂ تحقیق ہیں۔ بلاد بلغار۔ بلاد جرکس۔ بلاد روس۔ بلاد سرب۔ بلاد اولق (فلاخ)۔ بلاد فرنگ خلیج قسطنطینی سے لیکر بحر محیط غربی تک بہت سے بڑے بڑے شہر ہیں۔ لیکن بعض شہروں کے علاوہ ان ممالک کے اسماء تک سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی طرح سوڈان کے جنوبی علاقہ میں بھی بہت سے بلاد ہیں۔ جو حبش۔ زنگ۔ نوبہ۔ تکرور۔ زیلع وغیرہ سے بالکل مختلف اور جدا ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی معلومات فن کا خزانہ یکسر خالی ہے۔ مصنفین اسلام نے کتب مسالک الممالک کا بیشتر حصہ صرف اسلامی ممالک کی تحقیقات میں صرف کر دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی۔ الخ"

غرض یہ کہ مسلمانوں نے ابتداء میں اس فن کی جو خدمات انجام دیں وہ اگرچہ غلطیوں سے پاک نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مسلسل کوششوں نے ان کو آگے چلکر اس میدان میں بہت کامیاب ثابت کیا۔

(۲)

آٹھویں صدی میں جغرافیہ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں۔ وہ عبارت ہیں ان رسائل سے جن کی تصنیف کا منشاء صرف بدوی قبائل کی نفع رسانی تھی۔ چنانچہ یہ تمام کتابیں محض پہاڑوں۔ وادیوں۔ صحراؤں اور منزلوں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ ازانجملہ ایک کتاب النضر البصری مشہور تصنیف ہے۔ جس کو مصنف نے آٹھویں صدی کے اواخر میں خراسان میں بیٹھ کر تصنیف کیا تھا۔ اسکا مصنف ۲۰۴ھ میں پیدا ہوا۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس میں زیادہ تر مرد و عورت۔ جانور۔ پہاڑوں۔ چاند و سورج۔ دودھ اور شراب۔ شجر و نبات۔ پانی اور چشمے۔ ہوا اور بدلی وغیرہ کے خواص و افعال سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کی ترتیب بڑے عمدہ انداز پر کی ہے۔ اور وہ تمام باتیں تفصیل کیساتھ اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ جن کی بدوی قبائل کو اکثر ضرورت پڑا کرتی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بھی اس قسم کی بہت سی کتابیں ہیں۔

ممالک و بلدان کی تعریف میں سب سے پہلے جو مبسوط کتاب تالیف کی گئی وہ ابو اسحٰق اصطخری کی مشہور تصنیف ہے۔ ابو اسحٰق ان نامور علماء اسلام اور مشاہیر سیاحین میں سے ہیں، جو نویں اور دسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ جن لوگوں نے اسباب فن کی تلاش اور در علم کے جستجو میں مختلف اماکن و امصار کی سیاحت کی۔ ہر ملک کے حالات و آثار کو جمع کیا۔ اور خواص بلدان و امزجۂ اقالیم کی حقیقت بھی معلوم کی۔ ان سیاحوں میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک جماعت نے تو صرف اپنے حالات سیاحت

ہی کو مدوّن کرنے پر اکتفا کی۔ اور دوسری جماعت نے اپنے سفرناموں میں مشاہدات کے علاوہ تاریخی۔ جغرافیائی اور ادبی تصنیفات کے معلومات کو بھی حکماء یونان کے دستور کے موافق بیان کیا۔ ان لوگوں کے پاس چونکہ علوم و فنون کی تحصیل کے ذرایع کثیر نہ تھے۔ اس لئے وہ لوگ اس کے لئے سفر پر مجبور ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے نامور مؤرخین مثلاً ہیرودوٹس اور بولنیوس یا مسلمانوں میں مسعودی و ابن حوقل وغیرہ بہت بڑے سیاح بھی تھے۔

ابو اسحٰق ابو اسحٰق اصطخری دسویں صدی کے نصف اول میں مدینۂ اصطخر میں پیدا ہوا۔ جو فارس کا ایک مشہور شہر ہے۔ علم کی تلاش میں اس نے بعض اسلامی شہروں کا سفر کیا۔ اور جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں مختلف دیار و امصار۔ جبال و انہار کے مواقع اور بعض بعض مسافتوں کو بیان کیا۔ اگرچہ مصنف خواص بلدان اور امزجۂ اقالیم کی تحقیقات بخوبی نہ کر سکا لیکن پھر بھی موصوف کی یہ کاوشیں بہت کچھ لائق تعظیم ہیں۔ یہ اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کی یہ تصنیف کتب مسالک والممالک میں بہت مشہور ہے۔ ابن حوقل نے جو ان سے چند سال بعد پیدا ہوا۔ اپنی تصنیفات میں اس کتاب سے اکثر جگہ استشہاد کیا ہے۔ لیکن ابو اسحٰق نے بھی اپنی یہ کتاب ابو زید البلخی کی ایک کتاب تقویم البلدان کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھی۔ جس کو ابو زید نے (بہ روایت مسعودی) تقریباً ۳۰۸ھ میں تصنیف کیا تھا۔ قدماء مصنفین کے پاس چونکہ ذرایع معلومات کی کثرت نہ تھی اس لئے بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں کا طرز نگارش یہ تھا کہ وہ لوگ ذاتی مشاہدات کے علاوہ اگلے مصنفین کی کتب تواریخ و جغرافیہ کا خلاصہ بھی اپنی تصنیفات میں درج کر دیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو یونان کے ماہرین جغرافیہ اور مشاہیر اہل قلم نے بھی اختیار کیا تھا۔ چنانچہ بطلیموس کی عظیم الشان جغرافیائی تصنیف حقیقت میں مارنیوس کے جغرافیہ کی دوسری نقل ہے۔ جس کو بطلیموس نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔

نویں صدی کے اندر علم الجغرافیہ میں جتنی کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں ایک مشہور کتاب المسالک والممالک مصنفۂ ابو العباس احمد بن محمد الطیب السرخسی (المتوفی ۸۹۹ء) بھی ہے۔ اس کتاب تصنیف کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے اپنی بعض کتابوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن میں عبید اللہ بن عبد اللہ المشہور با بن خرداذبہ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں کی یہی ایک تصنیف ہے۔ جو علامہ شریف ادریسی کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق سے بہت مشابہ ہے لیکن اس سے زیادہ مختصر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف مقامات کی مسافتوں کو بیان کیا ہے راستوں کی تعیین کی ہے۔ اور بعض دوسرے جغرافیائی حقائق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ پیرس میں ۱۸۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مسعودی بغداد میں نویں صدی میں پیدا ہوا۔ مسعودی بچپن ہی سے طلب علم اور سیر و سیاحت کا بڑا شائق تھا۔ عنفوان شباب ہی میں وہ تمام ممالک اسلامیہ اور قرب و جوار کے ممالک کا سفر کر چکا تھا۔ مسعودی علم و فن کا بڑا حریص تھا۔ اس نے بہت سے علوم کی تحصیل کی لیکن حکمت و ادب۔ تاریخ و جغرافیہ اس کے ذوق کی خاص چیزیں تھیں۔ ۹۱۵ء میں اصطخر آیا۔ اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا۔ پھر ہندوستان کا سفر کیا۔ اور یہاں کے بعض حصوں کی جغرافیائی تحقیقات کی۔ (ایک مرتبہ اور اس سے چار برس پہلے بھی وہ ہندوستان آ چکا تھا) اس کے بعد بحر جنوبی سے ہوتا ہوا مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر اُترا۔ اور کچھ دنوں کے بعد پھر دریا کو عبور

کرکے جزیرہ عرب میں آیا۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ہے۔ جو ان سیاحوں کی واقعی تاریخ بتا سکے۔ اس کی تصنیفات سے البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً سنہ ۹۴۳ء میں سیر و سیاحت کو ختم کرکے باقی عمر ان تصنیف و تالیف میں بسر کردی۔ مسعودی نے سنہ ۳۴۶ھ مطابق سنہ ۹۵۷ء میں بمقام فسطاط وفات پائی۔

مسعودی نے ایک کتاب اخبار الزماں و من اباده الحدثان تاریخ میں لکھی۔ جو فن کی عظیم الشان تصنیف ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں پہلے ہیئت ارض۔ دیار و امصار۔ جبال و انہار۔ معادن و منابع کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر تمدن و عمران۔ اخبار و حوادث۔ اصل نسل۔ انقسام اقلیم۔ اور طبائع انسانی کے اختلافات وغیرہ جیسے اہم مسائل کو حوالہ قلم کیا ہے۔ اس کے بعد قرون ماضی کے گذشتہ اقوام و امم۔ ملوک و سلاطین۔ انبیاء اور اولیاء کے واقعات درج کئے ہیں۔ پھر ہر سن کے تحت میں مختلف واقعات اور متفرق حوادث کو تا وقت تالیف مروج الذہب یعنی سنہ ۳۳۲ھ مطابق سنہ ۹۴۳ء تک تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنے مطالب گوناگوں کی وجہ سے بہت زیادہ ضخیم ہوگئی۔ اس لئے مصنف نے پھر ایک دوسری تصنیف کتاب الاوسط کے نام سے مرتب کی۔ جس میں اخبار الزماں کی تفصیلات کو اجمال کیساتھ بیان کیا گیا۔ لیکن اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل تھی کہ کتاب کی ضخامت کچھ زیادہ کم نہ ہوسکی۔ اس لئے مصنف نے اسی اوسط کا بھی ایک معقول اختصار مروج الذہب و معادن الجوہر کے نام سے تالیف کیا۔ مسعودی کی کتاب اخبار الزماں تیس فن پر مشتمل ہے۔ اور یہ تصنیف بہت ہی نادر و کمیاب ہے۔ اور کتاب الاوسط بھی جو اخبار الزماں کیساتھ بیس جلدوں سے زیادہ میں شائع ہوئی تھی اس وقت بالکل ناپید ہے۔ مروج الذہب کے مقدمہ میں (جو اس سلسلہ کی تیسری سنہری کڑی ہے) مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"میں اس کتاب میں ان تمام باتوں کو مجمل طور سے بیان کروں گا جن کو اخبار الزماں میں بسط و تفصیل کیساتھ لکھ چکا ہوں اور ان باتوں کو بھی اختصار کیساتھ عرض کروں گا جو کتاب الاوسط میں آچکی ہیں۔ غرضکہ یہ کتاب اخبار الزماں اور کتاب الاوسط دونوں کے مطالب کا خلاصہ ہوگی"

مروج الذہب فن کی موجودہ عربی تصنیفات میں مشہور چیز ہے۔

ابن حوقل

ابو محمد بن علی الموصلی نام اور ابن حوقل کنیت ہے۔ دسویں صدی کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا۔ اور یہیں نشو و نما پائی۔ جس وقت مسعودی گوشہ نشین ہوچکا تھا۔ اس وقت ابن حوقل بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف تھا۔ اور ۲۸ برس تک مسلسل (سنہ ۹۴۳ء سے لیکر سنہ ۹۷۱ء تک) سفر کرتا رہا۔ سفر سے لوٹنے کے بعد سنہ ۹۷۶ء میں اس نے اپنے مشاہدات کو کتاب المسالک والممالک میں مدون کیا۔ اس کتاب میں زیادہ تر ممالک اسلامیہ ہی کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور غیر اسلامی شہروں کے متعلق بہت کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ابو الفدا نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس کتاب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"ابن حوقل کی یہ کتاب بہت ہی مطول ہے۔ مصنف نے ممالک کا حال نہایت ہی استقصاء کیساتھ بیان کیا ہے لیکن طول و عرض اور اسماء مقامات وغیرہ کی تفصیل نظر انداز کردی ہے۔ اس وجہ سے کتاب کا بیشتر حصہ ناقص اور مجہول الاسم رہ گیا ہے"

ابن حوقل نے اس کتاب میں ثروت بلاد۔ تجارت ملک۔ (ٹیکس اور محصول) پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور راستوں کی مسافت کو

بھی خاص طور سے بیان کیا ہے۔ علماء یورپ نے ۱۸۷۳ء میں اس مفید تصنیف کو لیڈن میں شائع کیا۔ اور ۱۸۷۰ء میں یہیں پر ابو اسحٰق اصطخری کی مشہور تصنیف بھی شائع ہوگئی۔ اور لیڈن ہی کے کسی مشہور اہل قلم نے ان دونوں کتابوں کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی لکھا۔

دسویں صدی کی جغرافی تصنیفات میں ابو محمد حسین بن احمد الہمدانی النحوی المتوفی ۹۳۵ء کی ایک کتاب المسالک والممالک ہے اس کتاب میں مصنف نے یمن اور جزیرۂ عرب کا حال پوری تحقیقات کے ساتھ لکھا ہے۔ شیخ شمس الدین ابی عبداللہ۔ محمد بن احمد المقدسی البشاری المعروف بابن البناء کی مشہور تصنیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم فن کی ایک جلیل القدر کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے بلاد و ممالک۔ بر و بحر۔ جبال و انہار۔ طرق و مسالک۔ معادن و منابع کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف اس کتاب کے متعلق خود لکھتا ہے کہ:-

"اگر اس کتاب کا دیکھنا مسافروں کے لئے ضروری ہے۔ تو علماء و رؤساء بھی اس سے مستغنی نہیں ہیں"

مصنف نے پہلے جہاں تک ہوسکا اقالیم کی خود سیاحت کی۔ اور مختلف مسافتوں کو فرسخوں سے متعین کیا۔ اور جن چیزوں کا خود مشاہدہ نہیں کرسکا ان کے متعلق معتبر لوگوں سے تحقیقات کی۔ ان سب کے بعد ۹۸۵ء میں ابن حوقل کے دس سال بعد اپنی یہ بےنظیر کتاب تصنیف کی۔ ابو عمر محمد بن یوسف الکندی المتوفی ۹۶۱ء کی بھی ایک کتاب "خطط مصر" بھی اسی زمانہ کی ہے۔

عہد مسعودی میں بلاد بلغار کے کسی امیر نے خلیفہ المقتدر باللہ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ میرے پاس کچھ ایسے لوگ بھیجیں جو احکام اسلام نماز روزہ کی تعلیم دے سکیں۔ خلیفۃ المقتدر نے علماء اسلام کی ایک جماعت اس امیر کے یہاں بھیجی۔ جن میں احمد بن فضلان بن عباس بن راشد بن حماد بھی تھے جو سفیر کی حیثیت سے تھے۔ ابن فضلان نے اس سفر کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ اور اس میں وہ تمام واقعات تفصیل سے بیان کئے جو راستہ میں بغداد سے والگا تک مشاہدہ میں آئے تھے۔ اور یہ سفر ۳۰۹ھ (۹۲۱ء) کو ہوا تھا۔ ابن فضلان کا یہ رسالہ نادر الوجود ہے۔ بعض مصنفین کی تصنیفات میں اس کے کچھ کچھ احوال و اقتباسات ملتے ہیں۔ جو سرتاپا بلاد صقالبہ اور روسی اقوام کے احوال و عادات پر مشتمل ہیں۔ اسی قسم کا ایک دوسرا رسالہ اور ہے جس کو ابن رستہ نے بلاد شمالیہ کے متعلق اسی زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اور ابن فضلان سے دو برس پہلے ابراہیم طرطوشی نے بھی بلاد صقالبہ کا سفر کیا تھا۔ اور یہ پہلا سیاح ہے جس نے سب سے پہلے شمالی روس کی سیاحت کی۔ اور بحر ابیض کے کناروں پر رہنے والی قوموں کے حالات و واقعات کی کامیاب تحقیقات کی۔

(۴)

ان کے علاوہ سلف میں بہت سے ایسے بحری سیاح بھی پیدا ہوئے۔ ان سیاحوں میں بروایت مسعودی سب سے زیادہ مشہور بلکہ بلحاظ زمانہ سب سے پہلے سلیمان نامی ایک تاجر گزرا ہے۔ جو نویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شخص خلیج فارس کے کنارے بندر سیراف میں رہتا تھا۔ سیراف اس زمانہ میں فارس کی ایک بہت بڑی مشہور بندرگاہ تھی۔ ہندوستان اور مشرق اقصیٰ کی تجارت کا دائرہ چونکہ اس عہد میں بہت زیادہ وسیع ہوگیا تھا۔ اس لئے تمام اطراف عالم سے یہاں تک کہ چین اور ملایا سے بھی تجارتی جہازات اسی بندرگاہ کا رخ کرتے تھے۔ سلیمان ایک تاجر تھا۔ اس لئے اسباب تجارت کی تلاش میں اس نے سفر کرنا شروع کیا۔ اور اسی سلسلہ میں بحر ہند کو عبور کرکے

سیلون و ملاکا سے ہوتا ہوا چین پہنچا - اور پھر کچھ دنوں کے بعد وطن لوٹ آیا - سلیمان کے اس قیمتی سفرنامہ کو ابو زید بلخی نے ۸۸۰ء کے قریب اور مفید معلومات کا اضافہ کرکے مرتب کیا - اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو چکا ہے - اور یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں پیرس میں شائع بھی ہو گئی ہے - چینی بلاد کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مفید کتاب ہے - علامہ رینوڈ نے ۱۸۴۵ء میں دوبارہ اس کا ترجمہ مع اصل عربی کے شائع کیا تھا - ابو زید احمد بن سہل البلخی المتوفی ۹۵۱ء کی ایک کتاب صور الاقالیم بھی ہے - اس کے علاوہ کتاب المسالک و الممالک اور کتاب البدء و التاریخ بھی انہی کی تصانیف عالیہ ہیں - جو فن کی بے نظیر کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں -

بیرونی بارھویں صدی عیسوی میں بھی بعض ایسے سیاح پیدا ہوئے جنہوں نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں - ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر علامہ بیرونی کی ذات گرامی ہے - شیخ العلامہ ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی الخوارزمی المتوفی ۱۰۴۸ء ہیئت و نجوم - تاریخ و جغرافیہ کے بڑے ماہر تھے - چنانچہ ہیئت و نجوم میں "قانون مسعودی" اور تاریخ میں "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" آپکی مشہور تصنیفات ہیں - موخر الذکر تصنیف معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے - اس میں مصنف نے مختلف جماعتوں کی تاریخ بیان کی ہے - اور فن تاریخ کے اختلاف اور مبادی و اصول کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے - بیرونی ریاضیات اور علم ہیئت کا امام مانا جاتا ہے - اور یہ پہلا شخص ہے جس نے سندھ اور شمالی ہندوستان کے شہروں کی تحقیقات کرکے ان کے نقشوں کی غلطیاں درست کیں - خصوصاً بلدان اسلامیہ کی تحقیقات غیر معمولی اعتناء کے ساتھ کی - بیرونی گیارہ برس تک (۱۰۰۰ء سے لیکر ۱۰۱۱ء تک) سلطان محمود غزنوی کے ساتھ لڑائیوں کے سلسلے میں یہاں پر رہا - ہندوؤں کی بعض سنسکرت تصنیفات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا - بیرونی درحقیقت ان مجتہدین عظام میں سے ہے جنہوں نے علوم و فنون کی غیر معمولی خدمات انجام دیں - الآثار الباقیہ کے بعض حصے پیرس میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں -

شیخ ابو محمد الحسن بن احمد الہمدانی نے ۹۳۶ء میں ایک کتاب اسماء اماکن میں تصنیف کی - اور ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری الاندلسی المتوفی ۱۰۹۴ء نے جغرافیہ میں ایک عام کتاب "المسالک و الممالک" کے نام سے تصنیف کی - پھر ۱۰۶۷ء میں بلاد مغرب اور افریقہ کے متعلق کتاب المغرب مرتب کی - اس میں وادی نیل سے لیکر بحر اتلانتک تک اور بحر متوسط سے لیکر سوڈان تک کے حالات لکھے گئے ہیں - یہ کتاب بہت مختصر ہے - میرا خیال ہے کہ کتاب المغرب مصنف کی پہلی کتاب المسالک و الممالک سے ماخوذ ہے - پہلے یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں جزائر میں شائع ہوئی تھی - پھر پیرس میں دوبارہ فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں شائع کی گئی - اس کے علاوہ مصنف کی ایک اور کتاب المعجم بھی ہے جس میں عجمی اسماء اماکن کو درج کیا گیا ہے - یاقوت نے اس معجم کا تذکرہ کیا ہے اور یہ معجم اس وقت بھی یوروپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے - اور یہ پہلا معجم ہے جو عربی زبان میں مرتب کیا گیا - لیکن مصنف نے اس میں صرف ان ہی منازل عربیہ کے بیان پر قناعت کی ہے جو عربوں کے اشعار و اخبار میں پائے جاتے ہیں -

ابو عبد اللہ محمد بن سلامت القضاعی المتوفی ۱۰۶۲ء نے بھی ایک مشہور کتاب "خطط مصر" میں تصنیف کی جس کا نام "المختار فی ذکر الخطط و الآثار" ہے - شیخ ابو القاسم محمود زمخشری المتوفی ۱۱۴۳ء نے بھی ایک معجم تصنیف کی - جو اگرچہ باعتبار حجم معجم بکری سے

زیادہ مختصر ہے۔ لیکن باعتبار صحت اس سے کہیں زیادہ مستند ہے۔ صاحب قاموس نے زمخشری کے اسی معجم سے بہت سے شہروں کے
نام نقل کئے ہیں۔ اور اکثر مقامات میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔ حقیقت میں فن کی یہ ایک بہت ہی مستند کتاب ہے۔ زمخشری کے
شاگرد رشید علامہ ابوالحسن العمرانی نے اس کتاب میں اپنی طرف سے بہت سے اور قیمتی اضافے کرکے اسکو زیادہ شاندار بنادیا ہے۔
۱۸۵۶ء میں یہ مفید تصنیف پیرس میں شائع ہو چکی ہے۔ اور لاطینی زبان میں اسکا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ابو الفتح نصر بن عبدالرحمن اسکندری
المتوفی ۵۶۰ھ کی ایک کتاب "اسماء البلدان" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور بھی تصنیف ہے۔ جس میں مقامات کے اختلاف کو بڑی
خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ حافظ ابو موسیٰ محمد بن عمر الاصفہانی نے اس کتاب کا اختصار لکھا۔ یاقوت حموی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ
"میں نے اسکو ایک مفید تالیف پایا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی معجم میں اس کتاب سے بہت جگہ نقل کیا ہے"
علی بن محمد الخوارزمی المتوفی ۵۶۰ھ کی کتاب "اشتقاق اسماء المواضع والبلدان" بھی اس فن کی عمدہ کتاب ہے۔ "منازل عرب"
کے بیان میں ابو الفضل محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی ۵۶۲ھ کی بھی ایک تصنیف ہے۔

ادریسی

شریف محمد بن محمد الادریسی الصقلی کی مشہور کتاب "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" اس فن میں بے نظیر ہے۔ علامہ
ادریسی نے روجیر افرنجی حاکم صقلیہ (سسلی) کے لئے اسکو تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب سات اقلیموں پر مرتب کی گئی ہے۔
اس کتاب میں بلاد و ممالک کے اوصاف و حالات کو پوری تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے۔ میل اور فرسخ کے حساب سے مسافتوں کی تعین
بھی کی ہے۔ لیکن تاہم ممالک کے طول و عرض کے کوئی بحث اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اسکا اختصار بھی لکھا
ہے۔ شریف ادریسی بارھویں صدی کے مشہور جغرافیہ دانوں میں ہے۔ طلب علم کے لئے پہلے قرطبہ کا سفر کیا۔ پھر وہاں سے صقلیہ (سسلی)
چلا گیا۔ ادریسی چونکہ بہت بڑا فاضل اور روشن دماغ تھا۔ اس لئے فرمانروائے سسلی نے اسکو اپنی مصاحبت خاص میں لے لیا۔ اور
وہ شاہی دربار میں رہنے لگا۔ اسی تعلق سے ادریسی نے اپنی مشہور تصنیف "نزہۃ المشتاق" روجر کے نام پر لکھی۔ ۱۱۵۴ء میں جب
اس تصنیف سے ادریسی کو فراغت ملی تو اس نے روجر کے لئے چاندی کا ایک مسطح کرہ بنایا جس کا وزن ۸۰۰ مارک تھا۔ اور اس کرہ
پر تمام اقالیم مشہورہ کا نقشہ بنایا۔ ادریسی مسلم اور فرنگی جغرافیہ دانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جبرائیل صہیونی المتوفی ۱۶۴۸ء
اور حنا حصرونی (جبل لبنان) دو مشہور فاضلوں نے اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ جو ۱۶۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔
پھر ۱۸۳۶ء میں اسکا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا وہ حصہ جو مغرب۔ سوڈان۔ مصر۔ اندلس کے حالات
میں ہے علیحدہ ۱۸۶۶ء میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ لندن میں چھاپا گیا۔
ادریسی نے "نزہۃ المشتاق" میں اگلے علماء فن کی تصنیفات سے بھی بہت کچھ مدد لی ہے۔ اور ذاتی مشاہدات کے
علاوہ تجار و ملاحین کے منقولات بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں مختلف مقامات کے ۶۹ نقشے ہیں۔ جن کو ادریسی نے مذکورہ
بالا کرہ سے بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن میں ادریسی کی ایک کتاب "روض الانس ونزہۃ النفس" بھی ہے۔ یہ کتاب نزہۃ المشتاق
سے زیادہ عام ہے۔ ابو الفداء نے اس سے بہت مدد لی ہے۔ اور اسکا نام کتاب الممالک لکھا ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نادر الوجود تصنیف کا ایک نسخہ پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔

فن کی کتابوں میں ابو المجد اسمٰعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی کی مشہور تصنیف مزیل الارتیاب عن مشتبہ الانساب بھی ایک عمدہ کتاب ہے۔ علامہ تویدر نے تقویم البلدان میں اسکا حوالہ دیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ضبط انساب پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کتاب التفصیل" بھی ہے۔ ابو الحسن علی المراکشی کی کتاب الممالک و المسالک بھی فن کی ایک اچھی کتاب ہے۔ ابن الوردی نے اسکا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمس الدین محمد الانصاری الدمشقی کی کتاب نخبۃ الدہر فی عجائب البر و البحر اور شیخ ابن ابی اسفرائینی کی کتاب عجائب الدنیا۔ ابن الجزار کی کتاب عجائب البلدان۔ ابو الحسن احمد الاشعری کی کتاب اللباب الی معرفۃ الانساب۔ ابو الفتح محمد بن جعفر الہمدانی کی کتاب اسماء البلدان۔ محب الدین ابن النجار البغدادی المتوفی سنہ ۶۴۳ھ کی کتاب عیون اخبار الدنیا۔ ابو القاسم مسلم بن محمود الشیرازی کی کتاب عجائب الاسفار و غرائب الاخبار۔ حسن بن احمد المہلبی کی کتاب المسالک و الممالک المعروف بہ عزیزی جو عزیز باللہ الفاطمی فرمانروائے مصر کے نام پر تالیف کی گئی۔ اور ابو عبداللہ الجیہانی وزیر خراسان کی کتاب الممالک اللباب میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابو عبداللہ فلسفہ اور نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے غریب سیاحوں کو جمع کر کے مختلف ممالک کے حالات اور پیداوار کو دریافت کیا۔ اور راہوں کی کیفیت بھی تفصیل کے ساتھ پوچھی۔ تاکہ تسخیر ممالک اور فتوح بلدان میں آسانی ہو۔ ابو عبداللہ نے دنیا کو سات حصوں پر تقسیم کیا۔ اور ہر اقلیم کا ایک کوکب مقرر کیا۔ لیکن بڑے بڑے شہروں کے علاوہ اور دیگر مقامات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف راستوں کو البتہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف احسن التقاسیم لکھتا ہے کہ :-

"اس کتاب میں صرف بڑے بڑے شہروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور بہت سی ضروری باتیں چھوڑ دی گئی ہیں اور ان کی جگہ ایسے غیر ضروری واقعات نے لے لی ہے جن کا درج کرنا مصنف کے شایانِ شان نہ تھا۔" الخ

فاضل خلیل بن شاہین الظاہری کی کتاب زبدۃ کشف الممالک فی بیان الطرق و المسالک فضائل مصر میں ایک عمدہ کتاب ہے ابن الحورانی کی کتاب الاشارات الی اماکن الزیارات بھی خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں شروع سے آخر تک شہر دمشق کے حالات اور وہاں کی قبور صحابہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شیخ علی بن ابی بکر السائح الہروی المتوفی بحلب سنہ ۶۱۱ھ (یا ۱۲۱۵ء) کی ایک کتاب "منازل الارض ذات الطول و العرض" ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر سی کتاب "الاشارات الی معرفۃ الزیارات" بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے حلب کے مزارات و مشاہد کو بیان کیا ہے۔ پھر آگے سفر میں جتنے مقامات متبرک معلوم ہو سکے ہیں۔ ان سب کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مصنف اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ :-

"میں نے شام۔ عراق۔ خراسان۔ مغرب۔ یمن۔ جزائر وغیرہ کے شہروں میں بہت سے وہ مشہور مآثر نہیں دیکھے جن کو اصحاب تواریخ نے بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبور کے نشانات مرورِ زمانہ سے محو ہو گئے۔"

مصنف کی تصانیف جلیلہ کا ایک معقول حصہ بعض سفروں میں دریا برد ہو گیا۔ معلوم نہیں ان کتابوں میں کیا کیا جواہر پارے رہے ہونگے جن سے اسلامی لٹریچر کا دامن ہمیشہ کے لئے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ مصنف چونکہ عرصہ تک اماکن مقدسہ کی زیارت

میں مختلف مقامات کا سفر کرتا رہا۔ اس لئے مشاہدات کا بیشتر حصہ خود اسے بھی یاد نہ رہا۔ چنانچہ مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اسکی معذرت پیش کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کتاب میں شام و روم۔ بلاد فرنگ۔ ارض مقدس۔ دیار مصر۔ مغرب۔ جزائر بحر۔ جزیرۃ اطراف ہند۔ حرمین۔ یمن۔ اور بلاد عجم۔ کے مزارات و مشاہد کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ جس کو مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد درج کیا ہے۔

تیرھویں صدی میں بھی مسلمانوں کے اندر ایک جید جماعت پیدا ہوئی جس نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ جماعت سفر و سیاحت میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابن سعید المغربی الغرناطی الاندلسی جو غرناطہ میں ۱۲۱۳ء میں پیدا ہوا اور تیونس میں ۱۲۸۶ء کے حدود میں وفات پائی۔ اس جماعت کا سردار ہے۔ ابن سعید پہلے قاہرہ۔ حلب۔ دمشق وغیرہ ہوتا ہوا مکہ مکرمہ گیا۔ اور حج سے فارغ ہونے کے بعد جب وطن واپس آیا تو اس سفر حجاز کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "النفحۃ المسکیہ فی الرحلۃ المکیہ" ہے۔ اس کے بعد سنہ ۶۵۲ھ میں افریقہ کی سیاحت کی۔ اور سنہ ۶۶۶ھ میں تیونس سے مشرق کا سفر کیا۔ ابن سعید نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے دو تو مشرق و مغرب کے متعدد سفروں کا عجیب و غریب مجموعہ ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "المغرب فی حلی المغرب" ہے۔ اور دوسری کا "المشرق فی حلی المشرق" ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ دوسرے اسفار کے حالات کا دلچسپ مجموعہ ایک کتاب "عدۃ المستجز و عقلۃ المستوفز" ہے۔ لیکن ابن سعید کی تصنیفات میں بہت سی غلط اور دور از کار روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ چونکہ ابن سعید قدماء کی کتابوں سے احوال و واقعات کو بغیر کسی لف و نظر کے صرف نقل کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے اسکی تصنیف میں ایسے اغلاط کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بلاد مغرب اور اندلس کے متعلق ابن سعید نے جو غلط روایات اپنی تالیف میں جمع کر دی تھیں۔ ان کو بعد میں ابو الحسن المراکشی نے ایک دوسری کتاب میں درست کیا۔ ابو الفداء نے اپنی مشہور تصنیف "تقویم البلدان" میں ممالک کے عرض و طول کے بیان میں ابن سعید کی اسی کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس لئے وہ بھی غلطیوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔ اور ان کی کتاب میں بھی یہ تمام خامیاں باقی رہ گئیں۔

یاقوت

یاقوت حموی کی مشہور تصنیف معجم البلدان فن کی اتنی مشہور کتاب ہے کہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ شیخ امام الدین شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی البغدادی یونانی مولد تھے۔ بچپن ہی میں گرفتار ہو کر بغداد کے کسی حموی تاجر کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اپنے آقا کے سایۂ عطوفت میں انہوں نے نشو و نما پائی۔ اور عربی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ اور بہت سے علوم کی تحصیل کی۔ جب جوان ہوئے تو مالک نے ان کو تجارت میں لگا دیا۔ اس سلسلہ میں وہ مختلف ممالک کا سفر کرنے لگے۔ جب مالک نے یاقوت کو آزاد کر دیا تو یہ اپنی ذاتی تجارت کرنے لگے۔ جس میں کتابوں کی تجارت بھی شامل تھی۔ یاقوت کو اسی تجارت نے علمی فائدہ بہت زیادہ پہنچایا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ تقریباً تمام علوم پر قادر ہو گئے۔ مزید براں معلومات سفر کا قیمتی اضافہ اور سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ یاقوت نے بلاد عرب۔ مصر۔ شام۔ جزیرہ۔ خراسان سے لیکر نہر جیحون کے کنارے تک سیاحت کی تھی۔ اور بعض روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں انہوں نے قسطنطنیہ کا بھی سفر کیا تھا۔ اور

۱۲۲۰ء کے قریب وہ خوارزم بھی آئے تھے۔ جب چنگیز خاں تاتاریوں کے ساتھ مصروف پیکار تھا۔ اس لئے وہ پھر بلاد شام کی طرف واپس چلے گئے۔ اور یہیں ۱۲۲۹ء میں انہوں نے وفات پائی۔

یاقوت کی کتاب معجم البلدان جغرافیہ کی ایک جلیل القدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔ اور اس میں تمام مقامات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بلاد و ممالک۔ پہاڑ۔ وادیاں۔ گاؤں۔ قصبات۔ دریا وغیرہ کے مفصل تذکرے موجود ہیں۔ دُنیا کو سات اقلیم پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ملک کی آب و ہوا اور دیگر خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے۔ صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت وغیرہ کے مزاروں کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان لوگوں کے مراثی بھی وہاں سے نقل کئے ہیں۔ بعض یورپین سیاحوں کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ غرض یہ کہ فن کی یہ ایک بڑی جامع تصنیف ہے۔

۶۱۵ھ مطابق ۱۲۱۸ء میں جب وہ "مرو آشاہجان" میں تھا۔ تو یہیں اس کتاب کے لکھنے کے بعض اسباب پیدا ہوئے مصنف کو اس کتاب کے ختم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں۔ ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یاقوت ۶۲۱ھ میں اس کتاب سے فارغ ہوا لیکن تصحیح کے لئے دوبارہ کئی مرتبہ نظر ثانی کی۔ یورپ کے کتب خانوں میں اس کتاب کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ ایک تو وہ قدیمی نسخہ ہے جس کی نقل ۶۲۵ھ میں ہوئی تھی۔ اس نسخہ کی نقل آٹھ جلدوں کے اندر ۱۸۶۶ء میں لیبیک میں شائع کی گئی۔ یاقوت کی اسی قسم کی ایک اور مختصر کتاب ہے۔ جو اسی معجم البلدان سے بہ ترتیب حروف انتخاب کر کے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی کو تجن میں ۱۸۴۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یاقوت اپنی معجم کا ایک بہترین اختصار "مراصد الاطلاع" کے نام سے لکھ رہے تھے لیکن ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ خود ان کی عمر ختم ہو گئی۔ اس اختصار کو ان کے بعد صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق نے پورا کیا۔ جو یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور اچھی چیز ہے۔ شاید جرمنی میں یہ کتاب عنقریب چھپنے والی ہے۔

قزوینی زکریا بن محمد القزوینی تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۳ء میں وفات پائی۔ جغرافیہ میں ایک مشہور کتاب "آثار البلاد و اخبار العباد" کے نام سے لکھی۔ جو ایک مقدمہ اور سات اقالیم پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۷۵ء میں قزوینی نے ایک دوسری کتاب "عجائب المخلوقات" اسی فن میں تصنیف کی۔ لیکن اس کتاب میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ یہ دونوں کتابیں کو تجن میں ۱۸۴۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ قزوینی چونکہ تاریخ طبعی کا بڑا ماہر تھا۔ اس لئے بعض ماہرین فن اس کو بھی "مشرق کا بلینوس" کہتے ہیں۔ زین الدین عمر بن المظفر بن الوردی المتوفی ۱۳۴۸ء کی لکھی ایک کتاب اس فن میں "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں اقالیم و بلدان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں بعض معادن و نباتات کے احوال سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے لیکن تعداد زلات اور کثرت اغلاط کی وجہ سے ناقابل توجہ سمجھی جاتی ہے۔ قاضی تاج الدین بن المتوج المتوفی ۱۳۲۹ء کی کتاب "الفاظ المتامل و ایقاظ المتغفل" بلاد مصر کے بیان میں بہترین تصنیف ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے مشاہیر جغرافیہ دانوں میں ابو الفداء سب سے زیادہ نامور ہے۔ ابو القاسم محمد النویری المالکی نے

بھی جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی - لیکن متقدمین کی روایات کے سوا کوئی نئی بات نہیں لکھی۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان المصری المتوفی ۱۳۴۷ء نے (جو ذہبی کے نام سے مشہور ہیں) ایک معجم صغیر تصنیف کی - عبدالرشید بن صالح بن نوری المتوفی ۱۴۰۳ء کی ایک مشہور کتاب "تلخیص الآثار فی عجائب الاقطار" اسی صدی کی تصنیف ہے۔

ابوالفداء | الملک المؤید عماد الدین اسمٰعیل بن علی بن ایوب بن شاذی (حاکم حماۃ) ۱۲۷۳ء میلاد میں پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ الملک الناصر محمد بن قلاوون کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرکے خدمت سلطانی میں رہنے لگا۔ یہانتک کہ تھوڑے ہی دنوں میں خلیفہ نے اسکو "حماۃ" کا فرمانروا بنادیا۔ ابوالفداء فقہ۔ طب اور نجوم کے علاوہ علم ہیئت میں بھی بڑا ماہر تھا۔ ۱۳۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔ جغرافیہ میں آپکی مشہور کتاب تقویم البلدان ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ اور پوری کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ اس کے بعض حصے فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ابوالفداء مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے:-

> "میں نے اس مختصر کتاب میں وہ تمام معلومات یکجا جمع کردی ہیں جو بہت سی کتابوں میں متفرق طور سے موجود تھیں۔ اور میں اپنی اس تالیف کو اسی طریقہ پر مرتب کرونگا جس طرح ابن جزلہ نے اپنی مشہور طبی کتاب تقویم الابدان کو تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ اسی انداز پر میں اپنی کتاب کا نام بھی تقویم البلدان رکھتا ہوں۔ اور سب سے پہلے میں بھی اُن ہی باتوں کو بیان کرونگا جو روئے زمین کے حالات جاننے میں ضروری ہیں۔"

ابوالفداء نے اس کتاب میں مبادیات فن کے بعد پہلے ملکوں کی تقسیم کی ہے۔ پھر شہروں کے نام۔ ان کا طول و عرض۔ اور وہاں کے حالات تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ کتاب ان اغلاط سے پاک نہیں ہے جن کو مصنف نے قدماء کی کتابوں سے بغیر کسی نقد و نظر اور بحث و تمحیص کے نقل کرلیا ہے۔ مگر پھر بھی ابوالفداء کی یہ کتاب بہت ہی قیمتی اور معلومات فن کا گرانقدر خزانہ ہے۔

ابن بطوطہ | ابن عبداللہ محمد بن ابراہیم اللواتی الطنجی المشہور بہ ابن بطوطہ مصنف تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار سیاحان اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ابن بطوطہ ۱۴ - حزیران ۱۳۲۵ء کو اپنے وطن طنجہ سے بغرض سیاحت نکلا۔ مغرب۔ افریقہ۔ طرابلس۔ برقہ۔ مصر۔ فلسطین۔ بلاد شام اور حلب سے ہوتا ہوا دمشق آیا۔ اور یہیں سے حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوا۔ اور زیارت بیت اللہ کے بعد نجد ہوتا ہوا پھر شام لوٹ آیا۔ عجم و عراق اور مابین النہرین کے شہروں میں گھومتا ہوا بحر بربرہ کو عبور کرکے مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر پہنچا۔ پھر جزیرہ عرب کے جنوبی حصہ کی سیاحت کرتا ہوا ہرمز آیا۔ اور جزائر بحر فارس میں (جو موتیوں کی غواصی میں مشہور ہے) کچھ دنوں تک مقیم رہا۔ اور دوسری مرتبہ پھر حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد شام ہوتا ہوا اناضول آیا۔ اور یہاں سے قرم جانے کے لئے دریائی سفر شروع کیا۔ اور بلاد قبچاق (جنوبی روس) وبلغار وغیرہ کی سیاحت کی۔ بلغار اس زمانہ میں پایۂ تخت تھا۔ ابن فضلان نے اپنے سفرنامہ میں یہاں کے حالات بڑی تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ بلغار کے آثار قدیمہ ابتک نہر اتل کے کناروں پر قائم ہیں۔

ابن بطوطہ نے شمال میں معمورہ کی اس آخری حد تک سفر کیا تھا۔ جہاں سے "ارضِ ظلمات" کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بلغار اور ارضِ ظلمات کے درمیان ۴۰ دن کی مسافت ہے۔ ابن بطوطہ نے ظلمات میں بھی جانے کی کوشش کی۔ لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ابن بطوطہ خود بیان کرتا ہے کہ:۔

"ظلمات کی طرف ان چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں سفر کیا جاتا ہے جن کو بڑے بڑے کتے کھینچتے ہیں۔ چونکہ اس طرف برف بہت ہوتی ہے اور برف پر نہ کسی آدمی کا قدم تھمتا ہے اور نہ کسی چوپائے کی کُھر۔ اس لئے گاڑیوں میں کتے جوتے جاتے ہیں۔ جن کے ناخن دار قدم ان کو پھسلنے نہیں دیتے۔ لیکن ان سواریوں میں صرف بہت ہوتا ہے۔ اس لئے اس خطہ میں مالداروں کے سوا کوئی اور نہیں جا سکتا"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا۔ پھر قفجق ہوتا ہوا بحر اخضر کے شمالی شہروں کی سیاحت کی۔ پھر خوارزم (خیوا) بخارا۔ خراسان۔ قندھار۔ وادیٔ سندھ سے ہوتا ہوا دہلی آیا۔ اور دو برس تک بحیثیت قاضی دہلی میں رہا۔ اس کے بعد وہ چین کے ارادے سے روانہ ہوا۔ کنبایت۔ کالی کٹ۔ جزائر ملدیو۔ لنکا۔ سوماترا۔ جاوا وغیرہ کا سفر کرتا ہوا چین پہنچا اور خان بالق (پیکن) میں جو پایۂ تخت سلطنت ہے کچھ دنوں مقیم رہا۔ پھر یہاں سے مغربی ممالک کی سیاحت کے لئے آگے بڑھا۔ اور تقریباً ۲۴ برس تک مسلسل گھر سے باہر رہنے کے بعد ۱۳۴۹ء کے قریب طنجہ اپنے وطن واپس آیا۔ لیکن کچھ دن نہ گذرے تھے کہ پھر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اور پہلے اندلس آیا اور یہاں سے غرناطہ چلا گیا۔ ۱۳۵۲ء میں سلطان مراکش کی طرف سے قاصد بنکر سوڈان گیا۔ اور سوڈان میں دریائے ٹمبکٹو کے اس پار تک کے ممالک کی سیاحت کی۔ پھر فاس واپس آیا۔ اور یہیں ۱۳۷۷ء میں اسکا انتقال ہوا۔

ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ چار جلدوں میں بمقام پیرس ۱۸۵۳ء میں شائع ہوچکا ہے۔ بعض لوگوں نے فرانسیسی زبان میں بھی اسکا ترجمہ لکھا ہے۔ یہ سفرنامہ عجیب و غریب معلومات فن کا ذخیرہ ہے۔ اگرچہ اس میں بہت سی غیر محقق اور مضطرب روایات بھی موجود ہیں۔ مگر باینہم ارباب ذوق کے لئے اس میں بہت کچھ سرمایۂ دانش و اعتبار اور مایۂ بصیرت و معلومات موجود ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بعض علماء اعلام کے متعدد چھوٹے چھوٹے سفرنامے ہیں۔ جن میں سفرنامہ شیخ ابن حبیب۔ سفرنامہ ابن جبیر (جو جرمنی میں شائع ہوچکا ہے) سفرنامہ ابن خلدون (یہ بہت ہی نادر اور نایاب ہے) سفرنامہ ابن رشید۔ سفرنامہ ابن الصلاح سفرنامہ ابوالقاسم التجیبی۔ سفرنامہ بدرالدین بن رضی الدین الغزی۔ سفرنامہ شیخ جلال الدین سیوطی۔ سفرنامہ کتانی اور سفرنامہ محمد بن رشد المالکی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مقریزی

اس مقالہ میں اب تک جن ممتاز ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی علامہ تقی الدین المقریزی المتوفی ۱۴۴۲ء کی ہے۔ جغرافیہ میں آپ کی کتاب "المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط و الآثار" مشہور تصنیف ہے۔ برہان الدین ابراہیم البقاعی المتوفی ۱۴۸۰ء نے بھی ۸۴۴ھ میں ایک کتاب "اسفار عن اشرة الاخبار" لکھی۔ جو فن کی بہترین تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے۔ محمد بن ایاس المتولد ۱۵۱۶ء کی ایک کتاب ہے جس کو مصنف نے تواریخ امم سے اخذ کیا

اس کتاب کے شروع میں کسی قدر علم ہیئت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصر وغیرہ کے عجائبات کی تفصیل ہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں غرناطہ کے اندر حسن نامی ایک مسلمان سیاح پیدا ہوا۔ یہ مغرب کے شمالی ممالک کی سیاحت میں مصروف تھا کہ ۱۵۱۷ء میں دو لفرانی سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور قیدکر کے پاپائے روم کے پاس بھیجدیا۔ حسن یہاں پہنچکر عیسائی ہوگیا۔ اور رومۃ الکبریٰ (اٹلی) میں رہنے لگا۔ حسن اٹلی لاطینی اور عربی تینوں زبانوں کا بڑا ماہر تھا۔ اُس نے عربی میں افریقہ کا ایک جغرافیہ لکھا۔ پھر ۱۵۲۶ء میں اسی جغرافیہ کو اٹلی زبان میں منتقل کر دیا۔ یہ کتاب معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس کتاب کا فرانسیسی اور لاطینی زبان میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ کاتب چلپی یا حلبی خلیفہ مصنف جہاں نما المتوفی ۱۶۵۸ء اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہے۔ مصنف نے اپنی تالیف میں انگریزی کی کتابوں سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ اور پرتگال و اسپین کے سیاحوں کی روایات کو زیادہ اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بدر اصلاحی

بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
نگارستان (نیاز فتحپوری)	عـہ؍	عہر	فراست التحریر	عہ؍	۸ر
جمالستان (نیاز فتحپوری)	للعہ	سے	شاعر کا انجام (نیاز فتحپوری)	۱۰ر	۸ر
ترغیبات جنسی (نیاز فتحپوری)	سے؍	۵؍	فلسفۂ مذہب	عہ؍	۸ر
مجموعۂ استفسار و جواب (نیاز فتحپوری)	سے؍	۶	لالۂ رُخ	عہ؍	۱۲ر
حکمائے قدیم کیساتھ چند گھنٹے (نیاز فتحپوری)	عہ	۸ر	مثنوی زہرِ عشق معہ تصاویر و مقدمہ	عہر	عہ؍
مذاکراتِ نیاز (نیاز فتحپوری)	۱۲ر	۶ر	فلسفۂ شوپنہار	عہر	عہ؍
جذباتِ بھاشا (نیاز فتحپوری)	۱۲ر	۶ر	منچلے	۸ر	۴ر
فراست الید (نیاز فتحپوری)	عہ؍	۸ر	گلابی اردو	۶ر	۴ر

(۱) محصولڈاک ذمہ خریدار ہوگا۔ لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصولڈاک بھی نہیں لیا جائیگا۔

(۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہئے۔

(۳) یہ رعایتی قیمت صرف اخیر جون ۳۵ء تک ہے۔ اسکے بعد شاید اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ نہ ملے۔

منیجر نگار لکھنؤ

دیر و حرم کے قصّے

جہاں آرا اور چھتر سال

(مسلسل)

جو بات میں نے اس رات کو ٹھانی تھی اُسے کر گزری۔ دوسرے روز میں نے اپنے محبوب کو خط لکھ بھیجا۔ جب میرا ناظر خط کا جواب لایا تو میں نے سواری کا حکم دیا۔ دہلی کے شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر جا کر ایک قدیم مسجد ہے۔ اس کی صورت ویران قلعہ کی سی ہے۔ میں وہاں پہنچی۔ ہوا چل رہی تھی۔ آس پاس کے درختوں سے ایک عجیب قسم کی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ مسجد کے برابر سڑک پر ایک یوگی مرگ چھالا بچھائے بیٹھا تھا۔ اسکا کمنڈل اور ڈنڈا اسکے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز سے کچھ کبت پڑھ رہا تھا۔ جن کا مطلب یہ تھا۔ "دنیا ناپائیدار ہے اے بیوقوف تو اس میں پائیداری ڈھونڈھتا ہے! یہ دار المحن ہے اور تو خوشی کا جویا!" یہ جوگی آنکھوں کا اندھا تھا۔ میں نے اسکی جھولی میں چند اشرفیاں ڈالیں۔ اور اسکی متوقع رہی کہ اسکی زبان سے میری آنیوالی زندگی کے متعلق کچھ نکلے۔ یوگی بولا: "اپنی اشرفیاں واپس لے لے میرے کس کام آئیں گی۔ تیری آتما تو سکھ دکھ دونوں سے اونچی ہے تو سکھ کے کھوج میں کیوں باولی ہو رہی ہے۔" یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور چلدیا۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہ کہہ سکی۔ پاس ہی کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر میں نے اپنے محبوب کا خط کھولا اور پڑھنے لگی۔ یہ پیام شوق اپنی شرافت اور سادگی کے لحاظ سے آپ اپنا نمونہ تھا۔ اُس نے مجھے "دیوی" کے لفظ سے خطاب کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ اگر میں سنجوگتا بھی ہوتی تو وہ قنوج پر پرتھوی راج کی طرح دھاوا مار کر مجھ کو لے آتا۔" اس نے مجھے سنجوگتا کے یہ لفظ یاد دلائے تھے کہ "ہم عورتیں جھیل کے پانی کی طرح ہیں اور تم مرد اُن ہنسوں کی طرح جو جھیل کی سطح پر تیرتے ہیں۔ اگر تم کو ہمارے سینہ سے جدا کر لیا جائے تو تم کس طرح رہ سکتے ہو۔" مجھے اس پیام شوق کا ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ میں خوشی سے پھولوں نہ سماتی تھی جس وقت میں نے شہر کا رخ کیا تو مجھ کو ہر چیز جادو بھری معلوم ہوتی تھی۔ شہر کا نظارہ عجیب لطف پیدا کر رہا تھا۔ انسان اور حیوان چرند اور پرند سب خوش خوش نظر آتے تھے۔ بازاروں میں آدمیوں کی چہل پہل سے میلہ لگا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں چاندنی چوک سے گذر رہی تھی شاہی دربار کا وقت تھا۔ سجے سجائے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ زرق برق پوشاکیں پہنیں جوق جوق

چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے صندل۔ اور زعفران، مشک اور عنبر کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں۔ دوکانیں زر و جواہر سے چمک دمک رہی تھیں۔ سڑک پر عورتوں کے پازیبوں کی جھنکار۔ ان کے رنگ برنگ دوپٹے۔ سروں پر پانی کی مٹکیاں۔ اور گھونگھٹوں سے ان کی مست ناز نگاہیں عجب لطف پیدا کر رہی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں سے رنگ برنگ پتنگ اڑائے جا رہے تھے۔ شاہجہان آباد بھی کتنا خوبصورت شہر ہے۔ میں نے سوچا کہ میں یہاں ایک ایسی عالیشان اور آرام دہ سرائے بنواؤں گی۔ جس کا جواب کہیں ہندوستان بھر میں نہ ہو۔ ملک کے تمام اطراف کے لوگ یہاں آئیں گے۔ قیام کریں گے اور آرام پائیں گے۔ میرا نام زندۂ جاوید رہیگا۔ اور غرباء کو تو میں مالا مال کر دونگی۔"

یہ سوچتی ہوئی میں شاہی محل کے میدان کے قریب پہنچی۔ میں نے یہاں سواری کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔ یہ مقام بھی چاندنی چوک کی طرح شارع عام ہے۔ یہاں بھانت بھانت کا پنچھی بولتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم و ملت کے مسافر و تاجر یہاں آکر جمع ہوتے ہیں۔ بخارا اور شام۔ خراسان اور زابلستان۔ کابل اور ترکستان۔ مصر و روم۔ چین و عرب حتیٰ کہ انگلستان اور ہالینڈ کے لوگ بھی یہاں دکھائی دیتے اور ملتے جلتے ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کی کمی نہیں۔ انگور و انار سیب اور سنگتروں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں اور ہاروں سے دوکانیں لدی ہوئی ہیں۔ طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں۔ جن کی خوشبو ہر تھکے ماندے کو للچاتی ہے۔ قریب ہی ایک رمال بیٹھے فال دیکھ رہے ہیں۔ عورتیں برقعہ پہنے آتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان سے کچھ پوچھتی ہیں ان کے ہاتھ میں دام رکھتی ہیں اور خوشی خوشی چلی جاتی ہیں۔ منصب دار۔ جاگیردار۔ رئیس۔ اور راجہ اپنے اپنے جلوس اور جھنڈوں کے ساتھ دیوان عام کی طرف جا رہے ہیں۔ ہاتھیوں۔ گھوڑوں کا ایک تانتا لگا ہوا ہے۔ گھنٹے اور نرسنگھے بج رہے ہیں۔ طوائفیں بھاری بھاری پشوازیں پہنے زیور سے لدی پالکی کے ریشمیں پردوں کے اندر سے اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ میں ایک طرف علیحدہ کھڑی یہ سب تماشہ دیکھ رہی ہوں لیکن خیال اپنے محبوب ہی کا ہے۔ میں راؤ راجہ کے انتظار میں ہوں کہ وہ کب ادھر سے نکلتا ہے۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسکا رسالہ دکھائی دیا۔ سب سے آگے وہ نوجوان رعنا اپنے سمند پر سپاہی کی پوری شان سے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھہر گیا۔ اور گھوڑے سے اتر کر ایک خاص ادا کیساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنے گلے سے موتیوں کا گلوبند اتار کر اور چند سطریں لکھ کر اپنے ناظر کے ہاتھ اسکو بھیجیں۔ اس نے جھک کر دوبارہ سلام کیا۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی۔ اور ایک لمحہ بعد نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس لمحہ کی یاد مدتوں دل میں گدگدی پیدا کرتی رہی۔ اور اسکی تصویر میرے دل پر نقش ہو گئی۔

اب میں ایک دن کا واقعہ سناتی ہوں کیونکہ یہ حادثہ بھی یادگار ہے۔ اس زمانہ میں گلزار بائی نامی ایک رقاصہ میری بڑی چہیتی تھی۔ وہ مجھ کو اپنے رقص و سرود سے اکثر شام کیوقت محظوظ کیا کرتی تھی۔ اس نے ایک نیا ناچ ایجاد کیا تھا ایک روز شام کے وقت وہ مجرے کے لئے آئی۔ حسن و زیبائش کا پیکر تھی۔ اسکا بناؤ سنگھار غضب کا تھا۔ اس نے ناچنا شروع کیا۔ ناچتے ناچتے وہ ایک ادا کیساتھ کمرہ سے نکلکر میری نظروں سے غائب ہونے لگی۔ میں بھی کیفیت وارفتگی میں اسکا

تعاقب کرنے لگی - ہم محل کے دالان سے گذر رہے تھے - دیوار کے سہارے رنگ برنگ کے کنول روشن تھے - کچھ کچھ ہوا چل رہی تھی - ایک جھونکا آیا کنول کو بھڑکا یا جس سے گلرو کے دوپٹہ میں آگ لگ گئی - اور دم کے دم میں شعلے بھڑکنے لگے - اور گلرو بدحواس چیختی چلاتی بھاگی - میں اسکو بچانے لگی تو شعلوں نے مجھے بھی گھیر لیا - ہم لوگ دیوان خاص کے قریب تھے - جہاں شہنشاہ روساء اور سرداروں سے مشورہ کر رہے تھے - اگر میں چاہتی تو چیخ پکار کر فوراً مدد حاصل کر سکتی تھی - میں جانتی تھی کہ راؤ راجہ بھی دیوان خاص میں موجود ہے - وہ آسکتا تھا - اور لوگ بھی دوڑ دھوپ کر سکتے تھے - لیکن شرم نے اجازت نہ دی - اور میں ہفتوں صاحب فراش رہی - اسی زمانہ میں میرے راکھی بند بھائی کو اورنگ زیب کیسا تھ ایک مہم پر جانا پڑا - مگر جانے سے پیشتر اس نے گویا میرے گلوبند کے جواب میں ایک کچلی بھیجی - کچلی سنہرے کمخواب کی تھی - اس میں موتیوں کی گوٹ لگی تھی - ہیرے اور موتیوں کے ٹنکے حد درجہ خوبصورت تھے - مجھے شکریہ کا خط بھیجنا لازم تھا - میں نے اپنے محبوب کو لکھا کہ اگر وہ مجھے اپنی تصویر ہاتھی دانت پر نقش کرا کر بھیج سکے تو وہ مجھ کو کچلی سے بھی زیادہ عزیز ہوگی - خط کے بھیجنے کے بعد کچھ زمانہ انتظار میں گذرا - بالآخر جواب آیا - بیتابی سے کھولا اور پڑھا - پڑھتے ہی زمین پاؤں تلے سے نکل گئی - آنکھوں میں اندھیرا سا آنے لگا - دل بیٹھا جاتا تھا - غم و غصہ طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے تھے - ضبط سے کام لیا دوبارہ نظر ڈالی - انداز خط سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھتے وقت ہاتھ نے لغزش کی ہے - لیکن تحریر ملتی جلتی تھی - جواب مختصر تھا - تحریر مہذب اور دلآویز تھی لیکن ہر لفظ سے سرد مہری عیاں تھی - مضمون یہ تھا :-

" محاذ جنگ پر سپاہی کے فرائض منصبی دم لینے کی مہلت نہیں دیتے - اتنی فرصت نہیں کہ خاطر خواہ عبارت آرائی کی جاسکے - یہ لکھنا کافی ہوگا کہ کسی مسلمان شہزادی کی تصویروں کے مرقع میں ایک چوہان راجپوت کی شبیہ بے محل اور نازیبا سی معلوم ہوتی ہے - اسکا خیال چھوڑ دینا چاہئے "

میں ان لفظوں کو بار بار دہراتی - ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتی - لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا - کیا کسی نے کچھ میرے خلاف کہدیا - اگر کہا بھی تھا تو اس آسانی سے باور کر لینے کے کیا معنی - کبھی سوچتی کہ کیا وہ اورنگ زیب اور روشن آراء کا طرفدار ہوگیا - مگر چھتر سال ایسا تو نہ تھا - بوندی کا راجہ اور اپنے عہد و پیمان سے منہ موڑے - الغرض کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور مجھ پر خوشی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا - مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت میری یہ حالت ہو رہی تھی آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی - کالی کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آرہی تھیں - بادل کی گرج اور بجلی کی چمک دل کو سہمائے دیتی تھی - آن کی آن میں موسلادھار پانی برسنے لگا - گویا کسی نے آسمان میں چھید کر دیا - قیامت کا سماں تھا - معلوم ہوتا تھا کہ عناصر قدرت بھی میری کیفیت یاس اور ہراس سے ہمدردی کر رہے ہیں - اور آسمان بھی میری آہ و زاری کا ہمنوا ہے - نہ صرف کئی گھنٹے بلکہ کئی دن تک میرے اوپر برا وقت گذرا - بالآخر اسی غم و غصہ کی حالت میں ایک دن گویا کسی نے کان میں کہا کہ اب کس بات کا انتظار ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا - عیش و عشرت کے سب سامان مہیا ہیں - دولت و ثروت کی کمی نہیں - جس پر نظر ڈالدیگی وہی

نذر برباد کر دیگا۔ خواب و خیال میں زندگی برباد کرنا کونسی عقل کی بات ہے۔ جس طرح بعض کم نصیب زندگی کے دکھ درد کے غم کو شراب کے نشہ سے غلط کرتے ہیں۔ میں نے دلّارے کی بانسری کے بولوں اور اسکی آغوش کی گرمی سے اپنے غم و ہراس کی کیفیت کو مٹانا چاہا۔ دلّارے معمولی گانے والا تھا۔ لیکن اس کی آواز میں ایک کیفیت تھی اور آنکھوں میں نشہ تھا۔ ایک دن دلّارے بڑے تزک و احتشام سے اپنا پھریرا اُڑاتا ہوا محل کی جانب آرہا تھا۔ دوسری جانب سے مہابت خاں رانا پرتاپ کا بھتیجا جس نے ہمیشہ سے دغا کی اور ہندو مت سے منہ موڑا تھا اور جس کا شمار شہنشاہ جہانگیر کے نامی سپہ سالاروں میں تھا اپنے رسالے اور نشان کیساتھ دربار جارہا تھا۔ کسی چھوٹی سی بات پر دونوں کے ساتھیوں میں تکرار ہوگئی۔ اس دن سے مہابت خاں شہزادہ دارا کا دشمن اور میرے نام سے بیزار ہوگیا۔ وہ اپنا رسالہ اور نشان چھوڑکر تن تنہا شاہی دربار میں پہنچا۔ شہنشاہ نے اس کیفیت کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ جب گوّیے تزک اور احتشام سے نکلنے لگے اور نشان پھریرے اُڑانے لگے تو امراء اور روساء کی کیا حیثیت باقی رہی؟ شہنشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ دلّارے سے اسکا نشان اور رسالہ چھین لیا جائے اور آیندہ کے لئے اسکو اس حرکت سے باز رہنے کی تنبیہ کردی جائے۔

مجھے بُرا تو لگا۔ لیکن میں سمجھ گئی کہ اس میں کیا مصلحت پنہاں تھی۔ بات یہ تھی کہ دربار میں ویسے ہی اورنگزیب کے کافی دوست اور ہمارے کافی دشمن تھے ان میں اضافہ کرنا خلاف مصلحت تھا۔ مصلحت وقت کو تو میں سمجھ گئی۔ لیکن جب میں نے اس سین کا اندازہ کیا جو دربار میں ہوا ہوگا اور ہر فرد کی زبان پر گوّیے کے نام کیساتھ ہی ساتھ میرا نام بھی ہوگا تو میں شرم سے گڑ گئی۔ کہاں میں شہنشاہ شاہجہاں کی نورنظر، تاج محل کی چہیتی بیٹی۔ نورجہاں اور ممتاز محل کی طرح خود سلطنت اور حکومت کی باگیں ہاتھوں میں لینے کی دعویدار۔ اور کہاں دلّارے گوّیا!

میں اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑے پڑے زار و قطار روتی اور بےچینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ میں اپنی زندگی کا ماتم کرنے لگی۔ کاش مجھ کو حسب دلخواہ محبوب اور خاوند پسند کرنیکا موقع ہوتا۔ میں بھی اپنی زندگی اور معمولی عورتوں کی طرح ٹھکانے لگا سکتی تو اس شرم و ذلّت کا سامنا کرنے کی نوبت کیوں آتی۔ اسی کیفیت غم و اندوہ میں میں اپنا گریبان چاک کرتی ہوئی اٹھی۔ اور کھڑکی کے سہارے جا کھڑی ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ باغبان اپنا کام ختم کرکے اور اوزار سنبھال کر اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ اس کی بیوی کے آج بچّہ ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی کہ دیکھو کیسی خوش نصیب ہے یہ عورت جس کا خاوند اور زندگی کا سہارا اسکے پاس ہوگا۔ ہنسی خوشی اس سے باتیں کریگا۔ اور وہ اپنے پیارے بچّہ کو ایک خاص انداز سے اس کی گود میں دیگی۔ وہ اس ننھی سی جان کو گود میں لیکر حیرت اور خوشی سے دیکھے گا۔ اور پھر ماں کے پہلو میں لٹا دیگا۔ وہ پہلے اپنے خاوند پر فخر و ناز سے ایک نگاہ ڈالے گی۔ اور پھر بچہ کو پیار کرنے لگے گی۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں منہ لپیٹ کر پھر پلنگ پر پڑ گئی۔ باوجود شہزادی ہونے کے اس کیفیت عذاب میں نہ میرے پہلو میں میرا بچّہ تھا کہ جسے میں پیار کرتی نہ میرا خاوند جو میرے پلنگ کے پاس بیٹھ کر مجھ کو ڈھارس دے سکتا۔

روتے روتے بالآخر میری ....۔۔۔

---

* اس نسخہ کا درمیانی حصہ محض چند اوراق پریشان ہیں جن کے سلسلہ اور ربط کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم مؤلف نے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

نجابت خاں سلطنت بلخ کے نامی سرداروں میں سے تھا۔ اس زمانہ میں میرے والد ماجد شہنشاہ شاہجہاں زیادہ تر زنانخانہ میں رہا کرتے تھے۔ اور دیوان عام میں دربار کرنے یا امراء و رؤسا سے صلاح و مشورہ کرنے کی نوبت کم آتی تھی۔ اکثر یہ فرائض مجھ کو ہی ادا کرنے پڑتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مجھے رموز مملکت کے متعلق نجابت خاں سے گفت و شنید کی کئی مرتبہ نوبت آئی۔ ایک دن شاہجہاں آباد میں جامع مسجد سے نماز کے بعد واپس آئی تھی۔ میری طبیعت بہت افسردہ تھی۔ میں پلنگ پر پڑی پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ کہ دفعتاً سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ لمحہ بھر بعد میرا بھائی دارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ خوش و خرم معلوم ہوتا تھا۔ پہلی بات جو اس نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ مجھے نجابت خاں سے شادی کرنے میں کچھ انکار تو نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کہا کہ جب وہ تخت و تاج کا مالک ہوگا میری شادی میں کوئی دقت لاحق نہ ہوگی۔ بلکہ اس رشتہ کے قائم ہونے سے استحکام سلطنت میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ لمحہ بھر میں نجابت خاں اور دُلارے دونوں کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی۔ ایک تناور درخت کی طرح سب سے زیادہ سر برآوردہ اور علیحدہ کھڑا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا معمولی سرپت کی طرح ہوامیں جھونکے کھا رہا تھا چونکہ دُلارے بے بضاعت اور گمنام شخص تھا میں نے اسی لئے اُسے پسند کیا تھا۔ لیکن اب ان رنگ رلیوں سے طبیعت سیر ہو گئی تھی۔ میں اپنی زندگی کے لئے کچھ سہارا چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگی اور بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ اسکا خاموشی نیم رضا سمجھ کر دارا ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ شام کو شہنشاہ سے عرض معروض کی جائیگی۔

جوں ہی شام ہوئی میں چپکے سے شاہی محل کی طرف چلی۔ میں نے برقعہ سے اپنے تئیں ڈھک لیا تھا۔ تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میں حیات بخش باغ سے گذری۔ عجب سماں تھا۔ آسمان پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔ سنگ مرمر کے در و دیوار گویا شعلہ کی لَو سے جھلک رہے تھے۔ چنبیلی۔ جوہی۔ بیلا سب کے سب زعفرانی لباس پہنے ہوئے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ محلات کے برج اور کنگرے اور باغ کے سبزے اور درختوں میں گویا کسی نے سنہرا پانی پھیر دیا تھا۔ اس جگمگاہٹ نے میری آنکھوں کو چوندھیا دیا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے دماغ سرشار تھا۔ لیکن مجروح دل کی ٹیس مجھے مضطرب کئے ہوئے تھی۔ لیموں اور نارنگی کے درختوں کی اوٹ میں ایک پتھر کی چوکی پڑی ہوئی تھی۔ میں اس پر تھک کر بیٹھ گئی۔ میں سراپا انتظار تھی کہ میرا بھائی ادھر ہی سے گذریگا۔ اور مجھے نوشتۂ تقدیر اس کی زبانی معلوم ہو جائیگا۔ نجابت خاں سے شادی کرنے کو طبیعت قبول نہیں کرتی تھی۔ اپنی شاہانہ آزادی کا قربان کرنا اور ایسے شخص کے آگے سر جھکانا جس سے طبیعت کو انس نہ ہو بے معنی سی بات معلوم

ہوتی تھی۔ ایک دن دوران گفتگو میں نجابت خاں نے بلخ کے تخت و تاج کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت اسکی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں مسرت اور فخر کی دونوں کے انداز موجود تھے۔ وہ اثنائے گفتگو میں کہہ گیا کہ "اگر میں بلخ کے تخت و تاج کا مالک ہو جاؤں تو پھر شہزادی........" یہ سنتے ہی میری طبیعت میں ایک کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ایک لمحہ کے لئے صرف ایک لمحہ کے لئے میری یہ خواہش ہوئی کہ میں اسکی ہو کر رہتی۔ لیکن وہ لمحہ گذر چکا تھا۔ اب وہ کیفیت باقی نہ تھی۔ میں کشمکش کی حالت میں تھی اور منتظر تھی کہ جو کچھ فیصلہ ہونا ہے ہو جائے۔ میں اسی کیفیت انتظار میں تھی کہ دیوان عام سے گانے بجانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ کبھی طبیعت جوش مسرت سے باغ باغ ہو جاتی کبھی افسردگی چھا جاتی۔ ایک دھن ایسی چھڑی کہ میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے خنجر دل کے آرپار کر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی نغمہ تھا جو میں نے اس شام کو سنا تھا جب میں اپنے راکھی بند بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن آج اس راکھی کی اسکی نظروں میں کیا قدر ہے۔ نہ معلوم وہ کس کے بازو پر بندھی ہوگی۔ اس نامۂ شوق کے کیا معنی تھے جو اس نے جواب میں مجھے لکھا تھا اور میں نے مسجد کے گنبد کے تلے بیٹھ کر پڑھا تھا۔ گو وہ یوگی مجھے خواب سے جگا چکا تھا لیکن میں اس وقت جوش مسرت سے اتنی مست تھی کہ ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا تھا۔ قسمت کی خبر نہ تھی۔ اب تو وہ اورنگ زیب کی ریشہ دوانیوں کا ہمراز ہے۔ اس کو خاندان تیمور اور آئین اکبر کا کیا غم ہے۔ غالباً وہ میواڑ اور راجپوتوں کے ننگ و ناموس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے پیمان وفا کو بھی بھلا چکا ہے۔ اب تو اسکو میری یاد بھی نہ رہی ہوگی۔ ایک دن اس نے مجھے سنجوگتا کہکر پکارا تھا۔ لیکن اب .... یہ یاد آتے ہی میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چار و ناچار میں نے اپنے ہوش سنبھالے۔ اب دارا کے لوٹنے کا وقت تھا۔ میں اپنے نوشتۂ تقدیر سے آگاہ ہونے کے لئے بیتاب تھی۔ میں اس دالان کی طرف چلی جہاں سے دارا میرے محل کو جاتا۔ تاکہ میں اسے راستہ ہی میں ملجاؤں۔ جونہی میں دیوان خاص کے قریب پہنچی مجھ کو کچھ آوازیں سنائی دیں۔ گویا دو شخص بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں فوراً ایک گوشہ میں چھپ گئی۔ مجھے دو شخص دکھائی دیے۔ ایک ان میں سے قد آور شاندار اور سجیلا جوان تھا۔ سر پر سبز شملہ۔ بدن پر زرد رنگ کا بوٹے دار خلعت پہنے تھا۔ اسکو میں نے پہچان لیا یہ نجابت خاں تھا۔ دوسرا معمولی سا کم رو آدمی تھا۔ یہ دونوں بیباکی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ بعد میں یہ ایک طرف کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میں قریب چھپ کر سننے لگی۔

نجابت خاں:۔ (حقارت آمیز لہجہ میں) داراشکوہ کو غرور تو ابھی سے ایسے ہو گئے ہیں کہ گویا وہ واقعی تخت و تاج کا مالک ہے۔ لیکن یاد ہے کہ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار باقی ہے اسکا تخت پر چڑھنا دشوار ہوگا۔ تم نے غور کیا تھا کہ جب اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ بادشاہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کرنے کے لئے تیار نہیں تو اسکا انداز بیان کیسا مغرور اور حقارت آمیز تھا۔ اگر بادشاہ اپنی بیٹی کو اپنے ہی محل میں رکھنا چاہتا ہے تو کون مزاحم ہو سکتا ہے۔

امیر:۔ غالباً بادشاہ بعد چندے اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگا۔ اسکو ذی مرتبہ اور ذی ہمت مددگاروں کی ضرورت ہے

اورنگ زیب کی نظر تخت و تاج پر ہے۔ جو شاہجہاں جہانگیر کیساتھ کر گذرا ہے اورنگ زیب شاہجہاں کیساتھ وہی سلوک کرنے سے دریغ نہ کریگا۔ اسکو تمہاری امداد کی ضرورت ہوگی۔ جہاں آرا بیگم تو تم کہتے تھے کہ بڑی حسین اور ذی ہوش شہزادی ہے۔ اور سنا جاتا ہے کہ بڑی دولتمند بھی ہے۔ سورت اسکی ملکیت ہے۔ اور اسکی آمدنی صرف اسکے پاندان کے لئے مخصوص ہے۔

نجابت خاں:۔ (جسکا چہرہ غصہ سے سُرخ تھا۔ تڑپ کر بولا) میں نے از خود جہاں آرا بیگم سے شادی کا شوق ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ تو ولیعہد نے اپنی چاپلوسی کی باتوں اور اسکی تعریف کے پل باندھ کر مجھکو اس جال میں پھنسایا۔ اور ہاں کرالی شہزادی کے حسن کا حال تو خدا جانے اور لوگ زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں میں نے تو صرف پس پردہ یا نقاب دیکھا ہے۔ اس کے ناز و نیاز کا سازباز تو دلارے کو معلوم ہوگا یا راجہ کو جس کے نام کیساتھ اسکا نام منسوب کیا جاتا ہے۔ (یہ کہتے ہوئے اس نے تمسخرانہ قہقہہ لگایا اور میری یہ کیفیت کہ گویا کسی نے تیر جگر کے پار کر دیا)۔ لیکن شہزادی اگر میرے محل میں آئی تو اس کو یہ سبق سیکھنا ہوگا کہ وہ میرے ننگ و ناموس کا پورا پورا پاس و لحاظ کرے۔ میں اپنے جانور کو خود ہی اچھی طرح ادا کرلے میں نکال سکتا ہوں مجھے اسکی ضرورت نہیں کہ دوسروں سے ایڑ لگواؤں۔

امیر:۔ (جو نجابت خاں سے زیادہ خود غرض، مکار اور چاپلوس معلوم ہوتا تھا۔ بولا) میرے دوست اس قدر جوش میں نہ آؤ۔ تمہیں تو یاد ہوگا کہ شہزادی کی عصمت پر کیا دھبہ لگا تو بڑا چرچا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے آگ کے شعلوں میں جل جانا منظور کیا لیکن غیر محرم کے سامنے عریاں ہونا گوارا نہ کیا۔

نجابت خاں:۔ ہاں عورت شاندار ہے۔ وہ اپنے محبوب کا دل مسخر کرنے کے لئے جان پر کھیلنے سے بھی پرہیز نہ کریگی۔ ممکن ہے اس حادثہ کی تہ میں یہی راز پنہاں ہو۔ لیکن اُس وقت اسکا محبوب کون تھا۔ کم از کم میں تو نہ تھا۔ مجھے راجہ کا شبہ ہے۔ اور میں ایک نہ ایک دن اس سے سمجھوں گا۔ (ایک لمحہ کے توقف کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر وہ پھر بولا)۔ دوست مظفر! میں نے ایک مرتبہ ایک حسین شہزادی پر نظر ڈالی۔ وہ ایک کھڑکی سے کھڑی طلوع آفتاب کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ غضب کی حسین اور قطعی معصوم تھی۔ وہ مجھے بالکل نہیں جانتی تھی۔ میں اس پر شیدا تھا۔ اور اسکو اپنی ملکہ بناتا۔ میں اسکے قدموں کے نیچے موتی بچھا دیتا۔ اور اسکی آغوش میں مجھ کو بہشت کا لطف ملتا۔ لیکن جس صبح کو میں نے اسے دیکھا تھا اسی شام کو وہ قضا کر گئی۔

امیر:۔ یار عزیز اس قصہ پارینہ میں کیا رکھا ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ بادشاہ کی بیٹی کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ رقیب کے چنگل سے چھڑا کر اس پر قبضہ کر۔ نجابت خاں کی آن بان پر کون عورت شیدا نہ ہو جائیگی۔ جب جہاں آرا بیگم تیرے حرم میں آئیگی تو گویا وہ جنت میں داخل ہوگی۔ جنت میں قدم رکھتے ہی وہ از سر نو معصوم بن جائیگی۔ اور کیا چاہئے۔

نجابت خاں:۔ (اسکے چہرہ پر تبسم نمودار نہ ہوا وہ ویسے ہی طیش میں کہتا رہا) میں اسی وقت اپنے شکار کو رقیب کے چنگل سے چھڑا کر قبضہ میں لانے کا عزم کرونگا جب مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ ہمارا رقیب میرے ہم رتبہ اور میرا ہمسر ہے ہاں اگر جہاں آرا میرے حرم سے نکل کر کسی کافر کے گھر پڑ جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ اسکو جنت کی حور سمجھکر ہر لحظہ قدمبوس

ہوا کرے:

اس کے بعد کی گفتگو میں نے نہیں سنی کیونکہ میں بیہوش ہو گئی تھی۔ جب میں ہوش میں آئی تو آواز گر رہی تھی۔ میرا بدن یخ تھا۔ یہ دونوں چلے گئے تھے۔ میں اٹھی اور محل کھڑی ہوئی۔ بلا ارادہ مہتاب باغ پہنچی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ نوکر چاکر ہاتھ میں روشنی لئے ہوئے سانپ بچھوؤں کی کھوج کر رہے تھے۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ میں نے کسی کی پروا کی۔ روش کے دونوں جانب سرو صنوبر کی طرح کھڑے تھے۔ چمیلی۔ بیلے اور نرگس کی خوشبو سے دماغ کو تسکین ہوتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آبشار کے اوپر ایک برج اور چبوترہ تھا۔ بجز شمع و فانوس کے وہاں اور کوئی نہ تھا۔ میں وہاں تھک کر بیٹھ گئی۔ [illegible] کر یہ خیال آتا تھا کہ عورت کی زندگی بھی کس مصیبت کا سامنا ہے۔ یہ بھی کیسی بے بسی ہے۔ مرد عورت کی عصمت و پاکبازی کا نگہبان بنتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بلا شرکت غیرے اسکا حظ اٹھائے۔ اس کو کیا خبر کہ عورت کے دل پر کیا بیتتی ہے۔ وہ اپنے سوز نہانی سے کس طرح پھنکی جاتی ہے۔ میں آبشار کی طرف جھکی۔ پانی ہاتھ میں لیکر منہ دھویا۔ منہ کی تمتماہٹ کچھ کم ہوئی لیکن خیال نے مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کیا کہ لاکھ دھوؤں پیشانی کا یہ داغ بے حرمتی اب کبھی نہیں مٹ سکتا۔ مرد اپنی قوت و ہمت پر بڑا نازاں ہوتا ہے۔ نجابت خاں بھی اپنے تئیں بڑا اولوالعزم اور ہمت والا سمجھتا ہے۔ مگر جب وہ ایک عورت کے دکھ درد کا بوجھ بانٹنے کی ہمت و شرافت نہیں رکھتا تو میری نظروں میں اسکی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ [illegible] پھر آیا اکھی مند بھائی یاد آیا۔ وہی ایک شخص تھا جسے میں چاہتی تھی۔ [illegible] کا خیال [illegible] نہیں رکھتا تھا۔ اس کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی۔ اسکی چمکتی ہوئی آنکھیں میرے اوپر جھک گئیں۔ اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ میں نے اپنے گلے میں اس تعویذ کو ٹٹولا جس میں میں نے اسکا پہلا نامۂ شوق نشانی سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ پھر معاً مجھے اس کے آخری خط کی وہ سطریں یاد آئیں۔ جنہوں نے میرے نہال امید کو پژمردہ کیا [illegible] دل کو ٹکڑے ٹکڑے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ سوچتے ہی کہ کیا وہ بھی نجابت خاں کی طرح ہمت و شرافت سے عاری تھا۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں تڑپ گئی۔ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ بیساختہ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور میں بیہوش ہو گئی۔ دوسرے دن محل میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پچھلی رات مہتاب باغ میں جہاں آرا بیگم کو کسی سانپ نے کاٹ لیا۔ (باقی)

پنڈت کشن پرشاد کول

بُندے

کمرے میں ایک چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ اس کو دیکھنے کے لئے میں نے چراغ اُٹھایا۔ خبر نہیں کہ میری نیند کیوں اُڑ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں اگلی صبح کو روانہ ہونیوالا تھا۔

یہ عجیب و غریب تصویر ایک بیش قیمت سنہرے چوکٹے میں جڑی ہوئی تھی۔ ایک عورت اپنے سر کو مخملی تکئے پر رکھے ہوئے تھی۔ اسکا ایک بازو ذرا اُوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اور شانہ و سینہ کا کچھ حصہ سیاہ بیک گراؤنڈ میں بالکل برہنہ نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا تصویر چھوٹی سی تھی۔ جس میں ایک نوجوان لڑکی اپنے داہنے بازو کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن صرف اُسکا سر جو مخملی تکئے پر ہونے کی وجہ سے کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اسکی گردن۔ ایک بازو اور سینہ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔

مصوّر نے اس تصویر کو کچھ اس طرح بنایا تھا کہ دیکھنے والا خود مصوّر کے وجود کو اس طرح محسوس کرنے لگتا تھا جیسے وہ اپنا مُنہ تکئے کے قریب رکھے ہوئے محو نظارہ ہو۔ سراپا خوبصورت تھا جس کو انسان بس خواب ہی میں دیکھ سکتا ہے ——— رُخساروں کی گلگونی۔ نیم وا آنکھوں کی گہری سُرمگینی۔ ریشم سے زیادہ نرم اور چمکیلے بالوں کی آرائش۔ لبوں کی سُرخی۔ حسین کتابی چہرہ! علیحدہ علیحدہ اور یکجائی طور پر ——— حُزن آفرین سیاہ بیک گراؤنڈ پر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نمایاں تھا۔ بائیں کان کی لَو میں مجھے ایک عجیب بُندا نظر آیا ——— تنہا ایک چڑیا اپنی کمان۔ تول اتحول سے اُٹھائے ہوئے ایک حلقے میں آویزاں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیں طلائی زنجیر سے جس نے اس کے نازک سیپ کے سے کان کیا نقہ مقیّد کر رکھا تھا۔ خود کو آزاد کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ کیا عجیب بُندا تھا!

لیکن تصویر میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات اُس حسینہ کا انداز تھا۔ اسکا کسی قدر پیچھے کی طرف جھکا ہوا سر۔ وہ نیم وا آنکھیں۔ وہ شبنم کی تازگی اور شراب کی سی کیفیت رکھنے والے لب جو ایک بوسہ کے ملتجی نظر آتے تھے۔ اور اُن پر وہ ہلکا سا تبسم! ——— فرطِ لذت سے میں کچھ ایسا مسحور ہو گیا کہ مجھے اسکی معطر سانس تک محسوس ہونے لگی۔ اسکا بلوّری بازو جس کے نیچے ریشمی چمکیلے بالوں کے چھلّے نظر آ رہے تھے اس طرح اُوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا گویا کسی کے گلے میں حمایل ہوجانیوالا ہے۔ میں مصوّر کے کمالِ فن اور قوتِ تخلیق کو دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ تصویر میں ایک خاص سحر آفرینی تھی۔ فانوس کی مُرتعش روشنی میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور اُس کے یاقوتی لب متحرک ہو گئے۔ شاید یہ حماقت تھی لیکن میں نے اپنے لب اُس کے لبِ لعلین سے ملا دیئے ——— ایک بار نہیں بلکہ مسلسل و متواتر کئی بار ——— اور اسکے بعد دفعتاً میں خوفزدہ ہو گیا ———

خون آلود مجسّموں اور پُراسرار تصویروں کے افسانے مجھے یاد آنے لگے اور ایک نئے مکان اور ایک اجنبی شہر میں تنہا ہونے کی وجہ سے میرے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ میں نے فانوس کو میز پر رکھا اور پھر سونے کے لئے پلنگ پر دراز ہوگیا۔

لیکن نیند آنی مشکل تھی۔ جب ذرا بھی غنودگی مجھ پر طاری ہوتی تو مجھے اپنے نیچے پر حسینہ کا سر نظر آتا ——— وہی ہلکا سا تبسم۔ وہی لبوں کی سُرخی۔ وہی بالوں کی نرمی اور خوشبو۔ وہی کافوری سینہ کی عُریانیاں اور وہی خواہشِ سپردگی ——— میں اُٹھ بیٹھا۔ کپڑے پہنے۔ فانوس کو گُل کردیا اور تاریکی میں کچھ سوچنے لگا۔ وقت گذرتا گیا۔ حتیٰ کہ دریچہ سے آفتاب کی ہلکی ہلکی زرد کرنیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔

خادم نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے زور سے کہا ——"جہاز دو گھنٹہ بعد روانہ ہوجائیگا۔"

روانگی سے قبل میں نے مالکِ مکان سے تصویر کے متعلق دریافت کیا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "اس کو ایک دیوانے نے بنایا تھا۔"

"لیکن وہ تھا کون؟ وہ دیوانہ ہو یا نہ ہو لیکن بڑا زبردست آرٹسٹ تھا۔"

"مجھے اس کا نام تک یاد نہیں رہا۔ یہ تصویر اس نے پاگل خانہ میں بنائی تھی۔ اور وہیں سے اسکو سکونِ قلب حاصل ہوگیا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد میں نے یہ تصویر اُس کے رشتہ داروں سے لے لی۔ اُن لوگوں نے اس کے معاوضہ میں رقم لینے سے انکار کردیا۔ لوگ کہنے لگے کہ وہ بخوشی اس کو جُدا کردینا چاہتے ہیں۔"

تصویر کا خیال کلیتہً میرے دل سے فراموش ہوچکا تھا۔ تقریباً پانچ سال بعد میں میکسیکو کے کسی شہر کی ایک سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً ایک ہسپانوی یہودی کی دوکان میں ایک خاص چیز نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرلی۔ بُندوں کی ایک جوڑی۔ ——— ایک حسین طلائی زنجیر میں لگے ہوئے دو ننھے کیوپڈ ——— مجھے فوراً تصویر اور اُس رات کا خیال آگیا!

جوہری نے کہا: "میں ان کو اس وقت تک فروخت نہ کرونگا جب تک ان کی کافی قیمت نہ آجائے۔ ایسے بُندے آپکو کسی اور جگہ نہیں ملیں گے۔ میں ان کے بنانے والے کو جانتا ہوں۔ یہ ایک آرٹسٹ نے بنوائے تھے۔ اور انکا نمونہ خود اُس نے بنایا تھا۔ وہ ایک عورت کو تحفتاً دینا چاہتا تھا۔"

"کیا وہ ہسپانوی تھی؟"

"جی نہیں۔ امریکن۔"

"وہ حسین۔ سبز نگین آنکھوں والی ——— اُسکی عمر شاید اُسوقت بیس سال کی ہوگی ——— اُسکا رنگ گلابی تھا؟"

"تو آپ اُس سے واقف ہیں؟ اُس کو جوزی فیثا کہتے تھے۔ آپ کو علم ہے اُس نے اُسکو مار ڈالا تھا؟ ——

—— مرنے کے بعد بھی اُس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم تھا۔ جیسے کسی نے سوتے میں اُسکو مار ڈالا ہو۔ بعد میں مجھے یہ بندے ایک جگہ فروخت ہوتے ہوئے مل گئے۔"

"اور آرٹسٹ کا کیا ہوا؟"

"وہ پیرس میں مر گیا —— دیوانہ ہو کر۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل کرنے کے وقت دیوانہ ہو گیا تھا۔ اگر در اصل آپ کو بندوں کی ضرورت ہے تو میں ان کو تین سو میں فروخت کر دوں گا۔ ان کی اصل لاگت ساڑھے چھ سو کی ہے۔"

سید محمد احسن۔ بی اے۔ حیدرآبادی

(ماخوذ)

"کسبی"

اگست ۱۹۵۸ء کے "نگار" میں حضرت بزمی کا ایک دلچسپ مقالہ "کسبی" کے زیرعنوان شائع ہوا تھا۔ اسکا مطالعہ کرتے ہی خیال ہوا کہ اسکا جواب لکھنا چاہئے۔ مگر سلسلۂ فرصت نہ ملی۔ اس لئے ارادہ ملتوی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ فروری کے "نگار" میں باب المراسلہ کے تحت میں ڈاکٹر محمد الیاس کا اعتراض نیاز صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا جس نے میرے سوئے ہوئے احساسات کو بیدار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت معقول اعتراض کئے۔ اور مضمون کا رد بھی اچھی طرح قلمبند کیا۔ جس کی بابت نیاز صاحب نے لکھا کہ بزمی کے مقالہ کا جواب رزمی انداز میں نہیں دیا جانا چاہئے تھا۔ جو محض مذاق ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے سنجیدگی کے دائرے سے ہٹ کر کوئی جنگ کی صورت اختیار کی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانا غیر ضروری تھا۔ کہ دفعتہ مارچ کے "نگار" میں ایک نسوانی مضراب نے پھر انہی تاروں کو چھیڑ دیا گیا۔ اس میں دہلی کی کسبی طوائف ——— اختر ریحانہ ——— کا خط شائع ہوا۔ جو اسی ضمن میں ہے۔ لیکن نفس مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ بلکہ اس میں ایک آپ بیتی بیان کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ مرد نہایت ظالم وجابر اور نفس پرست ہے۔ اس پر بھی نیاز صاحب کا ایک نوٹ ہے جس میں ریحانہ کے ساتھ بہت کچھ اظہار ہمدردی کیا گیا ہے۔ ریحانہ کا خط پڑھ کر اس کے طرز تحریر سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس امر کی ہوئی کہ ہمارے وطن عزیز کی ایک بازاری عورت بھی اس لطیف انداز بیان کی مالک ہے۔ جو بعض صوبجات کے علم دوست حضرات کو بھی نصیب نہیں۔

یہ خلاصہ اس لئے پیش کر دیا گیا ہے کہ جن حضرات نے "نگار" کا مسلسل مطالعہ نہیں کیا ہے وہ بھی موضوع کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

بزمی صاحب نے اپنے مقالہ کے شروع میں لکھا ہے کہ اس موضوع پر خالص علمی حیثیت سے غور کیا جائیگا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو موضوع عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر صرف علمی موشگافیاں کافی نہیں۔ بلکہ صاحب مضمون کو کچھ ذاتی مشاہدات بھی پیش کرنے چاہئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں بالکل مدلل اور منطقی ہے۔ حالانکہ اس میں کئی جگہ مغالطہ سے کام لیا گیا ہے۔ اصل موضوع پر قلم فرسائی کرنے سے قبل انہوں نے فلسفۂ جرم پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر وہ اس کو سمجھنے میں ناکامیاب رہ گئے۔ ان کے بیان کے مطابق گناہ۔ جرم۔ خطا۔ قصور اور بداخلاقی سب یکساں افعال اور ایک حد تک ہم معنی ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت گہرا فرق ہے۔

اگر ایک شخص مذہبی احکام کی پابندی نہیں کرتا۔ اور اُن سے انحراف کرتے ہوئے ایسے افعال کا ارتکاب کرتا ہے۔ جو مذہبی نقطۂ نظر سے مذموم ہیں۔ تو وہ گناہگار ٹھہرایا جائیگا۔ (سنا ہے۔ اسکی پاداش اس دُنیا میں ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ جس کا علم مولویوں کو ہے) ایک شخص حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ مجرم ہے۔ اور حکومت نے ہر جرم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ مانا کہ بعض جرم بھی گناہ کے دائرے میں ہیں۔ مثلاً زناکاری۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود زبردست اختلاف ہے یعنی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق صرف وہ زنا جرم ہے جو بالجبر ہو۔ مگر مذہب کا دائرہ غیر محدود ہے۔ برخلاف اس کے عبادت نہ کرنا۔ یا خدا کی وحدانیت و تثلیث کا قائل ہونا یا ہر قوی شے کو خدا سمجھنا جرم نہیں صرف گناہ ہے۔ اس کے بعد ایسی باتیں بھی ہیں جن کے لئے سوسائٹی نے کچھ اصول مقرر کئے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی نہ گناہ ہے نہ جرم۔ بلکہ بداخلاقی میں ان کا شمار ہے۔ برزمی صاحب "بخل" کو شخصی جرم بتلاتے ہیں۔ میں متفق نہیں ہوں۔ کیا وہ بتائیں گے کہ تعزیرات ہند میں اس جرم کے لئے کونسی دفعہ موجود ہے۔ اپنی غلط فہمیوں کی بنا پر انہوں نے "جرم یا گناہ" کی تعریف غلط کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کُل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر کوئی مضر اثر مترتب ہو"

ذرا سوچئے! کہ ایک غریب شخص جنگل میں مٹی کھودنے جاتا ہے۔ اتفاق سے اُسے ایک دفینہ مل جاتا ہے۔ وہ چپکے سے اُسے لے آتا ہے۔ اس فعل سے اسکی ذات پر یا سوسائٹی پر کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اسکی اور اسکے خاندان کی حالت سُدھر گئی۔ پھر بھی حکومت کی نظر میں وہ مجرم ہے۔ برخلاف اس کے ایک شخص طبیب کی ہدایات کو مدنظر نہیں رکھتا۔ اور وہ اغذیہ کھالیتا ہے جو اسکی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اسکا یہ فعل نہ گناہ ہے نہ جرم۔ پھر بھی اسکا اثر خود اسکی ذات پر ہوا۔ اور سوسائٹی کے ایک محدود طبقہ پر بھی یعنی اُن اقربا پر جو اسکی تیمارداری میں تھے۔ اب چونکہ ابتدا ہی میں برزمی صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اصل موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بھی صدہا غلطیوں کا ارتکاب کرینگے۔ (اسکا جواب وہ خود دینگے کہ اپنے اس فعل سے وہ مجرم ہیں یا گناہگار ہے ــــ شخصی یا اجتماعی؟)

آگے چل کر آپ تحریر فرماتے ہیں:۔ "بہرحال فلسفۂ جرم کی اس مختصر سی تحقیق کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ عصمت فروشی کا وہ جرم جو شدت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے۔ شخصی جرم ہے یا اجتماعی؟"

مندرجہ بالا عبارت کے اس حصہ سے کہ "وہ جرم جو شدت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے"۔ یہ ظاہر ہوتا ہے اور بلحاظ نفس مضمون بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ برزمی صاحب کسبی کی عصمت فروشی کو جرم نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسے ایک "شریف مقصد" بتاتے ہیں۔ فی الحال اس سے بحث نہیں کہ وہ "شریف مقصد" ہے یا ذلیل۔ کیونکہ صاحب مضمون نے اس کے ضمن میں اخلاقِ جلالی کی کچھ ایسی عبارت نقل کرکے ــــ جو قطعی بے محل ہے ــــ گویا قارئین کو دھمکایا کہ اگر

اعتراض کیا تو مرتد ہو جاؤ گے - چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں - کیونکہ اخلاقِ جلالی میں یہی لکھا ہے - گویا وہ منجانب اللہ ہے - اور اسکا ہر نوشتہ اٹل ہے - لوگوں پر رعب جمانے کے لئے یہ اچھی ترکیب ہے کہ بطور حوالہ کہیں سے کوئی عبارت نقل کر دی - یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مضمون لکھتے وقت "اخلاقِ جلالی" جیسی کتاب بھی ہمارے مطالعہ میں تھی - اور وہ بھی مطبوعہ نولکشور - بزمی صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس عبارت میں "شرفِ ہر علمے" زیر بحث ہے - "ہر عملے" نہیں - اور علم و عمل میں جو تفاوت ہے ظاہر ہے - دائرہ عمل کے کسی موضوع پر غور کرتے ہوئے ایسا حوالہ دینا نہیں ہے کسی علم کے خوب و زشت پر روشنی پڑتی ہو - بالکل بے محل ہے - غالباً یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ وہ کسبی کے پیشہ کو خالص علمی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں -

اوپر نقل کی ہوئی عبارت میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ وہ کسبی کے پیشہ کو جرم نہ سمجھتے ہوئے بھی اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ وہ جرم شخصی ہے یا جماعتی ؟ یہ بالکل اس طرح ہوا کہ ایک ملحد جو سرے سے خدا کے وجود ہی کو نہ مانتا ہو اس کی صفات پر غور کرنے کے لئے بیٹھ جائے -

اُن سے ایک اور بھی غلطی ہوئی - اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک کسبی، ایک رقاصہ اور ایک مغنیہ کو بالکل ہم پیشہ تصوّر کر لیا ہے - یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک عصمت فروش بازاری عورت رقص و غناء کی بھی ماہر ہو - لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مغنیہ یا ہر رقاصہ عصمت فروش ہو - ہارون الرشید کی بہن اپنے زمانہ کی بہترین مغنیہ تھی - لیکن کیا وہ کسبی تھی ؟ یا آجکل بنگال میں موسیقی اس قدر عام ہے کہ جب تک ایک عورت رقص و سرود میں کافی مہارت حاصل نہ کرے - سمجھا جاتا ہے کہ اس میں جملہ صفاتِ نسائیت پیدا ہی نہیں ہوئیں - پھر کیا وہ تمام شریف عورتیں کسبیاں ہیں ؟ آپ لکھتے ہیں کہ "کسبی جس کے بنیادی مقاصد میں رقص و سرود اور سرور آفرینی شامل ہے - اپنے مقاصد کے اعتبار سے کچھ کم بلند نہیں "

مضمون کے نفسِ موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ کسبی کا صرف وہ فعلِ شنیعہ ان کے پیش نظر ہے - جسے ناجائز تعلقِ جنسی یا زیادہ وضاحت کیساتھ زناکاری کہتے ہیں - پھر اس میں رقص و غناء کو لا ٹھونسنا خلطِ مبحث نہیں تو اور کیا ہے - اگر غناء اور عصمت فروشی ایک ہی فعل کے دو نام ہیں - تو بزمی صاحب اُن مردوں کے متعلق کیا رائے قائم کرینگے جو ماہرِ فنِ موسیقی ہیں -

اسی سلسلہ میں یہ قیاس بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بزمی صاحب خدا رکھے ابھی نوجوان ہیں - اور با اقتضائے عمر ایک کسبی کے فریبِ رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی زندگی کے مقصد کو سرور آفرینی سے تعبیر کرتے ہیں - کاش ! ان کو کسی ایسی کسبی سے سابقہ پڑ جائے جو اپنی عیاری اور مکر و فریب کے باوجود کبھی کبھی صداقت سے بھی کام لے لیتی ہو - تو وہ یقیناً ان کے سامنے تسلیم کریگی کہ اس کی زندگی کا واحد مقصد "حصولِ زر" ہے - اور حصہ بقدر جثہ کے مطابق اس کی کارگاہِ معصیت میں سرور آفرینی بقدر زر ہوتی ہے - اس کی منور عشرت گاہ مشابہ ہوتی ہے اس تاریک تماشاخانہ سے جہاں جگہ لینے سے پہلے یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ ٹکٹ کس قیمت کا خریدا گیا ہے - (یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک کسبی کی بزم طرب میں ہنگامۂ نشاط ان پیشہ ور مضمون نگاروں کے رشحاتِ قلم کی مانند ہوتا ہے جو مدیرانِ رسائل کی طرف سے پیشکردہ اُجرت کو مدّ نظر رکھ کر اسی معیار کا

مضمون لکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہاں اگر دو روپیہ فی صفحہ ہے تو وہاں دو روپیہ فی گھنٹہ)۔ بزمی صاحب کا جمالیاتی
معیار ملاحظہ ہو۔ کسبی کے متعلق رقمطراز ہیں۔ "وہ حسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی ہے"۔ اگر واقعی
حسن عبارت ہے۔ لبوں پہ جمے ہوئے لاکھے۔ چہرے پر ملے ہوئے غازے سے۔ رخسار پہ بنے ہوئے خال۔ اور خوشبودار روغن سے
سنوارے ہوئے بال سے تو خدا جانے ان ضرب زدہ حسن پرستوں پر کس نوع کی کیفیت طاری ہو۔ اگر ایک کسبی کا قرم مسک
جائے یا آستین پلٹ جانے کے بعد سینہ اور گردن کی جلد کا یا کلائی اور بازو کی سطح کا متضاد رنگ ان پر منکشف ہو جائے۔

ان کے نزدیک "عورت و مرد کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں۔ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیر
منزل۔ (۳) آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی" بالکل بجا ارشاد ہوا۔ لیکن ان کی اہمیت ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کے
منطقی دماغ سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے۔ وہ بجائے خود بہت غور طلب ہے۔ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کس ہستی کا نام ہے
بہت کچھ دماغی کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے کہ عورت نام ہے اس عجیب الخلقت ہستی کا جو ایک بیوی اور ایک
کسبی کے امتزاجِ باہمی سے (غالباً کیمیاوی طریقہ پر) دائرہ وجود میں آئے۔ اور یہ بھی کسی آیندہ زمانہ میں ہو تو ہو۔ آجکل نہیں
کیونکہ اس زمانہ میں دو قسم کی نامکمل عورتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک بیوی اور دوسری کسبی۔ جن میں سے بقول بزمی صاحب اول الذکر
ان تین اہم اغراض میں سے صرف دو کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور موخر الذکر صرف تیسری غرض کے لئے مخصوص ہے۔

اچھا ذرا عصرِ جدید کی عورت کے رجحاناتِ طبع کو مدِ نظر رکھ کر غور کیجئے۔ کہ یہ اغراض کس حد تک صحیح ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج
نہ صرف یورپ اور امریکہ میں بلکہ ہندوستان میں بھی ضبطِ تولید کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔ اور پھر اس شدت کے ساتھ کہ ایک
بھی بچہ کی پیدائش گوارا نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ مرد و زن کے اتصال کی دو اولین اغراض بزمی صاحب کے مضمون
میں سے خارج ہو گئیں۔ رہ گئی تیسری غرض۔ سو اس ترقی یافتہ زمانہ میں آلامِ حیات سے کسی قدر ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ آسودگی حاصل
کرنے کے لئے ہزاروں ذرائع عمل میں آ گئے ہیں۔ کیا دلچسپ کتابوں کے مطالعہ سے۔ روح افزا مقامات پر چہل قدمی کرنے سے۔ فرحت
بخش مشروبات سے۔ بے تکلف دوستوں کی صحبت میں۔ سینما اور تھیٹر کے وسیع کمروں میں زندگی کا حزن و ملال دور نہیں ہو سکتا؟ پھر
بتائیے۔ کہ مرد و زن کے اتصال کا کونسا مقصد باقی رہ گیا۔ زمانہ کی گردش اس قدر سرعت کے ساتھ واقعاتِ زندگی میں تغیر رونما کر رہی
ہے کہ کسی خاص چیز کا مقصد تعین کر دینا آسان کام نہیں ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بزمی صاحب نے ان مقاصد کا تعین ٹھیک طور پر کیا ہے تو کیا ڈاکٹر محمد الیاس کے خیال کے
مطابق بیوی کی ذات سے ہر سہ اغراض کی تکمیل قطعی غیر ممکن ہے؟ اور کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام کسبیاں لاولد رہتی ہیں؟ مشاہدہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بقائے نسل کی انتہائی آرزومند نظر آتی ہیں۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو جاتی ہے تو اسکی عمدہ پرورش میں کوئی
دقیقہ فروگذاشت کا نہیں رکھتیں۔ یہ صرف اس لئے کہ ان کے کاروبارِ جنسیت کا سلسلہ کسی طرح منقطع نہ ہو جائے۔ لیکن بزمی صاحب
ہیں کہ وہ ایک کسبی کی زندگی کا مقصد صرف یہ بتاتے ہیں کہ "وہ تھکے ہوئے دماغوں کو سکون اور مجروح روحوں کو راحت پہنچائے"۔ اس کے

معنی یہ ہوئے کہ دماغ صرف مردوں کے پاس ہے۔ عورتوں کے پاس نہیں۔ اور اگر ہوتا ہے تو کبھی تھکتا نہیں۔ اسی طرح اس کی روح کبھی مجروح نہیں ہوتی۔ ورنہ بتلایئے کہ عورت کو آلام حیات سے آسودہ کرنے کے لئے برزمی صاحب نے کیا تدبیر سوچی ہے۔ مرد کو پریشانیاں نصیب ہوئیں۔ اسکا دماغ تھکا۔ اسکی روح مجروح ہوئی تو اس نے فوراً اپنی جیب میں چند روپے ڈالے اور اس بازار کا راستہ لیا جہاں سکون فروخت ہوتا ہے۔ اور پھر گھر واپس آ گئے۔ تاکہ بقائے نسل کی غرض پوری ہو اور اسکے بعد اُن کی شریکِ حیات تدبیر منزل میں منہمک ہو جائے۔ اب ذرا سوچئے کہ مرد کی طرح عورت بھی آلام حیات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسکا دماغ تھک جاتا ہے۔ اس کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ وہ سکون حاصل کرنے کے لئے کس کی دہلیز پر جائے؟ لہذا ضرورت ہے کہ ہماری سوسائٹی جو برزمی صاحب کے خیال کے مطابق ہر لحاظ سے عورت کی حق تلفی کرتی رہتی ہے۔ ملک میں ایسے "چکلے خانے" قائم کرائے جہاں نہایت دلکش مرد اپنے اڈے جمائیں تاکہ مرد و عورت کے اتصال کی تیسری غرض اپنی آلام حیات سے کسی قدر آسودگی بھی پوری ہو جایا کرے۔ کسبی کی حیات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"وہ اتصال زوجین کی اس تیسری غرض کو اپنی حیات کا ایک مستقل موضوع بنا کر دنیا کے سامنے لطف و انبساط کا دسترخوان چنتی ہے۔ وہ عشوہ و کرشمہ کے باریک ترین نکات کا گہرا مطالعہ کرتی ہے۔ حسن اور حسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی ہے۔ اور پھر اپنی تحقیقات کے ہر ہر جزو کو انسانی زندگی کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرتی ہے جس سے دوچار ہونے کے بعد کائنات کی ساری فضائیں قوس قزح کے سے لطیف رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

تو میرا خیال ہے کہ اگر ملک میں "مردانہ چکلے خانے" قائم ہو گئے تو آیندہ اپنے مضمون میں حضرت برزمی کو "ایک مرد کسبی" کے متعلق ان الفاظ کا اضافہ کرنا پڑیگا:-

"وہ اتصال زوجین کی اس تیسری غرض کو اپنی حیات کا مستقل موضوع بنا کر عورت کے سامنے لطف و انبساط کی میز چنتا ہے۔ وہ ورزش جسمانی سے اپنے قوا کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ادویات استعمال کر کے ہمیشہ جوان بنا رہتا ہے۔ جس سے ہم آغوش ہونے کے بعد کائنات کی ساری فضا میں عورت کو آندھیوں کا جھکڑ اور سمندروں کا تلاطم محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس تند و تیز کیفیت کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ ایسی بیہوشی کہ اس پر ہزاروں ہوشمندیاں قربان ہوں۔ اس کے اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ایسے اضمحلال کیساتھ جس پر نشاط روح کی ہزاروں فرحتیں نثار ہوں۔"

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ کیونکہ برزمی صاحب نے اپنے بچاؤ کا پہلے ہی سے خیال رکھتے ہوئے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ "اس وقت ہمارا موضوع بحث صرف عورت کی عصمت ہے۔" اور عورت سے بھی ان کا مطلب صرف "کسبی" ہے کتنی معقول بات ہے۔ عورت و مرد کے اتصال پر غور کیا جا رہا ہے اور صرف عورت کی عصمت موضوع بحث ہے۔

برزمی صاحب اس موضوع پر فلسفیانہ نقطہ نظر سے غور فرماتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ نفسیات کے معمولی نکات کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں عورت سے کبھی دُور کا بھی واسطہ نہیں پڑا۔ وہ اسکی فطرت سے قطعی لاعلم ہیں۔ اگر

ایک عورت یہ سمجھ لے کہ مرد و زن کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں جن میں سے دو کی تکمیل میرا شوہر میرے وسیلہ سے کرتا ہے اور تیسری غرض (جو کہ سب سے زیادہ اہم اور لطیف غرض ہے) پوری کرنے کے لئے وہ ایک کسبی کے مکان پر جاتا ہے۔ تو آتش حسد سے وہ جہنم کا دہکتا ہوا انگارا بن جائیگی۔ اور اس برہمی کے باعث خاوند کے ساتھ اسکا طرز عمل اس نوع کا ہوگا کہ پھر اس غریب کو کبھی سکون نصیب نہیں ہوگا۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو اس کے نزدیک عورت و مرد کے اتصال کا صرف ایک مقصد رہ جائیگا یعنی آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی۔ اور صرف اس غرض کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر وقت کسبی کے مکان پر پڑا رہیگا۔ نہ بقائے نسل کا خیال ہوگا۔ نہ تعمیر منزل کی فکر۔ بات تو اچھی ہے۔ خدا اس لائے۔

اب بیک جنبشِ قلم نصف سال کی مدت طے کرکے میں اگست ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء کے "نگار" کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد الیاس کے اعتراض پر اظہار خیال کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جگہ بہت معقول ہے۔ البتہ وہ مقالہ جو اس سلسلہ میں نیاز صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے توجہ کا طالب ہے۔

نیاز صاحب کی ہر تحقیق مسلّم ہے۔ کیونکہ وہ نہایت کاوش سے کام لیکر کسی خاص نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنے کے لئے کہ "زنانِ بازاری کا وجود نتیجہ ہے مردوں کی آوارگی کا یا مردوں کی آوارگی نتیجہ ہے ان کے وجود کا" انھیں ذرا زیادہ غائر نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آوارگی کی ابتدا ہی کیونکر ہوئی؟ زنانِ بازاری کا وجود تو بہت بعد کی بات ہے۔ تاریخ کی کتابوں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چل سکے۔ ہم غور و فکر کے ذریعہ سے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ موجودہ یا ماضی قریب کا زمانہ اپنے واقعات کے لحاظ سے کبھی عہدِ قدیم میں بھی گذر چکا ہو۔ اور آج جن اسباب و علل کے زیر اثر آوارگی ظہور میں آ رہی ہے عہدِ عتیق میں بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف عہدوں میں انسان کی خصائل و عادات مختلف رہی ہیں۔ مگر پھر بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک اور ہر عہد کے انسان میں یکساں پائی گئیں۔ اس زمانہ کو نظر انداز کرنے کے بعد جب قدرتی پیداوار کی فراوانی انسان کو حصولِ معاش کے لئے مجبور ہی نہ کرتی تھی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہر ملک اور ہر عہد میں یہ ذمہ داری مرد کے لئے مخصوص رہی ہے۔ اگرچہ صنفِ نازک نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مگر ناقابلِ ذکر طور پر۔ یعنی وہ کبھی کبھی مرد کا صرف ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔ اور چونکہ بقائے حیات کے لئے وسیلۂ معاش نہایت اہم ہے۔ اس لئے جائز طور پر ہمیشہ مرد کو اس امر کا گھمنڈ رہا کہ خدا کے بعد وہ عورت کا مربی ہے۔ اس احساسِ فوقیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورت کو اپنے سے کمتر درجہ کی ہستی سمجھنے لگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ جبکہ صبح سے شام تک سخت محنت کرکے اسے اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنی شریکِ حیات کے لئے بھی خورد و نوش کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ شاید اسی لئے قرآن شریف میں "الرجال قوامون علی النساء" کہکر مرد کو فوقیت عطا کی گئی ہے۔ مگر ہمیشہ عورت اس کوشش میں رہی کہ کسی طرح

وہ مرد کی ہمسری نہیں بلکہ اُس پر حاوی ہو جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ جب مرد پر نفسانی خواہشات کا شدید غلبہ ہوتا ہے تو اسے اپنی شخصیت کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی اس خواہش کی تسکین کے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے لمحات عورتوں نے مرد سے ایسے ایسے وعدے لے لئے جس پر بعد میں اسکو پشیمان ہونا پڑا۔ اس طرح اگرچہ عورت ایک لحاظ سے حاوی ہو گئی۔ مگر اس کی نظر سے گر گئی۔ وہ اس کی طرف سے بدظن ہو گیا۔ اور اسے اس قدر نفرت ہوئی کہ آئندہ کے لئے اس مخصوص عورت سے ملتفت نہ ہونے کا تہیہ کر لیا۔ مگر پھر بھی اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے اسے ایک دُوسری عورت کا پہلو درکار تھا۔ جسے نگی رسم و رواج کا خیال رکھتے ہوئے اس نے کھلم کھلا نہیں بلکہ پوشیدہ طریقہ پر حاصل کیا۔ بس یہیں سے آوارگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ عورت نے مرد سے کسی قسم کا وعدہ نہیں لیا۔ بلکہ ہیجانِ جذبات کے عین نازک لمحات میں جب مرد پر ایک طرح کی دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ عورت نے انتہائی اجتناب سے کام لیکر اسکی جائز خواہشات کو کما حقہ پورا نہ ہونے دیا۔ بلکہ ایک حد تک پامال کر دیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس طرح وہ مرد پر یہ ثابت کر دیگی کہ وہ خواہ کتنی ہی فوقیت رکھتا ہو زندگی کی سب سے بڑی مسرت حاصل کرنے کے لئے عورت کا محتاج ہے۔ ان واقعات کے ماتحت مرد نے لواطت، استمناء بالید اور استلذاذ بالحوش کے ذریعہ اپنی خواہشات کو پورا کر کے عورت پر یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ اس کے بغیر بھی آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس آتشِ انتقام کی جلن میں صنفِ نازک کو صفحۂ ہستی سے بالکل مٹا دینے کے لئے دختر کشی اختیار کی۔ مگر بقائے نسل کا سوال جب مدِ نظر ہوا تو اسے مجبور ہونا پڑا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے آج تک عورت کو اور بالخصوص طور پر بیوی کو بقائے نسل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔
(زیدی صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو)

اگرچہ عورت کے پندار کو شکست دینے کے لئے مرد نے بعض خلافِ فطرت افعال کے ذریعہ اپنی خواہشات پوری کرنی شروع کر دیں۔ مگر حقیقتاً وہ لذت اسے نصیب نہ ہوئی جو صرف عورت ہی کی ذات سے ممکن ہے۔ اور چونکہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ اسکی خود پرستی کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اس لئے لطف و محبت کی بجائے عورت پر جبر و استبداد کے ذریعہ قبضہ حاصل کرنا شروع کیا۔ جنسِ بازاری سمجھتے ہوئے تجارتی منڈیوں میں گائے بکریوں کی طرح اس کی خرید و فروخت شروع کر دی۔ اور اس طرح عورت جو سمجھتی تھی کہ ایک دفعہ مرد کے جذبات کو ٹھکرا کر اسے اپنا حلقہ بگوش غلام بنا لے گی۔ خود اس کی زر خرید لونڈی بن گئی۔ پھر یہ ہوا کہ جب تک چاہا مرد نے ایک عورت کو اپنے پاس رکھا اور جب طبیعت اُکتائی تو بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ حقیقتاً اسی عہد سے کسبی کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اور اس کے لئے خود عورت موردِ الزام ہے۔ لہٰذا نیاز صاحب کا یہ لکھنا غلط ہے کہ "رواج فحاشی کی ابتداء مرد کی طرف سے ہوئی۔ اور عورت نے اسے مجبوراً صرف اس لئے اختیار کیا کہ مرد زبردستی اسے اس سطح پر گھسیٹ کر لے آیا تھا"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گناہِ عظیم کو کس طرح دُور کیا جائے۔ مرد اپنے جذبات کو قابو میں رکھے یا کسبی نو سو چوہے کھائے بغیر حج کے لئے چل جائے۔ سو اسکا حل نہایت آسان ہے۔ فحاشی کی ابتداء چونکہ عورت کی طرف سے ہوئی تھی۔

اس لئے اس کی روک تھام بھی وہی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ بازاری عورت کے بس کا کام نہیں۔ کیونکہ معصیت کی نگری سے جس کی فضا بظاہر رنگین اور لطیف ہوتی ہے۔ بچ نکلنا آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ فرض ہے چار دیواری میں رہنے والی اُن خواتین کا جن کے شوہر بقول حضرت برقی "آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی" حاصل کرنے کے لئے ایک بازاری عورت کے کوٹھے پر جانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ وہ اپنے ہی گھر میں ملت وانبساط اور خلوص ومحبت کے ذریعہ ایک ایسی فضا پیدا کر دیں کہ مرد اسے نعم البدل ہی نہ سمجھے بلکہ ان کے مقابلہ میں کسبی کی سرادا کو فریبکارانہ اور غیر فطری جان کر ٹھکرا دے۔ اور عورت کے لئے یہ اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ وہ اپنے احساسِ فوقیت کو دل سے دُور نہ کر دے۔ عورت کا وقار اسی میں ہے کہ مرد کو اپنا قائدِ اعظم تصور کرے۔

نیاز صاحب کسبی کو بے قصور بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: "کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی بازاری عورت دبردستی مرد کو اس کے گھر سے گھسیٹ کر لے گئی ہو؟ کیا اس نے ایسا کیا ہے کہ وہ راہ چلتے آدمی کو بہ جبر اپنے کوٹھے پر کھینچ لائی ہو۔" میرا خیال ہے کہ موصوف کا مشاہدہ بہت وسیع نہیں۔ ورنہ اس متمدن زمانہ میں بھی سرزمین ہند کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں حقیقتاً عورت بہ جبر مرد کو ارتکاب معصیت کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ علاوہ اس کے کسبی کا بن سنور کر کوٹھے پر بیٹھنا نیچے سے اُوپر کھینچ لینے ہی کے برابر ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچنے کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ کر کہیں نہیں جاتا۔ بلکہ اپنی کشش کے ذریعہ دُور ہی سے ریزۂ آہن کو کھینچ لیتا ہے۔ ایک تو نسائیت اور پھر تزئینِ جمال۔ مرد کو خود بخود اس طرف کھنچ جانا لازمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شراب کی کشید اسی لئے ہے کہ انسان اسے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شراب کو مضرت رساں بھی نہ کہا جائے۔ کسبی کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے یا نہ ٹھہرایا جائے مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اسکا وجود تباہ کن ہے۔

اب "نگار" بابت مارچ ۱۹۳۵ء کے صفحات مدِ نظر ہیں:-

اختر ریحانہ کا مراسلہ اتنا ہی دلچسپ اور دلفریب ہے جتنا خود ان کا نام۔ اس کے مطالعہ سے نیاز صاحب کی طرح مجھے بھی اُن سے ہمدردی ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ معصیت کے ساتھ مظلومیت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ حد درجہ ذی شعور ہونے کے باوجود وہ اس رنگین گردابِ معصیت سے بچ نکلنے کی تدبیر نہیں جانتیں۔ خیر وہ میری ہی ہموطن ہیں۔ اور اگر کبھی شرفِ نیاز حاصل ہوا تو انھیں بتاؤں گا کہ اس دُنیا کے بہت سے پیغمبر اپنی ابتدائی زندگی میں حد درجہ گناہگار اور عصیاں کار تھے۔ چنانچہ ایک نیک خاتون بن جانا اُن کے لئے بھی ممکن ہے۔ اس مراسلہ پر بھی نیاز صاحب نے حاشیہ آرائی کی ہے۔ جس کا آخری حصہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ "اب عورت کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ مرد کے کام ودھن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جو کبھی قبل عورت نے گوارا کی تھیں۔ اور عنقریب وہ اپنا وجود علیحدہ قایم کرنے میں مرد کے جذبات اس طرح ٹھکرا دے گی جس طرح اس سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔ لیکن نیاز صاحب نے تاریخ کے

اس قدیم عہد کو فراموش کر دیا۔ جو عصر جدید کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی عورتیں مردوں کے نہ صرف دوش بدوش ہوتی تھیں بلکہ اس سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر لیکر اس نے مرد کو ہر کام سے سبکدوش کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرد کو ہوش آیا۔ تو اس نے جلدی ہی اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ کیونکہ وہ اسکا پیدائشی حق تھا۔ اور اس نے عورت کی اس فوقیت کو جسے بڑی کاوش کے ساتھ کافی مدت میں حاصل کیا گیا تھا۔ ایک جھٹکے میں قعر مذلت کے اندر گرا دیا۔ اور جس طرح آج برطانوی حکومت نے عزت و وقار کے تمام شعبوں کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص کر کے ہندوستانیوں کو محض مزدور بنا رکھا ہے۔ عورت مویشیوں کے مانند صرف باربرداری کے کام آنے لگی۔ آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ عورت نے وہی قدیم روش اختیار کی ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ کرسئی عدالت ہی پر متمکن نہیں ہے۔ بلکہ محنت و مشقت کے کاموں میں بھی بڑا حصہ لے رہی ہے۔ تاریخ اپنے واقعات کو مکمل طور پر دہرا کر رہیگی۔ چنانچہ عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے جبکہ مرد ایک مخلوقِ شان کیساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہوا نظر آئیگا جسے عورت اپنے شانوں کی مدد سے گھسیٹ رہی ہوگی۔ کیونکہ عورت اگر حرم کی چار دیواری میں بند رہنا پسند نہیں کرتی تو اسے کنیز بنا کر رکھنا ہی پڑیگا ؛

"ق"

(نگار) آپ نے جس نقطۂ نظر سے جناب تبریزی کے مضمون پر اظہار کیا ہے۔ وہ یقیناً توجہ کے قابل ہے۔ اور ادارۂ فحاشی کی ضرورت کو صرف اس لئے تسلیم کرنا کہ اس میں ایک پہلو مرد کی تفریح کا بھی پایا جاتا ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دنیا کی کوئی بداخلاقی یا معصیت ایسی نہیں ہے جس پر کوئی لذتِ نفس یا فرحتِ دماغ نہ پائی جائے۔ اور اگر جوازِ معصیت کیلئے صرف یہ دلیل کافی ہو تو سوسائٹی کا کوئی قانون قابلِ توجہ نہ رہیگا۔ اور تمدن و معاشرت کے لئے کوئی اصول متعین نہ ہو سکیگا۔

اس میں شک نہیں کہ غنا و موسیقی کو دماغِ انسانی کی تفریح و تسکین میں بڑا دخل حاصل ہے۔ لیکن اگر یہ چیز ہمیں صرف اسی ذریعہ سے میسر آسکتی ہے کہ ہم کو اپنے اخلاق کو داغدار اور اصولِ معاشرت کے اجتماعی پہلو کو نظر انداز کرنا پڑے تو یقیناً ایسی تفریح و دلچسپی قابلِ احتراز ہوگی۔ اور انفرادی سکونِ دماغ پر مصالحِ اجتماعی کا قربان کر دینا کسی طرح جائز قرار نہ پائیگا۔ لیکن سوال اس وقت یہ نہیں ہے کہ زنانِ بازاری کی جماعت قابلِ مذمت ہے یا نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اور اگر یہ ناممکن ہے تو کیا دنیا سے ادارۂ فحاشی کو محو کر کے اس طبقہ کو فنا کر دینا ممکن ہے۔

تاریخ کے واقعات اور نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ دونوں اس باب میں ہم کو صرف اس ایک نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ عہدِ قدیم سے اس وقت تک کوئی زمانہ فحاشی سے خالی نہیں رہا۔ اور باوجود انتہائی کوشش کے دنیا کی کوئی حکومت

اسکا استعمال نہیں کر سکی۔ حتیٰ کہ مذہب بھی جو ہر وقت جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے اپنے ہاتھ میں لئے اسکا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اس کے ساتھ اس امر پر بھی غور کیجئے کہ ان تمام ناکامیوں کا کیا سبب تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس کی تمام تر ذمہ داری عورت پر ہے۔ اور اسی نے مرد کو فحاشی پر مجبور کیا۔ میں اس کا جواب مرد کو قرار دیتا ہوں۔ اور اسی کو موردِ الزام سمجھتا ہوں۔ آپنے جو استدلال کیا ہے وہ بالکل خلاف حقیقت و واقعہ ہے۔ کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ حکومت و سیاست کی ابتداء مرد کی طرف سے ہوئی اور تعلق جنسی کی قدیم ترین روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو ہمیشہ مال غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اور اسکی ضمیر کی آزادی کا سوال مرد کے سامنے کبھی آیا ہی نہیں۔ رہ گیا آپ کا دوسرا شعر اسے استدلال کرنا ع

درکشتنِ من دشنہ بیباک چرائی

سو وہ بالکل اسی قبیل سے ہے۔ جیسا کہ کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کو کھا جانے کے لئے اس پر یہ الزام قائم کیا تھا کہ تو پانی کیوں گندہ کر رہی ہے۔ حالانکہ پانی کا بہاؤ بکری کی سمت سے نہ تھا۔ علاوہ اس کے آپ ان حکومتوں کی تاریخ دیکھیے جنہوں نے پیشہ ور عورتوں سے ملک کے ملک کو خالی کر دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس طبقہ کے فنا ہونے کے بعد مرد پھر بیتاب ہو گیا اور اپنی تشنگی و گرسنگی کی تاب نہ لا کر اس نے سوسائٹی کو اتنا داغدار بنا دیا کہ آخر کار ادارہ فحاشی پھر قائم کرنا پڑا۔

بہرحال جس حد تک نفس فحاشی کا تعلق ہے یقیناً کوئی شخص اسکی خرابیوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کیساتھ بزمی صاحب کے مضمون کا وہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو مرد کی تفریح و دلچسپی سے متعلق ہے۔

مردوں کا اپنی بیویوں سے چھپ کر زنانِ بازاری کی صحبت ڈھونڈھنا اکثر و بیشتر اسی بنا پر ہوا کرتا ہے کہ ان کے بعض ذوق گھروں میں پورے نہیں ہوتے اور وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی اس خواہش تفریح کو دوسری جگہ پورا کریں۔ اس لئے صرف پیشہ ور عورتوں کو برا بھلا کہنے یا حفظانِ صحت کا لیکچر دینے سے تو یہ مسئلہ حل ہوتا نہیں۔ البتہ اگر خود گھروں کی عورتوں میں ایسا سلیقہ پیدا ہو جائے کہ وہ مردوں کی "رعایتِ ذوق" کا لحاظ رکھ سکیں تو بیشک ایک حد تک ادارہ فحاشی کا انسداد ہو سکتا ہے۔ گو یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ عورتوں کا یہ سلیقہ اپنے اندر کتنے خطرناک امکانات رکھتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے جب مرد مجبور ہو کر یا تو رہبانیت اختیار کر لے یا فحاشی کے مفہوم کو بدل کر خود سوسائٹی کے لئے اسی کو گوارا بنا دے۔

معلوم نہیں آپ اس سے باخبر ہیں یا نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تقریباً گذشتہ دس سال سے پیشہ ور عورتوں کے کاروبار میں برابر انحطاط پیدا ہوتا جا رہا ہے اور ان کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عورتوں میں تعلیم کا رواج زیادہ ہو گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنے رکھ رکھاؤ اور زیبائش و آرائش سے کام لیکر مرد پر زیادہ قابو حاصل کر لیا ہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ پردہ بھی اٹھتا جا رہا ہے۔ اس لئے دوسری عورتوں سے ملنے جلنے کا

موقعہ بھی مرد کو زیادہ حاصل ہے - اور جو چیز اسکو زنان بازاری کی طرف کھینچکر لے جاتی تھی وہ اُسے گھر بیٹھے میسر ہے -

اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کی اِن بڑھتی ہوئی رنگینیوں، طبقۂ شرفاء میں رقص و موسیقی کی طرف میلان عام۔ اور عورتوں کے موجودہ "آرائشِ خم کاکل" نے بعض محتاط دماغوں اور اخلاقیات کے قدیم پابندوں کو "اندیشہ ہائے دور و دراز" میں مبتلا کر رکھا ہے - لیکن اِن کا یہ پیچ و تاب بالکل بیکار ہے کیونکہ یہ موج اب بیچ میں تو رہ کے رُکتی نہیں اسے ساحل سے جا کر ٹکرانا ضرور ہے - اور بالکل ممکن ہے کہ مغرب کی طرح مشرق میں بھی یہ گرداب ساحل ہی کو بہالے جائے - اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا فحاشی کے مفہوم کو بدلکر اسے سوسائٹی کے لئے گوارا بنانا پڑے -

یہی وہ حقیقت تھی جس کی بنا پر میں نے اختر ریحانہ کی تحریر کا جواب دیتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ وہ زمانہ قریب آ پہونچا ہے جب عورت فعل جنسی کے ان تمام ناگوار پہلوؤں کو مرد کے لئے گوارا بنادیگی اور اس باب میں سوسائٹی کے جو جدید قانون مرتب ہوں گے وہ عورت کے ترتیب دیئے ہوئے ہونگے نہ کہ مرد کے — مگر افسوس ہے کہ آپ اس پیشگوئی سے لڑ گئیں - اور عورت کے اِس متوقع اقتدار کی تردید میں آپ نے حقائق تاریخی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ذرا میں بھی تو سنوں وہ کونسا عہد تھا جب عورت مردوں سے آگے بڑھ گئی تھی - اور مرد نے ہوش میں آنے کے بعد اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا تھا - اور اب وہ آثار کونسے ہیں جن کی بناء پر آپ اپنی ملکوتی شان عورت کے مقابلہ میں قائم رکھ سکیں گے - اور وہ آپکی کنیز بن کر رہنے پر مجبور ہوگی - معاف فرمائیے - خواب کی باتوں پر اس درجہ وثوق مناسب نہیں +

قوتِ ارادی کے حیرتناک کرشمے

مسمریزم۔ ہپناٹزم یا عملِ مقناطیسی اب محتاجِ تعارف نہیں رہا۔ اُردو داں طبقہ اس سے ایک حد تک واقف ہوچکا ہے۔ اور اسکے عامل بھی ہندوستان میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسکی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ انسان کے اندر ایک خاص قوت موجود ہے جسے قوتِ ارادی کہتے ہیں۔ اور اسی سے کام لینے کا نام عمل مسمریزم بھی ہے اور سلبِ امراض بھی۔ یہ حقیقتاً ایک اشارۂ نفسی ہے جو دوسرے کو متاثر کرتا ہے اور اس کے خیال کے اندر انقلاب پیدا کرکے کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔

اشارۂ نفسی کے سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم میں دو احساس ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک "حسِ شاعر" اور دوسری "حسِ غیر شاعر"۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ہم کچھ کام دانستہ کرتے ہیں اور کچھ نادانستہ۔ دانستہ کام کو تو چھوڑیئے۔ اس "نادانستہ کاری" پر اکثر لوگ متعجب ہونگے۔ مگر ہم ایک دو مثالوں سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرینگے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ بعض آدمی سوتے سوتے اٹھ کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یا چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے "Somnambuliom" کہتے ہیں۔ مجھے ایک حافظ صاحب کے متعلق علم ہے کہ انھیں یہی مرض تھا۔ آپ لاہور ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھے۔ علی الصباح اٹھ کر گھر سے انھیں کارخانہ جانا ہوتا تھا۔ جو تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ چنانچہ آپ بعض اوقات سوتے ہی سوتے گھر سے ورکشاپ تک جایا کرتے۔ اور لطف یہ کہ کہیں راہ میں ٹھوکر بھی نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نمازِ تراویح پڑھاتے پڑھاتے سو گئے مگر قرأت جاری رہی۔ مقتدی کھڑے کھڑے اکتا گئے تو بیٹھ گئے مگر حافظ صاحب ہیں کہ کہیں رکتے ہی نہیں۔ لوگ بہتیرا "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" پکار رہے ہیں۔ مگر وہاں کون سنتا ہے۔ آپ آٹھ سیپارے پڑھ گئے۔ اور پھر کہیں رکوع میں گئے۔ رکعت ختم کرنے پر پوچھا تو فرمایا "میں سوگیا تھا"۔ ایسے مریض بیدار ہونے پر یہ مطلقاً نہیں جانتے کہ بحالتِ خواب انہوں نے کیا کیا تھا۔ اسی طرح کبھی کبھی بعض شرابی انتہائے نشہ میں چاقو۔ تلوار۔ یا کوئی اور ہتھیار لیکر جو ہاتھ آجاتے دیوانہ وار کسی پر حملہ کر دیتے ہیں۔ مگر جب ہوش میں آتے ہیں۔ تو متحیر ہوتے ہیں۔ اور ہرگز انھیں یاد نہیں آتا کہ وہ اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ان دو مثالوں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اگرچہ دونوں شخصوں نے خود ہی سب کچھ کیا ہے۔ مگر وہ خود اس سے

بے خبر ہیں۔ گویا جو کچھ انہوں نے کیا نادانستہ کیا۔ نیند میں یا انتہائے سُکر میں۔ یہ ان کی "نفسِ غیر شاعر" تھی۔ جو مصروفِ کار تھی۔

اگر ہم اس "نفسِ شاعر" اور "نفسِ غیر شاعر" کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ "نفسِ شاعر" کا حافظہ کچھ ایسا قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ بخلاف "نفسِ غیر شاعر" کے حافظہ کے۔ کہ جو کچھ اس کے سپرد کر دیا گویا "نقش فی الحجر" ہو گیا۔ پھر یہ بھی کہ "نفسِ غیر شاعر" سے جو کہیں گے یا جو اُسے بتائیں گے وہ بغیر حجت و بحث کے اسے قبول کر لیگا۔ چنانچہ یہی وہ "نفسِ غیر شاعر" ہے جس کے ماتحت ہمارے دماغ اور احساسات کے تمام کل پرزے کام کرتے ہیں۔ اور یہی وہ قوت کا وہ ہے جسے ہم "واہمہ" کہتے ہیں۔ یہی واہمہ ہے جو ہماری "قوتِ ارادی" پر حاوی ہے۔ بالآخر جب کبھی "ارادہ" اور "واہمہ" میں کشمکش ہوئی یا ایک دوسرے کے مقابل ہوگئے تو ہمیشہ "واہمہ" ہی کو فتح نصیب ہوتی۔ "ارادہ" کے لغوی معنی ہیں "کسی کام کے متعلق خود مختارانہ سوچنا"۔ "ذہن کی وہ خاصیت یا قوت جس سے ہم کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق سوچتے ہیں"۔ "ذہن کی وہ قوتِ اختیار جو اسے اپنے افعال پر حاصل ہے"۔ اس تعریف کو اور ان معانی کو ہم ہمیشہ سے درست اور ناقابلِ تردید سمجھتے آئے ہیں۔ حالانکہ وہ اصل یہ سراسر نادرست اور دروغ ہے۔ یہ "قوتِ ارادی" جسے ہم "خود مختار" سمجھتے ہیں۔ اور جس پر ہمارا بڑا وثوق ہے ہمیشہ "واہمہ" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔

فرض کیجئے ہم ایک فٹ چوڑا اور کافی لمبا تختہ لکڑی کا زمین پر بچھا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص بآسانی اس پر سے گذر جائیگا۔ اب اسی تختہ کو سو سو فٹ کے دو بلند میناروں پر رکھ دو۔ تو کسی کو ان پر سے گذرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ تم دو ہی قدم چلو گے کہ کانپنے لگ جاؤ گے۔ اور باوجود اپنے ارادے کی تمام کوشش صرف کرنے کے تمہارا زمین پر گر جانا یقینی ہوگا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ تختہ زمین پر تھا تو آپ آسانی سے عبور کر گئے۔ اور بلندی پر تھا تو دو قدم بھی نہ چل سکے؟ بات یہ ہے کہ پہلی حالت میں تو آپکا خیال یہ تھا کہ اس سے گذر جانا آسان ہے اور دوسری حالت میں آپ نے اسکو دشوار سمجھا۔ اگر معمار اور رنگ ساز اونچے اونچے دیواروں پر پاڑیں باندھ کر بآسانی کام کرتے پھرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذہن میں گرنے کا وہم ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک بعض بے خوابی کی حالت کا اندازہ کرو۔ اگر وہ سونے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتا تو آرام سے بستر میں پڑا جاگتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر وہ سونے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اپنی قوتِ ارادی پر زور ڈالکر سونا چاہتا ہے تو اُلٹا بے چین ہوتا ہے۔ بلکہ جتنی کوشش کرتا ہے اُتنا ہی بے چین ہوتا ہے۔ ایک شخص اثنائے گفتگو میں کسی کا نام بھول جاتا ہے اب جب تک وہ یہ کہتا رہتا ہے کہ "دیکھئے صاحب مجھے اُن کا نام بھول گیا ہے۔ یاد ہی نہیں آتا" یقیناً اُسے کبھی وہ نام یاد نہیں آئیگا۔ مگر جب اس نے برخلاف اسکے یہ کہنا شروع کیا کہ "دیکھئے میں ابھی اُن کا نام بتاتا ہوں۔ مجھے ابھی یاد آیا جاتا ہے"۔ تو فوراً بغیر کسی کوشش کے بھولا ہوا نام یاد آجائیگا۔

بائیسکل کے نوآموز خوب واقف ہونگے۔ نوآموز کیا کہنہ مشقوں کا بھی یہ تجربہ ہے کہ وہ بائیسکل کا ہینڈل خوب مضبوط

بھاگے جا رہے ہیں مگر خوف یہ ہے کہ کہیں گر نہ پڑیں۔ راہ میں کوئی معمولی سی روک آجاتی ہے تو وہ ضرور اس سے ٹکرا جاتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔

ہم میں سے کون ہے جس پر "بے اختیارانہ ہنسی" کا دورہ طاری نہیں ہوا۔ کسی وجہ سے ہم ہنس پڑے اور اتنا ہنسے کہ بے اختیار ہوگئے۔ اب دیکھئے:۔

(۱) تختہ پر چلنے والا شخص۔ (۲) مریض بے خوابی۔ (۳) وہ شخص جسے کسی کا نام بھول گیا ہے۔

(۴) سائیکل سوار۔ (۵) بے اختیارانہ ہنسنے والا۔

پانچ مختلف حالتیں ہیں۔ جس میں "ارادہ" اور "واہمہ" دونوں کام کر رہے ہیں۔ اور انکی کیفیت علی الترتیب یہ ہے:۔

ارادہ		واہمہ
(۱) میں گرنا تو نہیں چاہتا	مگر	گر پڑوں گا۔
(۲) میں سونا چاہتا ہوں	مگر	سو نہیں سکتا۔
(۳) بھولا ہوا نام یاد کرنا چاہتا ہوں	مگر	یاد نہیں آتا
(۴) رکاوٹ سے بچنا تو چاہتا ہوں	مگر	گر پڑوں گا
(۵) ہنسی روکنا تو چاہتا ہوں	مگر	کیا کروں رکتی ہی نہیں۔

آپ نے دیکھا ہر حالت میں "وہم"، "ارادے" پر غالب آیا۔ شراب کے عادی سے دریافت کیجئے۔ پان میں تمباکو کھانیوالے سے پوچھئے۔ وہ کہیں گے دل تو چاہتا ہے چھوڑ دیں۔ مگر کمبخت یہ عادت چھٹتی ہی نہیں۔ متعدد مجرموں سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ وہ اس جرم کے کیوں مرتکب ہوئے تو انہوں نے کہا کہ برخلاف ان کے "ارادے" کے کسی ایسی طاقت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ایسا کریں۔ اور ان لوگوں کا کہنا بالکل بجا اور درست ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کا "واہمہ" یہی کہتا ہے کہ "وہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہ سکتے"۔

اب دیکھئے کہ "ارادے" اور "قوتِ ارادی" پر ہمیں کتنا فخر و ناز تھا۔ اور اسی کے بل بوتے پر ہم کہہ تو یہ رہے تھے کہ ہم مطلق العنان ہیں۔ جو جی چاہے کر سکتے ہیں۔ اور جس طرح چاہے سوچ سکتے ہیں۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ ہم "واہمہ" کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی ہیں ہمارے تمام خیالات اور تمام احساسات کی باگ ڈور "واہمہ" کے دستِ قدرت میں ہے۔ تو گویا اگر ہم اپنے "واہمہ" کو اپنے قابو میں رکھیں اور یہ جان لیں کہ اس کی صحیح راہ نمائی کی کیا تدبیر ہے تو ہمارے بہت سے بگڑے ہوئے کام بن سکتے ہیں۔

اب آئیے دیکھیں کہ "اشارۂ نفسی" کیا چیز ہے۔ جس کا ذکر ابتدائی سطروں میں کیا گیا ہے۔ کسی شخص کا کسی خیال کو کسی دوسرے شخص کے دماغ پر وارد کر دینے کا نام "اشارہ" ہے۔ "اشارۂ نفسی" ایک قسم کا عمل مقناطیسی ہے جسے نہایت سادہ الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ "واہمہ" کے اقتدار کا نام "اشارۂ نفسی" ہے۔ جب تک آپ کسی کام کو آسان

سمجھ رہے ہیں۔ اسکا کر ڈالنا آپ کے لئے مشکل نہیں۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیں کہ وہ نہایت دشوار ہے تو یقین جانیئے کہ آپ کبھی نہ کرسکیں گے۔ خفقان اور اختلاج قلب کے مریض اکثر معمولی سی باتوں سے اس قدر متاثر ہوجایا کرتے ہیں۔ کہ ان کا مرض لاعلاج ہوجاتا ہے۔ جس قدر وہ اپنے آپ کو زیادہ بے بس اور مجبور خیال کرتے ہیں اسی قدر وہ واقعتاً ہوتے بھی جاتے ہیں۔ چوٹ لگ جانے پر خواہ وہ کیسی ہی معمولی ہو جب تک یہ خیال کرتے جائیں گے کہ یہ بہت زیادہ ہے اور نہایت تکلیف دہ ہے تو وہ ناقابل برداشت ہوجائے گی۔ مگر اس کے برعکس اگر ہم اسکو اہمیت نہ دیں تو تکلیف ہم کو محسوس ہی نہ ہو۔ ہر شخص کو یقیناً اس بات کا تجربہ ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب کوئی حادثہ پیش آیا تو وہ اچھے بھلے بیٹھے رہے۔ مگر جونہی کسی نے کہا "اوہو! دیکھئے خون بہہ رہا ہے" تو ان کو فوراً غش آگیا۔ بچے کھیلتے کھیلتے گر پڑتے ہیں اور اٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں۔ مگر جہاں کہیں کوئی دوسرا شخص ان کی طرف متوجہ ہوا اور اظہار ہمدردی کے طور پر کچھ کہہ دیا تو وہ فوراً رونے لگتے ہیں۔

بعض مریض لوگ یوں بھی کہا کرتے ہیں کہ انھیں چاندنی یا اندھیری میں یا طلوع و غروب یا کسوف و خسوف کے وقت درد سر یا فلاں مرض کا دورہ پڑتا ہے تو وہ ہمیشہ اس وقت کے منتظر رہتے ہیں اور ٹھیک اسی وقت وہ اس مرض میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ تمام مثالیں اقتدار واہمہ کی ہیں۔

ڈاکٹر لی بو مذہب اشارہ کے موجد مانے گئے ہیں۔ مگر عہد حاضر میں منجملہ اور بڑے بڑے نامور ڈاکٹروں کے جن کا ذکر میں بعد کو کرونگا ڈاکٹر ایمل کو "بالخصوص قابل ذکر ہیں۔" اشارہ نفسی" کے مخترع آپ ہی ہیں۔ ان دنوں آپ فرانس میں بمقام نانسی اقامت پذیر ہیں۔ اور گذشتہ تقریباً نصف صدی سے "اشارہ نفسی" کے علمی اور عملی پہلوؤں پر غور کررہے ہیں۔ اپنے ہزاروں تجربات سے انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ "واہمہ" کا ہمارے تمام جسم اور جسمانی کیفیات پر کتنا زبردست اثر ہوتا ہے۔ انہوں نے اس عرصہ میں ہزارہا ایسے مریضوں کو جنہیں یوروپ کے نامی معالجانِ خصوصی نے لاعلاج قرار دیدیا تھا۔ بغیر کسی دوا یا آپریشن کے محض "اشارہ نفسی" کے عمل سے تندرست کردیا۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں:۔

"ہر مرض خواہ وہ کیسا ہی ہو "اشارہ نفسی" سے دور کیا جاسکتا ہے۔" "اشارہ نفسی" ایک ایسا آلہ ہے جو انسان کا پیدائشی ورثہ ہے۔ اور جس سے ہم تمام عمر بے شعورانہ کھیلتے رہتے ہیں۔ "اشارہ نفسی" ہماری ایک قوت پنہاں ہے جو ہمیں اپنے آپ پر پورا اقتدار حاصل کرنا بتاتی ہے۔ اس سے ہم اپنے آپکو اور دوسروں کو جسمانی اور دماغی امراض سے نجات دلاسکتے ہیں۔ اور اپنے ہی ماحول میں رہ کر مسرت و انبساط سے زندگی بسر کرنیکا طریقہ بتاسکتے ہیں۔ جن اعمال کو تم معجزات سمجھتے ہو در اصل ان کی پشت پر خالص فطرتی اسباب موجود ہیں اگر وہ تمہیں متحیر کرتے ہیں تو اسکی یہ وجہ ہے کہ تم نے "سبب" کو نہیں پایا۔ جب تمہیں سبب معلوم ہوگا تو سمجھو گے کہ اس سے زیادہ قدرتی فعل اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔"

"اشیاء ہمارے لئے وہ نہیں ہیں جو در اصل وہ ہیں۔ بلکہ وہ ہیں جو ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہماری تشکیل ہمارے اپنے دست قدرت میں ہے۔ نہ کہ واقعات ماحول کے ہاتھ میں۔ "اشارہ نفسی" جو یقین کے ساتھ پیہم عمل میں لایا جائے۔

مہندسانہ صحت کیساتھ نتائج پیدا کرتا ہے؟

ڈاکٹر پال جائر فرماتے ہیں۔ کہ عمل مقناطیسی بیشک ہمارے اعصاب کی وساطت سے عمل پذیر ہوتا ہے مگر اعصاب تو ہمارے تمام اعضاء جوارح پر قابو پائے ہوئے ہیں۔ اعصاب ہی اعضاء کو متحرک کرتے ہیں۔ اور اعصاب ہی براہ راست دل کے دوران خون اور عروق و شرائین کی بست و کشاد کو ایک ضابطہ میں رکھے ہوئے ہیں۔

بلجیم کے مایۂ ناز پروفیسر ایلمر آئی نولز فرماتے ہیں:-

"انسان میں امراض کی مدافعت کے لئے ایک قوت خود اس کے اپنے ہی اندر مخفی موجود ہے اور اشارہ نفسی پر اقتدار حاصل کرنے اور اسے مناسب طور پر استعمال کرنے سے ہم امراض کے ہر حملے کو رفع کر سکتے ہیں"۔ پروفیسر مذکور پھر فرماتے ہیں۔ "یہ ثابت ہو چکا ہے کہ "اشارۂ نفسی" کے باقاعدہ اور باضابطہ اعمال سے انسان ہر جسمانی درد و کرب سے نجات پا سکتا ہے۔ اور وہ تمام کمزوریاں اور بے قاعدگیاں جو انسان کو مائل بہ تنزل رکھنے کے باعث انسانیت کو قعر مذلت میں ڈالنے کا موجب ہو رہی ہیں" اشارۂ نفسی" سے اس طرح نابود کی جا سکتی ہیں کہ کبھی تھیں ہی نہیں"

"پریکٹیکل سائیکالوجی" کے فاضل مسٹر لے میڈلٹن ایک لیکچر کے دوران میں فرماتے ہیں۔" ہر اس شخص کے پاس جو اس شعبۂ حکمت کا عملی علم رکھتا ہو صحت کا پورا خزانہ موجود ہے۔ آج کسی شخص کے لئے بیمار رہنے کا سوائے حماقت کے اور کوئی بہانہ نہیں ہے۔ اور یہ وہ رائے ہے جس کی تائید تمام طبی دنیا نے کی ہے۔ جب یہ علم اس قدر وسیع ہو جائیگا کہ ہر شخص اس سے متمتع ہو سکے تو امراض نابود ہو جائیں گے۔

الغرض "اشارۂ نفسی" عجیب چیز ہے۔ جسمانی کمزوریاں اور صحت کی خرابیاں اس عمل سے مکمل طور پر رفع ہو سکتی ہیں بچوں اور بڑوں کی تمام ایسی عادتیں جن کے متعلق ہمارے تمدن اور معاشرت نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ جامۂ انسانیت پر ایک بدنما داغ ہیں اشارۂ نفسی سے سدھر سکتی ہیں۔ وہ ذلیل اعمال و اشغال جنہیں بنی نوع انسان کے متمدن ممالک کا کوئی باشندہ مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ اشارۂ نفسی کی تدریجی تدابیر سے رفتہ رفتہ نیست و نابود کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر واشے کہتا ہے کہ صرف "تنظیف واہمہ" سے ہر دوا اس قابل ہو سکتی ہے کہ وہ دماغی اور جسمانی تکالیف کا استیصال کر دے"۔ اس عمل سے مستفید ہونے کا طریقہ بیان کرنے سے پہلے اسکی وقعت ذہن نشین کرا دینا نہایت ضروری ہے۔

موسیو جان بیزیئے پیرس میں شعبۂ زراعت کے انجینئر تھے۔ مگر آپ نے اپنے مقناطیسی اعمال میں ملکہ حاصل کر کے شعبۂ زراعت کو خیرباد کہہ دیا اور اشارۂ نفسی سے علاج کرنا شروع کیا۔ اس میں انھیں اس درجہ کامیابی حاصل ہوئی کہ ان کے معاصر حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور آن پر مقدمہ چلا دیا۔ مگر جب عدالت گاہ میں بھی انہوں نے اپنے طریق علاج کو عین فطرت کے مطابق ثابت کر دیا تو عدالت کچھ نہ کر سکی۔

پروفیسر الیگزینڈر ارسکن۔ یہ انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور باوجود خاندانی مخالفت اور

نفرت ہے جو پیشہ طبابت کو علم نفسیات سے ہے - انہوں نے اعمال مقناطیسی کی طرف توجہ کی - اور ان کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انگلستان کے بڑے بڑے متعصب طبیب وجراح کئی مرتبہ ان کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں - اگرچہ انہوں نے کہیں باقاعدہ تعلیم کسی ادارہ طب وجراحت میں حاصل نہیں کی - مگر آپ انگلستان کے بڑے بڑے شفاخانوں میں معالجہ کے لئے طلب کئے گئے ہیں -

پروفیسر آٹو آٹو برلن — آپ کے طریقہ علاج نے بارہا وسط یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھوم مچادی - آپ کی علاج گاہ شہر برلن میں ہمیشہ مضطربان درد واندوہ کے لئے کنج عافیت و آسائش رہی ہے - پروفیسر صاحب کا شفاخانہ گویا راحت وسکون کا گھر تھا - جہاں نہ دوا کو دخل نہ نشتر کو - خستہ اعصاب مزمن امراض اور ہر طرح کی تکالیف سے شکستہ دل مریض باتوں باتوں میں بھلے چنگے ہوجاتے ہیں -

ڈاکٹر چارلس بوڈوین مصنف "اشارہ واشارہ نفسی" اور امریکہ کے ڈاکٹر چارلس ایف وینگلر پی ایچ - ایم مصنف "قانون واعمال اشارہ" کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں - لیکن پروفیسر آٹو کو اس باب میں خاص امتیاز حاصل ہے - بس یوں سمجھئے کہ معجزہ مسیح ۱۹۰۰ سال بعد پھر منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے - پروفیسر موصوف عوام الناس کو بہترین انسان بنانے میں جس تن دہی اور خلوص سے کام لے رہے ہیں اس کی مثال صفحہ ہستی پر ملنا دشوار ہے - ہر طبقہ کے لوگ ہر پیشہ کے انسان - ڈاکٹر اور فلسفی سے لیکر مزدور تک اس کے پاس مضطرب الحال جاتے ہیں اور مطمئن ہوکر آتے ہیں - معجزہ سحر - جادو ان کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں رہی - ایک مریض وجع المفاصل کا آتا ہے - جھکا ہوا - گھسٹتا ہوا - دونوں ہاتھوں میں لاٹھیاں تھامے - چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی - اور مطب میں آکر بیٹھ جاتا ہے - جہاں اور بہت سے معذور ومفلوج مریض موجود ہیں - پروفیسر آتا ہے - اور کہتا ہے - گھبراؤ نہیں - یہ مرض ابھی دور ہوتا ہے پھر چند ابتدائی اعمال کئے اور کہا اپنی آنکھیں بند کرو - اور منہ سے جلدی جلدی پیہم کہے جاؤ "یہ مرض جارہا ہے" "جارہا ہے" "گیا! گیا!" پھر بیس پچیس سیکنڈ کے بعد خود ہی کہا - دیکھو اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے - اٹھو اور چلو - مریض اٹھا اور چلنے لگا - تیز چلو - اور تیز - اور بھی تیز! تم اچھے بھلے چلنے لگے - اب تم دوڑو گے بھی - تو چلو دوڑو! لیجئے مریض دوڑنے لگا - اور ایسا خوش خوش دوڑنے لگا جیسے پچیس برس کا نوجوان ہو - آدھے منٹ میں ۲۲ سال کا پرانا مرض بات کرتے کرتے رفع ہوگیا - یہ ۲۷ - اپریل ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے - فرمائیے معجزہ اور کسے کہتے ہیں ؟

موسیو برنا پراوش اپنے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- "اس کی بے لوث ہمدردی اور اخوت اور بنی نوع انسان سے فراوانی محبت کا حال دیکھ کر ناممکن ہے کہ کوئی اسکا گرویدہ نہ ہوجائے - کہتے ہیں کہ "میں اسکے شفاخانہ میں گیا - ہر مرض کے مریض وہاں موجود تھے - مدقوق ومسلول - دمہ کے مریض - ناسوروں میں مبتلا - رسولیوں والے - مبروص اور مفلوج - اور اکثر ان میں ایسے تھے جو طب یا جراحت کے دروازہ سے ناکام ہوکر پھرے تھے -

میں نے ایک مفلوج عورت کو دیکھا۔ جو ایک کرسی پر پڑی تھی موسیو کو تشریف لائے اور اُس سے کہا۔ اپنا علاج خود کرنا بھی تو بہ نہایت آسان بات ہے۔ کبھی کسی کو میں نے اچھا نہیں کیا۔ صحت اور تندرستی کی قوت خود تم میں موجود ہے۔ اس سے کام لو۔ صرف اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرو لا متزلزل اعتماد۔ تمہاری روح میں تمہارا علاج موجود ہے۔ اسے بیدار کرو۔ تمہاری ہر تکلیف رفع ہو جائیگی۔ سنا تم نے جو میں نے کہا ہے؟ تمہیں یقین ہے کہ تم چل پھر سکوگی"؟ عورت بولی۔ جی ہاں۔ "اچھا تو پھر اٹھو"! معاً عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو"! عورت چلنے پھرنے لگی۔ اور باغ میں ٹہلنے لگی۔ الفاظ کیا تھے اشارات برقیہ تھے۔ ایک معجزہ تھا کہ میرے دیکھتے دیکھتے ظہور میں آیا"۔

بد اعتقادی میرے خیال میں جرم نہیں ہے۔ تمام محققین بد اعتقاد ہوا کرتے ہیں۔ اس مضمون کے قارئین بھی اکثر بدگمان ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں پروفیسر کو کے الفاظ ہی دہراتا ہوں۔ جو انہوں نے پیرس کے ایک مجمع کے روبرو فرمائے تھے:۔

"اگر آپ میں سے کچھ ایسے ہیں جو منکرین متشککین ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ضرور ہیں۔ تو میں اُن سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے مطب میں آیئے اور خود دیکھئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ حقیقت کو دیکھ کر منکر نہیں رہ سکتے"۔

محمد عطاء اللہ نسبل

مصطفیٰ کمال اور جنگِ عظیم

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جس وقت انور نے دوبارہ اورنہ پر قبضہ کیا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال بھی فوجی اسٹاف میں لفٹنٹ کرنل کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ لیکن انور کی کامیابی نے اسکو پس پشت ڈالدیا تھا اور لوگوں کی نگاہیں اس پر بہت کم پڑتی تھیں۔

یہ پھر قسطنطنیہ چلا گیا اور یہاں اپنی ماں اور بہن کیساتھ خاموش و بے مزہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہرچند وہ انور کی برسر اقتدار جماعت کو بہ لحاظ سیاست بہت پست سمجھتا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا ستارہ عروج پر تھا اور جدید حکومت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اس لئے پرانے ساتھیوں نے بھی اسکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس وقت طلعت و جمال وزارت کا بینہ تھے۔ اور انور وزیر جنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے ایک شاہزادی سے شادی کر لی تھی۔ اور آبنائے باسفورس پر ایک محل میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ انور چاہتا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو خلافت کے ماتحت ایک شیرازہ سے وابستہ کر دے اور تمام ترکی بولنے والی قوموں کو حکومت ترکی سے متعلق کر کے سلطنت عثمانی کے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لے آئے۔ مغربی سلطنتوں میں صرف جرمنی ایک ملک ایسا تھا جو ترکی کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ ورنہ اور تمام ممالک سے تعلقات اچھے نہ تھے۔

مصطفیٰ کمال اس وقت ایک جونیئر افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اپنی فطری نشونت کی وجہ سے انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں میں بھی مقبول نہ تھا۔ انور سے وہ بارہا لڑ چکا تھا۔ لیکن جمال ضرور اسکا معترف تھا۔ اور غالباً اس لیے کہ اس کی طرح مصطفیٰ کمال بھی جرمنی سے متنفر تھا۔

اورنہ پر قابض ہونے کے بعد انور نے سب سے پہلے فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس نے اس کام کے لئے ایک جرمن جنرل لیمان سانڈرس کی خدمات حاصل کیں۔ یہ سنتے ہی مصطفیٰ کمال کے بدن میں آگ لگ گئی۔ اور علی الاعلان اس نے مخالفت شروع کر دی۔ ایک دن اس نے فوجی افسروں کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اہل جرمن کو فوج میں دخل کا موقعہ دینا اول درجہ کی حماقت ہے۔ اور ترکی قوم کی توہین اس سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتی کہ اسکی فوج کا انتظام دوسروں کے ہاتھ میں ہو۔" اس نے جمال سے ملکر بھی گفتگو کی لیکن انور نے تو کوئی بات ہی نہیں کی اور اسکو سفارت صوفیہ میں فوجی

کا نائب بنا کر بھیجدیا۔

یہاں آئے ہوئے اسکو تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا کہ سرویا کا آرک ڈیوک قتل کیا گیا اور جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ جس میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

مصطفیٰ کمال کے اضطراب و غصہ کا اس وقت عجیب عالم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ترکی نے جرمنی کا حلیف بننے میں سخت غلطی کی ہے اور فائدہ صرف غیر جانبدار رہنے میں تھا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ اور نتیجہ کا منتظر تھا۔

مصطفیٰ کمال سمجھتا تھا کہ جنگ چند ہفتوں میں ختم ہو جائیگی۔ لیکن جب * دن پر ہفتے گذرتے گئے اور لڑائی کی آگ زیادہ مشتعل ہوئی تو یہ بے اختیار ہو گیا اور اس نے انور کو تار دیا کہ جنگ میں شرکت کی اجازت دیجائے۔ لیکن انور نے اسکو وہاں سے نہ ہٹایا۔ اس کے بعد اس نے متعدد تار دیئے۔ خطوط لکھے۔ اپنے احباب کو بیچ میں ڈالا۔ لیکن انور نے ایک نہ سنی۔ اور اسکو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ جب مہینہ پر مہینے اسی طرح گذر گئے تو فروری ۱۹۱۶ء میں ——— اس نے ارادہ کر لیا کہ بغیر اجازت ہی نکل پڑنا چاہیئے۔ اور وہ اسباب سفر درست کر ہی رہا تھا کہ قسطنطنیہ سے طلبی کا تار آیا۔ صورت یہ ہوئی کہ جب انور پاشا روس کے خلاف کوہ قاف میں جنگ کرنے کے لئے چلا گیا تو حقی پاشا اسکا انچارج ہوا۔ اسکو ضرورت تھی افسروں کی۔ اور انور پاشا کی ذاتی مخالفت سے اسے کوئی بحث نہ تھی۔ اس لئے اس نے فوراً مصطفیٰ کمال کو طلب کر لیا۔ کہ وہ بہترین فوجی افسر سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت تک انگریزی بیڑے دو بار درہ دانیال پر حملہ کر چکے تھے اور مصر میں گیلی پولی پر حملہ کرنے کے لئے زبردست فوجی اجتماع کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ جس وقت مصطفیٰ کمال قسطنطنیہ پہنچا اسی وقت درہ دانیال کے محاذ پر اسکو بھیجدیا گیا۔ جہاں کی کمان لیمان ساندرس (جرمن) کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے گیلی پولی کے جنوبی حصہ کی کمان مصطفیٰ کمال کے سپرد کر دی، ساندرس کی رائے ترکی افسروں کی نسبت کچھ اچھی نہ تھی لیکن مصطفیٰ کمال کے متعلق وہ دوسری رائے رکھتا تھا، ہرچند وہ سمجھتا تھا کہ مصطفیٰ کمال خود رائے اور ضرورت سے زیادہ بیباک و آزاد ہے لیکن اسکی محاربانہ قابلیت اور جرأت و دلیری کا معترف تھا۔

ایک مرتبہ تو مصطفیٰ کمال نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ ترکی کا غیر جانبدار رہنا بہتر تھا۔ کیونکہ جرمنی کی کامیابی اس جنگ میں بہت مشتبہ ہے۔ لیکن ساندرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہرچند ان دونوں کی رائے میں اکثر اختلاف ہوا کرتا تھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ ضدی واقع ہوئے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے قدر دان تھے۔

اب قاہرہ و یونان سے خبریں آنے لگیں کہ ۸۰ ہزار انگریزی سپاہ مصر میں مجتمع ہو گئی ہے۔ اور ایک بیڑے کی معیت میں جلد حملہ کرنے والی ہے۔ ساندرس کافی پریشان تھا کیونکہ گیلی پولی کے ۵۲ میل کے محاذ کی حفاظت کو

ہر جگہ فوج کا جمع رکھنا دشوار تھا۔ ملک پہاڑی تھا اور متعدد مقامات انگریزوں کے قبضہ میں جا چکے تھے۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ۲۰ میل کے محاذ میں کس خاص جگہ سے حملہ شروع ہوگا۔ اس وقت ترکی فوج ۶۰ ہزار تھی۔ اس نے اس کے تین حصے کر کے تمام محاذ پر پھیلا دیا اور خاموشی کیساتھ حملہ کا انتظار کرنے لگا۔

اسی دوران میں انور بے روس سے قسطنطنیہ واپس آیا۔ اور اس نے حکم بھیجا کہ مصطفیٰ کمال کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ سانڈرس مجبور ہوگیا اور نہایت افسوس کیساتھ انیسویں ڈویژن کی کمان اس کے سپرد کر دی جو میڈوس میں بطور محفوظ فوج کے خیمہ زن تھی۔ سانڈرس نے مصطفیٰ کمال کو چلتے وقت ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی فوج سے نہایت احتیاط کیساتھ کام لے اور جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ انگریزی فوج کا مرکزی حملہ کس جگہ ہے۔ اسکو حرکت میں نہ لائے۔

مصطفیٰ کمال ہر چند انور کے اس حکم سے نہایت برہم تھا۔ لیکن اس خیال سے ضرور مطمئن تھا کہ سانڈرس اس پر اعتماد رکھتا ہے۔ جب یہ میڈوس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ فوج ایک ترکی اور دو عربی رجمنٹوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اسکی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس نے فوج کی درستی و تنظیم پر توجہ کی۔ اور چند ہفتوں کی محنت سے اس کو ایک باقاعدہ و منظم صورت میں لے آیا۔ اسی کے ساتھ اس نے گھوم پھر کر اس حصۂ زمین کا بھی کافی مطالعہ کیا جہاں اسے اپنی فوج کو نقل و حرکت دینا تھی۔

۲۵۔ اپریل کو انگریزی حملہ شروع ہوا۔ سمندر پر ہلکا سا کہر پھیلا ہوا تھا کہ اس دھندلکے سے بیڑا نمودار ہوا۔ اور انگریزی فوج کے ایک حصہ نے شمال کی طرف بولیر پر حملہ کر دیا اور دوسرے حصہ نے جنوب کی طرف۔ لیکن یہ دونوں حملے صرف دھوکا دینے کے لئے تھے۔ تاکہ سانڈرس کو اصل مرکزی حملہ کا پتہ نہ چلے اور سانڈرس واقعی دھوکہ میں آ گیا۔

مرکزی حملہ کا مقام فی الاصل گابا ٹیپ تھا۔ تاکہ یہاں سے وادی میڈوس ہوتے ہوئے چوناق بیر کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا جائے۔ (جہاں مصطفیٰ کمال خیمہ زن تھا۔) جو اس محاذ کی کنجی تھی۔ لیکن اتفاق سے سمندر کے تموج نے جہازوں کو ذرا اور آگے بڑھا دیا اور فوجوں کو اری برنو پر اترنا پڑا۔ جو چوناق بیر پہاڑی کے بالکل دامن میں واقع تھا۔

مصطفیٰ کمال کو اسکا مطلقاً علم نہ تھا اور وہ حسب معمول صبح ساڑھے پانچ بجے اپنی فوج کی پریڈ میں مصروف تھا کہ اس نے ترکی فوج کے ایک دستہ کو پہاڑی کے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ "یہ کیا قصہ ہے؟" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا کہ "انگریزی فوج خشکی پر اتر آئی ہے۔" مصطفیٰ کمال نے پوچھا "کس مقام پر اتری ہے؟" جواب ملا کہ "آری برنو پر"۔ یہ سنتے ہی حکم دیا کہ "سنگینیں لگا لو اور واپس جاؤ"۔

چند منٹ میں نویں ڈویژن سے جو اس کے داہنی جانب تھی اس خبر کی تصدیق ہوئی۔ مصطفیٰ کمال نے تھوڑی دیر تک غور کیا اور جو کچھ کرنا تھا اسکا فیصلہ کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ سانڈرس کا یہ خیال کہ انگریزی فوج کا مرکزی حملہ بلیر پر ہوگا درست نہیں ہے۔ بلکہ حملہ کا اصل رخ چوناق بیر پر ہوگا۔ اس لئے اس نے حکم کا انتظار کئے بغیر مصمم ارادہ کر لیا کہ چوناق بیر کو بچانے

۔۔ اس لئے وہ اپنی ساری کوشش صرف کردیگا۔

اس نے فوج سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ "کارتوس خالی ہیں یا ان میں گولی بھری ہوئی ہے؟"

سپاہیوں نے جواب دیا کہ "گولیاں بھری ہیں۔"

مصطفیٰ کمال نے کہا کہ "فوراً چونک بیر کی طرف بڑھنا شروع کردو۔"

اس کے پاس اس وقت ایک معمولی سا نقشہ تھا جس میں اری برنو کا نام بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک ہاتھ میں یہی نقشہ لے لیا اور دوسرے ہاتھ میں کمپاس اور صرف دو سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر گھوڑا بڑھا دیا۔ زمین بہت ڈھلوان تھی، جا بجا گڑھے تھے۔ ناہموار پتھروں نے راستہ کو دشوار گذار بنا دیا تھا۔ اس لئے سپاہی اسکا ساتھ بمشکل دے سکتے تھے۔ مگر وہ برابر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور جب پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو صرف چند سپاہی اسکے ساتھ تھے۔ یہاں پہنچکر اس نے نیچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ تو معلوم ہوا کہ ۸۰۰ گز کے فاصلہ سے آسٹریلین فوج کا دستہ بڑھتا چلا آرہا ہے۔ رجمنٹ کا کمانڈر ابھی پیچھے تھا اور سپاہیوں سے ناہموار راستہ طے کراتا ہوا آرہا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے سب سے پہلے کمانڈر کو بلاکر حکم دیا کہ "جتنے سپاہی فراہم ہوسکتے ہیں ان سب کو اکٹھا کرکے دشمن پر حملہ کردو۔"

رجمنٹ جس وقت اوپر پہنچی تو بہت خستہ ہوچکی تھی۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے ان کی خستگی کی مطلق پروا نہیں کی۔ اور خود اسکو مرتب کرنا شروع کیا۔ اسی دوران میں توپخانہ بھی پہنچ گیا تھا۔ اور اس نے سب سے پہلی پہنچنے والی توپ کو خود اپنے ہاتھ سے بلند ترین مقام پر نصب کردیا اور فائر شروع کردیا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال کی حالت ایسی تھی جیسے اس کے جسم میں بجلی دوڑ گئی ہے اور ایک لمحہ کے لئے اسے قرار نہیں ہے۔ اس نے باختیار خود دوسری رجمنٹ کو بھی بلا لیا اور جب وہ ناکافی ثابت ہوئی تو تیسری کو بھی۔ یہانتک کہ اس نے ساری فوج طلب کرکے حملہ شروع کردیا۔ اور سنند میں ایک سپاہی بھی باقی نہ رہا۔

اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ کمال یہ سب کچھ باختیار خود بغیر حکم حاصل کئے ہوئے کر رہا تھا۔ اور اسکی یہ جسارت نہایت ہی خطرناک تھی۔ کیونکہ اگر مرکزی حملہ کسی اور طرف ہوتا تو پھر اسکا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن واقعات وحالات نے ثابت کردیا کہ مصطفیٰ کمال کا خیال بالکل صحیح تھا۔ اور جو کچھ اس نے کیا بجا و درست تھا۔

تمام دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی رہی۔ اور انگریزی فوج پہاڑ کے دو تہائی حصہ تک پہنچکر رک گئی۔ اب حالت یہ تھی کہ ترک سپاہی بھی تھک کر چور ہوگئے تھے اور دو عربی رجمنٹیں بھی بالکل خستہ و مضمحل نظر آتی تھیں۔ لیکن ادھر انگریزی فوج کا بھی یہی حال تھا۔ اس لئے جب شام ہوئی تو پہاڑی بدستور ترکوں کے قبضہ میں تھی۔ اور انگریزی فوج ان سے کچھ نیچے پہاڑی کے ڈھلوان حصہ پر پائی جاتی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے رات کیوقت بھی برابر گولہ باری جاری رکھی اور نہ خود چین سے بیٹھا نہ کسی اور کو چین لینے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزی افواج کو ہٹا کر ساحل تک پہنچا دے لیکن اس میں اسکو کامیابی حاصل نہ ہوئی

چوناق بیر کی پہاڑی حقیقتاً درۂ دانیال کی کنجی تھی۔ اور درۂ دانیال پر قابض ہو جانا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہو جانا تھا۔ اسی لئے انگریزی فوج چوناق بیر کے لئے جان لڑائے دیتی تھی۔ اور ادھر مصطفیٰ کمال سمجھتا تھا کہ اگر دشمن اس میں کامیاب ہو گیا تو پھر ترکی کے لئے بجز ہتھیار ڈال دینے کے اور کوئی مفر نہیں ہے۔

جب فریقین میں سے کسی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو دونوں نے خندقیں کھود کھود کر حملہ و حفاظت کی تدبیریں شروع کر دیں۔ انگریزی فوج چاہتی تھی کہ جہاں تک وہ پہنچ چکی ہے وہاں سے اور آگے بڑھ کر پہاڑی پر قبضہ کر لے اور مصطفیٰ کمال یہ عزم کر چکا تھا کہ دشمن کو ایک انچ آگے بڑھنے نہ دیگا۔ بلکہ اسکو پسپا کر کے ساحل آب تک پہنچا دیگا۔

آخر کار چند ہفتے اسی حالت میں گذر گئے اور دونوں فریق اپنی اپنی جگہ قائم رہے۔ یہاں تک کہ گرمی زیادہ پڑنے لگی۔ پانی کی فراہمی دشوار ہو گئی۔ اور لوگ مرنے لگے۔ لاشیں پڑی ہوئی سڑ رہی تھیں۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ہیضہ میں سپاہی مبتلا ہو رہے تھے۔ اور فریقین کی قوتِ مقابلہ و مدافعت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ان سب میں ایک مصطفیٰ کمال کی ذات ایسی تھی جو بدستور مستعد و آمادۂ کار نظر آتی تھی۔ نہ وہاں خستگی تھی نہ مایوسی۔ نہ اسے سونے کی ضرورت نہ آرام کرنے کی۔ وہ رات دن نہایت ہوشیاری سے موقع و محل کو جانچتا رہتا تھا۔ اور اسی کے مطابق اپنے اسٹاف کو حکم دیتا رہتا تھا۔ ہر کنجسٹر جرمن افسر جو نویں ڈویژن کا کمانڈر تھا مصطفیٰ کمال کی اس غیر معمولی قابلیت سے حیران تھا۔ اس نے ایک بار کہا کہ "مصطفیٰ کمال کا سا سوچنے والا دماغ میں نے کم دیکھا ہے وہ خود ہی تنہا سوچتا ہے اور خود ہی ایک عزم راسخ کے ساتھ راہِ عمل متعین کرتا ہے"۔

وہ چھوٹے بڑے افسروں سے جا کر خود باتیں کرتا اور براہ راست ان سے معلومات حاصل کرتا۔ بعض اوقات وہ نہایت سخت خطرناک موقعہ پر خود پہنچ جاتا تاکہ دشمن کی پوزیشن کو معلوم کر سکے۔ ایک بار وہ معمولی سارجنٹ کی حیثیت سے لاشیں اٹھانے والی جماعت میں شامل ہو کر آگے بڑھ گیا۔ تاکہ انگریزی افواج کی خندقوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھے۔ حملوں کے ساتھ کبھی کبھی وہ خود آگے بڑھ جاتا تا اور یہی وجہ تھی کہ ترکی فوج نے ہمت نہ ہاری اور برابر مقابلہ پر ڈٹی رہی۔ بارہا ایسا ہوا کہ چاروں طرف بندوقوں اور توپوں کی باڑھ میں وہ گھر گیا اور اس نے کبھی اسکی پروا نہیں کی۔

ایکبار خندق کے باہر وہ بیٹھا ہوا تھا کہ انگریزی توپخانہ نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور گولے اس کے قریب آ آ کر پھٹنے لگے۔ اسکے اسٹاف نے کہا کہ آڑ میں چلا جانا چاہئے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ "میں چھپ کر سپاہیوں کے لئے بری مثال قائم کرنا نہیں چاہتا"۔ وہ برابر اسی سکون کے ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ اور گولے اس کے چاروں طرف پھٹتے رہے۔ اتفاق سے اسی وقت دشمن کے توپخانہ نے اپنا ہدف بدل دیا۔ اور مصطفیٰ کمال بچ گیا۔ ایک بار وہ موٹر کار میں گیلی پولی کی طرف جا رہا تھا کہ انگریزی ہوائی جہاز نے اس پر بم پھینکنے شروع کر دیئے۔ گولے اسکے آگے پیچھے گر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈرائیور مر گیا۔ موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ بسا اوقات وہ

رائفل اٹھا لیتا۔ اور خندق سے آدھا دھڑ باہر نکال کر دشمن کی فوج میں کسی کو نشانہ بناتا۔ اور قطعی خوف نہ کھاتا کہ مبادا وہ خود نشانہ بن جائے۔ کبھی کبھی کھلی ہوئی خطرہ کی جگہ میں وہ باہر نکل آتا۔ اور نہایت آہستہ آہستہ وہاں سے گذرتا اور اسکی یہی فراخی وجسارت تھی جو ہر وقت اسکی فوج میں تازہ روح پھونکتی رہتی تھی۔

آخر کار جون میں دشمن کی فوج کا ایک حصہ اسے کمزور نظر آیا۔ اور ۲۸۔ کو اُس نے حملہ کی تیاری شروع کردی۔ لیکن اتفاق سے ۲۶۔ کو انور گیلی پولی کا محاذ دیکھنے آیا۔ اور اس نے اس تیاری کا حال سنکر مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ مصطفےٰ کمال کو پہلے اسکی اجازت لینا چاہیئے تھی۔ علاوہ اس کے یہ حملہ سوائے اسکے کہ ترک سپاہیوں کی جانوں کو نقصان پہنچائے۔ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مصطفےٰ کمال اس سے قبل اطلاع دے چکا تھا کہ اُس نے دشمن کی دو مشین گن چھین لی ہیں۔ لیکن انور کو اسکا یقین نہ تھا۔ اس لئے وہ تمام حالات کی جانچ کرنے کے لئے خود موقعہ پر پہنچ گیا۔

مصطفےٰ کمال کو انور کے اس طرزِ عمل سے سخت صدمہ پہنچا۔ اور اس نے اپنا استعفاء بھیجدیا۔ لیکن لیمان ساندرس نے اسکو سمجھا بجھا کر استعفاء واپس کردیا۔ اور انور نے بھی مجبور ہوکر حملہ کی اجازت دیدی۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ اور رجمنٹ ۱۸ بالکل تباہ ہوگئی۔ مصطفےٰ کمال نے اسکا سبب انور کی مداخلت ظاہر کیا اور انور نے مصطفےٰ کمال کو موردِ الزام قرار دیا۔ مصطفےٰ کمال نے پھر استعفاء پیش کردیا۔ اور باوجود ساندرس کے سمجھانے کے اس نے واپس نہ لیا۔ ساندرس نے کاظم پاشا (چیف آف اسٹاف) سے کہا کہ وہ مصطفےٰ کمال کو سمجھائے۔ چنانچہ کاظم نے ٹیلیفون پر مصطفےٰ کمال کو بلاکر پوچھا کہ "محاذ کا کیا حال ہے اور اب کیا ارادہ ہے"

مصطفےٰ نے کہا کہ "میں یہاں کی حالت برابر ظاہر کرتا رہا ہوں اور اب صرف ایک تدبیر باقی رہ گئی ہے"

کاظم نے پوچھا "وہ کیا ہے" مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ "تمام فوج میری کمان میں دیدیجائے"

کاظم نے کہا "لیکن یہ تمہارے لئے زیادہ تو نہ ہوگی" مصطفےٰ کمال نے کہا "یہ بہت کم ہے" اور یہ کہکر ٹیلیفون کا آلہ رکھ دیا۔ آخر کار ساندرس نے بہت کچھ کہہ سنکر مصطفےٰ کمال کو راضی کیا۔ اب انور بھی قسطنطنیہ واپس جا چکا تھا۔

اخیر جولائی تک یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ انگریزی فوج ایک بڑے حملہ کی تیاری کررہی ہے۔ کیونکہ جزائر یونان ومصر کی طرف سے تازہ دم فوجوں اور سامان حرب کی روانگی کی خبریں ترکوں کو پہنچ رہی تھیں۔ اِدھر ترکوں نے بھی امکان بھر تیاریاں شروع کردیں۔ اس حملہ کا مقصد یہ تھا کہ خوجہ چمن والی چوٹی پر قبضہ کرلیا جائے۔ یہ چوٹی چوناق بیر کے شمال میں واقع تھی۔ اور مصطفےٰ کمال کی داہنی خندقوں کی دسترس سے دُور تھی۔ اس چوٹی پر قابض ہوجانے کے معنی یہ تھے کہ ترکوں کے حملہ سے محفوظ رہ کر درۂ دانیال پر قبضہ ہوجاتا۔ انگریزی فوج کے کمانڈر نے یہ تدبیر کی کہ آسٹریلین فوج کو بائیں جانب سے سیدھا خوجہ چمن کی طرف روانہ کیا۔ اور ۲۵ ہزار فوج ساحل سے پانچ میل آگے بڑھا کر حکم دیا کہ دونوں طرف سے

بیک وقت حملہ شروع کر دیا جائے اور چوٹی پر پہنچکر دونوں فوجیں مل جائیں۔

برابر ایک ہفتہ سے روز رات کو خفیہ طور پر فوجیں آ آکر خندقوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ اور مصطفےٰ کمال اس تمام نقل و حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

آخر کار ۹-۱۰ اگست کی تاریک رات میں حملہ شروع ہو گیا۔ اور ۱۶ ہزار آسٹریلین سپاہ آگے بڑھنے لگی۔ صبح تک اس کو چوٹی تک پہنچ جانا تھا۔

سانڈرس نے داہنی طرف سے کنتجیسر کی کمان میں نویں ڈویژن کو روانہ کیا۔ جو ساڑھے چار بجے صبح تک چوٹی پر پہنچ گیا۔ جب کچھ روشنی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ دشمن کی فوجیں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی آ رہی ہیں۔ کنتجیسر کے پاس اس وقت صرف ۲۰ سپاہی تھے۔ لیکن اس نے فیر کا حکم دیا۔ دشمن نے یہ سمجھ کر کہ ترکوں کی کافی فوج چوٹی پر پہنچ چکی ہے۔ اپنے قدم روک لئے۔ اور خندق بنا بنا کر اپنی حفاظت میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف سے مصطفےٰ کمال اپنی فوج لیکر بڑھا۔ علاوہ اس کے سانڈرس نے میڈوس اور بلیر کی طرف سے بھی تمام محفوظ فوج اسی طرف روانہ کر دی۔

۷ اگست تک انگریزی فوجیں آرام کرتی رہیں۔ اور ۸ کو حملہ شروع کیا۔ حملہ کی صورت یہ تھی کہ میمنہ خوجہ چمن کی طرف بڑھا۔ میسرہ چونوق بیر کی طرف اور مرکزی حصہ پہاڑی کے اس درمیانی حصہ کی طرف جو دونوں چوٹیوں کو ملا رہا تھا۔ ترکوں کی طرف سے بھی پوری مدافعت کی گئی۔ اور مصطفےٰ کمال نے بہت کوشش کی کہ نیوزیلینڈ کی فوج کو جو اس کے سامنے بڑھ رہی تھی پسپا کر دے۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

شام کو سانڈرس نے مصطفےٰ کمال کو بلا بھیجا۔ وہ نہایت برہم تھا۔ کیونکہ بلیر سے جن فوجوں کو طلب کیا گیا تھا وہ اب تک نہیں پہنچی تھیں۔ اور اسی خطا پر اس نے اُن کے کمانڈر فوزی بے کو علیحدہ کر دیا تھا۔ تار پر تار اور ٹیلیفون پر ٹیلیفون دیئے لیکن فوجیں فراہم نہ ہو سکیں۔ اُس نے مصطفےٰ کمال سے کہا کہ "میں تمام فوجوں کو اب ایک جگہ کر کے کمان تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ اور ہر چند انگریزی فوج تعداد میں بہت زیادہ ہے لیکن جو کچھ ہو مقابلہ کرنا ضروری ہے" مصطفےٰ کمال نے فوراً اسکو منظور کر لیا۔ اور دیوانہ وار فوج کی ترتیب و تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ حسن اتفاق سے بلیر سے آنے والی فوجیں بھی اسی وقت پہنچ گئیں۔ اور بہت تھوڑا سا آرام دینے کے بعد مصطفےٰ کمال نے انھیں محاذ پر بھیجدیا۔

۹ کی صبح کو انگریزی اور ترکی فوج دونوں کا نصف دم ہوا۔ اور باوجود کثیر نقصان برداشت کر لینے کے انگریزی فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ چونوق بیر اور خوجہ چمن کی طرف بھی فریقین مصروف پیکار رہے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

انیسویں ڈویژن کے کمانڈر نے مصطفےٰ کمال کو ٹیلیفون دیا کہ انگریزی فوج کی گولہ باری نے ہماری فوج کو بہت بددل کر دیا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ انتشار پیدا ہو جائے۔ مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ جس طرح ممکن ہو ۲۴ گھنٹے اور کام

چلاؤ۔ میں یہاں کا انتظام کرکے خود آتا ہوں۔"

آخرکار ۸ بجے رات کو وہ خود چونوق بیر پہنچ گیا۔اور اُس نے گولہ باری کا کوئی خیال نہ کرکے خود دشمن کی پوزیشن کی جانچ کی۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر نیوزی لینڈ کی فوج کو یہاں سے نہ ہٹایا گیا تو میدان ہاتھ سے نکل جائیگا۔اس نے ساری رات تیاری میں صرف کردی اور تمام سپاہ کو جمع کرکے کہا کہ "میرے دوستو گھبراؤ نہیں ۔اور جلدی نہ کرو۔جس وقت تم میرا ہاتھ اٹھا ہوا دیکھو سنگینیں چڑھالو اور پھر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

مصطفیٰ کمال کی اس تقریر نے ترکی سپاہ میں نئی روح دوڑادی۔اور صبح ہونے سے قبل تمام توپخانوں نے گولہ باری شروع کردی۔ٹھیک تین بجے صبح کو مصطفیٰ کمال خندق سے باہر آیا اور آگے بڑھا۔انگریزی فوج نے بندوقوں کی باڑھ اس پر سرکی لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا۔اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور شیر کی طرح آگے بڑھنے لگا۔یہ دیکھتے ہوئے ترکی فوج میں غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا۔اور نعرے لگاتی ہوئی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ دو انگریزی بٹالین تو وہیں کھیت رہیں۔اس کے بعد ایک اور رجمنٹ منتشر ہوئی۔او۔پھر دوسری رجمنٹ کا ایک ایک سپاہی ترکی سنگینوں کا شکار ہوگیا۔انگریزی فوج لپسپا ہونے لگی۔اور چونوق بیر کا پورا محاذ دشمنوں سے صاف ہوگیا۔ یہ تھا مصطفیٰ کمال کا وہ کارنامہ جس نے جنگ عظیم میں ترکوں کی آبرو رکھ لی اور جس کی بناء پر دشمن بھی اُسے درۂ دانیال کا ہیرو کہتے ہیں۔

اس کے بعد تین ماہ تک برابر لڑائیاں جاری رہیں۔لیکن دشمن کو نہ درۂ دانیال حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور نہ وہ مصطفیٰ کمال کو اسکی جگہ سے ہٹا سکے۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں انگریزی فوجیں مجبور ہوکر یہاں سے ہٹ گئیں اور مصطفیٰ کمال بھی قسطنطنیہ واپس گیا۔

(باقی)

آئندہ مہینہ میں یہ سلسلہ مکمل ہوکر ختم ہو جائے گا۔

مکتوبات نیاز کی بعض ظاہری خصوصیات

۱۔ ۲۸ پونڈ کے چکنے کاغذ پر نہایت نفیس چھاپی گئی ہے۔
۲۔ حضرت نیاز کی تازہ ترین تصویر اس میں شامل ہے۔
۳۔ ایک اصلی خط کا بلاک بھی دیدیا گیا ہے۔
۴۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔

منیجر نگار

باب الانتقاد

(مجموعہ منظومات جناب سیماب اکبرآبادی)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صفحہ ۹۴ پر انقلاب روس کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

ہر آبادی کچھ ذراتِ رخشاں کا مجموعہ ہے
ہر کانِ گہر کچھ قطراتِ نیساں کا اک مرجوعہ ہے

چونکہ سیماب صاحب عربی زبان سے ناواقف ہیں اس لئے "مرجوعہ" کے صحیح معنی پر اُن کی نگاہ نہ تھی۔ "رجع" کے معنی لوٹنے کے ہیں اور اسی لئے "رجیع" اس عورت کو کہتے ہیں جو بیوہ ہونے کے بعد اپنے والدین کے گھر لوٹ جائے۔ اور اگر متعدی حالت میں استعمال کیا جائے تو "مرجوع یا مرجوعہ" کے معنی اُس چیز کے ہونگے جو لوٹائی جائے یا واپس کی جائے۔ لیکن عربی میں "مرجوعہ" خط یا رسالہ کے جواب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یا گودا گدانے کو کہتے ہیں۔

اصل میں کانِ گہر کو "مرجع" یعنی لوٹنے کی جگہ لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن غلطی یا ناواقفیت سے "مرجوعہ" لکھدیا گیا۔

اسی نظم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

معلوم نہیں تن تن کر چلنے والوں کو حوروں سے کیوں تشبیہ دی گئی۔ جبکہ ان کی یہ صفت مذہبی لٹریچر میں کسی جگہ نمایاں نہیں ہے۔ حوروں کو "قاصرات الطرف" بتایا گیا ہے۔ ان کی جوانی کو "کواعب اترابا" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کی پاکیزگی و دوشیزگی کو "درِ مکنون" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ان کی رفتار کی کوئی خصوصیت کہیں ظاہر نہیں کی گئی۔ تن تن کر چلنے کی تشبیہ عام طور پر طاؤس سے دیجاتی ہے۔ کیونکہ اسکی یہ صفت محسوس و مرئی ہے۔ حوریں نہ اس دنیا کی چیز ہیں اور نہ اس روئے زمین پر کسی نے ان کو چلتے دیکھا کہ ان کی یہ صفت متعین کی جائے۔ علاوہ اس کے موقعہ تعریض کا ہے اس لئے تشبیہ کسی ایسی چیز سے دینا جو حقیقی معنی میں محاسن کے ظاہر کرنے والی ہو یوں بھی درست نہیں۔ اس کے بعد کا شعر ہے:۔

وہ جن کے پرتو سے برقِ سینا کی شمعیں جلتی تھیں

اس مصرعہ میں بھی وہی عیب ہے۔ برقِ سینا تو ایک خدائی و متبرک چیز ہے۔ اور اگر کسی کے پرتو سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اسکی توہین و مذمت کیسی۔ در آنحالیکہ مدعا صرف تعریض ہے۔

اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔

زنجیرِ سیاست پاؤں میں تھی اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

اس میں بیان کا عدم توازن ظاہر ہے۔ کیونکہ پاؤں میں زنجیرِ سیاست دکھائی ہے جو حقیقی آہنی زنجیر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور دوسری طرف بارِ سلاسل سے واقعی ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:۔

پاؤں میں تھی زنجیر گراں اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

زار، شاہنشاہ روس کا حال بیان ہوتا ہے:۔

وہ زار، وہ سلطانِ رشیا جو حکمِ زنداں دیتا تھا

"جو حکمِ زنداں دیتا تھا" صحیح نہیں۔ زنداں۔ قیدخانہ کو کہتے ہیں۔ نہ کہ قید کو۔ اس لئے محاورہ کے اعتبار سے یا تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "جو قید کا حکم دیتا تھا"۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ "جو زنداں کا حاکم تھا"۔

سرمایہ دار کی نظم میں ایک جگہ تقسیمِ دولت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

نعمتِ مقسوم کا ممنون ہو جانا چاہئے صاحبِ دولت کو ہے تحدیثِ دولت لازمی

سیماب صاحب نے یہاں "تحدیث" کے معنی فنا ہونے کے لئے ہیں۔ یا تجدید کے۔ در آنحالیکہ "تحدیث" کے معنی صرف بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے ہیں یہ بھی نتیجہ ہے عربی سے ناواقفیت کا۔

اسی بند کی ٹیپ کا پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:۔

عارضی دولت کے عزّے پر نہ یوں مغرور ہو

عزّے پر مغرور ہونا غلط اور محاورہ کے خلاف ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں۔ "دولت پر عزّا نہ کرو۔ دولت پر مغرور نہ ہو۔ لیکن عزّہ پر مغرور نہ ہو صحیح نہیں۔ کیونکہ عزّہ کے معنی خود غرور کے ہیں۔

صفحہ ۴۶ پر ایک نظم "جبرِ باغبان" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے پہلے بند میں باغبان نے گلشن سے شکایت کی ہے کہ میں یوں تیری خدمت کرتا ہوں۔ اس اس طرح سینچتا ہوں لیکن تجھے پروا نہیں اس لئے میں تیرے اس ستم سے "مجبورِ انتقال" ہوں وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے بند میں گلشن نے جواب دیا ہے کہ "تیری طرح یہاں بہت آئے چلے گئے"۔ انسان کے اختیار میں اگر موت ہوتی تو وہ غمِ ایام کی تلخی کیوں سہتا اور آخر میں یہ کہ:۔

یہ جبر و انتداب یہ تخویف خودکشی بے اختیاریوں پہ ہے انسان کا یہ حال

کیا جائے کیا کرے جو خدا اختیار دے

سیماب صاحب نے مصرعہ اوّل میں انتداب غالباً بمعنی ندبہ (ماتم و بکار) استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انتداب کے معنی وفد یا نائب و قائم مقام بنانے کے ہیں۔ اور گریہ و بکاء کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ علاوہ اسکے دوسرے مصرعہ کا اقتضا یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو بے اختیاری کے منافی ہے۔ درآنحالیکہ سوائے جبر کے اور کوئی لفظ اس مفہوم کا نہیں لایا گیا۔ ندبہ یا تخویف خودکشی تو خود بے اختیاری و مجبوری کو ظاہر کرنیوالے ہیں۔ نہ کہ جبر پر زیادتی کو۔

صفحہ ۵۶ پر ایک نظم تنہائی کے عنوان سے مندرج ہے۔ جس کا ایک مصرعہ ہے:۔

اسی اک گوشہ میں کونین سما جاتا ہے

حالانکہ کونین تثنیہ ہے اور اردو میں اسکے لئے فعل جمع کا لانا چاہئے اور بجائے "سما جاتا ہے" کے "سما جاتے ہیں" لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۷۷ پر عید ناقص کے عنوان سے اظہار خیال کیا گیا ہے جس کا تیسرا شعر یہ ہے:۔

صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تو　　اپنا معدہ صاف کر کے مسہل و تبرید سے

معلوم نہیں عید سے قبل مسہل و تبرید کا موقعہ کیونکر مل سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اشارہ روزہ نہ رکھنے کی طرف ہے تو پھر پہلے مصرعہ میں کھانے پینے کی تخصیص صباح عید کے لئے بیکار ہو جاتی ہے کیونکہ وہ تو رمضان بھر کھانا کھاتا رہا ہے

صفحہ ۸۸۔ نظم "جوش انتقام" - پہلا شعر ہے:۔

اٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزم عشرت سے　　کہ آرہا ہوں میں صد محشر جنوں بردوش

لفظ "بردوش" بالکل غلط و بے محل ہے۔ بزم عشرت کے چنگ و رباب اٹھا دینے کا حکم دینا صرف اسی لئے ہو سکتا ہے کہ یا تو آنیوالا خود کوئی بہتر ساز موسیقی لیکر آرہا ہے یا یہ کہ بجائے نغمہ کے وہ کوئی اور ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی بات کا تعلق دوش انسانی سے نہیں ہے۔

چوتھا شعر ہے۔

شروع ہوتے ہیں کچھ واقعات نو ساماں　　مغنیہ سے کہو ختم کر فسانہ دوش

اوّل تو محاورہ کے لحاظ سے بجائے "ختم کر" کے "ختم کرے" کہنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے مغنیہ کا کام فسانہ کہنا نہیں ہے جو اس سے ختم کرایا جاتا ہے۔ اس لئے بجائے "فسانہ" کے ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو "نغمہ" کے مفہوم کو ظاہر کرتا۔ اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

مجھے جہان ریا کی جڑیں ہلانا ہیں　　ملا ہے اذن تکلم بہ اقتضائے سروش

جہان کی جڑیں ہلانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جڑیں درخت کی ہلائی جاتی ہیں اور یہ محاورہ مکان کے متعلق بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی جڑ ہلانا عجیب بات ہے۔ علاوہ اس کے محض اذن تکلم سے قصر ریا کی بنیاد کیونکر

ملائی جاسکتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں متقابلاً صداقت یا اسکا ہم معنی لفظ لانا ضروری تھا۔

صفحہ ۱۴۴ پر "اساس کائنات" کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کائنات کا نظام صرف عشق و محبت پر قائم ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:-

ہے محبت برہمی دہر کو روکے ہوئے　　ورنہ تھا اسکا الٹنا از قبیلِ ممکنات

اس شعر میں ایک معنوی نقص ہے اور وہ یہ کہ جب دہر کا الٹ جانا صرف ممکن تھا تو پھر اسکو قائم رکھنا محبت کا کوئی کمال نہیں کہا جاسکتا۔ اگر برہمی دہر کو بجائے ممکن کے لازم ظاہر کیا جاتا تو یہ نقص نہ رہتا۔

اس نظم میں نجات۔ رات۔ جبات وغیرہ کے ہم قافیہ ممکنات۔ اور واردات بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل نادرست ہے۔ قافیہ میں اس قسم کی غلطیاں سیماب صاحب نے بہت کی ہیں۔ اور اس سے قبل جا بجا انکا اظہار بھی کردیا گیا ہے

صفحہ ۱۴۲ پر ایک نظم "رنگین تیتری" کے عنوان سے ہے اسکا ایک مصرعہ ہے:-

اپنے ہی خاص گل پر قربان ہونے والی

اس مصرعہ کا پہلا ٹکڑا بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ تیتری کا کوئی گل مخصوص نہیں ہے۔ اور اگر "اپنے ہی خاص گل" سے مراد خود تیتری ہو تو اور زیادہ غلط ہے کیونکہ تیتری ہر پھول پر قربان ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے:-

عصمت کے گلکدے میں پابند دستِ محرم　　اڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم

پہلا مصرعہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ سے پہلے کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔

ایک جگہ دو تشبیہیں یہ نظر آتی ہیں:-

پر بستہ ایک کویل محرومِ رم اک آہو

تیتری کو "پر بستہ" اور "محرومِ رم" کہنا۔ جبکہ وہ ہر وقت پران نظر آتی ہے کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

اسی نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو:-

صد رنگ پھول جس میں قرنوں کی زندگی ہے　　عورت اسی چمن کی رنگین تیتری ہے

"اسی چمن" کا اشارہ کس طرف ہے۔ اسکا پتہ نہ پہلے مصرعہ سے چلتا ہے نہ نظم کے کسی اور شعر سے۔

صفحہ ۱۵۰ پر ایک شعر ہے:-

تیرے دل میں ہمت و احساس مطلق بھی نہیں　　تجھ کو پیمانِ وفا کا پاس مطلق بھی نہیں

دونوں مصرعوں میں لفظ "بھی" کا استعمال غلط ہے۔

صفحہ ۵۲ پر شاعر کی بعض خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ:۔

الفاظ بے زبان کے معنی نکالتا ہے

"الفاظ بے زبان" کے معنی نکالنا بے تکی سی بات ہے۔ "معنی" کے لحاظ سے "الفاظ" کی صفت "مہمل" ہونا چاہئے۔ یا "بے زبان" کی رعایت سے "معنی" کے بجائے کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نطق کے معنی پیدا کرتا۔

صفحہ ۵۴ پر ایک جگہ "خُنکی" بسکون نون لکھا ہے۔ حالانکہ بالضم ہونا چاہئے۔

اسی صفحہ میں ایک مصرعہ ہے:۔

جہان ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

اس میں لفظ "بھی" زائد ہے۔ بغیر اس کے معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

صفحہ ۶۲ پر ایک مصرعہ ہے:۔

آہستہ ردائے شب سمٹی ہوئی جاتی تھی

اس میں بجائے آہستہ آہستہ" کے "آہستہ" استعمال کیا گیا ہے اور بجائے "سمٹی جاتی تھی" کے "سمٹی ہوئی جاتی تھی" لکھا ہے۔ اگر "سمٹی" سے مراد خاص قسم کا کپڑا ہے جسے "سمٹی" کہتے ہیں۔ تو یہ پیش کردہ منظر کے منافی ہے۔

صفحہ ۶۴ پر ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

رات کو ڈوبے ہوئے خاموش تاروں کو پڑھا

جب تارے ڈوب جائیں تو پھر اُن کے پڑھنے کی کیا صورت ہے؟

صفحہ ۷۵ پر ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان "مغالطہ" ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:۔

حُسنِ اجل بکف کو تسکینِ روح جانا جامِ شفق میں سمجھا سامان تشنگی کا

پہلے مصرعہ میں "اجل" کی رعایت سے بجائے "تسکین روح" کے "اسباب زیست" لکھنا زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں ایک عجیب غلطی ہے۔ مقصود تو کہنا یہ ہے کہ جام شفق میں "تشنگی" بجھانے کا سامان نظر آیا لیکن "سامان تشنگی" کہکر مفہوم کو بالکل اُلٹ دیا۔

اسی نظم میں ایک جگہ "خود غرضی" بسکون "را" استعمال کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ صحیح بفتح "را" ہے۔

صفحہ ۷۶ پر ایک نظم "شاعر کا دل" نظر آتی ہے۔ اسکا آخری شعر ہے:۔

عرش کی خلوت سے جب فطرت کا دل گھبرائے گا عرش تیرا ہی دلِ ویراں بنایا جائے گا

دوسرے مصرعہ میں اگر بجائے "تیرا" کے "تجھ کو" لکھا جاتا۔ تو عرش کے معنی دوسرے مصرعہ میں بدل جاتے۔

لیکن یوں کوئی تفریق پیدا نہیں ہوتی۔

صفحہ ۱۸۰ پر ایک شعر ہے:۔

ابر کی آغوش سے قطرہ جو نکلا بے قرار   گرمیٔ فطرت نے اس کو کردیا جذب شرار

دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ ابر سے جب قطرۂ باراں نیچے آتا ہے تو وہ زمین میں جذب ہوجاتا ہے یا بہ جاتا ہے۔ شرار سے اسکا کیا واسطہ۔

صفحہ ۱۸۵ پر ایک جگہ "دوال اندوز" لکھا گیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ اور صفحہ ۱۸۸ پر ایک جگہ بجائے "حیات دائم کے" احیائے دوام نظم کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ صفحہ ۱۸۹ پر ایک مصرعہ ہے:۔

نظر آتا ہوتا ہے شاعر مایل ومجبور خواب

مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کی ترکیب بالکل غلط ہے۔ "مایل خواب" کہتے یا "مجبورِ خواب" مایل ومجبور دونوں کو حرفِ عطف سے وابستہ کرکے مضاف قرار دینا درست نہیں۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی غلطیاں ہیں جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ اور ایک ایسے شخص کے کلام میں ان کا پایا جانا جو اپنے آپ کو "ہندوستان کا شاعر اعظم" کہلانا پسند کرتا ہے۔ یقیناً حیرتناک ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ سیماب صاحب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس دَور کے اچھا کہنے والوں میں سے ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو صرف غزل گوئی تک محدود رکھتے اور نظموں کے خارزار میں نہ الجھتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ زیادہ کہنے اور تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے سے بدرجہا بہتر صرف ایک صنف کو لیکر اس میں کمال پیدا کرنا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اگر سیماب صاحب اپنی توجہ تمامتر صرف تغزل پر صرف کرتے تو آج ان کا مرتبہ دنیائے شاعری میں اس سے زیادہ بلند ہوتا۔

ماہ آئندہ کے نگار میں

"دیر وحرم کے قصے" اور "مصطفےٰ کمال" دونوں ختم ہوجائیں گے۔ اور

ایک ڈرامہ "جھانسی کی رانی"

ادارۂ تحریر کی طرف سے شروع ہوگا۔

(منیجر نگار)

بابُ المراسلة والمناظرہ

مذہب شکن سوسائٹی

(جناب سیّد تہور علی صاحب ۔ والدار نگر)

آپ نے اکثر اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ مذہب کی وجہ سے خونریزی ہوئی اور جب تک اس کا وجود دنیا میں باقی ہے ۔ امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کیوں نہ آپ ایک مذہب شکن سوسائٹی کی بنیاد قائم کر کے لوگوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ اور ایک اخبار یا رسالہ مخصوص اسی مقصد کیلئے جاری کر کے ملک میں پراگندہ کریں۔

(نگار) میں آپ کے لب و لہجہ سے مطلق اندازہ نہیں کر سکا کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں طنز شامل ہے یا واقعی آپکا مقصود وہی ہے جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم چونکہ بات دلچسپ ہے ۔ اس لئے بلا لحاظ اس امر کے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا سننا چاہتے ہیں۔ مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہوں۔

بالکل یہی مشورہ اس سے قبل بعض اور احباب نے بھی دیا لیکن نہ میں نے انھیں کوئی جواب دیا۔ اور نہ اُن کے ارشاد کی تعمیل کی طرف توجہ کی ۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ ایک یہ کہ مذاہب عالم جس دور سے گذر رہے ہیں۔ اس میں بہ لحاظ تمدن و معاشرت اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ اور اگر اہل ہند یا ایشیا کی بعض اور مذہب زدہ قوموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو نمایاں طور پر محسوس ہوگا کہ مذہب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کیونکہ علم و تمدن کی ترقی نے اس کے لئے کوئی جائے قرار باقی نہیں رکھی ۔ اور عقولِ انسانی اس عہد طفولیت سے گذر چکی ہیں جب صرف جنت کے کھلونوں اور دوزخ کے تازیانوں سے انسان بہلایا اور ڈرایا جاتا تھا ۔ البتہ ہندوستان میں چونکہ قدامت پرستی و جہل کی بلا ہنوز مسلط ہے ۔ اس لئے یہاں اس ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے ۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے ۔ اس قسم کا محاذ قائم کرنا یہاں مفید نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ

اوّل تو حکومت خود اسکو پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ مذہبی تصادم و اختلاف اس کی بقا کا بڑا زبردست راز ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جب تک خود کوئی قوم ترقی علوم کے مدارج طے کر کے اپنے اندر مذہب کی طرف سے احساس بیزاری پیدا نہ کرے دوسروں کے سمجھانے سے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بجائے "مذہب شکن سوسائٹیاں" قائم کرنے کے زیادہ اصولی تدبیر یہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت میں مدد کی جائے۔ اور علوم جدیدہ کی ترویج سے ذہن انسانی کو ترقی یافتہ بنایا جائے۔

علاوہ اس کے ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے مذہب کے خلاف پروپاگنڈا یوں بھی خلاف دانشمندی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے جس ملک میں ایسے دو متضاد مذاہب پائے جاتے ہوں۔ وہاں اگر صرف ایک جماعت نے اپنے مذہبی تقشف یا مذہبی اصول کو ترک کیا اور دوسری جماعت بدستور ویسی ہی سخت و متعصب بنی رہی تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تارکِ مذہب جماعت فنا ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس کوئی ذریعہ مقاومت کا باقی نہ رہیگا۔

جن ممالک میں اختلاف مذاہب اتنا شدید نہیں ہے اور تہذیب و معاشرت ایک ہے۔ وہاں تو دینی اور بے دینی دونوں صورتوں میں اتحادِ عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں مذہب کیساتھ تہذیب و تمدن بھی مختلف ہو۔ قومیت و وطنیت کا جذبہ بھی عام نہ ہو وہاں تو مذہب یا کسی ایسے نظام کا پایا جانا ضروری ہے۔ جو مختلف جماعتوں اور خصوصیت کے ساتھ چھوٹی جماعتوں کے افراد کو کسی ایک شیرازہ سے وابستہ رکھے۔

یورپ میں اوّل تو کوئی اختلاف مذاہب پایا ہی نہیں جاتا اور اگر یہودیوں کو بہ حیثیت ایک مذہبی جماعت ہونے کے نصاریٰ سے بالکل مختلف قرار دیں تو بھی یہ اختلاف ان کی عملی زندگی پر موثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی تہذیب و معاشرت اور ان کے خاندانی روایات علم و عمل بالکل ایک ہیں اور اس صورت میں اگر وہاں کوئی جماعت "تارکِ مذہب" ہو جائے تو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر ہندوستان میں آج مسلمان ترکِ اسلام کر دیں اور ہندو اپنے حال پر قائم رہیں تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح مذہب کی پابندیوں سے مسلمان آزاد ہو سکتا ہے۔ کیا اسی طرح ہندو نہیں ہو سکتا۔ اور جب دونوں مذہب کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں گے تو یقیناً ان میں اتحادِ عمل پیدا ہو جائیگا۔ لیکن ایسا سوال کرنا ہندو ذہنیت۔ ہندو مذہبیت اور ہندو معاشرت سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔

ہندوؤں کی اجتماعیت حقیقتاً مذہب سے وابستہ نہیں ہے اور نہ ہندو نام ہے کسی مذہب کا۔ بلکہ وہ سوسائٹی کی ایک خاص تنظیم ہے۔ معیشت و معاشرت کا ایک متعین لائحہ عمل ہے اور ایک ایسی مخصوص ذہنیت ہے جو یہاں کے ماحول سے پیدا ہوئی اور ہمیشہ یہیں کے ماحول سے وابستہ رہیگی۔ اس لئے ہندوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خوشی سے بغیر کسی اثر کے ترک مذہب کر سکتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اسکیمو قوم کے افراد سے یہ آرزو رکھنا کہ وہ اپنی سمور کی پوشش سے کسی وقت بیزار ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان بہ لحاظ وطنیت و قومیت کے ہندوؤں سے کسی طرح مختلف نہیں لیکن

بھی واقعہ ہے کہ اپنی تہذیب اپنی معاشرت اور اپنی ذہنیت کے لحاظ سے وہ ہندوؤں سے بہت مختلف ہیں۔

اسلام کی یہ خصوصیت کہ وہ جہاں گیا اپنی ذہنیت و تہذیب اپنے ساتھ لے گیا اور بلا لحاظ نسل و قوم - ملک و ملت جس کو چھو لیا اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ہندوستان بھی ساتھ آئی اور جو لوگ یہاں مسلمان ہوئے اُن کی تہذیب و معاشرت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اس لئے جس طرح اب یہاں کے ہندوؤں سے اُن کی مخصوص ذہنیت فنا نہیں ہوسکتی اسی طرح مسلمان بھی اپنے کلچر کو ترک نہیں کر سکتے - اور بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان ترکِ اسلام کے بعد بھی ہندو نہیں ہوسکتا - اور ہندوؤں کے ترک مذہب کی وہ صورت باقی نہیں جو حکومت اسلامی میں پائی جاتی تھیں - کہ وہ اسلامی تہذیب اختیار کر کے مسلمانوں سے متحد ہو سکیں -

الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے پناہ نہیں ہے کہ وہ مذہب کو ہاتھ سے نہ دیں - البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کے صحیح مفہوم کا پروپاگنڈا کر کے اپنی اخلاقی و ذہنی برتری کو ہندوؤں سے تسلیم کرالیں - علی الخصوص ایسے وقت میں کہ ہندو قوم اپنے جدید دورِ نہضت (Renaissance) میں مغرب کے بعض پست و فرومایہ اخلاق قبول کرنے کی طرف مائل نظر آرہی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ سب سے بڑی وجہ اس رائے کے قبول نہ کرنے کی میرے لئے ایک اور بھی ہے - وہ یہ کہ جن مقاصد بلند کو سامنے رکھ کر دنیا سے مذہب کے وجود کو محو کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے وہ میری رائے میں اسلام سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں - اور اسی لئے میں نے ہمیشہ اسلام کا مفہوم "اخلاق بغیر پابندی مذہب" (Morality without religion) قرار دیا ہے - اور ہر چند بظاہر یہ بالکل نئی سی بات معلوم ہوتی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کا ماحصل صرف درستی اخلاق ہے - اور ترک مذہب کی بڑی سے بڑی برکت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہی -

---

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوئم

کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور اس جلد میں اس وقت تک کے تمام استفسار و جواب شامل کر دیئے جائیں گے تاکہ تیسری جلد کی ضرورت نہ رہے - اسکا حجم غالباً ایک ہزار صفحہ سے کم نہ ہوگا - قبل اشاعت اس کی رعایتی قیمت چار روپیہ معہ محصول رکھی گئی ہے -

منیجر نگار

باب الاستفسار

رسول اللہ اور تعداد ازدواج

(جناب علی حسن خاں صاحب - تلہر)

جب سے آپکا رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے اُس وقت سے برابر میرے مطالعہ میں رہا ہے اُس کے مضامین بڑی قدر و منزلت سے پڑھتا ہوں - اسلام اور بانی اسلام کے متعلق جو خیالات آپ رکھتے ہیں اس سے بھی واقف ہوں - مہربانی فرماکر یہ تو بتلایئے کہ رسول اللہ نے جو اس قدر نکاح کر ڈالے تھے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے -

---

(نگار) یہ مسئلہ ہمیشہ سے غیر مسلم لوگوں کا مرکز توجہ رہا ہے - اور بارہا اس اعتراض کا جواب بھی دیا گیا - لیکن اس باب میں میرے نزدیک دونوں جماعتوں نے غلطی کی ہے - اور جس طرح معترضین نے رسول اللہ کی سیرت اور اُس وقت کے حالات پر غور نہیں کیا - اسی طرح مسلمانوں نے جواب دینے میں اپنی قدامت پرستانہ ذہنیت کا ثبوت دیا -

معترضین نے ہمیشہ رسول اللہ کی تعداد ازدواج کو اُن کے جذبۂ نفسانی پر محمول کرنا چاہا اور مسلمانوں نے ہمیشہ تعداد ازدواج کو ایک رحمت و برکت قرار دیکر ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے ضروری قرار دیا حالانکہ نہ رسول اللہ نے جذبۂ شہوت پرستی کے ماتحت اتنے نکاح کئے اور نہ اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے - کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا مستحسن سمجھا جائے اگر زمانہ کا اقتضاء اس کے خلاف ہے -

جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے - یہ وہ عہد تھا جب عرب میں عورت کوئی حیثیت و عزت نہ رکھتی تھی - اور اس سے کیا جاتا تھا وہی سلوک ہوتا تھا جو وحوش و بہائم کیساتھ - اور ادارۂ نکاح کی وسعت کا یہ حال تھا کہ ایک مرد اگر سینکڑوں پر بھی بسر کرتا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا - ظاہر ہے کہ یہ مذموم عادت دفعتۃً دور نہیں ہوسکتی تھی اور نہ اصلاح کا کام

یوں یکبارگی ہوا کرتا ہے۔ پھر غور فرمائیے کہ رسول اللہ نے جتنے نکاح کئے ہیں اُن میں کیا ضرورت و مصلحت پنہاں تھی بعض سے آپ نے صرف اس لئے شادی کی کہ عورت کی پوزیشن پر اسکا اثر پڑے اور بعض سے اس لئے کہ تبلیغی و اصلاحی مرکزیاں قائم رہ سکیں۔

آپ نے اتنی شادیاں کس مجبوری سے کیں اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آئندہ کے لئے صرف چار تک اُن کی تعداد محدود کر دی۔ اور وہ بھی ایسے سخت شرائط کے ساتھ کہ بیک وقت ایک نکاح کرنے سے زیادہ کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی۔

پھر چونکہ معاشرت کے احکام و قوانین میں ہمیشہ تغیر و تبدل کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس لئے احکام شرعی میں کافی گنجائش اسکی رکھدی کہ ہر زمانہ میں اس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے ترمیم و تنسیخ ہو سکے۔

اہل مذاہب کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کے محامد و محاسن بیان کرتے وقت اسکا لحاظ نہیں رکھتے کہ اُن کا زمانہ کیا تھا اور اُس وقت کا اقتضاء زمانہ مابعد کے واقعات سے کس حد تک مختلف تھا۔ وہ ہر رسول یا نبی کے احکام کو ایسی مکمل چیز سمجھتے ہیں کہ کبھی کسی حال میں وہ تغیر پذیر نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ہر پیغمبر اپنے زمانہ کے حالات سے وضع قوانین کرتا ہے۔ اور اسکے سامنے مستقبل کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ .... اس کی تعلیم کی تکمیل کا ثبوت یہی ہے کہ وہ احکام شرعیہ زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی اجازت دے اور غالباً یہی وہ خصوصیت اسلام و صاحب اسلام کی ایسی ہے جس میں دنیا کا کوئی دوسرا مذہب یا پیغمبر شریک نظر نہیں آتا۔

اگر رسول اللہ نے متعدد شادیاں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس وقت اس سے زیادہ اصلاح ممکن نہ تھی۔ اور آئندہ کیلئے مخصوص شرائط کیساتھ صرف چار کی اجازت دینا اس اصلاح میں ایک قدم اور آگے بڑھانے تھا جس سے رسول اللہ کی انتہائی فراست و دانشمندی ظاہر ہوتی ہے ـــــ لیکن اب اگر حالات کا اقتضاء یہ ہو کہ صرف ایک شادی کی جائے یا بالکل نہ کی جائے تو اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ اسلام اس کی مخالفت کریگا بلکہ وہ علماء مذہب و مصلحین قوم کو مجاز و مختار رہنا چاہیے کہ

مصلحت بین و کار آسان کن

مکتوبات نیاز کی جلد ثانی

جولائی کے پہلے ہفتہ سے شروع ہو جائیگی

(منیجر نگار)

مکتوباتِ نیاز

نگار کی اٹھائیسویں جلد میں یہ (حضرت نیاز نہیں بلکہ) میرا آخری خط ہے جس میں کسی مخصوص شخص کے بجائے پوری جماعت کو مخاطب کر رہا ہوں اور یہ جماعت ان تمام حضرات کی ہے جو نگار کو شرفِ مطالعہ بخشتے ہیں اور جن سے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا اخلاقی و روحانی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ اس لئے

میں اس تحریر کے ذریعہ سے اس رشتہ کو اور زیادہ مستحکم کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ کوئی یادگار ایسی آپ کے پاس رہے جو حضرت نیاز کی پرائیویٹ زندگی سے آپ کو قریب تر کر دینے والی ہو اور وہ یادگار صرف مکتوباتِ نیاز ہیں۔

ابھی اس کی اشاعت کو پورا ایک مہینہ باقی ہے اور آپ کے پاس کافی وقت ہے کہ اس یادگار کے حاصل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ اگر آپ ادب و انشاء کے اس مجموعۂ نوادر کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو صرف آپ کی خاموشی کافی ہے ورنہ تین پیسہ کا صرف گوارا کر کے مطلع فرما دیجئے کہ ہم اس کا وی پی آپ کے نام روانہ کریں۔

منیجر نگار

ایجادات

معلومات

مجرم کی شناخت کا جدید طریقہ۔

موجودہ دورِ تہذیب و تمدن میں یہ کوشش جاری ہے کہ اُن قوانین کا خاتمہ کر دیا جائے جن سے بربریت اور بہیمیت اظہار ہوتا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ابھی تک مجرمین کی گرفتاری اور شناخت کے وہی پرانے اور مذموم طریقے رائج ہیں جن سے غیر مجرم بھی مجرم قرار پا جاتے ہیں۔ مثلاً متہم کو تکلیف جسمانی پہنچا کر جرم کا اقبال کرایا جاتا ہے۔ اور اس وقت تک برابر یہ سلسلۂ اذیت جاری رہتا ہے کہ جب تک اقرار نہ کرے۔ یا کسی دوسرے کو مجرم نہ ثابت کرے۔

لیکن سائینس دان حضرات اس طرف سے غافل نہ تھے اور آخر کار انھوں نے ایسے طریقے دریافت کر ہی لئے۔ جن کے ذریعہ سے بہ آسانی اصل مجرم کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اجراء کے بعد انسداد جرائم میں بہت مدد ملیگی۔ کیونکہ یہ طریقے تجربہ کے بعد اس قدر صحیح ثابت ہوئے ہیں کہ اس کے بعد مجرمین کو کسی قسم کے حیلہ کی گنجائش باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وہ صریح الفاظ میں اپنے جرم کے اقبال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان طریقوں کو مختصر تعارف کے بعد درج کرتے ہیں:۔

پولیگراف (POLYGRAPH)

یہ آلہ اطباء کے اس آلہ سے بہت مشابہ ہے جس سے خون کی حرارت اور اس کے اُتار چڑھاؤ کو دریافت کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پولیگراف میں ایک قلم ہوتا ہے جو خطوط کے میلان کو کاغذ پر لکھتا جاتا ہے۔ یہ خطوط خون کے اُتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسان پر جس قسم کے انفعالات طاری ہوتے ہیں اسی مناسبت سے اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ جب اس سے کسی جرم کے متعلق استفسار کیا جاتا ہے۔ تو اگر وہ اسکا حقیقت میں مرتکب ہوتا ہے تو خوف کیوجہ سے اس کے اندر عجیب و غریب انفعالات طاری ہوتے ہیں۔ پولیگراف ان تمام تغیرات اور حالات کو محفوظ کر لیتا ہے۔ جس سے مجرم کی اندرونی حالت کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔

بعض مجرم کثرتِ جرم یا اپنے اندر غیر معمولی صبر کی وجہ سے جرم کے اخفاء پر کافی قدرت رکھتے ہیں ۔ اور وہ اپنے اوپر کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دیتے مگر باوجود اسکے قدرتی طور پر ان کا دوران خون نہایت تیز ہو جاتا ہے اور نہایت سرعت کیساتھ رگوں میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور یہ سرعت ہی درحقیقت مجرم کی پہچان ہے۔ جسے یہ آلہ نہایت خوبی کیساتھ کاغذ پر منتقل کر کے بتلا دیتا ہے۔

اس آلہ کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ حادثوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوا لیکن باوجود اس کے اسکا استعمال بہت قلیل ہے۔ امریکہ کی بعض کمپنیوں اور بنکوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شکاگو کے ایک بنک کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہاں سے پانچ ہزار ڈالر غائب ہو گئے۔ ۵۶ ملازمین پر اسکا تجربہ کیا گیا تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے۔ اور بعد کو سب نے بغیر کسی اکراہ کے اپنے جرم کا اقبال کیا۔ اس کے بعد سے ہر سال بنک مذکور میں اس کے ذریعہ تحقیق کی جاتی ہے۔۔ اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر جب اسے استعمال کیا گیا تو اسکا نتیجہ صحیح ثابت ہوا۔

سائیکو گلوانو میٹر (PSYCHO GALVANO METAR)

اس آلہ کا موجد ایک راہب ہے۔ اس آلہ میں بجلی کی خفیف سی شعاع ہوتی ہے۔ جو بیٹری سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اسے متہم پر لگا کر اس سے سوالات کئے جاتے ہیں تو اگر وہ مجرم ہوتا ہے تو اسکا بدن پسینہ سے تر ہو جاتا ہے۔ جس قدر پسینہ پیدا ہوگا اسی مناسبت سے بجلی کی شعاع جو تمام بدن میں پھیلی ہوتی ہے کم ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ اس مقدار کو محفوظ کر لیتا ہے۔ جس سے مجرم کا پتہ چلتا ہے۔

بذریعہ سائیکالوجی (PSYCHOLOGY)

علم النفس کے ذریعہ سے بھی تحقیق کی جاتی ہے۔ کیونکہ ماہران علم النفس نہایت آسانی سے مجرم کو پہچان لیتے ہیں چنانچہ اسی بناء پر جاسوسوں کے لئے علم النفس کا جاننا نہایت ضرور ہے مگر چونکہ اس میں غلطیاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لئے چنداں قابلِ توجہ نہیں۔

نیوموگراف (PNEUMAGRAPH)

علم النفس کا یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ جب مجرم سے استفسارات کئے جاتے ہیں تو اس کے تنفس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ تیزی ہی درحقیقت اس کے جرم کو ظاہر کر دیتی ہے یہ آلہ پولیگراف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسکا کام صرف یہ ہے کہ تنفس کی رفتار کو صحیح طور پر بتلا دے۔ اسکے تجربہ کرنیوالوں کا خیال ہے کہ اس سے کبھی بھی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔

اُوپر جتنے آلوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے ان سب کا انحصار انفعالات پر ہے۔ مگر بہت سے مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جو کثرت جرم کے باعث جرم کے پوشیدہ رکھنے پر پُوری قوت رکھتے ہیں اور اُن کے قلوب اس قدر مُردہ ہوجاتے ہیں کہ وہ اپنے اُوپر کسی قسم کا انفعال طاری نہیں ہونے دیتے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ آلے بالکل بیکار ثابت ہونگے۔

سائینس نے جہاں اس قسم کے آلوں کی ایجاد کی وہاں اس خرابی کے انسداد کا بھی طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس قسم کے مجرمین کو ایک دوا استعمال کرائی جاتی ہے۔ جسے "سکوپولامین" (Scopolamin) کہتے ہیں۔ یہ دوا قطعی بے ضرر اور بغیر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسکی خاصیت یہ ہے کہ یہ دماغ کے اُس حصہ کو جسے مرکز کذب کہا جاتا ہے بالکل بیکار کردیتی ہے۔ جس کے بعد انسان جھوٹ بولنے پر قادر نہیں رہتا۔

کولونیل گوڈرڈ نے جو کہ مسئلہ جرائم میں بہت بڑے ماہر ہیں۔ بارہا اس دوا کا تجربہ کیا ہے۔ اسکا قول ہے کہ اسکا نتیجہ کبھی غلط نہیں ظاہر ہوا۔ اور اسکے ذریعہ سے ہمیشہ وہی مجرم ثابت ہوا جو حقیقت میں مجرم تھا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ اسکا اثر دماغ کے مرکز کذب پر نہایت شدید ہوتا ہے اس لئے وہ بالکل کمزور ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد مجرم کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ وہ واقعہ کو اصلی صورت میں پیش کردے۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں اسکے اعجاز کا ایک واقعہ بیان کردیں۔

مسٹر ڈیفنیز امریکہ کے محکمۂ قضاء کے ایک بڑے عہدہ دار ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چودہ ۱۴ اشخاص پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ انھیں سکوپولامین استعمال کرائی گئی۔ تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے۔ موصوف کا بیان ہے کہ محکمہ نے محض ان کے اعتراف ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ جب دیگر ذرائع سے بھی تفتیش کی گئی تو یہ واقعہ صحیح ثابت ہوا۔ ظاہر ہے اس قدر شہادتوں کے بعد اسکی صحت پر کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اس دوا کے استعمال کے بعد اس قدر قطعی نتائج برآمد ہوتے ہیں تو اسے عام طور پر مجرمین کے شناخت کے لئے کیوں نہیں استعمال کیا جاتا؟

عبد اللطیف اعظمی

مطبوعات موصولہ

نغمۂ کہسار شملہ میں ایک انجمن بزم اردو کے نام سے قایم ہوئی ہے جس کا مقصد اردو زبان کی خدمت ہے۔ اسی سلسلہ میں کبھی کبھی صحبتِ مشاعرہ برپا کرنا بھی اس انجمن کے مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ ستمبر ۳۴ء میں ایک بزم شعر خوانی منعقد کی گئی۔ اور تقریباً ۴۲ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ چونکہ نہ مصرعِ طرح کی قید تھی اور نہ غزل و نظم کی تخصیص۔ اس لئے یہ صحبت عام مشاعروں سے زیادہ دلچسپ رہی۔

ان نظموں اور غزلوں کے مجموعہ کو اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ جو سیکرٹری بزم اردو شملہ سے پانچ آنہ میں مل سکتا ہے۔

مسیح الاطفال یہ کتاب فن طب سے متعلق ہے جس میں بچوں کی پیدائش سے لیکر ایام رضاعت ختم ہونے تک ان کے تمام امراض کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور نیز یہ کہ کس بیماری میں کس وقت کیا دوا دینا مناسب ہے۔ اسی کے ساتھ بچوں کے قیامِ صحت کے لئے اور جتنی تدابیر کی ضرورت ہے وہ بھی اس میں بیان کر دی گئی ہیں۔ چونکہ اس کے مؤلف حکیم مولوی محمد نسیم الدین صاحب خود ایک تجربہ کار طبیب ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا وہ یقیناً مفید و کار آمد ہوگا۔

یہ کتاب صدیقی دواخانہ کھاتولی ضلع مظفر نگر سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

حامد کے سو شعر حامد علی خاں بی اے رسالہ ہمایوں کے جوائنٹ ایڈیٹر پنجاب کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھیں کے کلام سے جناب منصور احمد صاحب نے سو شعر انتخاب کرکے اس نام سے شائع کئے ہیں۔ ابتداء میں جناب حامد کی خصوصیات شاعری پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ جو کافی دلچسپ ہے۔ انتخاب کے متعلق اس وقت تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ جب تک شاعر کا سارا کلام سامنے نہ ہو۔ تاہم بعض شعروں سے مادح و ممدوح دونوں کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:۔

جب یاد کیا اُس کو تب جان پہ بن آئی — یا اُس کو بھلاؤں گا یا جان سے جاؤں گا

تجھے بھلا رہا ہوں میں یہ کیا خیال ہے مجھے — غضب کا سنگدل ہوں میں عجیب بیوفا ہوں میں

مسلمانوں کی صنعت و حرفت

فون کرامر (مشہور جرمن مستشرق) نے ایک کتاب عہد خلفاء کی تاریخ تمدن پر لکھی ہے جس کا ایک باب مسلمانوں کی صنعت و حرفت۔ زراعت و تجارت سے متعلق ہے۔ مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ اسلامی عثمانیہ یونیورسٹی نے اسی باب کا ترجمہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نہایت مفید معلومات کا حامل ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس و پاکیزہ ہے۔ اور کتابت و طباعت پسندیدہ۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔ اور "کتابستان سٹی روڈ الہ آباد" سے مل سکتی ہے۔

کارخانہ جلد سازی حیدرآباد

مجوبیہ کارخانۂ جلد سازی گولیگوڑہ حیدرآباد نے ہمارے پاس جرمنی کے چھپے ہوئے دیوان غالب کا ایک نسخہ بھیجا ہے تاکہ ہم اسکی جلد کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور یہ کہنا یقیناً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ اتنی خوبصورت و پاکیزہ جلدیں نے اس وقت تک ہندوستان کے کسی انگریزی کارخانہ کی بھی نہیں دیکھی۔

یہ کارخانہ عرصہ سے قایم ہے اور اسکی ایک خصوصیت یہی ہے کہ وہ بچوں کو اس فن کی تعلیم دیتا ہے اور مستحق طلباء کے وظائف کا بھی انتظام کرتا ہے۔ حلقۂ "نگار" میں جن حضرات کو کبھی جلد بندھوانے کی ضرورت ہو تو وہ ضرور اس کارخانہ سے خط و کتابت کریں۔

انقلاب فرانس

مصنفہ جناب باری۔ پبلشرز اردو بک اسٹال لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات۔ تقطیع چھوٹی۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔

یہ ہیں ظاہری خصوصیات اس کتاب کی لیکن معنوی خصوصیات اس سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ جس اختصار و ایجاز اور جس شگفتگی و سلاست کیساتھ دنیا کے اس عظیم الشان انقلاب کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اردو کی کسی اور کتاب میں (اس موضوع پر) نہیں پایا جاتا۔ ملک کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں کا بغور مطالعہ کریں اور ملک و وطن کی خدمت کا وہی جذبہ اپنے اندر پیدا کریں جو انقلاب فرانس کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔

قادیانی مذہب

تصنیف ہے جناب الیاس برنی کی۔ جو پہلے جامعہ عثمانیہ میں استاد معاشیات تھے۔ اور اب دارالترجمہ کے ناظم ہیں۔ یہ ایڈیشن اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اور غالباً یہ کافی ثبوت اس کتاب کی مقبولیت کا ہے۔ اس ایڈیشن میں بہ نسبت سابق ایڈیشنوں کے مضامین کا کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ اور کچھ ضمیمے بھی بڑھائے گئے ہیں۔ ضخامت ۷۰۰ صفحات ہے اور قادیانی مذہب کے متعلق شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو اسمیں درج نہ ہو۔ ہرچند اس کتاب میں کوئی مناظرانہ دلچسپ انداز بیان نہیں پایا جاتا۔ لیکن طرز ادا کی سلاست مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین کرنیوالی ہے اور وہ حضرات جو ہندوستان کے اس جدید سیاسی مذہب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کیلئے اسکا مطالعہ بہر نوع فائدہ سے خالی نہیں۔ اسکی قیمت علاوہ محصول دو روپیہ ہے۔ اور کمال احمد صاحب فاروقی (بیت الاسلام حیدرآباد دکن) سے مل سکتی ہے۔

شاعری کی دُنیا

وہ گرمیوں میں شبِ مہ کی سرو سیمینی　　وہ برشگال میں شام و سحر کی رنگینی
وہ جھوم جھوم کے گھنٹوں برسنے والی گھٹا　　جو طبعِ مست کو دیتی ہے درسِ بے دینی
وہ نے نواز کے پُر کیف زمزموں کا لوچ　　وہ نغمہ گر کے رسیلے سُروں کی شیرینی
جوانیاں، وہ چھلکتے ہوئے شراب کے جام　　وہ گیسوؤں کی دمک وہ رُخوں کی زرّینی
وہ گردنوں کی نزاکت، وہ ابرؤں کا کھچاؤ　　وہ انکھڑیوں کی گلابی خمار آگینی
کسی کے عشق میں وہ نامرادیوں کے مزے　　وہ نوجوان طبیعت کی یاس آگینی
سکوتِ شب میں وہ بچھڑے ہوئے دنوں کی یاد　　جو دل کو بخشتی ہے اک لطیف غمگینی
وہ عین اُٹھتی جوانی میں موت آجانا　　وہ باغِ زیست میں دستِ فنا کی گلچینی

یہ زندگی کے ہلاکت فروز منظر ہیں
اِنہی کے مارے ہوئے کیٹس اور اختر ہیں

(اختر انصاری)

نغمۂ شاعر

جزِ گیتی میں ہوا ہے سست رَو خونِ حیات
گردشِ پیہم سے گویا تھک چکی ہے کائنات

بے خبر پردہ سرائے شب میں سوتا ہے جہاں
گویا انساں کو نہیں اندیشۂ سود و زیاں

محفلِ ہستی پہ یعنی چھا گیا خوابِ اجل
روح کی گہرائیوں میں سو گیا ذوقِ عمل

کتنی گہرائی ہے شب کے نغمۂ خاموش میں
زندگی سوتی ہے گویا موت کی آغوش میں

اہلِ عالم سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے
شورشِ ہنگامۂ ہستی سے گھبرائے ہوئے

نور کی چادر کو اوڑھے سو رہی ہے رات بھی
ترک کی ہے سرد ہو کے نبضِ موجودات بھی

آہ! لرزاں ہے مگر میرا ربابِ جاں ابھی
برقِ بیتابی مرے سینہ پہ ہے رقصاں ابھی

جاگتا ہوں میں زمانے کو سلانے کے لئے
جل رہا ہوں آگ اوروں کی بجھانے کے لئے

ذوقِ دیدار انگیز میں بیٹھا ہوں سرشارِ خیال
نشۂ خواب آفریں میں ہوں پرستارِ خیال

جاگ اٹھتے ہیں ہزاروں زمزمے اب خواب سے
سازِ دل کو چھیڑتا ہوں فکر کی مضراب سے

سوز ہے سینہ میں آہوں سے عیاں ہوتا نہیں
شمع اس محفل میں جلتی ہے دھواں ہوتا نہیں

شرحِ دردِ زندگانی ہے کتابِ آرزو
تشنۂ مضراب ہے میرا ربابِ آرزو

دل اگرچہ قطرۂ خوں ہے مگر طوفان ہے
سینکڑوں خوں گشتہ امیدوں کا گورستان ہے

میرے بربط میں جو نغمے ہیں ابھی گائے نہیں
میں نے بادہ کش ابھی محفل کے بہکائے نہیں

دل ہے کیا شاعر کا؟ صوتِ سرمدی کا ساز ہے
شعر کیا؟ پردہ سرائے قدس کی آواز ہے

خواب سے تم کو جگانے کے لئے آیا ہوں میں
"نغمۂ الفت" سنانے کے لئے آیا ہوں میں

آگ نغموں کی میں اپنے ساز سے برساؤں گا
ابر بن کے آسمانِ شعر پہ چھا جاؤں گا

شفیع منصور۔ لدھیانہ

"نوائے غریب"

تصور کس قدر آزاد ہے خوابِ پریشاں کا　　معرا ہے حقیقت سے تماشہ اہلِ امکاں کا

مری فطرت میں آزادی کے جلوے رقص کرتے ہیں　　مرے اندازِ گوناگوں مصیبت میں نکھرتے ہیں

عنایت ہائے ساقی کا گلہ میں کر نہیں سکتا　　ٹکا پوئے زمانی برطرف - میں مر نہیں سکتا

کرم کر مجھ پہ اے ساقی مجھے آزاد رہنے دے　　"میں بربادِ تمنا ہوں مجھے برباد رہنے دے"

مری کاوش سے پیدا ہے شرارِ آرزو دل میں　　شرر آہنگیاں میری نہ چھوڑیں گی لہو دل میں

جمالِ شاہدِ گیتی نظر افروزِ عالم ہے　　مگر قسمت مری وابستۂ اجزائے برہم ہے

مجھے فرصت نہیں شانِ امارت کے تکلف کی　　مجھے حاجت نہیں انبارِ دولت پر تصرف کی

تلاشِ زندگی میں عمرِ فانی کھو چکا ہوں میں　　جہاں میں بندۂ بے دامِ الفت ہو چکا ہوں میں

"محبت" چھا گئی ہے میری دنیائے تمنا پر　　زمانہ ہنس رہا ہے میری "لیلائے تمنا" پر

نمودِ حسن کی نیرنگیاں، واللہ! کیا کہنا!　　مگر میرے مقدر کی رسائی، آہ! کیا کہنا!

زبانِ بے زبانی کی شکایت کر نہیں سکتا　　فروغِ ظاہری سے میں محبت کر نہیں سکتا

مری ہستیاں اک دن نمایاں ہونگی محفل میں　　تجلیاتِ لرزاں کھو گئی ہیں میری منزل میں

امیرِ محتشم کھویا ہوا ہے اپنی دولت میں ؟
وقارِ معنوی حاصل ہے مجھ کو "اک محبت" میں !

ضمیر نعمانی بیادی